شوکت صدیقی

جانگلوس

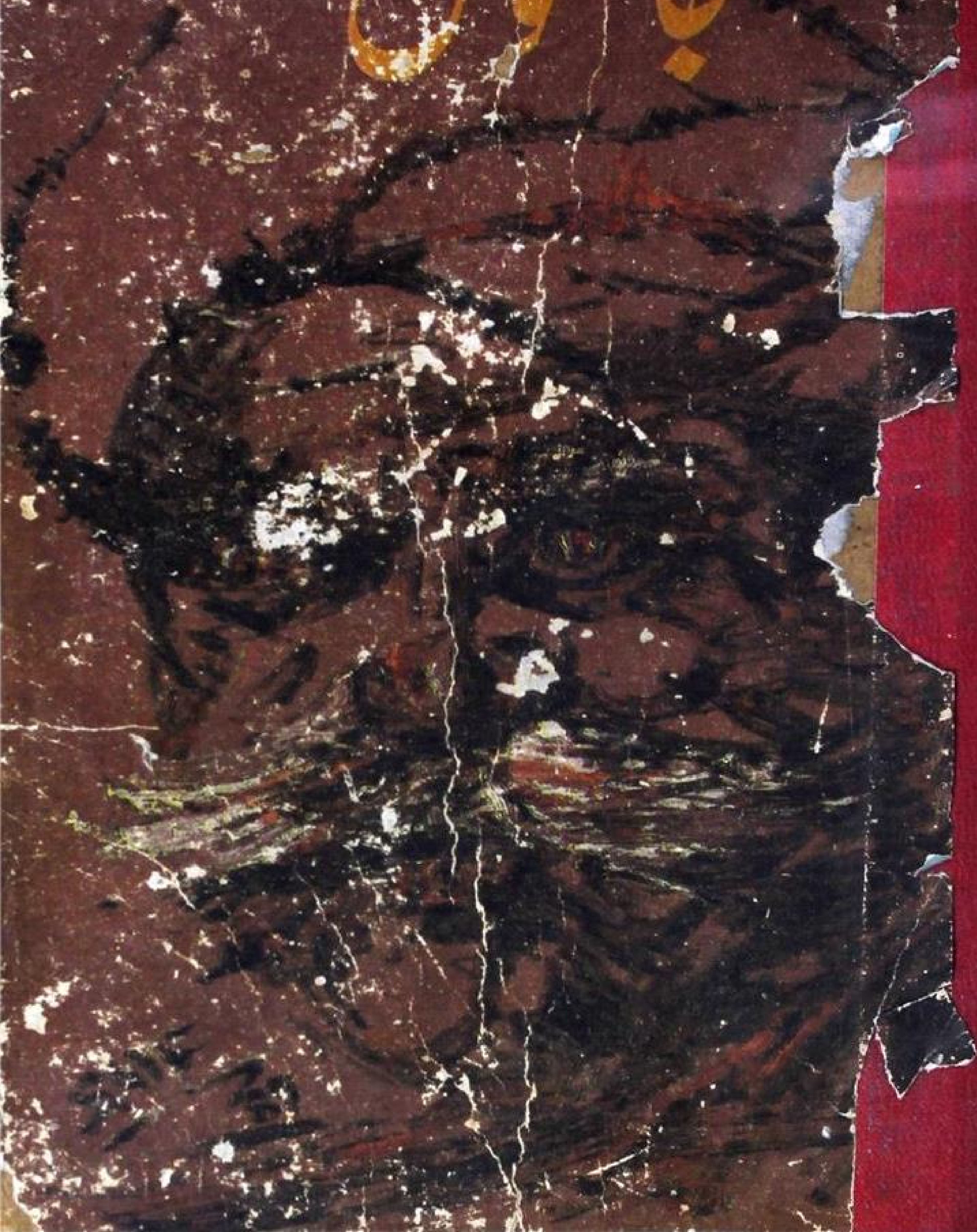

شوکت صدیقی

جانگلوس

(جلد دوم)

رکتاب پبلیکیشنز
پوسٹ بکس ۳۲۱۳ کراچی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

پہلا ایڈیشن —— اگست ۱۹۸۹ء

تعداد —— ایک ہزار

سرورق —— سیف الاسلام

مطبع —— مارس پرنٹرز کراچی

قیمت —— ۲۰۰ روپے

ناشر —— نثار حسین

رکتاب پبلی کیشنز

پوسٹ بکس ۳۳۱۳ —— کراچی

منجھلے بیٹے
شہزاد عالم صدّیقی کے نام

حرفِ چند

اس ناول کے بارے میں مجھے جو کہنا ہے، وہ جلد اوّل کے پہلے ایڈیشن کے دیباچے میں کسی قدر تفصیل سے کہہ چکا ہوں۔ اسی دیباچے میں یہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ یہ ناول اُردو کے مقبول اور کثیر الاشاعت جریدے، "سب رنگ"، کراچی، میں جولائی ۱۹۷۷ء سے قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ "سب رنگ" میں ناول کا جس قدر حصّہ اِس وقت تک شائع ہو چکا ہے، وہ جلد اوّل اور اب جلد دوم میں پیش کیا جا رہا ہے۔ جلد سُوم میں، جو آخری جلد ہو گی، بقیہ حصّہ شائع کیا جائے گا۔

جلد اوّل کی طرح جلد دُوم میں بھی ناول کا جو حصّہ پیش کیا جا رہا ہے، وہ قطعی طور پر وہ نہیں ہے جو "سب رنگ" میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ بڑی حد تک اس سے مختلف ہے۔ ہوا یہ کہ جب اس ناول کی اشاعت کا سلسلہ "سب رنگ" میں شروع ہوا تو بد قسمتی سے ملک پر مارشل لا نافذ تھا جس کے نت نئے قوانین اور احکامات کے تحت آزادیٔ اظہار پر طرح طرح کی پابندیاں عائد تھیں۔ اخبارات اور

جرائد پر سنسر تھا، اور ایسا کڑا سنسر تھا کہ شعر و ادب کا کیا ذکر احادیث نبوی اور قرانی آیات بھی سنسر کی زد سے نہ بچ سکیں۔ یہ دَور بھی عجب دَورِ ابتلا تھا۔

درد کیا جانئے کیا کیا یہ بیاں کرتا ہے
دہن زخم کو گویا لب گفتار نہیں

غرضیکہ سنسر کے مشق ستم کا نشانہ "جانگلوس" بھی بنا۔ صفحات کے صفحات شائع ہونے سے روک دئے گئے۔ اب سنسر کے کشتۂ ستم یہ صفحات ناول میں شامل کئے جا رہے ہیں۔ علاوہ ازیں نظر ثانی کے دوران خاطر خواہ ترمیم و اضافہ بھی کیا گیا۔ اُمید ہے کہ قارئین یہ تبدیلی بلکہ ناول کی اس تشکیل نو کو پسند فرمائیں گے۔

شوکت صدیقی

۱۲ر مئی ۱۹۸۹ء

۱۷

دیپال پور روڈ پر نیلی بار ٹرانسپورٹ کی ایک لاری شور مچاتی پاک پتن کی سمت جا رہی تھی۔ رحیم داد لاری کو دُور تک دیکھتا رہا۔ آخر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اُس نے سڑک عبور کی نشیب میں اُترا اور آگے بڑھنے لگا۔

شام کا دھندلکا پھیلنے لگا۔ رحیم داد کہیں ٹھیرے بغیر چلتا رہا۔ اندھیرا بڑھتا گیا۔ وہ حویلی روڈ سے گزر کر دیپال پور تحصیل کی حدود میں داخل ہوا تو رات ہو چکی تھی۔ رحیم داد تھکن سے بے حال ہو رہا تھا۔ بھوک بھی ستا رہی تھی۔ اُس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ نہر کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ راستہ صاف ستھرا اور کشادہ تھا۔ پیاس لگتی تو پینے کو نہر کا پانی مل جاتا۔

ہر سمت اندھیرا چھایا تھا۔ اُس کے پیر بوجھل ہو گئے تھے۔ اب اُس میں زیادہ دُور جانے کی سکت نہ تھی۔ وہ کہیں ٹھیر کر رات بسر کرنا چاہتا تھا مگر کوئی مناسب اور محفوظ ٹھکانا نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہر کے کنارے کہیں کہیں کھجور کے درخت تھے، کیکر کی جھاڑیاں تھیں جن کی شاخیں پیلے پیلے پھولوں سے لدی جھوم رہی تھیں۔ گندم اور جَو کی تیار فصلیں بھی کھڑی تھیں۔ جہاں فصلیں کٹ چکی تھیں وہاں اجاڑ کھیت دُور دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔

رحیم داد ٹھکانے کی تلاش میں تھکے ہارے قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ یکایک عقب میں ٹاپیں سنائی دیں۔ کوئی گھوڑا دوڑتا اسی طرف آ رہا تھا۔ آواز رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔ رحیم داد راستے سے ہٹ کر ایک طرف ہو گیا۔ قریب ہی کھیت تھے۔ وہ اُن کے

ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ گھڑ سوار بالکل نزدیک آگیا۔ اُس کا گھوڑا زور سے ہنہنایا، ٹھوکر کھائی اور راستے سے اتر کر رحیم داد کی جانب بڑھا۔ وہ سراسیمہ ہو کر پیچھے ہٹا اور کھیت کی مینڈھ سے ٹکرا کر گر پڑا۔ گرتے ہی اندھیرے میں گھوڑے کا سُم اس قدر زناٹے سے اُس کے چہرے پر پڑا کہ سر چکرا گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ سانس رُک رُک کر چلنے لگی۔

ذرا دیر بعد اُس نے سُنا، کوئی اُس پر جھکا ہوا معذرت کے انداز میں کہہ رہا تھا "معاف کرنا جی! گھوڑی ذرا چمک گئی تھی۔ میں نے بہت روکا پر کابو سے نکل گئی۔ رستے سے اتر کر ادھر آ گئی۔" اُس نے سہارا دے کر رحیم داد کو اُٹھایا۔ رحیم داد کراہتا ہوا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

گھڑ سوار نے نرمی سے پوچھا۔ "کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

رحیم داد سے تکلیف کے مارے بولا نہ گیا۔ اُس نے اپنے گال پر ہاتھ پھیرا تو ہاتھ خون سے تر بتر ہو گیا۔ رحیم داد نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ اپنا خون آلود ہاتھ سامنے کر دیا۔ دھندلی روشنی میں اُس نے خون سے بھرا ہاتھ دیکھا۔ رحیم داد کے چہرے کا زخم دیکھا اور پریشان ہو کر بولا۔

"لگتا ہے، تیرے تو بہت چوٹ آئی ہے۔"

چوٹ واقعی سخت آئی تھی۔ گھوڑے کی پوری ٹاپ رحیم داد کے چہرے پر بیٹھ گئی تھی۔ اور لوہے کی نئی نعل رُخسار کی جلد کاٹتی چار انچ تک چلی گئی تھی۔ رحیم داد نے خُون بند کرنے کے لئے زخم پر بایاں ہاتھ رکھ لیا تھا۔ وہ ٹیس برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

گھڑ سوار لمبا چوڑا جوان تھا۔ سفید قمیص اور سفید شلوار پہنے ہوئے تھا۔ سر پہ اُونچے طرّے کی پگ تھی۔ وضع قطع سے بڑا زمیں دار لگتا تھا۔ اُس نے جھٹ اپنی پگ اتاری۔ شملہ جھر سے پھاڑا اور پھٹا ہوا ٹکڑا لے کر تیزی سے نہر کی جانب گیا۔ اُسے پانی سے تر کیا۔ واپس آیا۔ رحیم داد کا ہاتھ ہٹایا۔ گیلے کپڑے کے ایک کونے سے خون صاف کیا، پھر کپڑا تہہ کیا۔ گدّی بنائی اور زخم پر رکھ دی۔ اُس نے پگ کا ایک حصّہ اور پھاڑا اور اُسے سر سے ٹھوڑی تک چہرے کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر گرہ لگا دی۔

رحیم داد خاموش بیٹھا رُک رُک کر کراہتا رہا۔ زخم پر پٹّی باندھ کر اس شخص نے پوچھا۔ "تیرا

نام کیا ہے؟"

رحیم داد نے بولنے کے لئے منہ کھولا اور صرف "چوہدری" کہہ سکا۔

وہ شخص بولا۔ "چوہدری! میرا نام اللہ د سایا ہے۔ ادھر کوٹلہ ہرکشن میں اپنی زمین داری ہے۔" اُس نے رحیم داد کی پیٹھ تھپک کر دل جوئی کی۔ "چوہدری! حوصلے سے کام لے۔ تھوڑی دیر میں درد کم ہو جائے گا۔" وہ رحیم داد کے قریب ہی زمین پر بیٹھا تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر اُس کی مُشکی گھوڑی کھڑی تھی۔ کچھ دیر خاموش رہ کر اللہ وسایا نے کہا۔ "تیری طبیعت سنبھل گئی ہو تو میرے ساتھ گھوڑی پر بیٹھ جا۔ کوٹلہ ہرکشن یہاں سے زیادہ دُور نہیں۔ وہاں پہنچ کر ٹھیک سے مرہم پٹی ہو جائے گی اور تُو آرام سے لیٹ جائے گا۔"

اللہ وسایا نے سہارا دیا، رحیم داد اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے کلیم کے کاغذات کا بستہ مضبوطی سے ہاتھ میں دبا لیا۔ اللہ وسایا گھوڑی کے پاس گیا۔ اُس کی راس پکڑ کر نہر کے کنارے لے گیا۔ رحیم داد آہستہ آہستہ اُس کے قریب چلا گیا۔ اللہ وسایا گھوڑی پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے رحیم داد کا ہاتھ تھام کر سہارا دیا اور وہ بھی اللہ وسایا کے پیچھے گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ اُس نے ایک ہاتھ سے اللہ وسایا کی کمر تھامی اور جم کر بیٹھ گیا۔

اللہ وسایا نے گھوڑی کو ایڑ لگائی اور اُسے آہستہ آہستہ دوڑانے لگا۔ نصف گھنٹے سے بھی کم عرصے میں دونوں کوٹلہ ہرکشن پہنچ گئے۔ اللہ وسایا نے حویلی کے پاس پہنچ کر گھوڑی ٹھہرا لی۔ نیچے اُترا۔ اُس کے نوکر چاکر قریب پہنچ چکے تھے۔ اللہ وسایا کی ہدایت پر انہوں نے سہارا دے کر رحیم داد کو گھوڑی کی پیٹھ سے نیچے اُتارا۔ گھوڑی کی لگام ایک ملازم نے تھام لی۔

اللہ وسایا نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری! میرے ساتھ آ۔"

رحیم داد خاموشی سے اللہ وسایا کے ہمراہ حویلی کے مہمان خانے میں چلا گیا۔ دونوں ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرہ کشادہ اور ہوادار تھا۔ طاق میں لیمپ روشن تھا۔ ایک طرف خوب چوڑا چکلا پلنگ تھا۔ اُس پر اُجلا بستر لگا تھا۔

اللہ وسایا نے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "چوہدری! اب تو منجی پر آرام کر۔

میں تھوڑی دیر میں واپس آجاؤں گا۔" وہ کمرے سے چلا گیا۔

رحیم داد خاموش لیٹا رہا۔ کچھ دیر بعد ایک ادھیڑ نوکرانی کانسی کے بڑے سے گلاس میں دودھ لے کر آئی۔ رحیم داد تکیے کے سہارے اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ اُس نے گلاس نوکرانی سے لے لیا اور دونوں ہاتھوں سے تھام کر دھیرے دھیرے دُودھ کے گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے لگا۔ دُودھ گاڑھا اور نیم گرم تھا۔

رحیم داد دُودھ پیتا رہا۔ نوکرانی نے کمرے کی دونوں کھڑکیاں کھول دیں۔ کمرے کی پشت پر باغیچہ تھا۔ اُس میں لیموں کے درخت بھی تھے اور کھڑکیوں کے قریب ہی تھے۔ لیموں کے درختوں میں پھول آگئے تھے۔ اُن کی مہک ہلکے ہلکے جھونکوں میں رچی ہوئی کمرے کے اندر آرہی تھی۔ دُودھ پی کر رحیم داد نے گلاس نوکرانی کو دے دیا۔ وہ اسے لے کر خاموشی سے چلی گئی۔

دُودھ پینے کے بعد رحیم داد کو خاصا سکون مل گیا تھا۔ نقاہت بھی کم ہو گئی تھی۔ وہ تکیے پر سر رکھ کر چت لیٹ گیا اور خاموشی سے چھت تکنے لگا۔ چند منٹ بعد اللہ وسایا واپس آگیا۔ اُس کے ہمراہ ایک بوڑھا بھی آیا۔ اس کی لمبی سفید داڑھی تھی۔ سر پر پگڑی تھی۔ لباس بوسیدہ اور ملگجا تھا۔ دونوں آہستہ آہستہ رحیم داد کے نزدیک آئے۔ بوڑھے کے جسم سے پسینے کی تیز بُو اُٹھ رہی تھی۔ اُس نے جُھک کر رحیم داد کا چہرہ دیکھا اور پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"بخار تو نہیں لگتا۔ چوٹ زیادہ گہری نہیں آئی۔"

اُسی وقت ایک سرو قامت نوجوان عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کا چہرہ تازہ پھول کے مانند نرم اور گلابی تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں پچھلی رات کے ستارے جھلملاتے تھے۔ نقش و نگار بھی سُبک اور تیکھے تھے۔ وہ ہلکے آسمانی رنگ کا ریشمی کُرتا اور شلوار پہنے ہوئے تھی۔ دوپٹا بھی آسمانی تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں لکڑی کا چھوٹا سا بکس لٹک رہا تھا، جس پر کراس کا بڑا سا سرخ نشان بنا تھا۔

رحیم داد نے اُسے دیکھا تو مبہوت ہو کر رہ گیا۔ ایسا محسوس ہوا کہ کمرے میں رنگ و بُو کا سیلاب اُمڈ آیا ہے۔ رحیم داد کی سانس لمحے بھر کو ٹھہر گئی، آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی۔

اللہ وسایا نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری!" اُس نے ہاتھ اُٹھا کر عورت کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ جمیلہ ہے، میرے گھر والی۔" جمیلہ کے چہرے پر سُرخی کی لہر دوڑ گئی۔ اُس نے دوپٹے کا آنچل سر پر ڈال لیا۔

بوڑھے نے رحیم داد کی پیشانی سے ہاتھ ہٹا کر اللہ وسایا کو دیکھا۔ "فکر کی کوئی گل نہیں۔ پاتھی کی گرم گرم راکھ چوٹ پر باندھ دے۔ دو تین دن میں چنگا ہو جائے گا۔ ویسے نیم کے پتّے کچل کر باندھنے سے بھی آرام آ جائے گا۔"

جمیلہ بڑھ کر دونوں کے قریب پہنچ گئی۔ اُس نے مُسکرا کر بوڑھے کو دیکھا، بے نیازی سے بولی۔ "بابے! تو اپنا کچّا علاج رہنے دے۔ میں نے پہلے گھاؤ دیکھنا ہے۔ اسے دیکھے بنا کیسے علاج ہو سکتا ہے۔"

اللہ وسایا نے نظر بھر کر بیوی کو دیکھا، ہنس کر بولا۔ "جمیلے! تَیں نُوں پتہ ہے، اپنا بابا بھی بہت سیانا اور تجربہ کار ہے۔" اُس نے بوڑھے کی دل جوئی کی۔ "دُور دُور سے بیمار اور روگی اس کے پاس علاج کرانے آتے ہیں، چنگے ہو کر جاتے ہیں۔"

"تیری گھر والی ڈاکٹرنی بن گئی ہے۔ اسے ہی علاج کرنے دے۔" بوڑھے کے لہجے میں تلخی تھی۔ وہ روٹھنے کے انداز میں جانے کے لئے مُڑا۔

اللہ وسایا نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ "بابے! کدھر چلا۔ میری گل تو سُن۔"

بوڑھا منہ بگاڑ کر بولا۔ "جب کام نہ بنے تو مجھے بلا لینا۔ ابھی تجھے میری ضرورت نہیں ہے۔" اُس نے مُڑ کر اللہ وسایا کی طرف نہیں دیکھا۔ کمرے سے نکل گیا۔ جمیلہ نے بوڑھے کی بات پر کوئی ردِّ عمل ظاہر نہیں کیا۔ اُس نے کمرے میں رکھی ہوئی چھوٹی سی میز گھسیٹ کر پلنگ کے قریب کی اور اُس پر اپنا فرسٹ ایڈ بکس رکھ دیا۔

اللہ وسایا نے اظہارِ تاسّف کیا۔ "جمیلے! تُو نے بابے کو ناراض کر دیا۔" جمیلہ خاموش رہی۔ اللہ وسایا بتانے لگا۔ "میں نے اپنی پگ پھاڑ کر چوٹ پر لپیٹ دی تھی تاکہ خُون بند ہو جائے۔ زخم گہرا آیا ہے۔ بہت خُون نکل رہا تھا۔ بابا تو چلا گیا، اب تُو ٹھیک سے چوہدری کی مرہم پٹی کر دے۔"

جمیلہ بدستور خاموش تھی۔ اُس نے رحیم داد کی پٹّی آہستہ آہستہ کھولی۔ پٹّی خون سے سُرخ ہو رہی تھی۔ جمیلہ نے اُسے میز پر ڈال دیا۔ جُھک کر دیکھا۔ زخم آنکھ سے ڈیڑھ انچ نیچے ہلال کی شکل بناتا ہوا رُخسار کے نشیب میں پھیلتا چلا گیا تھا۔ خوُن ابھی تک رس رہا تھا۔ اللہ وسایا نے لیمپ کی روشنی میں رحیم داد کا زخم غور سے دیکھا۔ پریشان ہو کر بولا۔ "لگتا ہے گھوڑی کا کھُرا سیدھا گال پر لگا۔ خیریت گزُری کہ آنکھ بچ گئی۔" رحیم داد آنکھیں کھولے چُپ پڑا رہا۔

جمیلہ نے اُس کے رُخسار پر آہستہ سے ہاتھ رکھا۔ اُس کے نرم نرم ہاتھ کے لمس سے رحیم داد کو بڑا سکون ملا۔ جمیلہ نے رُخسار کی ہڈّی ہولے سے دبا کر پوچھا۔

"چوہدری! ہڈّی میں درد تو نہیں ہوتا؟"

رحیم نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی، مدّھم لہجے میں بولا۔ "تھوڑا تھوڑا ہوتا ہے۔"

جمیلہ کے چہرے سے پریشانی کا غبار چھٹ گیا، وہ زیرِلب مسکرائی۔ "لگتا ہے ہڈّی میں زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ مجھے اسی کا ڈر تھا۔ گھوڑی کے کھُرے سے صرف کھال کٹی ہے۔" اُس نے بکس کھول کے روئی کا گالا نکالا، اسپرٹ سے اُسے ترکیا اور دھیرے دھیرے زخم صاف کرنے لگی۔ زخم پر اسپرٹ لگی تو رحیم داد تکلیف سے بلبلا یا۔ اُس نے کراہتے ہوئے اپنے دانت سختی سے بھینچ لئے۔

جمیلہ نے اُس کی تکلیف محسوس کی۔ تسلّی دیتے ہوئے کہا "چوہدری! حوصلے سے کام لے۔ تھوڑی دیر میں آرام آجائے گا۔" وہ اسپرٹ میں بھیگا ہوا گالا زخم پر ہولے ہولے رگڑتی رہی۔ رحیم داد بے چین ہو کر گردن اِدھر اُدھر ہلانے لگا۔ جمیلہ نے اپنا نرم و گداز ہاتھ اُس کی پیشانی پر رکھ دیا۔

رحیم داد نے اپنے چہرے پر جھکی ہوئی جمیلہ کو دیکھا۔ وہ اس قدر قریب تھی کہ رحیم داد اُس کے دل کش خدوخال کا ایک ایک خم اور ایک، ایک زاویہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ ایک حسین اور طرح دار عورت تھی۔ اسے نزدیک اور مہربان پاکر رحیم داد کو بڑی فرحت محسوس ہوئی۔ بار بار اٹھتی ہوئی ٹیس کا احساس بھی کم ہو گیا۔

جمیلہ نے بکس سے ایک شیشی نکالی۔ اُس میں مرکیورکروم بھرا تھا۔ جمیلہ نے اُسے روئی پر ڈالا اور روئی آہستہ سے زخم پر رکھ دی۔ پھر اس پر احتیاط سے پٹی باندھ دی۔ مرکیورکروم لگانے کے بعد جمیلہ نے مسکرا کر کہا "چوہدری! میں نے تیرے گھاؤ پر لال دوائی لگا دی ہے۔" اُس نے ہولے سے اُس کا سر تھپکا۔ "چنتا نہ کر۔ جلد آرام آجائے گا۔" رحیم داد چُپ پڑا جمیلہ کا مسکراتا چہرہ تکتا رہا۔

اللہ وسایا نے دبی زبان سے اندیشہ ظاہر کیا۔ "جمیلے! گڑبڑ کی تو کوئی گل نہیں؟ تیری مرضی ہو تو سویرے پاک پتن سے ڈاکٹر کو بلوا لوں گا یا چوہدری کو اُس کے پاس لے جاؤں گا۔ وہ اچھی طرح دوا دارُو کر دے گا۔"

"ویسے تو چنتا کرنے کی کوئی گل نہیں لگتی۔" جمیلہ نے کہا۔ "گھاؤ زیادہ گہرا نہیں۔ ہڈی پر بھی چوٹ نہیں آئی۔ فوری طور پر جو علاج ہو سکتا تھا، وہ میں نے کر دیا۔ رات آرام سے گزرے گی۔ صبح تک دیکھتے ہیں، طبیعت گڑبڑ ہوئی تو ڈاکٹر کو بلوا لینا یا سرکاری اسپتال لے جانا۔"

جمیلہ نے بکس بند کیا، ہینڈل تھام کر اُسے ہاتھ میں لٹکایا اور باہر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

اللہ وسایا نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ آہستہ سے بولا۔ "گیارہ بجنے والے ہیں۔" اُس نے مڑ کر رحیم داد پر نظر ڈالی، اُس کا بازو تھپ تھپایا۔ "چوہدری! تو اب آرام سے سو جا۔ گھبرانے کی کوئی گل نہیں۔ صبح تک چنگا ہو جائے گا۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "تُو تگڑا جوان ہے۔ ایسی چوٹیں تو روز آتی رہتی ہیں۔" رحیم داد نے بھی مسکرانے کی کوشش کی۔

اللہ وسایا اپنی بیوی کے ہمراہ کمرے سے چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک نوکر اندر آیا اور میز پر پڑی ہوئی پٹی اور روئی کے خون آلود ٹکڑے اٹھا کر لے گیا۔ کمرے میں خاموشی ہو گئی۔ رحیم داد نے آنکھیں بند کر لیں۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ چاپ سنائی دی۔ اُس نے آنکھیں کھول کے دیکھا نوکر کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا جگ اور گلاس تھا۔ وہ آگے بڑھا اور میز پر جگ اور گلاس رکھ دیا۔ اُس نے لیمپ کی لو مدھم کی۔ رحیم داد کی جانب مڑا، آہستہ سے بولا۔ "میرا نام جی احمد ہے۔ میں رات کو یہیں رہوں گا۔ باہر میری منجی پڑی ہے۔ کوئی

کام ہو تو بلا لینا۔ میں آجاؤں گا۔" وہ دروازے کی جانب بڑھا اور کمرے سے چلا گیا۔

✡

رحیم داد خاموش لیٹا رہا۔ اُس کے رُخسار میں رُک رُک کر ٹیس اُٹھ رہی تھی۔ مگر اُس میں پہلی سی شدّت نہیں تھی۔ البتہ اُس کا جسم جگہ جگہ سے دُکھ رہا تھا۔ کمر اور پنڈلیوں میں سخت اینٹھن تھی۔ اُس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں مگر بے چین رہا، نیند نہیں آئی۔ اُسے اپنی تکلیف کے ساتھ ساتھ اللہ وسایا کا خیال آرہا تھا۔ وہ اُسے بہت بھلا مانس لگا۔ کوئی اور بڑا زمیں دار ہوتا تو اُسے روندتا ہوا گزر جاتا، پلٹ کر بھی نہ دیکھتا۔ مگر اللہ وسایا نے نہ صرف پگ پھاڑ کر اُس کے زخم پر پٹّی باندھی بلکہ علاج معالجے کے لئے اپنی حویلی میں بھی لے آیا۔ اُس کی بیوی رحیم داد کو اور بھی زیادہ بھلی معلوم ہوئی۔ وہ جس قدر خوب صورت اور دل ربا تھی، اتنی ہی زیادہ نیک دل اور ہمدرد تھی۔ اُس نے رحیم داد کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو اُسے ایسا لگا جیسے زخم سے اُٹھتی ہوئی ٹیس گھٹ کر آدھی رہ گئی ہو۔ اُس کے لمس کی لذّت رحیم داد اب تک محسوس کر رہا تھا۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ رحیم داد نے ایک بار اُٹھ کر پانی بھی پیا۔ پچھلے پہر اُس کی آنکھ لگ گئی۔

سُورج طلوُع ہونے کے کچھ ہی دیر بعد اللہ وسایا کمرے میں آیا۔ جمیلہ بھی اُس کے ہمراہ تھی۔ رحیم داد جاگ رہا تھا مگر اُس کا جسم تیز بخار سے بھُن رہا تھا۔ اُس کے زخمی رُخسار پر سوجن تھی اور اس قدر زیادہ تھی کہ ایک آنکھ پوری طرح نہیں کھلتی تھی۔ جمیلہ نے قریب جا کر اُس کی یہ کیفیت دیکھی تو اس کے تر و تازہ اور دمکتے چہرے پر پریشانی چھا گئی۔ اُس نے جُھک کر رحیم داد کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ گھبرا کر اللہ وسایا کی طرف دیکھا۔ آہستہ سے بولی۔" اسے تو تیز بخار ہے۔" اُس نے رحیم داد کا جسم کھیس ڈال کر سینے تک ڈھک دیا۔

اللہ وسایا نے پوچھا۔" طبیعت کچھ زیادہ گڑبڑ ہے؟" اُس نے رحیم داد کا سُوجا ہوا چہرہ غور سے دیکھا۔" منہ پر ورم بھی آگیا ہے۔"

"ہاں"۔ جمیلہ بولی "پاک پتن سے ڈاکٹر خان کو بُلوا لے"۔ اُس نے رحیم داد کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "ڈاکٹر کے پاس اسے لے جانے میں بہت تکلیف ہوگی"۔

دونوں رحیم داد کے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھیرے۔

اُن کے جانے کے بعد رحیم داد کراہتا ہوا اُٹھا اور پیشاب کرنے کمرے سے باہر چلا گیا۔ واپس آیا تو آہستہ آہستہ ہانپ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا۔ اُسے لیٹے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ احمد دُودھ سے بھرا ہوا گلاس لے کر آیا مگر رحیم داد سے دودھ نہ پیا گیا۔ اُس نے بے دلی کے ساتھ نصف سے بھی زیادہ دُودھ چھوڑ دیا۔ گلاس میز پر رکھ دیا۔ وہ بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ دُھوپ کی تمازت بڑھ گئی۔ سُورج چڑھ کر بلندی پر پہنچ گیا۔

دوپہر کو ڈاکٹر آیا۔ اُس کے ساتھ صرف جمیلہ تھی۔ اللہ وسایا نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے رحیم داد کے رُخسار ہولے ہولے ایک انگلی سے دبائے۔ جمیلہ اُسے بتانے لگی۔ "ڈاکٹر! میں نے فرسٹ ایڈ کے طور پر گھاؤ اسپرٹ سے صاف کر کے لال دوائی لگا دی تھی۔ رات بہت بیت چکی تھی۔ اُس سمے میں اور کر بھی کیا سکتی تھی"۔

"یہ تو بہت اچھّا ہوا"۔ ڈاکٹر مسکرا کر بولا۔ "سیپٹک ہونے کا ڈر نہیں رہا۔ ویسے زخم خاصا گہرا آیا ہے"۔

جمیلہ نے کہا: "وہ ہوا یہ جی کہ اندھیرے میں اللہ وسایا کی گھوڑی چمک گئی۔ چوہدری ایک دم سامنے آ گیا۔ گھوڑی کا کھُرا اس کے منہ پر پڑا۔ گھاؤ تو فیر آنا ہی تھا پر آنکھ بچ گئی۔ بالکل آنکھ کے نیچے چوٹ آئی ہے"۔

ڈاکٹر اُس کی باتیں سُنتا رہا اور خاموشی سے رحیم داد کا ہاتھ تھام کر انگلیوں سے اُس کی نبض دیکھتا رہا۔ رحیم داد چُپ چاپ لیٹا سامنے کی دیوار تکتا رہا۔ نبض دیکھنے کے بعد ڈاکٹر نے اپنا چرمی بیگ کھولا، سرنج نکالی۔ اُس میں دوا بھری اور رحیم داد کے بازو میں انجکشن لگا دیا پھر اُس نے پٹّی کھولی۔ اسپرٹ سے بھیگی ہوئی روئی سے از سرِ نو زخم صاف کیا۔ رحیم داد نے تکلیف سے منہ بگاڑا۔ جب زخم اچھی طرح صاف ہو گیا تو ڈاکٹر نے اُس پر

مرہم لگایا۔ روئی کا گالا رکھا اور اسے اسٹکنگ پلاسٹر کی پتلی پتلی پٹیوں سے اچھّی طرح رُخسار پر چپکا دیا۔

ڈاکٹر نے تسلّی دینے کی غرض سے آہستہ آہستہ رحیم داد کا بازُو تھپکا۔ مُسکرا کر بولا۔ ''چوہدری! گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تھوڑی دیر میں آرام آجائے گا۔ شام تک چہرے کی سوجن بھی ختم ہوجائے گی۔ تین چار روز میں طبیعت بالکل ٹھیک ٹھاک ہوجائے گی۔'' اُس نے اپنا بیگ بند کیا۔ دروازے میں کھڑے ہوئے نوکر نے آگے بڑھ کر بیگ سنبھال لیا۔

ڈاکٹر کمرے سے چلا گیا۔ جمیلہ بھی اُس کے ہمراہ چلی گئی۔ رحیم داد اُنہیں نظریں اٹھائے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ جمیلہ اُس وقت ہلکا گلابی لباس پہنے ہوئے تھی اور کچھ زیادہ ہی حسین نظر آرہی تھی۔ اُس کے بال سیاہ اور گھنے تھے۔ ہلکے ہلکے گھونگریالے بھی تھے۔ چوٹی لمبی تھی اور کمر سے نیچے جھُول رہی تھی۔ کمر پتلی تھی مگر کولھے قدرے بھاری تھے۔ وہ اپنے کولہوں کو آہستہ آہستہ خم دیتی ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

رحیم داد ٹکٹکی باندھے جمیلہ کو دیکھتا رہا اور اُس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ مہمان خانے کا آنگن عبور کرکے بیرونی دروازے سے باہر نہ چلی گئی۔ رحیم داد کو ایسا محسوس ہوا کہ روشنی دھندلی پڑ گئی ہے، ہوا ٹھہر گئی ہے۔ کمرے میں حبس اتنا بڑھ گیا کہ اُس کا دم گھٹنے لگا۔ اُس نے گہری سانس بھری اور چھت تکنے لگا۔

رات کو جمیلہ پھر رحیم داد کے پاس آئی۔ اللہ دسایا بھی اُس کے ساتھ تھا۔ دونوں کمرے میں پڑی ہوئی بید کی کرُسیاں کھسکا کر رحیم داد کے بستر کے قریب بیٹھ گئے۔ رحیم داد کو اب خاصا افاقہ تھا۔ رُخسار کا ورم کم ہوگیا تھا، بخار بھی اُتر گیا تھا۔

اللہ دسایا نے ہاتھ بڑھایا۔ رحیم داد کا ماتھا چھو کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''چوہدری! اب تو تجھے بخار نہیں ہے۔''

رحیم داد نے نحیف آواز میں اُس کی تائید کی۔ ''لگتا تو ایسا ہی ہے۔ چوٹ میں تکلیف بھی پہلے سے کم ہے۔''

"اب تو تیری طبیعت کچھ ٹھیک ہے۔ بول بھی سکتا ہے۔" اللہ وسایا نے پوچھا۔ "یہ بتا تیرا پنڈ کدھر ہے؟ میں چاہتا ہوں، تیرے گھر والوں کو خبر بھیج دوں۔ تیرے گھر نہ پہنچنے پر وہ پریشان ہوں گے، تیرا انتظار کرتے ہوں گے۔ تجھے ڈھونڈتے ہوں گے۔ اُن کو ضرور پتہ چلنا چاہیئے کہ تو یہاں ہے۔"

رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بتاتا بھی کیا۔ اب اُس کا نہ گھر بار تھا نہ ٹھکانا تھا۔ کوئی اُس کا نہیں تھا۔ بیوی بچے پرائے ہو چکے تھے۔ اکلوتی بہن اُس کی آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر دم توڑ چکی تھی۔ سارے رشتے، سارے بندھن ٹوٹ پھوٹ کر اس طرح بکھر چکے تھے کہ وہ ملبے کا ڈھیر رہ گیا تھا۔ رحیم داد کے چہرے پر دُکھ کے سائے منڈلانے لگے۔ آنکھیں گویا منجمد ہو گئی تھیں۔

اللہ وسایا نے اُسے خاموش پایا تو اصرار کر کے دریافت کیا۔ "چوہدری! تُو نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟"

رحیم داد نے مڑ کر اللہ وسایا کی جانب دیکھا اور ایک ٹک دیکھتا رہا۔ اُس نے گہری سانس بھری۔ غم کے بوجھ سے دبے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اپنا جی نہ کوئی گھر ہے نہ گھر والے ہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" جمیلہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "کوئی تو تیرا ہو گا کہیں نہ کہیں گھر بھی ہو گا۔"

"کبھی گھر تھا، گھر والے بھی تھے۔" رحیم داد دل گرفتہ ہو گیا۔

جمیلہ نے دلچسپی سے پوچھا۔ "سب کہاں گئے؟ کیا ہو گیا؟"

رحیم داد رُک، رُک کر بولنے لگا۔ "میں جی گورداس پور کا مہاجر ہوں۔ فسادات میں مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر جو بیتی، وہ تو تیں نوں پتہ ہی ہو گا۔ اُدھر اپنی زمینداری تھی۔ رہنے کو ماڑی تھی۔ گھر والی تھی، چار بچے تھے۔ بیٹی سب سے وڈّی تھی۔ اُسے بلوائی اٹھا کر لے گئے۔ اُس سے چھوٹا پُتّر تھا۔ وہ میرے سامنے مارا گیا۔ میں بلوائیوں سے بچ بچا کر کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ گیا۔" اُس نے چوہدری نور الٰہی کی المناک داستان اپنی بنا کر سنائی دی۔

رحیم داد آہستہ آہستہ ہانپ رہا تھا۔ اُس کا بیمار چہرہ اور مُرجھا گیا۔ اللہ وسایا

اور جمیلہ کے چہروں پر بھی غم کا ہلکا ہلکا غبار بکھرتا جا رہا تھا۔ جمیلہ کچھ زیادہ ہی متاثر نظر آتی تھی۔ اُس نے رحیم داد کا سوگوار چہرہ نظر بھر کر دیکھا۔ اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے بولی "چوہدری! تو بہت نراش اور دکھی لگتا ہے۔ تو نے بہت کٹھنائیاں جھیلی ہیں۔" اُس کے لہجے میں دبا دبا کرب تھا۔ "یہ تو بتا، تیری گھر والی اور دو بچوں کا کیا بنا؟"

"بعد میں پتہ چلا کہ گھر والی دونوں بچوں کے ساتھ پاکستان آ گئی تھی۔" اُس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ لہجہ اور دل دوز ہو گیا۔ "وہ کہاں ہے، کس کے پاس ہے۔ بچوں کا کیا بنا۔ یہ اب تک پتہ نہیں چلا۔" رحیم داد کو نوراں اور اپنے دونوں بچے یاد آ گئے۔ اُس کا دل بھر آیا۔ آواز بھرا گئی۔ "آٹھ سال سے انہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ ادھر بھی انہیں ڈھونڈنے ہی آیا تھا۔ اندھیرے میں گھوڑی سامنے آ گئی۔" اُس کے لہجے میں سسکیوں کی سرسراہٹ تھی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ تڑپ کر بولا۔ "مر جاتا تو اچھا تھا۔" رحیم داد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جمیلہ کی آنکھوں سے بھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ وہ سر جھکا کر رونے لگی۔ اُس کا چہرہ بجھ گیا۔ اللہ دسایا نے اُسے روتے دیکھا۔ ہاتھ بڑھا کر اُس کا سر آہستہ آہستہ تھپکا۔ دل جوئی کی۔ "لے، تو بھی رونے بیٹھ گئی۔" وہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ "چوہدری! اس کا دل بہت کمزور ہے۔ کسی کو دکھی دیکھتی ہے تو اس کی آنکھوں میں ایسے ہی آنسو آ جاتے ہیں۔" اُس نے گہری سانس بھری۔ "ویسے جی فسادات میں بہت ظلم ہوا۔" اُس نے رحیم داد کو تسلی دی۔ "چوہدری! رب نے چاہا، تیری گھر والی اور بچے ایک نہ ایک دن تجھے ضرور مل جائیں گے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ اللہ دسایا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے جمیلہ کا بازو تھاما۔ "چل چوہدری کو اب سونے دے۔ بہت رات ہو گئی۔" جمیلہ نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے اور خاموشی سے کھڑی ہو گئی۔ دونوں آگے بڑھے اور آہستہ آہستہ کمرے سے نکل کر آنگن میں پہنچ گئے۔

رحیم داد کچھ دیر خاموش لیٹا رہا پھر اُٹھا۔ میز پر رکھے ہوئے جگ سے اُس نے گلاس میں پانی انڈیل کر پیا۔ دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ احمد اُس وقت موجود نہیں تھا۔ اُس کی چارپائی

خالی تھی۔ رحیم داد بستر سے نیچے اترا۔ لیمپ کی لَو مدّھم کی اور بستر پر آ کر لیٹ گیا۔

☆

سویرے سویرے اللہ وسایا آیا لیکن جمیلہ اُس کے ساتھ نہیں تھی۔ رحیم داد کی طبیعت اب خاصی سنبھل گئی تھی۔ چہرے پر سوجن بھی نہیں رہی تھی لیکن وہ کمزور ہو گیا تھا۔ رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ اللہ وسایا اُسے اپنے ہمراہ مہمان خانے سے باہر لے گیا۔ سورج شیشم کے درختوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا تھا۔ سنہری دھوپ گاؤں کے مکانوں کی منڈیروں پر جھلملا رہی تھی۔ کوٹلہ ہرکشن اب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ گھروں سے دُھواں اُٹھ رہا تھا۔

دونوں بستی کی جانب نہیں گئے، کھیتوں کی طرف نکل گئے۔ فصلوں کی کٹائی ہو چکی تھی کھیتوں میں کہیں کہیں کٹی ہوئی فصل کے ترنڈے دُور سے دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں خریف کی کاشت کے لئے تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ کہیں واہن کھیت تھے، جن میں ہل چلایا جا چکا تھا۔ مگر نہ سہاگا پھرا تھا نہ فصل کی بوائی کے لئے زمین تیار ہوئی تھی۔ رحیم داد کو اپنا گاؤں، احمد کوٹ یاد آ گیا۔ اور اُس کی یاد کے ساتھ ساتھ اپنے کھیت کھلیان یاد آ گئے۔ وہ اللہ وسایا کے ہمراہ چلتا رہا۔ دونوں خاموش تھے۔ صبح کی ہوا کے نرم نرم جھونکے خوش گوار تھے۔ اُن میں تازگی اور فرحت تھی۔

چلتے چلتے اللہ وسایا نے رحیم داد سے کہا "چوہدری! جب تک تیری طبیعت پوری طرح ٹھیک ٹھاک نہ ہو جائے، یہیں رہ۔ ویسے اپنا گھر سمجھ کر جب تک جی چاہے، ٹھیرا رہ۔ مہمان گھر میں ہو تو ذرا بہار رہتی ہے۔" اُس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"تیری مہربانی ہے۔" رحیم داد نے انکار نہیں کیا۔ "پر میں اس طرح کب تک یہاں پڑا رہ سکتا ہوں۔"

"چلا جانا، چلا جانا۔ ایسی بھی تجھے کیا جلدی ہے۔ ابھی تو تیری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہوئی۔"

دونوں حویلی کے سامنے کے وسیع میدان سے گزر رہے تھے۔ قریب ہی ایک نیم پختہ عمارت تھی۔ اُس کی دیواریں اینٹوں سے چُنی ہوئی تھیں۔ البتہ پختہ چھت کے بجائے چھپّر پڑا تھا۔

اندر سے بچوں کی ملی جُلی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔

رحیم داد نے اُس طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "لگتا ہے، یہ تو سکول ہے؟"

اللہ وسایا نے تائید میں گردن ہلائی۔ "ہاں جی! سکول ہی ہے۔"

"سرکاری سکول ہو گا؟"

"نہیں۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "سرکاری سکول تو یہاں سے دس میل اُدھر تاری والا میں ہے۔ یہ سکول تو جمیلہ نے کھولا ہے۔ خود بھی پڑھاتی ہے۔ دو ماسٹر بھی رکھ لیے ہیں۔ اب تو سکول کو چلتے لگ بھگ تین سال ہو گئے۔"

"اچھا تو تیری گھر والی پڑھی لکھی بھی ہے؟" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔

"بہت پڑھی لکھی ہے جی۔" اللہ وسایا نے بتایا "لہور میں پڑھتی تھی۔" وہ زیرِ لب مُسکرایا۔ جب اُس کے ساتھ میرا ویاہ ہوا تو میں بالکل ان پڑھ تھا۔ اُس نے سب سے پہلے تو مجھے پڑھنا لکھنا سکھایا۔ ویسے وہ تھوڑی بہت ڈاکٹری بھی کر لیتی ہے۔ تُو نے تو دیکھا ہی ہے۔"

"ہاں جی، بالکل دیکھا ہے۔ اُس رات وہ میری مرہم پٹّی نہ کرتی تو زخم سڑ جاتا۔ پتہ نہیں کیا ہوتا۔" رحیم داد نے اللہ وسایا کی تائید کی۔ "میں تو اُسے ڈاکٹرنی ہی سمجھا تھا۔ وہ سب کچھ ڈاکٹروں ہی کی طرح کر رہی تھی۔"

اللہ وسایا نے بتایا۔ "اب تو اُس پر پنڈ میں ڈسپنسری بنانے کی دُھن سوار ہے پر کوئی اچھا ڈاکٹر ہی نہیں ملتا۔ چھوٹا موٹا علاج تو وہ خود کر لیتی ہے۔ وہ حویلی میں ٹھیرتی ہی کب ہے۔ سکول سے بچّوں کو پڑھا کر نکلتی ہے تو مزارعوں کے گھروں میں گھس جاتی ہے۔ کمیّوں کے پاس بھی بے دھڑک چلی جاتی ہے۔ اُن کے ساتھ گھل مل کر گپ شپ کرتی ہے۔ منع کرتا ہوں تب بھی نہیں مانتی۔"

"ویسے تو جی یہ بُری گل نہیں۔" رحیم داد نے کہا۔ "پر تیرے جیسے وڈّے زمین داروں کی گھر والیاں اور زنانیاں ایسا کرتی نہیں۔ وہ تو حویلیوں اور ماڑیوں سے باہر ہی نہیں نکلتیں۔ ایسا کریں تو اُن کے کھصم طلاک کا کاغذ ہاتھ میں تھما دیں۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ زمین داروں نے ہی ہونا ہے۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "تبھی تو آس پاس کے وڈّے زمین دار جمیلہ سے ناراض ہیں۔ کہتے ہیں، اُس نے زمین داروں کی ساری لشک پشک اور عزّت خاک میں ملا دی۔ اُن کی پگ کے اُونچے طرّے نیچے کر دیئے۔" اُس کا لہجہ بوجھل ہو گیا۔ "کیا بتاؤں جی! سبھی مجھ سے خار کھاتے ہیں۔"

"وہ بھی ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ زمین دار میں اکڑ نہ ہو تو کام کیسے چلے۔" رحیم داد نے زمینداروں کی نفسیات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔ "مزارعے فصل سے کچھ بھی نہ دیں۔ اپنی راہکی کے ساتھ زمین دار کا حصّہ بھی دبا لیں۔ ویسے تیں نوں ایہہ تو پتہ ہی ہوگا کہ فصل کی واڈھی ہوتے ہی مزارع اُس میں سے چوری شروع کر دیتے ہیں۔ زمین دار اگر اُس کے کندے کڑی نظر نہ رکھیں اور چوری چکاری کرنے والے مزارعوں کو الٹا لٹکا کر ٹھکائی نہ کریں تو ساری فصل واڈھی سے پہلے ہی پہلے غائب ہو جائے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"پر اپنی زمین داری میں ایسا نہیں ہوتا۔" اللہ وسایا نے فخر سے گردن اُونچی کرتے ہوئے کہا۔ "ادھر نہ فصلوں کی چوری ہوتی ہے، نہ بانی کی۔ نہ بٹائی دینے میں مزارعے رولا کرتے ہیں۔" اُس نے قدرے توقف کیا۔ "جب پاکستان بنا تو شروع شروع میں میری زمین داری میں بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ تو جی عجب زمانہ تھا۔ مزارعے تو اُن دنوں زمین پر کبضہ کر کے بیٹھ گئے تھے۔ بٹائی دینے سے صاف انکار کرتے تھے۔ انہوں نے تو گنڈاسے اور ڈانگیں اٹھا کر حویلی پر ہلا بولنے کی بھی کوشش کی تھی۔"

"تو نے پولیس کو خبر نہ کی؟ پرچہ چاک کرایا ہوتا۔ پولیس سب کو الٹا لٹکا دیتی۔ حوالات میں بند کر کے چمڑی اُدھیڑ دیتی۔ سب بالکل ٹھیک ہو جاتے۔ پولیس کو ساتھ ملائے بغیر تو زمینداری چل ہی نہیں سکتی۔"

اللہ وسایا نے کہا۔ "پر مجھے پولیس بلانے کی ضرورت نہ پڑی۔ جمیلہ نے سب ٹھیک کر لیا۔" وہ بے تکلفی سے کھلکھلا کر ہنسا۔ "سچ پوچھ چوہدری، زمین داری تو وہی چلاتی ہے۔ نہ اُس نے منشی رکھا، نہ کاردار، نہ مینجر۔ خود ہی ساری لکھا پڑھی کرتی ہے۔ فصل کی بٹائی بھی

اپنے سامنے کراتی ہے۔ بٹائی کے لیے ونڈ لے بھی نہیں بلاتی۔ خود مزارع سے ونڈائی کراتی ہے۔ بٹائی کے بعد کمیّوں کے لیے انگنی کی صورت میں زیادہ سے زیادہ دانے کھلواڑے پر چھوڑ دیتی ہے۔ تبھی تو پنڈ کے سارے مزارعے اور کمیّ اُس سے بہت پیار کرتے ہیں۔ عزّت اور محبّت سے اُسے بھین جی کہتے ہیں۔" اُس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔" یہ لمّی، لمّی سفید داڑھی والے بھی اُسے بھین جی کہتے ہیں۔ جمیلہ بھی ذرا بُرا نہیں مناتی۔ بلکہ بہت خوش ہوتی ہے۔"

اللہ وسایا اور رحیم داد باتیں کرتے ہوئے اسکول کے نزدیک پہنچ گئے۔ رحیم داد نے کھلے ہوئے دروازے سے دیکھا۔ باقاعدہ کلاس لگی تھی۔ لکڑی کی بینچوں پر بچّے قطاروں میں بیٹھے تھے۔ جمیلہ بیٹھ موڑے بلیک بورڈ پر چاک سے کچھ لکھ رہی تھی۔ دونوں اندر نہیں گئے۔ حویلی کی جانب واپس ہوئے۔

دھوپ اب ہر طرف پھیل گئی تھی۔ گرمی بھی بڑھ گئی تھی۔ رحیم داد تھکا ہوا اور نڈھال نظر آرہا تھا۔ مگر دونوں مہمان خانے میں نہیں گئے۔ باغ میں چلے گئے۔ جامن کے ایک گھنے درخت کے نیچے چند کرسیاں پڑی تھیں۔ سامنے چھوٹی سی میز رکھی تھی۔ اللہ وسایا اور رحیم داد کرسیوں پر جاکر بیٹھ گئے۔ دھوپ میں چلنے سے پسینہ آگیا تھا۔ سائے میں بیٹھ کر پسینے پر ہوا کے جھونکے لگے تو تازگی اور فرحت محسوس ہوئی۔

رحیم داد نے شیشم کے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "اللہ وسایا! تیرے پنڈ میں ٹاہلی کے پیڑ کچھ زیادہ ہی ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟"

"جمیلہ نے خاص طور پر ٹاہلی کے پیڑ لگوائے ہیں۔ کہتی ہے جب سکول وڈّا ہوجائے گا اور ڈسپنسری بھی بن جائے گی تو ان میں ٹاہلی کا فرنیچر بنوا کر لگواؤں گی۔"

"اور حویلی کے لئے فرنیچر نہیں بنے گا؟ ٹاہلی کی لکڑی تو بہت کیمتی ہوتی ہے۔"

اللہ وسایا نے مسکرا کر جواب دیا۔ "چوہدری! اُس کی باتیں وہی جانتے۔ میں نے یہی گل کہی تو بولی، حویلی میں پہلے ہی بہت فرنیچر پڑا ہے۔ ہمیں اور زیادہ فرنیچر بنوا کر کیا لینا۔ چھوٹا سا تو اپنا ٹبّر ہے۔ ہم دونوں کے علاوہ صرف دو چھوٹے چھوٹے بچّے ہیں۔"

"تیرے ساتھ اور کوئی نہیں رہتا؟"

"نہیں جی، اپنا بس اتنا ہی ٹبّر ہے۔" اللہ وسایا نے بتایا۔

نوکروں نے ناشتے کا سامان میز پر رکھ دیا۔ ناشتے میں لسّی تھی، ساگ تھا۔ تلا ہوا مرغ تھا۔ پراٹھے تھے اور گرم گرم حلوہ تھا۔ رحیم داد نے مرغ اور پراٹھے نہیں کھائے۔ اُس نے پراٹھے کا ایک لقمہ بنا کر منہ میں رکھا، چبایا تو زخم میں کسک ہونے لگی۔ اُس نے لسّی کے گھونٹ پی کر لقمہ حلق سے نیچے اتارا۔

اللہ وسایا نے اُس کے چہرے پر کرب اور بے چینی کے اثرات دیکھ کر کہا "چوہدری! تو پرونٹھا نہ کھا، حلوہ کھا۔ یہ تیرے ہی لئے بنایا گیا ہے۔ میں ناشتے میں حلوہ نہیں کھاتا۔ عام طور پر شام کی چائے کے ساتھ حلوہ کھاتا ہوں۔"

ناشتے سے فارغ ہو کر اللہ وسایا کھڑا ہو گیا۔ "چوہدری! میں نے کچھ ضروری کام کرنا ہے۔ اب میں چلوں گا۔ تو یہیں بیٹھا رہ۔ دل بہلے گا۔ دھوپ بڑھ جائے تو اندر چلا جانا۔"

☆

ہوا کے نرم اور خنک جھونکے چل رہے تھے۔ رحیم داد نے میز پر دونوں ٹانگیں پھیلا دیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ ذرا دیر بعد وہ خرّاٹے بھرنے لگا۔

اُس کی آنکھ کھلی تو دھوپ کی تمازت بڑھ چکی تھی۔ مگر درختوں تلے بدستور ٹھنڈک تھی۔ ایک شخص گھاس پر اکڑوں بیٹھا ہولے ہولے رحیم داد کی پنڈلیاں دبا رہا تھا۔ وہ وضع قطع سے مزارع لگتا تھا۔ رحیم داد آنکھیں کھولے لمحے بھر تک حیرت سے اُسے تکتا رہا۔ پھر اُس نے پوچھا۔

"کون ہے تو؟"

وہ بولا۔ "میرا ناں ماجھا ہے جی۔"

"مزارع ہے یا حویلی کا نوکر ہے؟"

"میں تو جی پرلے پنڈ، پیراں والہ میں رہتا ہوں۔" اُس نے ایک طرف ہاتھ اُٹھا

کر کہا۔ ”یہاں سے چار پنج میل ہوگا۔“

رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”یہاں کس لئے آیا ہے؟“

”ایک کام تھا جی۔“ وہ عاجزی سے بولا۔ ”تیری بہت مہربانی ہوگی۔ میں تیرے پیر پکڑتا ہوں۔“ اُس نے پنڈلیاں چھوڑ کر رحیم داد کے پیر پکڑ لیے۔ رحیم داد نے پریشان ہو کر جھٹ اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں۔

”کیا کام ہے تیرا؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر استفسار کیا۔

”میرا بازو واپس دلوا دے۔“ وہ گڑگڑانے لگا۔

”میں کیسے واپس دلوا سکتا ہوں۔“ رحیم داد ہنوز حیرت زدہ تھا۔ ”تیری گھر والی کس کے پاس ہے؟“

وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ”وہ جی بہت وڈّا زمیں دار ہے۔ اُسے شاہ جی کہتے ہیں۔ اُس نے میری گھر والی کو اٹھوا کر اپنی حویلی میں رکھ چھوڑا ہے۔ پنج سال سے اوپر ہو گئے۔ سال بھر کا اُس سے ایک نکا بھی تھا۔ ماں کے لئے بلکتا ہوا مر گیا۔ زمیں دار سے بہت منّت سماجت کی۔ پیروں پر پگڑی رکھ دی پر وہ میری ایک نہیں سُنتا۔ تُو اپنے زمیں دار سے شاہ جی کے نام چِٹّھی لکھوا دے۔ اُس کی گل وہ ضرور مان لے گا۔“ ماجھا ہاتھ جوڑ کر بے بسی سے بولا۔ ”تین بچّے ہو چکے ہیں اُس کے۔ اب تو شاہ جی کے کام کی بھی نہیں رہی۔“

”اور تیرے کام کی کب رہ گئی۔“ رحیم داد نے تیکھے لہجے میں کہا۔

”کیوں نہیں رہی جی۔“ اُس نے بے جھجک کہا۔ ”وہ میرا بازو ہے۔ تجھے کیا پتہ، اُس کے جانے کے بعد میں تباہ ہو گیا۔ گھر میں بوڑھی ماں ہے۔ اُسے بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ تُو ذرا یہ تو سوچ۔ سویرے ڈھور ڈنگروں کا پٹّھا دتّھا کون کرے۔ روٹی پکا کر دوپہر کو کھیت میں مجھے بھتّا کون پہنچائے۔ چاٹی میں دُودھ بلو کر مکھّن کون نکالے۔“ اُس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”وہ کپڑے لتّے دھوتی تھی، صفائی اور جھاڑ پونچھ کرتی تھی۔ فیر یہ بھی تو ہے جی، خریف

کی فصل پہ وہ پھٹی چنتی۔ چوگی میں جو روئی ملتی، اُس کا چرخے پر سوت کاتتی تھی۔ چولھا جلانے کے لیے جھنگر سے لکڑیاں اور کماد کی کھوری چن کر لاتی تھی۔ اور جی۔۔۔"

رحیم داد نے اُکتا کر بیزاری سے کہا۔" یار! اب بس کر۔ کام کی گل کر۔"

"وہی تو کر رہا تھا جی۔" ماجھا نے سادگی سے کہا۔" اب یہی دیکھ، پچھلی برکھا میں آدھے سے زیادہ گھر ڈھے گیا۔ اپنا بازو ہوتا تو دونوں کب کے اسے ٹھیک ٹھاک کر چکے ہوتے۔" اُس نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑ کر کہا۔" میرا یہ کام کر دے۔ جنم جنم تجھے دعائیں دوں گا۔ تیری بہت مہربانی ہوگی۔"

" ایسا کیوں نہیں کرتا، دوسرا دیاہ کر لے۔ نیا اور زیادہ اچھا بازو مل جائے گا۔" رحیم داد نے مُسکرا کر مشورہ دیا۔

"حد کر دی تُو نے۔" ماجھا منہ بگاڑ کر بولا۔"دیاہ کرنا کوئی مخول ہے۔ پہلے جب دیاہ کیا تھا، نو سو اُدھار لیا تھا۔ اب تک وہی نہیں چُکا سکا۔ ہاں، اپنا بازو ہوتا تو کب کا ادا ہو جاتا۔"

"میں آج یا کل سویرے زمیں دار سے بات کروں گا۔" رحیم داد نے ٹالنے کی غرض سے وعدہ کیا۔

"بس، تُو مجھے اُس سے چٹھی لکھوا دے، میرا کام بن جائے گا۔" اُس نے اصرار کیا۔" تیری مہربانی ہوگی۔"

"کہہ تو دیا تجھ سے۔" رحیم داد اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ مہمان خانے کی جانب بڑھا۔ ماجھا اُس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے گھگھیا کر بولا۔" تو جی، میں سمجھ لوں، میرا کام بن جائے گا؟ کب آؤں تیرے پاس؟"

"چار روز بعد آنا۔" رحیم داد نے اُس کی جانب دیکھے بغیر بے نیازی سے کہا۔

ماجھا مستعدی سے بولا۔" آجاؤں گا جی، بالکل آجاؤں گا۔"

رحیم داد چُپ چاپ آگے بڑھتا ہوا مہمان خانے میں داخل ہو گیا۔ اُس نے پلٹ کر ماجھا کو دیکھا بھی نہیں۔ اُسے ماجھا اور اُس کے بازو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اُس نے راجو کو حاجی کی قید سے آزاد کرانے میں نور دین کی صرف اس لیے مدد کی تھی کہ اُس وقت اُسے نور دین

کی ہمدردی حاصل کرنا تھی۔ ماجھا کی ہمدردی کی اُسے کیا ضرورت تھی۔ خود اُس کے بازو نوراں کو جمال دین لے اُڑا تھا۔ وہ اُسے نہ واپس لا سکتا تھا نہ ماجھا کی طرح کسی سے فریاد کر سکتا تھا۔

رحیم داد کا دل بوجھل ہو گیا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے کمرے میں گیا اور خاموشی سے بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ مضمحل اور دل گرفتہ تھا۔ اپنی بے مصرف زندگی پر دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا۔ وہ پر کٹا کبوتر بن گیا تھا، جو نہ اُڑ سکتا تھا، نہ کہیں جا سکتا تھا۔ بیکار دن تھے اور بیکار راتیں۔ وقت زخمی چھپکلی کے مانند آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ حویلی پر سناٹا چھایا تھا۔ مہمان خانہ سُنسان تھا۔

دوپہر ہونے سے کچھ دیر پہلے جمیلہ کمرے میں داخل ہوئی۔ رحیم داد کو ایسا محسوس ہوا جیسے کمرہ اچانک روشن ہو گیا، فضا میں رنگ بکھر گیا اور خوشبو بس گئی۔ جمیلہ گہرا بسنتی لباس پہنے ہوئے تھی۔ اُس کا حُسن اور نکھر گیا تھا۔ گلابی چہرے پر شگفتگی اور رعنائی تھی۔ ہونٹوں پر ہلکا ہلکا تبسّم تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں نئے سلے ہوئے کپڑے تھے اور دوسرے میں سُرخ گلاب کا گُلدستہ تھا۔ رحیم داد اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

جمیلہ نے مُسکرا کر پوچھا۔ ”اب تیری طبیعت کیسی ہے چوہدری؟“

”ٹھیک ہی ہے جی۔“ رحیم داد نے جواب دیا۔ ”میں تو سویرے ٹہلتا ہوا تیرے سکول کی طرف بھی گیا تھا۔“

”تُو نے سکول دیکھا؟“ جمیلہ کا چہرہ اور شگفتہ ہو گیا۔ ”ابھی تو چھوٹا سا سکول ہے میں اسے بہت وڈّا بناؤں گی۔ اُس میں آس پاس کی بستیوں کے بچّوں اور بچیوں کو بھی پڑھانے کا انتظام ہو گا۔ بچّوں کا الگ اور بچّیوں کا الگ۔“ وہ زیرِ لب تبسّم کے ساتھ بتاتی رہی۔ ”میں نے تو دوا علاج کے لئے ڈسپنسری اور مہلاؤں کے لئے زچّہ گھر بنانے کی سکیم بھی تیاّر کر رکھی ہے۔ وہ بھی بن جائیں گے جی! کام کرنے کے لیے من میں لگن اور شکتی بھی ہونی چاہیئے۔“

”پیسہ بھی تو چاہیئے۔“ رحیم داد ہنس کر بولا۔

”ہونا تو چاہیئے۔“ وہ بدستور مُسکراتی رہی۔ ”پر خالی پیسے سے کچھ نہیں بنتا۔“

جمیلہ نے کپڑے میز پر رکھ دیے۔ گُل دستہ رحیم داد کو دیا۔ بے تکلفی سے بولی۔ "چوہدری! اپنے باغ میں گلاب کے بہت سے بوٹے ہیں۔ گوجرانوالہ سے منگوا کر لگائے ہیں۔ دیکھ کتنے سُندر پھُول ہیں۔ تھوڑے ہی سمے پہلے میں نے انہیں توڑ کر تیرے لئے گل دستہ بنایا تھا۔"

رحیم داد کا چہرہ خوشی سے کھل اُٹھا۔ پھُول سونگھ کر بولا۔ "خوشبو بھی بہت اچھی ہے۔ سونگھو تو لہر آتی ہے۔"

جمیلہ نے کپڑے اُٹھا کر رحیم داد کو دکھائے۔ "چوہدری! تیرے لئے میں یہ کپڑے بھی لائی ہوں۔ تیرے اپنے کپڑے تو بہت گندے ہو گئے ہیں۔ کل دوپہر تک ڈاکٹر آئے گا۔ اُس نے اجازت دی تو نہا کر کپڑے بدل لینا۔ دو جوڑے ہیں۔ ایک تو ابھی بدل لے۔"

رحیم داد نے کپڑے دیکھے۔ دو قمیصیں، دو شلواریں اور دو دھوتیاں تھیں۔ خوش ہو کر بولا۔ "کپڑے تو بہت اچھے ہیں زمیں دارنی! تو نے اتنی تکلیف کیوں کی۔"

"لے، اس میں تکلیف کی کون سی گل ہے۔" جمیلہ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ کپڑے میز پر رکھ دیے اور معذرت کے انداز میں بولی۔ "اللہ وسایا کی گھوڑی سے تجھے جو چوٹ لگی ہے چوہدری سچ مان، ہم دونوں کو اس کا بہت دُکھ ہے۔" اُس کا لہجہ قدرے دل گرفتہ ہو گیا۔ "اور تُو تو ویسے بھی بہت دکھیارا ہے۔ گھر بار، بال بچے، سب کچھ لٹا کر آیا ہے۔" اُس کا شگفتہ چہرہ مرجھا گیا۔ رُخساروں کی دھوپ پر بدلی چھا گئی۔

رحیم داد نے جمیلہ کے چہرے پر افسردگی دیکھی تو اُسے تسلی دینے کے لئے فوراً کہا۔ "وہ تو جی گھوڑی چمک کر بے کابو ہو گئی تھی۔ زمیں دار کی اس میں کون سی غلطی تھی۔ وہ تو جی ہونے والی گل تھی، ہو کے رہی۔"

جمیلہ بولی۔ "چوہدری! میں تیرے لیے روٹی کے ساتھ دُودھ بھجوا دُوں گی۔ تُو روٹی دُودھ میں بھگو کر کھا لینا پر دُودھ زیادہ پینا۔ خون بھی تو کتنا نکل گیا۔ گھاؤ گہرا لگا تھا۔ ابھی روٹی چبانے میں تجھے تکلیف ہوتی ہوگی۔ ڈاکٹر نے چاول کھانے سے منع کیا ورنہ چاول کی کھچڑی تیرے لئے ٹھیک رہتی۔" وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "چنتا نہ کر چوہدری! جلدی ہی تُو

سب کچھ کھانے پینے لگے گا۔" وہ دروازے کی جانب مُڑی۔" اچھا، اب میں تو ں جاتا ہے۔ روٹی کھاتی ہے۔ سکول سے سیدھی تیرے پاس آگئی تھی۔"

جمیلہ چلی گئی۔ رحیم داد کو ایسا محسوس ہوا کہ کھڑکیوں سے جھانکتی ہوئی دھوپ دھندلی پڑ گئی۔ کمرہ سنسان ہو گیا۔ وہ خاموش لیٹا رہا۔ دوپہر ہو گئی۔ احمد نے کھانا لا کر رکھا۔ کھانے میں دُودھ اور نرم نرم تنوری پراٹھے تھے۔ رحیم داد نے جمیلہ کی ہدایت کے مطابق پراٹھے دُودھ میں بھگو کر کھائے۔

☆

باہر تیز دُھوپ پھیلی تھی۔ ہوا بھی گرم تھی۔ رحیم داد کمرے میں لیٹا رہا۔ شام ہو گئی۔ احمد نے کرسی باہر صحن میں ڈال دی۔ رحیم داد کی بے چین نگاہیں بار بار اُس دروازے کی جانب اُٹھ جاتیں جو حویلی میں کھلتا تھا۔ اُسے جمیلہ کا انتظار تھا، جس کا مسکراتا ہوا شگفتہ چہرہ دیکھ کر وہ خود بھی شگفتہ ہو جاتا تھا۔ اندھیرا بڑھتا گیا۔ رات ہو گئی مگر جمیلہ نہیں آئی۔ اللہ دوسایا بھی نہیں آیا۔ وہ صبح آیا۔ رحیم داد کو اپنے ہمراہ باغ میں لے گیا۔ دونوں آم کے درختوں کے ایک کنج میں پڑی ہوئی کُرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ دُھوپ ابھی بہت ہلکی تھی۔ ہوا کے نرم جھونکے چل رہے تھے۔ فضا خوش گوار تھی۔ نوکروں نے ناشتہ لگا دیا۔

رحیم داد نے لسّی کا گھونٹ بھرتے ہوئے ماجھا کا ذکر چھیڑ دیا۔ "کل جی، دُور کے پنڈ کا ایک مزارع آیا تھا۔ ماجھا نام بتاتا تھا۔ بہت پریشان نظر آتا تھا۔ اُس کا ایک کام ہے تجھ سے۔"

"کیا کام ہے اُس کا؟" اللہ دوسایا نے دریافت کیا۔

"اُس کی گھر والی کو زمیں دار نے اُٹھوا کر اپنی حویلی میں رکھ لیا ہے۔" رحیم داد نے بتایا۔ "وہ اپنا بازو واپس لینے کے لیے بہت بے چین اور پریشان ہے۔"

اللہ دوسایا نے بے نیازی سے کہا۔ "چوہدری! تو کس چکّر میں پڑ گیا۔ وہ کوئی وڈّا ہی

زمیں دار ہوگا اور ایسے زمیں داروں کو دوسرے کے ڈھور ڈنگر چوری کروا کے اِدھر سے اُدھر کرنے اور مزارعوں اور کمیوں کی جوان گھر والیوں اور کُڑیوں کو اُٹھوا کر اپنی رکھیل بنانے کا چسکا ہے۔ پوچھو تو کہیں گے ایسا کیے بنا زمیں داری نہیں چل سکتی۔ مزارعوں اور کمیوں پر زمیں داروں کا رُعب اور دبدبہ نہیں بیٹھ سکتا۔ ایسا نہ کیا جائے تو وہ سر اونچا کر کے چلیں گے۔ بدمعاشی اور سرکشی کریں گے۔" اُس نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا، لہجہ کسی قدر تیکھا ہو گیا۔ "چوہدری! تُو کس کس کا بازو واپس دلوائے گا۔ میرا کہا مان، اس چکر میں نہ پڑ۔"

"پر ماجھا بہت دُکھیارا ہے۔" رحیم داد نے لہجے میں رقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سفارش کی۔ "پنج سال سے اُس کی گھر والی زمیں دار کی حویلی میں کید ہے۔ تین بچے اُس سے پیدا کرا چکا ہے تب بھی نہیں چھوڑتا۔ ادھر ماجھے کا حال یہ ہے کہ گھر میں صرف بوڑھی ماں ہے۔ پچھلی برکھا میں اُس کا مکان بھی ڈھے گیا۔ بے چارا پیر پکڑ کر روتا تھا، گڑ گڑاتا تھا۔ تُو اس کے زمیں دار کے نام چٹھی لکھ دے، میرے کہنے سے لکھ دے۔ ماجھے کا کام بن جائے گا۔"

"زمیں دار کون ہے؟" اللہ وسایا نے رحیم داد کی سفارش سے متاثر ہو کر نیم رضامندی ظاہر کی۔ "اُس کا کچھ اتا پتہ ماجھے نے بتایا تھا؟"

"اُدھر اتر میں اُس کا پنڈ ہے۔ پیراں والہ نام ہے۔" رحیم داد نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ "زمیں دار کوم کا سید ہے۔ شاہ جی کہلاتا ہے۔ اُس کا پورا نام مجھے ملوم نہیں۔"

"ضرورت بھی نہیں۔ میں سمجھ گیا، وہ کون ہے۔" اللہ وسایا بولا۔ "اُس کا نام احسان شاہ ہے ادھر کا بہت وڈا زمیں دار ہے، بلکہ اچھا وڈا جگیر دار ہے۔ اُس کی حویلی نہیں، بہت وڈا کوٹ ہے۔ ایسی اُونچی اُونچی دیواریں ہیں کہ پرانے زمانے کے کسی کلعے کی فصیلیں لگتی ہیں۔ ان فصیلوں کے پیچھے بہت سی کوٹھریاں ہیں۔ ہر زنانی کو اُٹھوانے کے بعد اُنہی کوٹھریوں میں سے کسی میں رکھا جاتا ہے۔ کوٹ کے دروازے پر مسلح راکھے دن رات پہرا دیتے ہیں۔ کوئی زنانی دروازے تک نہیں پہنچ سکتی۔ باہر نکلنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"اتنی زنانیاں اُٹھوا کر اُس نے کیوں رکھ چھوڑی ہیں؟"

"رات کو نشے میں ڈون ہو کر شاہ جی کوٹھڑیوں کے معائنے پر نکلتا ہے۔" اللہ وسایا نے بتایا۔" جس زنانی پر طبیعت آجاتی ہے، اُسے اپنے کمرے میں بلوا لیتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایک رات میں کئی کئی بلوا لیتا ہے۔ دلّی کے دو حکیم اُس نے نوکر رکھ چھوڑے ہیں۔ وہ اُسے تکڑا جوان رکھنے کے لیے نئے نئے کشتے- اور معجون بناتے ہیں۔ شاہ جی ادھکڑ ہو چکا ہے پر مونچھوں اور سر کے بالوں پر خضاب لگا کر جوان گبھرو کی طرح گھوڑی پر اکڑ کر بیٹھتا ہے۔"

رحیم داد بولا۔" وہ جیسا بھی ہے، ہم نے اُس سے کیا لینا۔ تُو صرف اُس کے نام چٹھی لکھ دے۔ ماجھا یہی چاہتا ہے۔ کہتا تھا، تیری چٹھی سے اُس کا کام بن جائے گا۔"

"بننے کی بجائے اور بگڑ جائے گا۔" اللہ وسایا نے سنجیدگی سے کہا۔" میری چٹھی دیکھ کر تو وہ اتنا ناراض ہو جائے گا کہ ماجھے کو ہرگز اُس کی گھر والی واپس نہیں کرے گا۔"

"تیری گل اپنی سمجھ میں نہیں آئی۔" رحیم داد نے حیرت سے کہا۔

"گل ایہہ ہے جی۔ میری اُس کے ساتھ لگتی ہے۔" اللہ وسایا نے بتایا۔" وہ مجھ سے سخت خار کھاتا ہے۔ میرے خلاف اُوپر طرح طرح کی شکائتیں پہنچاتا ہے۔ کتنی بار اُس نے میرے چوکھر اُٹھوا لیے۔ کھڑی فصلیں جلوا دیں۔ جھوٹے کیس بنوائے۔ چوہدری، تُو نہیں جانتا، وہ کتنا بُرا اور خطرناک بندہ ہے۔"

"مطلب یہ ہوا کہ ماجھے کے لیے تُو کچھ نہیں کر سکتا۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تو بتا، میں کیا کر سکتا ہوں۔ اللہ وسایا نے رحیم داد کو سمجھانے کی کوشش کی۔" شاہ جی کی حویلی میں اُس کی مرضی کے بنا کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ چاروں طرف مسلح پہرا رہتا ہے۔ پولیس اور حکومت بھی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ سارے ہی وڈے افسروں سے اُس کی یاری دوستی ہے۔ ایم ایل اے، ایم سی اے اور وزیر اُس کی حویلی میں آکر ٹھہرتے ہیں۔ وہ انہیں ولایتی شرابیں پلاتا ہے۔ جوان اور موہنی مٹیاریں پیش کرتا ہے۔" اللہ وسایا زیرِ لب مسکرایا۔" وہ شاہ جی کی مدد کرتے ہیں۔ شاہ جی وکت پڑنے پر اُن کی مدد کرتا ہے۔ وہ اس کی سفارشوں پر کام کر دیتے ہیں۔ شاہ جی اُن کے لیے اوپر سفارشیں پہنچاتا ہے۔ تبھی تو تھانے دار، تحصیل دار اور

دوسرے افسر اُس کی مرضی کے لگائے جاتے ہیں۔ ذرا اُس کے خلاف کوئی کام کریں، چھیتی اُن کا تبادلہ کرا دیتا ہے۔"

"پر جی، یہ تو اندھیر گردی ہے۔"

"ہے تو۔" اللہ وسایا نے کہا۔ "پر ایک احسان شاہ کیا، سارے ہی وڈّے زمیں دار اور جگیر دار یہی کرتے ہیں۔ اس دوڑ میں کوئی بہت آگے ہے، کوئی ذرا پیچھے ہے۔ کوئی کشتے اور انجیکشن آزمانے کے لئے مزارعوں اور کمیّوں کی گھر والیاں اور کُڑیاں اٹھواتا ہے، کوئی انہیں صرف ڈرانے اور دھمکانے کے لئے ایسا کرتا ہے۔ چوہدری تو یہ باتیں نہیں سمجھ سکتا۔ مزارع یا کمّی کی گھر والی کا جوان اور خوبصورت ہونا، اُس کی بدنصیبی بھی ہوتی ہے۔ وہ ایسے وڈّے زمیں داروں کے چنگل سے نہیں بچ سکتی۔"

"تو بھی تو وڈّا زمیں دار ہے پر تیری حویلی میں تو مجھے ایسا کوئی چکّر نظر نہیں آیا۔"

"میری گل چھوڑ۔" اللہ وسایا مُسکرایا۔ "میں کب زمیں داری کرتا ہوں، زمیں داری تو جمیلہ کرتی ہے۔" بات کہتے کہتے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چہرے سے تشویش جھلکنے لگی۔

رحیم داد نے پوچھا۔ "تو کس فکر میں پڑ گیا؟"

اللہ وسایا نے جھجکتے ہوئے بتایا۔ "چوہدری! سچ پوچھ تو مجھے جمیلہ کی طرف سے بھی دھڑکا لگا رہتا ہے۔ منع بھی کرتا ہوں پر وہ نہیں مانتی۔ دن ہو یا رات، پنڈ میں اِدھر اُدھر گھومتی پھرتی ہے۔ ذرا پروا نہیں کرتی۔ ڈرتا ہوں، کوئی وڈّا زمیں دار اُسے بھی نہ اٹھوالے۔ ویسے ہی سب مجھ سے خار کھاتے ہیں حالانکہ سچّی گل ایہہ ہے۔ چوہدری وہ مجھ سے سال دو سال ہی چھوٹی ہوگی۔ ۳۰ سال سے کم نہیں۔ کچھ اوپر ہی اُس کی عمر ہوگی۔ دو بچّے بھی ہو چکے ہیں۔"

"پر تیری گھر والی اتنی لگتی نہیں، جتنی تو اُس کی عمر بتا رہا ہے۔"

"بات یہ ہے جی! وہ سخت محنتی اور ماہری ہے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہے۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "ادھر وڈّے زمیں داروں کی گھر والیوں کا حال یہ ہے کہ حویلیوں اور بنگلوں

میں بند رہتی ہیں۔ بھر بھر گلاس دُودھ اور لسّی چڑھاتی ہیں۔ دبا کے گھی اور مکھن کھاتی ہیں۔ کچھ کرنا دھرنا تو اُنہیں ہوتا نہیں۔ کام کاج کے لیے نوکرانیوں کی پوری بٹالین ہوتی ہے۔ اُن کا کام تو مینجیاں توڑنا اور کھٹا کھٹ بچے جننا ہوتا ہے۔ اس طرح چند ہی سال میں پھیل کر نیلی بار کی مجھ بن جاتی ہیں۔" وہ شوخی سے ہنسا۔ "مجھ تو جی! مجھ ہی ہوتی ہے۔ سو وڈّے زمیں دار کچھ ہی مدّت بعد اپنی گھر والیوں کو مجھ سمجھ کر حویلی کے کسی ڈھارے شارڈھے میں ڈال دیتے ہیں۔ اور دوسروں کی جوان اور سوہنی گھر والیوں کو اڑانے کی تاک میں رہتے ہیں۔ مزارعوں اور کمیّوں کی گھر والیاں تو اس طرح اُٹھوا لیتے ہیں جیسے تیز کتّا منہ میں دبا کر لے جاتا ہے۔"

اللہ دسایا کو کچھ یاد آ گیا۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "چوہدری! میں نوں اب جانا ہے۔ شام کو تیرے پاس آؤں گا۔"

اللہ دسایا چلا گیا۔ رحیم داد باغ میں دیر تک بیٹھا رہا۔ جب دُھوپ تیز ہو گئی اور درختوں کے پتّوں سے چھن چھن کر اُس پر بھی پڑنے لگی تو وہ بھی اُٹھ کر مہمان خانے میں چلا گیا۔ دوپہر کو ڈاکٹر خان آیا۔ اُس کے ساتھ جمیلہ بھی تھی۔ ڈاکٹر نے اسٹکنگ پلاسٹر اور روئی ہٹا کر زخم دیکھا۔ زخم اب بھر گیا تھا۔ ڈاکٹر نے رحیم داد کے بازو میں انجیکشن لگایا اور ایک شیشی میں مرہم دے کر بولا۔ "اسے صبح شام لگاتے رہنا۔ اب پٹّی شٹّی کی ضرورت نہیں پر زخم پر مکھّی نہ بیٹھنے پائے۔ ویسے تو یہ صاف ستھری جگہ ہے پر احتیاط کرنا بہت ضروری ہے۔" ڈاکٹر نے اُسے غُسل کرنے کی بھی اجازت دے دی۔ ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی کہ وہ گرم پانی سے نہائے اور زخم پر مرہم لگانے سے پہلے نہا لے۔

ڈاکٹر چلا گیا۔ جمیلہ بھی اُس کے ساتھ چلی گئی۔ رحیم داد نے نائی کو بلوایا۔ حجامت بنوائی اور مہمان خانے کے غُسل خانے میں گرم پانی سے دیر تک صابن مَل مَل کر نہاتا رہا۔ غُسل سے فارغ ہو کر اُس نے اُجلے کپڑے پہنے، بالوں میں کنگھی کی اور زخم پر مرہم لگایا۔

دوپہر کو کھانا کھایا مگر بستر پر آرام کرنے کے بجائے اُس نے کمرے کا دروازہ بند کیا۔ اندر سے کنڈی لگائی۔ کلیم کے کاغذات کا بستہ کھولا، سادہ کاغذ نکالا اور اس پر مقتول چوہدری

نورالٰہی کے جعلی دستخط بنانے کی پوری توجّہ سے مشق کرنے لگا۔

دن ڈھلے تک وہ مسلسل مشق کرتا رہا۔ جب کمرے میں روشنی دھندلی پڑ گئی تو اُس نے کاغذ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور کمرے سے نکلا۔ احمد مہمان خانے میں نہیں تھا۔ رحیم داد نے کاغذ کے ٹکڑے ایک کونے میں ڈال کر ماچس سے آگ لگادی اور اُن کی راکھ مٹّی میں ملا دی۔

☆

دُھوپ گھروں کے منڈیروں پر پہنچ چکی تھی۔ سائے طویل ہو کر دُور دُور تک پھیل گئے تھے۔ رحیم داد مہمان خانے سے نکل کر باغ میں پہنچا۔ جمیلہ پہلے سے وہاں موجود تھی۔ وہ گلاب کے پودوں کے تختے کے پاس کرسی پر بیٹھی تھی۔ قریب ہی اُس کے دونوں بچّے کھیل رہے تھے۔ ایک بیٹا اور دوسری بیٹی۔ بیٹا پانچ سال کے لگ بھگ تھا۔ بیٹی اُس سے سال سوا سال چھوٹی تھی۔ دونوں بچّے تن درست اور خوب صورت تھے۔ پھولوں کے مانند شگفتہ اور تر و تازہ۔ جمیلہ گردن جھکائے ایک بوڑھے کے پیر کے زخم پر دوا لگا کر پٹّی باندھ رہی تھی۔ آہٹ سن کر جمیلہ نے گردن کو ہلکا سا خم دیا، رحیم داد کو دیکھا، مُسکرا کر بولی۔ "آ چوہدری! اِدھر بیٹھ جا" اُس نے ایک کُرسی کی طرف اشارہ کیا۔ رحیم داد خاموشی سے کُرسی پر بیٹھ گیا۔

جمیلہ نے زخم پر اچھی طرح پٹّی باندھ کر بوڑھے سے کہا "چاچا! جب تک چوٹ اچھی نہ ہو جائے، منجی پر پڑا رہ۔ دو تین روز میں چنگا ہو جائے گا۔" بوڑھا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جمیلہ نے اُسے ٹوکا۔ "یہ تو بتا، تیری گھر والی کا کیا حال چال ہے؟"

"بھین جی! اُس کا بُکھار نہیں جاتا۔ ہر تیسرے روز اُسے زور سے تاپ چڑھ جاتا ہے۔ جانے کیسا بُکھار ہے، جاتا ہی نہیں۔" بوڑھے نے تشویش کا اظہار کیا۔

"اُسے ملیریا ہے۔ میں رات کو اُس کے لیے دوائی لے کر تیرے گھر آؤں گی۔ چنتا نہ کر، اُس کا بخار جاتا رہے گا،" جمیلہ نے اُسے تسلّی دی۔ "دُعا کر اپنی ڈسپنسری بن جائے تو سارے پنڈ کا دوا دارو یہیں ہو گا۔ علاج کے لیے دیپال پور یا پاک پتن نہیں جانا پڑے گا۔"

بوڑھا اُسے دُعائیں دیتا چلا گیا۔

جمیلہ کے سامنے گھاس پر تین عورتیں بھی بیٹھی تھیں۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک عورت سے پوچھا "بشیراں! زمیں دار کدھر ہے؟ حویلی میں تو ہے نہیں۔"

بشیراں نے جواب دیا۔ "وہ تو جی نہر کی طرف گیا ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے۔"

جمیلہ کُرسی سے اُتر کر عورتوں کے ساتھ گھاس پر بیٹھ گئی، مُسکرا کر بولی "یہ وہ اس طرح بیٹھنے پر بُرا مناتا ہے، زمیں دار جو ٹھیرا۔" وہ ایک اور عورت کی جانب متوجہ ہوئی۔ "تُو کیسے آئی بھاتاں! ٹھیک ٹھاک تو ہے؟"

"ٹھیک ٹھاک ہی ہوں جی۔" بھاتاں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "جٹیاں فصل کی واڈھی کی آس لگاتی ہیں۔ واڈھی ہو تو اُن کا ویاہ ہو۔ اپنی تو نہ زمین ہے، نہ فصل۔ گھر والا بھی نہ رہا۔ دھی جوان ہو گئی۔ اُس کا ویاہ کیسے کروں۔ بے ساکھی کے بعد پنڈ کی کئی جٹیوں کا ویاہ ہو رہا ہے۔" اُس کا چہرہ سوگوار ہو گیا۔ "مجھے تو کوئی اُدھار بھی نہیں دے گا۔ میں کیا کروں بھین جی؟"

"تُو اپنی تاجاں کی گل کر رہی ہے؟" جمیلہ نے مُسکرا کر دریافت کیا۔ "تُو نے اُس کے لیے ور بھی ڈھونڈا؟"

"ور تو کب کا دیکھ بھال لیا، پرایا نہیں، اپنی ہی برادری کا ہے۔ سکّے ویر کا پُت ہے۔ اس کے گھر والے تو بالکل تیار ہیں۔ تاجاں اُنہیں پسند بھی ہے پر اپنے پاس تو کچھ بھی نہیں۔"

"چنتا نہ کر بھاتاں!" جمیلہ نے چہک کر کہا۔ "تاجاں اپنے پنڈ کی دھی ہے، میری دھی ہے۔ میں اُس کی سگائی کروں گی۔ یہیں حویلی سے اُس کا ویاہ ہو گا۔ تُو اپنے بھرجائی سے کہہ دے کہ وہ تیاری کرے۔"

"بھین جی! میری دھی بھی جوان ہو گئی۔" بشیراں نے جھٹ اپنا مسئلہ پیش کر دیا۔ "مجھے کچھ اور نہیں چاہیئے، اُدھار مل جاتا تو میں ویاہ کر کے اُسے اُس کے گھر بار کا کر دیتی۔"

"تو گلّو کی گل کر رہی ہے؟" جمیلہ نے حیرت سے پوچھا۔ "ارے وہ تو ذرا سی چھوکری

ہے۔ تو اُس کی سگائی کرنا چاہتی ہے۔ حد کر دی تو نے۔"

"بیٹی کا بوجھ جتنی جلدی سر سے اُتر جائے، اتنا ہی اچھا ہے جی۔" بشیراں نے اپنی دلیل کا سہارا لیا۔

"اس پرکار نہ سوچ، ابھی تو وہ بہت ترمل ہے۔ مشکل سے باراں برس کی ہوگی۔" جمیلہ بولی۔ "اُسے کچھ دن تو کھیل کود لینے دے۔ جوان ہو جائے تو ویاہ کرنا۔ کم سے کم چار سال بعد اس کام کے لئے میرے پاس آنا۔ میں تیری ضرور سہائیتا کروں گی۔"

جمیلہ نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ دُور سے اللہ دوسایا آتا نظر آیا۔ جمیلہ اُٹھ کر جھٹ کرُسی پر بیٹھ گئی۔ تینوں عورتیں چلی گئیں۔ اللہ دوسایا تھکا ہوا ایک کرُسی پہ آ کر بیٹھ گیا۔ وہ نڈھال اور بُجھا بُجھا نظر آ رہا تھا۔

جمیلہ نے تشویش سے دریافت کیا۔ "کیا بات ہے۔ اللہ دوسایا! تو کچھ پریشان اور نراش نظر آ رہا ہے؟"

"پریشانی کی گل ہی ہے۔" وہ ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔ "پڑ میں گاھی ہوئی کنک پڑی ہے۔ دُھڑ کو پچھوڑنے اور پھٹکنے کے لئے مُصلّی نہیں مل رہے ہیں۔" اُس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ "بارش یا آندھی آجائے تو سب کچھ برباد ہو جائے گا۔"

آسمان پہ بادلوں کا ہلکا ہلکا غبار چھایا ہوا تھا۔ ہوا میں بھی قدرے تیکھا پن تھا۔ جمیلہ نے بھی آسمان کو دیکھا۔ وہ بھی متفکّر نظر آنے لگی۔ "چنتا کرنے کی تو گل ہے پر تو نے کیا اُپائے سوچا؟" اُس نے بیٹے کو گود میں بٹھا لیا اور اُس کے بالوں میں انگلیوں سے آہستہ آہستہ کنگھی کرنے لگی۔

"پرسوں سویرے سے پہلے مصلّی نہیں آسکتے۔" اللہ دوسایا نے بتایا۔ "آج کی رات اور کل کے دن رات ٹھیک سے گزر جائیں تو سمجھو کام بن گیا۔"

"میں کہتی ہوں، مزارع اور زمیں دار یہ کام کیوں نہیں کر سکتے؟"

"نہیں جی! وہ ایسا نیچ کام کیسے کر سکتے ہیں۔" رحیم داد بیچ میں بول پڑا۔ "ایسا کام تو مصلّی اور کمّی ہی کر سکتے ہیں۔"

جمیلہ بولی۔" اور جو ریکھا آجائے، آندھی آجائے؟" اُس کا لہجہ تیکھا اور تلخ تھا۔

رحیم داد نے ناصحانہ انداز میں کہا۔" یہ تو رب کی مرضی ہے، اُس کی مرضی میں کون دخل دے سکتا ہے۔"

"چوہدری یہ باتیں جمیلے نہیں سمجھتی۔" اللہ دسایا نے رحیم داد کی تائید کرتے ہوئے کہا۔"شہر میں برسوں رہ چکی ہے نا، پڑھ لکھ بھی بہت گئی ہے۔ اسے کیا پتہ، زمیں داری کیا ہوتی ہے۔" وہ بازو سے لگی ہوئی بیٹی کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرنے لگا۔

"پر میں تو گڈّو کو پہلے ڈاکٹر بناؤں گی۔" اُس نے بیٹے کو سینے سے چمٹا کر پوچھا۔"گڈّو! تو ڈاکٹر بنے گا نا؟"

گڈّو نے نظریں اُٹھا کر ماں کو دیکھا اور اپنا گول مٹول سر آہستہ آہستہ ہلایا۔

جمیلہ نے بیٹی کو دیکھا، ہنس کر بولی۔" ڈاکٹرنی تو نینا بھی بنے گی۔ دونوں مل کر میری ڈسپنسری کو بہت وڈّا اسپتال بنا دیں گے۔ اپنے ہی پنڈ کا نہیں، دُور دُور کے پنڈ والوں کا علاج کرینگے۔"

"جمیلے! تُو سفنہ تو نہیں دیکھ رہی؟" اللہ دسایا ہنسنے لگا۔"تیری ڈسپنسری بنی بھی نہیں اور تُو نے خواب دیکھنے شروع کر دیئے ابھی سے۔"

"منش پہلے سپنے ہی دیکھتا ہے۔" جمیلہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔" من میں لگن ہو تو سپنا ایک روز سچ بن کر سامنے آجاتا ہے۔ سدا ایسا ہی ہوتا ہے۔"

شام دھیرے دھیرے باغ میں تاریکی کے ڈیرے ڈال رہی تھی۔ اللہ دسایا نے اُٹھتے ہوئے جمیلہ سے کہا۔" اندھیرا پھیل رہا ہے، کب تک یہاں بیٹھنے کا ارادہ ہے؟" جمیلہ بھی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

رحیم داد آہستہ آہستہ چلتا ہوا مہمان خانے میں چلا گیا۔ اللہ دسایا اور جمیلہ حویلی کی سمت بڑھے۔ دونوں گردن اُٹھا کر بار بار آسمان پر چھایا ہوا غبار دیکھتے تھے۔ وہ بارش اور طوفان کے خطرے سے فکرمند نظر آتے تھے۔ اسی خدشے سے سہمے ہوئے دونوں بچوں کے ہمراہ حویلی میں داخل ہو گئے۔

رات گزری، دن گزرا، دوسری رات بھی گزر گئی مگر نہ بارش ہوئی، نہ طوفان آیا۔سویرے سویرے مصلّی آ گئے اور گاہی ہوئی گندم پھوڑ کر بھوسا اور دانے الگ کرنے لگے۔ پھوڑنے کے بعد جگہ جگہ مزارعوں کے کھلیانوں میں گندم اور چنے کی ڈھیریاں نظر آنے لگیں۔ کہیں کہیں ڈھیریوں پر مٹّی اور راکھ کا لیپ لگا کر ہلکا سا پلستر چڑھا دیا گیا تاکہ چوری چکاری کا امکان نہ رہے۔ اسی طرح بھوسے کی بھی ڈھیریاں بنا کر اُوپر سے مٹّی کا گاڑھا گاڑھا لیپ چڑھا دیا گیا۔

جمعہ کے مبارک دن سے بٹائی کا آغاز ہوا۔ اُس روز کوٹلہ ہرکشن میں بڑی چہل پہل اور رونق تھی۔ مزارعوں اور کمیّوں نے نہا دھو کر اُجلے کپڑے پہنے۔ نوجوان عورتیں رنگ برنگے راکھوں لباس میں، ہنستی مسکراتی اِدھر اُدھر پھر رہی تھیں۔ وہ مٹیاریں جن کی بٹائی کے بعد شادی ہونے والی تھی، شرمائی شرمائی نظر آتیں۔ سہیلیاں اُن سے چھیڑ چھاڑ کرتیں۔ اُس روز گاؤں میں میلے کا سماں تھا۔

پہر دن گزرا تو اللہ وسایا اپنے مزارع کمال کے کھلیان پر جمیلہ اور رحیم داد کے ہمراہ پہنچا۔ فصل کی بٹائی کا آغاز وہیں سے ہوا۔ کمال کے گھر والے اور سیپی کمیّ پہلے سے وہاں موجود تھے۔ مسجد کا مُلّا بھی ایک طرف بیٹھا تھا۔ سب اللہ وسایا کے منتظر تھے۔ مٹّی سے لیپے پُتے کھلواڑ پر گندم اور چنے کی ڈھیریاں موجود تھیں۔ اللہ وسایا کے پہنچتے ہی غلغلہ پڑا۔ گندم اور چنوں کی ڈھیریوں پر چڑھا ہوا پلستر اُتارا گیا۔ کھلواڑ ایک بار پھر جھاڑو سے صاف کی گئی۔ عود و لوبان سُلگایا گیا۔ دھواں مرغولے بناتا ہوا فضا میں تیز خوشبو بکھیرنے لگا۔

ہر ڈھیری اس انداز سے بنائی گئی تھی کہ اُس میں لگ بھگ آٹھ من غلّہ ہو۔ اللہ وسایا اور کمال نے جوتے اتارے اور کھلواڑے کے چبوترے پر برہنہ پیر چڑھ گئے۔ دونوں ڈھیریوں کے قریب خاموش کھڑے ہو گئے۔ مُلّا نے کلام پاک کی تلاوت شروع کی۔ کھلواڑ کے اردگرد کھڑی ہوئی عورتوں اور لڑکیوں نے دوپٹوں کے آنچل سے سر ڈھک لیے۔ سب ہاتھ باندھ کر اور سر جھکا کر ادب سے خاموش کھڑے رہے۔

تلاوت ختم کرکے مُلّا نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ سب نے اُس کے ساتھ ساتھ ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگی۔ دُعا کے بعد بٹائی شروع ہوئی۔ بٹائی کی ذمّے داری پیشہ ور ونڈاوے کے بجائے گاؤں کے ایک بوڑھے کے سپُرد کی گئی۔ اُس کے ہاتھ میں ٹوپا دبا تھا۔ ٹوپے میں تقریباً ڈھائی سیر غلّہ آتا تھا۔ بٹائی شروع ہونے سے پہلے جمیلہ نے بوڑھے سے اونچی آواز میں کہا۔ ”چاچا! پتہ ہے، یہ ڈھیریاں زمیں دار اور مزارع کا مشترکہ کھاتا ہے۔ انہیں دونوں کے درمیان آدھا آدھا بانٹنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے قانونی حقوق بھی پوری طرح دھیان میں رکھنے ہوں گے۔ سرکاری کاغذات میں انہیں اس پرکار بتایا گیا ہے۔“ اُس نے ایک لمبا کاغذ نکالا اور اُسے سنبھل سنبھل کر پڑھنے لگی۔

ڈھیری جنس بحصّہ نصف نصف مابین مالک و مزارع بعد وضع خرچ ہائے ذیل

خرچ کمیّاں

ترکھان	۴½ پائی فی ہل
لوہار	۴½ پائی فی ہل
چھاجی	۹ پائی فی ڈھیری
موچی	۹ پائی فی ڈھیری
نائی	۹ پائی فی ڈھیری

جنس یافتنی، مالک از ڈھیری مشترکہ

معلّی (ملازم مالک)	ایک پائی فی ڈھیری
محاصل	ایک ٹوپا فی ڈھیری
مالک کا پٹواری	۳ ٹوپے فی ڈھیری
منشی ڈیرے دار	۲ پائی فی ڈھیری
داد (میراثی)	ایک پائی فی ہل
دھواں دار (برائے تکیہ فقیراں)	ایک پائی فی ڈھیری

خرچ گھوڑا، کاہیاں   دو پائی گندم فی ڈھیری

یہ تفصیلات سنانے کے بعد جمیلہ نے بوڑھے کی طرف دیکھا، مُسکرا کر بولی۔ "چاچا! تیں نوں تو پتہ ہی ہوگا کہ ایک پائی چار ٹوپے کے برابر ہوتی ہے۔ ویسے سرکاری کاغذات میں خرچ در ڈاک بنگلہ برائے افسران دورہ گشتی کے لیے دو پائی فی ڈھیری بھی درج ہے۔ پٹواری کا فصلانہ اور تھانے دار کا نذرانہ الگ ہوتا ہے۔ پر ہم نے یہ سب کچھ نہیں دینا اور اپنا پٹواری شٹواری تو ہے ہی نہیں۔ اُسے کچھ بھیجنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

بوڑھے نے جمیلہ کی تمام باتیں سُنیں، مُسکرا کر بولا۔ "تُو فکر نہ کر، میں نوں سب پتہ ہے۔ تیں نوں یاد نہیں، پچھلے سال ربیع پر بھی میں نے ہی بٹائی شروع کی تھی اور تُوں نے مجھے سب کچھ ایسے ہی پڑھ کر سنایا تھا۔ میں اُسے بھولا نہیں ہوں۔"

جمیلہ بولی۔ "پر چاچا، کانونی کارروائی تو پوری ہونی ہی چاہیئے۔ جس کا جتنا حصّہ بنتا ہے، اُسے پورا پورا ملنا چاہیئے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی پھر بوڑھے نے ٹوپے میں پہلے گندم کی ڈھیری سے دانے بھرے اور دو بوریوں میں ایک ایک ٹوپا ڈالنے لگا۔ ایک بوری زمیں دار کی اور دوسری مزارع کی تھی۔ بوڑھا بوریاں غلّے سے بھرتا رہا۔ جمیلہ اپنے مزارع کمال کی بیوی کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ بیچ بیچ میں بولتی جاتی۔ اُونچی آواز سے بٹائی کرنے والے بوڑھے کو ٹوکتی۔ ہنس ہنس کر کہتی۔

"چاچا! تو زمیں دار کی بوری میں زیادہ کنک ڈال رہا ہے۔"

"اُوپر والا دیکھ رہا ہے چاچا۔"

"ڈنڈی نہ مار۔ کمال کی راہکی کا ٹوپا پورا بھر۔"

جمیلہ کی باتوں پر بار بار قہقہہ بلند ہوتا۔ زمیں دار اور مزارع کے نصف نصف حصّے کی بٹائی کے بعد مقرّرہ مقدار کے مطابق کمیّوں اور دوسرے حق داروں کو بھی فصل کی پیداوار میں اُن کا حصّہ مل گیا تو جمیلہ نے ضد کر کے خاصی مقدار میں اگلی کا گندم فقیروں اور دوسرے

حاجت مندوں کے لیے پڑا رہنے دیا۔

شام تک یہ سلسلہ چلتا رہا، دوسرے دن بھی جاری رہا اور مسلسل کئی روز تک جاری رہا۔ آخر بٹائی ختم ہو گئی۔

رحیم داد حیرت زدہ تھا۔ اُس نے کسی بڑے زمیں دار کو اس طرح بٹائی میں شریک ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ یہ کام منشی یا کاردار انجام دیتے۔ وہ اپنے ساتھ بٹائی کرنے والے ڈنڈاوے بھی لاتے، جو ہر طرح یہ کوشش کرتے کہ مزارع کے مقابلے میں زمیں دار کو فصل کا زیادہ حصّہ ملے۔ مزارع یا اُس کے کنبے کا کوئی فرد احتجاج کرتا تو اُسے ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کر دیا جاتا۔ زمیں دار فصل کا نصف نہ لیتے، ہمیشہ زیادہ لیتے۔ اکثر و بیشتر دو تہائی کے لگ بھگ وصول کرتے۔

جب بٹائی کے حصّے کا غلّہ بند بوریوں کی صورت میں حویلی کے گودام میں پہنچ گیا تو پاک پتن کی غلّہ منڈی کے آڑھتی اللہ وسایا کی حویلی کے چکّر کاٹنے لگے۔ سال بھر کی ضرورت کا غلّہ رکھ کر بقیہ فروخت کر دیا گیا۔ یہ گویا آخری مرحلہ تھا۔ پھر دیگیں چڑھیں، طرح طرح کے پکوان پکے سب نے کھانا کھایا۔

حویلی کے سامنے میدان میں مردوں نے بھنگڑا اٹالا۔ ڈھولیوں نے جھوم جھوم کر ڈھول پر چوٹ لگائی۔ من چلے نوجوانوں نے اُن کے گرد حلقہ بنا کر رقص کیا۔ ایک دوسرے کو للکار کر ٹپّے کے بول اٹھائے۔ اللہ وسایا ایک اُونچی چارپائی پر بیٹھا تھا اور رقص کرنے والوں کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ اُن کی آواز میں آواز ملا کر بلّے بلّے کے نعرے بلند کر رہا تھا۔

بھنگڑا ختم ہو گیا تھا۔ اللہ وسایا حویلی میں داخل ہوا۔ رحیم داد بھی اُس کے ہمراہ تھا۔ حویلی کے وسیع صحن میں ابھی تک ڈھول بج رہا تھا۔ وسط میں جازم کا فرش تھا۔ اُس پر گاؤں کی عورتیں بیٹھی تھیں۔ چاروں طرف مشعلیں روشن تھیں۔ عورتیں ڈھولک کی تھاپ پر لہک لہک کر گا رہی تھیں۔

اساں ڈھولکی وجانی، ساڈی ریت اے پرانی

اللہ وسایا اور رحیم داد ایک گوشے میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ رحیم داد نے دیکھا کہ گانے

والی عورتوں میں جمیلہ بھی شامل تھی۔ اُس کی آواز سُریلی اور خوب صورت تھی۔ وہ گردن کو بار بار خم دے کر گا رہی تھی، اُونچی تان سے گیت کے بول اُٹھا رہی تھی۔ وہ اس وقت سُنہری طلّے کا لاچا باندھے ہوئے تھی۔ لاچے کا رنگ زعفرانی تھا، کرتا بھی اُسی رنگ کا تھا، گریبان پر سبز اور سیاہ دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ دوپٹّا سبز تھا۔ پیروں میں چاندی کی پازیب تھی۔ ماتھے پر جڑاؤ ٹیکا جھلک رہا تھا۔ آنکھوں میں دنبالہ کاجل تھا۔ مشعلوں کی لہراتی روشنی میں وہ بہت دل کش اور طرح دار نظر آ رہی تھی۔

گانا ختم ہوا تو جمیلہ نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ "ہو جائے جی، ہو جائے۔ گدّھا ہو جائے۔" چٹکیاں بجنے لگیں اور کچھ دیر بجتی رہیں۔ جمیلہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کے ساتھ نوجوان عورتیں اور مٹیاریں بھی کھڑی ہو گئیں۔ جمیلہ تالیاں بجاتی ہوئی آگے آ گئی۔ عورتیں اور مٹیاریں اُس کے گرد حلقہ بنا کر ساتھ ساتھ تالیوں کی تھاپ دینے لگیں۔ رفتہ رفتہ تالیوں میں ہم آہنگی پیدا ہوتی گئی۔ تالیوں کی تھاپ کے ساتھ ساتھ پاؤں گردش کرنے لگے۔ جمیلہ نے ایک ہاتھ اُٹھا کر اُونچے سُروں میں گدّھے کی مناسبت سے گیت چھیڑا۔

کُڑیاں سد کے گدھے پائیے
سُتیاں گلاں جگائیے !!

گیت کے دوسرے بول سہم تو اعورتوں نے اٹھائے۔ تالیوں کی مسلسل تھاپ پر بول اونچے اور اُونچے ہوتے گئے۔ تھرکتے، لہکتے جسموں کی گردش تیز ہوتی گئی۔ ناچ تیز ہوا تو عورتوں نے رُک رُک کر دائرے میں جمیلہ کے گرد پھیریاں لینی شروع کر دیں۔ اُن کے پاؤں ایک ہی انداز میں زمین پر پڑ رہے تھے اور اسی ترتیب اور تواتر سے ہاتھ اُوپر اُٹھ اُٹھ کر تالیوں کی تھاپ پر ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے۔ ایک نوجوان مٹیار کے پیر غلط پڑے تو سامنے بیٹھی ہوئی عورتوں میں زور کا قہقہہ بلند ہوا۔ وہ اس قدر خجل ہوئی کہ سر جھکا کر رقص کرنے والیوں کے حلقے سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ جمیلہ کی اس پر نظر پڑی، اُس نے آگے بڑھ کر جھٹ اس کا ہاتھ پکڑا اور حلقے سے علیحدہ نہ ہونے دیا۔

مشعلوں کے بھڑکتے شعلوں کی مچلتی روشنی میں جوان اور صحت مند جسم پھڑکتے رہے، لہراتے رہے۔ پازیب اور پائلیں جھنکارتی رہیں۔ گیت کے سریلے بول فضا میں بکھرتے رہے۔ ناچ تیز سے تیز ہوتا گیا۔ رقص کرنے والیوں کے چہرے خون کی گردش سے گلابی پڑ گئے۔ دہکنے لگے، دمکنے لگے۔

جمیلہ کا دل نواز چہرہ اُن کے حلقے میں طلوع ہوتے ہوئے سورج کے مانند جگمگا رہا تھا۔ اُس کی لمبی چوٹی ناگن کی طرح لہرا رہی تھی۔ چوٹی میں بندھا ہوا روپہلا پراندا جھلملا رہا تھا۔ وہ اس قدر حسین اور دل کش نظر آ رہی تھی کہ رحیم داد مبہوت ہو گیا۔ ٹکٹکی باندھے اُس کا تابندہ اور رخشندہ چہرہ تکتا رہا۔ پھولوں سے لدی ہوئی شاخ کی طرح اُس کے لچکتے بل کھاتے جسم کے پیچ و خم دیکھتا رہا۔ ناچ ختم ہوا تو رحیم داد کو ایسا لگا جیسے کوئی سہانا خواب دیکھتے دیکھتے اچانک بیدار ہو گیا ہو۔ جمیلہ اُس کے ذہن پر برسات کی گھنی گھٹاؤں کی طرح چھائی ہوئی تھی۔

آدھی رات کے بعد رحیم داد مہمان خانے میں گیا۔ بستر پر لیٹا تو ناچ کے آہنگ اور گیت کی نغمگی سے مسحور تھا۔ وہ خاموش لیٹا دیر تک لطف اندوز ہوتا رہا۔

صبح وہ دیر سے بیدار ہوا۔ آنکھ کھلی تو مہمان خانے کے صحن کی دیواروں سے دھوپ نیچے اُتر رہی تھی۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر غسل خانے میں گیا۔ واپس آیا تو میز پر ناشتہ لگایا جا چکا تھا۔ احمد اُجلے لباس میں اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ رحیم داد نے مسکرا کر پوچھا۔

"حمدے! آج تو بہت چمک رہا ہے؟"

وہ کسی قدر شرما کر بولا۔ "زمیں دارنی نے نئے کپڑے سلوا کر دیے ہیں۔ ہر فصل پر وہ حویلی کے سارے نوکروں اور نوکرانیوں کو نئے کپڑے دیتی ہے۔"

"تب تو تیرے عیش ہو گئے۔" رحیم داد بے تکلفی سے مسکراتا رہا۔

احمد نے دبی زبان سے کہا۔ "وہ ہے تو جی ہندنی پر دل کی بہت اچھی ہے۔"

رحیم داد چونک پڑا، پراٹھے کا لقمہ ہاتھ میں رہ گیا۔ "زمیں دارنی ہندنی ہے۔ تو سچ کہہ رہا ہے؟"

"چوہدری! میں تجھ سے کوئی جھوٹ بول رہا ہوں۔" احمد نے سنجیدگی سے کہا۔"پر اب وہ ہندنی نہیں رہی۔ زمیں دار سے نکاح پڑھانے سے پہلے مسلمان ہو گئی تھی۔ اپنی مسجد کے مُلاّں نے اُسے کلمہ پڑھا کر مسلمان بنایا تھا۔" اُس نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔"میں تو جی اس پنڈ کا پرانا رہنے والا ہوں۔ اُس زمانے سے رہتا ہوں جب پاکستان نہیں بنا تھا۔ اُس وکت یہ ساری زمین زمیں دارنی کے پیوُ کی تھی۔ یہ حویلی بھی اُسی کی تھی۔ بہت وڈّا زمیں دار ہوتا تھا وہ۔"

رحیم داد ششدر رہ گیا۔ گومگو کے عالم میں بولا۔"تیری باتیں سمجھ نہیں آئیں۔"

"چوہدری! میں نے غلط گل نہیں کی۔" احمد نے بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے کہا۔"یہ گل تو سارا پنڈ جانتا ہے۔ تجھے اب تک پتہ نہیں چلا ہے" وہ زیرِلب مُسکرایا۔"پر زمیں دارنی اتنی اچھّی ہے، اتنی بھلی ہے کہ کوئی اُس کے بارے میں ایسی گل نہیں کرتا۔ سب اُس سے پیار کرتے ہیں۔ بھین جی کہتے ہیں۔ پیج مان، میں نے یہ گل بُرائی سے نہیں کی۔ بس ایسے ہی زبان سے نکل گئی۔" اُس نے ایک ہاتھ سے دونوں کان باری باری چھو کر گردن ہلائی۔"توبہ جی توبہ، ربّا جانے، زمیں دارنی کا تو میں کبھی بُرا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

رحیم داد نے خاموشی سے ناشتہ ختم کیا۔ احمد خالی برتن لے گیا۔ وہ دیر تک احمد کی باتوں پر غور کرتا رہا پھر اُٹھ کر باغ میں گیا۔ وہاں بھی وہ احمد کی باتوں کی روشنی میں جمیلہ اور اللہ وسایا کے بارے میں سوچتا رہا۔

رحیم داد نے جمیلہ کے بارے میں نہ کسی سے کرید کر پوچھا، نہ احمد کی باتوں کی تصدیق چاہی۔ اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اُسے کچھ عرصے کے لیے ایک محفوظ ٹھکانے کی ضرورت تھی، وہ اُسے مل گیا تھا۔ اُس کے پاس کوئی کام کاج تو تھا نہیں، کمرے کا دروازہ بند کرتا اور اطمینان سے چودھری نورالٰہی کے دستخط کی مشق کرتا رہتا۔ رفتہ رفتہ اُسے اتنی مہارت ہو گئی کہ وہ چودھری نورالٰہی کے دستخط کی ہو بہو نقل کرنے لگا۔ اس کامیابی پر وہ خوش بھی تھا مطمئن بھی۔

ایک شام رحیم داد اللہ وسایا کے ساتھ باغ میں بیٹھا تھا۔ اُس نے دبی زبان سے رخصت

ہونے کی خواہش ظاہر کی مگر اللہ وسایا نے اصرار کیا تو اُس نے مزید زور نہیں دیا۔ وہ فی الحال وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ صرف یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ اللہ وسایا اُس سے اُکتا تو نہیں گیا مگر ایسا نہیں تھا۔ اللہ وسایا اور جمیلہ ہر طرح اُس کی دل جوئی کرتے، پورا خیال رکھتے کہ کسی طرح اُسے تکلیف نہ ہو، اُس کے دل کو ٹھیس نہ پہنچے۔

رحیم داد کا وقت اچھّا کٹ رہا تھا۔ مہمان خانے میں اُسے ہر طرح کا آرام اور سکون میّسر تھا البتہ ماجھا بری طرح کھلتا۔ بار بار کے انکار کے باوجود وہ رحیم داد کے پاس آتا، گڑگڑاتا اور روتا۔ احسان شاہ نے ابھی تک اُس کی بیوی واپس نہیں کی تھی۔ اُس کے پیٹ میں چوتھا بچّہ بھی آچکا تھا۔ یہ بات بھی اُسے ماجھا نے بتائی تھی۔ مگر رحیم داد اُس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اللہ وسایا بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ نہایت صاف گوئی سے اپنی مجبوری بتا چکا تھا۔

۱۸

گرمی خوب بڑھ چکی تھی۔ درودیوار سے چنگاریاں نکلتیں۔ لُو کے جھکڑ چلنے لگے تھے۔ اللہ وسایا کی زمینوں پر خریف کی فصل کے لیے مکئی، کماد، کپاس اور باجرے کی بوائی ہو رہی تھی۔ وہ کھیتوں میں کھڑے ہو کر اپنے سامنے بیج ڈلواتا، طرح طرح کی ہدایتیں دیتا۔ دن دن بھر چلچلاتی دھوپ اور لُو میں کھڑے رہنے سے اُس کا چہرہ جُھلس کر سانولا پڑ گیا تھا۔

جمیلہ نے سرکاری اسکولوں کی طرح اپنے اسکول میں بھی موسم گرما کی تعطیل کر دی تھی۔ اسکول بند تھا۔ وہ اکثر اللہ وسایا کے ساتھ کھیتوں پر نکل جاتی اور اِدھر اُدھر گھومتی پھرتی۔ رحیم داد نے دونوں کو جب بھی کھیتوں سے آتے دیکھا، پسینے سے شرابور اور دھول سے اَٹا ہوا پایا۔

ان دنوں اللہ وسایا سے رحیم داد کی ملاقات عام طور پر شام کو ہوتی۔ اللہ وسایا کبھی کبھی رات کا کھانا رحیم داد کے ساتھ مہمان خانے کے صحن میں بیٹھ کر کھاتا۔ زیادہ گرمی ہوتی تو کھانا باغ میں بھی کھایا جاتا۔ گھاس پر دری بچھادی جاتی، وسط میں چھوٹے پایوں کی لمبی میز رکھ دی جاتی۔ اُس پر کھانا چنا جاتا۔ سب دری پر بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ جمیلہ بھی اپنے دونوں بچوں کے ساتھ موجود ہوتی۔ جس دن باغ میں کھانا کھایا جاتا، رحیم داد بہت خوش ہوتا۔ خود کو اللہ وسایا کے کنبے کا فرد سمجھتا۔ اللہ وسایا اور جمیلہ کے رویّے سے بھی رحیم داد کو بیگانگی مطلق محسوس نہ ہوتی۔

ایک صبح اللہ وسایا مہمان خانے میں رحیم داد کے پاس آیا۔ رحیم داد ذرا ہی دیر پہلے ناشتے سے فارغ ہوا تھا۔ خلافِ معمول اللہ وسایا کے ہاتھ میں دونالی بندوق دبی ہوئی تھی۔ رحیم داد نے

نے مُسکرا کر کہا۔ "سویرے سویرے بندوق لے کر کیسے نکل آیا؟ شکار پر جانے کا ارادہ ہے؟"

اللہ وسایا نے کُرسی پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔ "محکمۂ آبادکاری میں میری زمین اور املاک کا ایک مقدمہ چل رہا ہے۔ اس سلسلے میں ملتان جا رہا ہوں۔ کل صُبح پیشی ہے۔"

"کب تک واپسی ہوگی؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"دو تین روز تو لگ ہی جائیں گے۔ اگر تاریخ پڑ گئی اور لمبی پیشی نہ لگی تو ہفتہ بھر ٹھہرنا پڑے گا۔ وکیل بھی بنانا تھا۔ میں دوپہر کو روٹی کھا کر ملتان کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔"

"بندوق اپنی حفاظت کے لیے لے جا رہا ہے؟ مقدمہ بازی چل رہی ہو تو حفاظت کے لیے اسلحہ رکھنا ہی پڑتا ہے۔"

"میرا مقدمہ ایسا نہیں جس میں کسی سے جھگڑے کا ڈر ہو۔ مقدمہ سرکار کے ساتھ چل رہا ہے۔" اللہ وسایا بولا۔ "ویسے سفر میں اپنے ساتھ میں بھرا ہوا پستول رکھتا ہوں۔ دو نوکر بھی ساتھ جا رہے ہیں۔ وہ بھی مسلّح ہوں گے۔ بندوق تو میں تیرے لیے لایا تھا۔ آج کل ڈکیتیاں بہت ہو رہی ہیں۔ فصل کی واڈھی کے بعد عام طور پر ڈکیتی کی وارداتیں بڑھ بھی جاتی ہیں۔ سنا ہے، لائل پور سے ڈکیتوں کی ایک دھاڑ ادھر آئی ہوئی ہے۔ اُس نے بڑا رولا کر رکھا ہے۔ روز ہی کہیں نہ کہیں سے ڈکیتی کی خبر سننے میں آتی ہے۔ ایک نیا چکر بھی چل رہا ہے وہ بھی کم خطرناک نہیں۔"

"وہ کیسا چکر ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔ "کسی سے تیرا جھگڑا ٹنٹا ہو گیا؟"

"میرا تو نہیں پر میرے مزارع کادو اور اُس کے پتر صابر کے ساتھ جھگڑا چل رہا ہے۔" اللہ وسایا بولا۔ "ہے تو پرانی دشمنی پر اب زیادہ سنگین ہو گئی ہے۔"

رحیم داد نے دلچسپی لیتے ہوئے کرید کر پوچھا۔ "جھگڑا ہوا کس بات پر؟"

"میں نے بتایا نا، پرانی دشمنی ہے۔ لمبی کہانی ہے۔" اللہ وسایا نے کہا۔ "ڈیڑھ، پونے دو سال اُدھر کی بات ہے، کادو کی دھی مجیداں کو پڑوس کے چک کا ایک نوجوان طاہرا اٹھا کر لے گیا۔"

"زبردستی اٹھا لے گیا یا آپس میں یاری آشنائی تھی؟"

"یاری آشنائی ہی تھی۔" اللہ وسایا ہنسا۔ "میں نے تو یہی سُنا تھا پر کادو اور اُس کا پُتّر نہیں مانتا۔ مجیداں کی واپسی کے لیے میں نے صُلح صفائی کی بھی کوشش کی مگر طاہر اور اُس کا پیو راضی نہیں ہوئے۔ کہتے تھے، مجیداں اپنی مرضی سے آئی ہے، یہاں راضی خوشی ہے۔"

"ایسی گل تھی تو کادو اور اُس کے پُتّر کو چاہیئے تھا کہ طاہر سے مجیداں کا ویاہ کر دیتا۔"

"پر کادو اُس کا ویاہ اپنے بھانجے سے کرنا چاہتا تھا۔ طاہر اُسے بالکل پسند نہیں تھا۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "ویسے اصل گل ایہہ تھی کہ مجیداں کے بھاگ جانے سے کادو کی بہت بدنامی ہوئی تھی۔ کئی روز تو شرم کے مارے گھر سے نہیں نکلا۔"

"عزت بھی تو آخر کوئی چیز ہوتی ہے۔" رحیم داد بولا۔ "کادو اور اس کے گھر والوں کی زبردست بے عزّتی ہوئی، اس سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔"

"یہی عزّت کا معاملہ تو سارے جھگڑے کی جڑ تھا۔" اللہ وسایا نے رحیم داد کی تائید کی۔ "کادو کو رہ رہ کر اسی پر غصہ آتا تھا۔ بات کرتا تو منہ سے جھاگ نکلنے، آنکھیں لال انگارا ہو جاتیں۔ بات ختم ہونے کی بجائے بڑھتی گئی۔ کادو اور اُس کا پُتّر مجیداں کو کسی نہ کسی طرح واپس لانا چاہتے تھے تاکہ طاہر اور اُس کے پیو کو نیچا دکھا سکیں، پاس پڑوس اور برادری میں اُن کا سر اونچا ہو جائے۔ اسی چکر میں دو مہینے سے اُوپر ہو گئے۔"

"کادو نے تھانے میں پرچہ چاک نہیں کرایا؟"

"نہیں۔ وہ کہتا تھا، تھانے دار کچھ نہیں کرے گا۔ طاہر نے اُس کی مٹھی گرم کر دی ہے۔" اللہ وسایا بتاتا رہا۔ "پر کادو چُپ کر کے نہ بیٹھا، وہ اور اُس کا پُتّر تاک میں لگے رہے۔ طاہر ایک روز پاک پتن بابا فرید کی درگاہ پر گیا۔ مجیداں اُس کے ساتھ تھی۔ دونوں منّت ماننے گئے تھے۔ کادو کو پتہ چل گیا۔ وہ اپنے پُتّر کے ساتھ نکلا۔ اُدھر طاہر اور مجیداں کو واپسی میں دیر ہو گئی۔ لاری سے اُتر کر دونوں پنڈ کی طرف چلے تو کافی رات ہو گئی۔ کادو اور اس کا پُتّر ایک سُنسان جگہ جھاڑیوں میں چھُپ کر بیٹھ گئے۔ جیسے ہی وہ نزدیک پہنچے، طاہر کو دونوں نے گھیر لیا۔ وہ نہتا بھی تھا۔

ٹکوے کے پہلے ہی وار میں گر پڑا۔ کادو اور صابر گصتے سے پاگل ہو رہے تھے۔ انہوں نے طاہر کے ہاتھ کاٹے، پیر کاٹے اور آنکھیں بھی نکال لیں۔ اُس کی لاش جھاڑیوں میں ڈالی اور مجیداں کو اپنے ساتھ لے آئے۔"

"پولیس نہیں آئی؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"کیوں نہیں آئی۔" اللہ وسایا نے کہا۔ "کادو اور اُس کے پُتّر صابر کو گرفتار کر کے لے گئی۔ دونوں پر طاہر کے قتل کا کیس چلایا۔ بعد میں سیشن سے دونوں کی ضمانت ہو گئی۔ ضمانت میں نے ہی دی تھی۔ میرا مزارع تھا۔ دوسرے یہ کہ کادو کی گھر والی صبح شام جمیلہ کے سامنے آ کر روتی۔ تُو جانتا ہے کہ جمیلہ کسی کو دُکھی نہیں دیکھ سکتی۔ وہ مجھ سے کہتی اور اُس کا کہا میں ٹال نہیں سکتا۔ مجھے کادو کے کیس کے لیے وکیل بھی کرنا پڑا۔ دوسری طرف طاہر کے چک کا زمیں دار بھی مددگار بن کر سامنے آ گیا۔ سال بھر سے اُوپر مقدمہ چلا۔ عینی گواہ تو کوئی تھا نہیں۔ شک کا فائدہ ملزموں کو ملا۔ عدالت نے کادو اور صابر کو پچھلے ہفتے بری کر دیا۔ جب دونوں گھر پہنچے تو بھنگڑا ڈالا گیا۔ جشن منایا گیا۔ تجھے بھی پتہ چلا ہو گا۔"

"نہیں۔ میں کسی سے ملتا جلتا ہی کب ہوں۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے تُو۔" اللہ وسایا نے کہا۔ "پر ادھر تو خوشیاں منائی جا رہی ہیں، اُدھر طاہر کے گھر والوں کے سینوں میں آگ بھڑک رہی ہے۔ وہ طاہر کے خون کا بدلہ لینے کے لیے تاک میں ہیں۔ کادو اور اُس کا پُتّر تو ہر وقت چوکس رہتے ہیں۔" اللہ وسایا کے چہرے سے پریشانی ٹپکنے لگی۔ "میں جب تک باہر رہوں، تُو بھی چوکس رہنا، خاص طور پر رات کو۔ ویسے بندوق چلانا تو جانتا ہی ہو گا؟ تُو نے بھی زمیں داری کی ہے۔"

"بہت اچھّی طرح جانتا ہوں" رحیم داد نے مستعدی سے کہا۔ "تیں نُوں پتہ نہیں، میں نے کیسی زمیں داری کی ہے۔" اُس نے اپنے بستے کی طرف اشارہ کیا۔ "تُو نے میرا کلیم نہیں دیکھا۔ سو مربّعے سے اوپر اپنا کلیم ہے۔"

"سو مربّعے سے اُوپر؟" اللہ وسایا نے حیرت سے چونک کر پوچھا۔

"یہ کاغذ رکھے ہیں، دیکھ لے۔" رحیم داد نے فخر سے گردن اُونچی کی۔

"میں نوں بالکل پتہ نہ تھا کہ توُ اتنا وڈّا زمیں دار ہوتا تھا۔" اللہ وسایا نے بندوق رحیم داد کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔" اسے اپنے پاس رکھ لے۔ اور یہ رہی کارتوسوں کی تھیلی۔" اُس نے چمڑے کی تھیلی بھی رحیم داد کو دے دی۔" ویسے بندوق استعمال کرنے کی تجھے ضرورت نہیں پڑے گی۔ پر خطرہ ہو تو ہمیشہ ہوشیار اور چوکس رہنا چاہیئے اور دیکھ، یہ خیال رکھنا، بندوق بھری ہوئی ہے۔ ویسے رات کو حویلی کے اگواڑے پہرا رہتا ہے۔ یوں بھی بہت سے نوکر چاکر ہیں۔ تیری ایک ہانک پر وہ کیا، پورا پنڈ نکل آئے گا۔ گھبرانے کی کوئی گل نہیں۔"

"توُ فکر نہ کر میں ڈرنے والا بندہ نہیں۔" رحیم داد نے بڑے اعتماد سے اللہ وسایا کو یقین دلایا۔" کتنی بار گولی چل چکی ہے۔ کبھی پیچھے نہیں ہٹا۔ ہمیشہ جم کر لڑا۔"

"ویسے دیکھنے میں بھی توُ جی دار لگتا ہے۔ اچھّا تکڑا جوان ہے۔"

اللہ وسایا نے غلط نہیں کہا تھا۔ حویلی میں رہ کر رحیم داد کا رنگ بھی نکھر گیا تھا۔ جسم پر خوب گوشت چڑھ گیا تھا وہ خاصا ہٹا کٹا لگتا تھا۔ ناشتے کے علاوہ دونوں وقت لذیذ اور مرغن غذا کھانے کو ملتی۔ کوئی کام کاج نہ کرنا پڑتا۔ تمام دن کمرے میں بستر پر لیٹا رہتا یا مقتول چودھری نور الٰہی کے جعلی دستخط بنانے کی مشق کرتا۔ صبح شام باغ میں گھنٹے دو گھنٹے بیٹھتا۔ زندگی نہایت عیش اور آرام سے بسر ہو رہی تھی۔

اللہ وسایا اُٹھ کر حویلی میں چلا گیا۔ رحیم داد نے بندوق کھونٹی پر دیوار کے ساتھ ٹکا دی مگر کارتوس نکال کر تھیلی میں ڈال دیے اور تھیلی سرہانے بستر کے نیچے رکھ دی۔ پچھلی رات سے احمد کو بخار تھا۔ اُس کی غیر حاضری میں حویلی کی ایک بوڑھی نوکرانی کھانا لائی تھی۔ دوسرے کام بھی اُسی نے کیے۔

اللہ وسایا پروگرام کے مطابق اُسی روز ملتان چلا گیا۔ رحیم داد اپنے کمرے میں رہا۔ ہوا ٹھیری ہوئی تھی۔ بڑا حبس تھا۔ آسمان پر گہرا غبار چھایا تھا۔

رحیم داد نے دن ڈھلے غسل کیا۔ اُجلے کپڑے پہنے اور باغ میں بچھی ہوئی کرسیوں میں

سے ایک پر جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد جمیلہ بھی آ گئی۔ گڈّو اور نینا دونوں بچّے اُس کے ہمراہ تھے۔ جمیلہ ململ کا کڑھا ہوا سفید کُرتا اور فیروزی شلوار پہنے ہوئے تھی، دوپٹّا بھی فیروزی تھا۔ رحیم داد نے اُسے دیکھا تو تڑپ کر رہ گیا۔ جمیلہ دُور سے چل کر آئی تھی۔ پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلملا رہے تھے۔ رخساروں پر سُرخی بکھری ہوئی تھی۔ کُرتا بدن سے چپکا ہوا تھا۔ ڈوبتے سُورج کی روشنی میں وہ خوب صورت اور دل آرا نظر آ رہی تھی۔

رحیم داد نے پوچھا۔ "زمیں دارنی! تو تھکی ہوئی دکھائی پڑ رہی ہے۔ کہاں گئی تھی؟"

"میں کادو کی دھی مجیداں کو دوائی دینے گئی تھی، اُسے بخار ہے۔ لگتا ہے لُو لگ گئی۔"

"یہ مجیداں وہی تو نہیں ہے جس کے لیے طاہر کا قتل ہوا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"ہاں وہی ہے۔" جمیلہ نے بتایا۔ "تجھے کیسے پتہ چلا؟"

"اللہ وسایا نے سویرے بتایا تھا۔" رحیم داد بولا۔ "لگتا ہے، مجیداں بہت سوہنی ہوگی، جبھی تو اُس کے لیے خُون خرابہ ہوا۔"

"ایسی تو اُس کی سُندرتا نہیں کہ خُون خرابہ ہو۔" وہ مُسکرا کر بولی۔

رحیم داد نے بے ساختہ کہا۔ "وہ تیری طرح تو سوہنی نہ ہوگی۔ تیری تو بات ہی اور ہے۔ اس پنڈ میں کیا، دُور دُور تک کوئی اتنی سوہنی زنانی نہ ہوگی۔" دل کی بات زبان پر آ گئی۔

"میں اب کیا رہ گئی۔" اُس نے شرما کر آنچل سر پر ڈال لیا۔ "میری سندرتا تو نینا اور گڈّو ہیں۔ عورت جب ماں بن جاتی ہے تو اُس کی سُندرتا اُس کے بچّے چوری چوری لے جاتے ہیں۔ سدا ایسا ہی ہوتا ہے۔"

رحیم داد نے گفتگو کا رُخ بدلنے کی کوشش کی۔ "پر مجیداں کے بارے میں جو کچھ ہوا بُرا ہوا۔"

"بہت بُرا ہوا۔" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "جب طاہر کے ساتھ چلی گئی تو میں نے کادو کو بہت سمجھایا کہ جو ہوتا تھا، ہو گیا۔ طاہر کو اپنا بنا لے پر وہ اُسے جنوائی ماننے کو کسی طرح تیار نہ ہوا۔ عجیب اکھڑ بندہ ہے۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ طاہر کا خُون کیا اور پُوتّر

دونوں پھانسی پر لٹکنے سے بال بال بچ نکلے۔ ضمانت سے پہلے مہینوں جیل میں بند رہے۔ آگے دیکھ، کیا ہوتا ہے۔ دشمنی نے جڑ تو پکڑ لی۔ ایک بار ایسی دشمنی پڑ جائے تو پیڑھیوں تک خون خرابے کا سلسلہ چلتا ہے۔"

"وہ ٹھیک کہہ رہی ہے تو۔ کادو اور اُس کے پُتّر کی جان کو ہر دم خطرہ ہے۔ دوسری پارٹی بدلہ لینے کی تاک میں لگی ہوگی۔"

"بالکل ایسا ہی ہے۔" جمیلہ نے اُس کی تائید کی۔ "اور یہ خون خرابہ کر کے ملا کیا۔ جان بھی خطرے میں اور اُدھر مجیداں رو رو کر آدھی بھی نہیں رہی۔ طاہر اُسی کے لیے کتل ہوا تھا اور اُس کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ وہ یہ بات کیسے بھول سکتی ہے۔ میں نے اُسے دیکھا تھا۔ اچھا گبھرو جوان تھا۔"

"بات یہ ہے جی! جب غیرت کا سوال سامنے آجاتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے، کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ بس ایک ہی چکّر سر پر سوار رہتا ہے۔"

جمیلہ خاموش رہی۔ رحیم داد بھی چُپ بیٹھا رہا۔

وہ زیادہ دیر نہیں ٹھیری۔ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی اُٹھ کر حویلی میں چلی گئی۔ بچّے بھی اُس کے ساتھ چلے گئے۔ رحیم داد مہمان خانے میں گیا۔ کھانا کھایا اور چھت پر چلا گیا۔ جب سے گرمی بڑھی تھی، اُس نے چھت پر ایک چارپائی ڈلوا دی تھی اور اُسی پر سوتا تھا۔ شام ہوتے ہی احمد یا کوئی دوسرا نوکر چھت پر چھڑکاؤ کرتا اور صاف ستھرا بستر لگا دیتا۔ رات ہوتے ہوتے چھت اتنی ٹھنڈی ہو جاتی تھی کہ اس سے گرم گرم بھپکے نہیں نکلتے تھے۔

☆

اُس رات اُمس کچھ زیادہ تھی۔ رحیم داد بستر پر لیٹا دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ بھری ہوئی بندوق اُس کے سرہانے رکھی تھی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ غنودگی میں رحیم داد کو کھٹکا محسوس ہوا۔ چارپائی کا سرہانا آنگن کی طرف تھا۔ کھٹکا اُسی طرف ہوا تھا۔

رحیم داد کی نیند اُڑ گئی۔ وہ چند لمحے خاموش لیٹا رہا۔ آسمان پر ابھی تک گاڑھا گاڑھا غبار چھایا ہوا تھا۔ ہوا دھیمی تھی اور رُک رُک کر چل رہی تھی۔

حویلی کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں مدھم روشنی جھلملا رہی تھی۔ مہمان خانے کا اگلا حصہ صاف نظر آرہا تھا۔ رحیم داد نے جھجکتے ہوئے گردن ذرا سی اٹھائی، جھک کر نیچے دیکھا۔ وہ سراسیمہ ہوگیا۔ اُسے ایک آدمی چار دیواری کی بلندی سے چمٹا نظر آیا۔ وہ ہولے سے پھسل کر نیچے آنگن میں اُترا۔ دبے دبے قدموں آگے بڑھا۔ بیرونی دروازے پر پہنچا اور آہستہ سے کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی چار آدمی اندر داخل ہوئے۔

رحیم داد نے جھٹ گردن جھکا لی۔ چند لمحے دم بخود پڑا رہا۔ اُس نے خوف اور پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ایک بار پھر گردن اُٹھائی اور منڈیر کی آڑ لے کر چوکنّا نظروں سے پانچوں کو دیکھنے لگا۔ اُن کے چہروں پر ڈھاٹے بندھے تھے۔ تین آدمی دھوتیاں اور لمبے لمبے کرُتے پہنے ہوئے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں قرابین اور بندوقیں دبی تھیں۔ دو قمیصیں اور شلواریں پہنے ہوئے تھے۔ اُن کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا مگر جو مسلّح تھے، اُن میں دو سکھ بھی تھے۔ اُن کے بڑے بڑے کیس ڈھاٹوں سے صاف نظر آرہے تھے۔ دھندلی روشنی میں وہ اُن کے بارے میں اس سے زیادہ اندازہ نہ لگا سکا۔ سکھوں کو دیکھ کر اُسے سخت حیرت ہوئی۔ اُس کی سمجھ میں مطلق نہ آیا کہ وہ کیوں آئے تھے اور کہاں سے آئے تھے۔

پانچوں کچھ دیر آنگن میں خاموش کھڑے رہے۔ جب آس پاس کوئی آواز اور آہٹ نہیں اُبھری تو ایک مسلّح شخص آگے بڑھا اور بندر کی طرح اُچھل کر قدِ آدم دیوار پر چڑھ گیا۔ یہ دیوار مہمان خانے کو حویلی سے جُدا کرتی تھی۔ اُس کا دروازہ حویلی کی جانب سے بند تھا۔

آنگن میں اب صرف چار افراد رہ گئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد درمیانی دیوار کا بند دروازہ کھلا اور وہ شخص باہر آگیا جو دیوار سے حویلی کے اندر کودا تھا۔ اُس کے نکلتے ہی ان دونوں نے، جو بظاہر غیر مسلّح تھے، قمیصوں کے اندر ہاتھ ڈال کر کمر سے لٹکتے ہوئے پستول نکالے اور تینوں کو بیرونی دروازے کی جانب جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چلے گئے تو دونوں حویلی کے

اندر داخل ہو گئے۔

رحیم داد کے پاس بھری ہوئی بندوق موجود تھی مگر وہ اکیلا تھا اور پانچوں نو وارد پوری طرح مسلّح تھے۔ تین آدمی دروازے پر پہرا دے رہے تھے، دو اندر جا چکے تھے۔ حویلی پر گہرا سکوت طاری تھا۔ رات تاریک اور بوجھل تھی۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ سناٹے میں حویلی کی بالائی منزل سے ایک گھٹی ہوئی نسوانی چیخ بلند ہوئی۔ رحیم داد بے قرار ہو گیا۔ بالائی منزل پر صرف دو کمرے تھے۔ گرمی کے موسم میں اللہ وسایا اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رات کو کمروں کے سامنے کھلی چھت پر سوتا تھا مگر وہ ملتان میں تھا۔ بالائی منزل پر صرف بچّے تھے اور جمیلہ تھی۔ چیخ جمیلہ ہی کی ہو سکتی تھی۔

رحیم داد کو خطرے کا شدّت سے احساس ہوا۔ اُس نے سرہانے سے بھری ہوئی بندوق اُٹھائی۔ آہستہ سے اتر کر نیچے آیا۔ چند لمحے دم سادھے پڑا رہا پھر زمین پر دھیرے دھیرے کھسکتا ہوا چھت کی مُنڈیر کے پاس پہنچ گیا۔ اُس نے گردن قدرے بلند کی۔ آنگن میں نظریں دوڑائیں۔ بیرونی دروازہ کھلا تھا۔ مہمان خانہ بالکل خالی تھا۔ البتہ دھندلی روشنی میں ایک شخص باہر اس طرح کھڑا تھا کہ اُس کی پُشت نظر آ رہی تھی۔ رحیم داد ٹکٹکی باندھے اُسے تکتا رہا مگر اُس شخص نے مُڑ کر نہیں دیکھا۔ رحیم داد کھسکتا ہوا زینے کے قریب پہنچا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں بندوق دبی تھی۔ نظریں اس مسلّح شخص کی جانب اُٹھی ہوئی تھیں جو دروازے کی جانب پیٹھ موڑے کھڑا تھا۔ رحیم داد نے ہولے ہولے قدم رکھتے ہوئے سیڑھیاں طے کیں۔ نیچے اُترا۔ آنگن میں پہنچ کر وہ دیوار سے لگ گیا۔ اس جگہ اندھیرا بہت گہرا تھا۔

وہ دم سادھے دیوار سے چپکا ہوا دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔ حویلی کے اندر کھلنے والے دروازے پر پہنچا۔ قریب پہنچ کر اُس نے حویلی کے اندر نظر ڈالی۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ اُس نے مُڑ کر چوکس نظروں سے بیرونی دروازے پر کھڑے ہوئے مسلّح آدمی کو دیکھا اور جھپاک سے حویلی میں داخل ہو گیا۔ حویلی کا اندرونی حصّہ وہ پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اُس نے کسی اور سمت جانے کے بجائے دالان کا رُخ کیا جہاں اوپر جانے کا زینہ تھا۔

دالان بالکل خالی تھا۔ سامنے وسیع صحن تھا۔ اُس میں دُور دُور تک چارپائیاں پڑی تھیں جن پر نوکرانیاں سو رہی تھیں۔ گرمی کی راتوں میں اُن کے شوہر اور جوان بیٹے باہر میدان میں چارپائیاں ڈال کر سوتے تھے۔ رحیم داد نے صحن میں پڑی ہوئی چارپائیوں پر مطلق توجہ نہیں دی۔ نوکرانیاں بے خبر سو رہی تھیں۔ رحیم داد سنبھل سنبھل کر زینے سے اوپر پہنچا۔ سامنے کھلی چھت تھی۔ دو پلنگوں پر دونوں بچے گہری نیند سو رہے تھے۔ لیکن جمیلہ کا پلنگ خالی تھا۔ وہ اُسے کہیں نظر نہیں آئی۔ پلنگوں کے قریب ہی کمرہ تھا۔ اُس کا دروازہ بند تھا۔

رحیم داد نے بندوق پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کی۔ زینے کی مُمٹی سے باہر نکلا۔ جھکا جُھکا آگے بڑھا۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ چرچراتا ہوا کھلا۔ رحیم داد جھٹ ایک پلنگ کی آڑ میں دبک گیا۔ دروازہ پھر بند ہوگیا۔ رحیم داد دم بخود بیٹھا چوکنّا نظروں سے دروازہ تکتا رہا۔

گرم اور غبار آلود رات دم بخود کھڑی تھی۔ حویلی پر گہرا سکوت طاری تھا۔ دونوں بچے پلنگوں پر بے خبر سو رہے تھے۔ جمیلہ کمرے کے اندر تھی۔ رحیم داد ایک پلنگ کی آڑ میں دبکا بیٹھا تھا۔ اُس کی نظریں کمرے کے دروازے پر لگی تھیں۔

دروازے کے پیچھے سے بہت مدّھم لہجے میں باتوں کی مبہم آوازیں اُبھر رہی تھیں۔ رحیم داد نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ مگر کچھ پلّے نہ پڑا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے جمیلہ کسی مصیبت میں مبتلا ہے۔

اُس نے بندوق سنبھال کر کمرے کے دروازے کا نشانہ لیا اور کبڑوں کی طرح جھکا جھکا کمرے کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچ کر اُس نے دروازے پر زور سے ٹھوکر ماری۔ دروازہ کھُل گیا۔ کمرے میں دو آدمی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ اُن کے عین سامنے پلنگ پر پیر لٹکائے جمیلہ بیٹھی تھی۔ رحیم داد نے نشانہ باندھ کر دونوں کو بندوق کی زد پر رکھ لیا۔ وہ بھونچکا رہ گئے۔ اُن کے چہروں پر دہشت اور پریشانی طاری ہو گئی۔ رحیم داد اُن کے سروں پر ملک الموت بنا کھڑا تھا اور انہیں قہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا۔

جمیلہ نے گردن کو خم دے کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اُس کے چہرے پر نہ خوف تھا، نہ

گھبراہٹ تھی۔ اُس نے سنبھلے ہوئے لہجے میں رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری! بندوق ہٹا لے۔"
رحیم داد نے بندوق نیچے کر لی۔ کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ مگر اُس کی لَو مدھم تھی۔ رحیم داد نے دونوں اجنبیوں کا جائزہ لیا۔ اُنہوں نے ڈھاٹے ہٹا دیے تھے۔ اب اُن کے چہرے صاف نظر آ رہے تھے۔ اُن میں سے ایک گورا چٹا جوان تھا۔ اُس کی داڑھی مونچھیں بالکل صاف تھیں۔ سر کے بال آڑی مانگ نکال کر جمائے گئے تھے۔ اُس کا قد اُونچا، جسم مضبوط اور بھرا بھرا تھا۔ وہ ڈبل گھوڑا بوسکی کی قمیص اور سفید شلوار پہنے ہوئے تھا۔ گلے میں سونے کی زنجیر پڑی تھی۔ ہاتھ کی ایک انگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی جس میں جڑا ہوا پکھراج جگمگا رہا تھا۔ دوسرا شخص ادھیڑ تھا۔ اُس کے سر کے بال کھچڑی تھے۔ مونچھیں گھنی تھیں، اُن میں کہیں کہیں سفید بال جھلک رہے تھے۔ چہرے پر عمرِ رفتہ کی دھندلی پرچھائیاں تھیں۔ وضع قطع سے وہ بھی کھاتا پیتا آدمی لگتا ہے۔ جمیلہ نے اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رحیم داد کو بتایا۔ "یہ میرا چاچا ہے اور یہ میرا ویر ہردیال ہے۔" اُس نے دوسرے کی سمت نظر گھمائیں۔ "دونوں مجھے لینے آئے ہیں۔" رحیم داد نے محسوس کیا کہ ہردیال کے چہرے سے جمیلہ کی شباہت صاف جھلک رہی تھی۔

جمیلہ کے چچا نے رحیم داد کو بغور دیکھا اور پوچھا۔ "یہ حویلی کا چوکیدار ہے؟"

"نہیں چاچا!" جمیلہ نے تردید کی۔ "ایسی گل نہ کر۔ چوہدری، ہمارا مہمان ہے۔ سمجھو گھر ہی کا بندہ ہے۔" اُس نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری! کھڑا کیوں ہے، بیٹھ جا۔"

رحیم داد نے دیوار کے قریب رکھے ہوئے سرکنڈوں کے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے جمیلہ کو دیکھا اور بڑے جوش سے کہا۔ "جب تک اللہ وسایا نہیں آئے گا، میں تجھے یہاں سے نہیں جانے دوں گا۔" اُس نے بندوق زانو پر رکھ لی۔ "یہ تجھے یہاں سے مجھے ختم کر کے ہی لے جا سکتے ہیں۔"

کمرے میں پُراسرار سکوت چھا گیا۔ ہردیال اور اُس کا چچا چُپ بیٹھے رہے مگر جمیلہ خاموش نہیں رہی۔ اُس نے رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری! تو چُپ کر۔" اُس کا لہجہ تیکھا تھا۔ "اِس معاملے میں نہ بول۔ تجھے چنتا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ میرا اپنا معاملہ ہے۔ اس میں تو اللہ وسایا بھی نہیں بول سکتا۔"

چچا نے بھتیجے کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ پھر ہردیال نے کھنکار کر جمیلہ کو مخاطب کیا۔ "پارو! کیا سوچا تو نے؟ ہم یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھیر سکتے۔" اُس کا لہجہ تیکھا اور تلخ ہوگیا۔ "آج ہم تجھے لے کر ہی جائیں گے۔"

"بھاجی! دھیرے بول۔ جاگ ہوگئی تو پورا پنڈ اکٹھا ہو جائے گا۔" جمیلہ نے نرم لہجے میں اُسے سمجھایا۔ "دھیرج سے گل کر، دھیرج سے۔"

چچا بولا "تیرا تیا تیرے لیے تڑپتا ہوا پچھلے برس سورگ باشی ہوگیا۔ آخری سمے اُس کی زبان پر تیرا ہی نام تھا۔ مڑ مڑ کر اِدھر اُدھر دیکھتا تھا۔ تجھے ڈھونڈتا تھا۔ ایک ایک سے پوچھتا تھا، میری پارو کہاں ہے۔ کیسے بتاؤں تیرے لیے وہ کیسا بیکل تھا۔ میں تو کہتا ہوں کہ مر کر بھی اس کی آتما کو شانتی نہیں ملی ہوگی۔" اُس کے لہجے میں دبا دبا کرب تھا۔ "پاروتی! تو بہت کٹھور ہے۔ تیرے سینے میں ہردے نہیں، پتھر ہے۔ تو نے میرے بھائی کو مار ڈالا۔"

"ماتا جی کا بھی سمجھ لے، چل چلاؤ ہے۔" بھائی نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "تیرے لیے روتے روتے اُس کی آنکھوں کی روشنی اتنی کم ہوگئی ہے کہ ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں سکتی۔ اتنی کمزور اور بیمار لگتی ہے کہ دیکھے گی تو پہچان نہیں پائے گی۔ اُس کا تو کب کا دیہانت ہوگیا ہوتا پر اُس کا دم تو تجھ میں اٹکا ہے۔" ہردیال کی آواز گلوگیر ہوگئی۔ "پارو! چل کر ماتا جی کو بچالے۔ پتا چھوٹا، ماتا بھی چھوٹ جائے گی۔" اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔

جمیلہ سر جھکا کر رونے لگی۔ بوجھل فضا کرب ناک ہوگئی۔ کمرہ مرگھٹ کی طرح ویران نظر آنے لگا۔ ہردیال نے گہری سانس بھری، آنسو پونچھے اور بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔ "پارو! میری بھین!" وہ پھر رونے لگا۔

جمیلہ نے ہردیال کو دیکھا اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "بھاجی! تیری بھین پاروتی تو اُسی روز مر گئی تھی جب تو اُسے بصیر پور سٹیشن پر بلوائیوں کے ہاتھوں میں اکیلا چھوڑ کر ستلج پار چلا گیا تھا۔"

"تجھے پتہ ہے، وہ کیسا کڑا سمے تھا۔" ہردیال نے صفائی پیش کی۔ "میں بالکل مجبور تھا۔

یہ تو سوچ، کوئی بھائی اپنی بہن کو اس پرکار چھوڑ سکتا ہے۔ یہ گل میں نے تجھے پہلے بھی بتائی ہے۔ اندھیرے میں مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ ستلج پار کرنے سے پہلے میں نے تجھے بار بار پکارا تھا۔"

اُس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اُس کے لہجے میں درد کی کسک تھی۔ "پارو! اٹھ سال سے تو ہم سب کو سزا دے رہی ہے۔ اب تو چھما کر دے۔"

"بھاجی! تو تین بار پہلے بھی آچکا ہے۔" جمیلہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "دو بار پولیس اور سرکاری افسروں کو لے کر آیا۔ تجھے اچھی طرح پتہ ہے، میں نے اب یہاں سے نہیں جانا۔ میں اب تیری پارو نہیں رہی۔ اب میں جمیلہ ہوں۔ اللہ وسایا کی گھر والی اور نینا اور گڈو کی ماں۔"

اُس کا لہجہ سنبھلا ہوا تھا۔ "میں ۲۲ برس تک پاروتی رہی۔ ۱۹۴۷ میں پاروتی کا مرن ہو گیا اور میں نے جمیلہ کے روپ میں دوسرا جنم لیا۔ اب تو مجھے یہاں سے لے جائے گا۔ ہردوار میں پنڈتوں اور پروہتوں کے ہاتھوں میری شدھی کرائے گا۔ جمیلہ کو کتل کر کے ایک بار فیر پاروتی بنائے گا۔" اُس کی آواز میں تلخی تھی۔ "بھاجی! میں کتنی بار کتل ہوں گی، کتنی بار مروں گی۔ یہ تو سوچ، مجھے وہاں کون چھما دے گا۔ ایسی نار کو کون چھما دے سکتا ہے جو اٹھ برس تک ایک مسلمان کی گھر والی رہ چکی ہو اور اُس کے دو بچوں کی ماں بھی ہو۔"

"تو چنتا نہ کر پارو! سب ٹھیک ہو جائے گا۔" چچا نے تسلّی دینے کی کوشش کی۔ "ہم نے تیرے سنجوگ کے لیے وَر بھی ڈھونڈ لیا ہے۔ اپنی ہی جات برادری کا ہے، بہت بھلا۔۔۔"

جمیلہ اُس کی بات کاٹ کر بولی۔ "چاچا! تو میرے ساتھ میرے بچّوں کو بھی تباہ کرنا چاہتا ہے۔ اتنا تو سوچ، اُن دونوں کا اس معاملے میں کیا دوش ہے؟"

"صاف گل ایہہ ہے پارو! ہم سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ہمارے جیتے جی تو ایک مسلے کے گھر میں رہے۔" چچا کا لہجہ تند اور تیز تھا۔ "اور وہ بھی ہمارے ایک مزارع کی پتنی بن کر۔ کچھ تو اپنے دھرم کا، اپنے اونچے خاندان کا دھیان کر۔" اُس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ہا، کیسا کلجگ ہے۔"

"چاچا! تو بھی ٹھیک کہتا ہے۔" جمیلہ نے دُکھ سے کہا۔ "جب بیٹیوں اور بہنوں کو

کو ننگا کر دیا جائے اور بازاروں سے اُن کا جلوس نکال کر دھرم کا نام اونچا کیا جائے، اُس کے نام پر کنیاؤں اور مہیلاؤں کی آبرو لوٹی جائے۔ کتّوں کی طرح اُن کو بھنبھوڑا جائے۔ اُن کی ہڈیاں پھوڑی جائیں تو یہ کلجگ ہی ہوا۔" اُس نے چچا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "اللہ دِتّا اگر ہمارا مزارع تھا تو کیا ہوا۔ اُس نے میرے ساتھ وہ سب کچھ نہیں کیا جو اِدھر اور اُدھر دونوں طرف دھرم کے نام پر ہوا۔ اُس کے اندر کا پُرش اُس سمے بھی زندہ تھا اور آج بھی زندہ ہے۔"

"یہ باتیں تو بار بار کہتی ہے۔ تیری ضد اور ہٹ دھرمی اب تک نہیں گئی۔" ہردیال کی تیوری پر بل پڑ گئے۔" دیکھ پارو! میں اس بار ماتا جی کو وچن دے کر آیا ہوں۔ آج خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔" اُس نے یکایک پستول نکال لیا۔" تو میرے ساتھ چلے گی۔ میرا رستہ کوئی نہیں روک سکتا۔" اُس نے جھپٹ کر جمیلہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔" چل اُٹھ۔ اگر تو چاہتی ہے کہ دو چار لاشیں یہاں گر جائیں تو میں اس کے لیے بھی تیاری کر کے آیا ہوں۔" اُس کا لہجہ تیز ہوتا گیا۔ "میرے بندے کاربینیں اور ہینڈ گنیں سنبھالے پنڈ کے ہر نکڑ پر چوکس کھڑے ہیں۔ تین جیپیں ہتھیار بندوں سے بھر کر لایا ہوں۔ اس بار ہر طرح تیار ہو کر آیا ہوں۔ میرا رستہ تو پولیس بھی نہیں روک سکتی۔"

"بھاجی! میرا ہاتھ چھوڑ دے۔" جمیلہ نے نرم لہجے میں کہا۔" میں نے پتہ ہے، تو بہت زور آور اور ویر ہے۔ مجھے مان ہے کہ تو میرا ویر ہے۔"

ہردیال نے بہن کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ جمیلہ اُٹھی اور تن کر بھائی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔" بھاجی! دوسروں کی لاشیں کیوں گرانا چاہتا ہے، ایسا کر، میرے سینے میں اپنے پستول کی ساری گولیاں اتار دے اور میری لاش ماتا جی کے پاس لے جا۔ وہاں میری ارتھی کو شمشان میں اپنے ہاتھوں سے آگ لگا دینا۔ تیرے دھرم کا پراشچت ہو جائے گا۔ میری مکتی اسی میں ہے۔" اُس نے بھائی کو للکارا۔" چلا گولی۔"

بھائی خاموشی سے اُسے گھورتا رہا۔ چچا بھی چپ تھا۔ رحیم داد دم بخود تھا۔ کمرے میں ایک بار پھر گہرا سکوت چھا گیا۔ ذرا دیر بعد ہردیال کھڑا ہو گیا۔ اُس نے قہر آلود نظروں سے جمیلہ

کو دیکھا۔

"تو نہیں چلے گی میرے سنگ؟"

"تو کس کی بات کر رہا ہے؟ میری؟ میں تو آٹھ برس پہلے ہی مر گئی تھی۔ جمیلہ تو ایک مہلا کا نام ہے۔ اُس کا کوئی بھی نام ہو سکتا ہے۔ وہ تو دوسروں کو خوش دیکھنے کے لیے ہنستی ہے، بولتی ہے، چلتی پھرتی ہے۔ میں تو مانو، اب ایک لاش ہوں۔ تو لاش اٹھا کر لے جانا چاہتا ہے تو ضرور لے جا۔ پر اس طرح نہیں، خون سے نہلا کر۔" وہ آگے بڑھی اور بھائی کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

ہردیال پیار سے اُس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ جمیلہ سسکیوں کے ساتھ رک رک کر کہتی رہی۔ "ویر! میرے سینے میں ہردے نہیں رہا۔ میں زخموں سے چُور چُور ہو چکی ہوں۔ مجھے اور دُکھ نہ پہنچا۔ میرے سارے زخم کھُل جائیں گے۔" وہ ہانپنے لگی۔ "مجھ مری ہوئی کو ایک بار پھر مارنا چاہتا ہے تو مار دے۔ میں تجھے کچھ نہیں کہوں گی، کچھ بھی نہیں۔"

وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ بھائی بھی بے قرار ہو کے رو پڑا۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے رہے۔ کمرے میں سسکیاں اُبھرتی رہیں۔ چچا بھی خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس کی آنکھیں بھی اشکبار ہو گئیں۔ وہ روتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ بھتیجے کے قریب گیا اور اُس کا کندھا تھپکتے ہوئے بولا۔

"ہردیال! تو کب تک روتا رہے گا۔ یہ نہیں جائے گی۔"

"ہاں چاچا! یہ نہیں جائے گی۔" ہردیال نے مایوسی سے کہا۔ "اسکی اِچھا یہیں رہنے کی ہے تو یہ یہیں رہے گی۔ اِس کی خوشی میں میری خوشی ہے۔ میں اسے دُکھی نہیں دیکھ سکتا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جمیلہ کی سسکیاں اور تیز ہو گئیں۔

مہمان خانے کی جانب سے سناٹے میں ہلکی سیٹی اُبھری۔ چچا پریشان ہو کر بولا۔ "ہردیال! اب یہاں سے چلنا چاہیئے۔"

ہردیال نے بہن کا سر چوما اور اُسے علیحدہ کر دیا۔ پھر ٹھوڑی پکڑ کر اُس کا چہرہ اُٹھایا اور بھیگے ہوئے رُخسار تھپ تھپائے۔ "آنسو پونچھ لے۔ میں تجھے نہیں لے جاؤں گا۔ تو جیت گئی۔ میرا مان

ایک بار پھر ٹوٹ گیا۔ تو پاروتی بن کر زندہ رہے یا جمیلہ بن کر، میں تجھے زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔" اُس نے ٹھنڈی سانس بھری۔" تو جس حال میں بھی رہے، میری لاڈلی بھتیجی پارو ہی رہے گی۔ میرے گھر کے دروازے سدا تیرے لیے کھلے رہیں گے۔ جب چاہے چلی آنا۔ میں انتم بار نہیں آیا ہوں۔ جب چاہے مجھے بلا لینا۔ سمگلر مجھے حفاظت سے تیرے پاس پہنچا دیں گے۔ وہ نہ ہندو ہوتے ہیں، نہ سکھ، نہ مسلمان۔ وہ صرف سمگلر ہوتے ہیں۔" وہ ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔

کمرے کی فضا آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔ ملگجی غبار آلود رات نڈھال ہو گئی تھی۔ سناٹا راکھ بن کر بکھرتا جا رہا تھا۔ ہوا دم بخود تھی۔" چاچا! اب یہاں سے نکل جانا چاہیئے۔ بہت دیر ہو گئی۔" ہردیال کی آواز اُبھری۔

وہ چچا کے ہمراہ دروازے کی جانب بڑھا۔ جمیلہ چپ چاپ اُن کے پیچھے پیچھے دروازے تک گئی۔ تیزی سے بڑھ کر دہلیز پر پہنچی، ہاتھ اُٹھا کر ہردیال سے بولی۔" ٹھیر جا ویرا! تو بہن کے گھر سے ایسے نہیں جائے گا۔ میں تجھے یوں بدا نہیں ہونے دوں گی۔" وہ کمرے کے اندر گئی، ٹرنک سے ایک ڈبیا نکال کے لائی۔ پھر ڈبیا کھول کر بھائی اور چچا کی پیشانیوں پر سیندور کا تلک لگایا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر بھائی اور چچا کو پرنام کیا۔

دونوں آگے بڑھے۔ جمیلہ دہلیز پر رُک گئی۔ انہوں نے چھت عبور کی، زینے کی ممٹی پر پہنچے۔ ہردیال نے مُڑ کر جمیلہ کی جانب دیکھا۔ لمحے بھر کو ٹھٹکا اور پھر اندھیرے میں چچا کے ساتھ گم ہو گیا۔

رات زخمی پرندے کے مانند پھڑ پھڑانے لگی۔ جمیلہ واپس آ کر کرسی پر تھکی ہوئی سی بیٹھ گئی۔ اُس کی آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ ہچکیاں لے رہی تھی۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں اُس کا چہرہ مٹیالا پڑ گیا تھا۔ رحیم داد گم صم بیٹھا تھا۔ کچھ دیر بعد کہیں دور رات کے سناٹے میں جیپوں کے انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز اُبھری۔ رحیم داد نے گردن کو ذرا سا خم دیا اور جیپوں کی آوازیں توجّہ سے سُننے لگا۔ آوازیں رفتہ رفتہ گہری خاموشی میں

تحلیل ہو کر ختم ہو گئیں۔

اُس نے جمیلہ کو مخاطب کیا۔" زمیں دارنی! وہ چلے گئے۔"

وہ رحیم داد کی طرف دیکھے بغیر بولی۔" ہاں چوہدری، وہ چلے گئے۔" اُس کی آواز بھرّا گئی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپایا اور بے اختیار رونے لگی۔

رحیم داد نے جمیلہ کو تسلّی دینے کی کوشش کی۔" زمیں دارنی! اب رونے سے کیا ہو گا جو ہونا تھا، ہو گیا۔"

"چوہدری! تو جا۔" اُس نے روتے ہوئے کہا۔" مجھے اکیلا چھوڑ دے۔ مجھے جی بھر کے رو لینے دے۔"

کمرے کی خاموشی میں جمیلہ کی سسکیاں رک رک کر ابھرتی رہیں۔ رحیم داد چُپ بیٹھا رہا مگر زیادہ دیر نہ ٹھیر سکا۔ اُس نے بندوق سنبھالی اور کمرے سے چلا گیا۔ جمیلہ نے نظریں اٹھا کر اُس کی جانب دیکھا اور سسکیاں بھر کر روتی رہی۔

رحیم داد سیڑھیوں سے نیچے اترا۔ دالان میں پہنچا۔ سامنے وسیع صحن تھا جس میں کچھ ہی عرصے پہلے رحیم داد نے مشعلوں کی لہراتی روشنی میں جمیلہ کو الھڑ مٹیاروں کے ساتھ گدھا ناچتے دیکھا تھا اب اسی صحن میں چارپائیوں پر نوکرانیاں بے خبر سو رہی تھیں اور جمیلہ اوپر کمرے میں بلک بلک کر رو رہی تھی۔

رحیم داد حویلی سے نکل کر مہمان خانے میں گیا۔ بیرونی دروازہ ابھی تک پاٹوں پاٹ کھُلا تھا۔ اُس نے دروازہ بھیڑ کر زنجیر چڑھائی۔ چھت پر گیا، بندوق احتیاط سے سرہانے رکھی اور نڈھال ہو کر بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ چت لیٹا اُجڑی ہوئی رات کو گزرتے دیکھتا رہا۔

صبح رحیم داد کی طبیعت بوجھل تھی جیسے اس نے رات کو کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔ حویلی کا ملازم، احمد ابھی تک بیمار تھا۔ ناشتہ اور دوپہر کا کھانا ایک نوکرانی لے کر آئی۔

دن ڈھلے رحیم داد باغ میں گیا۔ آسمان ہنوز غبار آلود تھا۔ اُمس تھی، گرمی تھی۔ فضا بے کیف اور دھواں دھواں تھی۔ اللہ وسایا واپس نہیں آیا۔ دوسرے روز بھی نہیں آیا۔ اس

دو دنوں میں جمیلہ بھی اُسے نظر نہیں آئی۔

☆

رات کو بارش کا ہلکا سا چھینٹا پڑا۔ آسمان سے غبار چھٹ گیا مگر گرمی بڑھ گئی۔ زمین سے گرم گرم بھپکے نکلتے تھے۔ رحیم داد کی وہ رات بھی بے چینی میں کٹی۔ سویرے ناشتے سے فارغ ہو کر وہ باغ میں گیا۔ دن ڈھلے بھی گیا۔ اب موسم خوش گوار تھا۔ نرم نرم جھونکے چل رہے تھے۔ کیاریوں میں پھولوں کے تختے لہرا رہے تھے۔ جمیلہ باغ کے ایک گوشے میں چپ بیٹھی تھی۔ رحیم داد اُس کی جانب بڑھا۔

جمیلہ نے نظر اٹھا کر اُسے دیکھا اور آہستہ سے بولی "آ چوہدری!"

رحیم داد خاموشی سے اُس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جمیلہ کے چہرے پر ابھی تک غم کی پرچھائیاں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ بجھی بجھی اور اجڑی اجڑی نظر آ رہی تھی۔ دونوں اپنی اپنی سوچ میں ڈوبے رہے۔ کچھ دیر بعد جمیلہ نے نظریں اُٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ زیرِ لب مسکرائی، یہ مسکراہٹ نہیں تھی۔ کلی مسل کر کھِل گئی تھی۔

"چوہدری! تُو نے بہت دنوں تک جمیلہ ہی کو دیکھا تھا۔ اُس رات پاروتی کو بھی دیکھ لیا" جمیلہ بولی۔

"حمدے نے یہ بات مجھے بتائی تھی" رحیم داد نے کہا۔ "پر مجھے یقین نہیں آیا تھا"

"یہ گل خالی حمدا ہی نہیں جانتا، سارا پنڈ جانتا ہے" جمیلہ نے بتایا۔ "اور میں اسے چھپاتی بھی نہیں۔ سچ بات کبھی نہیں چھپتی۔ اسے چھپانا، اپنے کو دھوکا دینا ہے"

"پر یہ بات اب تک سمجھ نہیں آئی" رحیم داد نے جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ اللہ وسایا تیرے پیو کا مزارع تھا؟"

"وہ تھا، بالکل تھا" جمیلہ نے صاف گوئی سے کہا۔ "پر وہ مزارع سے زمیں دار بن کر بھی زمیں دار نہیں بن سکا۔ وہ عجیب بندہ ہے۔ مجھ سے زیادہ اسے کوئی نہیں جانتا" وہ بات کرتے

کرتے گہری سوچ میں کھو گئی۔ رحیم داد بھی خاموش رہا۔ پھر جمیلہ ہی نے خاموشی توڑی "میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو ڈر گئی تھی۔ اُس سمے وہ بہت زوراور اور کڑوا تھا۔ بات بات پر آگ کی طرح بھڑک اُٹھتا تھا۔"

رحیم داد نے کہا۔ "دیکھنے میں تو بالکل کڑوا نہیں لگتا۔"

"اب تو گئو بن گیا ہے۔" جمیلہ نے بتایا۔ "اٹھ برس اُدھر کی گل ہے۔ جب فسادات کی آگ بھڑکی۔ ہر طرف خون خرابہ ہونے لگا۔ میں اُن دنوں لہور میں ہوتی تھی۔ وہاں میں پڑھتی تھی میرا بی اے کا آخری سال تھا۔ پر فسادات شروع ہونے کے بعد کالج بند کر دیا گیا تھا۔ میں ماڈل ٹاؤن میں اپنے ماما کی کوٹھی میں ٹھیری تھی۔ فیر ایسا ہوا کہ فسادات کم ہونے کی بجائے بڑھتے چلے گئے۔ لہور کے ہندو گھر بار چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ تب میرا بھی ویر ہردیال مجھے لہور سے دیپال پور لے آیا۔"

"پر یہ حویلی تو تیرے پیو کی تھی۔ تیرے گھر والے یہاں نہیں رہتے تھے؟"

"نہیں! یہاں ہمارا منیجر بنسی لال رہتا تھا۔ وہ اور اُس کے بال بچے اُسی مہمان خانے میں رہتے تھے جس میں آج کل تو ٹھیرا ہے۔ حویلی عام طور پر خالی رہتی تھی۔ ہم بھائی بہن تو یہاں گرمیوں کی چھٹیوں میں کبھی کبھار آ جاتے تھے۔ پتا جی بھی بہت کم آتے تھے۔ اُن کا نام لالہ کرشن دیال تھا۔" جمیلہ آہستہ آہستہ بتاتی رہی۔ "یہ جو دیپال پور میں کپاس بیلنے کی کرشنا کاٹن فیکٹری ہے، یہ میرے پتا نے ۱۹۳۳ء میں لگائی تھی۔ اُن کا اور بھی بہت سا کاروبار تھا۔ کئی دکانیں تھیں، ساہوکارہ تھا، کئی کمپنیوں اور ایک بینک کے وہ ڈائریکٹر بھی تھے۔ کاروبار میں اتنے الجھے رہتے تھے کہ کئی کئی سال ادھر نہ آتے۔ زمیں داری کی دیکھ بھال ہردیال کرتا تھا یا بنسی لال۔"

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "تو اتنے وڈے گھرانے کی دھی ہے، تو نے اپنے مزارع سے کیسے ویاہ کر لیا؟ بہت عجیب گل ہے۔"

"یہی تو میں تجھے بتا رہی تھی۔" جمیلہ نے جواب دیا۔ "جب فسادات کی آگ منٹگمری میں بھی پھیل گئی تو آس پاس کے دیہات کے ہندو دیپال پور آ گئے۔ وہاں پہلے ہی ہندو بہت

تھے۔ پر زیادہ تر کھتری تھے۔ ہم بھی جات کے کھتری ہیں۔ ہماری گوت کھنہ ہے۔ دیپال پور میں کھتریوں کی مشہور تیرتھ بھی ہے۔ یہ بابا لالہ جس راج رائے کی سمادھی ہے۔ سمادھی کے ساتھ مندر ہے۔ دھرم شالہ ہے۔ ایک دھرم سبھا بھی ہوتی تھی۔ جانے اُس کا کیا بنا۔" وہ لمحے بھر کے لئے رکی۔ "۵ برس ادھر کی بات ہے۔ میں اللہ سایا کے ساتھ دیپال پور گئی تھی۔ سمادھی، مندر، دھرم شالہ ہر جگہ مہاجروں نے کبضہ کر رکھا تھا۔ کبھی اس جگہ زبردست میلہ لگتا تھا۔ ماگھ کے مہینے میں کھتری دُور دُور سے تیرتھ یاترا کے لیے آتے تھے۔ جب کھتریوں کا کوئی پُتر دس برس کا ہو جاتا ہے تو بابا جس راج کی سمادھی کے سامنے اُس کا مونڈن ہوتا۔ سر کے بال صاف کر دیے جاتے۔ کیول بودھی چھوڑ دی جاتی۔ وہ کبھی نہیں کاٹی جاتی تھی۔ میں نے اپنے چھوٹے بھائی منوہر دیال کا مونڈن ہوتے دیکھا تھا۔ اُس دن گھر میں زبردست جشن ہوا۔ مہمانوں کے لیے پکوان پکے۔ اچھے اچھے بھوجن پروسے گئے، کیرتن ہوا، بھجن ہوا۔ ہمارا گھر بہت شان دار تھا۔ دو منزل کا تھا۔ اُس روز دیوے جلا کر گھر پر خوب روشنی کی گئی تھی۔ بالکل دیوالی کا سماں تھا۔"

"جب تو دیپال پور گئی تھی تو اپنا گھر بھی دیکھا ہو گا۔ کیا حال ہے اُس کا؟"

"یہ نہ پوچھ۔" جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "میں نے اُسے دیکھا تو بے کل ہو کر بن سوچے ایک دم اندر گھس گئی۔ اُس میں مہاجر کنبے ٹھیرے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ چولھے تھے۔ دھوئیں سے ساری دیواریں کالی پڑ گئی تھیں۔ ماتا جی جہاں پوجا پاٹ کرتی تھیں وہاں پکا چبوترا تھا۔ اوپر آلا تھا۔ اُس میں کرشن جی کی مورتی رکھی رہتی تھی۔ چبوترے کے پاس ہی تلسی کے بوٹے ہوتے تھے۔ ماتا جی ہر روز سورج نکلنے سے پہلے اُن میں پانی دیتی تھیں۔ چبوترے کے پاس کوئی اشنان کیے بنا نہیں جا سکتا تھا۔ پر اب چبوترے پر بھی چولھا بن گیا تھا۔ آلے سے مورتی اُٹھا کر پھینک دی گئی تھی۔ اب اُس میں چراغ جلتا تھا۔ تلسی کے بوٹے سوکھ کر کب کے ختم ہو چکے تھے۔"

وہ پھر کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ رحیم داد آہستہ سے کھنکارا تو وہ چونکی۔ "پتا جی میں نے بہت چاؤ سے گھر کے لیے ساگوان کا شان دار فرنیچر بنوایا تھا۔ کچھ توڑ پھوڑ کر روٹی پکانے کے لیے چولھوں میں جلا دیا گیا۔ جو بچ گیا تھا، وہ بھی ٹوٹ پھوٹ کر کاٹھ کباڑ بن گیا تھا۔ برادر گندگی

ہی گندگی تھی۔ بندے بھی اچھّے نہیں تھے۔ زنانیاں مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگیں، میں ڈر گئی۔ میرا کمرہ اوپر تھا۔ میں اُسے دیکھنا چاہتی تھی پَر حوصلہ نہ ہوا۔ میں جلد ہی گھر سے باہر چلی گئی۔ چوہدری! ذرا سوچ، کیسی عجیب گل ہے۔ اپنا گھر پرایا ہوا سو ہوا، اُس سے ڈر بھی لگنے لگا تھا۔ دوبارہ میں کبھی اُدھر نہیں گئی۔ جا کے کرتی بھی کیا، دُکھ ہی ہوتا۔"

"زمیں دارنی! تجھے اپنے گھر والے تو یاد آتے ہوں گے۔" رحیم داد نے پوچھا۔

"تجھے اپنی گھر والی اور بچّے یاد نہیں آتے؟"

"کیوں نہیں آتے۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تبھی تو تجھ سے پوچھ رہا ہوں۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ میرا دکھ تو سمجھ سکتا ہے۔ میری طرح تو بھی گھائل ہے۔" جمیلہ نے رحیم داد کی جانب افسردہ نظروں سے دیکھا۔ "چوہدری! ہم پانچ بھائی بہن ہوتے تھے۔ میں چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی پَر اب تین رہ گئے ہیں۔ چوتھا بلبیر دیال تھا۔ وہ ہردیال سے چھوٹا اور مجھ سے بڑا تھا۔ بلوائیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ ہردیال بتاتا تھا کہ پتا جی نے اُس کی لاش دیکھی تھی۔ بعد میں جانے اُس کا کیا بنا۔ چیلیں اور گِدھ ماس نوچ نوچ کر کھا گئے ہوں گے، پنجر کہیں دبا دیا گیا ہو گا۔ چوہدری! تو نے اُسے نہیں دیکھا۔ ہائے کیسا سندر اور سوہنا تھا۔" اُس نے لمبی سانس بھری۔ "سنا ہے، تینوں بھائیوں کا ویاہ ہو گیا ہے۔ بچّے بھی ہیں۔ میں نے نہ کسی بھرجائی کو دیکھا، نہ بچّوں کو۔ سب کو دیکھنے کے لیے من تو بہت مچلتا ہے۔ پَر اب مَیں اُن کے پاس نہیں جا سکتی۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ وہ سب مر گئے۔"

جمیلہ اُس اُلمیے کے اوراق پلٹتی رہی جس میں بنیادی کردار خود اُس نے ادا کیا تھا۔ رحیم داد ہمہ تن گوش رہا۔ وہ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتا تھا تاکہ اُس کے زیادہ سے زیادہ قریب ہو جائے۔ وہ خاموش ہو جاتی تو رحیم داد کرید کرید کر پوچھتا۔ اس دفعہ بھی جمیلہ بات کرتے کرتے رکی مگر رحیم داد نے اُسے خاموش نہیں رہنے دیا۔

"تیرے گھر والے تو سرحد پار نکل گئے تھے، تُو کیسے اِدھر رہ گئی؟"

"اب تو تجھے پتہ ہی چل گیا۔ جو نہیں تجھے پتہ، وہ بھی سُن لے۔ تجھ سے اب کیا چھپانا۔

ویسے چھپانے کو رہ ہی کیا گیا ہے۔ سب کو پتہ ہے۔" جمیلہ نے درد میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ بہت ڈراؤنی رات تھی جب میں اور میرے گھر والے ٹرک میں سوار ہو کر دیپال پور سے نکل کر بھاگے۔ اب میں وہ رات یاد کرتی ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بھیانک سپنا دیکھ رہی ہوں۔ رستے میں دو بار بلوائیوں نے ٹرک پر ہلا بولا، پر ڈرائیور بہت ہوشیار تھا۔ صاف بچا کر نکال لے گیا۔ آدھی رات کے بعد سب بھیرپور سٹیشن پر پہنچ گئے۔ وہاں پہلے ہی دُور دُور سے بھاگ کر آئے ہوئے ہندو اور سکھ پڑے تھے اور کھیم کرن اور امرتسر نکل جانا چاہتے تھے۔ میرا چھوٹا بھائی منو کصور کے راستے ٹرین سے کھیم کرن اور امرتسر نکل جانا چاہتے تھے۔ میرا چھوٹا بھائی منو ہردیال پہلے ہی امرتسر پہنچ چکا تھا اور ہم سب کا انتظار کر رہا تھا۔ ادھر ہم ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ ٹرین تو نہیں آئی، بلوائی آ گئے۔ اندھیری رات تھی۔ تڑ تڑ گولیاں چلتی تھیں۔ بچے رو رہے تھے۔ مہلائیں چیختی تھیں۔ ہر طرف ہاہا کار مچی تھی۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔"

"ترِیموں کے پتن پر راوی کے کنارے میں نے بھی یہی سماں دیکھا۔" رحیم داد نے بھی جمیلہ کی طرح خود کو مظلوم ثابت کرنے کے لیے مقتول چودھری نور الٰہی سے سنی ہوئی باتیں دہرائیں۔ جمیلہ خاموشی سے سنتی رہی۔ رحیم داد نے گہری سانس بھری اور افسردہ لہجے میں بولا۔ "اس طرح جی! میں راوی پار کر کے اکیلا پاکستان پہنچا۔" اُس نے قدرے توقف سے کہا۔ "ہاں اب تو بتا، آگے کیا ہوا؟"

"آگے کیا ہونا تھا۔ بس اتنا یاد ہے کہ بلوائی شور مچاتے آگے بڑھتے آ رہے تھے۔ میں ڈر کر ایک طرف بھاگی اور کسی سے ٹکرا کر زور سے گری۔ پر زمین تک نہیں پہنچی۔ ایسا لگا جیسے کوئی مجھے اپنی پیٹھ پر لادے بھاگا جا رہا تھا۔ پتہ نہیں، کون تھا۔ پوچھا بھی تو نہیں بولا۔ تب میں نے اُس کے ہاتھوں کی پکڑ سے نکلنے کی کوشش کی، منت سماجت کی، گڑگڑائی اور روئی پر اُس نے نہیں چھوڑا۔ ڈیڑھ میل آگے نہر تھی۔ اُس نے نہر کے نزدیک جنڈ اور کیکر کی گھنی جھاڑیوں میں بنی ہوئی ایک سنسان دھڑ میں مجھے اپنی پیٹھ سے ایسے پھینکا جیسے اناج تولنے والا دھڑوائی کنک کی بوری ایک جگہ سے دوسری جگہ ڈالتا ہے۔"

"بہت ظالم تھا وہ۔" رحیم داد نے نفرت سے منہ بگاڑ کر کہا۔

"وہ تیری سوچ سے بھی زیادہ ظالم اور کٹھور تھا۔" جمیلہ کی آواز میں درد کی چبھن تھی۔

"وہ اکیلا بھی نہیں تھا۔ اُس کے ساتھ چھ اور تھے۔" جمیلہ کی نظریں جھک گئیں۔ افسردہ چہرے پر ہلکی ہلکی سرخی بکھر گئی۔ "وہ سب تین روز تک باری باری میری ہڈیاں چچوڑتے رہے۔ نہ کھانے کو روٹی دی، نہ پینے کو پانی۔ نہ میں رو سکتی تھی، نہ بول سکتی تھی۔ میں تو مانو ایک لاش تھی ٹھنڈی اور بے جان۔ مجھے سب کچھ ایک ڈراؤنا سپنا لگا۔ آنکھیں بند تھیں اور میں بے سُدھ پڑی تھی۔ چوتھے روز دوپہر کو مجھے ہوش آیا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہڑ خالی تھی۔ اس وہڑ کو چاروں اُور باڑ لگا کر جھنگر میں بنایا گیا تھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ لگتا تھا، مجھے مردہ جان کر وہ چھوڑ گئے تھے۔ مجھے خود اچنبھا تھا کہ میں کیسے بچ گئی۔ وشواس ہی نہیں آتا تھا کہ میں زندہ ہوں۔"

چند لمحے رُک کے اُس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "میں کئی گھنٹے آنکھیں کھولے بے حال پڑی رہی۔ اُٹھا ہی نہیں جاتا تھا۔ دن ڈھلے نزدیک رکھی ہوئی کھرلی کا سہارا لے کر اٹھی۔ وہڑ میں ہر طرف گوبر ہی گوبر تھا۔ میرے کپڑے، پیٹھ، ہاتھ پیر اور سر کے بال گوبر سے لتھڑے ہوئے تھے۔ کھرلی میں جھانک کر دیکھا تو اُس میں مویشیوں کے لیے گتاوا پڑا تھا۔ توڑی کے ساتھ ونڈ ملا کر بنایا گیا تھا۔ میں نے چُن چُن کر ونڈ کھانے شروع کر دیے۔ چھولے کے یہ دلے ہوئے دانے کھا کر بدن میں تھوڑی سی جان آئی پر پیاس بہت لگی۔ وہڑ کی باڑ کے اُس پار نہر نظر آتی تھی۔ سوچا نہر پر جا کر پانی پی لوں لیکن کھڑے ہوتے ہی لڑکھڑا کر گر پڑی۔ دیر تک پڑی ہانپتی رہی۔ ذرا جی سنبھلا تو اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ ایک کونے میں تور کا ڈھیر نظر آیا۔ کھسکتی کھسکتی اُس طرف بڑھی، پاس جا کر اٹھی اور تور کے ٹکڑے چوسنے لگی۔ اُس کے رس میں مٹھاس تھی۔ نہ پوچھ کیسا سواد آیا۔"

"تور ویسے تو چری ہے پر چوپو تو کماد کی طرح میٹھی لگتی ہے۔" رحیم داد نے جمیلہ کی تائید کی۔

"میں نے تو اپنے جیون میں پہلی بار اُسے چوپا تھا۔ پر اُس سمے ایسا سواد ملا جیسے لاہور میں گرمی کے دنوں میں ٹھنڈی ٹھنڈی گنڈیریاں چوپنے پر آتا تھا۔" جمیلہ نے بتایا۔ "ونڈ کھا کر اور

تور کا رس چوپ کر اتنا آنند ملا کہ میں پڑ کر سو گئی۔ رات کو کوئی نہیں آیا، دن کو بھی نہیں آیا۔ میں چُن چُن کر ونڈ کھاتی رہی اور تور کے ٹکڑے دانتوں میں دبا کر چوُستی رہی۔ وہڑ سے باہر نہیں گئی۔ دوسری رات دو بندے ایک مج لے کر آئے۔ تب مجھے پتہ چلا کہ وہ جگہ وہڑ نہیں کسی رسّا گیر کی اُہر تھی۔ جس میں چوری کے مویشی اور چوکھر چھپا کر رکھے جاتے تھے۔"

رحیم داد نے کہا۔ "تجھے پتہ ہی نہ تھا کہ وہ رسّا گیروں کی اُہر تھی۔ گوبر اور کھرلی میں گتاوا پڑا دیکھ کر بھی تجھے پتہ نہ چلا؟" اُس کی آنکھوں میں حیرت نمودار ہوئی۔

"لے، مجھے کیا پتہ کہ اُہر ایسی ہوتی ہے۔ میں نے کوئی رسّا گیری یا مویشی چوری تو کی نہیں۔ مجھے تو یہ بھی اگیا نہ تھی کہ رسّا گیری کیا ہوتی ہے۔ سنا ہی سنا تھا۔" جمیلہ کا لہجہ قدرے تیکھا تھا۔ "مجھے تو اب بھی ٹھیک سے پتہ نہیں کہ رسّا گیری کیسے ہوتی ہے۔"

"تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔" رحیم داد کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ "ہاں، تو پھر کیا ہوا؟"

"دونوں نے مجھے اُہر میں دیکھا۔ پہلے تو وہ گھبرائے۔ تھوڑی دیر آپس میں کھسر پھسر کی۔ ایک وہیں ٹھہر گیا۔ دوسرے نے مجھے اپنے رہڑے میں بٹھا لیا۔ وہ اسی رہڑے کے پیچھے چوری کی مج باندھ کر لایا تھا۔ یہ بھی مجھے بعد میں پتہ چلا۔ وہ مجھے صاحبے والا لے گیا۔ اُس کی گھر والی تھی۔ بچّے تھے۔ مجھے کچھ اطمینان ہوا۔"

جمیلہ کا لہجہ اچانک تلخ ہو گیا۔ "پر وہ بھی کُتّا نکلا۔ گھسیٹ کر زبردستی کوٹھری میں لے گیا۔ اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ میں نے اُس کی منّت سماجت کی۔ ہاتھ جوڑے۔ گڑگڑا کے اُسے پچھلے تین روز کی ساری بپتا سنائی پر اُس نے ایک نہ سُنی۔ رات بھر میری ہڈیاں پچھوڑتا رہا۔" جمیلہ روہانسی ہو گئی۔ اُس نے آنسو پونچھے اور دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ "سویرے اُس کی گھر والی نے زبردست رولا کیا۔ روئی پیٹی، شور مچایا۔ اُس کا گھر والا ڈھیٹ بنا ہنستا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ ہل پنجالی سنبھال کر کھیتوں پر چلا گیا۔ گھر والی نے اُس کے جانے کے بعد میرے بال کھسوٹے، منہ نوچا۔ دونوں ہاتھوں سے خوب مارا پیٹا۔ میں نے مجبوری بتائی۔ پر اُس نے میری ایک نہ مانی۔ بس مارتی چلی گئی۔ مارتے مارتے تھک گئی تو رونے بیٹھ گئی۔ میں بھی روتی رہی اور روتے روتے

بے ہوش ہو گئی۔ تب اُسے کچھ ترس آیا۔ اُس نے مجھے پانی پلایا۔ دوپہر ہوئی تو کھانے کو روٹی بھی دی۔ شام کو اُس کا گھر والا لوٹا۔ اُس کا نام گاما تھا۔ رات کو فیر اُس نے مجھے گھسیٹ کر کوٹھری میں بند کر لیا۔ چار روز تک یہی ہوتا رہا۔ اُس کی گھر والی روز جھگڑا کرتی پَر وہ باز نہ آیا۔"

"گاما تو اور زیادہ گندہ اور کمینہ نکلا۔" رحیم داد نے جل کر کہا۔

"ہاں، وہ بہت گندہ اور کمینہ تھا۔" جمیلہ خلا میں گھورتی رہی اور بولتی رہی۔ "جب گامے کی گھر والی نے ایک روز بہت شور شرابا کیا اور دروازے کی دہلیز پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ پیٹنے لگی تو پاس پڑوس والے گاما کے گھر اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے گاما پر دباؤ ڈالا کہ وہ مجھے اپنے گھر سے نکال دے۔ اُس نے سب کے سامنے وعدہ کیا اور وعدہ پورا بھی کیا۔ پَر اُس نے مجھے اپنے گھر سے اس طرح نکالا کہ تین سو روپے میں دُلیل کے ہاتھ چپکے سے بیچ دیا۔"

رحیم داد نے استفسار کیا۔ "دُلیا بھی صاحبے والے میں رہتا تھا؟"

"نہیں! وہ مجھے بھومان شاہ لے گیا۔ اُس کی گھر والی اُسے چھوڑ کر ایک تیلی کے منڈے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔" جمیلہ نے کہا۔ "دُلیا کا بوڑھا پیو تھا۔ ایک چھوٹا بھائی تھا اور چھوٹے بھائی کی گھر والی بھی تھی۔ بچے بھی تھے۔ سب ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔" جمیلہ نے بڑی گہری سانس بھری۔ "دُلیا کے ساتھ میں دو مہینے سے اوپر رہی۔ دُلیا ادھکڑ تھا۔ پر اُس کا بھائی جوان تھا۔ مجھے اُس کے گھر میں پہنچے تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ دُلیا کا بھائی مجھے بُری نظروں سے گھورنے لگا۔ اکیلے میں پاتا تو نوچتا کھسوٹتا۔ ایک روز اُس کی گھر والی نے دیکھ لیا۔ اُس نے رو رو کر سارا گھر سر پر اُٹھا لیا۔ دُلیل کے پیو کو پتہ چلا تو وہ الٹا مجھ پر ناراض ہوا۔ سُسر اور نوہ دونوں مجھے گالاں نکالتے اور مارتے پیٹتے۔"

"تو نے انہیں اصل گل نہیں بتائی؟"

"کیا بتاتی۔ میرے پاس بتانے کو رہ کیا گیا تھا۔" جمیلہ نے اُداسی سے کہا۔ "گالاں سنتی تھی، مار کھاتی تھی اور چُپ کر کے بیٹھی رہتی تھی۔ فیر سُسر اور نوہ نے مل کر مسکوٹ کی۔ مجھے گھر

سے نکالنے کی سکیم بنائی۔ ایک روز دُلیا کا بیوُ ایک موٹی سی زنانی کو لے کر آیا۔ اُس کے بدن کا ماس تھل تھل کرتا تھا۔ وہ سگریٹ پیتی تھی اور پان چبا کر جگہ جگہ لال لال پیک تھوکتی تھی۔ بات کرتی تو ہاتھ بھی چلاتی اور آنکھیں بھی مٹکاتی۔ لہور سے آئی تھی۔ ہیرا منڈی کی کنجری تھی۔"

"کنجری تھی؟" رحیم داد نے پوچھا۔ "کس لیے آئی تھی؟"

"وہ فسادات میں اُٹھائی جانے والی اُن نوجوان مہلاؤں اور کنیاؤں کو خریدنے کا دھندا کرتی تھی جنہیں مغویہ کہا جاتا ہے۔" جمیلہ نے بتایا۔ "دلیا کے بیوُ نے پانچ سو روپے میں میرا سودا کر دیا۔"

"تجھے اس سودے کا پتہ تھا؟"

"بالکل تھا۔ میرے سامنے ہی تو طے ہوا تھا۔ اُس سمے دلیا اور اُس کے بھائی نہیں تھے۔ اللہ وسایا کی دُلیا کے چھوٹے بھائی سے جان پہچان تھی۔ اتفاق سے اُسی شام اللہ وسایا اُس سے ملنے آیا۔ وہ آنگن میں منجی پر بیٹھا دلیا کے بھائی سے باتیں کر رہا تھا۔ میں آنگن سے گزری تو اللہ وسایا نے مجھے دیکھ لیا اور فوراً پہچان لیا۔ اُس نے مجھے اپنے پاس بلایا، پوچھا، تُو یہاں کیسی آئی؟ میں تو چُپ رہی پر دُلیا کا بھائی بولا کہ دُلیا اسے خرید کر لایا ہے۔ اللہ وسایا نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ یہ میرے زمیں دار کی دھی ہے، یہاں نہیں رہ سکتی۔ میں اسے اپنے پنڈ لے جاؤں گا۔ دلیا کا بھائی تو کچھ نہیں بولا پر اُس کے بیوُ نے بگڑ کر کہا۔ یہ اس گھر سے نہیں جا سکتی۔ اُس کی نوہ بھی کڑ کڑ کرنے لگی۔ دو نوں مجھے کنجری کے ہاتھ بیچ کر رات کو ۵ سو روپے وصول کرنا چاہتے تھے۔ وہ مجھے کیسے جانے دیتے۔"

"اللہ وسایا اُن کی باتیں سُن کر کیا بولا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"وہ آنکھیں نکال کر کھڑا ہو گیا۔" جمیلہ کے چہرے پر چھائی ہوئی افسردگی میں ہلکی ہلکی سُرخی جھلکنے لگی۔ "اُس نے کُرتے کی دونوں آستینیں چڑھائیں اور اپنی لمّی ڈانگ اُٹھا کر جوش سے بولا۔ بابے! میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ اور ابھی لے جاؤں گا۔ بلا لے اپنے پنڈ کے جوانوں کو، دیکھتا ہوں کون میرا رستہ روکتا ہے۔ یہ کہہ کر اُس نے میرا ہاتھ تھاما اور

اُونچی آواز سے بولا۔ چل پاروتی۔ ولیا جھٹ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا پَر اللہ دوسایا کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر ڈر گیا۔ ویسے بھی وہ جھگڑالو بندہ نہیں تھا۔ کہنے لگا، اللہ دوسایا تو اُسے ضرور لے جا پَر میرے تین سو روپے دیتا جا۔ میں نے اسے اتنے ہی میں خریدا ہے۔ میری بات کا تجھے وشواس نہ ہو تو صلجے والا کے گاما سے پوچھ لے جس سے میں نے اسے خریدا تھا۔ اللہ دوسایا نے جھٹ دھوتی کے ڈب سے ۵۰ روپے نکالے اور ولیا کے سامنے ڈال کر کہا۔ یہ ۵۰ رکھ لے۔ اڑھائی سو کل شام اپنے بھائی کو بھیج کر منگوا لینا۔ ویسے تجھے میرا اعتبار ہو تو کل میں خود تیری رکم تیرے گھر پہنچا دوں گا۔ اللہ دوسایا وہاں ذرا دیر بھی نہیں ٹھیرا۔ مجھے گھر لے آیا۔ سب چُپ کر کے بیٹھے رہے۔ کسی نے اُس کا رستہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔"

"اپنا زمیں دار اتنا زور آور اور جی دار ہے، یہ تو میں نوں پتہ ہی نہیں تھا۔"

"چوہدری! وہ بہت جی دار ہے۔ اُن دنوں تو خوب تکڑا جوان تھا۔ اُس کے شریر میں بڑی شکتی تھی۔" اللہ دوسایا کا ذکر کرتے وقت جمیلہ کا مرجھایا ہوا چہرہ کِھل اُٹھا۔ "بھومان شاہ سے اپنے پنڈ تک دس میل سے کم فاصلہ نہیں ہوگا۔ مَیں فرلانگ دو فرلانگ چل کر بیٹھ گئی۔ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ پَر اللہ دوسایا ذرا بھی نراش نہ ہوا۔ اُس نے مجھے اُٹھا کر پیٹھ پر لاد لیا۔ دس میل تک وہ مجھے اسی طرح اٹھائے چلتا رہا، کہیں دم نہ لیا۔ اپنے گھر پہنچ کر ہی رُکا۔ میں آنے کو تو اُس کے ساتھ آ گئی پَر بعد میں مجھے بہت ڈر لگا۔ بات یہ تھی کہ بنسی لال نے اللہ دوسایا اور اُس کے بپو کو نراض ہو کر بے دخل کر دیا تھا اور ایسے سمے بے دخلی کی تھی جب اُس کی فصلیں تیّار کھڑی تھیں۔"

"فصل واڈھو ہو تو مزارع کو بے دخل نہیں کیا جا سکتا، ایسا کبھی نہیں ہوتا۔" رحیم داد نے بنسی لال کی کارروائی کی مذمّت کی۔

"پَر بنسی لال نے ایسا ہی کیا۔" جمیلہ نے بتایا۔ "اللہ دوسایا کے بپو نے دیپال پور جا کر ہردیال سے فریاد کی، پر اُس نے بنسی لال ہی کی بات مانی۔ اللہ دوسایا اور اُس کے گھر والے پنڈ سے نکل کر اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھاتے پھرے۔ اُس کا بپو اِسی دکھ سے مر گیا۔ چھوٹا

بھائی شیخوپورہ جاکر اینٹوں کے بھٹّے پر مزدوری کرنے لگا۔ جب فسادات بھڑکے تو بنسی لال حویلی چھوڑ کر سرحد پار چلا گیا۔ اللہ وسایا اپنی ماں کے ساتھ واپس پنڈ آگیا۔ اُس نے بنسی لال کے نئے مزارع سے اپنی زمین خالی کرالی۔ اُس پر کھیتی باڑی بھی شروع کردی پر مجھے جس بات کا ڈر تھا، وہ سامنے آئی۔ اللہ وسایا کی ماں کو پتہ چلا کہ میں پنڈ کے زمیں دار لالہ ہرکشن کی دھی ہوں تو وہ آگ بگولا ہوگئی، بہت چیخی چلّائی۔ مجھے دوش دینے لگی کہ تیرے پیُو نے میرے گھر والے کو بے دخل کرکے مار ڈالا۔ اس کی ناراضی پر میں نے سوچا کہ اللہ وسایا بھی مجھ سے اپنے پیُو کا بدلہ ضرور لے گا۔ وہ تھا بھی اُن دنوں بہت کڑوا اور غصّے والا۔ دُور دُور تک اُس کی ٹکّر کا جوان نہیں تھا۔ ہر سمے مونچھیں مروڑتا رہتا اور شیر کی طرح چھاتی تان کر چلتا تھا۔"

رحیم داد مُسکرا کر بولا۔ "پر اب تو اُس کی مونچھیں سیدھی سادی رہتی ہیں۔ کبھی نہیں مروڑتا شروڑتا۔"

"اُن دنوں تُو نے اُسے نہیں دیکھا۔ بہت زور آور گبھرو ہوتا تھا۔" جمیلہ نے فخر سے گردن اُونچی کی۔ "میں اُس سے اتنی ڈری کہ رات بھر جاگتی رہی پر وہ میرے پاس آیا ہی نہیں۔ دوسری رات بھی نہیں آیا۔ نہ اُس نے مجھ سے بات کی، نہ کسی طرح کی چھیڑ چھاڑ کی۔ کئی راتیں گزر گئیں۔ البتہ اُس کی ماں روز ناراض ہوتی۔ ہر سمے غصّے سے کڑ کڑ کرتی رہتی۔ ایک روز اُس نے مجھے مارا بھی۔ ٹھیک اُسی سمے اللہ وسایا آگیا۔ حویلی خالی پڑی تھی۔ اللہ وسایا نے ماں سے تو کچھ نہیں کہا، مجھے حویلی میں لے آیا۔ حویلی پہنچ کر مجھے اور ڈر لگا۔ اکتوبر کا مہینہ تھا۔ میں کمرے میں سوتی اور وہ کمرے کے باہر منجی ڈال کر لیٹ جاتا۔ رات کو وہ کبھی کمرے میں نہیں آیا۔ دوپہر اور شام کو میرے لئے روٹی لے کر آتا مگر بات چیت بہت کم کرتا۔"

"مہاجرین نے تو اس پنڈ میں گڑبڑ نہیں کی؟"

"کیوں نہیں کی، بہت گڑبڑ کی۔" جمیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ "مہاجرین کا کیمپ لہور کی طرح منٹگمری میں بھی کھُل گیا تھا۔ انہیں جہاں بھی ہندوؤں اور سکھّوں کی چھوڑی ہوئی زمین یا مکان نظر آتا، اُس پر جھٹ کبضہ کرلیتے۔ ویسے ادھر کے وڈّے زمیں داروں نے پہلے ہی ہندوؤں اور

سکھوں کی چھوڑی ہوئی زمین اور جایداد طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے دبا رکھی تھی۔ مہاجرین کے لئے بچا ہی کیا تھا۔ کسی طرح انہیں پتہ چل گیا کہ حویلی کسی ہندو زمیں دار کی ہے۔ وہ تو چلا گیا، اُس میں اُس کی ہندو بُتیری رہتی ہے۔ فیر تو جی، انہوں نے حویلی پر قبضہ کرنے کی سوچی۔ غول کے غول پنڈ میں آ گئے اور حویلی چھیننے کی کوشش کرنے لگے پر اللہ وسایا اور اُس کے ساتھیوں نے اُن کی کوئی کوشش سپھل نہ ہونے دی۔ حویلی میں ایک بندوق موجود تھی، یہی جو تیرے پاس ہے۔ کارتوس بھی تھے۔ اللہ وسایا کے ساتھیوں میں سے کئی کے پاس دیسی کاربینیں تھیں۔ سب نے جم کر مقابلہ کیا اور حملہ آوروں کو پنڈ سے باہر نکال دیا۔ دوسرے تو کسی اور طرف نکل گئے، پَر جلندھر کے پٹھان مہاجر نہ گئے۔ انہوں نے پنڈ کے باہر پڑاؤ ڈال دیا۔"

"ان کے بارے میں تو مشہور ہے کہ آراضی کیسے بھی ہو۔ کہیں بھی ملے، ہرگز نہیں چھوڑتے۔" رحیم داد نے مسکرا کر اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا۔ "کہتے ہیں کہ ایک بار دوزخیوں نے دیکھا، جلندھری پٹھانوں کے غول کے غول دوزخ میں چلے آ رہے ہیں۔ گھبرا کر ان سے پوچھا، بادشاہو! ادھر کہاں چلے آئے۔ یہ تو دوزخ ہے۔ وہ بولے، یہ تو ہم نے بھی پتہ ہے، پر سنا ہے، ادھر زمینوں کی الاٹمنٹ ہو رہی ہے۔"

"چوہدری! تو، تو مخول کر رہا ہے۔" جمیلہ نے بھی مسکرانے کی کوشش کی۔ "پر میں ان کے بارے میں اتنا ضرور کہوں گی، انہوں نے بہت تنگ کیا۔ روز اکٹھے ہو کر ہلّا بولتے تھے۔ اتنا شور شرابہ کرتے تھے کہ میں تجھے کیا بتاؤں۔" جمیلہ نے لمبی سانس بھری۔ اس کے چہرے پہ دُکھ کے سائے ایک بار پھر پھیل گئے۔ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "رات کو حملے کا بہت ڈر رہتا تھا۔ اللہ وسایا بندوق تھامے اپنے دس باراں تگڑے ساتھیوں کے ساتھ رات بھر رکھوالی کرتا۔ میں نے روز روز کے خطرے سے گھبرا کر ایک بار اُس سے صاف کہہ دیا دیکھ اللہ وسایا! سارا جھگڑا میرے کارن ہے۔ تُو مجھے ان کے حوالے کر دے یا گولی مار دے۔ میرے ختم ہوتے ہی سارا ٹنٹا مٹ جائے گا۔ اللہ وسایا آنکھیں نکال کر بولا۔ بیکار کی کڑ کڑ نہ کر، چُپ کر کے بیٹھی رہ۔ جب تک میری جان میں جان ہے، کوئی یہاں نہیں آ سکتا۔ وہ

میری لاش سے گزر کر ہی اس حویلی میں داخل ہو سکتا ہے۔ فیر جو تیرا جی کرے، کرنا۔ دن اسی ڈر اور خوف میں گزرتے رہے۔ ایک اندھیری رات انہوں نے اکٹھے ہو کر حویلی پر ہلّا بول دیا۔ اللہ وسایا اور اُس کے ساتھیوں نے بھی مورچے سنبھال لیے۔ دونوں طرف سے تڑ تڑ گولیاں چلیں۔ میں نے جی میں ٹھانی کہ اگر بلوائی حویلی میں آئے تو میں اُن کے پہنچنے سے پہلے ہی خودکشی کر لوں گی۔ میری آشا تھی کہ انہیں میں نہ ملوں، میری لاش ملے۔''

''تو نے کیا کیا؟'' رحیم داد نے بے چین ہو کر کہا۔

''میں نے دیوار میں لگی ہوئی ایک اونچی کھونٹی میں اپنی اوڑھنی کا ایک پلّو مضبوطی سے باندھا، دوسرے پلّو کا پھندا بنایا۔ کھونٹی کے نیچے لکڑی کا سٹول رکھا، اُس پر چڑھ کر پھندا اپنی گردن میں ڈال لیا۔'' جمیلہ ایک ایک تفصیل بتاتی رہی۔ ''حویلی کے باہر شور ہوتا رہا، گولیاں تڑتڑاتی رہیں۔ بہت دیر بعد شور بند ہوا۔ گولیاں بھی رُک گئیں، تھوڑی دیر بعد حویلی کے آنگن میں بول بالا ہوا۔ ملی جلی آوازوں کے ساتھ زور زور سے چلنے کی دگڑ دگڑ ہوئی۔ مجھے ایسا لگا کہ بلوائی حویلی میں گھس آئے ہیں۔ میں نے جھٹ اپنا ایک پیر اٹھایا، دوسرے پیر کے بوجھ سے سٹول ڈگمگا کر گر گیا۔ ساتھ ہی میں بھی گری اور اوڑھنی کے ساتھ لٹکنے لگی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ مجھے کچھ پتہ نہ چلا کہ فیر کیا ہوا۔''

رحیم داد نے پریشان ہو کر کہا۔ ''تو پھندے سے لٹکی رہی تھی؟''

''بالکل لٹکی رہی تھی۔'' جمیلہ نے سکون سے جواب دیا۔ ''رات گئے مجھے ایسا لگا کہ میں زندہ ہوں۔ میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ مجھے دکھ ہوا کہ کیوں بچ گئی۔ میں اُس نرک میں دوبارہ نہیں جانا چاہتی تھی جس سے نکل کر آئی تھی۔ ڈرتے ڈرتے میں نے آنکھیں گھما کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔ اللہ وسایا میرے سرہانے بت بنا بیٹھا تھا۔ اُس نے میری آنکھیں کھلی دیکھیں تو بھاگا بھاگا گیا، گلاس میں پانی لے کر آیا۔ ایک ہاتھ سے میرا سر اونچا کیا اور میرے منہ میں پانی ڈالا۔ مجھے بہت پیاس لگی تھی۔ سارا پانی پی گئی۔ مانو میں تو مر ہی چکی تھی۔ یہ اللہ وسایا تھا جس نے مجھے مرنے سے بچا لیا۔''

"ہاں! وہ نہ ہوتا تو تو ہرگز نہ بچتی۔" رحیم داد نے اُس کی تائید کی۔

"پانی پی کر ذرا جان آئی تو میں نے اللہ وسایا سے پوچھا کہ بلوائیوں کا کیا بنا؟ وہ ہنس کر بولا، بننا کیا تھا اُن کا۔ سب بھاگ گئے۔ میں نے کچھ دیر چپ رہ کے کہا۔ پر وہ کل نہیں تو پرسوں ضرور ہلّا بولیں گے۔ اللہ وسایا ذرا بھی نہ گھبرایا، مسکراتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کے کُرتے کی آستین خون سے لال ہو رہی ہے۔ کپڑوں پر بھی جگہ جگہ خون کے دھبّے تھے۔ میں گھبرا گئی۔ وہ ہنس کر بولا، گولی بازُو میں لگی تھی پر اندر نہیں اتری۔ گولی چلتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں تکیے کے سہارے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ مجھے اب بھی یاد ہے، اللہ وسایا نے بار بار منع کیا پر میں نے جھٹ اپنی اُوڑھنی پھاڑ کر اُس کے گھاؤ پر پٹّی باندھ دی۔"

"بلوائیوں نے دوبارہ حملہ کیا ہوگا۔ اللہ وسایا تو زخمی تھا۔ اُس نے کیسے مکابلہ کیا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"اُس رات کے بعد حملہ نہیں ہوا،" جمیلہ نے بتایا۔ "میں نے اُسی رات فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے اللہ وسایا سے فوراً ویاہ کر لینا چاہیئے ورنہ وہ مجھے بچانے کی کوشش میں مارا جائے گا۔ میں نے جب اُس سے یہ بات کہی تو وہ تیار نہیں ہوا، کہنے لگا۔ میں ٹھرا جانگلی اور تو ٹھرّی وڈّے زمیں دار کی دھی۔ مزارع کا زمیں دار کی دھی سے کیسے سگن ہو سکتا ہے، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں نے اُس کے کندھے پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تب اللہ وسایا نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میرے آنسو پونچھے۔ اُسی صبح میں اللہ وسایا کے ساتھ پنڈ کی مسجد میں گئی۔ ملّاں جی نے سب کے سامنے مجھے کلمہ پڑھایا۔ میں مسلمان ہو گئی۔ میرا نام جمیلہ رکھا گیا۔ اُسی روز ملّاں نے اللہ وسایا کے ساتھ میرا نکاح پڑھا دیا۔ بس جی اس طرح ہمارا ویاہ ہوا۔ میں پاروتی نہ رہی، اللہ وسایا کی جمیلہ بن گئی۔ یہ میرا نیا جیون تھا اور یہ نیا جیون مجھے اللہ وسایا ہی نے دیا تھا۔"

"اللہ وسایا کی ماں بھی نکاح میں شامل ہوئی تھی؟"

"نہیں جی۔ وہ تو اتنی ناراض ہوئی کہ اُسی روز پنڈ چھوڑ کر اپنے چھوٹے پتّر کے پاس شیخوپورہ

چلی گئی۔ اللہ وسایا اُسے واپس لانے کئی بار شیخو پورے گیا پر وہ نہ آئی۔ بہت ضدّی اور ہٹیلی تھی۔
دو برس ہوئے اُس کا مرن ہو گیا۔ اللہ وسایا کا بھائی بھی کبھی یہاں نہیں آیا۔ سنا ہے وہ
کراچی چلا گیا۔ اُس کے بارے میں کچھ اور پتہ نہیں چل سکا۔"

☆

سورج غروب ہو رہا تھا۔ دھوپ بلندیوں پر پہنچ چکی تھی۔ مزارع اور کسان مویشیوں کو ہنکاتے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ رحیم داد اور جمیلہ خاموش بیٹھے تھے۔ نوکر نے لسّی سے بھرے ہوئے گلاس دونوں کے سامنے میز پر رکھ دیے۔ جمیلہ نے لسّی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا "برسوں بعد میں نے اپنے بارے میں کسی کو اتنی باتیں بتائی ہیں۔ لگتا ہے، بہت ہلکی پھلکی ہو گئی ہوں۔ اُس رات میں بہت بے کل تھی جب ہردیال اور چاچا مجھے لینے یہاں آئے تھے۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ بار بار رونے کو جی چاہتا، رات کو نیند بھی نہ آئی۔ آج میں آرام نال سو سکوں گی۔ مانو میرے من کا بوجھ اتر گیا۔"

رحیم داد کوئی فوری ردِّ عمل ظاہر نہ کر سکا۔ وہ جمیلہ کی بپتا کے ہوش رُبا اور حیرت انگیز تانے بانے میں اُلجھ کر رہ گیا۔ اسی اثنا میں حویلی کے اندر سے جمیلہ کی بیٹی نینا کے زور زور سے رونے کی آواز ابھری۔ جمیلہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھی "لگتا ہے بہن بھائی میں جھگڑا ہو گیا۔ کھیلتے کھیلتے لڑنے لگتے ہیں۔" وہ تیز قدم اٹھاتی حویلی کی جانب روانہ ہو گئی۔ رحیم داد اُسے دور تک دیکھتا رہا اور اُس کے جانے کے بعد گم صم بیٹھا رہا۔

شام ہو گئی۔ اندھیرا بڑھنے لگا۔ رحیم داد اُٹھا اور بوجھل قدموں سے مہمان خانے کی سمت بڑھا۔ وہ نڈھال نظر آ رہا تھا۔

تیسرے روز اللہ وسایا واپس آ گیا۔ شام کو وہ باغ میں رحیم داد سے ملا۔ خلافِ معمول وہ بجھا بجھا لگ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھیں خالی خالی اور ویران تھیں۔ رحیم داد نے چاہا کہ اُس کی پریشانی کا سبب معلوم کرے مگر اللہ وسایا زیادہ دیر نہیں بیٹھا، معذرت

کے انداز میں بولا۔ ''معاف کرنا چوہدری، میری طبیعت آج کچھ گڑبڑ ہے۔ کل تجھ سے آرام سے گل بات کروں گا۔'' وہ چلا گیا۔

جمیلہ کے بھائی ہردیال اور چچا کے بارے میں نہ اللہ وسایا نے کچھ کہا نہ رحیم داد نے اُن کا ذکر چھیڑا۔

اللہ وسایا اب ہر وقت چُپ چُپ رہتا۔ بہت کم بات کرتا اور بات کرتے کرتے بہک جاتا۔ جب بھی ملتا کچھ سوچتا نظر آتا۔ کئی روز گزر گئے۔ مگر اللہ وسایا کے چہرے پر پہلی سی تازگی اور شگفتگی دکھائی نہ دی۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ اندر ہی اندر سلگ رہا ہو۔ اُسے کوئی بڑا صدمہ پہنچا تھا۔ رحیم داد نے کئی بار ہمت کر کے پوچھا بھی مگر وہ ٹال گیا۔

انھی دنوں ایک شام جمیلہ باغ میں آئی۔ رحیم داد پہلے سے بیٹھا تھا۔ وہ بھی ایک طرف بیٹھ گئی۔ اللہ وسایا گاؤں میں نہیں تھا۔ کہیں گیا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بھاتاں آ گئی۔ وہ جمیلہ کے پیروں کے پاس گھاس پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''بھین جی! تاجاں کی سسرال والے اگلے مہینے کے پہلے جمعے کو آ رہے ہیں۔'' اُس نے انگلیوں پر حساب لگایا۔ ''آج کے چھّبی دیں دن وہ ویاہ کی تاریخ مانگنے آ رہے ہیں۔''

''کب تک ویاہ کرنا چاہتے ہیں۔'' جمیلہ نے پوچھا۔

''اُن کا ارادہ تو جلدی کرنے کا ہے۔'' بھاتاں نے جواب دیا۔ ''پر اپنے پاس تو کچھ نہیں۔''

''تو کیوں چنتا کرتی ہے۔'' جمیلہ بولی۔ ''تجھے مجھ پر وشواس نہیں؟ تجھ سے کہہ تو چکی ہوں، میں تاجاں کا ویاہ خوب دھوم دھڑّکے سے کروں گی۔ تاجاں تیری نہیں، میری بھی دھی ہے۔''

بھاتاں کا چہرہ کھل اٹھا۔ ''تو جی میں کہلوا دوں کہ وہ ساھے کے لیے آ جائیں۔''

''بالکل کہلوا دے۔ ان کو یہیں حویلی میں لانا۔'' جمیلہ نے کہا۔ ''پر یہ تو سوچ، جلدی کیسے ویاہ ہو سکتا ہے اتنی گرمی میں؟'' اُس نے گردن اُٹھا کر اوپر دیکھا، چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر اُس نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ''ساون ٹھیک رہے گا۔'' مگر فوراً اُس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ ''پر ساون میں تو زبردست برکھا ہوتی ہے۔ سگائی کا کیا مزا آئے گا۔ یہ کیا گل ہوئی

کہ جنج چڑھے اور اوپر بادل گرجتے ہوں۔ بجلی چمکتی ہو، چاروں اُور پانی ہی پانی ہو۔ نہ ٹھیک سے ملنی ہو نہ سٹھنیاں۔ ماگھ کیسا رہے گا؟"

"نا بھین جی! ماگھ تو بہت دُور ہے۔" بھاتاں رضا مند نہیں ہوئی۔ "وہ لوگ ویاہ میں اتنی دیری نہیں چاہتے۔"

"سوچ لے تو جب کہے گی، تیاری ہو جائے گی۔" جمیلہ نے اڑنے کی مطلق کوشش نہیں کی۔ "تیری تاجاں تو بہت سندر مٹیار ہے۔ اُس کا ویاہ بھی سندر ہونا چاہیئے۔ سمے بھی ویسا ہی ہونا چاہیئے۔ اگے تیری مرضی۔ میں نے کیا لینا۔"

"میرا کیا ہے جی! تو سسرال والوں کو تیار کر لینا۔" بھاتاں نے مسکرا کر کہا۔

"ایہہ گل ہے تو سلھے کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دے۔ میں انہیں راضی کر لوں گی۔ کوئی شبھ گھڑی ہونی چاہیئے۔ اس کے بارے میں ہل جُل کر طے کر لیں گے۔"

بھاتاں اٹھتے ہوئے بولی۔ "بھین جی ساہے کا دن یاد رہے گا ناں؟"

"بالکل یاد رہے گا۔" جمیلہ بھی کھڑی ہو گئی اور بھاتاں کے ساتھ ساتھ باغ سے چلی گئی۔

رحیم داد کو حیرت ہوئی کہ اللہ دسایا کے برعکس جمیلہ کے چہرے پر پہلی سی تازگی تھی اور ویسا ہی نکھار تھا۔ اُس کے رویے میں بھی وہی شگفتگی تھی جو مسکراہٹ بن کر اُس کے ہونٹوں پر ہر وقت رقصاں رہتی تھی۔

اللہ دسایا نہ باغ میں آیا نہ رات کو مہمان خانے میں۔ وہ دوسرے روز دن چڑھے رحیم داد کے پاس آیا۔ اُس کا چہرہ اب بھی اترا ہوا تھا۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "چوہدری میں دو گھنٹے بعد لہور جا رہا ہوں۔ جمیلہ اور دونوں بچے میرے ساتھ جائیں گے۔"

"کوئی خاص کام ہے لہور میں؟" رحیم داد کے استفسار میں حیرت تھی۔

"خاص ہی کام ہے۔" اللہ دسایا نے کام کی نوعیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ "تجھے کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ میں نے نوکروں کو بول دیا ہے۔ آرام سے رہ، یہ تیرا ہی گھر ہے، جس چیز کی ضرورت ہو منگوا لینا۔"

"کب تک واپسی ہوگی؟" رحیم داد نے پوچھا

"تین چار روز تو لگ ہی جائیں گے۔ زیادہ دن بھی ہو سکتے ہیں۔"

رحیم داد دریافت کرنا چاہتا تھا کہ وہ ملتان سے واپسی کے چند ہی روز بعد لاہور کیوں جا رہا ہے اور جمیلہ کو کس لئے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔ اس کے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی مگر اللہ وسایا نے اسے موقع ہی نہیں دیا۔ وہ فوراً باہر چلا گیا۔

اللہ وسایا اسی روز بیوی بچوں کے ہمراہ لاہور روانہ ہو گیا۔ رحیم داد بالکل تنہا رہ گیا۔ وہ بار بار اللہ وسایا کے بشرے سے ٹپکتی ہوئی پریشانی کے بارے میں غور کرتا۔ جتنا وہ غور کرتا، اللہ وسایا کا رویّہ اُسے پُراسرار نظر آتا۔ وہ دن دن بھر کمرے میں بند ہو کے حسبِ معمول چودھری نور الٰہی مرحوم کے جعلی دستخط بنانے کی مشق کرتا رہتا، شام کو نہا دھو کر ٹہلتا ہوا باغ کی جانب نکل جاتا۔ رات کا کھانا مہمان خانے میں یا باغ میں کھاتا۔ مہمان خانے کی چھت پر بندوق سرھانے رکھ کر سوتا اور بہت چوکنّا سوتا۔ ذرا کھٹکا ہوتا، اور وہ بندوق پر ہاتھ رکھ کر اٹھ بیٹھتا۔ احمد صحت یاب ہو گیا تھا۔ وہ رات کو آنگن میں سوتا۔ اس کے آنے سے رحیم داد کو خاصی تقویت مل گئی تھی۔

اللہ وسایا نویں روز بیوی بچوں کے ساتھ صبح صبح واپس آگیا مگر رحیم داد سے نہیں ملا۔ شام کو رحیم داد باغ میں بیٹھا تھا کہ اللہ وسایا آیا۔ جمیلہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس دفعہ نہ صرف اللہ وسایا کے چہرے پر بلکہ جمیلہ کے چہرے پر بھی پریشانی برس رہی تھی۔ دونوں کچھ دیر گم صم بیٹھے رہے پھر اللہ وسایا نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "چوہدری! یہ حویلی ہم نے جلد ہی خالی کرنی ہوگی۔"

رحیم داد ششدر رہ گیا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیوں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہم مکدمہ ہار گئے ہیں پہلے ملتان میں ہارے فیر لہور میں۔ ایڈیشنل کمشنر بحالیات کے پاس اپیل کی۔ اس نے اپیل نامنظور کر دی۔ حویلی اور ہماری ساری زمین متروکہ جائیداد کرار دے دی گئی ہے۔" اللہ وسایا نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "یہ حویلی اور زمین جمیلہ کے بیو کی ملکیت تھی۔ اس کی دھی ہونے کے ناتے جمیلہ کے نام پر یہ میرے پاس تھی پر سرکار

نے جمیلہ کو وارث ماننے سے انکار کر دیا۔"

"چوہدری! یہ تو دیکھ، میرے پیو کی تو بہت آراضی تھی۔ اس کی دو ہزار ایکڑ سے اوپر زمین احسان شاہ نے دبالی پر اس کا کبضہ مان لیا گیا۔" جمیلہ نے گلے کے انداز میں کہا۔ "ویسے اُس کے پاس پہلے ہی دو سو مربع کے لگ بھگ اراضی تھی۔ یہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی مدد کرنے اور وفاداری دکھانے پر اس کے پُرکھوں کو ملی تھی۔" اس کا لہجہ تلخ ہوگیا۔ "انگریز کا راج تھا، تب اس کی چلتی تھی۔ اب انگریز کا راج نہیں رہا تب بھی اس کی چلتی ہے۔ اس نے ہمارے خلاف درخواست لگائی تھی۔ ہم نے اپنی زمین کی واپسی کے لئے اس کے خلاف درخواست لگائی تو کوئی انکوائری شنکوائری نہ ہوئی پر اس کی درخواست پر فٹافٹ انکوائری کا حکم جاری کر دیا گیا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اللہ وسایا ہار گیا۔ احسان شاہ جیت گیا۔"

"اُسے تو جیتنا ہی تھا، اُس کی اُوپر تک پہنچ ہے۔ وزیروں اور افسروں سے یاری ہے۔ اس کے پُتر اور جنوائی بھی وڈّے افسر ہیں۔ وہ نہ جیتے گا تو کیا میں جیتوں گا۔"

"تُو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" جمیلہ کا لہجہ تیکھا اور مزید تلخ ہو گیا۔ "احسان شاہ نے تو جیتنا ہی جیتنا تھا۔ احسان شاہ کے پُرکھے بھی تیرے پُرکھوں سے جیتے تھے، جنہوں نے اپنی دھرتی کو انگریزوں کی غلامی سے بچانے کے لئے جنگ لڑی تھی، بغاوت کی تھی۔ وہ باہنی وال تھے۔ ہار گئے تو اُن سے زمین، مویشی، عزّت آبرو، سب کچھ چھین لیا گیا۔ اُنہیں تباہ و برباد کر کے جانگلی بنا دیا گیا۔ احسان شاہ کے پُرکھوں نے انگریزوں کے کارن غدّاری کی، آزادی کا سودا کیا، ان کے ساتھ مل کر باہنی وال وردُھیوں کو کچل دیا۔ انگریزوں نے خوش ہو کر اُنہیں عزّت دی، شان دی، سیّد اور شاہ جی کہا اور سیّد اور شاہ جی بھی بنا دیا۔"

"جمیلہ تو ایسی باتیں کیوں کرتی ہے؟" اللہ وسایا نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں نے جھوٹ تو نہیں کہا۔" جمیلہ اُسی تلخی سے بولی۔ "میں نے تاریخ کی کتابوں میں جو پڑھا ہے، وہ بتا رہی ہوں۔" اُس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "سر ڈینزل ابٹ سن بہت وڈا انگریز افسر ہوتا تھا اس نے پنجاب کی کوموں اور جات برادریوں کے بارے میں ایک

کتاب بھی لکھی ہے۔ اُس کا نام ہے 'پنجاب کاسٹس'، ابٹ سن نے اس میں لکھا ہے، ۱۸۵۷ء کی گڑ بڑ میں باہنی وال ودرُوھیوں نے انگریز فوجوں کو بہت تنگ کیا۔ وہ لٹیرے اور جانگلی تھے۔ سو باہنی وال آج تک جانگلی کہلاتے ہیں۔ تُو خود سوچ، انگریز کی مونچھ کا بال خاندانی جگیردار سیّد احسان شاہ، ایک باہنی وال جانگلی اور معمولی مزارع اللہ وسایا کو کیسے زمیں دار دیکھ سکتا ہے۔ تب ہی تو اُس نے اللہ وسایا سے زمیں داری چھین لی۔ اُس کی پگ کا طرّہ اور اُونچا ہو گیا۔"

"احسان شاہ میری زمیں داری ہی سے نہیں، تیرے سکول سے بھی خار کھاتا ہے۔"

"سکول سے کیوں خار کھاتا ہے؟ سکول نے احسان شاہ کا کیا بگاڑا ہے؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"وہ میرے سکول سے سخت ناراض ہے وہ یہ نہیں چاہتا کہ جانگلیوں اور کمیّوں کے بچے پڑھ لکھ کر یہ جان لیں کہ وہ جانگلی اور کمّی کیوں ہیں اور احسان شاہ کیسے جگیردار بن گیا۔ انہیں پتہ چل جائے گا کہ اُس کے پُرکھے اپنے انگریز حاکموں کے جوتے چاٹتے تھے۔ اُن کے سامنے کتّوں کی طرح دم ہلاتے تھے۔" اُس کے ہونٹوں پر زہرخند نمودار ہوا۔ "یہ ہے احسان شاہ کی اصلیت جس کے بل پر وہ شاہ جی بنا پھرتا ہے، اپنے کو خاندانی جگیردار اور رئیس بتاتا ہے۔"

اللہ وسایا اور رحیم داد خاموش بیٹھے رہے۔ جمیلہ کے چہرے پر جھنجلاہٹ اور نفرت سُرخی بن کر پھیل گئی۔ وہ ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہی تھی۔

"اب کیا ہوگا؟" کچھ دیر بعد رحیم داد نے سکوت توڑا۔

"ہونا کیا ہے، وہی جو میں نے کہا ہے۔" اللہ وسایا نے جواب دیا۔

"کب تک حویلی خالی کرنی ہوگی؟"

"دس روز کے اندر اندر حویلی خالی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔"

اللہ وسایا کھڑا ہو گیا، جمیلہ اور رحیم داد بھی کھڑے ہو گئے۔ تینوں باغ سے نکلے اور مہمان خانے میں پہنچے مگر اللہ وسایا ٹھہرا نہیں، حویلی میں کھلنے والے دروازے کی جانب

بڑھا۔ جمیلہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ رحیم داد نے شام کی دھندلی روشنی میں دیکھا کہ جمیلہ تھکی ہوئی اور نڈھال نظر آرہی ہے۔ اُس کے قدم ڈگمگائے۔ اللّٰہ دسایا نے اُسے سنبھال لیا۔ جمیلہ نے اُس کے بازو پر اپنا سر ٹکا دیا۔ شاید وہ رو رہی تھی۔ رحیم داد اُس کا چہرہ نہ دیکھ سکا، صرف یہ دیکھ سکا کہ اللّٰہ دسایا اُس کا کندھا بڑے پیار سے تھپک رہا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے سہارے سنبھل سنبھل کر چلتے ہوئے حویلی میں داخل ہو گئے۔

رحیم داد مہمان خانے میں تنہا رہ گیا۔ احمد بھی نہیں تھا۔ وہ آنگن میں پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ ایک اداس شام تھی اور اس سے بھی زیادہ اداس رحیم داد تھا۔ اُس کے ذہن میں سوالات کا سیلاب امڈ رہا تھا۔ ایک کے بعد دوسرا سوال اُٹھ رہا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ وہ کس کے پاس جائے گا؟ کہاں جائے گا؟ کیسے جائے گا؟ ان سوالات کا اُس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ زندگی ایک بار پھر اُسے بوجھ نظر آنے لگی۔

وہ بے چین اور مضطرب تھا۔ احمد کھانا لایا مگر وہ آدھی روٹی بھی نہ کھا سکا۔ بستر پر لیٹا تو آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ رات کروٹیں بدلتے کسی نہ کسی طور کٹی۔ سویرے اُٹھا تو وہی اُلجھن اور پریشانی تھی۔ دوپہر ہوئی، رات ہوئی۔ نہ اللّٰہ دسایا نظر آیا، نہ جمیلہ۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ رحیم داد نے سوچا کہ دونوں گاؤں چھوڑنے کی تیاریوں میں مصروف ہوں گے۔ زمیں داری کا بہت بڑا بکھیڑا تھا۔ اُنہیں جانے سے پہلے ہر کام نمٹانا تھا۔

رحیم داد کو بھی اب کوٹلہ ہرکشن سے کہیں نہ کہیں جانا تھا۔ اللّٰہ دسایا اُسے پہلے ہی صورتِ احوال سے خبردار کر چکا تھا۔ اُس نے سویرے سویرے نائی بلوایا، بال کٹوائے، داڑھی کی تراش خراش کرائی۔ حجامت بنوانے کے بعد غسل خانے میں گیا۔ نہا دھو کر اُجلے کپڑے پہنے۔ کنگھی سے سر اور داڑھی کے بال سنوارے، آنکھوں پر عینک لگائی اور دیوار میں لگے ہوئے آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے چہرے کا زخم کب کا مندمل ہو چکا تھا مگر اُس کے بائیں رخسار پر لگ بھگ چار انچ لمبا نشان ہلال کی شکل میں چھوڑ گیا تھا۔ اُس نے گردن اِدھر اُدھر گھما کر اپنے چہرے پر مختلف زاویوں سے نظر ڈالی، زیرِ لب مسکرایا۔

اب اُس کی شکل و شباہت میں اتنا فرق آچکا تھا کہ اسے شناخت کرنا آسان نہیں تھا۔ چہرے مہرے سے وہ اس قدر مختلف بن چکا تھا کہ لاری یا ٹرین سے بھی سفر کر سکتا تھا۔

آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے اُس نے طے کیا کہ وہ کوٹلہ ہرکشن شام ہونے سے پہلے چھوڑ دے گا۔ منٹگمری اسٹیشن جانے کے بجائے لاری سے پاک پتن جائے گا اور رات کی ٹرین سے لودھراں پہنچ کر بہاول پور کے راستے سندھ کی طرف نکل جائے گا۔ سکھر، شکارپور، نواب شاہ یا سندھ کے کسی بھی ضلع میں چلا جائے گا۔ چودھری نور الٰہی کے کلیم کی بنیاد پر زرعی زمین اور مکان الاٹ کرانے کی کوشش کرے گا۔ جب تک الاٹمنٹ نہیں ملے گا، کہیں دکان کھول لے گا یا کوئی اور کاروبار شروع کر دے گا۔ لالی کی دی ہوئی تین ہزار سے اوپر رقم اُس کے پاس موجود تھی۔ اس رقم سے وہ بہت کچھ کر سکتا تھا۔ سندھ میں کسی جان پہچان والے کے ملنے کا امکان بھی کم تھا۔ وہ چودھری نور الٰہی کے روپ میں اطمینان سے نئی زندگی کا آغاز کر سکتا تھا۔

وہ چودھری نور الٰہی بن کر ہی زندہ رہنا چاہتا تھا۔ رحیم داد کو وہ بہت پہلے ختم کر چکا تھا۔ بیگماں کے قتل کے بعد رحیم داد سے اُس کے سماجی وجود کا آخری رشتہ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ یہ پھانسی کا خطرہ مول لے کر رحیم داد کو زندہ رکھنے کی آخری کوشش تھی جس میں وہ اپنی اکلوتی بہن کو بھی داؤ پر لگا چکا تھا۔ وہ کس کے لئے رحیم داد بن کر زندہ رہتا؟ نوراں کے لئے؟ بچوں کے لئے؟ اُس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ نوراں مر گئی۔ اُس کے ساتھ بچے بھی مر گئے۔ اب اس کا کوئی رشتہ نہیں رہا تھا۔ رحیم داد اس کے لئے ماضی کے کباڑ خانے کا حصہ بن چکا تھا۔ زنگ خوردہ، بوسیدہ، بیکار اور فضول۔

☆

احمد ناشتہ لے کر کمرے میں آیا۔ اس کا چہرہ بھی مرجھایا ہوا تھا۔ وہ اداس اور مضمحل لگ رہا تھا۔ رحیم داد نے لسی کا گھونٹ بھر کر اظہارِ ہمدردی کے طور پر پوچھا "حمدے! تو پریشان لگ رہا ہے۔ بات کیا ہے؟"

"پریشانی کی تو جی گل ہی ہے۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تینوں تو پتہ ہی ہے کہ زمین دار

مکدمہ ہار گیا۔ وہ زمیں دارنی کے ساتھ پنڈ چھوڑ کر جا رہا ہے۔"

"تجھے کیسے پتہ چلا؟"

"مجھے تو جی پتہ چل ہی جاتا۔ میں تو حویلی کا نوکر ٹھیرا۔" احمد نے بتایا۔ "پر اب تو یہ بات سب جانتے ہیں۔ زمیں دار ہی نے سب کو بتایا ہے۔ پنڈ میں ہر جگہ اسی بات کا چرچا ہے۔ سب دکھی ہیں۔ کیا مزارع، کیا کمی۔ سبھی زمیں دار اور زمیں دارنی سے بہت پیار کرتے ہیں۔ میں نے تو جی کتنوں ہی کو روتے دیکھا۔"

"دکھ کی تو گل ہی ہے۔" رحیم داد نے اس کی تائید کی۔ "پنڈ والوں کو ایسا زمیں دار نہیں ملے گا۔"

"توبہ کرو جی! وہ زمیں دار ہی کب تھا۔ وہ اور زمیں دارنی تو سب سے اس طرح گھل مل کر رہتے تھے جیسے اُس کے اپنے شریکے اور گھر والے ہوں۔" احمد آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ "وڈے زمیں دار تو جی! ویاہ ہو یا موت، ہر مزارع سے بھیڑ بکری، بھاڑ دیا پھندر لیتے ہیں۔ بیماری ہو یا مہمان آئے، جتنے لکڑ چاہے منگوا لیتے ہیں۔ مزارع کی دودھ دینے والی مجھ ہو یا ڈھگی، جب تک جی چاہے اپنے پاس رکھتے ہیں۔ گاہ کے وکھت ایک جوڑا ڈنگرا اور جتنے بندے چاہتے ہیں بلا لیتے ہیں۔ ماڑی یا حویلی کی لپائی، کنک کی پسائی سب مفت کراتے ہیں۔ ایسی ہی جانے کتنی طرح کی مزارعوں سے ویگار لیتے ہیں۔ مویشی اور چوکھر تو اٹھواتے ہی ہیں، نوجوان گھر والیوں اور کڑیوں تک کو اٹھوا لیتے ہیں۔ واپس کرنے کی رکم مانگتے ہیں یا بیچ دیتے ہیں۔ کیا کیا بتاؤں کہ وڈے زمیں دار کتنا ظلم کرتے ہیں پر اپنا زمیں دار تو نیک بندہ ہے، اُس نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ جبھی تو سب اُس کے لئے رو رہے ہیں۔"

"اس کے جانے کے بعد تو کیا کرے گا؟"

"میں تو جی اس کے ساتھ ہی جاؤں گا۔" احمد نے جواب دیا۔

"اور اگر وہ تجھے اپنے ساتھ نہ لے گیا تو کیا کرے گا؟"

"تب تو جی میں یہ پنڈ ہی چھوڑ دوں گا۔" احمد نے کہا۔ "اس کے جانے کے بعد میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ پنڈ کے جانے کتنے لوگ سوچ رہے ہیں کہ زمیں دار اور زمیں دارنی کے جاتے ہی

کسی اور پنڈ کو چلے جائیں گے۔ جانے نیا زمیں دار کون ہو، کیسا ہو۔ اور جی کوئی بھی ہو۔ ہو گا تو وڈا ہی زمیں دار اور ایسے سب زمیں دار ایک ہی سے ہوتے ہیں۔" اس کی آواز بھرّا گئی۔ آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔" یہ تو جی بہت بُرا ہوا۔ بہت ہی بُرا ہوا۔"

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ احمد سامنے فرش پر خاموش بیٹھا بار بار آنسو پونچھتا رہا۔ رحیم داد ناشتے سے فارغ ہوا تو وہ برتن اُٹھا کر باہر چلا گیا۔

پہر دن گزر گیا۔ گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ لُو کے جھکڑ چلنے لگے تھے۔ مہمان خانے پر سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ فضا بوجھل اور غبار آلود تھی۔ رحیم داد بستر پہ لیٹ گیا۔ اُس کی آنکھ لگ گئی۔

دوپہر کو قدموں کی آہٹ سے رحیم داد کی آنکھ کھُل گئی۔ اُس نے دیکھا کہ اللہ وسایا کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ اُس کے ساتھ جمیلہ بھی تھی۔ رحیم داد اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اللہ وسایا اور جمیلہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

رحیم داد نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔" باہر زبردست گرمی ہے۔"

" ہاں جی! آج گرمی کچھ زیادہ ہی ہے۔" اللہ وسایا بولا " سویرے سے لُو چلنی شروع ہو گئی۔"

رحیم داد نے جھجکتے ہوئے اُسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔" میرا تو آج شام سے پہلے یہاں سے جانے کا ارادہ ہے۔ سوچا تھا، روٹی کھا کر تیرے پاس آؤں گا۔ تم دونوں سے مل کر چلا جاؤں گا۔"

جمیلہ چپ بیٹھی رہی۔ اللہ وسایا نے کہا۔" چلا جانا، ایسی کیا جلدی ہے۔ دو چار روز ٹھیر جا۔ ہم نے بھی یہاں کب تک رہنا ہے۔ حویلی تو خالی ہی کرنی ہے۔"

" آگے کے لئے تُو نے کیا سوچا؟"

" ابھی تو کچھ نہیں سوچا۔" اللہ وسایا نے سادگی سے جواب دیا۔

" سوچنا کیا ہے۔" جمیلہ نے کرسی پر پہلو بدلا اور اللہ وسایا کی جانب مڑ کر دیکھا۔" تیرے پاس ۱۵ ایکڑ زمین تو رہے گی۔ مزارع بن کر تو ہم اس پنڈ میں رہ ہی سکتے ہیں۔"

" تو جی، اس کی سنو۔" اللہ وسایا نے مسکرانے کی کوشش کی۔" جس پنڈ میں اٹھ سال

تک زمیں داری کی، اب تو اسی میں مجھے مزارع بنا کر ٹھہرانا چاہتی ہے۔ ذرا سوچ تو، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"نہیں جی، یہ نہیں ہو سکتا۔" رحیم داد نے بھی اللہ وسایا کی تائید کی۔ "زمیں دار اپنے ہی پنڈ میں مزارع بن کر نہیں رہ سکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ عزت اور آبرو بھی آخر کوئی چیز ہوتی ہے۔"

"چھوڑ چوہدری کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔" جمیلہ تیکھے لہجے میں بولی۔ "سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اور جی سب سے وڈی گل ایہہ ہے کہ میں نے اپنا سکول نہیں چھوڑنا۔ اللہ وسایا! تو زمیں داری بھول جا۔ اپنے تئیں مزارع سمجھنے کی کوشش کر۔ ویسے بھی زمیں دار بن کر تو کب زمیں دار رہا۔ نہ وہ تیری آکڑ تھی، نہ وڈے زمیں داروں والی آن بان تھی اور مجھے تیری یہی سادگی اچھی لگتی تھی۔"

"چل، تیری گل میں نے مان لی۔ میں تو مزارع بن جاؤں گا۔ پہلے بھی مزارع ہی تھا۔ میرا پیو بھی مزارع تھا۔ زمیں دار تو مجھے تو نے بنایا۔" اللہ وسایا کھل کر مسکرایا۔ "پر تو مزارع کی گھر والی بن سکے گی؟"

"بالکل بن سکتی ہوں۔" جمیلہ نے جوش سے سینے پر ہاتھ مارا۔ "آزما کے دیکھ لے۔" وہ اور زیادہ جوش میں آ گئی۔ کرتے کی دونوں آستینیں چڑھا لیں۔ اس کے گورے گورے ہاتھ دور تک عریاں ہو گئے۔ "تو نے مجھے سمجھا کیا ہے۔ سویرے سویرے اٹھ کر مویشیوں کے لیے پٹھا دتا کروں گی۔ چاٹی میں مدھانی ڈال کر دودھ بلوؤں گی۔ تو کھیتوں پر جائے گا اور میں بچوں کو لے کر سکول چلی جاؤں گی۔ دوپہر کو روٹی پکاؤں گی اور سر پر چنگیر میں رکھ کر تیرے لئے بھتا لے کر کھیتوں پر جاؤں گی۔ تیرے کپڑے دھوؤں گی۔ چرخے پر سوت کاتوں گی۔ چکی میں دانا پیسوں گی۔ میں کیا نہیں کر سکتی۔"

"چوہدری! سن رہا ہے، اس کی باتیں۔" اللہ وسایا نے رحیم داد کو مخاطب کیا پھر مڑ کر جمیلہ کی جانب دیکھا۔ "تجھ سے یہ سب کچھ ہو سکے گا؟ جمیلہ! ایسا کرنا تیرے بس میں نہیں۔ تیرا

یہ سارا رنگ روپ مٹ جائے گا۔ آئینہ دیکھے گی تو خود کو پہچان بھی نہ سکے گی۔ کہے گی، ہائے ربا! میں تو برباد ہو گئی۔ یہ کیا ہو گیا۔ تو نے یہ بھی سوچا؟"

"اللہ وسایا! روپ رنگ کا کیا ہے۔ یہ تو دھوپ چھاؤں ہے۔ آج نہیں تو کل اسے مٹنا ہے۔" وہ سنجیدگی سے اپنی بات پر اڑی رہی۔ "میں نے تھوڑا جیون گزار کر ہی بہت کچھ دیکھ لیا ہے۔ کبھی اپنے کو اُس پاروتی کے روپ میں دیکھا جو لہور میں پڑھتی تھی۔ بڑھیا کپڑے پہنتی تھی، کالج کے ڈراموں میں سوانگ بھر کر ایکٹنگ کرتی تھی، ہنستی تھی۔ ہنساتی تھی۔ سکھیوں کے ساتھ ناچتی گاتی تھی۔ پکنک مناتی تھی۔ شام کو راوی پر کشتی چلاتی تھی۔ کار میں سواری کرتی تھی۔ شان دار کوٹھی میں رہتی تھی۔" اُس کا لہجہ دھیما پڑ گیا۔ "میں نے اُس پاروتی کو بھی دیکھا جسے ستمبر ۱۹۴۷ء کی رات بصیر پور سٹیشن سے بلوائی اٹھا لے گئے۔ پھر وہ پاروتی نہ رہی بھوکے کتوں کے لئے ہڈی بن گئی۔ کبھی تین سو میں بکی، کبھی پنج سو میں۔" اُس کا چہرہ مرجھا گیا۔ لہجہ تلخ ہو گیا۔ "تو مجھے ولیا کے گھر سے نکال کر نہ لاتا تو آج میں ہیرا منڈی کی کسی کنجری کے کوٹھے پر اپنا روپ رنگ اور جوانی بیچ رہی ہوتی۔" اُس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "تجھے پتہ ہی ہے کہ میں پاروتی سے کیسے جمیلہ بنی اور زمیں دارنی کہلانے لگی۔ اب زمیں داری کے ساتھ زمیں دارنی بھی نہ رہی۔ جس طرح پاروتی مر گئی، ویسے ہی زمیں دارنی بھی مر گئی۔ اب میں اللہ وسایا مزارع کی گھر والی بن جاؤں گی۔ بول میں مزارع کی گھر والی کیوں نہیں بن سکتی۔ یہ کیوں نہیں کہتا کہ تو زمیں داری کی شان میں مزارع بننا نہیں چاہتا۔"

"چل، تو ہی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میں نے تیری بات مان لی۔" اللہ وسایا نے جمیلہ کے جوش و خروش کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ "پر یہ تو سوچ، اگر نئے زمیں دار نے مجھے بے دخل کر دیا، ایسے ہی جیسے بنسی لال نے میرے بُو کو اور مجھے بے دخل کر دیا تھا۔ تب کیا بنے گا؟"

"بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔" رحیم داد نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "کوئی زمیں دار یہ نہیں چاہے گا کہ ایسے بندے کو اپنا مزارع بنا کر رکھے جو اسی پنڈ کا اٹھ سال تک زمیں دار رہ چکا

ہو۔ مزارعوں پر اپنا رعب جمانے کے لئے وہ سب سے پہلے اللہ وسایا کو بے دخل کرے گا۔ زمیں داری جو چلانی ہوئی۔"

"چوہدری! تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ ہم یہ پنڈ چھوڑ دیں۔" جمیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "پر میرے سکول کا کیا بنے گا؟"

"سکول کو تو اب تو بھول ہی جا۔" اللہ وسایا بولا۔ "کوئی وڈّا زمیں دار اپنی زمیں داری میں سکول شکول نہیں دیکھ سکتا۔ سرکار نے کتنے ہی زمیں داروں کے پنڈ میں سکول کھولنے چاہے پر انھوں نے نہ صرف زبردست مخالفت کی بلکہ تکڑی رشوت دے کر رُکوا دیا۔"

"اللہ وسایا بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔" رحیم داد نے کہا۔ "میں تجھے ایک واکعہ سناتا ہوں۔ ملتان کی تحصیل میلسی میں وڈّے زمیں داروں میں زبردست جھگڑا چل رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ اُن میں سے ایک میرا جاننے والا تھا۔ اُس سے ڈپٹی کمشنر نے سکول کھولنے کے لئے چندا مانگا۔ چندا تو اُس نے دُگنا دے دیا پر ساتھ ہی ڈپٹی کمشنر سے یہ بھی کہا کہ سکول اُس کے پنڈ کی بجائے، مخالف زمیں دار کے پنڈ میں کھول دیا جائے۔ ڈپٹی کمشنر نے اُس کی بات مان لی اور حکم جاری کر دیا۔ بعد میں سنا کہ وہ زمیں دار گالاں نکالتا تھا۔ کہتا تھا، میرے ساتھ دھوکا کیا گیا۔"

"ہاں جی، ایسا ہی ہوتا ہے۔" اللہ وسایا نے کہا۔ "یہ پنڈ چھوڑنا ہی ہوگا جمیلے! اب تو کچھ اور سوچنا ہوگا۔"

جمیلہ خاموش رہی۔ اُس کے چہرے سے افسردگی ٹپک رہی تھی۔

رحیم داد نے کہا۔ "اب اس پنڈ میں تم دونوں کا رہنا کسی طرح ٹھیک نہیں کوئی اور ہی رستہ دیکھنا ہوگا۔"

اللہ وسایا نے بیزاری سے کہا۔ "کچھ سمجھ نہیں آتا۔ میں نے تو ملتان میں کیس ہارنے کے بعد سوچنا شروع کر دیا تھا۔"

جمیلہ بولی۔ "چنتا نہ کر، تو مزارع بننا نہیں چاہتا تو نہ بن۔"

اللّٰہ وسایا اُس کی بات کاٹ کر بولا۔" میں مزارع بننے کو تیار ہوں پر اس پنڈ میں نہیں کسی اور زمیں داری میں مزارع بن کر رہ سکتا ہوں۔"

"تو یہ بات دل سے نکال دے۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔" اللّٰہ وسایا! اب تو مزارع نہیں بن سکتا۔ کوئی زمیں دار تجھے مزارع بنائے گا بھی نہیں۔ تو اسے جتنا آسان سمجھتا ہے، ایسا ہے نہیں۔ اب تو تیں نوں کچھ اور سوچنا ہو گا۔"

"یہی میں کہہ رہی تھی مگر اس نے مجھے یہ بات کہنے ہی نہیں دی۔"

"کہہ، کیا کہنا چاہتی ہے؟" اللّٰہ وسایا بولا۔

جمیلہ نے کہا۔" اگر اس پنڈ میں نہیں رہنا تو ایسا کرتے ہیں کہ لہور چلتے ہیں۔"

" وہاں جا کر کیا کریں گے؟" اللّٰہ وسایا نے حیرت سے پوچھا۔

"میں وہاں کسی سکول میں پڑھانے پر لگ جاؤں گی۔" جمیلہ نے بتایا۔" مجھے کسی نہ کسی سکول میں نوکری ضرور مل جائے گی۔"

"تو یہ کہنا چاہتی ہے کہ تو نوکری کرے اور میں ہڈحرام بن کر تیری کمائی کھاؤں؟" اس نے منہ بگاڑا۔" یہ نہیں ہو سکتا۔" وہ رحیم داد سے مخاطب ہوا۔" چوہدری! اس کی گل سن رہا ہے؟"

" اتنا بُرا کیوں مناتا ہے۔" جمیلہ نے روٹھتے ہوئے اللّٰہ وسایا کو منانے کی کوشش کی۔

" میں نے اپنی طرف سے ایک اپائے بتایا تھا۔ تو اس کے لئے تیار نہیں تو کچھ اور وچار کرتے ہیں۔"

رحیم داد نے کہا۔" ہاں، کچھ اور سوچنا پڑے گا۔"

اللّٰہ وسایا کھڑا ہو گیا۔" چوہدری! تو ابھی نہ جا۔ چند روز بعد چلا جانا۔ ویسے اس پنڈ سے تو اب جانا ہی ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ اللّٰہ وسایا کھڑا ہوا تو جمیلہ بھی کھڑی ہو گئی۔ دونوں کمرے سے چلے گئے۔ رحیم داد نے کوٹلہ ہرکشن چھوڑنے کا ارادہ فی الحال ترک کر دیا۔ وہ اللّٰہ وسایا اور جمیلہ کی دل آزاری نہیں چاہتا تھا۔ ویسے بھی اُسے جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔

اُس نے کلیم کے کاغذات کا بستہ نکال کے کھولا۔ چوہدری نورالٰہی کے دستخط سامنے رکھے۔ ایک سادہ کاغذ پر جعلی دستخط بنائے۔ دونوں کو برابر رکھا۔ اُن پر تنقیدی نظر ڈالی۔ دستخط بالکل ہوبہو تھے۔ کسی نقطے، شوشے، یہاں تک کہ اعراب میں بھی سرِمو فرق نہ تھا۔ رحیم داد کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ مہینوں کی مسلسل مشق کا نتیجہ آج اس کے سامنے تھا۔ وہ دیر تک دستخط دیکھتا اور خوش ہوتا رہا۔

رحیم داد نے کاغذات الٹ پلٹ کے دیکھے۔ جو کاغذ اردو میں تھے، وہ اس نے پڑھ لئے۔ انگریزی میں لکھی ہوئی درخواستیں اور ان پر متعلقہ محکموں کے افسران کے احکام پڑھنے سے وہ قاصر تھا۔ ان کا مفہوم وہ مطلق نہ سمجھ سکا۔ ویسے بھی متروکہ جائداد اور اس کے الاٹمنٹ کے بارے میں اس کی معلومات نہایت محدود تھیں۔ تجربہ بھی نہیں تھا۔ وہ مہاجر نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے کبھی یہ باتیں جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ چودھری نورالٰہی نے مرنے سے پہلے اپنے کلیم کے متعلق جو کچھ بتایا تھا، وہی اس کی کل معلومات تھیں اور انھی کی بنیاد پر وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ کلیم منظور شدہ ہے اور اس کے عوض وہ زرعی اراضی اور املاک کا الاٹمنٹ حاصل کر سکتا ہے۔

کاغذات دیکھتے ہوئے اس کے ذہن میں یکایک خیال آیا کہ جمیلہ کی زمین اور حویلی مقدمہ ہار نے کے بعد متروکہ جائیداد قرار دی جا چکی ہے۔ چودھری نورالٰہی کے کلیم کی بنیاد پر وہ یہی زمین الاٹ کرا سکتا ہے۔ اس طرح وہ اللہ وسایا اور جمیلہ کو پریشانی اور اضطراب سے بچا سکتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُسے کوٹلہ ہرکشن چھوڑ کر کہیں جانے کا خطرہ مول نہیں لینا پڑے گا۔ کوٹلہ ہرکشن اس کے لئے ایک محفوظ ٹھکانا تھا۔ یہاں وہ کئی ماہ سے مقیم تھا اس ماحول سے وہ پوری طرح مانوس ہو چکا تھا۔ اللہ وسایا اور جمیلہ اس پر مہربان تھے اور اس کے آرام کا ہر طرح خیال رکھتے تھے۔ اس کی دل جوئی کرتے تھے۔ مہمان کے بجائے اُسے اپنے ہی کنبے کا فرد تصور کرتے تھے۔

اُسے اللہ وسایا اور جمیلہ کا احسان چکانے کا نہایت عمدہ موقع ملا تھا۔ اس میں اُس

کا اپنا فائدہ بھی تھا۔ وہ راتوں رات مہمان سے مالک و مختار بن جاتا، زمیں دار بن جاتا۔ وہ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا مگر اس کے ساتھ اندیشوں نے بھی سر ابھارا اور ان کی نوعیت یہ تھی کہ پنجاب کے کسی دور دراز علاقے میں اگر وہ الاٹمنٹ حاصل کرتا تو خطرہ بہت کم تھا۔ سندھ میں بہت ہی کم تھا۔ ضلع منٹگمری میں خطرہ زیادہ اور بہت زیادہ تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس ضلع میں اراضی اور املاک الاٹ کرانے کے لئے چودھری نورالٰہی مرحوم طویل عرصے تک کوشش کرتا رہا تھا۔ دفتروں کے چکر کاٹتا رہا تھا۔ افسروں اور ماتحت عملے سے ملتا رہا تھا۔ ان میں اُس کے جاننے والے بھی ہو سکتے تھے۔

کوٹلہ ہرکشن کی حویلی اور اراضی کے الاٹمنٹ کو جب اُس نے اس پہلو سے دیکھا تو گھبرا گیا، خوف زدہ ہو گیا۔ جعلی دستخط سے حاصل کیا ہوا الاٹمنٹ اگر کسی وقت پکڑ لیا جاتا تو اس میں صرف جیل جانے کا خطرہ نہیں تھا بلکہ اس کے گلے میں پھانسی کا پھندا ہوتا۔ وہ چودھری نورالٰہی کا قاتل تھا اور ایک بار جب راز افشا ہو جاتا تو سارے دوسرے راز پیاز کے پرت کی طرح اُترنے چلے جاتے۔ وہ حکیم چشتی کا قاتل تھا۔ سیف اللہ کا قاتل تھا اور جیل کا ایک مفرور قیدی بھی تھا۔ رحیم داد لرز کر رہ گیا۔ اس نے کلیم کے کاغذات کپڑے میں لپیٹ کر گرہ لگائی اور حفاظت سے تکیے کے نیچے رکھ دیئے۔

شام کو اُس نے اللہ وسایا اور جمیلہ کے ساتھ کھانا کھایا۔ دونوں شش و پنج میں مبتلا تھے اور آیندہ کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکے تھے۔ اُن کے چہرے مُرجھائے ہوئے تھے اور آنکھیں ویران ویران نظر آتی تھیں۔ نہ اللہ وسایا نے اُس کے کلیم کے بارے میں تذکرہ کیا نہ ہی رحیم داد نے ایسی کوئی بات کی۔ وہ دوپہر ہی کو طے کر چکا تھا کہ نہ صرف کوٹلہ ہرکشن کی متروکہ املاک بلکہ ضلع منٹگمری میں کہیں بھی الاٹمنٹ حاصل کرنے کی مطلق کوشش نہیں کرے گا۔ وہ کوئی خطرہ مول لینے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔

صبح جمیلہ مہمان خانے میں آئی۔ وہ اُس وقت تنہا تھی۔ رحیم داد ناشتہ کر رہا تھا۔ وہ اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔ رحیم داد نے پوچھا "تو نے اور اللہ وسایا نے آگے کے

لئے کیا سوچا؟"

"میں تیرے پاس اسی بارے میں بات کرنے آئی ہوں۔" جمیلہ نے جواب دیا۔

"کیا بات کرنی ہے؟ کیا تُو نے کچھ سوچ لیا؟"

"ہاں! اپنی سمجھ میں تو ایک ہی گل آتی ہے۔" جمیلہ بولی۔ "میں برابر اسی پر سوچ بچار کر رہی ہوں۔ اور کچھ مجھے نظر نہیں آتا۔"

"تُو نے اللہ وسایا کو نہیں بتایا؟"

"اسے میں نے بتایا تو تھا۔ تیرے سامنے ہی تو بات کی تھی۔" جمیلہ نے کہا۔ "پر وہ کہاں راضی ہوا۔ ایک دم ناراض ہو گیا۔"

"وہی لہور جانے کی گل؟"

"ہاں۔" جمیلہ نے آہستہ سے گردن ہلائی۔ "تُو خود ہی سوچ ہم اور کہاں جا سکتے ہیں۔ لہور میں مجھے آسانی سے کسی سکول میں پڑھانے کی نوکری مل سکتی ہے۔"

"پر یہ بات تو وہ ہرگز نہ مانے گا کہ تُو کمائے اور وہ بیٹھ کر کھائے۔"

"بات اس طرح نہیں ہے۔" جمیلہ بولی۔ "جاتے ہی تو نوکری نہیں مل جائے گی پر لہور وڈا شہر ہے۔ وہاں مجھے نوکری ملنے میں زیادہ مشکل نہیں پڑے گی۔ جب تک نوکری نہیں ملے گی، تب تک گزارے کے لئے اپنے پاس کچھ نہ کچھ تو ہے۔ زیور کس دن کے لئے ہیں۔ انہیں بیچ کر بھی کام چلایا جا سکتا ہے۔"

"اللہ وسایا تو اُس روز صاف انکار کر چکا ہے۔" رحیم داد نے کہا۔

"تُو اسے سمجھائے گا تو وہ مان جائے گا۔ میں اس لئے تیرے پاس آئی ہوں۔"

"کیا تُو سمجھتی ہے کہ وہ میری بات مان لے گا؟"

"مجھے پورا وشواس ہے۔" جمیلہ نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "وہ تیری بات نہیں ٹالے گا۔ کہہ کے تو دیکھ۔ اس میں برائی کیا ہے۔"

"تُو کہتی ہے تو میں اُس سے ضرور کہوں گا۔ اُسے راضی کرنے کی پوری پوری کوشش

کروں گا۔" رحیم داد نے جمیلہ کو یقین دلایا۔

"چوہدری! تو بھی ہمارے ساتھ لہور چلنا" وہ خوش ہو کر بولی۔

مگر رحیم داد رضامند نہیں ہوا۔ وہ لاہور جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہاں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ منٹگمری سے نزدیک ہونے کے باعث کوئی نہ کوئی ایسا جان پہچان کا وہاں کسی بھی وقت پہنچ سکتا تھا جو اُسے شناخت کر لیتا حالانکہ وہ اپنا حلیہ بڑی حد تک تبدیل کر چکا تھا مگر کسی ایسے خطرے سے دوچار ہونے کے لئے تیار نہ تھا جو اُسے پھانسی گھاٹ تک لے جاتا۔ اُس نے صاف انکار کر دیا۔ "نہیں، میں نے لہور نہیں جانا۔ میں اپنی گھر والی اور بچوں کو تلاش کرنے رحیم یار خاں جاؤں گا۔ وہاں بھی بہت مہاجر ہیں۔ کسی سے اپنی گھر والی اور بچوں کا اتا پتہ مل سکتا ہے۔ ویسے تو اور اللہ وسایا پہلے ہی پریشان ہیں۔ اب میں تم دونوں کے لئے بوجھ بننا نہیں چاہتا۔" رحیم داد لمحے بھر خاموش رہا۔ "تو میری فکر نہ کر۔ اپنے اور اللہ وسایا کے بارے میں سوچ۔"

"وہ تو میں دن رات سوچتی رہتی ہوں۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ جمیلہ گردن جھکائے کچھ دیر سوچتی رہی پھر اُس نے پوچھا۔ "چوہدری! تجھے ہم دونوں کے چھوٹنے کا کوئی دکھ نہیں ہوگا۔ تو میری بات کا وشواس کر، مجھے تو بہت دکھ ہوگا۔ سدا یاد آئے گا۔"

جمیلہ کے انداز میں لگاوٹ تھی، دبی دبی چاہت تھی۔ رحیم داد نے یہی محسوس کیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر جمیلہ کو دیکھا۔ وہی ستاروں کی مانند روشن آنکھیں، وہی پھول سا شگفتہ چہرہ، وہی دل کشی، وہی رعنائی، جسے دیکھ کر اُس پر خود فراموشی طاری ہو جاتی تھی۔ وہ اُس کے اس قدر قریب بیٹھی تھی کہ رحیم داد اُس کے خوب صورت بدن کی مہک سونگھ سکتا تھا۔ وہ تڑپ اُٹھا۔ اُس نے اب تک سوچا ہی نہیں تھا کہ جمیلہ سے دور ہونے کے بعد اُس پر کیا بیتے گی۔ نہیں، وہ اُس سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ اُس پر گویا وارفتگی طاری ہو گئی۔ اُس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"تو یہ پنڈ چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔ میرے کلیم سے حویلی اور زمین کا الاٹمنٹ ہو سکتا ہے۔

"تیرا کلیم ہے؟" جمیلہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "ضرور ہو گا۔ تو مہاجر ہے نا۔ تو نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

عین اسی وقت اللہ دسایا کمرے میں داخل ہوا۔ جمیلہ نے اسے دیکھا تو مسکرا کر بولی۔ "اللہ دسایا! تجھے پتہ ہے اپنے چوہدری کا کلیم موجود ہے۔ اس نے مجھے ابھی بتایا ہے۔"

"بتایا تو اس نے مجھے بھی تھا۔" اللہ دسایا نے کہا۔ "پر ایسی پریشانی رہی کہ یاد ہی نہیں آیا۔ یہ تو کہتا تھا، بہت وڈا کلیم ہے۔"

"وڈا کلیم ہے تو حویلی اور ساری اراضی کا الاٹمنٹ ہو سکتا ہے۔" جمیلہ بولی۔ "اب تو سب کچھ متروکہ جائیداد ڈیکلیئر کر دیا گیا ہے۔"

جمیلہ اور اللہ دسایا کے چہروں پر سرخی دوڑ گئی۔ انہیں مسرور دیکھ کر رحیم داد بھی جذبات کے سیلاب میں بہہ گیا۔ نہ اسے اندیشے یاد آئے، نہ خطرات نے لرزہ براندام کیا۔ اس نے تکیے کے نیچے سے بستہ نکالا اور اللہ دسایا کو دے کر بولا۔

"یہ رہے میرے کلیم کے کاغذات۔"

اللہ دسایا نے بستہ جمیلہ کی طرف بڑھا دیا۔ "جمیلے! اپنے چوہدری کے کلیم کے کاغذات تو دیکھ۔ تو انگریزی بھی پڑھ سکتی ہے۔ سب کچھ سمجھ لے گی۔"

جمیلہ نے بستہ کھولا۔ کاغذات نکالے اور انہیں الٹ پلٹ کر پوری توجہ سے پڑھنے لگی۔ ذرا دیر بعد اس نے حیرت زدہ ہو کر اونچی آواز سے کہا۔ "اللہ دسایا! اپنے چوہدری کا تو بہت وڈا کلیم ہے۔ منظور شدہ بھی ہے۔ اس میں زرعی اراضی اور املاک سبھی شامل ہے۔"

"تب تو زمین کے ساتھ حویلی کا بھی الاٹمنٹ ہو سکتا ہے۔"

"بالکل ہو سکتا ہے۔" جمیلہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "چوہدری نے تو پہلے ہی یہ گل کی تھی۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "چوہدری زمیں دار بن جائے گا، تب تو مزارع بن کر بھی تو

اس پنڈ میں رہ سکتا ہے۔ میرا اسکول بھی رہے گا۔ نہ کہیں جانا پڑے گا نہ اس بارے میں سوچ سوچ کے بھیجا خراب کرنا پڑے گا۔" اُس نے رحیم داد کی جانب دیکھا اور مسکرائی" چوہدری! تو اللہ وسایا کو اپنا مزارع بنائے گا نا؟"

" ایسی باتیں نہ کر۔" رحیم داد نے ناراض ہونے کے انداز میں کہا۔" تو مجھے اتنا کمینہ اور پیچ سمجھتی ہے کہ میں اللہ وسایا کو اپنا مزارع بنا کر رکھوں گا؟ اللہ وسایا زمیں دار تھا، الاٹمنٹ کے بعد بھی زمیں دار ہی رہے گا۔ تو آگے ایسی بات نہ کہنا۔ مجھے بہت دکھ ہوگا۔"

اللہ وسایا بولا" یہ باتیں چھوڑ۔ سب سے پہلے تو وکیل کو کلیم کے کاغذات دکھانے ہوں گے۔ وہی بتا سکتا ہے کہ اگے کیا کرنا ہے۔"

" وکیل کو آج ہی بُلوا لے۔" جمیلہ نے اللہ وسایا سے کہا۔

" میں خود اُس کے پاس چلا جاؤں گا۔ اب دیر بالکل نہیں ہونی چاہیے۔" وہ کھڑا ہو گیا۔" پہلی لاری سے شہر چلا جاؤں گا۔"

اللہ وسایا اور جمیلہ کے مرجھائے ہوئے چہرے چمک گئے۔ دونوں کمرے سے چلے گئے۔ رحیم داد انہیں دور تک دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو ایک بار پھر طرح طرح کے اندیشوں نے اُس پر یلغار کی۔ کلیم کے کاغذات کا بستہ سامنے میز پر رکھا تھا۔ وہ اُسے خوف زدہ نظروں سے گھور رہا تھا۔

۱۹

دن ڈھل رہا تھا۔ ہوا رکی ہوئی تھی۔ فضا دھندلی تھی۔ شدید گرمی تھی۔ حبس تھا۔
رحیم داد خوف زدہ اور پریشان تھا۔ اُس نے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ اب وہ کمرے میں خاموش بیٹھا سورج غروب ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اُسے بخوبی اندازہ تھا کہ اللہ دسایا رات گئے لوٹے گا۔ رحیم داد اس کی واپسی سے پہلے ہی کوٹلہ ہرکشن چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ اُس نے جذبات کی رو میں بہہ کر چودھری نورالٰہی مرحوم کے کلیم کی بنیاد پر حویلی اور زمین الاٹ کرانے کا وعدہ تو کر لیا تھا مگر اب پچھتا رہا تھا۔ اُسے طرح طرح کے اندیشے ستا رہے تھے۔ جیل اور پھانسی کا پھندا رہ رہ کر ڈرا رہا تھا۔

اللہ دسایا اور جمیلہ کے رخصت ہوتے ہی وہ اس ذہنی اذیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ضلع منٹگمری میں جہاں ہر طرف مشرقی پنجاب کے مہاجرین بکھرے ہوئے تھے، الاٹمنٹ حاصل کرنے میں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ وہ اپنے پچھلے منصوبے کے مطابق کسی ایسے علاقے کی جانب نکل جانا چاہتا تھا جہاں اُس کے جعلی کلیم کے پکڑے جانے کا امکان بہت کم ہو اور کسی جان پہچان والے کے ملنے کا بھی خوف نہ ہو۔ وہ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی کلیم کے کاغذات کا بستہ سنبھال کر خاموشی سے نکل جانے کا تہیہ کر چکا تھا۔

وہ اسی ادھیڑ بن میں اُلجھا ہوا تھا کہ کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ جمیلہ اندر داخل ہوئی۔ اُس کے ہمراہ اللہ دسایا نہیں تھا، وکیل تھا۔ وہ دوہرے بدن کا سنجیدہ اور

بُردبار شخص تھا۔ آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کی عینک تھی۔ سر کے بال اُڑے ہوئے تھے۔ اُس کا نام محمّد عثمان رندھاوا تھا۔ جمیلہ نے رحیم داد کا اُس سے تعارف کرایا۔

رحیم داد بہت سٹ پٹایا مگر اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا اور اللہ وسایا کے بارے میں پوچھا۔ "زمیں دار نہیں آیا۔ وہ تو تمہارے ہی پاس گیا تھا وکیل صاحب؟"

"جمیلہ نے بھی مجھے یہی بتایا تھا۔" وکیل نے جواب دیا۔ "میں منچن آباد گیا تھا۔ واپسی پر سوچا، اللہ وسایا سے ملتا چلوں۔ وہ میرے دفتر منٹگمری پہنچ گیا ہوگا۔ اُسے وہاں پتہ چل گیا ہوگا، واپس آتا ہوگا۔"

"جب سے کیس کا فیصلہ ہمارے خلاف ہوا ہے، وہ بہت پریشان ہے۔" جمیلہ نے بتایا۔ "پریشان تو میں بھی ہوں پر وہ کچھ زیادہ ہی ہے۔ سمجھ نہیں آتی، کیا کیا جائے۔ پنڈ چھوڑ کر کہاں جائیں۔ اب تو یہاں زیادہ ٹھیر بھی نہیں سکتے۔"

"پریشانی کی تو ویسے بات ہی ہے، پر ابھی پنڈ چھوڑنے کی ایسی جلدی کیا ہے۔" وکیل نے تسلّی دینے کی کوشش کی۔

"تجھے تو پتہ ہی ہے۔ دس دن میں حویلی خالی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" وہ بدستور مطمئن نظر آتا تھا۔ "ابھی کمشنر بحالیات سے اپیل کرنے کی گنجائش ہے۔ اس کے بعد اوراوپر جا سکتے ہیں۔ زمیندارنی، تو فکر نہ کر۔"

"کیسے فکر نہ کروں۔" جمیلہ بُجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "کسٹوڈین والے تاک میں ہیں۔ دس روز گزرتے ہی حویلی اور زمین خالی کرانے سرکاری کرندے پولیس کے ساتھ پہنچ جائیں گے۔ متروکہ جائداد ڈیکلئر ہونے کے بعد پہلے سب کچھ کسٹوڈین ہی کے کبضے میں جاتا ہے ناں۔"

"کسٹوڈین کے پاس جانے سے پہلے میں ہائی کورٹ سے حکمِ امتناعی حاصل کر لوں گا۔" وکیل نے جمیلہ کو آگاہ کیا۔ "میں کل ہی لہور پہنچ کر حکم امتناعی کے لیئے درخواست لگا دوں گا۔ درخواست میں نے تیار کرلی ہے۔ اس پر تجھ سے دستخط کرانے ہیں۔"

"کدھر ہے درخواست؟" جمیلہ نے دریافت کیا۔

"یہ رہی۔" وکیل نے اپنا بریف کیس کھولا۔ اندر سے ایک فائل نکالی۔ "یہ تیرے کیس کی فائل ہے۔" وکیل نے فائل کے کاغذات الٹ پلٹ کر ایک ٹائپ شدہ درخواست نکال کر جمیلہ کو دی۔ "میں اسے اپنے ساتھ لے کر چلا تھا۔ میں نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ آگے کیا کرنا ہے۔"

جمیلہ نے درخواست توجہ سے پڑھی، اُس پر دستخط بھی کر دیئے مگر اس کے خدشات کم نہ ہوئے۔ "مان لیا کہ حکمِ امتناعی مل گیا۔ پر آگے کیا ہو گا؟ ویسے یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ درخواست منظور نہ ہو اور حکمِ امتناعی نہ ملے۔"

"اتنا تو مجھے بھروسا ہے کہ حکمِ امتناعی مل جائے گا۔ تُو فکر نہ کر۔" وکیل نے جمیلہ کو اطمینان دلایا۔

جمیلہ تو خاموش رہی مگر رحیم داد نے دریافت کیا۔ "پر اس سے حویلی اور زمین واپس تو نہیں مل جائے گی۔"

"چوہدری! اصل میں تو یہ کیس وراثت کا ہے۔" وکیل محمّد عثمان رندھاوا نے مقدمے کی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رحیم داد کو سمجھایا۔ "اس کا فیصلہ محکمۂ بحالیات سے نہیں، عدالتِ دیوانی سے ہونا ہے پر یہ ہے پیچیدہ کیس۔ ہندو ہونے کے ناتے اس جائداد پر جمیلہ کا حق نہیں بنتا۔ یہ جائداد کے مالک لالہ کرشن دیال کی بیٹی جو ہوئی ہندوؤں میں بیٹی کا جائداد پر حق نہیں بنتا۔ اس کے مسلمان ہونے کے بعد کیس کی نوعیت بدل گئی۔ مسلم قانون میں بیٹی کا حق بنتا ہے۔ اب پیچیدگی یہ پیدا ہو گئی کہ جائداد تو ہوئی ہندو کی اور بیٹی مسلمان ہے۔ اس کا فیصلہ آسان نہیں۔ بڑی قانونی پیچیدگیاں ہیں۔"

"رندھاوا جی! بحالیات والوں نے تو اس کا فیصلہ کر ہی دیا۔" جمیلہ نے کہا۔ "آگے کیس لے بھی گئے تب بھی کیا اس فیصلے کا اثر نہیں پڑے گا؟"

"پڑ تو سکتا ہے۔ پر یہ کوئی نظیر نہیں بنتی۔" وکیل نے جمیلہ کا اعتماد بحال کرنے کی

کوشش کی۔" زمیں دارنی! تُو فکر نہ کر۔ میں ہائی کورٹ بلکہ فیڈرل کورٹ تک کیس لے جاؤں گا۔ صرف یہ زمین اور حویلی نہیں بلکہ وہ زمین بھی تجھے دلواؤں گا جو احسان شاہ نے دبا رکھی ہے۔"

"وہ تو بعد کی گل ہے۔ یہ بتا، اب کیا ہو گا؟"

"ویسے کیس تو تیرا اب تک مضبوط ہے۔ اسے لڑنے کی بہت گنجائش ہے۔" وکیل نے جمیلہ کو سمجھایا۔ "تیرے حق میں سب سے اہم بات یہ جاتی ہے کہ حویلی اور زمین پر تیرا قبضہ ہے۔ متروکہ جائداد کے معاملے میں قبضے کی زبردست اہمیت ہے۔"

رحیم داد کی پریشانی رفتہ رفتہ زائل ہوتی جا رہی تھی۔ اُسے اپنے سر پر منڈلاتا ہوا خطرہ ٹلتا نظر آ رہا تھا۔ بات عدالت اور مقدمے بازی کی ہو رہی تھی۔ جس میں نہ وہ کسی طور فریق تھا، نہ اُس کے لئے کوئی کردار ادا کرنے کی گنجائش تھی۔ مگر خطرہ ٹل کر بھی ٹلا نہیں۔

جمیلہ نے وکیل سے کہا۔" میں تو کہتی ہوں مکدمے بازی کے بکھیڑے میں پڑا ہی کیوں جائے۔ میں نے تو ایک اور اپائے سوچا ہے۔ اُسی کے بارے میں بات کرنے اور تجھے یہاں لانے کے لئے اللہ وسایا تیرے پاس گیا تھا۔"

"وہ کیا اُپائے ہے؟ تُو نے اور اللہ وسایا نے مسئلے کا کیا حل سوچا ہے؟" وکیل نے کسی قدر حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔

"اپنے چوہدری کے پاس منظور شدہ کلیم موجود ہے۔" اُس نے رحیم داد کی طرف اشارہ کیا۔" یہ ضلع گورداس پور کا مہاجر ہے۔ اس کے کلیم سے حویلی اور زمین کا الاٹمنٹ لیا جا سکتا ہے۔ چوہدری پرایا بندہ بھی نہیں۔ بہت سے چکروں میں پڑنے سے یہ کہیں سیدھا سادا رستہ ہے کہ الاٹمنٹ ہی کرا لیا جائے۔ اب تو یہ متروکہ جائداد بنا ہی دی گئی۔"

"اگر ایسا ہے تو کیس پر اس پہلو سے بھی غور کیا جا سکتا ہے۔"

جمیلہ نے رحیم داد سے کہا۔" چوہدری! اپنے کلیم کے کاغذات رندھاوا جی کو تو دکھا۔"

رحیم داد سنّاٹے میں آگیا۔ پریشانی اور گھبراہٹ نے اچانک اُس کے ذہن پر شب خون مارا۔ اُس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ بددلی سے ہاتھ بڑھایا۔ تکیے کے نیچے سے بستہ نکالا اور کلیم کے کاغذات وکیل کی طرف بڑھا دیے۔

وکیل نے کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھے۔ کچھ دیر اُن کا مطالعہ کرتا رہا۔ کمرے میں خاموشی چھاگئی۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔ جمیلہ بھی کچھ نہ بولی۔ کاغذات سرسری طور پر دیکھنے کے بعد وکیل نے کہا: "کلیم تو پکا ہے۔ منظور شدہ ہے اور بڑا بھی ہے۔"

"اس سے کام بن سکتا ہے ناں؟" جمیلہ نے دریافت کیا۔

"کیوں نہیں بن سکتا۔" وکیل مسکرا کر بولا: "میں یہ کاغذات اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ دفتر میں اطمینان سے انھیں پڑھوں گا۔ اس کے بعد اگلی کارروائی کی جائے گی فی الحال یہی ہو سکتا ہے۔ اس بارے میں میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"ویسے کلیم تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہے ناں؟" رحیم داد کے دل کا چور بول پڑا۔

"بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ میں نے بھی اسے پڑھا تھا۔" جمیلہ نے رحیم داد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی: "منظور شدہ پکا کلیم ہے۔ کیوں رندھاوا جی! میں نے غلط بات تو نہیں کہی؟"

"تو نے ٹھیک ہی کہا۔ بالکل یہی بات ہے۔" وکیل مسکرا کر بولا: "سب سے پہلے مجھے ہائی کورٹ سے حکمِ امتناعی حاصل کرنا ہوگا۔ یہ بہت ضروری ہے۔ ایک بار جائداد قبضے سے نکل جائے اور کسٹوڈین کی تحویل میں چلی جائے تو اُسے دوبارہ حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جتنے کلیم منظور ہوئے ہیں، متروکہ جائداد اُس سے بہت کم ہے۔ تبھی تو یہ صورت ہے کہ متروکہ جائداد کا پتہ چلتے ہی کلیم ہولڈر ایسے جھپٹتے ہیں جیسے چیل گوشت پر گرتی ہے۔ سفارش، رشتے داری، رشوت، سبھی ہتھ کنڈے الاٹمنٹ کے لئے چلائے جاتے ہیں۔" اُس نے جمیلہ کی جانب دیکھا: "میں تجھے کیا بتاؤں کہ متروکہ جائداد کی کیسی لوٹ مار مچی ہے۔ جسے کچھ نہیں ملا، وہ تو بھاگ دوڑ کرتا ہی ہے۔

پر جسے مل چکا ہے، وہ اور زیادہ لینے کے چکّر میں رہتا ہے۔"

"تب تو جی سب سے پہلے حکمِ امتناعی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔" جمیلہ نے پریشانی کا اظہار کیا۔ "کلیم ہولڈروں کو پتہ چل گیا تو وہ ابھی سے الاٹمنٹ کی درخواستیں لگانی شروع کر دیں گے۔"

"پتہ چلنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔" وکیل ہنس کر بولا۔ "محکمہ بحالیات والوں نے تو اب تک کتنے ہی کلیم ہولڈروں کو بتا دیا ہوگا۔ ایسی بات چھپی کہاں رہتی ہے۔" وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اچھا، میں چلتا ہوں۔" اُس نے رحیم داد کی طرف دیکھا۔ "چوہدری! تجھ سے جلد ہی ملاقات ہوگی۔ میں تیرے کلیم کے کاغذات اطمینان سے دیکھوں گا۔ ابھی تو مجھے حکمِ امتناعی لینے کی تیاری کرنی ہے۔"

وکیل نے جمیلہ کے مقدمے کی فائل کے ساتھ کلیم کے کاغذات بھی اپنے بریف کیس میں رکھ لئے۔ رحیم داد پریشان تو ہوا مگر خاموش رہا۔ کہہ بھی کیا سکتا تھا۔ کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ وکیل دروازے کی جانب بڑھا۔ جمیلہ بھی اُس کے ساتھ ساتھ چلی۔ رحیم داد حیران و پریشان بیٹھا رہا۔ دونوں کے جانے کے بعد اُس کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ کلیم کے کاغذات اب وکیل کی تحویل میں تھے۔ وہ پوری طرح پھنس چکا تھا۔ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ اُس نے کوٹلہ ہرکشن چھوڑ کر کہیں اور جانے کا جو منصوبہ بنایا تھا، وہ خاک میں مل چکا تھا۔ مجبوری یہ تھی کہ نہ وہ کسی کو اپنی پریشانی بتا سکتا تھا نہ کوئی مشورہ کر سکتا تھا۔ اُس کی بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

رات کو اللہ وسایا واپس آ گیا مگر رحیم داد سے اُس کی ملاقات نہیں ہوئی۔ رحیم داد کے دن رات اُلجھن اور طرح طرح کے وسوسوں میں کٹ رہے تھے۔ وہ ہر وقت گم صُم رہتا۔

موسم بدل رہا تھا۔ لُو کے جھُلسا دینے والے گرم گرم جھکّڑ چلنا بند ہو گئے تھے۔ پچھلی رات ہلکی ہلکی بارش بھی ہوئی تھی۔ دن میں بھی اَبر چھایا رہا۔ ہوا کے نرم اور خنک

جھونکوں میں تازگی اور فرحت تھی۔ زمین سے سوندھی سوندھی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ درختوں کے پتے رات کی بارش سے دُھل کر نکھر گئے تھے۔ جدھر نظر اُٹھ جاتی، ہریالی نظر آتی۔

یہ ایک خوش گوار سہ پہر تھی۔ رحیم داد کچھ ہی دیر پہلے سو کر اٹھا تھا۔ وہ نہانے کے لئے غسل خانے جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اللہ وسایا نے اُسے باغ میں بلوایا۔

رحیم داد باغ میں پہنچا۔ اُس نے اللہ وسایا اور جمیلہ کے ساتھ وکیل کو دیکھا۔ اُس پر گھبراہٹ کا دورہ پڑا مگر وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا قریب پہنچا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

اللہ وسایا مسکرا کر بولا۔" چوہدری! تجھے خوش خبری سنانے کے لئے بلایا ہے۔"

"حکم امتناعی مل گیا ہے۔" جمیلہ بولی۔ اُس کے چہرے پر خوشی، سرخی بن کر بکھری ہوئی تھی۔ اُس نے وکیل کی جانب دیکھا۔" وکیل صاحب یہی بتانے آئے ہیں۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا۔" رحیم داد نے سکون کی سانس لی۔

اللہ وسایا بولا۔" ہاں جی ایہہ بہت زبردست کام ہوا۔ اب حویلی خالی کرنے اور پنڈ چھوڑنے کی ایسی جلدی نہیں رہی۔"

رحیم داد نے موقع سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ کلیم کے چکر سے اپنی جان چھڑانے کے لئے وکیل کو مشورہ دیا۔" اب تو جی آگے یہی ہونا چاہیے کہ زمیں دارنی کی طرف سے مکدمہ کر دیا جائے۔ جیسا اُس روز بنایا تھا، وہی ٹھیک لگتا ہے۔"

"میں نے بعد میں اس پر سوچا تھا پر کیس بہت کمزور ہے۔" اُس نے اللہ وسایا کی جانب دیکھا۔" زمیں دار! ویسے تیری مرضی ہو تو میں کیس کی تیاری کروں؟"

"جب کیس ہی مضبوط نہیں تو اس چکر میں کیوں پڑا جائے۔" جمیلہ بولی۔" چوہدری کے کلیم کے کاغذات تو دیکھ ہی لئے ہوں گے۔ الاٹمنٹ کی کوشش کیوں نہ کی جائے۔ اس بارے میں کیا سوچا؟"

"کلیم تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ میں نے سارے کاغذات اچھی طرح دیکھ لیے

ہیں۔" وکیل بولا۔" اس کی بنیاد پر الاٹمنٹ حاصل کرنے میں مشکل بھی نہیں پڑے گی۔"

"میں نے سنا ہے کانون تو یہ ہے کہ حویلی کے علاوہ اڑھائی سو ایکڑ سے زیادہ زمین کا الاٹمنٹ نہیں مل سکتا۔" جمیلہ نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔" اس طرح تو صرف دس مربعے کا الاٹمنٹ ملے گا۔ میرے تو ۲۲ مربعے ہیں۔ ۱۲ مربعے کا کیا بنے گا؟"

"زمیں دارنی! تو نے ٹھیک ہی سنا ہے۔" وکیل نے اس کی تائید کی۔" چوہدری کا ایک جگہ اڑھائی سو ایکڑ ہی کا الاٹمنٹ ہو سکتا ہے۔ ویسے کلیم تو بہت بڑا ہے۔ دوسرے کسی بھی علاقے میں مزید الاٹمنٹ لیا جا سکتا ہے۔"

"یہ تو ٹھیک نہیں ہوگا۔" اللہ وسایا پریشان ہو کر بولا۔

"زمیں دار! ایسا کر بارہ مربعے کا کلیم کسی کلیم ہولڈر سے خرید لے اور اپنی وہ زمین الاٹ کرالے جو چوہدری کے الاٹمنٹ کے بعد رہ جائے۔" وکیل نے تجویز پیش کی۔" میرا ایک مہاجر مؤکل ہے۔ اُس کے پاس پکا کلیم ہے۔ بیچنا بھی چاہتا ہے۔ ضرورت مند بھی ہے، سستے داموں میں دے دے گا۔ تو تیار ہو تو میں اُس سے بات کروں۔"

"اپنے پاس تو سمجھو کچھ بھی نہیں۔" اللہ وسایا بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"سوچ لے۔ ابھی تو تیرا قبضہ ہے۔ آسانی سے الاٹمنٹ مل سکتا ہے۔" وکیل نے کہا۔" ورنہ حال یہ ہے کہ ہزاروں مہاجر کلیم کے کاغذات دبائے دبائے پھر رہے ہیں۔ الاٹمنٹ ہی نہیں ملتا۔ تبھی تو سستے داموں کلیم مل رہا ہے۔ اب یہی دیکھ، چوہدری کا اتنا بڑا کلیم ہے پر اب تک کہیں الاٹمنٹ نہیں ملا۔"

"ہاں جی، کلیم لینا اتنا مشکل نہیں، جتنا الاٹمنٹ لینا۔" رحیم داد نے گہری سانس بھری۔" دفتروں کے چکر کاٹتے کاٹتے ہی جوتے ٹوٹ گئے۔ منّت سماجت اور رشوت الگ دی پر کام کہیں نہیں بنا۔ کلر زمین تک نہ ملی۔ تبھی تو میں نے مکدمہ کرنے کی بات کی تھی۔"

"پر اب آسانی سے تیرے کلیم پر الاٹمنٹ مل جائے گا۔ قبضہ جو اپنے پاس ہے۔"

وکیل نے وضاحت کی۔ وہ اللہ وسایا کی طرف متوجّہ ہوا "زمیں دار! تُو نے اپنے بارہ مربّعوں کے لئے کلیم خریدنے کے بارے میں کیا سوچا؟"

اللہ وسایا نے وکیل کی بات کا جواب نہیں دیا، جمیلہ سے مخاطب ہوا "تُو نے کچھ جمع جوڑ کر رکھا ہی نہیں۔ کچھ ہوتا تو آج کام آتا۔"

جمیلہ نے سر اٹھا کر اللہ وسایا کو دیکھا۔ "چنتا نہ کر۔ میرے پاس سکول اور ڈسپنسری بنانے کا فنڈ ہے۔ اُسے میں الگ رکھتی تھی۔" وہ زیرِلب مسکرائی۔ "پر یہ روپیہ ایک شرط پر دوں گی۔ اُدھار رہے گا، تجھے لوٹانا ہوگا۔"

"منظور ہے، تیری یہ شرط بالکل منظور ہے۔" اللہ وسایا خوش ہو کر بولا۔ "میں تیرے اُدھار کا ایک ایک پیسہ ادا کر دوں گا۔"

"یہ دونوں گواہ موجود ہیں۔ تو اُن کے سامنے وعدہ کر رہا ہے۔" جمیلہ نے ہنس کر وکیل محمّد عثمان رندھاوا اور رحیم داد کی جانب ہاتھ اُٹھا کر اشارہ کیا۔ "بعد میں پلٹ نہ جانا!"

وکیل نے جمیلہ کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تو گویا یہ طے ہو گیا کہ حویلی اور زمین کا الاٹمنٹ ہی کرانا ہے۔ اب اس کام میں کوئی تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے لئے جلد سے جلد کام شروع کرنا ہوگا۔"

"جب تیرے پاس روپیہ موجود ہے تو اپنے پورے ۲۲ مربّعے کا کلیم کیوں نہیں خرید لیتی؟" رحیم داد نے ایک بار پھر اپنا پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔

"نہیں چوہدری، اتنا روپیہ میرے پاس نہیں ہے۔" جمیلہ نے وضاحت کی۔ "زیورات بیچ کر بھی مشکل سے ۱۲ مربّعے کا بندوبست ہو سکے گا۔"

وکیل نے مسکرا کر کہا۔ "زمیں دارنی! تجھے اللہ وسایا کو اُدھار نہیں دینا پڑے گا۔ کلیم تو تیرے ہی نام سے خریدا جائے گا، قبضہ تو تیرے ہی نام سے ہے۔ تجھے آسانی سے الاٹمنٹ مل جائے گا۔ اللہ وسایا کے نام سے کلیم خرید کر الاٹمنٹ لینے میں کوئی رخنہ پڑ سکتا ہے۔"

"میرے نام سے ہو یا اللہ وسایا کے نام سے۔ بات تو ایک ہی ہے۔" جمیلہ ہنس کر بولی۔ "میں اور اللہ وسایا الگ تھوڑا ہی ہیں۔ زمیں دار تو اسی کو رہنا ہے، میں نے زمیں داری سے کیا لینا۔"

"لو جی، اس کی سنو۔" اللہ وسایا بھی ہنسنے لگا۔ "میں کب زمیں دار رہا۔ ساری زمیں داری تو یہی چلاتی رہی۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"تو بھی ٹھیک کہہ رہا ہے اور یہ بھی۔" وکیل سنجیدہ ہو گیا۔ "اب کام کی گل ہونی چاہیے۔ میں اپنے ایک مؤکل زمیں دار کی کار میں آیا ہوں، اُدھر حویلی کے اگواڑے کھڑی ہے۔ اللہ وسایا! تو ابھی میرے ساتھ چل۔ رات میرے ساتھ ٹھیرنا۔ سویرے کلیم کا سودا ہو جائے گا۔ سودا طے ہوتے ہی فٹافٹ الاٹمنٹ کے لئے کام شروع کر دیں گے۔" وہ رحیم داد کی طرف متوجہ ہوا۔ "تجھے بھی ساتھ ہی چلنا ہو گا۔ الاٹمنٹ کے لئے تجھے بھی موجود رہنا ہو گا۔"

"مجھے لے جا کر کیا کرنا ہے۔ اللہ وسایا تو موجود ہی ہو گا۔" رحیم داد نے پیچھا چھڑانا چاہا۔ وہ شہر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اُسے کسی اَن جانے خطرے سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

"چوہدری! تجھے تو چلنا ہی پڑے گا۔ ایسے کس طرح کام چلے گا۔" وکیل نے اصرار کیا۔

"بات یہ ہے جی، وکیل صاحب! میں نے کلیم تسلیم سے کچھ نہیں لینا۔" اُس نے لہجے میں رقّت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "گھر والی اور بچے ہوتے تو اس طرف دھیان دیتا۔ اُنھیں ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔ لگ بھگ اٹھ سال ہو گئے۔"

"اللہ وسایا نے مجھے تیرے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ تُو بہت مصیبت زدہ ہے۔ پر درخواستوں پر دستخط کرنے اور افسروں کے سامنے پیشی کے لئے تیری ضرورت تو پڑے گی۔"

"صاف گل ایہہ ہے جی، میں پہلے بھی الاٹمنٹ نسلاٹمنٹ کے چکّر میں نہیں پڑا۔ تبھی تو مجھے اب تک کہیں الاٹمنٹ نہیں ملا۔ تُو نے تو کاغذات دیکھ ہی رکھے

ہیں،" وہ آہستہ آہستہ بولتا رہا "میں تو جی اللہ وسایا کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا مجھ پر بہت احسان ہے۔ اس نے مجھے اپنے پاس ٹھہرایا۔ ہر طرح کا آرام پہنچایا۔ ایسا پیار دیا کہ میرا غم ہلکا ہوگیا۔ لگتا ہے، میں اپنے سگوں کے ساتھ ہوں۔" اُس نے وکیل کی جانب نظر بھر کر دیکھا۔" مجھ سے تو جی، جس کاغذ پر اور جس درخواست پر چاہو، دستخط کرالو۔ آگے جو کچھ کرنا ہے، اللہ وسایا ہی کو کرنا ہے۔ پہلے بھی یہ زمین داری چلاتا رہا ہے۔ آگے بھی یہی چلائے گا۔ مجھے زمین داری شمینداری سے کچھ نہیں لینا۔ سچ پوچھو تو مجھے زندگی ہی سے کچھ دلچسپی نہیں۔" رحیم داد نے کچھ ایسے درد بھرے لہجے میں بات کی کہ فضا سوگوار ہوگئی۔ سب خاموش بیٹھے رہے۔

وکیل سر جھکائے سوچتا رہا۔ پھر اُس نے رحیم داد کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا۔ "چوہدری اگر تو پیش ہونا نہیں چاہتا تو ایسی صورت میں تجھے اللہ وسایا کو مختار نامہ دینا ہوگا۔"

"بالکل دے دوں گا جی!" رحیم داد نے مستعدی سے کہا۔" مجھے اللہ وسایا پر پورا بھروسا ہے۔"

"اچھا جی! یہ مسئلہ بھی طے ہوگیا۔" وکیل نے کہا۔" میں کل مختار نامہ تیار کروالوں گا۔" وہ مسکرایا۔" ایک نہیں، دو تیار کرنے ہوں گے۔ ایک چوہدری کی طرف سے اور دوسرا زمیں دارنی کی طرف سے۔" اُس نے جمیلہ کو مخاطب کیا۔" تو بھی دفتروں کے چکر کاٹنے اور پیشیوں سے بچ جائے گی۔"

"بالکل ٹھیک ہے جی!" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔" ایک مختار نامہ تو اسے نکاح کے سمے پہلے ہی دے چکی ہوں۔ دوسرا بھی دے دوں گی۔ تو نے بالکل ٹھیک سوچا۔ میں کہاں افسروں کے سامنے پیش ہوتی پھروں گی۔ میرے دونوں بچے چھوٹے ہیں۔ انہیں یہاں چھوڑ بھی نہیں سکتی۔ اُن کی دیکھ بھال کروں گی۔ اللہ وسایا سب کام کرلے گا۔ پہلے بھی کرتا رہا ہے۔ مکدمے بازی کر کے اب تو تجربہ کار بھی بن گیا ہے۔"

"ایسا ویسا تجربہ کار بن گیا" وکیل بھی ہنسنے لگا" اب تو یہ مجھے بھی قانونی نکتے سمجھانے لگا ہے"

"ایسی گل نہ کر" اللہ وسایا نے مسکرا کر وکیل کی جانب دیکھا" اب آگے کی سوچ" اُس نے تجویز پیش کی" تو آج یہیں ٹھیر جا۔ سویرے سویرے نکل کھڑے ہوں گے۔ جمیلہ اور چوہدری کو بھی ساتھ لے لیں گے۔ یہ مختار ناموں پر دستخط کر دیں گے۔ کسی اور درخواست پر دستخط کرانے ہوں تو اُس پر بھی کر دیں گے۔ میں تیرے ساتھ الاٹمنٹ کے لئے ٹھیر جاؤں گا۔ یہ دونوں واپس آجائیں گے"

مگر رحیم داد رضامند نہ ہوا۔ وہ اُن کے ہمراہ جانے سے کترا رہا تھا۔ اُس نے فوراً عذر پیش کیا" مجھے نہ لے جا۔ میری طبیعت آج کچھ گڑبڑ ہے۔ مختار نامہ بھجوا دینا۔ میں دستخط کر دوں گا"

"تو چلا جائے گا تو کام جلدی نمٹ جائے گا۔ ممکن ہے دستخط کی توثیق کے لئے تجھے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت پڑے۔ ویسے اس کا امکان کم ہی ہے پھر بھی تیرا موجود ہونا مناسب رہے گا" وکیل نے صورت حال کی وضاحت کی" سویرے تک تیری طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ پروا نہ کر، طبیعت بگڑی تو شہر میں بہت اچھے ڈاکٹر موجود ہیں۔ یہاں سے اچھا ہی علاج معالجہ ہو جائے گا"

اللہ وسایا نے کہا" تو یہ طے ہو گیا کہ چاروں صبح چلیں گے"

رحیم داد خاموش رہا۔ وکیل نے تائید کی" ہاں جی، یہی ٹھیک رہے گا۔ میں رات یہیں گزار لوں گا"

سورج غروب ہو چکا تھا۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں کے باعث روشنی پہلے ہی کم تھی۔ شام جلد ہی ہو گئی۔ اندھیرا پھیلنے لگا۔ نوکروں نے لیمپ روشن کیا اور ایک اسٹول پر رکھ دیا۔ جمیلہ نے کھانا لگانے کی ہدایت کی۔ گھاس پر دری بچھائی گئی۔ لمبی میز لا کر رکھی گئی اور اُس پر کھانا چُن دیا گیا۔ سب نے بیٹھ کر کھانا کھایا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ لیکن گھوم پھر کر ایک بار پھر کلیم اور الاٹمنٹ کا موضوع چھڑ گیا۔ دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ رحیم داد نے بات چیت میں کم ہی حصّہ لیا مگر اُسے بہت سی ایسی باتوں کا علم ہو گیا جن سے وہ اب تک بے خبر تھا۔

رات کا ایک پہر گزرا تو سب اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اللہ وسایا اور جمیلہ نے حویلی کا رُخ کیا۔ رحیم داد اور وکیل محمّد عثمان رندھاوا مہمان خانے میں پہنچے۔ آنگن میں پہلے سے دو پلنگ بچھے تھے۔ اُن پر اُجلے بستر لگے تھے۔ دونوں میں مزید بات چیت نہیں ہوئی وہ اپنے اپنے بستروں پر لیٹے اور سو گئے۔

☆

سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی احمد نے رحیم داد اور رندھاوا کو جگا دیا۔ دونوں نے غسل کیا۔ ناشتہ میز پر لگ چکا تھا۔ وہ ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ اللہ وسایا پہنچ گیا۔ جمیلہ اُس کے ساتھ تھی۔ اللہ وسایا کرسی پر بھی نہیں بیٹھا۔ وہ سفر کے لئے تیار ہو کر آیا تھا۔ جمیلہ بھی پوری طرح تیار تھی۔ ذرا دیر بعد وکیل رندھاوا اور رحیم داد اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ مہمان خانے سے باہر نکلے۔

کار حویلی کے سامنے پیپل کے گھنے درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ ڈرائیور بھی قریب ہی موجود تھا۔ نوکروں نے ضرورت کا سفری سامان پہلے ہی کار میں رکھ دیا تھا۔ چاروں کار میں سوار ہوئے۔ روانگی سے پہلے اللہ وسایا نے دو نوکروں کو لاری کے ذریعے پہنچنے کی ہدایت کی۔ کار آگے بڑھی اور نہر کے کنارے کنارے دوڑنے لگی۔ صبح کا سہانا وقت تھا۔ ہوا میں تازگی اور فرحت تھی۔ اللہ وسایا، جمیلہ اور وکیل کے چہروں پر شگفتگی تھی۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ مگر رحیم داد خاموش اور سہما ہوا تھا۔

دوپہر ہونے سے پہلے ہی کار شہر کی حدود میں داخل ہوئی اور وکیل کے دفتر جا کے ٹھہر گئی۔ چاروں کار سے اُتر کے دفتر میں چلے گئے۔ دفتر اور گھر علیحدہ علیحدہ نہیں تھے مگر جس کمرے میں دفتر تھا، وہ خوب کشادہ اور ہوا دار تھا۔ کسی زمانے میں بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا۔ پچھلے حصے میں وکیل اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ مکان پختہ تھا۔ بالائی منزل پر آگے کے رُخ کمرہ تھا۔ دفتر کی دیواروں میں لگے ہوئے خوش رنگ ٹائل، قیمتی فرنیچر اور الماریوں میں لگے ہوئے قدِ آدم آئینے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ مکان کسی کھاتے پیتے سکھ یا ہندو کی ملکیت رہ چکا ہے۔

اتفاق سے وکیل کا وہ مؤکل بھی دفتر میں موجود تھا جس سے کلیم کا سودا کرنا تھا۔ وکیل نے اُسے دیکھتے ہی مسکرا کر اللہ وسایا کو مخاطب کیا۔ "لو جی، اپنے شیخ عنایت اللہ بھی موجود ہیں۔ یہ ہوشیار پور کے مہاجر ہیں۔ تو نے انھی سے کلیم کا سودا کرنا ہے۔" اُس نے شیخ عنایت اللہ سے اللہ وسایا کا تعارف کرایا۔ "اور شیخ صاحب! یہ کوٹلہ سرکشن کا زمیں دار اللہ وسایا ہے۔" شیخ عنایت اللہ کرسی پر بیٹھا تھا، جھٹ کھڑا ہو گیا۔ اللہ وسایا نے بڑھ کر گرم جوشی سے مصافحہ کیا، مڑ کر جمیلہ کی سمت دیکھا، مسکرا کر شیخ عنایت کو بتایا۔ "یہ میری گھر والی ہے جی۔ سودا تو دراصل اس نے کرنا ہے۔" اللہ وسایا نے رحیم داد کو بھی شیخ عنایت سے ملایا۔ چاروں کرسیاں سنبھال کر بیٹھ گئے۔

اللہ وسایا اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد جلد ہی حرفِ مطلب پر آگیا۔ اُس نے گفتگو کلیم اور متروکہ جائداد کے الاٹمنٹ کی جانب موڑ دی۔ شیخ عنایت کے پاس کلیم کے کاغذات موجود تھے۔ اُس نے اللہ وسایا کے استفسار پر زیادہ تفصیل میں جانے کی کوشش نہیں کی۔ کلیم کے کاغذات نکالے اور اللہ وسایا کی جانب بڑھا دیے۔ اللہ وسایا نے کاغذات الٹ پلٹ کر سرسری مطالعہ کیا۔ رحیم داد قریب ہی بیٹھا تھا۔ اُس نے بھی کاغذات پر نظر ڈالی مگر جمیلہ نے پوری توجہ سے ضروری دستاویزات اور کاغذات پڑھے۔

وکیل نے اس عرصے میں اللہ وسایا کے لئے اسٹامپ پیپروں پر دو مختار نامے

تیار کرائے، اُن پر جمیلہ اور رحیم داد سے دستخط کرائے۔ دستخط کرتے وقت رحیم داد کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اُس نے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالا اور مختار نامے پر چوہدری نورالٰہی مرحوم کے جعلی دستخط بنا دیے۔ وکیل دستخطوں کی توثیق کے لئے کچہری چلا گیا۔ وہ بارسوخ اور منجھا ہوا وکیل تھا۔ رحیم داد اور جمیلہ کو وہ اپنے ہمراہ نہیں لے گیا۔ واپس آیا تو دونوں مختار نامے مکمل تھے۔ اُن کی تصدیق بھی ہو چکی تھی اور توثیق بھی۔

مختار ناموں سے فارغ ہو کر وکیل نے نہایت خوش اسلوبی سے کلیم کا سودا بھی طے کرا دیا۔ شیخ عنایت کے رویّے سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ مالی طور پر بہت زیادہ پریشان اور ضرورت مند ہے۔ وکیل نے اُس کے بارے میں بالکل صحیح بتایا تھا۔ سودا اتنی سستی قیمت پر ہو گیا کہ جمیلہ کو اپنے زیورات فروخت کرنے کی ضرورت نہیں پڑی حالانکہ وہ زیور اپنے ساتھ ایک پوٹلی میں باندھ کر لائی تھی کہ اگر نقد رقم سے کام نہ بنا تو زیورات بیچ کر کمی پوری کر دے گی۔

ہر کام توقع سے زیادہ اطمینان بخش طور پر ہو گیا۔ مگر جب وہ تمام لکھت پڑھت سے فارغ ہوئے تو دن ختم ہو رہا تھا۔ شام کی آمد آمد تھی۔ دونوں نوکر بھی پہنچ چکے تھے۔ جمیلہ واپس جانے پر مصر تھی۔ وہ اپنے بچوں کو نوکرانیوں کی نگرانی میں چھوڑ کر آئی تھی۔ اب اُسے اُن کی یاد ستا رہی تھی۔ رحیم داد نے بھی جمیلہ کی تائید کی۔ وہ بھی فوری واپسی کے حق میں تھا۔ شہر میں داخل ہوتے ہی اُس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی۔ اُسے ہر طرف خطرہ نظر آتا تھا۔ وکیل کے دفتر میں وہ جتنی دیر رہا، خوف زدہ اور پریشان رہا۔ لمحے بھر کے لئے بھی باہر نہیں گیا۔ تمام وقت کرسی پر گم صم بیٹھا رہا۔ اُسے دن ختم ہونے اور شام کا دھندلکا پھیلنے کا بے چینی سے انتظار تھا۔ وہ شہر سے جلد از جلد دور چلا جانا چاہتا تھا اور خطرات سے بچنے کی خاطر رات کے اندھیرے میں سفر کرنا چاہتا تھا۔

لیکن وکیل نے جمیلہ اور رحیم داد کو جانے نہیں دیا۔ اُس کے خیال میں اس وقت سفر کرنا مناسب نہیں تھا۔ وہ صبح سے پہلے کوٹلہ ہرکشن نہیں پہنچ سکتے تھے۔ راستہ طویل تھا۔

ویران اور اُجاڑ علاقوں سے گزرتا تھا۔ رات کے سفر کے لئے محفوظ نہیں تھا۔ کچھ ہی عرصے قبل اسی راستے پر دن ڈھلے ایک لاری لٹ چکی تھی۔ کوٹلہ ہرکشن سڑک سے دور بھی تھا۔ کچا راستہ تھا اور خاصے پھیر کا تھا۔ دونوں کو، خصوصیت کے ساتھ جمیلہ کو، سفر میں طرح طرح کی مشکلات اور پریشانیوں سے سابقہ پڑتا۔

شیخ عنایت کلیم کا سودا مکمل ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد چلا گیا۔ اللہ وسایا، جمیلہ اور رحیم داد نے وکیل کے ساتھ کھانا کھایا اور اُسی کے مکان پر رات بسر کی۔ صبح ہوئی تو اللہ وسایا طے شدہ پروگرام کے مطابق وکیل کے پاس ٹھہر گیا۔ اُس نے ایک نوکر کو اپنے کام کاج کے لئے روک لیا، دوسرے کو جمیلہ اور رحیم داد کے ہمراہ کر دیا۔

راوی ٹرانسپورٹ کی ایک لاری سے تینوں واپس ہوئے۔ جمیلہ کو ڈرائیور کے ساتھ والی اگلی نشست پر جگہ مل گئی۔ اُس کے برابر دو عورتیں اور بیٹھی تھیں۔ دونوں برقع اوڑھے ہوئے تھیں۔ رحیم داد اور ملازم عالم، پچھلی نشست پر تھے۔ رحیم داد خوف زدہ اور سہما ہوا تھا۔ اُسے طرح طرح کے خدشات اور وسوسے پریشان کر رہے تھے۔ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کوئی اُسے پہچان نہ لے۔ لاری جس قدر آگے بڑھتی گئی، رحیم داد کی پریشانی میں اُسی قدر اضافہ ہوتا گیا۔ سویرا ختم ہو رہا تھا۔ زندگی کی چہل پہل اور گہما گہمی بیدار ہو رہی تھی۔

لاریوں کے اڈّے پر رحیم داد کو کوئی پولیس والا نظر آتا تو وہ لرز جاتا، سراسیمہ ہو جاتا، عینک قمیض کے دامن سے صاف کر کے دوبارہ آنکھوں پر لگاتا اور گردن جھکا کر اخبار پڑھنے لگتا۔ اخبار اُس نے شہر میں ایک ہاکر سے خریدا تھا۔ دھوپ کی تمازت میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ ہوا گرم ہو گئی مگر لُو کے تیز جھکّڑ نہیں چل رہے تھے، اس کے باوجود رحیم داد نے لُو سے بچاؤ کی آڑ میں گردن اور کانوں کے گرد چادر لپیٹ رکھی تھی۔ اس طرح اس کا چہرہ خاصا چھپ گیا تھا۔ لُو تیز ہوتی تو وہ ڈھاٹے سے چہرہ پوری طرح چھپانے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ اُسے سب سے زیادہ خطرہ پولس کی جانب سے تھا۔

لیکن اتفاق سے اس روز کوئی پولس والا لاری میں سوار ہی نہ ہوا۔

سہ پہر کو وہ پاک پتن پہنچے۔ مگر وہاں رکے نہیں۔ نیلی ٹرانسپورٹ کی پہلی لاری سے دیپال پور کی جانب روانہ ہوگئے۔

☆

چک بیدی کے اڈے پر اللہ وسایا کا مزارع قادرا اور اُس کا بیٹا صابر لاری میں سوار ہوئے۔ دونوں نے رحیم داد کو پہچان لیا ادب سے سلام کیا اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ وہ بھی کوٹلہ ہرکشن جا رہے تھے۔ اللہ وسایا کے ملازم عالم کو، جو شہر سے جمیلہ اور رحیم داد کے ہمراہ سفر کر رہا تھا، انہوں نے یہی بتایا تھا۔ دونوں مسلّح تھے۔ قادر کے پاس مضبوط اور اونچی ڈانگ تھی۔ اُس کے دونوں کناروں پر لوہے کی شام چڑھی تھی۔ ایک طرف کی شام میں سیسہ بھرا تھا۔ صابر کے پاس بھی مضبوط اور لمبے ہتھے کی کلہاڑی تھی جس کا چوڑا پھل تیز اور چمک دار تھا۔

لاری مسافروں سے بھری ہوئی تھی اور ہچکولے کھاتی پختہ سڑک پر دوڑ رہی تھی دن کا چل چلاؤ تھا۔ آسمان پر چھائے ہوئے گرد کے مٹیالے غبار کے پیچھے ڈوبتا سورج الاؤ کی مانند دہک رہا تھا۔ مغرب میں سرمئی مائل سُرخ روشنی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ لاری بھی اُسی سمت جا رہی تھی۔ سڑک ویران تھی۔ دونوں طرف کیکر کے درختوں اور گھنی جھاڑیوں کا جھنگر تھا۔ کہیں کہیں اونچے نیچے ٹیلے اور ٹبے بھی تھے۔ لاری دو ٹبوں کے درمیان سے ڈھلوان پر اُترتے ہوئے دائیں ہاتھ کو مڑی تو اس کی رفتار سست پڑ گئی اور کچھ ہی دور جانے کے بعد ٹھہر گئی۔

ڈرائیور لاری سے نیچے اُترا۔ باہر کچھ ملی جلی مدھم آوازیں اُبھریں۔ رحیم داد کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ اُس نے جھانک کر نظریں دوڑائیں۔ اگلے دروازے کے عین سامنے دو آدمی نہایت مشتبہ حالت میں کھڑے تھے۔ ایک وضع قطع سے کسان نظر آتا تھا۔

اُس کے ہاتھ میں لمبی لاٹھی تھی جس پر گنڈاسا لگا تھا۔ لاٹھی کندھے پر رکھی تھی اور پشت کی جانب اُس میں ایک گٹھڑی اس طرح جھول رہی تھی کہ گنڈاسے کا تیز پھل دُور سے صاف نظر نہیں آتا تھا۔ دوسرے کے چہرے پر ڈھاٹا بندھا تھا۔ اُس کے پاس پرانی وضع کی دیسی بندوق تھی۔ یہ مسکٹ تھی جو عام پیدل سپاہیوں کے پاس ہوتی ہے۔

ڈرائیور اُن کے نرغے میں خاموش کھڑا تھا۔ دیکھتے دیکھتے قریب کی جھاڑیوں سے تین آدمی نکلے اور ڈرائیور کے قریب پہنچ گئے۔ اُن کے چہروں پر بھی ڈھاٹے بندھے تھے۔ صرف آنکھیں نظر آتی تھیں جو تیزی سے اِدھر اُدھر گردش کر رہی تھیں۔ تینوں بلموں اور کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔ رحیم داد خوف زدہ ہوگیا۔ لاری کے دوسرے مسافر بھی دم بخود اور سہمے ہوئے تھے۔ اُن میں مرد تھے، عورتیں تھیں، بچے تھے مگر نہ کوئی بولا نہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ مسلح افراد نے مسافروں کو مزید دہشت زدہ کرنے کی کوشش کی۔ جس شخص کے ہاتھ میں مسکٹ تھی، اُس نے نال آسمان کی سمت بلند کی اور ٹھائیں ٹھائیں دو ہوائی فیر کیے۔ اُن میں سے ایک اونچے قد کا تھا وہ ڈپٹ کر زور سے چیخا۔

" سارے بندے باہر آجائیں۔ اپنا سامان اندر ہی رہنے دیں "

رحیم داد کے پیچھے بیٹھے ہوئے بوڑھے نے ساتھ والے مسافر سے کھُسر پھُسر کی۔

" ڈکیت جان پڑتے ہیں۔ دھاڑا پڑا ہے "

لباس کی سرسراہٹیں ابھریں۔ مسافر نشستوں سے اُٹھنے لگے۔ ایک عورت کی بغل میں دبا ہوا بچہ منہ پھاڑ کر رو یا۔ عورت نے ہاتھ بڑھا کر جھٹ اُس کا منہ بند کر دیا۔ بچہ سہمی ہوئی نظروں سے ماں کا جھنجلایا ہوا چہرہ تکنے لگا۔

کنڈکٹر جو کلینر بھی تھا، سب سے پہلے دروازے کی جانب بڑھا۔ اُس کے پیچھے پیچھے دوسرے مسافر لاری سے اُترنے لگے۔ رحیم داد بھی اُترا۔ وہ ابھی تک پریشان اور ڈرا ہوا تھا۔ وہ سڑک پر ایک طرف خاموش کھڑا ہوگیا۔ اُس نے دیکھا کہ قادر داد اور صابر بھی مسافروں کے ساتھ باہر نکل رہے تھے۔

اُن دونوں کو دیکھ کر مسلح افراد میں سے ایک غصّے سے دہاڑا۔" یہ رہا کا دوا دور اُس کا پتر۔"

قادر اور صابر نے جھٹ اپنی ڈانگ اور کلہاڑی اٹھائی اور اچھل کر مسلح افراد پر جھپٹے۔ اُنہوں نے پینترا بدل کر تیزی سے حملہ کیا، پانچوں حملہ آور بدحواس ہو گئے۔ ایک تو پہلے ہی بلے میں تیورا کر گرا اُس کی کنپٹی سے لال لال خون نکل کر گردن اور کپڑوں پر پھیلنے لگا۔ بقیہ چاروں مسلح افراد سراسیمہ ہو کر اِدھر اُدھر تتر بتر ہو گئے۔ اُن کے بکھرتے ہی مسافروں میں بھگدڑ مچ گئی۔ جس کا جدھر منہ اٹھا، اُدھر بھاگا اور درختوں کے نیچے گھس گیا۔

رحیم داد بھی ایک گھنی جھاڑی کی آڑ میں حیران و پریشان کھڑا تھا۔ جب وہ ذرا سنبھلا تو اُسے جمیلہ کا خیال آیا۔ اُس نے نظریں گھما پھرا کر اُسے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ کچھ فاصلے پر چھتری جیسے ایک گھنے درخت کے نیچے کھڑی تھی اور نگاہیں اُٹھائے بے چینی سے لاری کی جانب دیکھ رہی تھی۔ قادر اور اُس کا بیٹا تیزی سے اپنی ڈانگ اور کلہاڑی گھما رہے تھے۔ جھپٹ جھپٹ کر وار کر رہے تھے۔ صورتِ حال اب رحیم داد پر واضح ہوتی جا رہی تھی۔ مسلح افراد جو ڈاکو سمجھے جا رہے تھے دراصل مقتول طاہر کے شریکے اور بھائی بند تھے۔ انہوں نے طاہر کے قتل کا انتقام لینے کے لئے لاری رکوائی تھی۔ انہیں قادر اور صابر کی تلاش تھی جو اُن سے مقابلہ کرنے کے لئے سامنے آ چکے تھے۔

قادر کی عمر ۴۵ سے تجاوز کر چکی تھی مگر اُس کا جسم مضبوط اور گٹھا ہوا تھا۔ اُس میں توانائی کے ساتھ ساتھ پھرتی بھی تھی۔ اُس کے ہاتھوں میں دبی ہوئی ڈانگ بجلی کے مانند لہرا رہی تھی۔ صابر بیس بائیس سال کا قد آور نوجوان تھا۔ اُس میں بھی باپ کی طرح پھرتی اور حوصلہ تھا۔ حملہ آور اب سنبھل چکے تھے۔ وہ بھی گھوم پھر کر وار کر رہے تھے اور قادر اور اُس کے بیٹے کو نرغے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے مگر دونوں ہر بار اُن کا گھیرا توڑ کر نکل جاتے۔ وہ جھک کر، سمٹ کر، پلٹ کر ہر طرح اپنا سر بچانے کے

لئے کوشاں تھے۔ جھکائی دے کر اور پینترے بدل بدل کر حملے بھی کر رہے تھے۔

دونوں فریق لڑائی میں اس طرح گتھے ہوئے تھے کہ جس کے پاس مسکٹ تھی، وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ فاصلہ اس قدر کم تھا اور فریقین اس طرح جلدی جلدی اپنی جگہ بدل رہے تھے کہ گولی چلانے کی مطلق گنجائش نہ تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں مسکٹ سنبھالے اِدھر اُدھر گھومتا پھر رہا تھا۔ آخر اُس نے ایک بار ٹریگر دبا ہی دیا۔ گولی چیختی ہوئی نکلی مگر کسی کے جسم میں نہیں لگی۔ گولی کی آواز سن کر مسافر اور بدحواس ہو گئے۔ بھاگے اور درختوں اور جھاڑیوں کے نیچے دور دور تک بکھر کر دبکنے اور روپوش ہونے کی کوشش کرنے لگے۔

قادر اور اُس کے بیٹے کے مقابلے پر دراصل تین ہی مسلح افراد تھے۔ دونوں اس بے جگری سے جم کر لڑ رہے تھے کہ تینوں حملہ آوروں میں سے ہر ایک چوٹ کھا چکا تھا۔ کسی کے ہونٹ سے، کسی کے کندھے سے اور کسی کی ٹانگ سے خون رس رس کر پھیلتا جا رہا تھا مگر کسی کو کاری زخم نہیں آیا تھا۔ قادر اور صابر بھی گھائل ہو چکے تھے مگر زخموں سے بے نیاز وہ ہنوز بڑھ بڑھ کر تیزی سے وار کر رہے تھے۔ تینوں حملہ آوروں کو اپنے بچاؤ کے لئے زیادہ کوشاں ہونا پڑا۔ اب اُن میں پہلی سی پھرتی اور حوصلہ نہیں رہا تھا۔ وہ کسی قدر پریشان اور تھکے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور رفتہ رفتہ پیچھے ہٹ رہے تھے۔

وہ حملہ آور جسے قادر اور صابر نے پہلے ہی ہلے میں شدید زخمی کر دیا تھا "تڑک پر چت لیٹا تھا۔ قریب ہی اس کا بلّم پڑا تھا۔ وہ کچھ دیر بے حال پڑا رُک رُک کر سانس بھرتا رہا پھر اُس نے کروٹ بدلی۔ قادر اور صابر چند گز کے فاصلے پر تھے اور بپھر بپھر کر حملے کر رہے تھے۔ وہ دونوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ وہ اُن کے عقب میں تھا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر بلّم مضبوطی سے تھام لیا پھر اُٹھا اور دونوں ہاتھوں میں بلّم دبائے ہوئے تیزی سے قادر پر جھپٹا، وار کیا، بلّم کا نصف سے زیادہ پھل قادر کی پیٹھ میں اُتر گیا۔ وہ تلملا کر پلٹا۔ اسی وقت سامنے سے کلہاڑی کا وار ہوا، ہاتھ بھرپور پڑا۔ قادر کا ایک بازو

چھوٹ گیا۔ ڈانگ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ لڑکھڑایا اور سنبھلنے کی کوشش کی مگر بلّم کے تازہ وار نے اُسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اس دفعہ بلّم کا پھل اُس کے پہلو میں گوشت چیرتا ہوا پسلیوں تک اُتر گیا۔ قادر ڈگمگایا۔ گہری سانس بھری اور دونوں ہاتھوں سے بلّم پکڑا پھر سڑک پر گر پڑا۔ بلّم بدستور اُس کی پسلیوں میں پھنسا ہوا تھا۔

قادر نے زور لگا کر بلّم کھینچا۔ بلّم تو باہر نکل آیا، مگر ساتھ ہی پہلو سے خون کا فوّارہ اُبل پڑا۔ قادر نے ایک ہاتھ زخم پر رکھا، اُٹھنے کی کوشش کی مگر جس کے پاس مسکٹ تھی، وہ قریب پہنچ چکا تھا۔ اُس نے اُچھل کر پوری قوت سے قادر کے منہ پر لات ماری۔ وہ اس حملے کی تاب نہ لا سکا۔ بے سدھ ہو کر گر گیا۔ حملہ آور نے مسکٹ ایک طرف رکھی، دھوتی کے ڈب سے چھری نکالی اور قادر کے سینے پر سوار ہو گیا۔ اُس کا گلا ایک ہاتھ سے دبا کر بولا۔ ”میں طاہر کا پیو عطا محمّد ہوں۔“ اُس نے غصّے سے قادر کے منہ پر تھپڑ مارا۔

قادر کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اُس نے لڑکھڑاتی نظروں سے عطا محمّد کو دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ عطا محمّد نے چھری ایک آنکھ میں بھونک دی اور اُسے نکالنے کے لیے بے دردی سے چھری گھمانے لگا۔ قادر تڑپ کر بے بسی سے گردن اِدھر اُدھر ہلانے لگا۔ صابر پلٹ کر باپ کی جانب دیکھ بھی نہ سکا۔ حملہ آوروں نے اُسے نرغے میں لے لیا تھا اور ہر طرف سے تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے۔ صابر کے جسم پر جگہ جگہ زخم تھے لیکن وہ ڈٹا رہا اور ہر وار کلہاڑی کے ڈنڈے پر روکتا رہا۔ موقع ملتا تو پینترا بدل کر حملہ کرنے سے بھی نہ چوکتا۔

چار افراد کے مقابلے میں صابر زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ زخموں سے برابر خون بہہ رہا تھا۔ قدم بار بار ڈگمگاتے۔ کلہاڑی پر انگلیوں کی گرفت کمزور پڑنے لگی۔ اُس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ کلہاڑی کا لمبا ڈنڈا بھی ٹوٹ چکا تھا۔ اب وہ اپنا مؤثر دفاع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ حملہ آوروں کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ وہ گھیر کے ہر طرف سے پے در پے وار کر رہے تھے۔ صابر بھی گر پڑا۔

سورج ڈوب چکا تھا۔ مغربی افق پر ابھی تک لہو رنگ روشنی بکھری ہوئی تھی۔ شام بلندی سے نیچے اترنے کے لیے پر تول رہی تھی۔ دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا۔ رحیم داد نے دیکھا کہ جمیلہ درخت کے نیچے سے نکل کر سڑک کے اُس جانب بڑھی جدھر قادر اور صابر زخموں سے نڈھال پڑے تھے۔ عطا محمدؔ ابھی تک قادر کے سینے پر سوار تھا۔ جمیلہ زور سے چیخی "بہت ہوگیا۔ اب بند کر دیہ ہتیا چار" اُس کے لہجے میں بے قراری اور جھنجلاہٹ تھی۔
رحیم داد گھبرا گیا۔ اُس نے چاہا کہ جمیلہ کو آگے جانے سے روکے۔ وہ ایک ہاتھ اُٹھا کر اونچی آواز سے بولا "ٹھیر جا زمیں دارنی! اُدھر نہ جا" جمیلہ نے پلٹ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اُسی وقت ہارن کی آواز ابھری۔ سڑک کی مخالف سمت سے ایک لاری آتی نظر آئی۔ سب اُدھر دیکھنے لگے۔ عطا محمدؔ نے بے سدھ پڑے ہوئے قادر کو چھوڑ دیا۔ اُس کے سینے پر سے نیچے اترا۔ مسکٹ سنبھالی اور اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے اُونچی آواز سے بولا۔

"کام ہوگیا۔ اب نکل چلو"

سب نے جلدی جلدی اپنے اسلحہ سنبھال لیے۔ عطا محمدؔ نے مسکٹ کی نال اونچی کی۔ خوف اور دہشت پھیلانے کے لئے تڑ تڑ ہوائی فائر کیے۔ وہ فائر کرتا ہوا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سڑک پر دوڑنے لگا۔ فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ راستہ طے کرنے کے بعد سڑک سے اتر کر نشیب میں چلا گیا اور گھنے درختوں اور جنگلی جھاڑیوں کے اندر داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

سامنے سے آنے والی لاری قریب آ کر ٹھیر گئی۔ اس میں بھی مسافر سوار تھے اور کھڑکیوں سے جھانک کر قادر اور صابر کو دیکھ رہے تھے جو خون میں لت پت سڑک کے بیچوں بیچ پڑے تھے۔ جمیلہ بڑھ کر زخمیوں کے پاس پہنچی۔ رحیم داد، ڈرائیور

کلینر اور مسافر بھی درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ سے باہر نکلے اور سہمے ہوئے قادر اور صابر کی جانب بڑھے ۔ دوسری لاری کا ڈرائیور بھی اپنے مسافروں کے ساتھ نیچے اُترا۔

جمیلہ نے دیکھا کہ عطا محمدؐ نے قادر کی دونوں آنکھیں نکال دی تھیں ۔ وہ گردن پر بھی چھری چلا چکا تھا مگر صرف اوپر کی ذرا سی کھال کاٹ سکا تھا۔ جمیلہ نے کلائی تھام کر قادر اور صابر کی باری باری نبض دیکھی پھر گردن ہلا کر بولی "ابھی زندہ ہیں پر بُری طرح گھائل ہوئے ہیں۔" اُس نے مڑکر دوسری لاری کے ڈرائیور کی جانب دیکھا ۔

"تیں نوں پاک پتن جانا ہے ؟"

"جانا تو ہے جی ۔" اُس نے زخمیوں کی طرف اشارہ کیا۔" یہ جھگڑے میں زخمی ہوئے ہیں؟"

"ہاں جھگڑا ہی ہوا تھا۔" جمیلہ نے آہستہ سے جواب دیا ۔

ڈرائیور نے پوچھا۔" دوسری پارٹی کدھر گئی ؟"

"اُنھوں نے جی لاری رکوائی ، سارے مسافروں کو باہر بلایا۔" ایک بوڑھا مسافر بتانے لگا۔" وہ ان دونوں کی کھوج میں آئے تھے ۔ دیکھتے ہی حملہ کر دیا پر جی یہ دونوں بھی زبردست حوصلے والے نکلے ۔ وہ پنج تھے اور یہ صرف دو۔ انہوں نے ڈٹ کر ٹاکرہ لیا۔"

بوڑھے نے اپنی بات ختم بھی نہ کی تھی کہ طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں ۔ جو جس کے جی میں آرہا تھا، کہہ رہا تھا، اپنی سوجھ بوجھ کے اعتبار سے اظہارِ خیال کر رہا تھا مگر جمیلہ بہت پریشان تھی ۔اُس نے ڈرائیور سے کہا۔" بے کار کی باتیں چھوڑ۔ اِن دونوں کو پاک پتن کے سرکاری اسپتال لے جا ۔ اگر ان کی جلد ہی مرہم پٹی کردی گئی تو بچ جائیں گے ۔ ویسے خون بہت بہہ گیا۔" وہ دونوں زخمیوں کے قریب بیٹھ گئی اور خون بند کرنے کے لیے اُنھی کی پگڑیاں پھاڑ پھاڑ کر زخموں کے گرد لپیٹنے لگی ۔

ڈرائیور زخمیوں کو اسپتال لے جانے پر آمادہ نہیں ہوا۔" میں جی انہیں نہیں لے جاؤں گا۔"

"کیوں نہیں لے جائے گا؟" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔" تو چاہتا ہے، یہ دونوں نہیں

سڑک پر مر جائیں۔ تو اتنا بے رحم اور کٹھور کیوں ہے؟"

"گل ایہہ ہے جی،" ڈرائیور نے صفائی پیش کی۔ "بعد میں پولیس بہت ستاتے ہیں۔ روز روز گواہی کے لیے بلاتے ہیں۔ اوپر سے وکیل الٹے سیدھے سوال کر کے بھیجا خراب کر دیتے ہیں۔ دوسری پارٹی کا بھی ڈر رہتا ہے۔ گواہی خلاف دو تو عدالت سے نکلتے ہی حملہ ہوتا ہے۔"

"تو گواہی شواہی نہ دینا،" جمیلہ نے اُسے سمجھایا۔ "میں اپنے نوکر کو زخمیوں کے ساتھ بھیج رہی ہوں۔ وہی تھانے میں پرچہ چاک کرائے گا۔ اسپتال میں بھی لے جائے گا۔ تیں نوں تو انہیں صرف اسپتال تک پہنچانا ہے۔ گھبرانے کی کوئی گل نہیں۔"

ڈرائیور نے پھر بھی کترانے کی کوشش کی۔ جمیلہ نے جھٹ اُس کے ہاتھ پر دس روپے کا نوٹ رکھا۔ مسافروں نے بھی اصرار کیا، سمجھایا بجھایا۔ آخر وہ زخمی قادرا اور صابر کو پاک پتن لے جانے پر رضامند ہو گیا۔ جمیلہ کا ملازم، عالم زخمیوں کے ساتھ پاک پتن جانے والی لاری میں سوار ہو گیا۔ جمیلہ نے اُسے ضروری ہدایات دیں، پچیس روپے بھی دیے۔ لاری پاک پتن کی سمت روانہ ہو گئی۔

دیپال پور جانے والی لاری کے مسافر بھی سوار ہو گئے۔ اُن میں قادرا اور صابر نہیں تھے جن کا لال لال خون سڑک پر جگہ جگہ پھیلا ہوا تھا۔ جمیلہ اپنی نشست پر بیٹھی اُن دونوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اُس کا خوب صورت چہرہ افسردہ اور مرجھایا ہوا نظر آرہا تھا۔ باہر شام کا اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ مغرب میں دہکتا ہوا الاؤ بجھ چکا تھا۔ ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا۔ لاری سڑک پر دوڑنے لگی۔

ٹبی رحمان کے اڈے پر لاری ٹھہری۔ جمیلہ اور رحیم داد نے لاری سے اتر کر تانگا لیا۔ دونوں اس میں سوار ہو گئے۔ تانگا نہر کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ جب وہ کوٹلہ ہرکشن میں داخل ہوا تو پہر رات گزر چکی تھی۔ جمیلہ حویلی میں نہیں گئی، سیدھی قادرا اور صابر کے گھر پہنچی۔ رحیم داد اُس کے ہمراہ تھا۔ اطلاع ملتے ہی قادر کی بیوی ایک ہاتھ میں لالٹین سنبھالے

باہر آئی۔ اُس کے ساتھ بہو بھی تھی۔ دونوں کے پیچھے مجیداں تھی۔ وہ کمزور اور بیمار نظر آ رہی تھی۔

قادر کی بیوی نے جمیلہ کو دیکھتے ہی کہا: "بھین جی! تو اس وکھت کیسے آ گئی؟" وہ مسکرائی۔ "آ اندر آ جا۔ منجی پر آرام سے بیٹھ۔"

"نہیں، میں نے اندر نہیں جانا۔" جمیلہ بولی۔ "تجھے یہ بتانا ہے کہ کادو اور صابر کا طاہر کے پیو عطا محمد اور اُس کے شریکوں سے جھگڑا ہو گیا۔"

"ہائے ربّا!" وہ اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "زیبں دارنی! ٹھیک ٹھیک بتا۔"

"میں لاری میں چوہدری اور عالم کے ساتھ شہر سے آ رہی تھی۔ چک بیدی کے اڈے پر کادو اور صابر بھی لاری میں سوار ہو گئے۔ رستے میں عطا محمد اور اس کے ساتھیوں نے کسی بہانے سے لاری رکوائی، مسافروں کو نیچے اتروایا۔ وہ ۵ تھے اور سب مسلّح تھے۔ انہوں نے کادو اور صابر پر ہلّہ بول دیا۔"

"ہائے میں مر گئی۔" قادر کی بیوی بے قرار ہو کر چیخی۔ "صابر اور اس کا پیو کہاں ہے۔ تو دونوں کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لائی؟"

"وہ گھائل ہو گئے ہیں۔ میں نے عالم کے ساتھ دونوں کو لاری میں ڈال کر پاک پتن کے سرکاری اسپتال بھجوایا ہے۔"

قادر کی بیوی یہ سنتے ہی دروازے کی دہلیز پر بیٹھ کر بین کرنے لگی۔ بہو بھی سینہ پیٹتے ہوئے ساس کے ساتھ رونے لگی۔ مجیداں بت بنی گم صم کھڑی تھی۔ نہ وہ بولی، نہ روئی۔ لالٹین کی زرد روشنی میں اُس کا مرجھایا ہوا چہرہ مٹی کی طرح مٹیالا پڑ گیا تھا۔ وہ لڑکھڑائی اور ماں کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ ماں نے پلٹ کر اُسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ زور سے اُس کی پیٹھ پر دو ہتڑ مار کر چیخی۔ "کرماں ماری! تو مر کیوں نہ گئی۔ تیرے یار کے پیو نے اُس کے خون کا بدلہ چکا لیا ناں!" مجیداں پھر بھی کچھ نہ بولی۔ اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ

آنسو گرنے لگے۔

قادر کی بیوی اور بہو کے رونے اور چیخنے کی آوازیں رات کے سناٹے میں ابھریں تو گاؤں میں کھلبلی مچ گئی۔ گھروں کے دروازے کھلنے لگے۔ سب قادر کے گھر پہنچنے لگے۔ آن کی آن میں خاصا بڑا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ ان میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی تھیں، سبھی پریشان تھے، تشویش میں مبتلا تھے۔ قادر اور صابر کی بیویاں بلک بلک کر رو رہی تھیں۔

جمیلہ نے دونوں کو تسلی دینے کی کوشش کی "چنتا نہ کرو۔ سب ٹھیک ہی ہوگا"، ساتھ ہی انہیں ڈانٹا بھی۔ "تم نے تو خوا مخواہ پٹنی شروع کر دی۔ یہ برا شگون ہے۔ آنسو بہانا بند کرو۔ دونوں کی دیکھ بھال کے لئے کسی کو اسپتال بھیجو۔ ابھی تو لاری مل جائے گی۔"

"مجیداں کے دونوں ماما جائیں گے"، قادر کی بیوی نے رونا بند کر دیا۔ "میں بھی ان کے ساتھ جاؤں گی۔"

"چاچا اکبر کو بھی ساتھ لیتی جا"۔ بہو نے مشورہ دیا۔

اکبر وہاں موجود تھا، مستعدی سے بولا "ہاں جی، میں بھی چلوں گا۔" اس نے قادر کی بیوی کی طرف دیکھا "بھابی تو فٹا فٹ چلنے کو تیار ہو جا۔"

قادر کی بیوی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے دونوں بھائی اور بھاوجیں بھی موجود تھیں۔ روانگی کا پروگرام فوراً بن گیا۔ جمیلہ اور رحیم داد جس تانگے سے پہنچے تھے، وہ ابھی تک کھڑا تھا۔ قادر کی بیوی اپنے بھائیوں اور دیور کے ساتھ تانگے میں سوار ہو گئی۔ جمیلہ نے ایک بار پھر اسے تسلی دی۔ "مجیداں کی ماں! حوصلے سے کام لے۔ کوئی پریشانی کی گل ہو تو مجھے فوراً اطلاع بھیجنا۔ عالم تو وہاں موجود ہی ہوگا، میں بھی تیرے پاس پہنچ جاؤں گی۔ ویسے تو سویرے سویرے عالم کو واپس بھیج دینا تاکہ پتہ چل جائے کہ دونوں کیسے ہیں۔"

قادر کی بیوی نے جمیلہ کی ہر ہدایت پوری توجہ سے سنی اور عالم کے ذریعے اطلاع دینے کا وعدہ کیا۔ تانگا آگے بڑھا اور گاؤں سے دور نکل گیا۔

بھیڑ اب چھٹ چکی تھی۔ جانے والے واپس گھروں کو جا چکے تھے۔ مگر جمیلہ نہیں

گئی۔ اُس کے دونوں بچے سو چکے تھے۔ نوکرانیوں سے اُسے یہ اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی۔ قادر کے گھر کے دروازے پر صابر کی بیوی ابھی تک مضمحل اور نڈھال کھڑی تھی۔ اُس کی اوٹ میں مجیداں تھی۔ وہ پتھر کی مانند ساکت تھی۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ جمیلہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اُس کے قریب گئی شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا۔

وہ جمیلہ کے سینے پر سر رکھ کر جیسے پھٹ پڑی "بھین جی! میں بہت پاپی ہوں۔ مجھ بختاں ماری کو موت کیوں نہیں آجاتی۔" اُس کی سسکیاں خاموشی میں اُبھرنے لگیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ جمیلہ اس کا سر آہستہ آہستہ تھپکنے لگی۔ اُس نے زبان سے کچھ نہیں کہا البتہ اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ آنسو ڈھلک ڈھلک کر اُس کے رخساروں پر ٹپکنے لگے۔

رحیم داد خاموش کھڑا مجیداں اور جمیلہ کو روتے ہوئے دیکھتا رہا مگر وہ یہ رقّت انگیز منظر زیادہ دیر نہ دیکھ سکا۔ اُسے مجیداں کے باپ قادر کی آنکھیں یاد آگئیں جنہیں مقتول طاہر کے باپ نے چھری ڈال کر نکال دیا تھا وہ خون سے لتھڑے ہوئے دو بھیانک غار بن کر رہ گئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر خوف اور کراہت محسوس ہوتی تھی۔ رحیم داد سے وہاں نہ ٹھیرا گیا۔ وہ خاموشی سے مہمان خانے کی جانب روانہ ہوگیا۔

بستر پر لیٹ کر رحیم داد دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ بوجھل رات بھی زخمی تھی اور رحیم داد کی نیند بھی زخمی تھی۔ ہوا سسکیاں بھر رہی تھی۔

دن چڑھے جمیلہ مہمان خانے میں آئی۔ رحیم داد ناشتے سے فارغ ہو چکا تھا۔ جمیلہ کو دیکھتے ہی اُس نے بے چینی سے پوچھا "کادو اور صابر کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟"

"ہاں، عالم آیا تھا۔ بتاتا تھا۔ صابر کی حالت تو زیادہ خراب نہیں، پر کادو کو ابھی تک ہوش نہیں آیا۔"

"کادو کو زخم بھی زیادہ آئے تھے۔" رحیم داد بولا "تو نے تو دیکھا ہی تھا۔ سارا بدن خون سے لت پت تھا۔ طاہر کے پیو نے اُس کی آنکھیں تو نکال ہی لیں، وہ تو اس کی

گردن بھی کاٹ دینا چاہتا تھا۔ بہت ظالم ہے۔"

"یہ غصہ ہتیارا ہوتا ہے۔ اندھا بنا دیتا ہے۔" جمیلہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جب طاہر کا کتل ہوا تھا، تبھی میں نے کہا تھا کہ یہ جھگڑا اب کبھی ختم نہیں ہو گا۔ ویسے کادو اور صابر کتل کے مکدمے سے صاف چھوٹ گئے تھے۔ پر طاہر کے پُتر، بھائیوں اور شریکوں نے تو بدلہ لینے کا ارادہ نہیں چھوڑا تھا۔ آخر انہوں نے بدلہ لے لیا۔ کادو مر گیا تو صابر اور اُس کے چاچے، مامے بدلہ چکائیں گے۔ یہ جھگڑا ایسا ہی چلتا رہے گا۔ جانے کب تک چلے۔" جمیلہ کا چہرہ افسردہ ہو گیا، آنکھیں ویران ہو گئیں۔ وہ پریشان اور مضمحل ہو گئی۔

رحیم داد نے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ "زینن دارنی! تُو نے اپنے کو کیوں پریشانی میں ڈال لیا؟ ایسے جھگڑے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ تو کس کس کا دکھ اٹھائے گی۔" اُس نے گفتگو کا رخ بدلا۔ "اچھا، یہ بتا، عالم کدھر ہے؟"

"تُو اُس سے کادو اور صابر کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہے؟"

"نہیں، اُن کے بارے میں تُو نے بتا ہی دیا۔" رحیم داد نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "میں تو عالم سے اپنی دھوپ کی عینک کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ شہر میں اُسے اپنی عینک فریم بدلوانے کے لیے دی تھی۔ پچھلے دنوں فریم کی ایک کمانی ٹوٹ گئی تھی۔ پتہ نہیں عینک کا کیا بنا۔ اُس نے مجھے بعد میں کچھ بتایا ہی نہیں۔"

"اب تو شام سے پہلے پتہ نہیں چلے گا۔" جمیلہ نے کہا۔ "میں نے عالم کو اللہ دسایا کے پاس بھیجا ہے۔ وہ اُسے کادو اور صابر کے بارے میں بتا دے گا۔"

"اللہ وسایا کو اس جھگڑے میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ تُو نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔" رحیم داد کو جمیلہ کا اقدام پسند نہیں آیا۔ وہ قادر اور صابر کے معاملے کو اتنی زیادہ اہمیت دینے کے حق میں نہیں تھا۔

"اس میں غلط بات کیا ہوئی؟" جمیلہ کا لہجہ تیکھا تھا۔ رحیم داد کے رویّے سے اُس کے احساسات کو ٹھیس پہنچی تھی۔ کہنے لگی۔ "کادو کیول مزارع ہی نہیں، اس پنڈ کا رہنے

والا بھی ہے۔ مزارع بھی ہوا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کادو فصل پیدا کرے تو اللہ دوسایا زمیں دار بن کر اپنا حصّہ لینے تو پہنچ جائے، پر وہ گھائل ہو کر موت کے منہ میں پڑا ہو تو اللہ دوسایا اس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھے۔ نہ اُس کی خبر گیری کرے، نہ اُس کی سہاہتیا کرے، نہ اُسے حوصلہ دے۔ تُو خود ہی سوچ، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

رحیم داد نے خاموشی سے جمیلہ کی باتیں سنیں۔ لہجے کی تلخی بھی محسوس کی مگر اُس نے کسی ردِّ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ جمیلہ بھی کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ پھر وہ اٹھی اور باہر چلی گئی۔ وہ مضطرب اور بے چین نظر آرہی تھی۔

اللہ دوسایا رات گئے واپس آیا۔ رحیم داد اس وقت جاگ رہا تھا۔ حویلی کی چھت پر اُسے اللہ دوسایا کی آواز بھی سنائی دی مگر وہ رحیم داد کے پاس نہیں آیا۔ زیادہ دیر ٹھیرا بھی نہیں۔ وہ کیوں آیا تھا اور کیوں چلا گیا' رحیم داد کو دوسرے روز تک کچھ پتہ نہ چلا۔ نہ جمیلہ آئی اور نہ احمد نے کچھ بتایا۔ چوتھے روز اللہ دوسایا آیا تو رحیم داد سے اُس کی ملاقات ہوئی۔ رحیم داد اپنی بے قراری کی زیادہ دیر پردہ پوشی نہ کر سکا۔ اُس نے کرید کر پوچھا "تُو منگل وار کی رات کو بھی آیا تھا؟"

"ہاں آیا تو تھا۔" اللہ دوسایا نے بے نیازی سے کہا۔

"میں اُس وکت جاگ رہا تھا۔" رحیم داد نے بتایا۔ "پر تُو ٹھیرا نہیں، تھوڑی ہی دیر بعد چلا گیا تھا۔ تُو کیوں آیا اور کیوں اتنی جلدی چلا گیا، یہ بھید نہ کھلا۔"

"تجھے جمیلہ نے نہیں بتایا؟"

"وہ آج کل نظر ہی نہیں آتی۔ جانے کہاں رہتی ہے۔" رحیم داد نے جواب دیا۔ "ویسے یہ تو میں نوں پتہ ہے کہ وہ تیرے ساتھ نہیں گئی تھی۔"

"سمجھ گیا، وہ تجھے کیوں نظر نہیں آتی۔" اللہ دوسایا نے مسکرا کر کہا۔ "وہ ان دنوں کادو کے گھر میں زیادہ رہتی ہے۔ مجیداں اور صابر کی گھر والی کو تسلی دیتی رہتی ہے۔ چوہدری! اُسے تو ایسے کاموں کے لیے حیلہ چاہیے۔ وہ کسی کو دکھی دیکھ نہیں سکتی۔"

"اُس نے دُکھ بھی تو بہت سہے ہیں"، رحیم داد نے جمیلہ کی حمایت کی۔ چند لمحے خاموش رہا، پھر دریافت کیا۔ "یہ تو بتا کادو اب کیسا ہے؟ جمیلہ بتاتی تھی، ایک رات تو اُسے ہوش ہی نہیں آیا۔ اُسے زخم بھی تو بہت آئے تھے۔ میں نے تو سارا خون خرابہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔"

"کادو کو دوسرے روز بھی ہوش نہیں آیا تھا"، اللہ وسایا نے بتایا۔ "مجھے جیسے ہی پتہ چلا، سیدھا اسپتال پہنچا۔ کادو چپ پڑا تھا۔ صرف سانس لے رہا تھا۔ وہ بھی بہت دھیرے دھیرے۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا، اسے لاہور لے جاؤ، شاید بچ جائے۔ ویسے اُمید کم ہی لگتی ہے۔ میرے پاس وکیل کے زمین دار دوست کی کار تھی۔ میں نے کادو اور صابر دونوں کو اُس میں ڈالا۔ جمیلہ بھی اسپتال پہنچی ہوئی تھی۔"

"یہ مجھے پتہ نہیں تھا"، رحیم داد نے حیرت سے کہا۔

"میں جمیلہ ہی کو چھوڑنے منگل وار کی رات یہاں آیا تھا"، اللہ وسایا نے کہا۔ "وہ تو لاہور جانے کو بھی کہتی تھی پر میں نے سمجھا بجھا کر اُسے روکا۔ دونوں زخمیوں کو لاہور لے گیا۔ اسپتال میں داخل کرایا۔ کادو کو تو شام کو ہوش آیا۔ مرتے مرتے بچا ہے۔ اب تو کچھ ٹھیک ہے پر اندھا ہو گیا ہے۔"

"طاہر کے پیو نے کادو کے سینے پر چڑھ کر میرے سامنے چھری ڈال کر آنکھیں نکالی تھیں۔ کادو ایسا زور زور سے چیخا اور اُس کی آنکھوں سے ایسے خون نکلا کہ مجھے متلی ہونے لگی۔ مجھ سے اُدھر دیکھا نہ گیا۔"

"عالم نے مجھے بتایا، جمیلہ تو رو پڑی تھی۔"

"صابر تو اب بالکل چنگا ہو گیا ہوگا"، رحیم داد نے کہا۔

"بالکل چنگا تو نہیں ہوا پر اٹھ دس روز بعد اسے اسپتال سے چھٹی مل جائے گی، پر کادو کو زیادہ دن اسپتال میں رہنا پڑے گا۔"

"حملہ کرنے والوں کے خلاف پولیس نے بھی کوئی کاروائی کی؟"

"تینوں ملزم تو دوسرے ہی روز گرفتار کر لئے گئے تھے"، اللہ وسایا نے کہا۔ "طاہر کا پیو عطا محمد

اور چاچا سلطان محمدؐ ایک روز مفرور رہے۔ بعد میں وہ بھی پکڑ لئے گئے۔ پانچوں ابھی تک پولیس کی حراست میں ہیں۔ کیس رجسٹر کر کے پولیس نے ابھی عدالت میں چالان پیش نہیں کیا۔"

"ملزموں کے خلاف پرچہ تو نے چاک کرایا تھا؟"

"نہیں! عالم تھانے گیا تھا، اُسی نے رپٹ لکھوائی تھی۔ عینی گواہ بھی وہی ہے۔ بعد میں وکیل کے ساتھ میں بھی تھانے گیا تھا۔"

"وکیل نے الاٹمنٹ کے لئے کیا کیا؟"

"ابھی تو کچھ نہیں ہوا۔" اللہ وسایا نے بتایا۔" اِدھر نو میں کا دو اور صابر کے معاملے میں پھنسا رہا۔"

"اس میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔" رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہے تو میں نوں اب اسی طرف دھیان دینا ہے۔" اللہ وسایا نے رحیم داد کی رائے سے اتفاق کیا۔

جمیلہ بھی آگئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے اللہ وسایا سے پوچھا۔" تین نوں شہر نہیں جانا، وکیل انتظار کرتا ہو گا۔"

اللہ وسایا مسکرا کر بولا۔" چوہدری سے اسی بارے میں بات کر رہا تھا۔ تو فکر نہ کر، الاٹمنٹ شلاٹمنٹ کا سارا کام کر کے ہی لوٹوں گا۔"

رحیم داد نے جمیلہ سے کہا۔" زمین دارنی اکھڑی کیوں ہے۔ آرام سے بیٹھ کے بات کر لے۔"

"چوہدری! اب اسے نہ روک۔" اُس نے ہاتھ اٹھا کر اللہ وسایا کی طرف اشارہ کیا۔" اسے آج ہی شہر جانا ہے۔"

"پر ابھی تو بہت گرمی ہے۔ لو بھی چل رہی ہے۔ ایسے میں یہ کیسے سفر کر سکتا ہے۔"

"جانا تو اسے دن ڈھلے ہے پر کچھ دیر آرام تو کرنا ہو گا۔ سفر بھی لمبا ہے۔ رات دیر سے پہنچے گا۔"

اللہ وسایا کھڑا ہو گیا، مسکرا کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔" چوہدری! یہ زمیں دارنی نہیں تھانے

دارنی ہے اس کی بات تو ماننی ہی پڑے گی ۔ اب تجھ سے واپسی پر ملوں گا۔ چھینی نال لوٹنے کی کوشش کروں گا۔" اللہ وسایا دروازے کی جانب بڑھا۔ رحیم داد بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اللہ وسایا باہر گیا۔ جمیلہ بھی اُس کے ساتھ ہی چلی گئی۔

☆

شام کو رحیم داد نہا دھو کر باغ میں گیا۔ خلاف معمول باغ میں خوب چہل پہل تھی۔ گھاس پر قالین بچھا تھا۔ جمیلہ بڑی سج دھج سے قالین پر بیٹھی تھی۔ وہ اس وقت ہلکا گلابی کرتا اور گلابی شلوار پہنے ہوئے تھی۔ دوپٹا بھی اسی رنگ کا تھا۔ اُس کا سر دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ کرتے کے گریبان اور آستینوں پر کلابتو کی کشیدہ کاری تھی۔ پیشانی پر جڑاؤ داؤنی جھلملا رہی تھی۔ کانوں میں سونے کے مُندرے، گلے میں بگتیوں کا ہار اور ہاتھوں میں جڑاؤ کنگن تھے۔ آنکھوں میں کاجل تھا۔ وہ باوقار اور حسین نظر آ رہی تھی۔

جمیلہ کے قریب ہی بھاتاں سیاہ پھلکاری سے سر اور چہرے کا کچھ حصّہ چھپائے ٹکّل مارے بیٹھی تھی۔ اُس نے بھی غسل کیا تھا۔ اُجلی دھوتی باندھی تھی اور اُس کے اوپر بوٹی دار سفید جھگّا پہنا تھا۔ دونوں کے روبرو کچھ فاصلے پر نیم دائرے میں سات مرد بیٹھے تھے۔ وہ سفید کرتے پہنے ہوئے تھے۔ اُن کی دھوتیاں اور پگڑیاں بھی سفید اور اجلی تھیں۔ درمیان میں ایک بوڑھا بیٹھا آہستہ آہستہ حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اُس کی لمبی سفید داڑھی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور بوڑھا تھا۔ پانچ ادھیڑ تھے۔ اُن کی داڑھیوں اور سروں کے بال کھچڑی تھے۔

جمیلہ نے رحیم داد کو آتے ہوئے دیکھا تو مسکرا کر اونچی آواز سے کہا "چوہدری! ادھر ہی آجا۔"

رحیم داد آگے بڑھا اور جمیلہ اور بھاتاں سے ذرا ہٹ کر قالین پر بیٹھ گیا۔ اُسے اللہ وسایا نظر نہیں آیا۔ بیٹھتے ہی دریافت کیا "زمیں دار دکھائی نہیں دے رہا۔ وہ کدھر ہے؟"

"وہ تو سہ پہر ہی کو شہر چلا گیا۔" جمیلہ نے رحیم داد کو یاد دلایا "تیرے سامنے ہی تو پروگرام

بنا تھا۔"

رحیم داد خفیف ہو کر بولا۔" مجھے بالکل یاد نہیں رہا۔"

"ویسے اللہ وسایا نے وعدہ کیا تھا پر تجھے تو پتہ ہی ہے، اُسے ضروری کام سے جانا پڑا۔ اچھا ہوا تو آ گیا۔ میں تجھے بلوانے ہی والی تھی۔" جمیلہ نے سامنے بیٹھے ہوئے مردوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ تاجاں کے سگن کے لئے دن متھنے آئے ہیں۔ اب کوئی شبھ گھڑی سوچ کر ویاہ کی تاریخ طے کرنی ہے۔"

"اچھا تو یہ سا ہے کے لیے آئے ہیں۔" رحیم داد نے مسکرا کر روبرو بیٹھے ہوئے مردوں کو دیکھا۔" یہ تو نیک کام ہے۔ اس میں دیری کیا کرنی۔"

"لے زمیں دارنی! چوہدری بھی وہی گل کہہ رہا ہے، جو ہم اتنی دیر سے کہہ رہے ہیں۔" سامنے بیٹھے ہوئے سفید داڑھی والے بوڑھے نے حقّے کی نے منہ سے ہٹائی اور بے تکلفی سے جمیلہ کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"دیکھ بابے! جلدی نہ کر۔ تاجاں اب پھاتاں کی نہیں، میری دھی ہے۔ میں اُس کا ویاہ دھوم دھام سے کروں گی۔ اُس کا پیو نہ ہوا تو کیا ہوا، میں تو ہوں۔" جمیلہ نے اپنے سینے پر ہولے سے ہاتھ مارا۔" تو اس بات کی ذرا چنتا نہ کر۔ میں چاہتی ہوں، تو اپنے پُتر کی جنج لے کر آئے تو ذرا موسم اچھا ہو۔ ساری ہی رسمیں رِیتاں ہوں۔ ملنی ہو، سٹھنیاں ہوں، چھانتی وکھاونی ہو۔" وہ گردن کو ہلکا سا خم دے کر مسکرائی۔ "چلچلاتی گرمی یا بھری برکھا میں کیا مزا آئے گا۔ جنج چڑھے اور دھوم دھڑکا نہ ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

بوڑھا ہنس کر بولا۔" ہم نے اُڑنا نہیں ہے۔ زمیں دارنی! چل تیری ہی بات اُچی۔ تو ہی ویاہ کے لئے دن تاریکھ بتا دے۔ ویسے بھی تاریکھ تو وہٹی کے گھر والے ہی دیتے ہیں۔"

"ماگھ کیسا رہے گا۔ تین ہی مہینے تو بیچ میں ہیں۔" جمیلہ نے تجویز پیش کی۔" اُس سمے تک خریف کی فصل کی واڈھی بھی ہو جائے گی۔ پھٹّی کی چنائی ہو چکی ہو گی۔ بہت سہانا موسم ہو گا۔ گلابی سردی ہو گی۔"

"چلو جی ماگھ ہی رہا۔" بوڑھے نے کہا۔ "اب تاریکھ طے کرنی ہوگی۔"

"وہ تو زنانیاں ہی بیٹھ کر طے کریں گی۔" جمیلہ نے نظریں جھکا کر قدرے آہستہ سے کہا۔

"تو نے اپنی بھرجائی سے اس بارے میں گل بات تو کی تھی۔" ایک ادھیڑ شخص بولا۔ وہ پھاتاں کا بڑا بھائی اور رشتہ کرنے والا سمدھی اللہ دیتو تھا۔ "گھروالی کہتی تھی، ماگھ کی سات تاریکھ کی گل ہوئی تھی۔"

"ایسی گل ہوئی تو تھی۔" پھاتاں نے جھجکتے ہوئے اعتراف کیا۔ "دن کون سا ہوگا؟" وہ گردن اٹھا کر سوچنے لگی۔

"جمعرات یا جمعے کا دن ہوگا۔ چاند کی ۱۶ یا ۱۷ ہوگی۔" بوڑھے نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی اور زیرلب مسکرا کر گویا ہوا۔ "ہم نے پہلے ہی حساب لگا لیا تھا۔"

جمیلہ ہنس کر بولی۔ "بابے! ایہہ گل تھی تو پہلے ہی بتا دی ہوتی۔ اتنی دیر جھک جھک کیوں کی۔"

"زمیں داری! شادی ویاہ میں تھوڑی جھک جھک بک بک نہ ہو تو مزا نہیں آتا۔" بوڑھا بدستور مسکراتا رہا۔

"مجھے تو ٹھیک ہی لگتا ہے۔ سمجھو پورن ماشی ہی ہو گی۔ دو دن میں چندرما زیادہ نہیں گھٹتا۔ بھری چاندنی رات ہوگی۔" جمیلہ نے مڑ کر پھاتاں کی جانب دیکھا۔ "ٹھیک ہی رہے گا ناں؟"

پھاتاں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انگلیوں پر خاموشی سے حساب لگاتی رہی پھر مسکرا کر بولی۔ "ٹھیک ہے جی! ٹھیک ہے۔ ویسے جو دن ویاہ کا سب نے طے کیا، میں نے اُس میں کیا بولنا۔"

"تو فیر جی دن تاریکھ تو طے ہوگیا۔" بوڑھے نے یہ کہہ کر ذرا دور بیٹھے ہوئے نائی کی جانب دیکھا جو ان کے ساتھ ہی آیا تھا۔ اُس نے اونچی آواز سے کہا۔ "دینے! گنڈا لے آ۔"

نائی نے قریب رکھا ہوا مٹھائی کا ٹوکرا سنبھالا اور آگے بڑھ کر بوڑھے کے سامنے رکھ دیا۔ بوڑھے نے ٹوکرے کے اوپر رکھا ہوا رنگ برنگے سوت کا کلاوا اٹھایا اُس میں دو گرہیں لگائیں پھر اُسے ٹوکرے پر رکھ دیا۔ نائی نے جھک کر مٹھائی کا ٹوکرا پھر اٹھایا اور جمیلہ کے آگے

رکھ دیا ۔ جمیلہ نے اسے پانچ روپے لاگی کے دیئے ۔ لاگی بے کر وہ اونچی آواز سے دعائیں دیتا ہوا اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا ۔

جمیلہ نے پیچھے کھڑے ہوئے ملازم کو شربت لانے کا اشارہ کیا ۔ شام کا دھندلکا پھیل گیا تھا ۔ باغ میں گیس بتی روشن کر دی گئی تھی ۔ اُس کی تیز روشنی میں بوڑھے نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو دوسروں نے بھی ہاتھ اٹھا دیئے ۔ دعا کے بعد سب کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی ۔ ذرا دیر میں دودھ کا شربت آگیا ۔ جمیلہ نے اپنے ہاتھ سے شربت کا گلاس بوڑھے کو پیش کیا ۔ اُس نے گلاس لیتے ہوئے بڑی شفقت سے کہا ۔

" زمیں دارنی ! تُو جتنی سوہنی ہے ، اتنی ہی اچھی بھی ہے ۔ رب تیں نوں زمیں دارنی سے رانی بنائے ۔ تیرے لیے تو اندر سے دعا ہی دعا نکلتی ہے ۔ "

پھاتاں کے بھائی نے بھی جمیلہ کو کلمۂ خیر سے یاد کیا ۔ " تیری ایسی زمیں دارنی تو نہ دیکھی ، نہ سنی ۔ کون وڈا زمیں دار مزارعوں کے ساتھ ایسا میل جول رکھتا ہے ۔ انہیں اس طرح اپنے ساتھ بٹھاتا ہے ۔ ان کی آؤ بھگت کرتا ہے ۔ "

جمیلہ نے کچھ نہ کہا ۔ مسکرا مسکرا کر سب کے سامنے خود ہی گلاس بھر بھر کر شربت رکھا ۔ پھاتاں نے اُس کا ہاتھ بٹانا چاہا تو جمیلہ نے اُسے پیار سے ڈانٹ دیا ۔ " تُو چپ کر کے بیٹھی رہ ۔ ابھی تُو نے بہت سے کام کرنے ہیں ۔ "

سب مہمانوں نے شربت پیا ۔ رحیم داد نے بھی پیا ۔ شربت پینے کے کچھ دیر بعد گھاس پر دری ڈالی گئی ۔ اُس پر دستر خوان بچھایا گیا ۔ نوکروں نے نہایت مستعدی سے کھانا چنا ۔ سب نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا ۔ کھانے سے فارغ ہو کر مہمانوں نے واپس جانے کی خواہش کا اظہار کیا مگر جمیلہ نے اصرار کر کے انہیں روک لیا ۔

حویلی کے سامنے کے میدان میں خوب چھڑکاؤ کیا گیا ۔ چارپائیاں بچھا کر اجلے بستر لگا دیے گئے اور یہ طے ہوا کہ مہمان رات بسر کرنے کے بعد سویرے تاروں کی چھاؤں میں اپنے گاؤں واپس چلے جائیں گے ۔ پھاتاں ، بیٹی کا رشتہ اس شان سے طے ہو جانے پر بہت خوش تھی

مگر اُس سے بھی زیادہ مسرت جمیلہ کے چہرے پر بکھری ہوئی تھی۔ وہ بات بات پر ہنستی مہمانوں کی دل جوئی کرتی۔ رات گئے تک محفل جمی۔ پھر سب سونے چلے گئے۔ رحیم داد بھی سارے کی رسم میں شریک ہو کر بہت خوش تھا۔ اُس رات وہ بستر پر لیٹتے ہی گہری نیند سو گیا۔

دوسرے روز مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد جمیلہ بھاتاں کے گھر گئی اور ناجاں کو اپنے ہمراہ حویلی میں لے آئی۔ اب وہ سارے بندھی لڑکی تھی اور ایسی ہر لڑکی گھر کی لاج اور عزت ہوتی ہے۔ نہ وہ کھیتوں پر جا سکتی ہے نہ پانی بھرنے کنوئیں یا پنگھٹ پر۔ اُسے گھر کی دہلیز سے آگے قدم نکالنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ناجاں حویلی میں آنے کے بعد جمیلہ کے لئے امانت بن چکی تھی۔ وہ حویلی کی چار دیواری سے باہر صرف اپنے دولھا کے ساتھ ہی رخصت ہو کر جا سکتی تھی۔

☆

گرمی کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گئی تھی۔ صبح ہی سے لُو چلنے لگتی۔ دوپہر ہوتے ہوتے ہر طرف سناٹا چھا جاتا۔ گاؤں کا جوہڑ دن بھر بھینسوں سے بھرا رہتا۔ وہ کیچڑ اور پانی میں لیٹی جگالی کرتی رہتیں۔ اللہ وسایا ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ ایک شام جمیلہ باغ میں بیٹھی تھی۔ رحیم داد بھی موجود تھا۔ فضا بوجھل اور مٹیالی تھی۔ جمیلہ مسکرا مسکرا کر رحیم داد کو ناجاں کی شادی کی تیاریوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر مسرّت کی ایسی لہریں مچل رہی تھیں جیسے وہ اپنی سگی بیٹی بیاہنے جا رہی ہو۔ اسی اثنا میں قادر کی بیوی آ گئی۔ اُس کا چھوٹا بھائی سردار بھی ہمراہ تھا۔ وہ گٹھے ہوئے جسم کا مضبوط اور توانا جوان تھا۔ مونچھیں نوکیلی اور گھنی تھیں، چہرہ کسی قدر کرخت تھا۔

جمیلہ نے قادر کی بیوی سے پوچھا۔ ”تُو لہور ہی سے آ رہی ہے ناں؟ کادو اور صابر اب کیسے ہیں؟“

”اب تو دونوں ٹھیک ہی ہیں۔ صابر کو جلد ہی اسپتال سے چھٹی مل جائے گی۔“ قادر کی بیوی نے جواب دیا اور مڑ کر سردار کی جانب دیکھا ”بہین جی! یہ نئی خبر لایا ہے۔ میں اُسی کے بارے میں تجھے بتانے آئی ہوں۔“

جمیلہ نے قادر کی بیوی کو نظر انداز کرتے ہوئے براہِ راست سردار سے دریافت کیا۔" کیا نئی کھبر لایا ہے تو؟ کوئی پریشانی کی گل تو نہیں ؟"

" پریشانی ہی کی گل ہے جی!" سردار نے بتایا۔" عطا محمد اور اس کے ساتھ کے چاروں دوسرے ملزم ضمانت پر چھوٹ گئے ہیں۔"

" ضمانت پر تو انہیں چھوٹنا ہی تھا۔ اس میں پریشانی کی کون سی گل ہوئی؟" جمیلہ نے بے نیازی سے کہا۔

" تیرے لیے یہ پریشانی کی گل ہی نہیں ہے۔" سردار کا لہجہ قدرے تیکھا تھا۔" تیں نوں تو پتہ ہی ہے اُنہوں نے کادو کی آنکھیں نکال لی ہیں۔ یہ معمولی جرم نہیں۔ اس پر تو ان کی ضمانت ہی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ عطا محمد کی تو بالکل نہیں ہونی چاہیے تھی مگر پانچوں کی نہ صرف ضمانت ہو گئی بلکہ اتنی جھیتی ہو گئی کہ ان کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں۔ ہر طرف بڑھکیں مارتے پھر رہے ہیں۔"

" اب کیا کر سکتے ہیں وہ؟" جمیلہ نے دریافت کیا۔

" میں نے سنا ہے جی! وہ کادو اور صابر پر دوبارہ حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ یہی پریشانی کی گل ہے۔"

" ان کی طرف سے ایسا خطرہ ہو تو سکتا ہے۔" رحیم داد نے بھی سردار کے خدشات کی تائید کی۔

" پر کادو اور صابر تو سرکاری اسپتال میں ہیں۔" جمیلہ نے کہا۔" وہ اسپتال میں گھس کر کیسے حملہ کر سکتے ہیں؟"

" بالکل کر سکتے ہیں۔" سردار نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔" تیں نوں ان کے بارے میں اندازہ نہیں، وہ کتنے کھطرناک ہیں کتنے ہیں، طاہر کے خون کا تو ابھی بدلہ لینا ہے۔ وہ تو کادو اور صابر کا خون کرنے کے بعد ہی پورا ہو گا۔"

" تو اب کیا کرنا ہو گا؟" جمیلہ کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔" اللہ وسایا بھی موجود نہیں۔ میں کل ہی صبح اُس کی طرف کسی نوکر کو بھیج دوں گی۔ وہ اُسے سب کچھ بتا دے گا۔ کیوں

نہ تم دونوں نوکر کے ساتھ اللہ وسایا کے پاس چلے جاؤ اور اُسے خطرے سے آگاہ کردو۔"

"زیں وارثی! تُو فکر نہ کر۔" سردار نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ "میں اور میرا بھائی ابھی موجود ہیں۔ صابر کا چاچا اکبر بھی ہے۔ اور بھی اپنے شریکے ہیں۔ ڈٹ کر سامنا کریں گے۔ ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں۔ دیکھیں وہ کادو اور صابر پر کیسے حملہ کرتے ہیں۔ اس بار ایک بھی اُن میں سے بچ کر نہیں جائے گا۔"

"یہ تو ٹھیک نہیں ہوگا۔" جمیلہ اور پریشان ہوگئی۔ اُس نے جھگڑا ختم کرنے کی غرض سے تجویز پیش کی۔ "پنچایت بھیج کر صلح صفائی نہیں ہوسکتی؟"

"میں نوں پتہ ہے، وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ وہ خون خرابہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔" قادر کی بیوی نے کہا۔

رحیم داد نے جمیلہ کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "پر کوشش تو کرنی چاہیے۔"

"اس میں برائی کیا ہے؟" جمیلہ بولی۔ "پنچایت تو میں اپنی طرف سے بھیجوں گی۔ تمہاری آن پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"

"آئے گی تو۔ وہ یہی کہیں گے، کادو اور اُس کے شریکے ڈر گئے۔" سردار بولا۔ "پر تیری بات بھی ماننی ہے۔ تُو چاہتی ہے تو کوشش کر کے دیکھ لے۔"

"یہ تو ہونا رہے گا پر تم کو چوکس رہنا پڑے گا۔" رحیم داد نے سردار سے کہا۔

"میں اسی لیے تو یہاں آئی ہوں۔" قادر کی بیوی نے کہا۔ "ضمانت کی خبر ملتے ہی میں سردار کے ساتھ لہور سے چل کھڑی ہوئی۔ آج ہی شام تیاری کر کے سب کے ساتھ واپس جانے کا ارادہ ہے۔ تجھے تو بتانے آئے تھے۔ ویسے صابر کے چاچا اور اپنے دیر کو لہور چھوڑ کے آئی ہوں۔"

جمیلہ نے کہا۔ "اب تو اندھیرا ہوگیا۔ کل سویرے جانا۔"

"نہیں، بھین جی! ہم نے آج ہی جانا ہے اور ابھی جانا ہے۔" قادر کی بیوی آمادہ نہیں ہوئی۔ "لہور ہم نے چھیتی نال پہنچ جانا چاہیئے۔"

رحیم داد نے بھی اس کی تائید کی۔" زیں دارنی! انہیں نہ روک، جانے دے۔ تیں نوں پنچایت بھیجنی ہے تو کل یا پرسوں تک بھیج دینا۔"

"نہیں" جمیلہ نے کہا۔" پنچایت تو میں کل سویرے ہی بھیجنے کی کوشش کروں گی۔ اس معاملے میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔"

"جیسی تیری مرضی،" قادر کی بیوی نے کہا۔" اچھا، اب ہم نے جانا ہے۔"

جمیلہ اور رحیم داد خاموش رہے۔ قادر کی بیوی اپنے چھوٹے بھائی کے ہمراہ چلی گئی۔ شام کا دھندلکا گہرا ہو گیا تھا۔ جمیلہ بھی زیادہ دیر نہیں ٹھہری۔ وہ حویلی کی جانب روانہ ہو گئی مگر رحیم داد باغ ہی میں بیٹھا رہا۔ اس نے کھانا بھی وہیں کھایا۔ رات گئے وہ مہمان خانے کی چھت پر جا کر سو گیا۔

پچھلے پہر احمد نے رحیم داد کو آہستہ سے جھنجوڑا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ احمد حیران و پریشان سامنے کھڑا تھا۔ رحیم داد نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔" کی گل اے حمدے؟"

وہ بولا۔" غضب ہو گیا جی! وہ مجیداں کو اٹھا لے گئے۔"

" مجیداں کو اٹھا لے گئے؟" رحیم داد کو یقین نہیں آیا۔

" میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں جی۔"

" کب اٹھا لے گئے۔ کیسے اٹھا لے گئے؟" رحیم داد ہنوز حیرت زدہ تھا۔

" یہ تو جی میں نوں پتہ نہیں، وہ کیسے مجیداں کو اٹھا لے گئے۔" احمد نے بتایا۔" مجھے تو تھوڑی ہی دیر پہلے عالم سے ملوم ہوا ہے۔ سیدھا تیرے پاس آ رہا ہوں۔"

" زیں دارنی کو بھی ابھی پتہ چلا کہ نہیں؟"

" اُسے تو جی فوراً ہی پتہ چل گیا تھا۔ وہ کادو کے گھر دیر سے پہنچی ہوئی ہے۔ پورے پنڈ میں کھلبلی مچی ہے۔ سبھی کادو کے گھر جمع ہیں۔ یہ تو بہت بُرا ہوا جی!"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ نیند آنکھوں سے اُڑ چکی تھی۔ آسمان کی رنگت بدل رہی

تھی۔ رات کی سیاہی دھندلی پڑ چکی تھی۔ مغربی افق پر سرمئی اجالا پھوٹ رہا تھا۔ رحیم داد نے انگڑائی لی اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ چھت سے اتر کر نیچے آنگن میں آگیا۔ احمد بھی اُس کے ہمراہ تھا۔

دونوں مہمان خانے سے نکلے اور قادر کے گھر کی جانب چلے مگر وہ کچھ ہی دور گئے تھے کہ انہیں جمیلہ آتی نظر آئی۔ اُس کے ساتھ حویلی کے نوکر اور کچھ مزارع تھے۔ رحیم داد قریب پہنچا تو جمیلہ نے حیرت سے کہا۔" چوہدری! تو اب تک کہاں تھا؟"

" مجھے تو ذرا ہی دیر پہلے حمدے نے بتایا۔ سیدھا ادھر چلا آیا۔" رحیم داد نے صفائی پیش کی۔ اُس کے چہرے سے ندامت جھلک رہی تھی۔ چند لمحے وہ خاموش رہا۔ پھر اُس نے دریافت کیا۔" پر یہ سب کچھ ہوا کیسے؟"

" مجیداں کی بھرجائی بتاتی تھی۔ وہ اُوٹھوں پر سوار ہو کر آئے تھے۔ اُدھڑ دیوار سے لگا کر پہلے ایک آنگن میں اُترا۔ اُس نے دروازہ کھول دیا۔ دوسرے بھی اندر آگئے۔ چار تھے اور سب کاربینوں اور دوسرے ہتھیاروں سے پوری طرح مسلح تھے۔"

" پر مجیداں اور اُس کی بھرجائی نے کوئی شور وور بھی نہیں مچایا۔" رحیم داد نے کہا۔" ایسا ہوتا تو میری آنکھ ضرور کھل جاتی۔ بندوک تو اپنے پاس بھی ہے۔ جھٹ پہنچ جاتا۔ بنڈ کے دوسرے بندے بھی آجاتے۔ آسانی سے تو وہ مجیداں کو اٹھا کر نہیں لے جا سکتے تھے۔ لگتا ہے انہوں نے ڈرانے دھمکانے کے لیے ہوائی فیر شیر بھی نہیں کیے۔"

" انہوں نے جی! گھر میں گھستے ہی مجیداں اور اُس کی بھرجائی کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تاکہ وہ آواز نہ نکال سکیں۔" ایک بوڑھے مزارع نے بتایا۔" بھرجائی کو تو انہوں نے منجی سے باندھ دیا اور مجیداں کو اٹھا کر لے گئے۔ کسی کو پتہ چلتا تو کیسے، وہ پوری تیاری کر کے آئے تھے۔" اُس نے جمیلہ کی طرف دیکھا۔" کادو کی نوہ یہی بتاتی تھی ناں؟"

رحیم داد نے دریافت کیا۔" ان دو کے سوا گھر میں اور کوئی نہیں تھا؟"

" بچے تھے۔" جمیلہ بولی۔" مجیداں کی ماں تو اپنے بھائیوں اور شریکوں کے ساتھ شام ہی

کو لاہور چلی گئی تھی۔ تیرے سامنے ہی تو اُس نے بتایا تھا۔ گھر میں تو صرف مجیداں اور اُس کی بھرجائی تھی۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ انہیں پتہ تھا کہ گھر میں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں۔"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔" جمیلہ نے بھی رحیم داد کے خیال سے اتفاق کیا۔

رحیم داد نے پوچھا۔ "آگے کے لیے تو نے کیا سوچا؟"

جمیلہ نے کہا۔ "اس بارے میں بات کرنے میں تیرے پاس آؤں گی۔" وہ حویلی کی طرف مڑ گئی۔ رحیم داد مہمان خانے میں چلا گیا۔ اُس نے نہا دھو کر ناشتہ کیا اور جمیلہ کا انتظار کرنے لگا مگر وہ نہیں آئی۔ دوپہر ہو گئی۔

دن ڈھلے رحیم داد باغ میں پہنچا تو جمیلہ موجود تھی۔ اُسے دیکھتے ہی بولی۔ "معاف کرنا چودری! میں تیری طرف آنہ سکی۔ دن بھر پنڈ والے میرے پاس آتے رہے۔ مرد بھی تھے، زنانیاں بھی تھیں۔ سبھی پریشان ہیں۔ اس پنڈ میں پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔"

"تو نے زمیں دار کو بھی یہ خبر بھجوا دی؟"

"نہیں۔" جمیلہ نے کہا۔ "وہ سنے گا تو پریشان ہو جائے گا۔ مجھے ڈر ہے، واپس نہ آجائے۔ اُدھر بھی اُسے بہت ضروری کام ہے۔ تجھے تو پتہ ہی ہے، وہ کتنا ضروری کام ہے۔"

"تو ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ پر زمیں دار کو اس بات کا پتہ تو چلنا چاہیے۔ بعد میں وہ برا نہیں منائے گا۔"

"اس کی تو چنتا نہ کر۔" جمیلہ نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "میں اُسے سمجھا بجھا دوں گی۔ وہ خاما خاکی اکڑ نہیں دکھاتا، نہ مجھ پر رعب جمانے کی کوشش کرتا ہے۔" وہ زیرِ لب مسکرائی۔

"مجیداں کے ماپے چاچے کو پتہ چلے گا تو غصے سے پاگل ہو جائیں گے۔ یہ اُن کی عزت اور آن کا معاملہ ہے۔ وہ پہلے ہی جوش میں تھے اب تو اُن کے آگ ہی لگ جائے گی۔" رحیم داد نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ "وہ مجیداں کو واپس لانے کی ضرور کوشش کریں گے۔"

"مجیداں کو واپس لانا اب آسان نہیں رہا۔"

"یہ تو مجھے بھی اندازہ ہے۔" رحیم داد بولا۔ "پر مجیداں کے گھر والے اور شریکے چپ کر کے تو نہیں بیٹھیں گے۔ کسی نہ کسی طور ضرور بدلہ لینے کی کوشش کریں گے۔ پہلے اتنا خون خرابہ نہیں ہوا، جتنا اس دفعہ ہو گا۔ دونوں ہی پارٹیاں ایک دوسرے کو ختم کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

"سویرے سے اب تک میں اسی بارے میں سوچتی رہی۔"

"تو نے کوئی فیصلہ بھی نہیں کیا؟ مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔ زمیں دار کو بھی کچھ بتانا نہیں چاہتی۔ اور خود بھی کچھ کرنا نہیں چاہتی۔ اب بنے گا کیا؟"

"اپنی سمجھ میں تو ایک ہی گل آتی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" رحیم داد نے مضطرب ہو کر دریافت کیا۔

"طاہر کے پیو عطا محمّد کے پاس پنچایت بھیجی جائے۔"

"تو سمجھتی ہے وہ پنچایت کی بات مان لے گا؟" رحیم داد نے اپنے شک و شبہ کا اظہار کیا۔ "اب تو مشکل ہی لگتا ہے، مجیداں جوان کے پاس پہنچ گئی۔ وہ اُسے ہرگز واپس نہیں کریں گے۔ سارا جھگڑا تو اُسی کا ہے۔"

"میں خود پنچایت لے کر جاؤں گی۔" جمیلہ نے کہا۔ "تو بھی میرے ساتھ چلنا۔"

"زمیں دارنی تو پنچایت لے کر کیسے جا سکتی ہے۔" رحیم داد کا لہجہ قدرے تیکھا تھا۔ "وہ مزارع ہیں۔ تیرے نہ سہی، کسی اور کے تو ہیں۔ سمجھے تو مزارع ہی جائیں گے۔ اور تو ٹھہری زمین دارنی۔ تیرا جانا بالکل ٹھیک نہیں۔ یہ بات تو اپنے دل سے نکال دے۔"

"تجھے زمیں داری کی ایسی ہی شان ہے تو نہ جا، پر میں تو جاؤں گی۔"

"یہ شان اور گھمنڈ کی گل نہیں۔ پر عزت کا بھی تو کچھ خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو مزارع اور زمیں دار میں فرق ہی کیا رہا۔"

"تیرا مطلب ہے، عزت اور مان کے کارن بس چپ کر کے خون خرابہ ہوتے دیکھتی رہوں۔" جمیلہ نے رحیم داد کی دلیل سختی سے مسترد کر دی۔ "میں چلی جاؤں گی تو ہو سکتا ہے، عطا محمّد اور اس کے شریکے صلح صفائی پر راضی ہو جائیں اور مجیداں کو واپس بھیج دیں۔ میں انہیں سمجھانے

بجھانے کی کوشش کروں گی۔ میں نے سنا ہے، عطا محمد کا پیو بہت نیک بندہ ہے۔ کلا نور خاں موضع ہے۔ اُس کے سارے ہی مزارع اور زمیں دار اُس کی بہت عزت کرتے ہیں۔ وہ میری بات ضرور مان لے گا۔"

"اور جو تیری پنچایت کی بات نہ مانی گئی تو؟"

"تو کیا ہوگا؟ آگے کی آگے دیکھی جائے گی۔ کوشش تو کر کے دیکھ ہی لینا چاہیے۔" جمیلہ بے نیازی سے بولی۔" میری عزت اور آن ایسے نہیں جاتی۔ تیں نوں کی پتہ۔ میں نے عزت اور لاج کو برباد ہوتے کیسے کیسے دیکھا ہے۔" اُس نے ٹھنڈی سانس بھری۔" چوہدری! یہ عزت اور شان کا بھی عجب چکر ہے۔ میں نے فسادات اور بلووں کے دنوں میں راتوں رات اسے کیسے کیسے بگڑتے اور لٹتے ہوئے دیکھا۔ جب سے یہ سب کچھ دیکھا ہے، میرا تو عزت اور آن پر سے وشواس ہی اٹھ گیا۔"

"تیری یہی مرضی ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" رحیم داد نے جمیلہ کے عزم کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔" اچھا یہ بتا، کب تک پنچایت لے جانے کا ارادہ ہے؟"

"یہ کام تو چھیتی نال ہونا چاہیے۔ کل سویرے ہی چلیں گے۔ روانگی سے پہلے کسی بندے کو بھیج کر عطا محمد کو اطلاع کرا دیں گے۔" جمیلہ نے اپنا پروگرام بتایا۔" اور ہاں، تو نے اپنے جانے کے بارے میں کیا سوچا؟"

"جب تو جا رہی ہے تو میں بھی تیرے ساتھ چلا جاؤں گا۔" رحیم داد نے اظہار رضامندی کیا۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد جمیلہ نے رحیم داد کے ساتھ ہی باغ میں کھانا کھایا۔

کھانے سے فارغ ہو کر جمیلہ نے گاؤں کے اُن بڑے بوڑھوں کو بلایا جنہیں وہ پنچایت میں شریک کر کے اپنے ہمراہ موضع کلا نور خاں لے جانا چاہتی تھی۔ وہ اُن کے ساتھ رات گئے تک صلاح مشورہ کرتی رہی۔

سویرے سویرے اُس نے اپنے ایک ملازم کو عطا محمد کے پاس بھیج دیا تاکہ وہ پنچایت کی آمد سے اُسے مطلع کر دے۔ دن چڑھے اُس نے تین تانگے بلوائے۔ سب اُس میں سوار ہوئے۔ پنچایت اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔ کلا نور خاں لگ بھگ نو میل تھا۔

جمیلہ کی سربراہی میں پنچایت جب عطا محمّد کے گاؤں میں داخل ہوئی تو سورج آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ چکا تھا۔ گرمی شباب پر تھی، البتہ لُو نہیں چل رہی تھی۔ حبس اور امُس سے سب پسینے میں شرابور تھے۔ تانگے گاؤں کے گلی کوچوں سے گزرتے ہوئے عطا محمّد کے گھر پہنچے۔ جمیلہ نے دیکھا، گھر کے سامنے ایک درخت کے نیچے گاؤں کے کچھ بوڑھے اور جوان جمع تھے۔ اُن میں عطا محمّد بھی شامل تھا۔ سب خاموش تھے۔ اُن کے چہروں پر افسردگی تھی، سنجیدگی تھی۔ ایک کانسٹیبل بھی موجود تھا۔ اُسے دیکھ کر رحیم داد پریشان اور خوف زدہ ہوگیا۔

جمیلہ تانگے سے نیچے اُتری۔ رحیم داد اور دوسرے لوگ بھی اُترے۔ عطا محمّد نے جمیلہ کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا، آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آیا۔ سر جھکا کر بجھے ہوئے لہجے میں بولا "زمیں دارنی! تو جسے لینے آئی تھی، اُس نے تیرا انتظار بھی نہیں کیا۔ وہ چلی گئی۔"

جمیلہ حیران و پریشان ہو کر بولی "تیرا مطلب مجیداں سے ہے؟ وہ کہاں چلی گئی۔ کس کے پاس چلی گئی؟"

ایک بوڑھے نے اپنی لمبی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "وہ اپنے رب کے پاس چلی گئی۔ جس کی امانت تھی، اُسی کے پاس پہنچ گئی۔ ایک دن سب کو وہیں جانا ہے۔" وہ کلانور خاں کی مسجد کا ملّا تھا۔

جمیلہ اور زیادہ پریشان ہوگئی۔ اُس نے عطا محمّد سے پوچھا "کیا یہ سچ ہے؟" اُس نے قدرے تامّل کیا "لگتا ہے، تُو نے اُس کا خون کر دیا۔ طاہر کا بدلہ مجیداں سے لے کر تُو نے اچھا نہیں کیا۔ وہ تو پہلے ہی بہت دکھی تھی۔ وہ ابھاگن تو خود اپنی آگ میں اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔" اُس کی آواز گلوگیر ہوگئی "کہاں ہے وہ؟ کدھر ہے اُس کی لاش؟"

"اندر منجی پر پڑی ہے۔" عطا محمّد دل گرفتہ ہو کر بولا "زمیں دارنی! تو بھی پولیس کی طرح مجھ پر شبہ کر رہی ہے؟ میں نے اُس کا خون نہیں کیا۔ اُس نے رات کو اپنے کپڑوں پر لالٹین سے تیل چھڑک کر آگ لگا لی اور جل کر مر گئی۔ اُس کا کسی نے خون نہیں کیا۔ جا اندر جا کر دیکھ لے۔"

جمیلہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگے۔ وہ گھر کے اندر چلی گئی۔ آنگن کے ایک

طرف چھپر کے نیچے چارپائی پر سیاہ چادر بچھی تھی۔ اُس کے نیچے بھیداں کی لاش تھی۔ چارپائی کے قریب ایک چٹائی پر دو بوڑھی عورتیں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔ ہر طرف جلے ہوئے گوشت کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ جمیلہ آگے بڑھی اور چارپائی کے سرہانے کھڑے ہو کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

⚝

آسمان دھواں دھواں تھا۔ فضا نڈھال اور بوجھل تھی۔ باغ میں جمیلہ خاموش بیٹھی تھی۔ رحیم داد بھی موجود تھا۔ جمیلہ کا شگفتہ اور حسین چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ وہ دیر تک نظریں جھکائے کچھ سوچتی رہی پھر اُس نے گردن اونچی کر کے رحیم داد کو دیکھا اور بجھے ہوئے لہجے میں بولی "چوہدری! سمجھ نہیں آتی، اللہ وسایا اب تک کیوں نہیں لوٹا، اُسے گئے ہوئے دس بارہ روز ہو گئے۔"

"کام میں پھنسا ہو گا۔ الاٹمنٹ کرانا آسان نہیں۔ لمبا چکر ہوتا ہے۔"

"پر اُس نے کوئی اطلاع کیوں نہیں بھیجی۔ پہلے تو اُس نے کبھی ایسا نہیں کیا۔" جمیلہ کے چہرے پر غم کا ہلکا ہلکا سایہ پھیلنے لگا "سویرے سے جانے کیوں میرا من بے کل ہے۔ بار بار رونے کو جی چاہتا ہے۔"

"زمیں دارنی! تو بہت جلد گھبرا جاتی ہے۔ پریشان نہ ہو، وہ دو چار دن میں آ جائے گا۔" رحیم داد نے بےتکلفی سے مسکرایا "لگتا ہے، تجھے اللہ وسایا سے بہت پیار ہے۔"

"ہے تو۔" جمیلہ نے سر دوپٹے کے آنچل سے ڈھانکا اور شرما کر نگاہیں نیچی کر لیں "وہ میرے بچوں کا پیو ہے۔ اٹھ سال سے میرا اُس کا ساتھ ہے۔ مجھے ذرا نراس دیکھتا ہے تو گھبرا جاتا ہے۔ پوچھتا ہے، جمیلے! تجھے کیا ہو گیا۔ تو اتنی پریشان کیوں ہے۔ جب وہ میرے لئے اتنا بے کل ہو جاتا ہے تو میں اُس کے لئے کیوں نہ چنتا کروں۔ چوہدری، تالی تو دونوں ہاتھ سے بجتی ہے نا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے پر تجھے خامخا اتنا پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ چند روز انتظار کر لے۔ وہ واپس آتا ہی ہو گا۔ حوصلے سے کام لے۔"

"میں اُس کا کل تک اور انتظار کروں گی۔" جمیلہ نے اپنا عندیہ بتایا "اگر وہ چراغ جلے تک نہ پلٹا تو میں شام کو حویلی سٹیشن چلی جاؤں گی۔ یہاں سے حویلی سٹیشن نزدیک ہی ہے۔ دونوں بچوں

اور ایک نوکر کو ساتھ لیتی جاؤں گی۔ رات کی ٹرین سے کھوور کے رستے رائے ونڈ ہوتی ہوئی لھور پہنچ جاؤں گی۔"

"تیں نوں پتہ ہے، وہ لھور ہی ہیں ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔ "وہ ملتان میں بھی ہو سکتا ہے۔"

"مجیداں کا ماما سردار پرسوں آیا تھا۔ بتاتا تھا، اللہ وسایا کو اُس نے لھور میں دیکھا تھا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ جمیلہ کھڑی ہوئی، آگے بڑھی اور جھٹ پٹے بین درختوں کے نیچے اوجھل ہوگئی۔ وہ بڑی بے قرار نظر آرہی تھی۔ اُسے اس طرح پریشان دیکھ کر رحیم داد کو بھی اللہ وسایا کے بارے میں تشویش ہوئی۔

دوسرے روز سہ پہر کو رحیم داد ٹہلتا ہوا کھیتوں کی جانب چلا گیا۔ کماد اور کپاس کے پودے ہاتھ ہاتھ بھر اونچے ہوگئے تھے۔ اُن کے پتوں سے خاک کے ذرّے چمٹے ہوئے تھے۔ مکئی کے پودوں پر ہل چلا کر ڈنٹھل توڑے جارہے تھے تاکہ اُن کی زیادہ شاخیں پھوٹیں اور زیادہ سٹے لگیں۔ جیٹھ کا مہینہ ختم ہورہا تھا۔ چلچلاتی گرمی کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ فضا ہنوز غبار آلود تھی۔ سانس لیتے ہوئے گھٹن محسوس ہوتی۔ دھوپ میلی اور مٹیالی تھی۔ سائے طویل ہوتے جارہے تھے۔

رحیم داد باغ میں پہنچا۔ جمیلہ پہلے سے وہاں تھی۔ موسم گرما کی سلگتی شام کے دھندلکے میں جمیلہ کا چہرہ مٹیالے آسمان کے مانند اجڑا اجڑا لگ رہا تھا۔ وہ اُس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد جمیلہ نے بتایا کہ وہ گھنٹے سوا گھنٹے میں لاہور روانہ ہوجائے گی۔ اتنا بتا کر وہ پھر چپ ہوگئی۔ رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ شام دھیرے دھیرے نیچے اتر رہی تھی۔ سناٹا بڑھتا جارہا تھا۔ یکایک قریب بیٹھے ہوئے نوکروں میں سے ایک کی آواز اُبھری: "لو جی، زمیں دار تو آگیا۔"

جمیلہ بے چین ہوکر کھڑی ہوگئی۔ ذرا دیر بعد اللہ وسایا درختوں کے ایک جھنڈ سے نکل کر سامنے آگیا۔ جمیلہ نے اُسے دیکھا تو جہاں تھی، وہیں کھڑی رہ گئی۔ اللہ وسایا آہستہ آہستہ نزدیک آگیا۔ وہ بہت تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ چہرہ اور کپڑے خاک سے اَٹے ہوئے تھے۔ جمیلہ کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔

"مجھے پتہ تھا، تو ادھر ہی ہوگی۔ سامان نوکروں کے حوالے کیا اور سیدھا تیرے پاس چلا آیا۔" جمیلہ

نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بت بنی کھڑی رہی۔

اللہ وسایا نے اُس کا گمبھیر چہرہ دیکھا اور بے تکلفی سے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "کیا بات ہے جمیلے! بہت ناراض لگ رہی ہے"۔ اُس کے لہجے میں پیار کی مٹھاس تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تجھے میری ناراضی کی کیوں چنتا ہونے لگی"۔ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے تیکھے لہجے میں بولی۔ "تُو تو لہور میں عیش کر رہا تھا"۔

"لے چوہدری، اس کی گل سن"۔ اللہ وسایا نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "کہتی ہے، میں لہور میں عیش کر رہا تھا۔ یہ تو پوچھا نہیں، میں اتنے دنوں کیسے کیسے چکروں میں پھنسا رہا"۔

"تُو نے بتایا تھا؟" جمیلہ نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر ترچھی نگاہوں سے اللہ وسایا کو دیکھا۔ "کسی نوکر ہی کو بھیج کر اپنی خیر خبر بھجوا دیتا۔ میں نے تو تیرے پاس پہلے ہی ایک نوکر اور بھجوا دیا تھا"۔

"ہاں جی، اپنے سے یہ غلطی ہو گئی"۔ اُس نے آہستہ آہستہ سر ہلا کر نہایت معصومیت سے اعتراف کیا۔ "لے اب غصہ تھوک دے۔ لسی شربت پلا۔ سخت پیاس لگی ہے"۔

جمیلہ نے سامنے کھڑے ہوئے ایک ملازم کو لسی لانے کی ہدایت کی اور اللہ وسایا سے پوچھا۔ "یہ تو بتا، جس کام سے تُو لہور گیا تھا، اُس کا کیا بنا؟"

اللہ وسایا نے ہنس کر جواب دیا۔ "فکر نہ کر۔ تجھے خوش خبری ہی سناؤں گا"۔

جمیلہ نے کرسی کھسکا کر اللہ وسایا کے قریب کر لی۔ "کیا خوش خبری سنانا چاہتا ہے؟"

"سارا ہی کام ٹھیک ٹھیک ہو گیا"۔

"کیا کیا ہو گیا؟" جمیلہ نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

"چوہدری کے نام حویلی اور اڑھائی سو ایکڑ زمین کا الاٹمنٹ ہو گیا اور خریدے ہوئے کلیم کی بنیاد پر اپنی ۱۲ مربع زمین کا بھی تیرے نام الاٹمنٹ ہو گیا"۔ اللہ وسایا نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "لے بھئی چوہدری تجھے حویلی اور دس مربع زمین کا الاٹمنٹ مبارک ہو"۔

"میرا کیا ہے اللہ وسایا! سب تیرا ہی ہے۔ تیری ہی کوششوں سے اور تیرے ہی ٹمپے سے سب کچھ ہوا ہے"۔ رحیم داد نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "اب تو یہ میرا پیچھا چھوڑے۔ مجھے

تیری یہ گل اچھی نہیں لگی۔ اگے ایسی گل نہ سوچنا۔ مجھے دکھ ہوگا۔"

"تو بُرا مناتا ہے تو نہیں کہوں گا۔" اللہ وسایا نے بے نیازی سے قہقہہ لگایا۔" پر یہ ضرور سن لے، احسان شاہ تڑپ کر رہ گیا ہے۔ اُس کے تو جیسے آگ ہی لگ گئی۔ وہ بھی لاہور پہنچا ہوا تھا۔ اُس نے سٹلمنٹ کمشنر کا فیصلہ سنتے ہی حویلی اور زمین پر قبضہ کرنے کی پوری پوری تیاری کر لی تھی بہت بڑھکیں مار رہا تھا۔ اُس نے تو اپنے تیئں حویلی اور زمین کو اپنی ہی ملکیت سمجھ لیا تھا۔ پر ہائی کورٹ کے حکم امتناعی نے اُس کا سارا کھیل بگاڑ دیا۔ ویسے جی اپنا وکیل بھی بہت زوردار ہے۔ اس نے ادھر حکم امتناعی لیا اور دوسری طرف فٹا فٹ الاٹمنٹ کی درخواست بھی لگا دی۔ قبضہ تو اپنا تھا ہی، اُس نے بہت کام کیا۔ احسان شاہ نے بہت زور لگایا کہ الاٹمنٹ نہ ہو پر اس کی ایک نہ چلی۔" اللہ وسایا نے مڑ کر جمیلہ کو دیکھا، محبت سے اُس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔" اب تو تیں نوں پتہ چل گیا۔ مجھے اتنی دیر کیوں ہوئی۔ الاٹمنٹ کے چکر میں دن رات پھنسا رہا، اتنا بھی ہوش نہ رہا کہ اپنی خیر خبر بھجوا دیتا۔ ویسے یہ بات بھی تھی کہ میں الاٹمنٹ ملنے کی خوش خبری تجھے خود سنانا چاہتا تھا۔ تو سن کر خوش تو ہو جاتی پر یہ مزا نہ آتا جو اب آ رہا ہے۔"

"تجھے کیا پتہ، تیرا انتظار کرتے کرتے میں کتنی بے کل رہی۔ ہر سمے تیرا دھیان رہتا۔ بار بار من گھبراتا۔ رات کو سوتے سوتے گھبرا کر اٹھ بیٹھتی۔ پر تُو یہ باتیں کیوں سوچنے لگا۔" جمیلہ نے گلہ کیا۔" میں تو آج ہی شام بچوں کے ساتھ تیرے پاس لاہور پہنچنے والی تھی۔ چوہدری سے پوچھ لے۔ اسے سب پتہ ہے۔ ساری تیاری کر لی تھی۔" وہ گردن کو خم دے کر ایک خاص ادا سے مسکرائی۔" اللہ وسایا! تو نے اس بار مجھے بہت تنگ کیا۔"

"روئی تو نہیں تھی؟" اللہ وسایا نے ہنس کر پوچھا۔

"روئی بھی تھی پر مجیداں کے لئے۔" جمیلہ کے چہرے پر افسردگی چھاگئی۔ اُس نے ٹھنڈی سانس بھری۔" تجھے تو پتہ چل گیا ہوگا۔ اُس نے کپڑوں میں آگ لگا کر خودکشی کر لی۔"

"مجھے تو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ پولیس نے مجیداں کی موت پر عطا محمد اور اس کے بھائی کو قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔ مجھے الاٹمنٹوں کے چکر سے جب بھی فرصت ملتی، کادو اور

صابر کو دیکھنے اسپتال چلا جاتا۔ وہیں مجھے مجیداں کے چاچا، اکبر نے یہ خبر دی۔ میں تو پنڈ واپس آنا چاہتا تھا پر اُن دِنوں روز ہی پیشی لگ رہی تھی۔ حاضر نہ ہوتا تو کام بگڑنے کا ڈر تھا۔ احسان شاہ ضرور گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کرتا۔"

"اچھا ہوا، تو نہیں آیا۔ تجھے دکھ ہی ہوتا۔" جمیلہ کی آواز بھرّا گئی۔ "پوسٹ مارٹم کے بعد لاش پنڈ میں آئی تو سبھی رو پڑے۔ سنا ہے، جب اُسے قبر میں اتارا گیا تو کہرام مچ گیا۔ ہائے، کیسی ابھاگن تھی مجیداں۔" اُس نے دوپٹے کے پّلو سے آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسو پونچھے۔ "اُس کا جیون تو دکھ جھیلتے ہی کٹا۔ کیسا کیسا اس پر اپراده ہوا۔ زنده رہنے کو اُس کے پاس رہ ہی کیا گیا تھا۔ سب کچھ تو چھن گیا تھا۔"

"بہت ظلم ہوا جی اس کے ساتھ۔" رحیم داد نے جمیلہ کی تائید کی۔

"ویسے مر کر اُس کی مکتی ہو گئی۔ سارا جھگڑا تو اُسی کے کارن تھا۔"

"وہ تو جان سے گئی پر جھگڑا تو جہاں تھا، ابھی تک وہیں ہے۔" اللہ وسایا نے کہا۔

"اب تو اسے ختم ہو جانا چاہیے۔" جمیلہ نے مشورہ دیا۔ "اللہ وسایا! جھگڑا چکانے کے لئے صلح صفائی کرا دے۔ جھگڑا ختم نہ ہوا تو آگے نہ جانے کتنے اور خون ہوں گے۔"

"یہ تو پنچایت لے کر مجیداں کو واپس لانے کے لئے طاہر کے پیو کے پاس گئی بھی تھی۔" رحیم داد نے اللہ وسایا کو مطلع کیا۔

"کیا بنا پنچایت کا؟" اللہ وسایا نے دریافت کیا۔

"بننا کیا تھا۔" جمیلہ بولی۔ "جسے لینے گئی تھی وہی نہ رہی پر جھگڑا ختم کرنے کے لیئے تیں نوں کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔"

"تو کہتی ہے تو ضرور کوشش کروں گا۔" اللہ وسایا نے جمیلہ کو اطمینان دلایا۔

"کادو اور صابر کا کیا حال ہے؟" جمیلہ نے پوچھا۔

"صابر کو تو اسپتال سے چھٹی مل گئی۔ میرے ساتھ ہی واپس آیا ہے۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "کادو ابھی کچھ دن اسپتال ہی میں رہے گا۔ اُس کی گھر والی اور چھوٹا بھائی دیکھ بھال کے لئے لاہور

ہی ہیں ہیں۔"

نوکر لسّی لے کر آگیا۔ اللہ دسایا نے گلاس ہونٹوں سے لگایا اور خالی کر دیا۔ نوکر گلاس اٹھا کر چلا گیا۔ جمیلہ نے کہا"اللہ دسایا! اب تو نہا لے۔ دیکھ تو تیرے بدن اور کپڑوں پر کتنی گرد جمی ہے۔" وہ خاموشی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جمیلہ بھی کھڑی ہو گئی۔

دونوں حویلی کی جانب روانہ ہو گئے۔ رحیم داد بیٹھا رہا۔ اندھیرا بڑھ گیا۔ نوکروں نے لیمپ جلا کر اسٹول پر رکھ دیا۔

اللہ دسایا نہا دھو کر اُجلے کپڑے پہنے ہوئے جمیلہ اور دونوں بچوں کے ہمراہ واپس آگیا۔ اس کے پہنچتے ہی کھانا چن دیا گیا۔ سب نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اللہ دسایا کھانے کے بعد زیادہ دیر نہیں ٹھیرا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا، جلد ہی سونے چلا گیا۔

چند روز بعد اللہ دسایا نے مقدمہ جیتنے کی خوشی میں جشن منایا۔ حویلی کے سامنے کھلے میدان میں چھڑکاؤ کیا گیا۔ شام ہوتے ہی گیس بتیاں روشن کی گئیں، دیگیں چڑھیں، طرح طرح کے پکوان پکے۔ گاؤں کے تمام مزارعوں اور کمیوں نے کھانا کھایا۔ رحیم داد محفل میں اللہ دسایا کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ اُس روز وہ اُجلے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ سر پر اونچے طرّے کی پگ تھی جو اللہ دسایا اُس کے لئے خاص طور پر لاہور سے لایا تھا۔ اللہ دسایا نے رحیم داد کا ایک ایک مزارع اور کمّی سے تعارف کرایا۔ انہیں صاف صاف بتایا کہ حویلی اور گاؤں کی زیرِ کاشت ڈھائی سو ایکڑ زمین رحیم داد کے نام الاٹ ہو چکی ہے۔ اب وہ گاؤں کا دوسرا زمیں دار بن گیا تھا۔

مگر رحیم داد نے بھی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ اُس نے ہر ایک سے یہی کہا کہ اللہ دسایا اُس کے بھائی کی مانند ہے۔ پہلے کی طرح سب کچھ اسی کا ہے اور وہی پورے گاؤں کا زمیں دار ہے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اونچی آواز سے اعلان کیا"گل ایہہ ہے جی! اللہ دسایا کی کوششوں ہی سے میرے نام الاٹمنٹ ہوا ہے۔ زمیں داری اسی نے چلانی ہے اور وہی چلائے گا۔" اُس نے اپنی پگ اُتاری اور اللہ دسایا کے سر پر رکھ دی اور اس کی پگ اپنے سر پر رکھ لی۔ سب نے خوش ہو کر قہقہے لگائے۔

پہر رات گزری تو نوجوانوں نے لڈی ناچ شروع کیا۔ ڈھولیوں نے جھوم جھوم کر ڈھولوں پر چوٹ لگائی۔ رقص کرنے والے نوجوان باری باری پاؤں اوپر اٹھاتے، بانہیں سر کی سیدھ میں لہراتے آگے بڑھتے۔ انہوں نے ڈھولیوں کے گرد حلقہ بنالیا اور ایک ایڑی کے بل بیٹھ کر دائرے میں رقص کرنے لگے۔ وہ چٹکیاں بجاتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھاتے۔ کبھی سینے کے سامنے اور کبھی گھٹنوں کے قریب لاکر ہاتھوں کی جنبش کے ساتھ ساتھ جسم کو اس طرح حرکت دیتے کہ کمر اور کولھوں کے ساتھ ساتھ ایک ایک عضو لچکتا اور لہراتا نظر آتا۔ رقص رفتہ رفتہ تیز ہوتا گیا۔ ڈھولیوں نے گردنیں جھٹک جھٹک کر ڈھولوں پر تیزی سے چوٹ لگانا شروع کر دی۔ رقص تیز، اور تیز ہوتا گیا۔ اور جب شباب پر پہنچا تو سرخوشی کے عالم میں ناچنے والوں کے منہ سے اونچے سروں میں گیت کے بول نکل نکل کر فضا میں گونجنے لگے۔ وہ اونچی آواز میں الاپتے۔

ہُو، ہُو، علی علی، لڈھی گھمّ ملڈی

آدھی رات تک رقص و موسیقی کا سلسلہ جاری رہا۔ رقص کرنے والے اور ڈھولی پسینے میں شرابور ہو گئے۔ رقص ختم ہوا تو ستاروں کے کنول روشن ہو چکے تھے۔ ہوا گنگنا رہی تھی۔ رات نشے سے مدہوش تھی۔

۲۰

رحیم داد بھی اب بڑے زمیں داروں کی طرح اونچے طرّے کی پگ سر پہ رکھ کر باہر نکلتا مگر اُس کا بیشتر وقت مہمان خانے میں گزرتا البتّہ وہ اکثر گھوڑی پر سوار ہو کر دن ڈھلے اللہ وسایا کے ہمراہ نہر کی طرف چلا جاتا۔ نہر گاؤں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ دونوں، گھوڑیاں آہستہ آہستہ دوڑاتے ہوئے نہر کے کنارے کنارے دور تک چلے جاتے پھر باغ میں واپس آتے اور عام طور پر وہیں ساتھ بیٹھ کر رات کا کھانا کھاتے۔ جمیلہ اور اُس کے دونوں بچے بھی کھانے میں شریک ہوتے۔

اساڑھ کا مہینہ لگ چکا تھا لیکن گرمی کم نہیں ہوئی تھی۔ موسم میں صرف اس قدر تبدیلی ہوئی تھی کہ لُو کے جھکڑوں کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ ہوا ٹھیری ہوئی ہوتی تو حبس بڑھ جاتا۔ آسمان پر سفید سفید بادلوں کے ٹکڑے بگلوں کی ڈار کی مانند منڈلاتے۔ کبھی کبھار بادل سرمئی غبار بن کر چھا جاتے مگر بارش نہیں ہوئی۔

ایک روز سخت گرمی اور حبس کے بعد شام کو بارش کا پہلا چھینٹا پڑا۔ گرد و غبار بیٹھ گیا۔ فضا نکھر کر اُجلی ہو گئی۔ ہوا خوش گوار اور بھیگی ہوئی تھی۔ زمین سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھتی تھی۔ دن ڈھلے اللہ وسایا اپنے دونوں بچوں اور جمیلہ کے ہمراہ ٹہلتا ہوا نہر کی طرف پیدل ہی چلا گیا تھا۔ رحیم داد باغ میں تنہا بیٹھا تھا۔ شام سہانی اور فرحت افزا تھی۔ رحیم داد نے آنکھیں بند کیں اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ اُس نے دونوں ٹانگیں سامنے رکھی ہوئی میز پر پھیلا دیں اور موسم کی شگفتگی سے لطف اٹھانے لگا۔ یکایک اُسے محسوس ہوا کہ کسی نے اُس کے پیروں پر ہاتھ رکھا اور

ہولے ہولے دبانے لگا۔ رحیم داد نے جھٹ آنکھیں کھول دیں۔ اُس کے پیروں میں ماکھا بیٹھا تھا۔

رحیم داد نے تیکھے لہجے میں پوچھا "تُو فِر آ گیا؟"

"اور کس کے پاس جاؤں جی" اُس نے رحیم داد کے پیر دباتے ہوئے عاجزی سے کہا "پیاسا تو جی دوڑ کر کھو پر ہی جاتا ہے"

"مَیں کتنی بار تجھے کہہ چکا ہوں کہ اللہ دسایا تیرے لئے کچھ نہیں کر سکتا" رحیم داد نے بیزاری سے کہا۔

"مَیں نوں پتہ ہے، وہ کچھ نہیں کرے گا پر چوہدری! اب تو میرا کام تُو بھی کر سکتا ہے" ماکھا مسکین سی شکل بنا کر بولا "اب تُو بھی وڈا زمیں دار بن گیا ہے۔ تُو چاہے تو میرا بازو شاہ جی سے واپس دلا سکتا ہے۔ شاہ جی تیری گل ضرور مان لے گا"

"میری گل وہ کیسے مان سکتا ہے۔ تَیں نوں پتہ ہے اللہ دسایا کی احسان شاہ سے لگتی ہے"

رحیم داد نے ماکھا سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔

ماکھا گڑگڑا کر بولا "شاہ جی کی اللہ دسایا سے لگتی ہے پر تجھ سے تو نہیں لگتی۔ سچ جان، وہ بہت خوش ہے کہ اللہ دسایا اب اس پنڈ کا زمیں دار نہیں رہا اور تُو وڈا زمیں دار بن گیا ہے۔ حویلی بھی اب تیری ہی ہے۔ اللہ دسایا کے پاس تو خالی پٹی رہ گئی۔ سب کچھ تیرا ہی ہے"

رحیم داد نے اُسے گھور کر دیکھا "تَیں نوں کیسے پتہ چلا کہ احسان شاہ اس طرح سوچتا ہے؟ وہ اللہ دسایا کا دشمن ہے تو میرا بھی ہے"

"چوہدری! تَیں نوں کچھ پتہ نہیں" ماکھا مسکرا کر بولا "اللہ دسایا سے تو شاہ جی اس لئے خار کھاتا ہے کہ وہ مزارع سے وڈا زمیں دار بن گیا۔ اُس کے برابر پہنچ گیا۔ اُسے تو اللہ دسایا سے خار کھانا ہی چاہیے۔ تجھے تو وہ خاندانی زمیں دار ہی مانتا ہے۔ رب سونہہ، مَیں نے اپنے کانوں سے سنا، شاہ جی کہہ رہا تھا، چلو جی، یہ بھی ٹھیک ہی ہوا۔ پتہ چلا ہے کہ چوہدری دیسے جات کا ہے تو جاٹ پر خاندانی زمیں دار ہے۔ اللہ دسایا کی طرح مزارع یا جانگلی نہیں رہا"

"وہ میرے بارے میں کچھ ہی کہے، میں اس کے پاس نہیں جا سکتا۔ اللہ دسایا یہ بات

پسند نہیں کرے گا اور میں اُسے نراض نہیں کر سکتا۔"

"چوہدری! میری کھاتر ایک روز چپکے سے شاہ جی سے مل لے۔" اس نے رحیم داد کے پیر ایک بار پھر پکڑ لیے۔" اللہ وسایا کو پتہ ہی نہیں چلے گا۔ تو شاہ جی سے کہے گا تو وہ تیری گل مان لے گا۔ میرا بازد مجھے مل جائے۔ پنج سال ہو گئے اُسے دیکھے ہوئے۔" اُس نے آسمان کی سمت نظریں اٹھا کر ٹھنڈی سانس بھری۔" جب سے وہ گئی ہے، میرا گھر بار بالکل تباہ ہو گیا۔"

رحیم داد نے اپنے دونوں پیر سمیٹ لیے اور بے رخی سے بولا۔" صاف صاف سن لے احسان شاہ اگر اللہ وسایا سے خار کھاتا ہے تو وہ میرا بھی دشمن ہے۔ میں اُس کے پاس ہرگز نہیں جاؤں گا۔ تو کوئی اور رستہ ڈھونڈ۔ میں تیرے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔" رحیم داد کے چہرے پر جھنجلاہٹ چھا گئی۔ "اور دیکھ، اگے بھی تو میرے پاس نہ آنا۔ مجھے تیرا یہاں آنا بالکل اچھا نہیں لگتا۔ اب تو جا۔" رحیم داد کا لہجہ تیکھا اور تلخ ہو گیا۔

ماکھا سر جھکائے کچھ دیر بت بنا بیٹھا رہا پھر اُس نے گہری سانس بھری، اُٹھا اور چپ چاپ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ اُس کی طبیعت مکدر ہو گئی تھی۔ وہ بیزار ہو کر اٹھنے ہی والا تھا کہ احمد آ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں لیمپ تھا۔ اُس نے لیمپ اسٹول پر رکھا، اُسے روشن کیا اور رحیم داد کی جانب مڑ کر دیکھا۔" زمیں دار حویلی میں ہے۔ اُس نے کہا ہے۔ چوہدری سے کہنا کہ باغ میں ٹھیرے۔ میں بھی ذرا دیر میں پہنچ جاؤں گا۔ روٹی اُس کے ساتھ ہی کھاؤں گا۔"

رحیم داد کو احمد کی زبانی اللہ وسایا کا پیغام ملا تو اس نے مہمان خانے میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا، باغ میں بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اللہ وسایا آ گیا۔ اُس کے ہمراہ جمیلہ بھی تھی۔ اُن کے پہنچتے ہی نوکروں نے کھانا لگایا۔ تینوں نے کھانا کھایا۔

کھانے سے فارغ ہو کر اللہ وسایا بولا۔" آج تو جی بہت اچھا موسم ہے۔ بارش کا ایک ہی چھینٹا پڑا۔ نہ حبس رہا، نہ گرمی۔ ہوا بھی ٹھنڈی چل رہی ہے۔"

جمیلہ نے مسکرا کر کہا۔" موسم کو تو بدلنا ہی تھا۔ جولائی کا مہینہ شروع ہو چکا ہے۔"

رحیم داد نے گردن اٹھا کر آسمان کی سمت دیکھا۔" ابھی تو آسمان بالکل صاف ہے پر پتہ

نہیں، کب برکھا شروع ہو جائے۔"

"کوئی پتہ نہیں، کب بادل گھر کر آ جائیں۔" جمیلہ بولی "چوہدری! تُو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس مہینے ایسا ہی ہوتا ہے۔ یاد آتا ہے، جب کالج میں چھٹیاں ہوتیں تو ہم بہن بھائی، ماں جی کے ساتھ عام طور پر ڈلہوزی چلے جاتے۔ مجھے تو ڈلہوزی ہمیشہ مری سے اچھا لگا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "وہی کنڈ اور دھولدھر کی صنوبر کے درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں اور اُن کی برف پوش سفید سفید چوٹیاں، بہت سندر دکھائی پڑتی تھیں۔ بارش ہوتی تو اور مزا آتا۔ ادھر برکھا ہوئی ادھر ذرا سی دیر میں سڑکیں اور رستے ایسے صاف ستھرے، مانو پانی برسا ہی نہیں۔" اُس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چوہدری، تُو ڈلہوزی تو گیا ہو گا؟ ضلع گورداس پور ہی میں تو ہے۔"

رحیم داد بہت سٹ پٹایا۔ اُس نے نہ گورداس پور دیکھا تھا، نہ کبھی ڈلہوزی گیا تھا۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دے، اتنے میں اللہ وسایا بول پڑا۔ "جمیلے! ڈلہوزی اور گورداس پور کو چھوڑ، یہ بتا کیمبل پور جانے کے بارے میں تُو نے کیا سوچا؟ اگلے جمعے کو چلنا ہے۔"

"چنتا نہ کر۔ میں نے سفر کی پوری تیاری کر لی ہے۔" جمیلہ نے اعتماد سے کہا۔

رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ "اللہ وسایا! کیا تُو کیمبل پور جا رہا ہے؟"

"جانا ہی پڑے گا جی!" اللہ وسایا نے جواب دیا۔ "میری پھپھی کا ویاہ ہے۔ اُس میں شرکت ضروری ہے۔ جمیلہ اور بچے بھی ساتھ جائیں گے۔" اُس کا لہجہ دھیما پڑ گیا۔ ٹھنڈی سانس لے کر اُس نے بتایا۔ "بات یہ ہے چوہدری! اُس کا نہ پیو ہے، نہ ماں۔ بہن بھائی بھی سگے نہیں۔ میرا پھوپھا فوج میں تھا، پچھلی جنگ میں جاپانیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ سرکار نے اُس کے مرنے کے بعد کیمبل پور میں تھوڑی سی زمین گزارے کے لئے دے دی تھی۔ تب سے پھوپھی وہیں رہنے لگی تھی پر بے چاری زیادہ دن زندہ نہیں رہی۔ اُس کے مرنے کے بعد سرکاری پنشن بھی بند ہو گئی۔ اب پھوپھی کی نشانی شرفاں ہی رہ گئی ہے۔ چاچے نے اُسے پالا ہے۔ وہ بھی کیمبل پور میں ہوتا ہے۔ میں نے تو شرفاں کو برسوں سے نہیں دیکھا اور جمیلہ نے تو اُسے صرف ایک بار دیکھا ہے۔ گڈو کے مونڈن پر میں نے اُسے یہاں بلایا تھا۔"

"اس سمے تو وہ بارہ تیرہ برس کی چھوہری تھی۔" جمیلہ نے کہا۔ "پر اب تو جوان مٹیار ہو گی۔ پر بہت سیدھی سادی تھی۔ سدا چپ، چپ رہتی۔" اُس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ "جس کے سب مر جائیں، اس کا یہی حال ہوتا ہے۔"

"پر تجھ سے تو وہ بہت پیار کرتی تھی۔ ہر وکت تیرے ہی ساتھ لگی رہتی تھی۔" اللہ وسایا نے کہا۔

"ایسے ہی پیار نہیں کرتی تھی۔" جمیلہ کے لہجے میں درد کی کسک تھی۔ "تیں نوں کی پتہ، میں کتنی بار اُسے چھاتی سے لگا کر روئی ہوں۔"

"ضرور روئی ہو گی۔" اللہ وسایا بولا۔ "کسی کڑی کا پیو یا ماں گزر جائے تو سب سے بڑھ کر تو ہی جا کر سیاپا کرتی ہے۔" اُس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چوہدری! اس کا دل بہت کمزور ہے۔ ذرا سی بات پر اسے رونا آتا ہے۔ ویسے گلاں بہت کرتی ہے۔"

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "کیمبل پور سے تیری واپسی کب تک ہو گی؟"

"ہفتہ بھر تو لگ ہی جائے گا۔ زیادہ دن بھی لگ جائیں تو کوئی تعجب نہیں۔"

"ایک روز تو لہور ٹھیرنا پڑے گا۔ میں نے شرفاں کو نانکی چھک دینے کے لیے کپڑے لتے اور زیور بھی انار کلی سے خریدنے ہیں۔ دو ریشمی پٹا لگل تو میں نے پہلے ہی تیار کر لیے ہیں۔" جمیلہ نے بتایا۔

اللہ وسایا حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ "وہ تو نے کب تیار کیے؟ میں نوں پتہ ہی نہ چلا۔"

"لے یہ بھی کوئی بتانے کی گل ہے۔" جمیلہ نے مسکرا کر شوخی سے کہا۔ "یہ تو سوچ ننھیال میں تیرے علاوہ شرفاں کا اور کون ہے۔ ویسے تو وڈا زمیں دار بھی کہلاتا ہے۔ میں کنبے برادری میں تیرا سر نیچے نہیں ہونے دوں گی۔" جمیلہ نے سینے پر ہاتھ مارا۔ "چنتا نہ کر، شرفاں کی ماں نہیں، میں تو موجود ہوں۔ دیکھ لینا، کیسی دھوم دھام سے سگائی ہو گی۔ ویاہ کی ساری ریتاں رسماں ہوں گی۔ شرفاں کے سسرال والوں کے سامنے میں نے ناک نہیں کٹوانی۔"

"میں نوں پتہ ہے، تو سب کچھ کرے گی۔" اللہ وسایا نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "ڈھولکی بجائے گی، گھوڑیاں اور سہاگ کے گیت گائے گی۔ جھمریا ماگھا ناچے گی اور سلامی میں سب سے بڑھ چڑھ کر

روپیہ بھی دے گی اسی لیے تو اپنے پاس کچھ بچتا بچاتا نہیں۔"

"کیا کرے گا پیسہ جوڑ کر؟" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔" اس کے لابھ میں پڑ کر مور کھ نہ بن۔ اس میں کچھ نہیں رکھا۔ جتنا جوڑو جمع کرو، اُتنا ہی لالچ بڑھتا ہے۔ منش خود غرض اور کٹھور بن جاتا ہے۔ دن رات اسی چکر میں رہتا ہے۔"

اُسی وقت ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ اسٹول پر رکھا ہوا لیمپ بھڑکا اور بجھ گیا۔ روشنی نہیں رہی تو اندھیرا چھا گیا۔ تینوں ذرا دیر گھور اندھیرے میں خاموش بیٹھے رہے، پھر محفل برخاست ہو گئی۔ اللہ وسایا اور جمیلہ حویلی کی سمت چلے گئے۔ رحیم داد مہمان خانے میں پہنچا۔ صحن میں بچھے ہوئے پلنگ پر بستر لگا ہوا تھا۔ وہ بستر پر لیٹ گیا۔

اللہ وسایا اور جمیلہ سفر کی تیاریوں میں اُلجھے ہوئے تھے۔ رحیم داد سے شام کو ان کی سرسری ملاقات ہوتی۔ پھر ایک صبح تاروں کی چھاؤں میں دو تانگے حویلی کے سامنے نظر آئے۔ ایک میں جمیلہ اور دونوں بچے اور دوسرے میں دو نوکر سامان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ رحیم داد بیدار ہو چکا تھا۔ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے وہ اللہ وسایا سے ملا۔ اللہ وسایا نے رخصت ہوتے وقت رحیم داد کو گلے سے لگایا اور اس کی پیٹھ محبّت سے تھپک کر بولا۔

"چوہدری! میں جلد ہی واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ تو زمیں داری کی دیکھ بھال کرتا رہنا۔ ویسے بھی اب تجھے زمیں داری کے معاملات میں پوری دلچسپی لینی چاہیے کہ تو بھی اس پنڈ کا زمیں دار بن چکا ہے۔"

"ایسی گل نہ کر اللہ وسایا!" رحیم داد نے جھٹ کہا۔" اس پنڈ کا زمیں دار تو ہی ہے اور تو ہی سدا رہے گا۔"

"یہ تو تیری محبّت ہے چوہدری!" اللہ وسایا نے ہنس کر کہا۔" میں نوں پتہ نہیں تھا کہ تیرا دل اتنا وڈا ہے۔"

" میرا دل کتنا وڈا ہے، یہ تو تیں نوں اگے پتہ چلے گا۔" رحیم داد نے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا۔ " جو کہہ رہا ہوں، وہی کروں گا اور ثابت کر کے دکھاؤں گا۔" اس کا چہرہ مضمحل ہو گیا۔" یہ تو سوچ،

تیرے سوا دنیا میں اب میرا کون ہے۔ میرے لئے تو سب کچھ تو ہی ہے۔"

جمیلہ ہنس کر بولی "تم دونوں ساری گلاں اسی سمے کر لو گے۔ کچھ واپسی کے لیے بھی چھوڑ دو۔"

رحیم داد نے جمیلہ کی بات سن کر اللہ وسایا سے کہا "اچھا، اب تو جا۔ دیر ہو رہی ہے۔ دیکھ، جلد آنے کی کوشش کرنا۔"

اللہ وسایا خاموشی سے تانگے کی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ جمیلہ اور بچے بھی اسی تانگے میں تھے۔ دونوں تانگے آگے پیچھے روانہ ہوئے۔ رحیم داد حویلی کے نوکروں اور نوکرانیوں کے ساتھ خاموش کھڑا تانگے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ دھول اڑاتے رفتہ رفتہ دور ہوتے گئے۔ آخر ایک موڑ پر درختوں کی آڑ میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

رحیم داد بوجھل قدموں سے چلتا ہوا مہمان خانے میں واپس آگیا اور اپنے کمرے میں جا کر تھکا ہوا سا کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ مضمحل نظر آ رہا تھا۔ اُس نے ناشتہ بھی رغبت سے نہیں کیا۔ دن بھر کمرے میں رہا۔ شام کو باغ میں گیا مگر وہاں بھی دل نہ لگا۔ اُسے تنہائی کا شدید احساس تھا۔ وہ جلد ہی اٹھ کر مہمان خانے میں چلا گیا اور کھانا کھا کے بستر پر لیٹ گیا۔

دوسرے روز بھی اُس کی طبیعت اچاٹ رہی۔ موسم بھی دھندلا دھندلا اور بے کیف تھا۔ آسمان پر بادلوں کا غبار چھایا تھا۔ ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ بارش بھی نہیں ہوئی۔ فضا میں حبس تھا۔ گھٹن تھی۔ رحیم داد مہمان خانے سے نکلا۔ کھیتوں کی طرف گیا۔ مزارعوں سے فصل کے بارے میں اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ واپس آیا تو جسم پسینے پسینے تھا۔ اُس نے غسل کر کے لباس تبدیل کیا۔

☆

دن ڈھلے رحیم داد کا دل اور بوجھل ہو گیا۔ اس روز وہ باغ میں نہیں گیا۔ گھوڑی نکلوائی۔ اس پر سوار ہوا اور دل بہلانے کے لیئے نہر کی طرف چلا گیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور بادلوں کے ایک ٹکڑے کے پیچھے سے جھانک رہا تھا۔ اُس کی نارنجی روشنی سے نہر کا پانی جھلملا رہا تھا۔ رحیم داد گھوڑی دوڑاتا دور نکل گیا۔ ہلکے ہلکے جھونکے اُس کے جسم سے ٹکرا رہے تھے۔ اُن میں تازگی اور

فرحت تھی۔ فضائیں جنگلی پھولوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ رحیم داد کو قدرے سکون ملا۔ وہ گھوڑی دوڑاتا چلا گیا۔ سورج ڈوب گیا۔ شام نے اپنے بازو پھیلا دیے فضائیں تاریکی گھلنے لگی۔

رحیم داد نے واپسی کے ارادے سے گھوڑی کی رفتار سست کی۔ گھوڑی پیاسی بھی تھی۔ وہ نیچے اترا اور اُسے پانی پلانے کے لیئے نہر کے قریب لے گیا۔ گھوڑی پانی پی چکی تو رحیم داد نے اُسے کچھ دیر سستانے کا موقع دیا۔ اُس کا جسم پسینے سے بھیگ کر سیاہ پڑ گیا تھا۔ رحیم داد نہر کے قریب ریت کے ایک تودے پر بیٹھ گیا۔ اُس کی قمیض پسینے سے شرابور تھی۔ نہر کی سمت سے ٹھنڈی ہوا آرہی تھی۔

واپسی کے لئے وہ گھوڑی پر سوار ہوا۔ عین اُسی وقت پلچھی کے اونچے اونچے پودوں کے گھنے جھنڈ کے پیچھے سے ماکھا نکل کر سامنے آگیا۔ رحیم داد نے اُسے دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔ "اوئے ماکھے! تو ادھر کیسے آگیا؟"

"چوہدری! تیں نوں یہ بھی پتہ نہیں، وہ ادھر درختوں کے اس پار اپنا پنڈ پیراں والہ ہے۔" ماکھا ایک طرف ہاتھ اٹھا کر بولا۔

رحیم داد اس سے مزید بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اُسے نظرانداز کرتے ہوئے اُس نے گھوڑی موڑی مگر ماکھا جھپاک سے گھوڑی کے سامنے آگیا۔ گڑگڑا کر بولا "چوہدری! میری ایک گل سن لے۔"

رحیم داد نے گھوڑی ٹھہراتے ہوئے دریافت کیا۔ "تجھے کیا کہنا ہے؟" اُس نے تیکھی نظروں سے ماکھا کو دیکھا "میں تجھ سے پہلے ہی صاف صاف کہہ چکا ہوں کہ میں تیرا کام نہیں کر سکتا۔ میرا پیچھا چھوڑ دے۔"

"میری گل تو سن لے۔" اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ "شاہ جی اپنی گھوڑی پر اگے گیا ہے۔ واپس آتا ہی ہوگا۔"

"میں نے اُس سے کیا لینا۔ سامنے سے ہٹ۔" رحیم داد نے ڈپٹ کر بے رخی سے کہا۔
ماکھا ڈھیٹ بن کر بولا۔ "تو اُس سے میرے بارے میں کہے گا تو وہ ضرور مان

لے گا۔"

"پر میں نے اُس سے کوئی گل شل نہیں کرنی۔" رحیم داد کے لہجے میں بدستور بیزاری تھی۔ "الگ ہٹ۔ میرا رستہ چھوڑ۔"

ماکھا گھوڑی کے سامنے سے تو ہٹ گیا مگر اُس نے جھٹ رکاب میں پڑا ہوا رحیم داد کا پیر تھام لیا۔ "چوہدری! تیری ایک گل سے مجھے اپنا بازو مل جائے گا۔ مجھے تباہی سے بچا لے۔ تیری مہربانی ہوگی۔" اس نے رحیم داد کے پیر پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ رحیم داد پسیج گیا اور تذبذب میں مبتلا ہوگیا۔ وہ گھوڑی پر گم صم بیٹھا رہا۔ شام کے سناٹے میں ماکھا کی دبی دبی سسکیاں اُبھر رہی تھیں اور اُس کی پیشانی رحیم داد کے پیروں پر ٹکی ہوئی تھی۔ اسی اثنا میں دور سے گھوڑے کی ٹاپیں اُبھریں۔ ماکھا نے گردن اٹھا کر رحم طلب نظروں سے رحیم داد کو دیکھا اور گلوگیر آواز میں بولا۔

"چوہدری! وہ آرہا ہے۔ بس ذرا دیر ٹھیر جا۔ وہ یہیں سے گزرے گا۔ تُو شاہ جی سے گل کر کے تو دیکھ۔"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ ٹاپیں رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھیں۔ ماکھا گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "شاہ جی پہنچنے ہی والا ہے۔ مجھے تیرے پاس دیکھے گا تو نراض ہوگا۔" یہ کہتا ہوا وہ پیچھے ہٹنے لگا۔ ساتھ ہی گڑگڑاتا رہا۔ "چوہدری! اُس سے میرے بارے میں گل کر لے۔ تُو کہے گا تو میرا کام بن جائے گا۔ زندگی بھر تجھے دعائیں دوں گا۔" ماکھا آنسو پونچھتا ہوا ایک کریکر کی ایک گھنی جھاڑی کے پیچھے چلا گیا۔

رحیم داد پس و پیش میں جہاں تھا، وہیں کھڑا رہا۔ ٹاپیں بالکل قریب سنائی دینے لگیں۔ رحیم داد نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ شام کے دھندلکے میں احسان شاہ اپنی گھوڑی دوڑاتا، گرد کے بادل اُڑاتا، ایک موڑ سے نمودار ہوا۔ وہ رحیم داد ہی کی طرف آرہا تھا۔ آن کی آن میں وہ نزدیک پہنچ گیا۔ اُس نے گھوڑی کی راسیں زور سے کھینچیں۔ گھوڑی اونچی آواز سے ہنہنائی اور ٹھیر گئی۔ احسان شاہ نے رحیم داد کو غور سے دیکھا۔ رحیم داد نے اُسے سلام کیا۔

احسان شاہ نے سلام کا جواب دیا اور گردن اُٹھا کر پوچھا۔ "میں نے تجھے پہچانا نہیں۔ پہلی بار ادھر دیکھ رہا ہوں۔"

رحیم داد نے بتایا۔ "میرا نام جی، چوہدری نور الٰہی ہے۔ کوٹلہ ہرکشن میں اپنی زمیں داری ہے۔"

"اچھا تو ہے چوہدری نور الٰہی!" احسان شاہ نے حیرت کا اظہار کیا۔ "نام تو تیرا سنا تھا، آج تجھے دیکھ بھی لیا۔" اُس کے چہرے کا تناؤ کم ہو گیا۔ مسکرا کر بولا۔ "پر آج تو اُدھر کیسے نکل آیا؟"

رحیم داد نے نظر بھر کر احسان شاہ کو دیکھا۔ سن و سال کے اعتبار سے وہ چھپن ستاون سال کے پیٹے میں تھا مگر جسم مضبوط اور بھاری بھر کم تھا۔ چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں۔ پگ کا اونچا طرہ ہوا سے آہستہ آہستہ لہرا رہا تھا۔ وہ اپنے ڈیل ڈول اور وضع قطع سے بہت بارعب لگتا تھا۔

رحیم داد اُس کی شخصیت سے خاصا مرعوب ہوا، جھجکتے ہوئے بولا۔ "شاہ جی! تجھ سے ایک گل کرنی تھی۔"

"ضرور کر۔" احسان شاہ نے اُس کی حوصلہ افزائی کی۔ "پر یہاں کھڑے کھڑے کیا گل ہو سکتی ہے۔ اپنی حویلی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ موسم بھی سہانا ہے، وہیں آرام سے بیٹھ کر بات چیت ہو گی۔"

رحیم داد اُس کی حویلی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے کترانے کی کوشش کی۔ لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "کوئی لمبی چوڑی گل نہیں کرنی۔"

"چھوٹی ہو یا لمبی، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔ "پر یہ تو کوئی بات کرنے کی جگہ نہیں۔"

احسان شاہ نے بات ختم ہی کی تھی کہ ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ وہ بے تکلفی سے قہقہہ مار کر ہنسا۔ "لے چوہدری! اب تو بوندا باندی بھی شروع ہو گئی۔ آ میرے ساتھ۔ اب حویلی میں بیٹھ کر آرام سے گل بات ہو گی۔"

بارش اور تیز ہو گئی۔ رحیم داد کے لئے انکار کرنے کی گنجائش نہ رہی۔ احسان شاہ نے ایڑ لگا کر گھوڑی آگے بڑھائی۔ رحیم داد بھی چپ چاپ اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دونوں

گھوڑیاں دوڑاتے ہوئے پیراں والہ کی جانب روانہ ہوئے۔

بارش بتدریج تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ پیراں والہ میں داخل ہوئے تو بارش خاصی تیز ہو چکی تھی۔ دونوں جلدی جلدی اترے۔ گھوڑیاں ملازموں کے حوالے کیں اور حویلی کے اندر چلے گئے۔

حویلی نہایت شاندار تھی۔ اُس کے چاروں طرف فصیل نما اونچی اونچی دیواریں تھیں۔ اللہ وسایا نے رحیم داد کو ٹھیک ہی بتایا تھا کہ احسان شاہ کی حویلی دور سے پرانے زمانے کا کوئی قلعہ لگتی ہے۔ اس کا پھاٹک اس قدر اونچا تھا کہ ہاتھی گزر سکتا تھا، دروازے بھاری اور مضبوط لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ پھاٹک پر مسلح پہرا تھا۔

حویلی کے تین حصے تھے۔ ایک حصے میں احسان شاہ کی منکوحہ بیویاں اور بچے رہتے تھے۔ یہ حویلی کا عقبی حصہ تھا۔ سامنے کے رُخ پر ڈیرا تھا جو دیوان خانہ کہلاتا تھا۔ حویلی کے نوکر چاکر اسے مہمان گھر بھی کہتے تھے۔ دیوان خانہ پھاٹک سے اندر داخل ہوتے ہی نظر آتا تھا۔ احسان شاہ اس دیوان خانے میں صبح شام کچہری لگاتا تھا۔ منیجر، منشیوں اور کارندوں کے ساتھ بیٹھ کر زمیں داری کے معاملات طے کرتا تھا۔ مزارعوں کے خلاف شکایات پیش ہوتیں تو اُن کے مقدمات کا فیصلہ بھی دیوان خانے ہی میں کرتا تھا۔

دیوان خانے کے آگے وسیع پائیں باغ تھا۔ دیوان خانے سے مُتصل اونچی اونچی دیواروں سے گھرا ہوا حصہ کوٹ کہلاتا تھا۔ کوٹ میں احسان شاہ کی داشتائیں اور مزارعوں کی وہ نوجوان عورتیں قید رکھی جاتی تھیں جنہیں اغوا کر کے لایا جاتا تھا۔ کوٹ میں آمدورفت کا صرف ایک دروازہ تھا اور اس پر چوبیس گھنٹے مسلح پہرا رہتا تھا۔

دیوان خانے میں کشادہ ہال تھا۔ جس پر دبیز قالین کا فرش تھا۔ جگہ جگہ صوفے اور دیوان قرینے سے رکھے تھے۔ صوفے پرانی وضع کے مگر قیمتی اور آرام دہ تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر ہلکے ریشمی پردے پڑے تھے۔ احسان شاہ دیوان خانے میں داخل ہوتے ہی ہال کی جانب بڑھا۔ رحیم داد اُس کے ہمراہ تھا۔ دونوں ہال میں پہنچے تو نوکروں نے نہایت مستعدی سے پردے ہٹا دیے اور کھڑکیوں کے پٹ کھول دیے۔ ہال کے آگے طویل برآمدہ تھا۔ اس میں بید

کی کرسیاں پڑی تھیں۔

احسان شاہ نے ہال میں پہنچ کر گرمی محسوس کی اور رحیم داد کو مخاطب کیا" چوہدری! یہاں تو حبس ہے۔ باہر برآمدے میں بیٹھا جائے۔" اُس نے قریب کھڑے ہوئے ملازم کی جانب دیکھا "شیدے! دروازہ کھول دے۔ کرسیاں اور میز برآمدے میں ٹھیک سے لگا دے۔ یہاں گرمی ہے۔ ہم نے برآمدے میں بیٹھنا ہے۔"

شیدا آگے بڑھا۔ اس نے فوراً دروازہ کھولا۔ باہر گیا۔ کرسیاں قرینے سے لگائیں اور وسط میں میز رکھ دی۔ احسان شاہ اور رحیم داد ہال سے نکل کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ برآمدے کے آگے دور تک پھیلا ہوا نرم نرم گھاس کا لان تھا۔ اونچے اور گھنے درخت تھے۔ ان کے درمیان جگہ جگہ روشیں اور کیاریاں تھیں۔ پھولوں سے مہکتی ہوئی بھیگی بھیگی شاخیں تیز جھونکوں سے جھوم رہی تھیں۔

باغ میں رم جھم بارش ہو رہی تھی۔ بادل رک رک کر گرج رہے تھے۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ بارش کے چھینٹے کبھی کبھار برآمدے میں بھی آجاتے۔ رحیم داد حویلی کی شان و شوکت اور احسان شاہ کی آن بان سے بڑا مرعوب نظر آتا تھا۔ وہ گم صم بیٹھا تھا۔ احسان شاہ کی پشت پر شیدا سر جھکائے مودّب کھڑا تھا۔

احسان شاہ نے اپنی پگ اتار کر شیدا کو دی، ہنس کر بولا" کچھ پینے پلانے کو لا۔ دیکھ تو کیسا ظالم موسم ہے۔"

شیدا نے پگ سنبھالی اور ہال کے اندر چلا گیا۔ رحیم داد ہنوز خاموش تھا۔ احسان شاہ نے اُس کی جانب دیکھا، مسکرا کر پوچھا" ہاں چوہدری، اب بتا، تو کیا کہنا چاہتا تھا؟"

رحیم داد نے جھجکتے ہوئے ماکھا کا ذکر چھیڑا" شاہ جی! میں نے جو گل کرنی ہے، وہ ایہہ ہے۔"

"کوئی خاص گل ہے؟" احسان شاہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"خاص ہی گل ہے۔" رحیم داد نے آہستہ آہستہ اثبات میں گردن ہلائی۔

"تب تو آرام سے گل ہوگی۔ ایسی جلدی کیا ہے۔" وہ ہنس کر بولا" اس بارش میں تو واپس جانے

سے رہا۔ کوٹلہ ہرکشن دور ہے اور رستہ بھی کچا اور پیچ کا ہے۔ بارش تھم جائے تو روٹی کھا کر چلا جانا ورنہ رات یہیں ٹھیر جانا۔" اُس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔" میں نے سنا ہے، اللہ وسایا تو گھر والی اور بچوں کے ساتھ پنڈ سے باہر گیا ہے۔"

"وہ اپنی پھپھیری کے ویاہ میں شرکت کے لئے کیمبل پور گیا ہے۔"

"اچھا، جب ہی تو اُدھر نکل آیا۔" احسان شاہ نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔" وہ پنڈ میں ہوتا تو تجھے ادھر آنے نہ دیتا۔"

رحیم داد نے کسی ردِّ عمل کا اظہار نہیں کیا، خاموش بیٹھا رہا۔ ذرا دیر بعد شیدا ایک ٹرے میں وہسکی کی بوتل، دو گلاس اور پانی سے بھرا ہوا جگ لے کر آگیا۔ اُس نے بوتل، جگ اور گلاس میز پر رکھ دیے۔ رحیم داد نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھا تو بہت گھبرایا۔ اُس نے پہلے کبھی شراب نہیں پی تھی۔ البتہ میلوں ٹھیلوں میں بھنگ اور ساوی بارہا پی چکا تھا۔ جن دنوں وہ منٹگمری جیل میں تھا، لالی اور دوسرے قیدیوں کے اصرار پر چرس بھری سگرٹیں بھی پی لیتا تھا مگر چرس پینے کی لت نہیں لگی تھی۔

شیدا نے پہلے احسان شاہ کے لئے وہسکی کا پیگ بنایا اور گلاس اس کے سامنے رکھ دیا مگر جب وہ دوسرا پیگ بنانے لگا تو رحیم داد کسی قدر پریشان ہو کر بولا۔" میرے لئے نہ بنا۔" شیدا نے ہاتھ روک لیا۔

"کیسی گل کر رہا ہے چوہدری! ایسے کافر موسم میں تو وڈے وڈے صوفیوں اور پرہیزگاروں کی توبہ ٹوٹ جاتی ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ شیدا کی جانب متوجہ ہوا۔" منہ کیا تک رہا ہے۔ تو اپنا کام کر۔"

اُس نے نہایت مستعدی سے پیگ تیار کیا اور رحیم داد کے سامنے رکھ دیا۔ احسان شاہ نے اشارہ کیا۔ شیدا فوراً چلا گیا۔ احسان شاہ نے گلاس اٹھایا۔ رحیم داد کو مخاطب کیا۔" چوہدری! اٹھا اپنا گلاس۔"

لیکن رحیم داد نے گلاس نہیں اٹھایا، حیران و پریشان بیٹھا رہا۔ احسان شاہ نے اصرار

کیا۔" اب تکلف شکلف چھوڑ۔ گلاس اُٹھا۔"

"شاہ جی، گل ایہہ ہے۔ میں نے آج تک پی نہیں، مجھے نہ پلا۔"

"نہیں پی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آج سے شروع کردے۔" احسان شاہ کا اصرار جاری رہا۔" اللہ دسایا کے رستے پر نہ چل۔ وہ تو مزارع تھا، زمیں دار بن کر بھی مزارع ہی رہا۔ وہ تجھے بھی زمیں دار نہیں بننے دے گا۔" احسان شاہ نے گلاس اٹھا کر رحیم داد کے ہاتھ میں تھما دیا، اپنا گلاس اُس کے گلاس سے ٹکرایا۔" چل شروع ہو جا۔ میں نے آج تک کسی مہمان کی اس طرح ناز برداری نہیں کی۔" اُس نے ایک ہاتھ مونچھ پر پھیرا۔" میں متروکہ جائداد کی لوٹ مار سے زمیں دار نہیں بنا، خاندانی جگیردار ہوں۔ یہ حویلی میرے دادا نے بنوائی تھی۔ وہ بہت وڈا زمیں دار ہوتا تھا۔ لاٹ گورنر کے دربار میں اُسے کرسی ملتی تھی۔ کیا سمجھا۔"

احسان شاہ نے وسکی کا گھونٹ بھرا۔ رحیم داد اس کی باتوں سے ایسا مرعوب ہوا کہ گلاس اُس کے ہونٹوں تک پہنچ گیا۔ اُس نے بھی گھونٹ بھرا اور منہ ذرا سا بگاڑ کر بولا۔" تو نے یہ اچھا نہیں کیا۔"

"بچوں جیسی گلاں نہ کر۔" احسان شاہ نے ہنس کر اُس کی حوصلہ افزائی کی۔" تیں نوں ابھی پتہ نہیں۔ زندگی کا اس کے بناں کیا مزا۔ تھوڑی سی اور لگا، تیں توں خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ یہ کیا بہار دکھاتی ہے۔"

اُسی وقت بادل زور سے گرجا۔ رحیم داد نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے ایک گھونٹ اور بھرا اور بھیگی ہوئی مونچھیں ہاتھ سے پونچھنے لگا۔ بارش تیز ہو گئی۔ ہوا کے نم آلود جھونکے برآمدے کے اندر آنے لگے۔ فضا میں خنکی رچ گئی۔

شیدا دو پلیٹوں میں تلے ہوئے مرغ اور تکے لے آیا۔ احسان شاہ اور رحیم داد پیتے رہے، مرغ اور تکے کھاتے رہے۔ باہر موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔

احسان شاہ بولا۔" ہاں چوہدری، اب سنا اپنی گل، تیں نوں کی کہنا ہے۔ بار بار ذکر کرتا تھا۔ ایسی کیا خاص گل ہے؟"

"گل شل کیا ہے جی! وہ تیرا ایک مزارع ہے نا۔ ماکھا نام ہے اُس کا۔" رحیم داد نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ احسان شاہ کا ردِ عمل دیکھنا چاہتا تھا۔

مگر احسان شاہ پر کوئی خاص ردِ عمل نہیں ہوا۔ بے نیازی سے بولا۔" یاد تو پڑتا ہے، اپنا ایک مزارع ماکھا بھی ہے، پر چوہدری، تجھے اس سے کیا لینا؟"

رحیم داد نے جھجکتے ہوئے کہا۔" اُس کی گھر والی تیری حویلی میں ہے۔"

"ہو گی۔" احسان شاہ نے ایک تنکا اُٹھا کر چباتے ہوئے رحیم داد کی طرف دیکھا۔" تجھے کیسے اُس کی یاد آ گئی؟"

"ماکھا کئی بار میرے پاس آ چکا ہے۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔" وہ اپنی گھر والی واپس لے جانا چاہتا ہے۔"

"اُس کی بات نہ کر۔ وہ تو ایسے ہی سب کے پاس پہنچتا رہتا ہے۔ تیرے پاس بھی جا کر گڑگڑایا ہو گا۔ یہی گل ہے نا؟"

"ہے تو جی یہی گل۔" رحیم داد نے وہسکی کی چسکی لگا کر کہا۔" ماکھا اپنے بازو کے لیے بہت پریشان ہے۔ کہتا تھا، اُس کے بغیر وہ تباہ ہو گیا۔" رحیم داد پر اب وہسکی اپنا اثر دکھانے لگی تھی۔ وہ پہلی بار کھل کر مسکرایا۔" شاہ جی، وہ پنج سال سے تیری حویلی میں ہے۔ کئی بچے بھی جن چکی ہے۔ اب وہ تیرے کس کام کی رہ گئی؟"

"کام کی تو وہ اب بھی ہے۔ چوہدری! تو نے اُسے دیکھا نہیں۔" احسان شاہ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔" بچہ جننے کے بعد وہ اور رسیلی ہو جاتی ہے۔ تب ہی تو میں نے اس کا نام رسیلی رکھ دیا ہے۔ اب تو یہ بھی یاد نہیں پہلے اس کا کیا نام ہوتا تھا۔ اب تو میں اسے رسیلی ہی کے طور پر پہچانتا ہوں۔ سچ کہتا ہوں، وہ ہے بھی رسیلی۔"

"اب تو وہ بوڑھی ہو گئی ہو گی؟"

"لگتی تو وہ ابھی تک جوان ہے۔" احسان شاہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تیری گل سمجھ نہیں آئی۔" رحیم داد نے چہرے کے تاثرات سے حیرت کا اظہار کیا۔" میں نے

تو جی یہ دیکھا ہے کہ دو تین بچّوں کے بعد تو مزارعوں اور کمیوں کی گھر والیاں ایسی مریل اور بوڑھی لگتی ہیں کہ دیکھنے کو جی نہیں کرتا۔"

"چوہدری تو بھی ٹھیک کہہ رہا ہے۔" احسان شاہ نے اُس کی تائید کی۔" بات یہ ہے جی! یہ مزارع اور کمی اُن سے دن رات سخت محنت کراتے ہیں پر روٹی ٹکر دینے کو اُن کے پاس اتنا ہوتا نہیں کہ انہیں ٹھیک ٹھاک رکھیں۔ وہ بوڑھی اور مریل نہیں لگیں گی تو اور کیا لگیں گی۔"

"پر یہ بھی تو ہے جی، اِدھر کڑی تیراں چوداں کی ہوئی، اُدھر جھٹ اس کا ویاہ ہو جاتا ہے۔ پوری طرح جوان بھی نہیں ہوتی کہ بچّے پیدا ہونے لگتے ہیں۔"

"جبھی تو مزارعوں اور کمیوں کے گھروں میں جوان اور خوب صورت زنانیاں نظر نہیں آتیں۔" احسان شاہ نے منہ بگاڑ کر کہا۔" میں جسے بھی اٹھواتا ہوں، پہلے اسے مکھن دودھ کھلا پلا کر تیار کراتا ہوں۔ تب اس پر جوبن آتا ہے۔ وہ نکھرتی ہے۔ چہرے پر رنگ روپ آجاتا ہے۔ بدن بھی گداز اور کسا ہوا ہو جاتا ہے۔"

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ چپ بیٹھا مرغ کی ٹانگ چباتا رہا۔ بارش کا زور اب ٹوٹ گیا تھا البتہ ہوا کی شوریدہ سری کم نہیں ہوئی تھی۔ دونوں کی آنکھوں میں نشے سے ستارے جھلملا رہے تھے۔

احسان شاہ زیادہ دیر خاموش نہیں رہا۔ اُس نے ہنس کر پوچھا۔" چوہدری تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

"سوچ رہا تھا، تیری تن درستی بہت اچھی ہے۔ تو اب بھی جوان گبھرو لگتا ہے۔" رحیم داد نے اُسے خوش کرنے کی کوشش کی۔

"اب تو کچھ بھی نہیں رہا۔ دو سال اُدھر میرا جگر خراب ہو گیا تھا۔ اس سے صحت ذرا گر گئی۔" احسان شاہ بتانے لگا۔" تو نے اُس زمانے میں مجھے نہیں دیکھا۔"

"برا نہ منا تو ایک گل پوچھوں۔" رحیم داد نے دبی زبان سے کہا۔" شاہ جی! تو مزارعوں کی گھر والیاں کیوں اٹھواتا ہے؟"

"مزارعوں کی زنانیاں تب اٹھواتا ہوں جب وہ سرکشی کرتے ہیں۔ ویگار سے جی چراتے

ہیں۔ حرام خوری اور بدمعاشی کرتے ہیں۔" احسان شاہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"ایسے مزارعوں کو بے دخل کیوں نہیں کر دیتا؟"

"انہیں بے دخل کرنے کا سب سے آسان اور مجرّب نسخہ یہ ہے کہ جس مزارع کو بے دخل کرنا ہو، اُس کی گھروالی اٹھوا لو۔ سمجھو اُس کا ایک بازو کٹ گیا۔ وہ بالکل بے بس ہو جاتا ہے۔" احسان شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "ویسے کبھی کبھی مزارعوں اور رکمیوں پر رُعب اور دہشت بٹھانے کے لیے بھی ایسا کرنا پڑتا ہے ورنہ تیں نوں تو پتہ ہی ہے، مزارعوں میں ایک سے ایک نمبری، نکما، اور ہڈحرام پڑا ہے۔ ذرا ڈھیل دو، جھٹ کانون چھانٹتا ہے، اوپر درخواستیں پہنچاتا ہے۔ خود بدمعاشی کرتا ہے اور دوسروں کو بھی اکساتا ہے۔ زمیں داری کرنا ہنسی ٹھٹھا نہیں۔ زمیں دار کا رُعب اُٹھ جائے تو سمجھ لے، گئی زمیں داری۔ اسے چلانے کے لیے ضروری ہے، ایسا وار کرو کہ مزارع سر ہی نہ اٹھا سکے۔ عورت تو مرد کی عزت ہوتی ہے نا۔ بس اُس سے وہی چھین لو۔ ہمیشہ کے لیے اُس کا سر جھک جاتا ہے۔"

"پر شاہ جی! توُ نے تو بہت زنانیاں رکھ چھوڑی ہیں۔ میں نے تو سنا ہے، توُ نے اُن کے لیے بہت وڈّا کوٹ بنوا رکھا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"توُ نے ٹھیک ہی سنا۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "کوٹ ساتھ ہی ہے۔ دیکھنا چاہے تو ابھی دیکھ لے۔ بول کیا کہتا ہے؟"

"دیکھ لوں گا، پر آج نہیں۔" رحیم داد رضامند نہ ہوا۔ "ویسے بارش بھی ہو رہی ہے۔"

"اب میں تجھے راز کی گل بتاتا ہوں۔ ان رکھیلیوں سے بہت کام نکلتا ہے۔ میں تو ان کو اپنے کمرے میں رات کو کم ہی بلاتا ہوں۔" اس نے وہسکی کی چسکی لگائی۔ "تھانے دار، تحصیل دار، اور کبھی کبھی تو ان سے بھی وڈے افسر، بلکہ اسمبلی کے ممبر بھی میری حویلی میں آکر ٹھیرتے ہیں۔ تیرے ایسے یار دوست بھی آتے ہی رہتے ہیں۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ نشے کی جھونک میں لہرا کر بولا۔ "شراب کا دور بھی چلتا ہے۔ مہمانوں کی خاطر مدارت تو کرنی ہی پڑتی ہے۔" اُس نے بے تکلفی سے انکھ ماری۔ "ان میں رنگین مزاج بھی ہوتے ہیں۔ ان کا دل بہلانے کے لیے یہ زنانیاں

بہت کام آتی ہیں۔ نہ کسی کو بلوانے کی ضرورت، نہ ڈھونڈنے شونڈھنے کا چکر۔ کوٹ میں ہر طرح کی رن موجود ہے۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔

نشے کا ریلا آیا۔ احسان شاہ کے ہاتھ میں دبا ہوا گلاس چھلک اٹھا۔ اس نے گلاس میز پر رکھ دیا۔ ہنس کر گویا ہوا۔ "چوہدری اِک گل اور بھی ہے۔ پُتر جوان ہو گئے ہیں۔ تیں نوں پتہ ہے، جوانی تو دیوانی ہوتی ہے نا۔ چھپ چھپ کر کنجریوں کے پاس جائیں گے۔ لہور جا کر ہیرا منڈی کے چکر کاٹیں گے۔ روپیہ پیسہ برباد کریں گے۔ بدنامی الگ ہوتی ہے۔ فیر ایسا بھی تو ہے کنجریوں کے پاس جائیں گے تو پوشیدہ اور خطرناک بیماریاں لگا کر لائیں گے۔" اس نے زور کا قہقہہ بلند کیا۔ "کوٹ کی یہ رکھیلیاں ان کے کام بھی آتی ہیں۔"

"پر شاہ جی! تجھے یہ بات بری نہیں لگتی؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"چوہدری! تو برائی کی گل کر رہا ہے۔ میں پوری طرح جوان بھی نہ ہوا تھا کہ پنڈ کی ایک چھوہری پر میرا دل آ گیا۔ میں نے اُسے اٹھا کر زبردستی گھوڑی پر بٹھایا اور حویلی میں لے آیا۔ میں نے ایک فلم میں ہیرو کو اسی طرح ہیروئن کو اٹھا کر لے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔" احسان شاہ بتاتا رہا۔ "وہ جی کمہاروں کی چھوہری تھی۔ وہ اکٹھے ہو کر پیچھے پیچھے آئے۔ بہت رولا گولا کیا۔ اسی دیوان خانے میں میرے پیو کے سامنے مکدمہ پیش ہوا۔ میں بہت ڈرا۔ میرا پیو بہت رعب داب والا زمیں دار تھا۔ کمہاروں کی شکایات سنتے ہی بھڑک اٹھا۔ سب کو اُلٹا لٹکا کر جوتے لگوائے۔ اسی روز ان کی کٹی مٹیاریں اور جوان زنانیاں اٹھوا لیں۔ کئی روز سب کو جیل میں بند رکھا۔ اُس کی اپنی جیل ہوتی تھی۔ اسی حویلی میں ایک تہہ خانہ ہے۔ پہلے وہ جیل کی جگہ استعمال ہوتا تھا۔ جو مزارع یا کمی سرکشی یا نافرمانی کرتا، اس میں ڈال دیا جاتا۔"

"تو بھی اسے جیل کے طور پر کام میں لاتا ہے؟"

"نہیں میں نے اسے ختم کر دیا۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "دو کیدی مر گئے۔ پنڈ کے مزارعوں اور کمیوں نے بہت شور مچایا۔ آس پاس کے کسان بھی اُن کے ساتھ لگ گئے۔ انہیں دبانے

کے لئے پولیس کو بلانا پڑا۔ معاملہ تو دب گیا پر میں نے اس کے ساتھ ہی جیل بھی ختم کردی۔ تہہ خانے میں اب تو غلہ رکھا جاتا ہے۔"

"تو کمہاروں کی چھوہری اٹھا لایا تو تیرے پیو نے تجھ سے کچھ نہیں کہا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔ "تھوڑا بہت ناراض تو ہوا ہو گا؟"

"بالکل ناراض نہیں ہوا۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ ماں جی کے پاس جا کر ہنستے ہوئے بولا، لے نیک بخت، تیرا پتر جوان ہو گیا۔ زور آور بھی ہے۔ اچھا زمیں دار بنے گا۔" احسان شاہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "میں اپنے پیو کا اکلوتا پتر تھا۔ لاڈلا بھی بہت تھا۔" اس نے نظر بھر کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ "بعد میں تو جی اس کی رکھیلیاں اپنے کام میں آنے لگیں۔ اس نے ایک سے ایک اچھا دانا چھانٹ کر رکھ چھوڑا تھا۔ میرا پیو بھی یوں سمجھ لے بادشاہ ہوتا تھا۔ اس کا رعب ایسا زبردست تھا کہ مزارع اور کمی اس کے نام سے کانپتے تھے۔ سر اٹھا کر اس کے روبرو بات نہیں کر سکتے تھے۔"

"ایک گل سمجھ نہیں آئی۔ تو جن زنانیوں کو اٹھواتا ہے، کوٹ میں رکھتا ہے، ان کے گھر والے انہیں واپس لے جاتے ہیں۔ برا نہیں مناتے؟" رحیم داد نے پوچھا۔ "ان کی غیرت ذرا نہیں جاگتی؟"

"تو غیرت کی گل کر رہا ہے۔" احسان شاہ بولا۔ "وہ تو انہیں واپس لینے کے لئے منت سماجت کرتے ہیں، پیر پکڑتے ہیں۔ کئی تو ایسے ہوتے ہیں کہ منہ مانگی کیمت ادا کر کے لے جاتے ہیں۔"

"یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔ ایسا کیوں ہے؟"

"یہ سوال تو اسمبلی میں بھی اٹھایا گیا تھا۔ ہوا یہ کہ بیگم شاہنواز نے زنانیوں کے حکوک کے لئے اسمبلی میں بہت زبردست تکریر کی۔ گلہ کیا کہ ان کو کوئی حکوک حاصل نہیں۔ مردوں نے ان کے سارے حکوک دبا رکھے ہیں۔ ان کو اپنا غلام بنا کر رکھ چھوڑا ہے۔ ملک فیروز خاں نون بھی ان دنوں اسمبلی کا ممبر ہوتا تھا۔ وہ جھٹ کھڑا ہو گیا۔ ایسا مسکت جواب دیا کہ بیگم شاہنواز چپ کر کے رہ گئی۔"

"کیا جواب تھا اس کا؟ ذرا میں بھی سنوں۔"

"اس نے گرج کر کہا، بیگم شاہنواز کو پتہ نہیں، پاکستان میں زنانیوں کو کتنے حقوق حاصل ہیں۔ میں اس سلسلہ میں اپنے ایک مزارع کا واقعہ مثال کے طور پر ایوان کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جس سے اچھی طرح اندازہ ہو جائے گا کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کو کتنے زیادہ حقوق ملے ہوئے ہیں۔ میرے مزارع کا نام کرم دین ہے۔ اس کے بارے میں میرے پاس شکائتیں پہنچیں کہ اسے اپنی عزت اور آبرو کا ذرا لحاظ نہیں۔ میں نے اسے بلا کر ایک روز پوچھا، کرمے! میں نے سنا ہے تیری گھر والی نے کسی سے یاری لگا رکھی ہے۔ تُو اسے کچھ نہیں کہتا۔ تیری غیرت نہیں جاگتی؟ وہ بولا، ملک صاحب! ہے تو یہ بالکل سچی گل۔ میری گھر والی نے پنڈ کے لوہار سے یاری لگا رکھی ہے۔ وہ ہر رات اس کے پاس چلی جاتی ہے۔ میں نے اسے بہت منع کیا۔ جھگڑا کیا، پر وہ نہیں مانتی۔ میں اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا۔ گل ایہہ ہے جی۔ وہ سویرے ہی سویرے واپس آجاتی ہے۔ ڈھور ڈنگروں کو چارہ پانی دیتی ہے۔ میرے لئے روٹی تیار کرتی ہے۔ شام تک سارے ہی کام کرتی رہتی ہے۔ بچوں کو روٹی کھلا کر سلاتی ہے۔ میرے پاس آکر پوچھتی ہے اور کوئی کام تو نہیں کرنا؟ میں جب تک روکتا ہوں، رک جاتی ہے، فیر لوہار کے پاس چلی جاتی ہے۔ ملک صاحب! میں نے اس سے اور کیا لینا۔ دن بھر تو وہ میری گھر والی ہی رہتی ہے نا۔ ویسے کبھی کبھار رات کو میرے پاس ٹھہر بھی جاتی ہے۔ پر یہ اس کی مرضی پر ہے۔" احسان شاہ نے نشے کی ترنگ میں زور کا قہقہہ لگایا۔ "تو ہی بتا فیروز خاں نے کیسی زبردست دلیل پیش کی۔ اور سچ پوچھ تو بالکل صحیح پیش کی۔"

"تُو نے جو کچھ بتایا، کیا یہ سچ ہے؟" رحیم داد نے جھجکتے ہوئے اپنے شبہ کا اظہار کیا۔

"بالکل سچ ہے۔" احسان شاہ نے نہایت اعتماد سے کہا: "ملک فیروز خاں نون کی یہ تکریر تو دستور ساز اسمبلی کے ریکارڈ میں موجود ہے۔ سارے ہی اخباروں میں چھپ چکی ہے۔ میں نے بھی اُسے اخبار ہی میں پڑھا تھا۔ میں کب اسمبلی میں بیٹھا تھا۔"

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ بارش اب رک چکی تھی۔ رحیم داد نے گردن اٹھا کر باہر دیکھا اور برآمدے

میں چھائی ہوئی خاموشی توڑی۔" پانی تو اب تھم چکا ہے۔" اُس نے احسان شاہ کا چہرہ نظر بھر کر دیکھا۔

"شاہ جی! تو نے میری گل کا اب تک کوئی جواب نہیں دیا؟"

"کون سی گل؟" احسان شاہ نے دریافت کیا۔

"وہی ماکھے کے بازو کی واپسی کی گل۔" رحیم داد نے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی! میری خوشی ہے کہ تو اُس کی گھر والی واپس دے دے۔"

"چوہدری تو کہتا ہے تو دے دوں گا۔" احسان شاہ رضامند ہو گیا۔" پر ماکھا اُس کا ناس مار دے گا۔ تو نے اسے دیکھا نہیں۔ بہت زوردار جٹی ہے۔ ایک نمبر دانا ہے۔"

"وہ جیسی بھی ہے، میں چاہتا ہوں تو اُسے ماکھے کے حوالے کر دے۔" رحیم داد بے تکلفی سے مسکرایا۔" شاہ جی! تیں نوں میری یہ بات ماننی ہوگی۔"

"میں نے کب انکار کیا۔ تیری گل ضرور مانوں گا۔ اب تو تجھ سے یاری ہو گئی ہے۔" احسان شاہ نے سرگوشی کے عالم میں کہا۔" پر ایک شرط پر واپس کروں گا۔"

"کیا شرط ہے، وہ بھی بتا دے۔"

"تو آج رات یہیں ٹھیرے گا۔ ویسے بھی رستہ خراب ہے۔ بارش کیچڑ میں اتنی رات گزرے کیسے واپس جائے گا۔"

"شاہ جی! تیری یہی شرط ہے تو ٹھیر جاؤں گا۔" رحیم داد ہنس کر بولا۔ وہ واپسی کے متعلق پہلے ہی تذبذب میں مبتلا تھا۔ احسان شاہ نے زور دیا تو وہ بلا جھجک ٹھیرنے پر راضی ہو گیا۔

احسان شاہ بولا۔" پر تو نے میری پوری گل نہیں سنی۔"

"وہ بھی بتا دے۔" رحیم داد بدستور مسکراتا رہا۔

"شرط ورط کیا ہے، یوں سمجھ لے۔ یہ میری خوشی ہے۔" احسان شاہ نے کہا۔" رسیلی آج تیرے کمرے میں رہے گی تاکہ تجھے بھی پتہ چل جائے کہ میں نے پنج سال سے اسے اپنے پاس کیوں رکھ چھوڑا ہے۔"

"نہیں شاہ جی! ایسا نہیں ہوگا۔" رحیم داد نے صاف انکار کر دیا۔

"نوجوان بندہ ہے۔" احسان شاہ نے تیوری پر بل ڈال کر تیکھے لہجے میں کہا۔ "جانے تو نے کیسی زمیں داری کی ہے۔ اللہ دسایا کی طرح تو بھی پہلے مزارع تو نہیں رہ چکا ہے؟"

رحیم داد سراسیمہ ہو گیا۔ اُس نے جھٹ صفائی پیش کی: "ایسی گل نہیں۔ میں کتنا وڈا زمیں دار تھا، یہ تو میرا کلیم دیکھ کر تو اندازہ لگا سکتا ہے۔" اُس نے بات بنائی۔ "گل ایہہ ہے جی! میرا پیو تھا تو وڈا زمیں دار پر بہت نیک بندہ تھا۔ اُس نے میری ماں کے سوا زندگی بھر کسی دوسری زنانی کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔"

"پر تو اپنے پیو کے رستے پر چل کر ادھر زمیں داری نہیں چلا سکتا۔ مزارعے تیرے کابو میں نہیں آئیں گے۔ ان کو دبا کر رکھنے کے لئے ایسا کرنا ہی پڑے گا۔" احسان شاہ نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے اصرار کیا۔ "تجھے میری یہ گل تو ماننی ہی پڑے گی۔ دیکھ، ضد نہ کر۔ میں نے تیری گل مانی ہے تو تجھے بھی میری گل ماننی ہوگی۔" وہ نشے سے جھوم کر ہنسا۔ "اب یاری کی ہے تو اسے نباہنا بھی پڑے گا۔ میں تو یاروں کا یار ہوں۔"

احسان شاہ نے گلاس ختم کیا۔ شیدا کو بلایا۔ وہ آیا تو اُسے کھانا چننے کی ہدایت کی۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔

کھانے کا کمرہ برابر ہی تھا۔ دونوں نے وہاں جا کر کھانا کھایا۔ کھانا مرغن اور خوش ذائقہ تھا مگر رحیم داد زیادہ نہ کھا سکا۔ کھانے سے فارغ ہو کر احسان شاہ حویلی کے زنان خانے کی جانب چلا گیا۔

✡

دیوان خانے کا ایک دروازہ ایک طویل راہداری میں کھلتا تھا۔ آگے مختصر باغیچہ تھا۔ باغیچے کے ایک طرف برآمدہ تھا۔ اس میں ایک سلسلے سے کئی کمرے تھے جو مہمانوں کے قیام کے لیے تھے۔ شیدا نے ایک کمرے میں رحیم داد کو پہنچا دیا۔ کمرہ خوب ہوا دار تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے پڑے تھے۔ کمرے کے ایک طرف مسہری بچھی تھی۔ اُس پر اجلا بستر لگا تھا۔ قریب ہی

میز رکھی تھی۔ اُس پر لیمپ روشن تھا۔ شیدا اُسے کمرے میں چھوڑ کر باہر چلا گیا۔

رحیم داد بستر پر لیٹ گیا۔ اُس نے لیمپ کی لو مدھم کر دی۔ بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ بادل رک رک کر گرج رہے تھے۔ بجلی بھی کڑک رہی تھی۔ کمرے کی کھڑکی باغ کی جانب کھلتی تھی۔ ہوا کے بھیگے ہوئے جھونکے اندر آ رہے تھے۔ رحیم داد نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر ذرا ہی دیر بعد دروازہ آہستہ سے چرچراتا ہوا کھلا۔ رحیم داد نے آنکھیں کھول دیں۔ مڑ کر دروازے کی جانب دیکھا، دھندلی روشنی میں ایک عورت دہلیز کے پاس کھڑی دروازہ بند کر رہی تھی۔ اُس کی پُشت رحیم داد کی جانب تھی۔ وہ سبز کنارے کا سُرخ ریشمی لاچا باندھے ہوئے تھی۔ آنکھوں میں کاجل تھا اور بال خوشبودار تیل سے چمک رہے تھے۔

دروازہ بند کرنے کے بعد وہ مڑی۔ اُس کا رنگ چمپئی تھا۔ صورت شکل گوارا تھی البتہ آنکھیں روشن اور خوب صورت تھیں۔ اُس نے ہاتھ اٹھا کر اپنی ناک کا بیڑ درست کیا اور آہستہ آہستہ رحیم داد کی جانب بڑھنے لگی۔ وہ پچیس چھبیس سال کی جوان اور صحت مند عورت تھی۔ رحیم داد خاموش لیٹا رہا۔

عورت چپ چاپ آکر پائنتی کی جانب بستر پر پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔ بادل ایک بار زور سے گرجے۔ بارش تیز ہو گئی۔ رحیم داد تکیے کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ عورت کو ایک ٹک دیکھتا رہا پھر اُس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "تو ماکھے کی گھر والی ہے؟"

"ہاں جی! میں اس کی گھر والی ہوں۔" اُس نے رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔

"تیرا نام کیا ہے؟" رحیم داد نے بات چیت آگے بڑھائی۔

"نام تو جی میرا سگراں ہے پر شاہ جی مجھے رسیلی کہتا ہے۔ اب سب مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں۔" وہ آہستہ آہستہ بولتی رہی، "تو نے ماکھے کا نام لیا، تو اسے جانتا ہے؟"

"ہاں۔" رحیم داد نے گردن ہلا کر اقرار کیا۔ "یہ بتا، تجھے کبھی وہ یاد بھی آتا ہے؟"

"آتا تو ہے۔ پر اس سے کیا ہوتا ہے جی۔" رسیلی کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔ "پنج سال سے اوپر ہو گئے۔ میں نے اُسے نہیں دیکھا۔"

"اگر شاہ جی تجھے واپس بھیج دے تو تو اُس کے پاس چلی جائے گی؟"

"کیوں نہیں چلی جاؤں گی۔ وہ میرا گھر والا ہے۔"

"وہ تجھ سے دن رات محنت کرائے گا، نہ کھانے کو اچھی روٹی دے گا۔ نہ ایسے اچھے کپڑے لتے پہننے کو دے گا اور نہ تجھے ایسا آرام ملے گا، جو یہاں حویلی میں مل رہا ہے۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا "تو یہ سب کچھ چھوڑ کر اُس کے پاس چلی جائے گی؟"

"یہ بھی کوئی زندگی ہے جی۔" اُس کے لہجہ میں تلخی تھی۔ دبا دبا کرب تھا۔ "کبھی شاہ جی کے ساتھ سوتی ہوں، کبھی اس کے پتّروں کے ساتھ۔ تیرے ایسے مہمان ادھر آکر ٹھیرتے ہیں، تو اُن کے ساتھ بھی سونا پڑتا ہے۔" اس کی آواز میں رِقّت پیدا ہوگئی۔ "کئی تو ایسے مہمان آتے ہیں کہ پوری روشنی میں سارے کپڑے لتے اتروا دیتے ہیں۔ شراب کے نشے میں جانے کیسی گندی گندی حرکتیں کرتے ہیں۔ میں تجھے کیا کیا بتاؤں۔ کیسے بتاؤں کہ مجھ پر کیا کیا بیتتی ہے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ چہرہ غم زدہ ہوگیا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ رحیم داد، دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ ٹھیک سے نہ دیکھ سکا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ رسیلی بھی خاموش رہی۔ باہر تیز بارش ہو رہی تھی۔ ہوا کے بھیگے ہوئے جھونکے کمرے کے اندر آتے، لیمپ کی لو بار بار بھڑکتی، دونوں کے سائے دیوار پر لہرا کر گڈمڈ ہو جاتے۔ پھر رسیلی کی آواز خاموشی میں ابھری۔ "مجھے جھونک آرہی ہے، تُو نہیں سوئے گا؟" اس نے انگڑائی لی۔ "تو کہہ تو لیمپ بجھا کر کپڑے اتار دوں۔"

اس نے یہ باتیں ایسی بے باکی اور بے نیازی سے کہیں کہ رحیم داد حیرت سے چونک پڑا۔ نظریں اٹھا کر رسیلی کو دیکھا۔ منہ بگاڑ کر کسی قدر حقارت سے گویا ہوا۔

"تجھے اس طرح گل کرتے لاج بھی نہیں آتی؟"

"کیسی لاج، اور کیسی عزت۔" اس نے تیکھی نظروں سے رحیم داد کو گھور کر دیکھا۔ "پنج سال سے اوپر ہوگئے، اور تُو مجھ میں لاج ڈھونڈتا ہے۔ وہ میرے پاس رہی کہاں۔ مزارعوں اور کمیوں کی کڑیوں اور گھر والیوں کی عزت اور آبرو ہوتی ہی کب ہے۔ عزت شجت تو

زمیں دارنیوں کے پاس ہوتی ہے۔ وہ تو اپنے شریکوں کے سامنے بھی اوڑھنی کا بکل مار کر، منہ چھپا کے بیٹھتی ہیں۔ تانگے اور موٹر میں سوار ہو کر کہیں جاتی ہیں تو چاروں طرف چدّر باندھ دی جاتی ہے۔" اس کے چہرے پر دکھ کے سائے منڈلانے لگے۔" اپنا حال ایہہ ہے۔ دو برس ہوئے۔ اسی کمرے میں ایک وڈّا افسر آ کر ٹھیرا۔ اس نے ایک نہیں، دو لیمپ جلوائے اور سویرے تک ننگا نچوایا۔"

"وہ تجھ سے اتنا ناراض کیوں ہو گیا تھا؟"

"میں نے جی اس سے صرف اتنی گل کی تھی کہ جب اس نے پوری روشنی میں میرے کپڑے اتروانے چاہے تو میں نے انکار کر دیا۔ صاف، صاف کہہ دیا، میں کنجری نہیں ہوں، فیر تو جی، وہ اتنا ناراض ہوا کہ خود تو آرام سے بیٹھا شراب پیتا رہا، اور مجھے ننگا نچواتا رہا۔ تھک جاتی تو گالاں نکالتا۔ گصّے سے گلاس میں بھری ہوئی شراب اچھالتا۔ گر پڑتی تو اپنی چمڑے کی بیٹی سے مار لگاتا۔ منہ میں پیشاب کرنے کی دھمکی دیتا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"تو نے منت سماجت نہیں کی؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"بہت کی جی۔ پر وہ تو جی نشے میں دھت ہو رہا تھا۔" رسیلی نے بجھے ہوئے لہجہ میں بتایا۔ "اب تو یہ بات پرانی ہو گئی۔ اس کے بعد تو جو جیسا کہتا ہے، ویسا ہی کرنا پڑتا ہے۔ مہمان نراض ہو جائے اور شاہ جی سے شکایت کر دے تو وہ گندی، گندی گالاں نکالتا ہے۔ زور زور سے ٹھُڈّے مارتا ہے۔"

"شاہ جی، جن دوسری زنانیوں کو اٹھوا کر یہاں لاتا ہے، وہ سب ایسا ہی کرتی ہیں؟"

"کرنا ہی پڑتا ہے جی۔ ایسا نہ کریں تو شاہ جی چمڑی ادھیڑ ڈالے۔" اس کے چہرے پر خوف کا سایہ پھیل گیا۔" روٹی ٹکر بند کر دیتا ہے۔ کئی کئی روز بھوکا رکھتا ہے۔"

"میں بھی شاہ جی کا مہمان ہوں۔" رحیم داد نے مسکرا کر دریافت کیا۔" میرے بارے میں تو نے کیا سوچ رکھا ہے؟"

"میں نوں کی پتہ تو کیسا بندہ ہے۔" اس نے دبی زبان سے کہا۔" جب تو نے مجھے اپنے پاس بلوا ہی لیا تو میں توں تیرے بارے میں کی سوچنا۔"

”میں نے تجھے نہیں بلوایا۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”تو واپس چلی جا۔“

”کیسے جا سکتی ہوں۔ دروازے پر شیدے کی ڈیوٹی لگی ہے۔ اس نے شکایت کر دی تو شاہ جی میرے گلے پڑ جائے گا۔ تو اُسے نہیں جانتا۔ وہ بہت ظالم ہے۔ روٹی تو اچھی کھلاتا ہے، کپڑے لتے بھی بنوا کر دیتا ہے پر ظلم بھی ایسے ہی کرتا ہے۔“

”ایسا کر رسیلی!“ رحیم داد نے کمرے میں پڑے ہوئے قالین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تو اُس پر سو جا۔ میں نوں تجھ سے کچھ نہیں لینا۔“

وہ حیرت زدہ ہو کر بولی۔ ”تو سچ کہہ رہا ہے۔“ مگر فوراً ہی اس کا چہرہ مرجھا گیا۔ ”لگتا ہے، میں تجھے اچھی نہیں لگی۔“

”ایسی کوئی گل بات نہیں۔“ رحیم داد نے وضاحت کی۔ چند لمحے خاموش رہا، پھر اس نے کرید کر پوچھا۔ ”یہ بتا تیرے پیٹ میں تو بچہ تھا نا؟ ماکھا یہی بتاتا تھا۔“

”تھا تو، پر حکیم جی نے پرانے چھپر کا پھوس اور گڑ ملا کر کھلایا۔ دوائی بھی دی۔ حمل گر گیا۔ سب ٹھیک ہو گیا۔ پر بہت تکلیف ہوئی جی۔“ اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ دبی زبان سے پوچھا۔ ”ماکھا تجھے کہاں ملا تھا؟“

”وہ مجھے کئی بار مل چکا ہے۔ تیرے لیے بہت پریشان رہتا ہے۔“

”پریشان تو جی رہتا ہی ہوگا۔“ وہ افسردہ لہجے میں بولی۔ ”میں اس کے لئے کم پریشان رہتی ہوں۔ شروع شروع میں تو بہت یاد آتا تھا۔ چھپ چھپ کر روتی تھی۔ شاہ جی کو پتہ چل جاتا تو گالاں نکالتا، روٹی بند کر دیتا۔ وہ تو جی رونے بھی نہیں دیتا۔“ وہ اپنی بات کہتے کہتے گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

رحیم داد نے پوچھا۔ ”کیا سوچنے لگی؟“

”ماکھے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔“ اس کے چہرے پر غم کی پرچھائیاں منڈلانے لگیں۔ ”کیسا ہے وہ؟“

”لگتا ہے، تو اسے ابھی تک بہت یاد کرتی ہے۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”پر اب تو اس کے لئے پریشان نہیں رہے گی۔ کل سویرے وہ یہاں آ کر تجھے اپنے ساتھ لے جائے گا۔“

"نہیں جی! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ "ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ شاہ جی کے پاس بار بار آتا رہا، منت سماجت کی، پیروں پر سر رکھ دیا پر شاہ جی نہ مانا۔ اب وہ کیسے مان جائے گا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "کوٹ کی جس زنانی سے اُس کا جی بھر جاتا ہے، اُسے وہ بیچ دیتا ہے۔ واپس بھی کر دیتا ہے پر اس کے لئے لمبی رکم مانگتا ہے۔ ماکھا مجھے واپس لینے کے لئے کہاں سے اتنا روپیہ لائے گا۔ تیری گل سمجھ نہیں آئی۔"

"کل سویرے تیری سمجھ میں آجائے گی۔" رحیم داد نشے سے جھوم کر بولا۔ رسیلی نے رحیم داد کو گہری نظروں سے دیکھا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات صاف چغلی کھا رہے تھے کہ اسے رحیم داد کی بات پر یقین نہیں آیا۔ مگر اُس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ رحیم داد کسی قدر بیزاری سے بولا۔ "اب میں نوں سونے دے اور خود بھی سو جا۔ کل تیرا ماکھا، تجھے آ کر لے جائے گا۔" وہ ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔

رسیلی خاموشی سے اٹھی اور قالین پر جا کر بیٹھ گئی۔ رحیم داد نے کروٹ بدلی، پھونک مار کر لیمپ بجھا دیا۔ کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ باہر ابھی تک بارش ہو رہی تھی۔ تیز ہوا درختوں کی شاخوں سے الجھ کر پھڑپھڑا رہی تھی۔ رحیم داد پر نیند کا غلبہ ہوا۔ وہ گہری نیند سو گیا۔

سویرے اُس کی آنکھ کھلی تو کمرہ خالی تھا۔ رسیلی جا چکی تھی۔ بارش بھی بند ہو چکی تھی۔ کمرے کے باہر صبح کا اجالا پھیلا تھا۔ رحیم داد اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد شیدا آگیا۔ کمرے سے متصل غسل خانہ تھا۔ شیدا نے رحیم داد کو غسل خانے میں پہنچا دیا۔

رحیم داد نہا دھو کر غسل خانے سے نکلا تو برآمدے کے سامنے باغیچے میں ہلکی ہلکی دھوپ پھیلی تھی۔ درخت رات کی بارش سے ابھی تک بھیگے ہوئے تھے۔ وہ شیدا کے ہمراہ کھانے کے کمرے میں چلا گیا۔ میز پر ناشتہ لگایا جا چکا تھا۔ رحیم داد کے پہنچنے کے چند ہی منٹ بعد احسان شاہ بھی آگیا۔ وہ اس وقت بوسکی کا لمبا کرتا اور سفید شلوار پہنے ہوئے تھا۔ کرتے میں سونے کے بٹن لگے تھے جن پر جڑے ہوئے پکھراج کے نگینے جھل ملا رہے تھے۔

رحیم داد کو دیکھتے ہی احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔ "چوہدری! آرام نال نیند آئی؟ کوئی تکلیف

تو نہیں ہوئی؟" وہ کرسی کھسکا کر رحیم داد کے مقابل بیٹھ گیا۔ اُس نے لسّی کا گلاس اُٹھایا اور غٹا غٹ چڑھا گیا۔ مونچھیں ہاتھ سے صاف کیں، کھل کر مسکرایا۔ رحیم داد کی جانب ذرا سا جھکا۔ "رن کیسی تھی؟"

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "شاہ جی! میں نوں اب اپنے پنڈ واپس جانا ہے۔ ادھر سب پریشان ہوں گے۔ کسی کو پتہ نہیں کہ میں رات تیری حویلی میں رہا۔"

"کسی کو پتہ نہ چلے تو اچھا ہی ہے۔" احسان شاہ نے مشورہ دیا۔ "اور اللہ وسایا کو تو بالکل پتہ نہیں چلنا چاہیے۔"

"یہ تو میں بھی چاہتا ہوں، اُس کو پتہ نہ چلے۔" رحیم داد نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "میں نوں پتہ ہے، تیری اُس کے ساتھ پرانی لگتی ہے۔ اُسے ملوم ہو گیا تو بُرا منائے گا۔"

"اس بارے میں تو میں تجھ سے اگے آرام سے گل بات کروں گا۔ تجھے کئی باتیں بتانی ہیں۔ تو ابھی کچھ نہیں جانتا۔"

رحیم داد نے گفتگو کا موضوع بدلا اور مطلب پر آگیا۔ "شاہ جی! تو نے ماکھے کے بارے میں کیا سوچا؟"

"سوچنا کیا ہے۔ تجھ سے جو وعدہ کیا ہے اُسے پورا کروں گا۔" اُس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "ویسے بھی اب تیری گل تو ماننی ہی پڑے گی۔ یارانہ جو ہو گیا۔ ساتھ بیٹھ کر پینے کے بعد تو سمجھ لے یاری پکّی ہو گئی۔ اس پر مُہر لگ گئی۔ ایسی یاری دوستی کبھی نہیں ٹوٹتی، زندگی بھر چلتی ہے۔ ابھی نہیں، اگے تجھے اس کا اچھی طرح اندازہ ہو جائے گا۔"

رحیم داد مسکرایا اور خوش کرنے کے لئے احسان شاہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گرم جوشی سے بھینچ لیا۔ رحیم داد کا قیاس غلط نہیں نکلا۔ احسان شاہ کے چہرے پر مسرّت کی سُرخی دوڑ گئی۔ اُس نے شیدا کو بلایا۔ اُسے ہدایت کی کہ ماکھا کو اُس کے گھر سے بلا لائے۔ پھر وہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ "چوہدری! تیں نوں اتنا بتا دوں کہ ماکھا، رسیلی کا ناس مار دے گا۔ دو چار مہینے بعد ہی دیکھ لینا، وہ کھانگڑ اور مریل مجھ بن کر رہ جائے گی۔"

"تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" رحیم داد نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ "میں نوں تو یہ خوشی ہے کہ شاہ جی، تو نے میری بات مان لی۔"

احسان شاہ مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

دونوں ناشتے سے فارغ ہو کر برآمدے میں گئے اور اطمینان سے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سامنے لان پر ہلکی زرد دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ بھیگی ہوئی گھاس پر بارش کے قطرے جھل ملا رہے تھے۔ آسمان بارش کے بعد گہرا نیلا نظر آ رہا تھا۔ بادلوں کے ہلکے پھلکے ٹکڑے بلندی پر ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ ہوا مدھم تھی۔ حویلی کی دیواریں ابھی تک گیلی تھیں۔ احسان شاہ خوش گوار موڈ میں تھا۔ چہرے پر تازگی اور ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔

مگر جیسے ہی ماکھا سر جھکائے شیدا کے ہمراہ سامنے آیا، احسان شاہ کے چہرے سے تازگی اڑ گئی، تیوری پر بل پڑ گئے۔ آنکھوں سے جھنجلاہٹ جھلکنے لگی۔ ماکھا چند لمحے خاموش کھڑا رہا۔ پھر وہ جھکا اور تیزی سے آگے بڑھ کر احسان شاہ کے قدموں پر گر پڑا، پیر پکڑے اور زار و قطار رونے لگا۔

احسان شاہ اور برہم ہو گیا۔ اس نے غصے سے ماکھا کی کمر پر ٹھوکر لگائی۔ چیخ کر بولا۔ "سدّھا کھڑا ہو۔ زنانیوں کی طرح میرے سامنے ٹسوے نہ بہا۔"

احسان شاہ خاموش بیٹھا غصے سے پیچ و تاب کھاتا رہا۔ ماکھا اٹھ کر سیدھا ہو گیا تھا اور ایک گوشے میں ڈرا سہما نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ احسان شاہ نے مڑ کر قریب کھڑے ہوئے شیدا کو دیکھا، تیکھے لہجے میں گویا ہوا۔ "شیدے! رسیلی اور اس کے بچوں کو یہاں لے آ۔"

رحیم داد نے احسان شاہ کو اس طرح جلال کے عالم میں دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ اس نے کچھ کہا نہیں۔ چپ بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد شیدا کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی رسیلی بھی آ گئی۔ اس کے ہمراہ چار چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ رسیلی کا لباس بدلا ہوا تھا۔ وہ نہا دھو کر آئی تھی اور نکھری نکھری نظر آ رہی تھی مگر اس کے بچے اتنے ہی گندے تھے۔ لباس بھی ان کے جسم پر میلے اور بوسیدہ تھے۔

احسان شاہ نے نظر بھر کر رسیلی کو دیکھا اور تحکمانہ انداز میں پوچھا۔ "ماکھا تجھے لینے آیا ہے، تو اس کے ساتھ جائے گی؟" رسیلی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے گھبرائی ہوئی خاموش کھڑی رہی۔ ماکھا سونتق کی طرح منہ اٹھائے اُسے بے چینی سے دیکھتا رہا۔ رحیم داد بھی رسیلی کی خاموشی پر حیرت زدہ تھا۔

احسان شاہ نے رسیلی کی جانب ایک بار پھر دیکھا، اونچی آواز سے بولا۔ "چپ کر کے کیوں کھڑی ہے۔ صاف صاف بتا، تُو نے ماکھے کے ساتھ جانا ہے کہ نہیں۔ اپنی مرضی بتا، کیا چاہتی ہے تُو؟"

"میری کیا مرضی ہے جی!" رسیلی نے آہستہ سے کہا۔ "جو تُو حکم کرے گا، ویسا ہی کروں گی۔"

"میرے حکم کو چھوڑ، اپنی گل کر۔"

"چلی جاؤں گی جی اس کے ساتھ۔" رسیلی نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "یہ میرا گھر والا ہے، ویاہ کر لایا ہے۔"

"لے سنبھال اپنا بازو اور اس کے چھوہرے، چھوہریاں۔" احسان شاہ نے ماکھا سے کہا پھر رحیم داد کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "چوہدری کی خاطر واپس دے رہا ہوں۔ اس کی گل تو میں نے ماننی ہی تھی۔"

ماکھا ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ "تیری مہربانی ہے شاہ جی۔"

احسان شاہ خاموش بیٹھا رہا۔ ماکھا نے چھوٹے بچے کو گود میں اٹھا لیا، رسیلی کا ہاتھ تھاما، احسان شاہ کی جانب خوف زدہ نظروں سے دیکھا، اُس سے اجازت چاہی۔ "اسے لے جاؤں جی؟"

"لے جا۔ دفعہ ہو یہاں سے۔" احسان شاہ نے جھنجلا کر کہا۔

ماکھا آگے بڑھا، رسیلی اس کے ساتھ چلی۔ بچے بھی اس کے ہمراہ تھے۔ وہ سب آہستہ آہستہ برآمدے سے نکل گئے۔

رحیم داد نے احسان شاہ کا شکریہ ادا کرنے کے انداز میں کہا۔ "شاہ جی! تیری بہت بہت مہربانی۔ تُو نے میری بات کی لاج رکھ لی۔" اُس کے لہجے سے خوشامد آشکارہ تھی۔

"چوہدری میں یاروں کا یار ہوں۔" احسان شاہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔" اگے بھی آزما لینا۔ احسان شاہ کو تو بات کا ہمیشہ دھنی پائے گا۔ ایک بار وعدہ کر لوں گا تو اُسے ضرور پورا کروں گا۔"

رحیم داد نے کچھ دیر ٹھہر کر جانا چاہا تو احسان شاہ مسکرا کر بولا۔" اب تجھ سے آئندہ بھی ملنا جلنا رہنا چاہیے۔ تو اپنا پڑوسی زمیں دار ٹھیرا۔ آپس میں میل ملاپ بہت ضروری ہے۔ ایک دوسرے سے کام پڑتا ہی رہتا ہے۔" وہ بے تکلفی سے ہنسا۔" دیکھ یہ آخری ملاقات نہیں ہونی چاہیے۔ تو یہاں آتا جاتا رہے گا تو میرا بھی اچھا وکت کٹے گا۔ تیرا دل بھی بہل جائے گا۔"

رحیم داد نے ایک بار پھر احسان شاہ کا شکریہ ادا کیا۔ احسان شاہ اسے رخصت کرنے حویلی کے پھاٹک تک آیا۔ گرم جوشی سے بغل گیر ہوا۔ پیٹھ تھپک کر بولا۔" تجھ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" رحیم داد نے علیحدہ ہوتے ہوئے دوبارہ آنے کا وعدہ کیا۔ اپنی گھوڑی پر سوار ہوا اور کوٹلہ ہرکشن کی سمت روانہ ہو گیا۔

رات بھر کی بارش کے بعد پانی اور کیچڑ سے راستہ بہت خراب ہو گیا تھا۔ رحیم داد گھوڑی سنبھال سنبھال کر دوڑا رہا تھا۔

وہ گاؤں میں داخل ہوا تو پہر دن گزر چکا تھا۔ مہمان خانے کا ملازم، احمد، اُس کے انتظار میں پریشان بیٹھا تھا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی اس نے جلدی سے پوچھا۔" چوہدری! تو اب تک کہاں رہا؟ رات زبردست بارش ہوئی۔"

رحیم داد نے حیلے سے کام لیا۔" گھوڑی دوڑاتا نہر کے پار دور تک نکل گیا۔ واپسی پر بارش شروع ہو گئی۔ عالم پور نزدیک ہی تھا، اُدھر چلا گیا۔ وہاں کے ایک زمیں دار سے اپنی جان پہچان ہے۔ بارش بہت تیز تھی۔ رات اسی کے پاس ٹھیر گیا۔"

"ہاں جی! اتنی زور کی برکھا میں واپسی کیسے ہو سکتی تھی۔" احمد نے کہا۔" ناشتہ لے آؤں تیرے لیے؟"

"نہیں، ناشتہ میں نے اُدھر ہی کر لیا تھا۔ بہت تھک گیا ہوں۔ میں تو اب آرام کروں

گا تو ٹر جا۔"

احمد چلا گیا۔ رحیم داد بستر پر لیٹ کر سو گیا۔ اُس نے دوپہر کا کھانا بھی نہ کھایا۔ دن ڈھلے تک پڑا سوتا رہا۔ بیدار ہوا تو جسم ٹوٹ رہا تھا۔ اُس نے غسل کیا، لباس تبدیل کیا اور باغ میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہ شام تک تنہا بیٹھا رہا۔ رات کا کھانا کھا کر وہ مہمان خانے میں واپس چلا گیا۔

کئی دن گزر گئے۔ اللہ وسایا ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ اس کے بغیر رحیم داد کو شدید احساس تنہائی ہوا۔ گاؤں میں کسی اور سے اُس کا میل جول نہیں تھا۔ نہ ہی کوئی ایسا تھا جس سے میل جول پیدا کیا جاتا۔ سارے ہی مزارع اور کمّی تھے مگر تنہائی سے اکتانے کے باوجود نہ اُس نے گھڑ سواری کی، نہ نہر کی جانب گیا۔ اُسے خدشہ تھا کہ احسان شاہ سے دوبارہ مڈبھیڑ نہ ہو جائے اور وہ اصرار کر کے اپنے ہمراہ پیراں والہ نہ لے جائے۔ وہ اب احسان شاہ سے ملنا اور اُس کے پاس جانا نہیں چاہتا تھا۔

☆

اُس شام موسم بڑا سہانا تھا۔ دوپہر تک بارش ہوتی رہی۔ پھر بادل چھٹ گئے، مطلع صاف ہو گیا۔ گرد و غبار سے اَٹے ہوئے درختوں اور پودوں کے پتّے بارش سے دھل کر خوب صاف ستھرے ہو گئے تھے، ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنوں میں دمک رہے تھے۔ ہوا سنساتی ہوئی چل رہی تھی۔ اس میں فرحت اور تازگی تھی۔ رحیم داد خاموش بیٹھا نکھری ہوئی خوش گوار فضا سے لطف اٹھا رہا تھا۔ اُسے پتہ بھی نہ چلا کہ ماکھا کب اس کے پہلو میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ آہستہ سے کھنکارا تو رحیم داد نے پلٹ کر دیکھا۔ ماکھا اپنے گندے دانت نکال کر مسکرانے لگا۔

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا "تو کب آیا اور کیسے آیا؟"

"بس جی آ ہی گیا۔" اُس کے لہجے میں خوشامد تھی "چوہدری! تو نے میرا بازو واپس دلا دیا، میں تجھے کیسے بھول سکتا ہوں۔"

رحیم داد نے دریافت کیا "رسیلی ٹھیک ٹھاک ہے؟"

"کیوں نہیں ٹھیک ٹھاک ہو گی جی!" ماکھا خوشی سے چہک کر بولا۔ "اپنے گھر میں لوٹ

آئی ہے۔ بہت خوش ہے۔ اپنا گھر جی اپنا ہی ہوتا ہے۔ وہ بھی تیرے پاس آنا چاہتی تھی پر میں اُسے نہیں لایا۔ سوچا، پہلے تجھ سے پوچھ لوں۔"

"اچھا کیا، تو اُسے نہیں لایا، بلکہ تُو بھی نہ آیا کر۔ تو احسان شاہ کا مزارع ہے۔ اللہ دسایا کو تیرا اس طرح بار بار آنا اچھا نہیں لگے گا۔ تیرا کام بن گیا۔ جا موج کر۔ اب یہاں نہ آنا۔" اُس نے ماکھا کو تنبیہ بھی کی۔ "اور دیکھ، کسی کو پتہ نہ چلے کہ میں رات شاہ جی کی حویلی میں ٹھہرا تھا۔"

"تُو اطمینان رکھ، میں کسی سے ایسی گل نہیں کروں گا۔ پر میں آج تیرے پاس ایک ضروری کام سے آیا تھا۔" اُس نے سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے کہا۔ "شاہ جی نے تجھے بلایا ہے۔ کوئی ضروری گل کرنی ہے۔ کہا ہے، آج ہی شام آجا۔"

"نہیں جی! میں اب اس کے پاس نہیں جاؤں گا۔ میں صرف تیری خاطر گیا تھا۔ تیرا کام بن گیا، اس کے ساتھ ہی میرا آنا جانا بھی بند ہو گیا۔"

"پر وہ کوئی بہت ضروری گل کرنا چاہتا ہے۔" ماکھا نے چوکنا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "سن لینے میں کیا جاتا ہے۔ تُو وہاں دیر تک نہ ٹھہرنا۔ تو نہیں جائے گا تو وہ مجھ پر ناراض ہو گا۔"

"تیں نوں پتہ ہے، وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟" رحیم داد کے لہجے میں پہلی سی بیزاری اور بے رخی نہیں تھی۔

ماکھا نے اُس کے رویے میں لچک پائی تو مسکرا کر بولا۔ "یہ تو میں نوں پتہ نہیں پر اتنا ضرور لگتا ہے، گل کچھ تیرے کام ہی کی ہو گی۔ شاہ جی کہتا بھی یہی تھا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ سر جھکا کر سوچنے لگا کہ احسان شاہ اُس سے کون سی ایسی اہم بات کہنا چاہتا ہے جس کے لئے اُس نے ماکھا کو بھیج کر اُسے بلایا ہے۔ ماکھا نے رحیم داد کو خاموش پایا تو قدرے عاجزی سے بولا۔ "تُو چلا جائے گا تو شاہ جی مجھ سے خوش ہو جائے گا۔ تیں نوں تو ذرا دیر گل بات کرنی ہے۔ جب جی چاہے، لوٹ آنا۔ ہو سکتا ہے، کوئی بہت کام ہی کی گل ہو۔"

رحیم داد نے احسان شاہ کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ماکھا سے کہا۔ "تُو جا، میں آج ہی شاہ جی کی حویلی پر پہنچ جاؤں گا۔ اُسے بتا دینا۔"

ماکھا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ آہستہ آہستہ باغ سے چلا گیا۔ رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ گھاس پر ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا کہ احسان شاہ اُس سے کیا کہنا چاہتا ہے۔ اُس کے ذہن میں کرید پیدا ہوئی، جس نے دھیرے دھیرے تجسّس بھرے بے چینی کی کیفیت اختیار کر لی۔

رحیم داد نے گھوڑی اصطبل سے نکلوائی۔ اُس پر سوار ہوا اور احسان شاہ کی حویلی کی جانب روانہ ہو گیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا مگر شفق کی سُرخی نے فضا کو لالہ رنگ بنا دیا تھا۔ وہ گھوڑی دوڑاتا ہوا کوٹلہ سرکشن سے نکلا۔ نہر کی طرف بڑھا۔ گہری سرخ روشنی میں اُسے نہر کے کنارے ایک شخص نظر آیا جسے دیکھتے ہی وہ سراسیمہ ہو گیا۔ وہ دارا تھا۔ رحیم داد نے اُسے غور سے دیکھا دونوں کی نظریں ملیں۔ رحیم داد نے اُسے اچھی طرح پہچان لیا، ہاں، وہ دارا ہی تھا۔

رحیم داد نے ایڑ لگا کر گھوڑی کی رفتار میں اضافہ کیا اور تیزی سے دارا کے قریب سے گزرتا ہوا آگے نکل گیا۔ اُسے گمان گزرا کہ دارا نے اُسے روکنے کے لیے ہاتھ بھی اٹھایا تھا مگر رحیم داد نے اُس کی جانب مطلق توجہ نہ دی، پلٹ کر دیکھا بھی نہیں، گھوڑی سرپٹ دوڑاتا رہا۔ وہ بیراں والہ کی جانب بڑھ رہا تھا اور دارا خطرہ بن کر اس کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ وہ رہ رہ کر سوچ رہا تھا کہ دارا، اُس کی مقتول بہن بیگماں کے گاؤں ڈھولہ امیر خان سے ادھر کیوں آ گیا؟ کیسے آ گیا؟ یہ سوالات اس کے ذہن میں منڈلاتے رہے اور وہ آگے بڑھتا گیا۔ دارا بہت پیچھے رہ گیا۔

✡

احسان شاہ اپنی حویلی کے سبزہ زار پر تنہا بیٹھا تھا۔ اس کے اردگرد کئی خالی کرسیاں پڑی تھیں۔ میز پر وہسکی کی بوتل، گلاس اور ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا جگ رکھا تھا۔ رات نکھری نکھری تھی، آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے، ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ قریب ہی برآمدہ تھا۔ اس میں لیمپ روشن تھا۔ لیمپ کی روشنی میں احسان شاہ کا چہرہ نشے سے تمتما رہا تھا۔ وہ رک رک کر وہسکی کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ اس کی نظریں بار بار برآمدے کی جانب اُٹھ جاتیں۔ وہ بے چینی سے رحیم داد کا انتظار کر رہا تھا۔

رحیم داد برآمدے سے گزر کر لان میں پہنچا۔ احسان شاہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا" چوہدری! تو نے بہت انتظار دکھایا۔ کہاں لگا دی اتنی دیر؟" اس نے گرم جوشی سے رحیم داد کا ہاتھ تھاما اور اپنے برابر ہی ایک کرسی پر بٹھایا۔

رحیم داد نے صفائی پیش کرنے کے انداز میں کہا" میں تو ماکھے سے تیرا پیغام ملتے ہی چل کھڑا ہوا تھا، پر تیں نوں پتہ ہے، برسات کے دن ہیں۔ ہر طرف پانی اور کیچڑ ہے، رستہ کچا ہے۔ یہاں پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ گھوڑی کو سنبھال سنبھال کر دوڑانا پڑا۔"

"ایسے موسم میں تو ان راستوں پر جیپ بہت کام دیتی ہے۔"

"وہ تو اپنے پاس ہے نہیں۔"

"اللہ وسایا نے تو تانگا بھی نہیں رکھا۔ وہ تو کسی طور زمیں دار ہی نہیں لگتا۔" احسان شاہ نے اللہ وسایا کے خلاف اپنی کدورت کا اظہار کیا" بنسی لال، تھا تو منیجر، پر اس کے زمانے میں ایک چھوڑ دو تانگے ہوتے تھے اور ہر دیال تو ہمیشہ جیپ ہی میں کوٹلہ ہر کشن آتا جاتا تھا۔ اُس میں زمیں داروں کی شان تھی۔ تھا بھی وڈّے زمیں دار کا پتّر۔"

"میں نے تو ایک بھی تانگا نہیں دیکھا۔ وہ گئے کدھر؟"

"فسادات شروع ہوئے تو بنسی لال بھاگ گیا۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو بتایا" کوچوانوں نے لوٹ مار سے فائدہ اٹھایا۔ دونوں ہی تانگے لے کر نکل گئے۔" احسان شاہ نے خالی گلاس میں بوتل سے وسکی انڈیلی، پانی ڈالا اور پیگ بنا کر رحیم داد کی جانب بڑھا دیا" لے، پہلے تھوڑی سی لگا لے۔ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔"

رحیم داد نے گلاس تو لے لیا مگر دبی زبان سے بچنے کی کوشش بھی کی" شاہ جی! آج رہنے دے۔ میں نوں پنڈ واپس بھی جانا ہے، زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا۔ تو نے بلایا، میں چلا آیا۔"

"چوہدری! خاما خا کی بات نہ کر۔" احسان شاہ نے مسکرا کر کہا" بس اب شروع ہو جا۔ واپسی کی بعد میں دیکھی جائے گی۔"

احسان شاہ نے رحیم داد کے گلاس سے اپنا گلاس ٹکرا کر ہاتھ اونچا کیا، ہلکا قہقہہ لگایا

اور گلاس ہونٹوں سے لگالیا۔ رحیم داد نے بھی گھونٹ بھرا، بھیگی ہوئی مونچھیں ہاتھ سے صاف کیں اور گلاس میز پر رکھتے ہوئے پوچھا" شاہ جی! ایسی کون سی خاص گل تھی جس کے لیے توُنے مجھے بلوایا؟"

احسان شاہ نے بے نیازی سے کہا" بس تجھ سے ذرا گپ شپ کرنے کو جی کرتا تھا۔ سوچا' تو ادھر اکیلا ہے' آجائے گا تو تیرے ساتھ اپنا دل بھی بہل جائے گا۔"

"پر ماکھا تو کہتا تھا، توُ نے کوئی خاص گل کرنی ہے، فوراً آنے کو کہا ہے۔"

" ماکھا ٹھیک ہی کہتا تھا" احسان شاہ نے خمار آلود نظروں سے رحیم داد کو دیکھا" خاص گل تشل کیا ہے۔ تجھ سے کچھ پوچھنا تھا۔ تیرے ہی مطلب کی گل ہے" وہ کھل کر مسکرایا" توُنے ہاتھ کیوں روک لیا؟ سارا گلاس ویسا ہی رکھا ہے۔ اِسے آدھا تو کر۔ تجھے کچھ سرور شرور ہو جائے تو گل کرنے میں مزا بھی آئے۔"

رحیم داد نے بڑا گھونٹ بھرا اور ایک تہائی گلاس خالی کر دیا۔ اُس نے منہ بگاڑا۔ احسان شاہ نے تکوں کی پلیٹ اس کے سامنے کردی۔ رحیم داد ایک تکا اٹھا کر چبانے لگا۔ تکا چٹ پٹا تھا۔ رحیم داد کے منہ کی کڑواہٹ کم ہوگئی۔ تھوڑا سا سرور بھی ہوا مگر وہ یہ جاننے کے لئے بے چین تھا کہ احسان شاہ اُس سے کیا پوچھنا چاہتا ہے۔ اس کے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی تجسس کے ساتھ ساتھ خدشات اور وسوسے بھی تھے۔

احسان شاہ نے رحیم داد کو زیادہ دیر اس ذہنی خلفشار میں مبتلا نہیں رکھا۔ اُس نے قدرے سنجیدگی سے دریافت کیا" چوہدری! توُنے اپنی زمیں داری کا مختار تو اللہ وسایا کو بنا دیا۔ پر یہ بھی پتہ ہے کہ مختار نامے میں لکھا کیا تھا؟"

"یہ تو جی پتہ نہیں، میں نوں انگریزی نہیں آتی۔ مختار نامہ انگریزی میں تھا" رحیم داد نے سادگی سے کہا" وکیل نے جہاں جہاں بتایا، میں نے دستخط لگا دیے" اس کے لہجے میں تجسس پیدا ہوگیا" پر یہ گل تو کیوں پوچھ رہا ہے؟"

"لگتا ہے تو اپنی زمیں داری کے بارے میں لکھا پڑھی کے سارے کام منشی یا کاردار کے

ذریعے کرا تار ہا ہے۔ تجھے اس پر پورا پورا بھروسہ بھی ہو گا۔ احسان شاہ نے ہنس کر کہا۔" میں نے غلط تو نہیں کہا؟"

"تو نے ٹھیک ہی سوچا، بالکل یہی بات ہے۔" رحیم داد نے احسان شاہ سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی لاعلمی کی پردہ پوشی کی۔

"تبھی تو نے آنکھ بند کر کے ایسی پکّی دستاویز پر دستخط کر دیے۔ مختار نامہ تو سٹامپ پیپر ہی پر ہو گا؟"

"ہاں جی، سٹامپ پیپر ہی پر تھا۔" رحیم داد کے چہرے سے ہلکی ہلکی پریشانی جھلکنے لگی۔" پر تو اس کے بارے میں کیا بتانا چاہتا ہے؟"

"تیں نوں یہ بتانا ہے کہ تو نے یہ غلط کام کیا۔" احسان شاہ نے کہا۔" دستخط کرنے سے پہلے تجھے چاہیے تھا کہ مختار نامہ کسی جان پہچان کے وکیل کو دکھا لیا ہوتا۔ جائداد کی ایسی دستاویزوں پر اس طرح کانونی مشورے کے بغیر دستخط نہیں کیے جاتے۔"

"وہ تو ہو گئے۔ اب تو اس کے بارے میں کیا کہنا چاہتا ہے؟"

"اللہ وسایا نے اگر مختار نامے کی بجائے بیع نامے پر تجھ سے دستخط کروا لیے تو؟" احسان شاہ نے رحیم داد کے ذہن میں شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی مگر رحیم داد نے تذبذب میں مبتلا ہونے کے باوجود اس کا اظہار نہیں کیا۔" نہیں شاہ جی! تیں نوں پتہ نہیں، اللہ وسایا میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔"

"یہ جائداد اور ملکیت بہت ظالم چیز ہوتی ہے۔" احسان شاہ نے وسکی کی چسکی لگاتے ہوئے کہا۔" بھائی کو بھائی کے خلاف، پیو کے خلاف پتّر کو مدّعی اور مدّعا علیہ بنا کر عدالت تک پہنچا دیتی ہے۔ ایسی دشمنی ڈالتی ہے کہ خون ہو جاتے ہیں۔ تو نے بھی ایسے کتنے ہی جھگڑے دیکھے ہوں گے۔" وہ کھل کر مسکرایا۔" اللہ وسایا سے تو تیرا کوئی سگا رشتہ بھی نہیں۔ فیر وہ ایسا کیوں نہیں کر سکتا؟"

"یہ تو ٹھیک ہے کہ جائداد اور زمین کی ملکیت پر سگے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ مکدمے بازی بھی

ہوتی ہے۔ خون بھی ہو جاتے ہیں، پر میں نوں اتنا پتہ ہے، اللہ دسایا ایسا نہیں ہو سکتا،" رحیم داد اپنی بات پر اڑا رہا۔" اچھا یہ بتا، ایسی گل تو نے اللہ دسایا کے بارے میں کیوں سوچی؟"

"ٹھیک ٹھیک سننا چاہتا ہے تو سن لے" احسان شاہ کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔ "میں نوں پتہ چلا ہے کہ اللہ دسایا نے تجھ سے بیع نامے ہی پر دستخط کرائے ہیں۔ وہ زمین اور حویلی کی ملکیت اپنے نام کرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرا منیجر مہربان علی ایک کیس کی پیروی کے سلسلے میں کل شہر گیا تھا۔ وہیں صدر دفتر کے ایک محرر نے اُسے یہ گل بتائی۔ اللہ دسایا بھی وہاں موجود تھا۔ اُس کا وکیل کوشش کر رہا ہے کہ کام چھیتی نال پورا ہو جائے۔"

"تیرے منیجر نے غلط بتایا،" رحیم داد نے احسان شاہ کی اطلاع درست تسلیم نہیں کی۔" اللہ دسایا تو کیمبل پور میں ہے اور میں نوں پتہ ہے کہ اس کا شہر میں رکنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ وہ تو ابھی تک کیمبل پور ہی میں ہوگا۔ وہاں سے سیدھا اپنے پنڈ آئے گا۔"

"تو بھی ٹھیک کہہ رہا ہے۔" احسان شاہ نے اُس سے اُلجھنے کی کوشش نہیں کی۔" اللہ دسایا نے یہی بتایا ہوگا۔ پر میرا منیجر مجھ سے غلط بات نہیں کہہ سکتا۔" اُس نے پہلو بدلا۔" یہ بتا، تو جسے مختار نامہ بتاتا ہے، اُس کی تیرے پاس کوئی نقل شکل بھی ہے؟"

"وہ تو جی میرے پاس نہیں ہے۔ نہ میں نے مانگی اور نہ وکیل نے مجھے دی۔ میں نے اُس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔" رحیم داد نے کہا۔" برا نہ منانا شاہ جی! تیری گل سمجھ نہیں آتی۔ اگر اللہ دسایا کے دل میں کھوٹ ہوتی تو وہ حویلی اور زمین کے الاٹمنٹ کے بعد پنڈ کے سارے مزارعوں اور کمیوں کو اکٹھا کر کے یہ بات سب کو صاف صاف نہ بتاتا۔ تیں نوں پتہ نہیں، اُس نے ایسا ہی کیا تھا۔"

"تیرا مطلب ہے، میں جھوٹ بول رہا ہوں؟" احسان شاہ بھڑک اٹھا۔" چوہدری! تیں نوں معلوم نہیں، تو کس سے بات کر رہا ہے۔ پہلے میں آنریری مجسٹریٹ ہوتا تھا۔ عدالت لگاتا تھا۔ مقدموں کے فیصلے سناتا تھا، پر میں نے خود ہی مجسٹریٹی چھوڑ دی۔ زمیں داری کے بکھیڑے کیا تھوڑے تھے جو اس بکھیڑے میں پڑا رہتا۔ بہت اصرار کیا پر میں راضی نہ ہوا۔ دوسرے اس کے لیے جانے کیسی کیسی کوشش کرتے ہیں۔ منتیں کرتے ہیں۔ سفارشیں پہنچاتے ہیں۔" اُس نے جھنجلا کر منہ

بگاڑا۔" میں نوں تیری جائداد، ملکیت سے کیا لینا میرے پاس کچھ کم مربعے ہیں؟"

رحیم داد اس کی برہمی سے سخت مرعوب ہوا۔ لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا" شاہ جی! تو میری بات کا غلط مطلب سمجھا؟"

"تیرا مطلب کچھ ہی ہو۔ گل اصلی ایہہ ہے کہ میں یاری کرتا ہوں تو اُسے نبا ہنا بھی ہوں۔ اب یہی دیکھ میں نوں جیسے ہی مہربان علی سے معلوم ہوا، فوراً تجھے بلایا اور سب کچھ بتا دیا تاکہ تو ہوشیار ہو جائے۔ اگے تیری مرضی۔"

"شاہ جی! یہ تیری مہربانی ہے۔" رحیم داد کے لہجے سے خوشامد صاف جھلک رہی تھی۔

احسان شاہ یہی سننا بھی چاہتا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی خشونت مٹنے لگی۔ اس نے سنجیدگی سے کہا" ویسے تیں نوں یہ بتا دوں کہ مہربان علی پٹواری سے ملا تھا۔ اُس نے رجسٹر خسرہ گرداوری دیکھا ہے۔ ابھی تک انتقالات تیرے ہی نام ہیں۔" احسان شاہ نے وسکی کا بڑا گھونٹ بھرا، شیدا کو بلایا اور کھانا چننے کی ہدایت کی۔

کھانے سے فارغ ہو کر احسان شاہ نے رحیم داد کو روکنا چاہا مگر رحیم داد رضامند نہیں ہوا۔ اُسے خدشہ تھا کہ وہ صبح واپس گیا تو دارا پھر نہ مل جائے۔ رحیم داد نے جب سے دارا کو دیکھا تھا، سخت پریشان تھا۔ دارا خطرہ بن کر اس کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ اس نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ ہو سکتا ہے، دارا اُسے پہچان نہ سکا ہو۔ وہ منہ موڑ کر تیزی سے گھوڑا دوڑاتا اُس کے پاس سے نکل گیا تھا۔ اب وہ دوبارہ ایسا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ احسان شاہ کے اصرار کے باوجود وہ نہیں ٹھہرا۔

جب وہ اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر واپس ہوا تو آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی۔ صاف شفاف آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔ ہر طرف اُجلی اُجلی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ رحیم داد نہر کے ساتھ ساتھ گھوڑی دوڑانے لگا اور رفتار بتدریج تیز کرتا گیا۔

وہ کوٹلہ ہرکشن میں داخل ہوا تو رات ڈھل رہی تھی۔ مہمان خانے میں پہنچا تو احمد نے دروازہ کھول کر رحیم داد کو پہلی خبر یہ سنائی کہ اللہ وسایا سرِ شام ہی واپس آگیا تھا۔

رحیم داد پریشان ہوگیا۔ وہ شراب کے نشے میں چور تھا اور سیدھا احسان شاہ کے پاس سے آرہا تھا۔ اُس نے سوچا، اگر اس وقت اللہ وسایا کی آنکھ کھل گئی اور وہ اس سے ملنے مہمان خانے میں آگیا تو بڑی مشکل ہو جائے گی لہٰذا اس نے احمد سے بات چیت نہیں کی، جو کچھ اس نے کہا خاموشی سے سن لیا۔ کپڑے تبدیل کیے۔ شلوار اتار کر دھوتی باندھی اور چپ چاپ بستر پر لیٹ گیا مگر اُسے جلد نیند نہیں آئی۔ وہ دیر تک احسان شاہ کی بات پر غور کرتا رہا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہو رہے تھے۔ وہ برابر یہ کوشش کرتا رہا کہ اللہ وسایا کے بارے میں کوئی بدگمانی دل میں نہ آنے دے مگر شبہات بار بار سر اٹھاتے اور دماغ میں کھلبلی مچا دیتے۔ اسی ذہنی انتشار میں وہ سو گیا۔

سویرے سویرے اللہ وسایا مہمان خانے میں آگیا۔ "چوہدری! رات کہاں رہا؟ میں تو تیرے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد پہنچ گیا تھا۔ پتہ چلا کہ تو گھوڑی پر بیٹھ کر نہر کی طرف گیا تھا۔ میں دیر تک انتظار کرتا رہا۔"

رحیم داد اس سوال کے لئے خود کو پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولا۔ "تو چلا گیا تو اکیلے میں جی بہت گھبرایا۔ تیں نوں پتہ ہے، اپنا یہاں اور کوئی میل جول کا نہیں۔ کل شام گھوڑی پر بیٹھ کر دل بہلانے نہر کی طرف نکل گیا۔ رستے میں ایک پرانا جاننے والا مل گیا۔ ضد کر کے اپنے گھر لے گیا۔ عالم پور کے نزدیک اُس کا پنڈ ہے۔ ڈیڑھ سو کلا کے لگ بھگ زمین داری ہے۔ مزے سے گزر بسر ہو رہی ہے۔ رات کی روٹی بھی میں نے اُس کے ساتھ کھائی۔ بعد میں گپ شپ لگی تو آدھی رات ہو گئی۔ وہ تو روکتا تھا پر میں نہ رکا۔"

"تو پہلے بھی تو ایک رات اسی کے ہاں ٹھہرا تھا۔" اللہ وسایا نے کرسی پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کوئی پرانا یار لگتا ہے۔ پر تو نے پہلے اُس کا ذکر نہیں کیا؟"

رحیم داد نے یہ سنا تو حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا کہ احمد نے اللہ وسایا کو اس کے بارے میں ایک ایک بات کی رپورٹ پہنچا دی تھی۔ اُس نے اپنی جھنجلاہٹ دبا کے جھٹ بات بنائی۔ "مجھے تو پہلی بار پتہ چلا کہ وہ اِدھر ہے، برسوں بعد ملا تھا۔ شکور نام ہے اُس کا۔ پٹیالہ کا مہاجر ہے۔ جن

دنوں میں خوشاب میں ہوتا تھا، وہ ساتھ ہی کے مکان میں رہتا تھا۔" وہ اطمینان سے جھوٹ پر جھوٹ بولتا رہا۔ "پچھلی بار تو اس لیئے اُس کے پاس ٹھیرنا پڑا کہ اچانک برکھا شروع ہو گئی، ساری رات ہوتی رہی۔ ایسے میں کیسے واپس آسکتا تھا۔"

"اچھا کیا، تو اُدھر ہی ٹھیر گیا۔ بارش میں تو سارے ہی رستے خراب ہو جاتے ہیں۔" اللہ وسایا نے کہا۔" برسات کی اندھیری راتوں میں تو ان کچے رستوں پر ہرگز سفر نہیں کرنا چاہیے۔"

رحیم داد نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے پوچھا "گھر والی اور بچے بھی تیرے ساتھ ہی واپس آگئے یا ابھی کیمبل پور ہی میں ہیں؟" اُس نے قدرے توقف کیا۔" تو کچھ جلدی نہیں آگیا؟"

"ہاں جی، میں جلد ہی آگیا۔ کیمبل پور میں گرمی بہت تھی۔ اُدھر اب تک بارش نہیں ہوئی۔ میں تو بہت گھبرا گیا تھا۔" اللہ وسایا نے بتایا "پر جمیلہ جلد آنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ تو جاتے ہی ویاہ کی ریتاں رسماں میں ایسی الجھی کہ اُس سے ملنا ہی نہ ہوتا تھا۔ وہ تو ویاہ کے بعد بھی وہاں کچھ روز ٹھیرنا چاہتی تھی پر میں ضد کر کے اُسے اور بچوں کو اپنے ساتھ ہی لے آیا۔"

"ویاہ تو ٹھیک ٹھاک ہو گیا؟"

"ہاں جی، سب ٹھیک ٹھاک رہا۔" اللہ وسایا نے جواب دیا۔" جمیلہ نے سارے کام کاج ایسے اچھی طرح کیے کہ شرفاں کے سسرال والے خوش ہو گئے، اتنے خوش کہ چوہدری، میں تجھے کیا بتاؤں۔ انہوں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنی دھوم دھام سے ویاہ ہو گا۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "اُدھر جمیلہ بھی بہت خوش تھی۔ جب ملی ہنستی، مسکراتی ملی۔ اُسے تو مزا آرہا تھا۔ پر اپنا جی اکتا گیا۔ کچھ ضروری کام بھی کرنے تھے۔"

آخری جملہ سُن کر رحیم داد چونکا۔ معاً اُسے وہ بات یاد آگئی جو گزشتہ شب احسان شاہ نے اللہ وسایا کے بارے میں بتائی تھی۔ اُس نے اللہ وسایا کو ٹٹولنے کی غرض سے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "تو پرسوں شہر میں تھا؟ واپسی میں وہاں بھی ٹھیرا تھا؟"

اللہ وسایا نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔" ٹھیرا تو تھا پر تیں نوں کیسے پتہ چلا؟"

"شکور ہی نے بتایا تھا۔ وہ بھی اس روز شہر میں تھا"۔ رحیم داد نے بات نباہنے کی کوشش کی۔
"پر میں تو اسے بالکل نہیں جانتا"۔ اللہ وسایا بدستور حیرت زدہ تھا۔
"تو اُسے نہیں جانتا پر وہ تو تجھے جانتا ہے"۔ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ اُس کے لہجے سے خوشامد عیاں تھی۔ "تُو اتنا وڈا زمیں دار ہے، تجھے ادھر کا کون بندہ نہیں جانتا۔ زمیں دار تو سب ہی جانتے ہیں"۔ اُس نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "وہ تجھ سے بہت ملنا چاہتا ہے۔ تُو کہہ تو اُسے کسی روز بلوا لوں؟"
"ضرور بلوا لے۔ تیرا پرانا ملنے والا ہے۔ اچھا ہی بندہ ہو گا"۔ اللہ وسایا نے اُس کی حوصلہ شکنی نہیں کی۔
"میں کسی روز اُس کی طرف جاؤں گا اور اپنے ساتھ ہی لیتا آؤں گا۔ اُس سے مل کر تُو خوش ہی ہو گا"۔
اللہ وسایا نے شکور کے ذکر میں دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ بات کا رُخ شرفاں کی شادی کی جانب موڑ دیا اور اس میں جمیلہ کی سرگرمی اور انہماک مسکرا مسکرا کر بیان کرتا رہا۔ اُس کے طرزِ اظہار سے بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ جمیلہ نے اُس کی پھوپھی زاد بہن کے بیاہ میں جوش و خروش کا جو مظاہرہ کیا تھا، وہ اُس سے بہت خوش تھا۔ وہ کچھ دیر تک بیٹھا شرفاں کی شادی کے ہنگاموں کا ذکر کرتا رہا پھر کھڑا ہو گیا۔
اُس کے جانے کے بعد رحیم داد فکر مند ہو گیا۔ سوچنے لگا، احسان شاہ نے گزشتہ شب جو کچھ بتایا تھا، وہ درست تھا؟ کیا اللہ وسایا نے وکیل کے ساتھ ساز باز کر کے مختار نامے کے بجائے اُس سے بیع نامے پر دستخط کرائے ہیں؟ کیا وہ حویلی اور زمین دوبارہ اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش کر رہا ہے؟ واپسی میں اُس نے شہر میں ایک روز کیوں قیام کیا تھا؟ اور وکیل کے ہمراہ صدر دفتر کس لئے گیا تھا؟
یہ اور ایسے کتنے ہی سوالات اُس کے ذہن میں اُبھرتے رہے، ڈوبتے رہے۔

رحیم داد مخمصے میں پڑ گیا اور تمام وقت اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہا۔

☆

برسات کی سہانی شام تھی۔ گہرا نیلا آسمان آئینے کی مانند جھلک رہا تھا۔ بھیگی بھیگی ہوائیں سرسراہٹ تھی۔ درخت اور پودے جھوم رہے تھے۔ گھاس میں لہریں اٹھ رہی تھیں۔ باغ میں رحیم داد کے ساتھ اللہ وسایا بیٹھا تھا۔ جمیلہ بھی موجود تھی۔ وہ نہا دھو کر آئی تھی۔ شگفتہ اور نکھری نکھری نظر آ رہی تھی۔ موسم کی مناسبت سے وہ دھانی کرتا اور اسی رنگ کی شلوار پہنے ہوئے تھی۔ البتہ چندری رنگ برنگی تھی مگر اُس پر سبز دھاریاں بہت نمایاں تھیں۔ ہر طرف پھیلی ہوئی ہریالی کے پس منظر میں اُس کی خوبصورتی میں تابندگی تھی، ایک نئی سج دھج تھی۔ رحیم داد نے اُسے دیکھا تو سینے میں دھواں سا اُٹھتا محسوس کیا۔ وہ مبہوت ہو کر ایک ٹک اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

جمیلہ کا ہر انداز صاف چغلی کھا رہا تھا کہ اُسے اپنی دل کشی اور رعنائی کا پورا پورا احساس ہے۔ رحیم داد کی بہکی بہکی نظریں دیکھ کر وہ مسکرائی۔ اُس کے گلابی ہونٹ تازہ پھول کی پنکھڑیاں بن گئے۔ اُس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر پوچھا "چوہدری! کل رات تو کدھر رہا؟"

اللہ وسایا نے رحیم داد کے جواب دینے سے پہلے ہی ہنس کر کہا "جمیلے! اصلی گل ایہہ ہے، اکیلے اس کا جی گھبراتا ہے۔" اُس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا "چوہدری! اب تو ویاہ کر لے۔ اس طرح کب تک گزارا ہو گا۔ اٹھ سال تو ہو گئے گھر والی اور بچوں کو ڈھونڈتے ہوئے۔ جانے وہ پاکستان پہنچے بھی کہ نہیں۔"

"ہاں جی، لاکھوں ہی خاندان اور برادار بکھر کے ایسے اُجڑے کہ کسی کو کسی کا کچھ پتہ نہیں۔" جمیلہ بولی۔ اُس کا دبا ہوا غم ابھرا اور سورج کی مانند دمکتے چہرے پر بادل کا ٹکڑا بن کر پھیل گیا۔ "ہر ایک کو نئے سرے سے اپنا جیون شروع کرنا پڑا۔"

"کہنی تو ٹھیک ہی ہے۔" رحیم داد نے گہری سانس بھری "پر اب تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی سُفنہ دیکھ رہا ہوں۔"

"کب تک ایسے سُفنے دیکھتا رہے گا۔" اللہ وسایا بولا "ابھی تو جوان ہے۔ نیں توں اب

اگے کی فکر کرنی چاہیے۔"

"یہ کام تو تیں نوں ہی کرنا ہوگا اللہ وسایا۔" جمیلہ نے مشورہ دیا۔

"میں تو اس بارے میں اسی روز سے سوچ رہا ہوں، جب سے چوہدری کے نام حویلی اور زمین کا الاٹمنٹ ہوا ہے۔"

"ہاں، اب تو اسے یہیں رہنا ہے۔ گھر بھی بسانا ہوگا۔" جمیلہ نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔

"چوہدری! تو برسوں اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا، اب وہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ سمے آگیا ہے کہ تو اگے کے لیے سوچ۔"

"سچ پوچھ، میں نے تو اس بارے میں ابھی تک سوچا ہی نہیں۔"

"تو نے نہیں سوچا تو کیا ہوا، اللہ وسایا کو تو سوچنا چاہیے۔" جمیلہ نے اللہ وسایا کی جانب دیکھا۔ وہ سر جھکائے کسی گہری سوچ میں اُلجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ جمیلہ نے اُسے اس عالم میں پایا تو مسکرا کر پوچھا۔ "اللہ وسایا! تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

"چوہدری کے لیے رشتے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"کوئی ہے رشتہ تیرے سامنے؟" جمیلہ نے دریافت کیا۔

"چوہدری کے لئے رشتے تو کئی تلاش کرنے پر مل سکتے ہیں۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "پر ایک رشتہ ٹھیک لگتا ہے۔ اُسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"اللہ وسایا! تیری گل سن کر مجھے ڈر لگتا ہے۔" رحیم داد نے کہا۔

اللہ وسایا حیرت سے اُس کا منہ تکنے لگا۔ "ڈر کیوں لگتا ہے؟"

"تیری گل مجھے بھی سمجھ نہیں آئی۔" جمیلہ بھی حیرت زدہ نظر آ رہی تھی۔

"صاف صاف بتا، تو کہنا کیا چاہتا ہے؟" اللہ وسایا نے پوچھا۔

"دیکھ، ابھی تو میرے اور تیرے درمیان بہت پیار ہے۔ تیرا گھر مجھے اپنا ہی گھر لگتا ہے۔ برسوں بعد مجھے ایسا لگا کہ میرا بھی کوئی ایسا ٹھکانا ہے، جہاں میں آرام سے رہ سکتا ہوں۔" رحیم داد ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔ "سوچتا ہوں، بعد میں شاید تیرے ساتھ یہ پیار محبت نہ رہے۔ پتہ نہیں کیسی

وہٹی، میری گھر والی بن کر آئے۔ ہمارے اتنے اچھے میل جول کا ناس مار دے۔ ایک دوسرے سے دور کر دے۔" اُس نے اللہ وسایا کو بغور دیکھا۔" ایسا بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"چنتا نہ کر چوہدری!" جمیلہ نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔" اپنا من اُجلا ہے اور وڈّا بھی ہے۔ ایسے ہی مل جل کر رہیں گے تو آگے بھی گزارا ہو جائے گا۔" وہ کھل کر مسکرائی، مڑ کر اللہ وسایا کی جانب دیکھا۔" یہ تو بتا اللہ وسایا! تو نے چوہدری کے لئے کہاں رشتہ سوچا ہے؟ پہلے تو کبھی اس بارے میں گل نہیں کی؟"

"وہ ایسا ہوا جمیلے! کیمبل پور سے واپسی میں تو زنانیوں کے ڈبے میں تھی۔ میرے ساتھ ملتان کا ایک زمیں دار، چوہدری اکرم سفر کر رہا تھا۔" اللہ وسایا نے بتایا۔" وہ پشاور سے آ رہا تھا۔ ۶۰ برس سے اوپر ہو گا۔ نیک اور اچھا بندہ ہے۔ تحصیل کبیر والا کے احمد پور پنڈ میں اس کی زمیں داری ہے۔"

"جات برادری کے بارے میں کچھ اتا پتہ ہے۔" جمیلہ نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔" اللہ وسایا نے مسکرا کر کہا۔" اُس سے پہلی بار نہیں ملا، پرانی جان پہچان ہے۔ اپنے وکیل محمد عثمان رندھاوا نے اُس سے ملوایا تھا۔ اکرم اُس کا بھی موکل رہ چکا ہے۔ کئی بار اُس سے وکیل کے دفتر میں ملنا ہوا۔ وہ بھی جاٹ ہے اور رساہو ہے۔ لگتا ہے، اُس کے وڈیرے اور بزرگ پہلے منٹگمری میں رہے ہوں گے۔ ملتانی اور جھٹکی سے زیادہ وہ اپنی طرح پنجابی بولتا ہے۔ اسی سے میں نے اندازہ لگایا۔"

"ویسے تجھے پتہ نہیں، کبیر والا اور پوری میلسی میں جھٹکی اور ملتانی سے زیادہ پنجابی کا رواج ہے پر اُدھر جلال پور اور لودھراں میں ملتانی ہی چلتی ہے۔ کوئی اُسے جھٹکی کہتا ہے، کوئی اُچّی۔" جمیلہ نے بات کا رخ بدلتے ہوئے دریافت کیا۔" تو نے یہ بھی معلوم کیا، کڑی کی عمر کتنی ہے بھائی بھین کتنے ہیں؟"

"نہ اُس کا کوئی بھائی ہے، نہ بھین۔ یوں سمجھ لے، اپنی شرفاں کی طرح ہے۔ فرک صرف اتنا ہے کہ اُس کا پیو زندہ ہے۔" اللہ وسایا نے جواب دیا۔" پر ایک گل ذرا سوچنے کی ہے۔"

"وہ بھی بتا دے۔ تو چبا چبا کر کیوں بول رہا ہے؟" جمیلہ نے ہنس کر کہا۔

"گل صاف صاف ایہہ ہے کہ اُس کا پہلے بھی ایک ویاہ ہو چکا ہے پر کوئی بال بچہ نہیں۔ وہ چھ مہینے بھی سسرال میں نہیں رہی۔" اللہ وسایا نے کسی قدر جھجکتے ہوئے بتایا۔ "اُس کا گھر والا اچھا بندہ نہیں تھا، مار پیٹ کرتا تھا، اوپر سے ایک کنجری سے بھی یاری لگا رکھی تھی۔ جب اُس نے بہت تنگ کیا تو اکرم نے کاغذ لکھوا لیا، دھی کو اپنے گھر لے آیا۔"

"ضرور تنگ کرتا ہوگا اُس کا گھر والا۔" رحیم داد بولا۔ "ملتانیوں میں نن کھلا مشہور ہے۔ مطلب یہ کہ جیسے گھوڑی کے لئے گھاس ضروری ہے، ویسے ہی زال یا گھر والی کے لیے جتی سے پٹائی۔"

"فضول باتیں نہ کر۔" جمیلہ نے تڑپ کر تیکھے لہجے میں اُسے ٹوکا۔ "پتہ نہیں، تو نے کہاں سے یہ کہاوت سن رکھی ہے۔ میری چھوٹی ماسی ملتان شہر میں رہتی تھی، وہاں کھتریوں کے وڈے وڈے کنبے اور پروار آباد تھے۔ میرا موسا، رلئے زادہ رام چند، کھتا گھرانے کا تھا۔ مشہور خاندان ہوتا تھا۔ رائے زادہ کو تو میں نے دیکھا نہیں، اُس کا تو میرے پیدا ہونے سے پہلے دیہانت ہو چکا تھا۔ وہ اپنے زمانے کا بہت مشہور رئیس تھا۔ آنریری مجسٹریٹ بھی تھا۔" اُس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "تجھے تو میں پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ میں موسی کے گھر ملتان اکثر جاتی تھی۔ ہفتوں اُس کے پاس رہتی۔ میرا موسا اتنا اچھا تھا کہ چوہدری، تجھ سے کیا بتاؤں۔ موسی سے تو بہت ہی زیادہ پیار کرتا تھا۔ وہ تھی بھی بہت سندر۔" جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اب تو ملتان کے سارے ہی کھتری محلے اُجڑ گئے۔ میری موسی کا گھر بھی برباد ہو گیا۔ سنا ہے اب وہ بمبئی میں ہے۔ اس بات کو سنے ہوئے بھی ایک جگ بیت گیا۔ جانے زندہ ہے یا وہ بھی سورگ باشی ہو گئی۔"

جمیلہ کے دل کش چہرے پر دکھ کے سائے منڈلانے لگے۔ رحیم داد نے اُسے اس طرح افسردہ پایا تو صفائی پیش کرنے کے انداز میں بولا۔ "رئیس دا رانی! تو برا نہ منا۔ میں نے تو ملتانیوں کے بارے میں صرف سنا ہی سنا ہے۔ اُس ضلع میں تھوڑے ہی دن رہا ہوں۔ وہاں کے بارے میں زیادہ پتہ نہیں۔"

"ویسے جی ایسی باتیں اور کہاوتیں ہر شہر اور ضلع کے بارے میں مشہور ہیں۔" اللہ وسایا نے

کہا۔" اچھا جی! اب کام کی گل ہو جائے"۔ اُس نے جمیلہ کی جانب پیار بھری نظروں سے دیکھا۔" جمیلے! میں تو یہ جانتا ہوں کہ چوہدری اکرم بہت بھلامانس ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اُس کی زندگی ہی میں وصی کے لئے کوئی اچھا در مل جائے۔ ٹرین میں مجھ سے یہی گل کرتا تھا۔ بے چارہ بیمار بھی رہتا ہے وصی کی طرف سے بہت پریشان ہے۔ کہتا تھا مجھے تو یہ فکر کھائے جاتی ہے کہ میرے مرنے کے بعد اُس کا کیا بنے گا۔ برادری اور کنبے والے اچھے بندے نہیں۔ زمین داری پر کبضہ کرنے کے لیے بعد میں جانے کیا کریں۔"

" پر میں پہلے کڑی کو دیکھوں گی۔ اس کے بناں کیسے فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ خود کبیر والا جاؤں گی"۔ جمیلہ نے اپنا عندیہ بیان کیا۔

" تو ضرور کبیر والا چل۔ میں بھی چلوں گا۔ چوہدری بھی ساتھ ہو گا"۔ اللہ دسایا نے جمیلہ کی تائید کی۔

" مجھے سے جا کر کیا کرے گا۔ تو اور جمیلہ جو بھی طے کریں گے، مجھے منظور ہو گا"۔ رحیم داد نے کبیر والا جانے سے انکار کر دیا۔

" ایسا کیسے ہو سکتا ہے"۔ جمیلہ نے اُس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔" چوہدری! تجھے تو چلنا ہی پڑے گا۔ اکرم سے تیری ملاقات ہونی ضروری ہے تاکہ وہ بھی تجھ سے مل کر اپنا اطمینان کر لے۔ وہ پہلے ہی چوٹ کھایا ہوا ہے۔ اس بار پوری طرح سوچ بچار کرنے کے بعد رشتہ طے کرے گا"۔

" چوہدری! اگر رشتہ ٹھیک ٹھاک ہو تو میں تجھے یہی کہوں گا کہ تو ضرور ویاہ کر لے"۔ اللہ دسایا نے اصرار کیا۔

رحیم داد خاموش رہا لیکن جمیلہ خاموش نہیں رہی، مسکرا کر بولی:" پہلے کبیر والا چلنے کا پروگرام بنا۔ اس کے بعد آگے طے ہو گا۔ بول، کب چلنے کا ارادہ ہے؟"

" ابھی تو کیمبل پور سے لوٹی ہے، ذرا دم تو لینے دے"۔

" کیمبل پور کی بات دوسری تھی"۔ وہ پچھم کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولی:" کبیر والا تو یہ رہا۔ منٹگمری سے خانیوال کے لیے ٹرین پکڑیں گے اور خانیوال سے کبیر والا دور ہی کتنا ہے۔ پکی

سڑک جاتی ہے۔ ویسے تو یہاں سے بھی سڑک کے رستے جا سکتے ہیں پر برکھا میں لاریوں کا سفر کٹھن ہوتا ہے۔ تجھے پتہ نہیں، میں پہلے بھی ایک بار کبیر والا جا چکی ہوں۔ پر اب تو اس بات کو برسوں ہو گئے۔"

"یہ بتا، تو کہاں نہیں گئی۔" اللہ وسایا نے ہنس کر کہا۔ "اچھا، تو ہی بتا، کب چلنا ہے؟"

"آج سوم وار ہے۔" جمیلہ چند لمحے سوچتی رہی۔ "جمعرات کی صبح روانہ ہو جائیں گے۔ جمعے کو کبیر والا ٹھہریں گے۔ سنیچر کی رات لوٹ آئیں گے۔ ٹھیک رہے گا پروگرام؟"

"مجھے نہ لے جا تو اچھا ہے۔" رحیم داد نے ایک بار پھر کترانے کی کوشش کی۔

"ویاہ تجھے ہی کرنا ہے نا؟" جمیلہ نے کہا۔ "تو نہیں جائے گا تو کیسے کام بنے گا۔ اکرم نے تجھے بھی دیکھنا ہوگا۔ تو موجود رہے گا تو جلد ہی رشتہ طے ہو جائے گا۔ بار بار چکر نہیں کاٹنا پڑے گا۔" وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ "دوبارہ جائے گا تو دلہنی کو بیاہ کر اپنے ساتھ ہی لائے گا۔" رحیم داد نے کچھ کہنا چاہا۔ جمیلہ نے اُسے روک دیا۔ "اب تو چپ کر کے بیٹھا رہ۔ مجھ پر وشواس رکھ۔ تیرے لئے اچھی سی گھر والی لاؤں گی۔ تجھے اس بارے میں چنتا کرنے کی ضرورت نہیں۔"

رحیم داد چپ رہا۔ جمعرات کی روانگی طے ہو گئی۔ نوکروں نے کھانا چن دیا۔ کھانے پر بھی رحیم داد کی شادی کے بارے میں بات چیت ہوتی رہی۔ اللہ وسایا سے زیادہ جمیلہ نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی۔ رحیم داد چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔ وہ شادی کرنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆

جمعرات کو تاروں کی چھاؤں میں اللہ وسایا، جمیلہ اور رحیم داد کبیر والا کے لیے روانہ ہو گئے۔ جمیلہ نے اس دفعہ دونوں بچوں کو ساتھ نہیں لیا۔ انہیں نوکرانیوں کی نگرانی میں چھوڑ دیا۔ اللہ وسایا نے ایک روز پیشتر اپنا ایک ملازم چودھری اکرم کے گاؤں احمد پور بھیج دیا تھا تاکہ وہ تینوں کی آمد سے اُسے مطلع کر دے۔

رحیم داد سفر پر روانہ تو ہو گیا مگر کسی قدر گھبرایا ہوا تھا۔ وہ طرح طرح کے خدشات اور وسوسوں میں مبتلا تھا۔ پاک پتن روڈ پر پہنچ کر وہ لاری میں سوار ہوا تو اور زیادہ سہما ہوا نظر آنے لگا۔ اللہ وسایا اور جمیلہ نے بار بار اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑیں مگر وہ مختصر جواب دے کر خاموش ہو جاتا۔

منٹگمری اسٹیشن پہنچنے پر معلوم ہوا کہ گاڑی آنے میں دو گھنٹے کی دیر ہے۔ اللہ وسایا اور جمیلہ کے ہمراہ رحیم داد بھی ویٹنگ روم میں چلا گیا۔ وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھا تھا کہ ایک انسپکٹر دو کانسٹیبلوں کے ہمراہ داخل ہوا۔ اُسے دیکھتے ہی رحیم داد کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ کچھ دیر سہما ہوا بیٹھا رہا پھر اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

ویٹنگ روم سے نکل کر وہ پلیٹ فارم پر اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ بار بار خوف زدہ نظروں سے ویٹنگ روم کی طرف دیکھتا جاتا۔ پولیس والے ویٹنگ روم کے اندر ہی تھے۔ رحیم داد ٹہلتے ٹہلتے پلیٹ فارم کے آخری سرے تک پہنچ گیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے۔ ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ گرمی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ رحیم داد کو پیاس محسوس ہوئی۔ پانی پینے کے لیے وہ نلکے کی جانب چلا۔ سامنے سے ایک نوجوان عورت آتی نظر آئی۔ وہ سفید دھوتی باندھے ہوئے تھی۔ نیلی قمیص کے اوپر سیاہ دوپٹہ تھا۔ عورت نے رحیم داد کو بغور دیکھا اور ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔

رحیم داد نے اُسے فوراً پہچان لیا۔ وہ شاداں تھی۔ اُس کے سر پر گٹھڑی تھی۔ اُس کی چال میں وہی پہلی سی آن بان تھی، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ جسم بدستور مضبوط اور کسا ہوا تھا لیکن اب وہ کسی قدر دُبلی ہو گئی تھی۔ چہرے کی رنگت بھی خاصی ماند پڑ گئی تھی۔ رحیم داد نے اُسے دیکھا تو سراسیمہ ہو گیا۔ وہ عین اُس کے سامنے تھی۔ رحیم داد نے چاہا کہ کترا کر اُس کے قریب سے گزر جائے مگر وہ ٹھٹکی اور اس طرح کھڑی ہو گئی کہ رحیم داد کو بھی قدموں کی رفتار روکنی پڑی۔

"گل سن۔" شاداں نے اُسے ٹوکا۔ "لگتا ہے، میں نے تجھے پہلے بھی دیکھا ہے؟"

"پر میں نے تو تجھے کبھی نہیں دیکھا۔" رحیم داد نے بے رُخی سے کہا۔

"ناراض نہ ہو۔" وہ مسکرائی۔ "میں نوں سو چنے دے۔"

رحیم داد نے خود کو سنبھالا۔ یہ سوچ کر گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی کہ اُس نے لالی

کے ہمراہ شاداں کے گھر میں ایک دن اور دو راتوں سے بھی کم وقت کے لیے پناہ لی تھی اور اُس وقت اُس کی وضع قطع بھی قطعی مختلف تھی ۔ عالم یہ تھا کہ جسم پر جیل کی میلی کچیلی وردی تھی ۔ حجامت بڑی ہوئی تھی ۔ وہ اُس کے سامنے بھی کم ہی رہا تھا ۔ بیشتر وقت اُس نے کوٹھری میں زمین کھود کر بالا کی لاش دبانے میں گزارا تھا ۔ بالا کو قتل کرنے کے باعث شاداں کے حواس بھی بجا نہیں تھے ۔ بہکی بہکی باتیں کرتی تھی ۔ اب ایک طویل مدّت گزرنے کے بعد وہ دوبارہ ملی تھی ۔ اس عرصے میں رحیم داد بہت سی تبدیلیوں سے گزر چکا تھا ۔ اُس کا حُلیہ اس قدر بدل چکا تھا کہ اُسے شناخت کرنا آسان نہیں تھا ۔

"لگتا ہے میرے بارے میں تیں نوں دھوکا ہوا" رحیم داد نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے مسکرانے کی کوشش کی ۔

"تُو رحیم داد تو نہیں ہے؟" شاداں اُس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولی "ہو بھی نہیں سکتا ۔ اُسے تو مرے ہوئے بھی بہت دن ہو گئے ۔ پتہ نہیں، اُسے کس نے کتل کر دیا" وہ چند لمحے سوچتی رہی ۔ "تو اُس کا بھائی تو نہیں ہے؟ دیکھنے میں ایسا ہی لگتا ہے"

"جانے تُو کس کی گل کر رہی ہے" رحیم داد نے منہ بگاڑ کر چہرے پر جھنجلاہٹ طاری کی ۔

مگر وہ اُس کی جھنجلاہٹ سے متاثر نہیں ہوئی ۔ اپنی حسین آنکھوں کو گردش دیتے ہوئے بولی "میں کسی کو ایک بار دیکھ لوں تو بھولتی نہیں ۔ سچ مان، میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں"

رحیم داد ایک بار پھر گھبرا گیا اور اپنی گھبراہٹ پر پردہ ڈالنے کے لیے بگڑ کر گویا ہوا "پر تُو نے مجھے پہلے کب دیکھا؟" اُس نے آگے بڑھنے کے لیے قدم اُٹھایا ۔

شاداں نے اُسے روکا، نرم لہجے میں بولی "اتنا ناراض نہ ہو ۔ آرام سے گل کر" وہ بے تکلفی سے مسکرائی "تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے، میں نوں دھوکا ہوا پر یہ تو بتا دے، تیرا نام کیا ہے؟"

"چوہدری نور الٰہی" رحیم داد نے جواب دیا ۔

"تب تو ٹھیک ہی سوچا تُو نے ۔ میں نوں دھوکا ہی ہوا" شاداں نے رحیم داد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی "پر تُو کچھ کچھ رحیم داد سے ملتا ہے ۔ میں نوں ایسا ہی لگا تھا"

"کون تھا رحیم داد؟" رحیم داد نے بے نیازی سے پوچھا۔ اُس کے لہجے سے اطمینان جھلک رہا تھا، گھبراہٹ رفع ہو چکی تھی۔

"وہ لالی کا ساتھی تھا۔" شاداں نے بتایا۔ "دونوں جیل میں اکٹھے ہوتے تھے اور جیل سے بھاگے بھی اکٹھے تھے۔ لالی اُسے اب تک یاد کرتا ہے۔"

رحیم داد کے ذہن میں لالی کے لیے کرید پیدا ہوئی۔ اُس نے دریافت کیا۔ "یہ لالی کون ہے؟ اور اب کہاں ہے؟"

"جیل میں ہے۔ پہلے منٹگمری جیل میں ہوتا تھا، اب ملتان جیل بھیج دیا گیا ہے۔ میں اُسی سے ملنے ملتان جا رہی ہوں۔ کل ملاقات کا دن ہے۔"

"تیرا کون لگتا ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"یہ نہ پوچھ۔" شاداں نے گہری سانس بھری۔ "کچھ تو لگتا ہی ہے۔ تبھی تو اس سے ملنے جا رہی ہوں۔" شاداں نے گٹھڑی اتار کر فرش پر رکھ دی۔ پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ اُس کے لہجے سے تھکن کے ساتھ ساتھ افسردگی بھی جھلکنے لگی۔ "ویسے اس کا میرے سوا کوئی بھی نہیں۔"

رحیم داد نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "تو اس کے لیے بہت دکھی معلوم ہوتی ہے۔"

شاداں نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر شاداں نے جھک کر گٹھڑی اٹھائی۔ ایک بار پھر سر پر رکھی اور چپ چاپ ایک طرف چل دی۔ رحیم داد جہاں تھا، وہیں کھڑا رہا۔ وہ شاداں کی جانب دیکھتا رہا۔ شاداں پہلے ہی کی طرح خوب صورت اور طرح دار نظر آ رہی تھی۔ اُس کے گھنے بالوں کی لمبی چوٹی کمر کے نیچے تک لٹک رہی تھی۔

رحیم داد کو لالی یاد آ گیا۔ اُس کے ساتھ گزارے ہوئے دن رات یاد آ گئے۔ وہ عہد و پیمان یاد آ گئے جو دونوں نے ایک دوسرے سے کیے تھے۔ یادوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جو دور تک پھیلتا چلا گیا۔

ٹرین آ گئی مگر وہ لاہور جا رہی تھی۔ رحیم داد نے دور سے دیکھا۔ انسپکٹر ویٹنگ روم

سے نکلا۔ دونوں کانسٹیبل اُس کا سامان اٹھائے عقب سے نمودار ہوئے۔ انسپکٹر اور کانسٹیبل ٹرین میں سوار ہوئے۔ ٹرین لاہور کے لیے روانہ ہو گئی۔

رحیم داد نے اطمینان کی سانس لی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ویٹنگ روم کی جانب بڑھا' اندر پہنچا۔ اللہ وسایا اور جمیلہ اُس کے لیے بے چین نظر آ رہے تھے۔ جمیلہ نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"چوہدری! تُو کدھر چلا گیا تھا؟"

"بیٹھے بیٹھے جی گھبرایا تو پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔" رحیم داد نے بات بنائی۔

"پر تُو بالکل اچانک اٹھ کر چلا گیا، بتایا بھی نہیں، کہاں جا رہا ہے؟" جمیلہ نے گلہ کرنے کے انداز میں کہا۔

رحیم داد کے بولنے سے پہلے اللہ وسایا بول پڑا۔ "تُو تو ہر بات پوچھتی ہے۔ اس نے بتا تو دیا، پلیٹ فارم پر ٹہلنے کے لیے نکل گیا تھا۔" اللہ وسایا بے تکلفی سے مسکرایا۔ "تو کوئی تھانے دارنی لگی ہے کہ یہ ہر کام تجھ سے پوچھ کر کرے۔ آگے بھی تُو نے ایسا کیا تو اس کی گھر والی تجھ سے خار کھانے لگے گی۔ یہ سوچ لے۔"

"لے تُو نے مجھے ابھی سے دوش دینا شروع کر دیا۔" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔

رحیم داد دونوں کی نوک جھونک پر چپ رہا۔ مسکراتا ہوا ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ٹرین آئی تو قلی نے سامان اٹھایا اور تینوں سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں سوار ہو گئے۔ رحیم داد نے کھڑکی سے جھک کر دیکھا۔ شاداں بھی تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں سوار ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ ذرا دیر میں ٹرین روانہ ہو گئی۔

خانیوال کا اسٹیشن آیا تو اللہ وسایا اور جمیلہ کے ساتھ رحیم داد بھی اتر گیا۔ اسٹیشن سے نکلتے ہی انہیں کبیر والا جانے والی لاری مل گئی۔ وہ اس میں سوار ہو گئے۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ بھیگی ہوئی سڑک پر لاری زیادہ تیز رفتار سے نہیں دوڑ رہی تھی مگر جب تینوں کبیر والا کے اڈے پر پہنچے تو بارش رک چکی تھی۔ انہوں نے تانگا کرائے پر لیا اور اس میں بیٹھ کر احمد پور کی جانب روانہ ہو گئے۔

جب وہ احمد پور پہنچے تو جھٹ پٹا ہو چکا تھا۔ چودھری اکرم اپنے دو منزلہ مکان کے باہر اُن کا منتظر تھا۔ وہ اللہ وسایا اور رحیم داد سے بڑی گرم جوشی سے ملا۔ جمیلہ تو گھر کے اندر چلی گئی اللہ وسایا اور رحیم داد کو چودھری اکرم ڈیرے پر لے گیا۔ ڈیرا گھر کے ساتھ ہی تھا۔ اس میں دو کشادہ کمرے تھے۔ آگے کھلا صحن تھا۔ کمروں میں پلنگ بچھے تھے۔ ان پر صاف ستھرے بستر لگے ہوئے تھے۔ بیٹھنے کے لئے کرسیاں اور مونڈھے تھے۔

دونوں کے ڈیرے میں پہنچتے ہی مالیشا آگیا۔ اُس کے ہاتھ میں تیل کی شیشی دبی ہوئی تھی وہ تیل کی مالش اور مساس کے ذریعے سفر کی تھکن اتارنے کے لیے نہایت مستعد نظر آتا تھا مگر اللہ وسایا اور رحیم داد نے مالش کرانے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے نہا دھو کر لباس تبدیل کیا اور صحن میں قرینے سے لگی ہوئی کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ غسل کرنے سے اللہ وسایا اور رحیم داد تر و تازہ ہو گئے تھے۔ ذرا ہی دیر میں نوکر لسی لے کر آگیا۔ دونوں نے ٹھنڈی ٹھنڈی لسی پی۔ بڑا سکون ملا۔

رات کے کھانے پر بات چیت شروع ہوئی۔ اللہ وسایا نے چودھری اکرم سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ صرف ایک روز ٹھہرے گا اور سنیچر کو علی الصباح چلا جائے گا، جو کچھ طے کرنا ہے، جمعے ہی کو طے ہو جانا چاہیے۔ رحیم داد کو چودھری اکرم نیک اور بھلا مانس لگا۔ وہ کم گو اور حلیم الطبع تھا۔ مزاج میں نرمی اور رکھ رکھاؤ تھا۔ اُس نے مہمانوں کی خاطر مدارت میں سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ ہر طرح اُن کی دل داری کی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد بھی باتوں کا سلسلہ جاری رہا مگر شادی بیاہ کے بارے میں کھل کر گفتگو نہ ہوئی۔ چودھری اکرم کے ساتھ رشتے کا ایک چچا زاد بھائی بھی تھا۔ وہ اکرم سے عمر میں بڑا تھا۔ اُس نے کئی بار شادی کے سلسلے میں بات چھیڑی مگر اللہ وسایا نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ وہ جمیلہ سے مشورہ کئے بغیر اس مسئلے پر کوئی بات چیت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ رات گئے محفل برخاست ہوئی۔

سویرے سویرے جمیلہ ڈیرے پر آگئی۔ اللہ وسایا اور رحیم داد کمرے میں ناشتہ کر رہے تھے۔ چودھری اکرم بھی موجود تھا مگر وہ ناشتے میں شریک نہیں تھا۔ جمیلہ کے پہنچنے کے

تھوڑی ہی دیر بعد وہ اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

اللہ وسایا نے جمیلہ سے پوچھا۔" جمیلے! کڑی دیکھی تُو نے، کیسی ہے؟"

"سندر ہے اور سیدھی سادھی بھی ہے۔ عمر میں چوتی پنجھی سے زیادہ نہیں ہوگی۔ چوہدری کے لیے بالکل ٹھیک رہے گی۔" جمیلہ مسکرا مسکرا کر بتاتی رہی۔" دیکھنے میں تو ایسی شرمیلی اور کومل لگتی ہے جیسے اس کا کبھی ویاہ ہی نہیں ہوا۔ پتہ نہیں، اُس کے پہلے گھر والے نے ایسی بھولی بھالی کڑی کو کیوں اتنا تنگ کیا۔" اُس نے منہ بگاڑا۔" گل ایہہ ہے، بعضے مرد ہوتے ہی خراب ہیں۔ انہیں اپنی گھر والیوں کو تنگ کرنے میں سواد ملتا ہے۔ لگتا ہے، اُس کا گھر والا ایسا ہی خراب بندہ تھا۔"

"تیری باتوں سے لگتا ہے کڑی تجھے پسند آگئی۔ ویسے چوہدری اکرم کو تو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ نیک بندہ ہے۔" اللہ وسایا نے سنجیدگی سے کہا۔" تو اس کا مطلب یہ ہوا جی کہ آج اکرم سے بات چیت شروع کی جائے۔"

"تُو نے ابھی تک اس بارے میں گل بات ہی نہیں چھیڑی؟" جمیلہ نے حیرت سے پوچھا۔

"تجھ سے صلاح مشورہ کیے بناں کیسے شروع کرتا۔" اللہ وسایا ہنس کر بولا۔

جمیلہ نے کہا۔" اکرم کا چھرا ابھی تو آیا ہے۔ لگتا ہے، اکرم نے اُسے بات چیت ہی کے لیے بلایا ہے۔ اُس کی گھر والی بھی آئی ہے۔ میری تو اُس سے کھل کر گل بات ہوئی۔ اُس نے اپنے چوہدری کے بارے میں کرید کرید کر ایک ایک بات پوچھی۔ میں نے اُسے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ لگتا ہے، اُس نے اکرم اور اپنے گھر والوں کو بھی یہ باتیں بتا دیں۔ اُن دونوں سے میری زیادہ بات چیت نہیں ہوئی۔ شام کو وہ میرے پاس آئے تھے۔ اکرم تو چپ رہا پر اُس کے چھرے نے کئی باتیں پوچھیں میں نے اُسے بھی ہر بات صفائی سے بتا دی۔"

"اُن کے رویے سے تُو نے کیا اندازہ لگایا؟" اللہ وسایا نے دریافت کیا۔

"مجھے تو دونوں خوش اور مطمئن نظر آئے۔" جمیلہ نے بتایا۔" اکرم کی بھرجائی تو بہت مطمئن لگتی ہے۔ سمجھ لے، وہ لوگ تو تیار ہیں۔"

"تو فیر بات پکی کر لی جائے؟" اللہ وسایا نے استفسار کیا۔

"ضرور کر لے۔ مجھے تو یہ رشتہ ہر طرح پسند ہے۔" جمیلہ نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔
لمحے بھر خاموش رہی پھر اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا اور اُس کی رائے معلوم کرنے کے لیے براہِ راست سوال کیا۔ "بول چوہدری تجھے کیا کہنا ہے۔ تو اپنی مرضی بتا؟"

"میں توں اپنی مرضی کیا بتانا۔" رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔ "میری مرضی تو وہی جان جو تیری اور اللہ وسایا کی ہے۔ تیں نوں پتہ ہے، میں نے اللہ وسایا کو بھائی کہا ہے، پگڑی بدلی۔ وہ بھائی ہے۔ اور تو بھرجائی۔ تم دونوں جو بھی طے کرو گے، مجھے منظور ہوگا۔"

"تب تو آج ہی ساہا ہو جائے۔" جمیلہ خوشی سے چہک کر بولی۔ "میرا من کہتا تھا کہ یہ رشتہ طے ہو جائے گا۔ اللہ وسایا! تجھے پتہ نہیں، میں نے تو سگن کے لیے مٹھائی اور میوے کا بھی بندوبست کر لیا ہے۔ اِدھر آنے سے پہلے نوکر کو سگن کے لیے ضروری سامان لانے خانیوال بھیج دیا ہے۔ دوپہر تک آ جائے گا۔ شام کو سگائی کے لیے کوئی شبھ دن سوچ کر تاریکھ طے کر لی جائے۔"

"ساری تیاری تو کر لی، اب میری اور چوہدری کی مرضی پوچھنے آئی ہے۔" اللہ وسایا نے ہنس کر کہا۔

"ایسے فیصلے زنانیاں ہی کرتی ہیں۔" جمیلہ بھی اللہ وسایا کے ساتھ ہنسنے لگی۔ "تو بات پکی کرنے سے پہلے اکرم سے کہہ دینا، ساہے کے لیے وہ شریکے برادری کے کسی اور کو بلانا چاہے تو بلا لے۔ یہ بات تو اُسے دوپہر کو روٹی کھاتے ہوئے بتا دینا۔ یوں سمجھ لے، آج ویاہ کی تاریکھ طے کر کے ہی جانا ہے۔"

جمیلہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ کمرے سے باہر گئی تو کچھ ہی دیر بعد چودھری اکرم آ گیا۔ اُس سے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ دوپہر ہو گئی۔ نوکروں نے کھانا چن دیا۔ کھانے پر اللہ وسایا اور رحیم داد کے ساتھ چوہدری اکرم اور اس کا چچازاد بھائی بھی شریک ہو گئے۔ رحیم داد تو خاموش بیٹھا رہا مگر اللہ وسایا نے بات چھیڑی اور چوہدری اکرم کو اپنی مرضی سے مطلع کر دیا۔ صاف صاف بتا دیا کہ اُسے اور رحیم داد کو رشتہ منظور ہے۔ اگر وہ بھی اس کے لیے رضامند ہو تو شام کو ساہے

کی رسم کرلی جائے۔ دن تاریخ مقرر کر کے شادی کی تیاری شروع کر دی جائے۔ اکرم اور اُس کے چچازاد بھائی نے اللہ وسایا کی تجویز سے اتفاق کیا۔ اُس کی بات چیت سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس کے لیے ذہنی طور پر پہلے سے تیار تھے۔

دن ڈھلے صحن میں خوب چھڑکاؤ ہوا۔ کرسیاں نکال کر ترتیب سے لگائی گئیں۔ لیمپ کے بجائے پیٹرومیکس روشن کیا گیا۔ جب سب کرسیوں اور چارپائیوں پر بیٹھ گئے تو شادی کی باقاعدہ بات چیت شروع ہوئی۔ یہ ساہا تھا۔ اس میں چودھری اکرم کی طرف سے اُس کا چچازاد بھائی شریک ہوا تھا۔ پڑوس کے گاؤں کے ایک زمیں دار کو بھی اکرم نے بلا لیا تھا۔ وہ چودھری اکرم کا ہم عمر ہی تھا۔ اُس کے انداز میں معاملہ فہمی اور رکھ رکھاؤ تھا، بات چیت بھی سلجھی ہوئی کرتا تھا۔

گفتگو کے دوران کسی بھی مرحلے پر اُلجھن یا تلخی پیدا نہیں ہوئی۔ ہر بات خوش اسلوبی سے طے ہوگئی۔ چودھری اکرم نے بات چیت کے آغاز ہی میں اپنی اس خواہش کا صاف گوئی سے اظہار کر دیا تھا کہ نکاح سادگی سے ہوگا اور رخصتی بھی خاموشی سے ہوگی۔ نہ کوئی دھوم دھڑکا ہوگا، نہ شادی کی دوسری رسمیں ہوں گی۔ براتیوں کی تعداد بھی مختصر ہوگی۔ چودھری اکرم کی بات معقول تھی لہذا اللہ وسایا نے مطلق حجت نہیں کی۔ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ دیہات میں، خاص طور پر جاٹوں میں بیوہ یا طلاقن کا عقدِ ثانی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ دھوم دھڑکا کرنے کی صورت میں خوشی کی بجائے ذات برادری والوں کے طعنے سننے پڑتے۔

بات چیت جاری تھی کہ اللہ وسایا اٹھ کر کمرے میں گیا۔ جمیلہ کو وہاں بلایا۔ اُس سے مشورہ کیا اور اس کی روشنی میں شادی کی تاریخ طے کی، ۲ اگست مقرر ہوئی۔ مہمانوں کی دودھ کے شربت سے تواضع کی گئی۔ جمیلہ واپس زنان خانے میں جا چکی تھی۔ تاریخ مقرر ہونے کی اطلاع پہنچی تو اپنے نوکر کے ذریعے چودھری اکرم کے پاس سگن کی مٹھائی کے ساتھ خشک میوہ بھیجا۔ ساہے کی خوشی میں نائی اور لاگیوں کو نقد انعام کے علاوہ ایک ایک لنگی بھی دی۔

رات کے کھانے میں چودھری اکرم نے خاص اہتمام کیا۔ وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ بات بات پر مسکراتا۔ پلیٹیں اٹھا اٹھا کر رحیم داد اور اللہ وسایا کے سامنے رکھتا۔ کھانے پر اصرار کرتا۔ دل

جوئی کرتا۔ شفقت اور محبت کا اظہار کرتا۔ کھانا ختم ہونے کے بعد بھی وہ دیر تک دونوں کے پاس بیٹھا رہا۔

صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی اللہ وسایا اور رحیم داد تیار ہو گئے۔ جمیلہ بھی تاروں کی چھاؤں میں بیدار ہو گئی تھی اور اللہ وسایا اور رحیم داد کے ساتھ سفر کے لیے تیار تھی۔ گھر کے باہر دو تانگے موجود تھے۔ تینوں اُن میں سوار ہوئے۔ نوکر بھی ہمراہ تھے۔ چودھری اکرم اُن کے ساتھ کبیر والا تک آیا۔ اُس نے اللہ وسایا اور رحیم داد کو گلے لگا کر گرم جوشی سے رخصت کیا۔

رات گئے تینوں واپس کوٹلہ ہرکشن پہنچ گئے۔ صبح ہوئی۔ دن گزرا۔ شام کو معمول کے مطابق باغ میں محفل جمی۔ جمیلہ اور اللہ وسایا کے رویے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ چودھری اکرم کی بیٹی سے رحیم داد کا رشتہ طے ہو جانے پر دونوں بہت خوش ہیں۔ جمیلہ مسکرا مسکرا کر ساہے کی رسم کی ایک ایک تفصیل بیان کر رہی تھی۔ چودھری اکرم کے حسنِ سلوک اور مہمان نوازی کی تعریف کر رہی تھی۔

رات کا کھانا انہوں نے ساتھ ہی کھایا۔ کھانے پر بھی شادی کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ رحیم داد کم بلکہ بہت کم بول رہا تھا۔ جمیلہ نے اُس کی جانب دیکھا اور ہنس کر بولی "تو ابھی سے وٹنا بن گیا۔ شرما اور لجا تو اس طرح رہا ہے جیسے آج ہی تیری جنج چڑھنے والی ہے۔" وہ اللہ وسایا کی طرف متوجہ ہوئی "اللہ وسایا! تو دیکھ رہا ہے۔ چوہدری کیسے شرما شرما کر بول رہا ہے۔" وہ لمحے بھر تک گردن جھکا کر سوچتی رہی "آج جولائی کی ۷ تاریخ ہے۔ یہ ۳۱ دن کا مہینہ ہے۔ ویاہ میں کل سولاں دن رہ گئے ہیں۔"

"تیاری ہی کون سی کرنی ہے۔" اللہ وسایا بولا "جنج شنج تو دھوم دھام سے جانی نہیں۔ بس ایک رسم ادا کرنی ہے۔" وہ مسکرایا "ویسے اپنا ویاہ تو بالکل ہی خاموشی سے ہوا تھا۔ پر بہت نیک گھڑی تھی۔ اب تو سب کچھ سفنہ لگتا ہے۔" جمیلہ نے کچھ نہیں کہا، رحیم داد بھی چپ رہا مگر اللہ وسایا خاموش نہ رہا۔ اُس نے ہلکا قہقہہ لگایا "چلو جی، یہ بہت اچھا ہو گیا۔ چوہدری کا دل اکیلے میں بہت گھبراتا ہے۔ اب نہیں گھبرائے گا۔" اُس نے رحیم داد کی طرف نظر بھر کر دیکھا "اکرم کی پوری زمین داری ورثے میں تیری ہونے والی گھر والی ہی کو ملے گی۔ وہ تو یہاں تک کہتا تھا کہ ویاہ

کے بعد ہی زمیں داری تیرے حوالے کر دے گا۔ اٹھ مربعے سے اوپر زمین ہے اور بہت زرخیز زمین ہے۔ پانی کی بھی کمی نہیں۔"

"تب تو اپنا چوہدری اور وڈا زمیں دار بن جائے گا۔" جمیلہ بولی۔

"اب تو اس کا ہرگز جی نہ گھبرائے گا۔ وڈی زمیں داری ہو اور اچھی گھروالی تو کس کا جی گھبرا سکتا ہے۔" اللہ وسایا نے کہا۔ "میں تو کہوں گا تو احمد پور کی زمیں داری سنبھال لینا۔ اِدھر کی دیکھ بھال تو میں کر ہی رہا ہوں۔ اِس کی تو بالکل فکر نہ کر۔"

رحیم داد نے چونک کر اللہ وسایا کو دیکھا۔ اُسے فی الفور احسان شاہ کی باتیں یاد آ گئیں، اُس کے ذہن میں شبہات اور وسوسے کلبلانے لگے، مگر اُس نے ظاہر نہ ہونے دیا۔ مسکرانے کی کوشش کی اور نرم لہجے میں گویا ہوا۔

"یہ زمیں داری بھی تیری اور وہ بھی تیری۔ میں تیرے لیے پرایا نہیں ہوں۔"

"میرا مطلب ہے دونوں مل جل کر ہی زمیں داری چلائیں گے۔" اللہ وسایا نے زیرِ لب مسکرا کر وضاحت کی۔

☆

رحیم داد مطمئن نہ ہوا۔ اللہ وسایا کی وضاحت کے باوجود اس کا شبہ رفع نہ ہوا۔ رات کو دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

دوسرے روز ایک اور واقعہ پیش آیا۔ رحیم داد زیادہ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ ہوا یہ کہ اللہ وسایا اچانک اپنے وکیل کے ساتھ رحیم داد کے پاس آیا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی اُس نے پوچھا "چوہدری تیرے کلیم کے کاغذات کہاں ہیں؟" اُس نے وکیل کی طرف اشارہ کیا۔ "وکیل صاحب کو کاغذات دیکھنے ہیں۔"

رحیم داد خاموشی سے اٹھا۔ ملحقہ کوٹھری کا دروازہ کھول کر اندر گیا۔ اپنے ٹرنک کا تالا کھولا۔ کلیم کے کاغذات کا بستہ نکالا اور کاغذات وکیل کے حوالے کر دیے۔ وہ کچھ دیر تک پوری توجہ

سے کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر اُس نے کہا۔" یہ کاغذات میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا، اِن کی ضرورت پڑ گئی ہے۔"

رحیم داد تو چپ رہا مگر اللہ وسایا بول پڑا۔" ضرورت ہے تو جی، ضرور لے جاؤ۔"

وکیل نے کاغذات اپنے بریف کیس میں رکھتے ہوئے کہا۔" ایک درخواست بھی لگانی ہے۔" اُس نے انگریزی میں ٹائپ کی ہوئی ایک درخواست نکالی اور رحیم داد کے سامنے رکھی۔" چوہدری! اس جگہ اپنے دستخط لگا دے۔" اُس نے درخواست کے آخر میں ایک جگہ انگلی رکھ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔

رحیم داد دستخط کرتے ہوئے جھجکا۔ ہمت کر کے اُس نے پوچھا۔" وکیل صاحب! یہ درخواست کیوں لگانی ہے؟ میں نوں بھی تو کچھ پتہ چلنا چاہیے۔"

"یہ میں بعد میں آرام سے بتاؤں گا۔ اگر ابھی بتاؤں بھی تو تیری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔" وکیل ہنس کر بولا۔" یہ قانونی نکات ہیں۔ یوں سمجھ لے یہ درخواست لگانی بہت ضروری ہے اور جلد سے جلد لگانی ہے۔"

رحیم داد نے درخواست پر دستخط نہیں کیے۔ خاموش بیٹھا رہا۔ وکیل نے اللہ وسایا کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ اللہ وسایا اٹھ کر رحیم داد کے نزدیک گیا، اُس کا شانہ تھپ تھپا کر نرم لہجے میں بولا۔" لگا دے دستخط۔ تیری جانب سے یہ درخواست لگانی بہت ضروری ہے۔ اس میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ ورنہ اگے گڑبڑ پڑ سکتی ہے۔" اس طرح اصرار کرنے پر رحیم داد نے نظریں اٹھا کر اللہ وسایا کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر تذبذب اور بے اطمینانی کے تاثرات تھے۔ اللہ وسایا نے مسکرا کر کہا۔" چوہدری! تیں نوں مجھ پر بھروسا نہیں؟"

"ایسی گل نہ کر۔" رحیم داد نے نیکھے لہجے میں کہا اور درخواست پر دستخط کر دیے۔

وکیل نے درخواست رحیم داد کے ہاتھ سے لے کر اپنے بریف کیس میں رکھی اور فوراً اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کمرے سے نکلا تو اللہ وسایا بھی اُس کے ہمراہ تھا۔

دونوں کے جانے کے بعد رحیم داد بستر پر لیٹ گیا۔ اللہ وسایا کے رویے نے اُس کے

شبہات میں اضافہ کر دیا تھا۔ دن ڈھلے تک وہ اسی اُلجھن میں مبتلا رہا۔ اسی عالم میں اُس نے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا پھر وہ باغ کی جانب روانہ ہوا۔ مہمان خانے کے دروازے پر اُسے احمد مل گیا۔ احمد نے بتایا کہ اللہ وسایا بھی وکیل کے ساتھ شہر چلا گیا۔ رحیم داد اور پریشان ہو گیا۔

اُس نے دور سے دیکھا، جمیلہ باغ میں بیٹھی تھی۔ قریب ہی اسکول ماسٹر بیٹھا تھا۔ جمیلہ اُس کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھی۔ رحیم داد باغ کی طرف نہیں گیا، اصطبل پہنچا۔ گھوڑی نکلوائی اُس پر سوار ہوا اور جمیلہ کو اطلاع دیے بغیر گھوڑی دوڑاتا نہر کی طرف نکل گیا۔

۲۱

احسان شاہ کا خاص ملازم شیدا حویلی کے پھاٹک ہی پر رحیم داد کو مل گیا۔ اُس کی زبانی رحیم داد کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ احسان شاہ حویلی میں موجود ہے۔ شیدا نے رحیم داد کی گھوڑی ایک ملازم کے سپرد کی اور رحیم داد کو دیوان خانے میں لے گیا مگر وہاں سے باغ کی سمت نہیں گیا۔ دیوان خانے کے پچھواڑے کی باڑی میں پہنچا۔ اُس نے جھپاک جھپاک کرسیاں نکال کر باہر رکھ دیں اور ایک طرف ادب سے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد نے پوچھا: ”شاہ جی، کدھر ہے؟“

”وہ تو جی باغ میں ہے۔ شہر سے کئی وڈّے افسر آئے ہوئے ہیں، وہ ان کے ساتھ بیٹھا ہے۔ میں اُسے تیرے آنے کی اطلاع کرتا ہوں۔ اتنی دیر تو آرام سے بیٹھ، تھکا ہوا بھی ہے، میں جلد واپس آتا ہوں۔“

رحیم داد خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ شیدا چلا گیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ درختوں کی بلند شاخوں پر سنہری دھوپ دھندلی پڑتی جا رہی تھی۔ شام دھیرے دھیرے اپنے بازو پھیلا رہی تھی۔ باڑی میں دھند لکا پھیلتا جا رہا تھا۔ رحیم داد نے باڑی پہلی بار دیکھی تھی۔ یہ درختوں سے گھرا ہوا ایک ہرا بھرا گوشہ تھا۔ وسط میں گھاس کا قطعہ تھا۔ پھولوں کی چند کیاریاں بھی تھیں۔ دائیں طرف نیم کے ایک گھنے درخت کے پہلو میں مختصر سی عمارت تھی جو ایک کمرے اور غسل خانے پر مشتمل تھی۔ کمرے کے آگے برآمدہ تھا، اس پر کھپریل کی جھکی ہوئی چھت تھی۔ کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ کھلی کھڑکی سے لیمپ کی روشنی باہر جھانک رہی تھی۔ باڑی ہر چند کہ حویلی کی چار دیواری کے اندر تھی مگر الگ تھلگ تھی۔

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ شام گہری ہوتی گئی۔ خاموشی اور بڑھ گئی۔ احسان شاہ نہیں آیا۔ کچھ دیر بعد شیدا واپس آیا۔ اُس نے رحیم داد کے آگے میز رکھی۔ اُس پر وہسکی کی بوتل، پانی سے بھرا ہوا جگ اور گلاس سلیقے سے رکھ دیئے۔ رحیم داد نے دریافت کیا۔" شیدے! شاہ جی نہیں آیا؟" اُس کے لہجے سے بے چینی جھلک رہی تھی۔

" شاہ جی نے کہا ہے، میں تھوڑی دیر بعد آؤں گا۔ چوہدری سے کہنا، روٹی ساتھ ہی کھانی ہے۔ آرام سے گپ شپ ہوگی۔ ابھی میں سرکاری افسروں سے کچھ ضروری باتیں کر رہا ہوں۔" شیدا نے احسان شاہ کا پیغام رحیم داد کو پہنچا کر وہسکی کا پیگ تیار کیا اور رحیم داد کے سامنے رکھ کر بولا۔" تو شروع کر۔ شاہ جی اُدھر بیٹھا لگا رہا ہے۔ جلدی تیرے پاس آئے گا۔"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ شیدا چلا گیا۔ گلاس سامنے رکھا رہا۔ اُس میں وہسکی کا رنگ جھلکتا رہا مگر رحیم داد نے گلاس کو ہاتھ نہیں لگایا۔ چپ بیٹھا احسان شاہ کا انتظار کرتا رہا۔ اندھیرا گہرا ہوگیا تھا۔ باڑی پر پُراسرار سکوت طاری تھا۔ آس پاس نہ کوئی آواز تھی، نہ آہٹ۔ رحیم داد بالکل تنہا تھا۔ رات باڑی میں اتر کر کالی پڑتی جارہی تھی۔ کھڑکی سے جھانکتی ہوئی لیمپ کی روشنی زرد دھبا بن کر رہ گئی تھی۔

لگ بھگ گھنٹے بھر بعد احسان شاہ آیا اور معذرت کے انداز میں بولا۔" معاف کرنا چوہدری، مجھے دیر ہوگئی، پر تو آج اچانک کیسے آگیا؟" وہ قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس نے رحیم داد کے سامنے رکھا ہوا گلاس دیکھا۔" اوئے! یہ گلاس ایسے ہی پڑا ہے۔ لگتا ہے تُو نے ایک گھونٹ بھی نہیں لیا۔" اُس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

" نہیں شاہ جی! میں نے آج بالکل نہیں پینی۔" رحیم داد نے انکار میں گردن ہلائی۔" واپسی میں جمیلہ مل گئی تو گڑبڑ ہو جائے گی۔ میں اس کے یا اللہ وسایا کے سامنے پی کر جانا نہیں چاہتا۔ ویسے بھی میں نے یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھیرنا۔ بس تیرے ساتھ روٹی ٹکر کھا لوں گا۔"

احسان شاہ نے اصرار کیا۔ مگر رحیم داد آمادہ نہیں ہوا۔ احسان شاہ نے زچ ہو کر کہا۔" جیسی تیری مرضی۔" اُس نے گلاس اٹھایا۔ ایک بڑا گھونٹ بھرا۔ چڑھی ہوئی آنکھیں اور تمتماتا ہوا چہرہ صاف ظاہر کر رہا تھا کہ وہ پہلے ہی خاصی شراب چڑھا چکا ہے۔" اچھا یہ بتا، اِدھر کیسے آنا ہوا؟"

"تجھ سے کچھ ضروری گل کرنی تھی۔" رحیم داد نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کوئی خاص گل ہے؟"

"خاص ہی گل سمجھ لے۔" رحیم داد بولا۔ "آج دوپہر اللہ وسایا اپنے وکیل کے ساتھ میرے پاس آیا اور مجھ سے ایک درخواست پر دستخط لگوا لیے۔"

"کیسی درخواست تھی؟" احسان شاہ نے پوچھا۔

"انگریزی میں تھی۔ تیں نوں پتہ ہے میں توں انگریزی نہیں آتی۔" رحیم داد نے کہا۔ "میں نے اس کے بارے میں وکیل سے پوچھا بھی، پر اس نے کہا کہ یہ کنوں کی باتیں ہیں، تیری سمجھ میں نہیں آئیں گی، میں بعد میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا ابھی تو جلدی میں ہوں۔ درخواست فوراً لگانی ہے۔"

"حد کر دی تو نے۔" احسان شاہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "جب اس نے درخواست کی نوعیت اور اس کا سبب ہی نہ بتایا تو آنکھ بند کر کے تو نے اس پر دستخط کیوں کر دیے؟"

"کیا کرتا جی!" رحیم داد نے مسکین سی شکل بنا کر کہا۔ "اللہ وسایا میرے گلے پڑ گیا۔ بار بار دستخط کرنے کو کہا۔ پہلے تو میں چپ کر کے بیٹھا رہا۔ جب وہ ضد کرنے لگا تو دستخط لگانے ہی پڑے۔ میں اسے ناراض بھی تو نہیں کر سکتا۔"

"تو نے بہت برا کیا۔" احسان شاہ کے چہرے پر جھنجلاہٹ طاری ہو گئی۔ "لگتا ہے اللہ وسایا نے اپنا کام پکا کر لیا۔ میں نے پہلے ہی خبردار کیا تھا۔ پر تو نے میری بات پر بھروسہ نہیں کیا۔" اس کے لہجے میں تلخی کا اضافہ ہو گیا۔ "کبھی یہ بھی سوچا اس نے دو تین ہزار روپے خرچ کر کے حویلی اور زرعی آراضی تیرے نام کیوں الاٹ کرا دی؟ تو اس کا کون سا سگا لگتا ہے۔ آخر اس نے الاٹمنٹ کے لیے اتنا پیسہ کیوں خرچ کیا؟ کیوں اتنی بھاگ دوڑ کی؟ تو ہی بتا، اس نے ایسا کیوں کیا؟ کوئی تو بات ہو گی، کچھ تو اسے فائدہ ہو گا۔ اتنا تو کوئی اپنے بھائی کے لیے بھی نہیں کرتا۔ تو اس کا کچھ بھی تو نہیں لگتا۔ پرانی یاری بھی نہیں۔ اپنی سمجھ میں تو یہ چکر آتا نہیں۔ اس میں ضرور کچھ ایر پھیر ہے۔"

"شاہ جی تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اپنا مغز بھی کام نہیں کرتا۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وکیل نے درخواست پر دستخط کرانے کے ساتھ میرے کلیم کے سارے کاغذات بھی پاس رکھ

بیسے ہیں۔"

"کیا کہا! کلیم کے کاغذات بھی اس نے اپنے کبضے میں کر لیے؟" احسان شاہ نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔ "اُس نے تجھے بالکل ہی ختم کر دیا۔ تو اندھے اعتماد میں مارا گیا۔ اب تو تیرے پاس دستاویزی ثبوت بھی نہیں رہا۔ مختار نامہ تو اُسے پہلے ہی دے چکا ہے۔ اُس نے اپنی مرضی کی درخواست پر تجھ سے دستخط بھی لگوا لیے۔ پہلے جو کمی رہ گئی تھی، وہ اب پوری کر لی۔ اب تو وہ جو جی چاہے کر سکتا ہے۔ جب مرضی ہو گی، تجھے بے دخل کر دے گا۔ اب تو اُسے صرف پٹواری کے رجسٹر ملکیت میں اپنے نام کا اندراج کرانے کے بعد تحصیل دار کے پاس جانا ہے۔ ہزار دو ہزار میں یہ کام بھی ہو سکتا ہے۔" اُس نے دہشکی کی چسکی لگائی۔ "اب تو وہ ساری جائداد پر اپنا ہی کبضہ رکھے گا۔ ویسے بھی اُس کے کبضے میں ہے۔ لگتا ہے، وہ اپنی کاروائی پوری کرنے کے لیے جلدی ہی شہر جائے گا۔"

"وہ تو آج ہی وکیل کے ساتھ شہر چلا گیا۔" رحیم داد نے بتایا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنی کاروائی مکمل کر کے جلد سے جلد تیرا پتا کاٹ دینا چاہتا ہے۔"

"کس سوچ میں پڑ گیا چوہدری؟" احسان شاہ نے رحیم داد کو خاموش دیکھ کر دریافت کیا۔

"شاہ جی! سچ پوچھ تو مجھے یکین نہیں آتا کہ اللہ دسایا میرے خلاف ایسا بھی کر سکتا ہے۔ میں یہی سوچ رہا تھا۔" رحیم داد نے مدھم لہجے میں کہا۔ "سمجھ نہیں آتی، وہ ایسا کیسے کر سکتا ہے۔ تجھے پتہ نہیں، پچھلے دنوں وہ مجھے کبیر والا کے ایک زمیں دار کے گھر لے گیا۔ جمیلہ بھی ساتھ تھی۔ دونوں اُس کی دھی سے میرا ویاہ کرانا چاہتے ہیں۔ اب تجھ سے کیا چھپانا۔ ویاہ کے لیے اگلے مہینے کی ۲ تاریکھ طے بھی ہو چکی ہے۔" رحیم داد نے نظر بھر کر احسان شاہ کی طرف دیکھا۔ "اُن کے دل میں اگر میرے خلاف کوئی بدی ہوتی تو وہ ایسا کیوں کرتے۔ میں نوں بے دخل ہی کرنا ہوتا تو اللہ دسایا اور جمیلہ میرا گھر بسانے کی کوشش کیوں کرتے؟"

"یہ کب کی گل ہے؟" احسان شاہ کے لہجے میں تحیر تھا۔

"پچھلے جمعے کی۔" رحیم داد نے بتایا۔ "زمیں دار کا نام چوہدری اکرم ہے۔ تحصیل کبیر والا کے پنڈ احمد پور میں اُن کی زمیں داری ہے۔ اٹھ مربعے سے اوپر زمین ہے۔ پکی ماڑی ہے اور جس کڑی کے ساتھ

وہ میرا ویاہ کرنا چاہتا ہے، اُس کے سوا اُس کا کوئی نہیں۔ وہی اس کی ساری جائداد کی وارث ہے بلکہ اللہ وسایا تو یہ بھی کہتا تھا کہ اکرم ویاہ کے بعد اپنی ساری زمین داری میرے سپرد کردے گا۔"

"مجھے تو یہ بھی کوئی اونچا چکّر لگتا ہے۔" احسان شاہ نے منہ بگاڑ کر کہا۔" اپنی سمجھ میں تو یہ گل آتی نہیں۔ جس کی اکلوتی اُلاد صرف ایک دھی ہو اور اچھی خاصی زمین داری بھی ہو، کیا اُسے اپنی جات برادری میں رشتہ نہیں مل سکتا تھا جو وہ تجھے اپنا جنوائی بنانے پر اتنی جلدی تیار ہو گیا؟"

"پر ایک گل اور بھی ہے۔ اُس کی دھی کا پہلے بھی ویاہ ہو چکا ہے۔ دماد اچھا نہیں تھا اس لیے اکرم کاغذ لکھوا کر دھی کو اپنے گھر لے آیا۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔" اکرم بوڑھا ہے اور بیمار بھی رہتا ہے۔ چاہتا ہے اپنی زندگی میں دھی کا ویاہ کر دے تاکہ اُس کے بعد وہ بے سہارا نہ رہ جائے، شریکے اور برادری والے جائداد پر قبضہ کرنے کے لیے اُسے تنگ نہ کریں۔"

"چوہدری، مجھے تو یہ شادی ویاہ سب ڈھونگ لگتا ہے۔ پتہ نہیں، اکرم کون ہے، کیسا بندہ ہے؟" سید احسان علی نے نشے کی جھونک میں قہقہہ بلند کیا۔" چوہدری تو ٹھیرا مہاجر۔ تو ان ملتانیوں کو نہیں جانتا ان کے لیے تو مشہور ہے کہ صورت ملاّں کی اور آنکھیں چور کی۔ پورے پنجاب میں ملتانی زمینداروں سے بڑا رسّہ گیر نہیں ملے گا۔ جتنا وڈّا زمیں دار ہو گا، اتنا ہی وڈّا رسہ گیر ہو گا۔ ویسے نام کو کوئی سیّد ہے۔ کوئی کریشی، کوئی گردیزی ہے۔ کوئی گیلانی ہے۔ کوئی نواب اور کوئی مخدوم ہے۔" اس نے وسکی کی چسکی لگائی۔" وہ کوئی بھی ہو پر رسّہ گیری کو جرم اور برائی نہیں سمجھتا۔ رسّہ گیری تو ان کے لیے دل بہلانے کا مشغلہ اور تفریح ہے۔"

"پر چوہدری اکرم ایسا نہیں ہے۔ دیکھنے میں نیک بندہ لگتا ہے۔" رحیم داد بولا۔

"کسی کی صورت پر تو اندر کا حال لکھا نہیں ہوتا۔" احسان شاہ اپنی بات پر اڑا رہا۔" چوہدری تجھے ملتانی زمیں داروں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ پنجاب گزیٹیر میں تو ان کا ذکر کرتے ہوئے یہاں تک بتایا گیا ہے کہ وہ رسّہ گیری کو بالکل چوری چکاری نہیں سمجھتے۔ زور آور اور کامیاب نمبردار وہی سمجھا جاتا ہے جو دن میں حکومت کرے اور رات کو چوری اور رسّہ گیری۔ ان کے بارے میں تو جانے کتنی کہاوتیں مشہور ہیں۔ کہتے ہیں چاچا چور، بھتیجا کاضی، ملاّں چور، موذن گواہ۔ کہاں تک تجھے بتاؤں۔"

اُس نے وسکی کا بڑا گھونٹ بھرا اور گلاس خالی کر دیا۔ ”نوجوان زنانیوں اور مٹیاروں کو اٹھوا لینا اور ان کی عزت لوٹنا ملتانی زمیں داروں میں بالکل عام بات ہے۔ چاہے وہ نواب زادہ ہو یا گدی نشین۔“

رحیم داد نے حیرت سے احسان شاہ کو دیکھا۔ وہ نشے میں بالکل بھول گیا تھا کہ جتنی بھی برائیاں نفرت سے منہ بگاڑ بگاڑ کر وہ ملتانی زمیں داروں کی گنوا رہا ہے، وہی حرکتیں اور وہی جرائم وہ خود کرتا ہے اور نہایت دھڑلے سے کرتا ہے اور زمیں داری چلانے کے لیے یہ سب کچھ ناگزیر قرار دیتا ہے۔ مگر احسان شاہ اُس کے احساسات سے بے نیاز کہتا رہا۔ ”تو کس چکر میں پڑ گیا۔ ہرگز ہرگز اُدھر بیاہ نہ کرنا۔ بعد میں بہت پچھتائے گا۔ ویسے مجھے تو یہ بیاہ شیاہ ہوتا نظر نہیں آتا۔ اللہ وسایا اس بہانے تجھ سے پیار جتانا چاہتا ہے پر اُس کے ارادے کچھ اور ہی ہیں۔ یوں سمجھ لے، وہ ایک ہاتھ سے حویلی اور زمین تجھے دے کر دوسرے ہاتھ سے چھین لینا چاہتا ہے۔ میرا کام تجھے خبردار کرنا ہے، آگے تیری مرضی۔“

رحیم داد کو فوراً یاد آ گیا کہ اللہ وسایا نے باتوں باتوں میں اُس سے یہ بھی کہا تھا کہ چوہدری! تو احمد پور کی زمیں داری سنبھال لینا، اِدھر کی دیکھ بھال میں کر ہی رہا ہوں۔ رحیم داد ایک بار پھر ذہنی اُلجھن میں مبتلا ہو گیا۔ اُس نے پوچھا۔ ”شاہ جی! یہ بتا، اب میں نوں کی کرنا ہے؟ میں تیرے پاس اِسی لیے آیا تھا۔“ اُس کے لہجے سے بے چارگی اور پریشانی جھلک رہی تھی۔

”تُو نے تو خود اپنے ہاتھ کٹوا لیے۔“ احسان شاہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”اللہ وسایا نے تجھ سے سب کچھ تو لے لیا۔ اب میں تیرے لیے کیا کر سکتا ہوں۔“

”میں اللہ وسایا کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔“ رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”پر یہ تو جانتا ہی ہے کہ اللہ وسایا صرف مزارع ہی نہیں رہا۔ کوم کا جانگلی بھی ہے اور وہ جانگلی ہی کیا جو چوری، ڈکیتی اور لوٹ مار نہ کرے۔ جانگلی تو ماں کے پیٹ ہی سے جرائم پیشہ پیدا ہوتا ہے۔“ احسان شاہ کے چہرے سے سخت برہمی جھلکنے لگی۔ ”مجھے اُس سے اتنی سخت نفرت ہی اس لیے ہے کہ ایک جانگلی میرے ضلع، بلکہ میری ہی تحصیل میں زمیں دار بنا بیٹھا ہے۔ شان سے حویلی میں رہتا ہے،

اور اوپچے طرّے کی پگ لگا کر نکلتا ہے تجھے پتہ نہیں، اُس کی یہ آن بان دیکھ کر میرا خون کس طرح کھولتا ہے۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ احسان شاہ وسکی کی چسکی لگاتا رہا پھر اُس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور سنبھل سنبھل کر بولنے لگا۔ "مشکل یہ ہے کہ یہ بھی تو پتہ نہیں کہ تو نے اللہ وسایا کے لیے مختار نامے پر دستخط کیے ہیں یا بیع نامے پر۔ کلیم کے کاغذات بھی اُس نے تجھ سے ہتھیا لیے۔ اب تو معاملہ بہت آگے نکل چکا ہے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا؟" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اب تیرے سامنے صرف دو رستے ہیں۔"

"وہ رستے کیا ہیں؟" رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔

"اگر تو کانونی چارہ جوئی کرنا چاہے تو میں تیرا کیس اپنے وکیل سے لڑواؤں گا حالانکہ تو نے اپنا کیس خود اپنے ہاتھوں کمزور کر دیا ہے۔" احسان شاہ نے رحیم داد کی جانب بھرپور نظروں سے دیکھا۔ "بول، کیا کہتا ہے؟"

"نہیں شاہ جی!" رحیم داد نے اتفاق نہیں کیا۔ "میں مکدمے بازی کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔ یہ دیوانی مکدمہ ہے۔ برسوں عدالتوں کے چکّر کاٹنے پڑیں گے۔ کہتے ہیں دیوانی کیس تو دیوانہ بنا دیتا ہے۔"

انکار کے باوجود احسان شاہ نے مقدمہ لڑنے پر زور دیا مگر رحیم داد تیار نہیں ہوا۔ وہ اس کے لیے تیار ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اُس پر تو پولیس کو صرف دیکھ کر گھبراہٹ طاری ہو جاتی تھی۔ عدالت میں پیش ہونے اور بیان دینے کی اُس میں جرأت ہی نہیں تھی۔ اس میں اُسے سراسر خطرہ نظر آتا تھا۔ جائداد اور املاک حاصل کرنے کی کوشش میں اگر اُسے شناخت کر لیا جاتا تو صرف جیل ہی نہ جانا پڑتا، حکیم نذر محمّد چشتی اور چوہدری نور الٰہی کے قتل کے جرم میں پھانسی بھی ہو سکتی تھی۔ اسی کمزوری کے باعث اُس نے اللہ وسایا کو مختار نامہ دیا تھا تاکہ اُسے عدالتوں اور سرکاری افسروں کے سامنے پیش نہ ہونا پڑے۔ وہ ہرگز کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

"تو مکدمہ لڑنا نہیں چاہتا تو صرف ایک رستہ رہ جاتا ہے۔" احسان شاہ نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی اور آہستہ آہستہ وہسکی کی چسکی لگانے لگا۔

"وہ کون سا رستہ ہے؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"وہ یہ کہ اللہ وسایا کو رستے سے صاف کر دیا جائے۔" اُس کی خمار آلود آنکھوں میں مجرمانہ چمک پیدا ہو گئی۔

"تیرا مطلب ہے، اللہ وسایا کو کتل کر دیا جائے؟" رحیم داد نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"بالکل یہی مطلب ہے۔" احسان شاہ کی آنکھوں کی چمک اور تیز ہو گئی۔ "اللہ وسایا کا صفایا کرنے کے بعد حویلی اور زمین پوری طرح تیرے کبضے میں آ جائے گی۔" اُس نے ہلکا قہقہہ لگایا اور ایک آنکھ دبا کر بولا۔ "تجھے کبیر والا میں ویاہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ جمیلہ تو موجود ہی ہے، وہ سوہنی ہے اور جوان بھی۔ تو اُس سے نکاح پڑھا لینا۔ اُس کے دس مربعے بھی تحویل میں آ جائیں گے۔ تو پورے کوٹلہ ہرکشن کا زمیں دار بن جائے گا۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "پر تجھ میں اتنی ہمت بھی ہے؟"

"نہیں شاہ جی! یہ ٹھیک نہیں۔" رحیم داد کے چہرے سے پریشانی برسنے لگی۔

"تو یہ بھی سن لے۔" احسان شاہ کا لہجہ گمبھیر ہو گیا۔ "اگر تو نے اللہ وسایا کا صفایا نہ کیا تو وہ جلد ہی تجھے اپنے رستے سے صاف کر دے گا۔"

"تو یہ کہنا چاہتا ہے، اللہ وسایا مجھے کتل کرا دے گا؟"

"بالکل کرا سکتا ہے مت بھول کہ اللہ وسایا جانگلی بھی ہے۔" احسان شاہ کے لہجے میں تلخی تھی "جانگلی تو نہ صرف لوٹ مار کے لیے خون کرتا ہے، بلکہ پیسے لے کر دوسروں کے لیے بھی کتل کرتا ہے۔ وہ تو پیشہ ور کاتل ہوتا ہے۔" اُس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "اگر اس نے تجھے کتل نہ بھی کیا تو کسی کیس میں پھنسوا کر جیل بھجوا سکتا ہے۔ اُس کا وکیل بہت تیز ہے۔ مجھے پتہ ہے، وہ کتنا تیز ہے۔"

رحیم داد نے سراسیمہ ہو کر احسان شاہ کی طرف دیکھا۔ "شاہ جی! تیری باتیں بالکل سمجھ نہیں آ رہی ہیں۔ سچ جان، اپنا تو جیسے مغز پھر گیا ہے۔"

"سوچ لے، اچھی طرح سوچ لے۔" احسان شاہ اُس کی سراسیمگی اور گھبراہٹ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے بولا" مجھے تیری پریشانی کا پتہ ہے، تبھی میں نے تجھے ہر پہلو دکھا دیا۔ اب تو اپنے طور پر سوچ بچار کر لے مگر تجھے جلد ہی فیصلہ کرنا ہوگا۔ وقت بہت کم ہے۔"

"میں تیرے پاس چند روز بعد آؤں گا۔ اب مَیں نوں چلنا ہے۔" رحیم داد کھڑا ہو گیا۔

احسان شاہ نے اُسے جانے نہیں دیا" ایسی کیا جلدی ہے۔ روٹی کھا کر جانا۔" احسان شاہ بھی کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد ٹھہر گیا۔ دونوں نے کھانا کھایا۔ رحیم داد کھانے کے دوران خاموش رہا۔ احسان شاہ نے بھی کم بات چیت کی لیکن اُس نے اللہ وسایا کی جانب سے رحیم داد کو برگشتہ کرنے کی پوری کوشش کی۔ کھانے سے فارغ ہو کر رحیم داد اپنی گھوڑی پر سوار ہو کے واپس ہوا۔

رحیم داد مہمان خانے میں پہنچا تو احمد سو رہا تھا۔ اُس نے اُٹھ کر دروازہ کھولا مگر بات چیت نہیں کی گہری نیند سے اٹھا تھا، آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں لیکن رحیم داد کو اُس کی زبانی یہ اطلاع مل گئی کہ اللہ وسایا شہر سے لوٹا نہیں ہے۔

اللہ وسایا دوسرے روز شام کو واپس آیا۔ رحیم داد باغ میں تنہا بیٹھا اُس کا انتظار کرتا رہا مگر وہ اُس کے پاس نہیں آیا۔ واپسی کے کچھ ہی دیر بعد وہ قادر کے گھر چلا گیا۔ جمیلہ بھی اُس کے ہمراہ تھی یہ اطلاع بھی احمد ہی نے دی تھی۔ رحیم داد کے دریافت کرنے پہ اُس نے بتایا" زمیں دار اور زمیں دارنی کادو کے پاس گئے ہیں۔ وہ آج دوپہر کو لاہور سے لوٹا ہے۔"

"کادو اب کیسا ہے؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"بالکل کمزور پڑ گیا ہے جی!" احمد نے کہا" آنکھیں تو اُس کی دونوں ہی جاتی رہیں۔ کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ اندھا ہو گیا ہے۔"

کئی روز گزر گئے۔ نہ اللہ وسایا اُس کے پاس آیا، نہ جمیلہ۔ دونوں قادر اور عطا محمد کا جھگڑا ختم کرانے کے لیے صلح وصفائی کی کوشش کر رہے تھے۔ عطا محمد تو تیار تھا۔ وہ اور اس کا بھائی دوبارہ گرفتار ہونے کے بعد ضمانت پر رہا ہو چکے تھے۔ پولیس نے دونوں کو مجیداں کے قتل کے الزام میں

گرفتار کر لیا تھا۔ دوسری طرف قادر صلح کرنے پر رضامند نہیں تھا۔ وہ ایسی شرائط پیش کرتا جو عطا محمد کے لیے قابلِ قبول نہ ہوتیں۔

ہر روز دونوں فریقوں کے نمائندے اکٹھے ہوتے۔ پنچایت بیٹھتی، لیکن قادر کے بگڑے ہوئے رویّے کے باعث کچھ نہ طے ہوتا۔ بار بار تلخ کلامی کی نوبت آجاتی، بات بنتے بنتے بگڑ جاتی لیکن جمیلہ نے ہمت نہیں ہاری اُس نے قادر اور اُس کے بیٹے صابر کو سمجھا بجھا کر کسی نہ کسی طور راضی کر ہی لیا۔

رحیم داد پنچایت میں شریک نہیں ہوا۔ اس کا وقت تنہائی میں کٹتا رہا۔ احمد یا دوسرے نوکروں سے اُسے اللہ وسایا اور جمیلہ کی سرگرمیوں کا پتہ چلتا رہا۔

✡

اللہ وسایا مہمان خانے میں رحیم داد کے پاس آیا مگر وہ کمرے میں نہیں بیٹھا۔ رحیم داد کو باہر لے گیا۔ دونوں ٹہلتے ہوئے کھیتوں کی طرف چلے گئے۔ دن کے ساڑھے بارہ بجے تھے، لیکن دھوپ نہیں تھی۔ آسمان پر سرمئی بادل چھائے تھے۔ بارش کے بعد ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ ہوا قدرے بپھری ہوئی تھی۔ درختوں کی شاخیں اور پودے جھونکوں سے جھوم رہے تھے۔

فضا خوشگوار اور سہانی تھی لیکن اللہ وسایا کے چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی۔ وہ چپ چپ تھا۔ رحیم داد بھی خاموش رہا۔ کچھ دیر تک دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔ آخر رحیم داد نے خاموشی توڑی۔

"تو شہر گیا تھا، درخواست کا کیا بنا؟"

"وکیل نے دوسرے ہی روز درخواست لگا دی تھی۔" اللہ وسایا نے بتایا۔

رحیم داد نے جھجکتے ہوئے استفسار کیا۔ "یہ نئی درخواست کیسی ہے؟ نہ تو نے کچھ بتایا نہ وکیل نے۔"

"تو درخواست کے بارے میں بار بار اس طرح کیوں پوچھ رہا ہے؟" اللہ وسایا کا لہجہ تیکھا تھا۔

رحیم داد نرم پڑ گیا "تو بُرا منا رہا ہے تو نہیں پوچھوں گا" اُس نے لمحے بھر خاموش رہ کر کہا "میں تو یہ ملوم کرنا چاہتا تھا، الاٹمنٹ میں کوئی گڑبڑ تو نہیں پڑ گئی؟"

"گڑبڑ ہو سکتی تھی، اگر فوراً درخواست نہ لگائی جاتی۔"

"پریشانی کی تو کوئی گل نہیں؟" رحیم داد نے بے چینی کا اظہار کیا۔

"ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا" اللہ وسایا نے بے نیازی سے کہا۔

رحیم داد نے محسوس کیا کہ اللہ وسایا خلاف توقع کچھ اکھڑا اکھڑا تھا۔ وہ ہر بات کا مختصر اور ادھورا جواب دیتا۔ رحیم داد نے دبی زبان سے پوچھا "تُو نے یہ نہیں بتایا کہ یہ درخواست لگانے کی ضرورت کیوں پڑی؟"

"یہ تو وکیل سے پوچھنا، وہی بتائے گا۔"

"تیں نوں کچھ پتہ ہو تو بتا دے۔" رحیم داد کا لہجہ بہت نرم تھا "وکیل تو کانونی نکات بتائے گا، وہ اپنی سمجھ نہیں آئیں گے۔"

"جب کانونی نکات تیں نوں سمجھ نہیں آتے تو چپ کر کے بیٹھا رہ اگے تجھے سب کچھ خود ہی پتہ چل جائے گا۔" اللہ وسایا کے انداز میں ہلکی ہلکی تلخی تھی۔ وہ چند لمحے خاموشی سے چلتا رہا۔ رحیم داد نے بھی خاموشی توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ آخر اللہ وسایا خود ہی بولا "تجھ سے ایک ضروری گل پوچھنی ہے۔"

"کیسی گل؟" رحیم داد نے مضطرب ہو کر دریافت کیا۔

اللہ وسایا کا چہرہ اور گمبھیر ہو گیا۔ اُس نے مڑ کر تیکھی نظروں سے رحیم داد کی جانب دیکھا "تو یہاں آنے سے پہلے ڈھولہ امیر خاں میں ہوتا تھا؟"

رحیم داد کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ لرز کر رہ گیا۔ زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ نظریں جھکائے چپ چاپ چلتا رہا۔ اُس کے چہرے پر اچانک سراسیمگی چھا گئی تھی اور صاف نظر بھی آ رہی تھی۔

اللہ وسایا گردن اٹھائے چلتا رہا۔ اس کا چہرہ اور گمبھیر ہو گیا۔ چند قدم خاموشی سے آگے بڑھنے کے بعد اللہ وسایا کی آواز ابھری "تُو نے اُدھر دو کتل بھی کیے ہیں؟" رحیم داد کے قدم

ڈگمگانے لگے۔ اُس پر سکتہ طاری تھا۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اُس کا ذہن ستار کے تاروں کی مانند جھن جھنا رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرے کے جال پھیلنے لگے "چپ کیوں ہے، بولتا کیوں نہیں؟" اللہ وسایا کا لہجہ تیکھا اور قدرے اونچا تھا۔

رحیم داد شدید مخمصے میں پڑ گیا، نہ وہ اعتراف کر سکتا تھا، نہ صاف انکار۔ دونوں صورتوں میں اس کے لیے پریشانی تھی۔ اُس نے صاف جواب دینے سے گریز کیا۔ ذہنی خلفشار پر قابو پانے کی پوری پوری کوشش کی، جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔ "دارا تجھ سے ملا تھا؟"

"ہاں!" اللہ وسایا نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ "پچھلے دنوں وہ تجھے ڈھونڈتا ہوا میرے پاس آیا تھا۔ دیر تک باتیں کرتا رہا۔"

"کیا کہتا تھا؟" رحیم داد کے لہجے میں لڑکھڑاہٹ تھی۔

"وہی جو میں نے تجھے بتایا۔" اللہ وسایا نے جواب دیا۔

رحیم داد نے فوراً پینترا بدلا۔ "میں نے تجھے بھائی کہا ہے، تجھ سے ہرگز جھوٹ نہیں بولوں گا۔ سب کچھ صاف صاف بتا دوں گا۔" اُس کے لہجے میں عاجزی تھی۔

اللہ وسایا پر خاطر خواہ ردِعمل ہوا۔ اُس کے انداز میں قدرے نرمی پیدا ہوئی۔ وہ گلہ کرنے کرنے کے انداز میں بولا۔ "چوہدری! میں تجھے اتنا خطرناک بندہ نہیں سمجھتا تھا۔"

"تُو پہلے میری پوری گل سُن لے۔" رحیم داد نے اللہ وسایا کو رام کرنے کی کوشش کی۔

"تجھے پتہ نہیں۔ میں نے ان باتوں کا ابھی تک کسی سے بالکل تذکرہ نہیں کیا۔" اللہ وسایا نے کہا۔ "جمیلہ تک کو نہیں بتایا حالانکہ میں اُس سے کبھی کوئی بات نہیں چھپاتا۔" اُس نے لمبی سانس بھری۔ "چوہدری! تو نے مجھے سخت اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔ تُو خود سوچ، اگر یہ باتیں سچ ہیں تو آگے کیا بنے گا۔"

"تو میری بات پوری طرح سن لے گا تو سب کچھ تیری سمجھ میں آجائے گا۔" رحیم داد نے صفائی پیش کرنی چاہی۔ "تُو جس طرح سوچ رہا ہے، بات اس طرح نہیں ہے۔"

اللہ وسایا اُس کی صفائی سننے پر رضامند نہ ہوا۔ "تجھے اِس معاملے میں جو کچھ کہنا ہے، دارا ہی

کے سامنے کہنا تاکہ ہر بات کھل کر سامنے آجائے۔ وہ جلد ہی میرے پاس آئے گا۔"

رحیم داد نے اصرار کیا: "اُس کے سامنے بھی بات ہو جائے گی مگر تو اس سے پہلے میری گل بھی سُن لے۔"

"تو کہتا ہے تو ضرور سنوں گا۔" اللہ وسایا نے اُس کی حوصلہ شکنی نہیں کی: "اس بارے میں آرام سے بیٹھ کر تجھ سے گل بات ہو گی۔ آج تو میں نوں وکیل کے پاس شہر جانا ہے۔"

"درخواست ہی کے سلسلے میں جا رہا ہے؟"

"ہاں تجھ سے مختار نامہ لینے کے بعد اب تو مجھی کو ہر افسر کے سامنے پیش ہونا پڑتا ہے۔"

"کب جائے گا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"دوپہر کی روٹی کھا کر روانہ ہو جاؤں گا۔"

"واپسی کتنے روز میں ہو گی؟"

"کچھ پتہ نہیں۔" اللہ وسایا نے کہا: "تین چار روز تو لگ ہی جائیں گے۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے کھیتوں سے گزر کر اسکول کی جانب نکل آئے۔ رحیم داد نے نظریں اٹھا کر دیکھا، جمیلہ اسکول سے باہر آرہی تھی۔ اُس کے ہمراہ دونوں بچے بھی تھے۔ اللہ وسایا نے بھی اُسے دیکھ لیا۔ رحیم داد نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"لگتا ہے، سکول کی چھٹی ہو گئی ہے۔ زمیں دارنی آرہی ہے۔"

اللہ وسایا نے آہستہ سے کہا: "میرے جانے کے بعد اس معاملے میں جمیلہ سے کوئی گل بات نہ کرنا۔ میں تجھے بتا ہی چکا ہوں کہ میں نے اُسے ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔ جب تک تجھ سے پوری طرح بات چیت نہ ہو جائے گی، اُس سے کچھ نہیں کہوں گا۔ وہ ایسی باتوں سے جلد گھبرا جاتی ہے۔"

"نہیں، میں اُس سے کچھ نہیں کہوں گا، تو فکر نہ کر۔" رحیم داد نے اللہ وسایا کو یقین دلایا۔

جمیلہ قریب آگئی۔ اللہ وسایا اور رحیم داد اُس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے حویلی کی جانب چل دیے۔

رحیم داد مہمان خانے میں پہنچا تو سخت پریشان اور خوف زدہ تھا۔ پریشانی کے عالم میں

اُس سے دوپہر کا کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ وہ شام تک کمرے میں بستر پر لیٹا بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اُسے اپنے سر پر خطرہ منڈلاتا نظر آرہا تھا۔ اندھیرا پھیلنے لگا تو وہ مہمان خانے سے نکلا۔ باغ میں گیا اور تنہا بیٹھا رہا۔ اللہ دسایا شہر جا چکا تھا مگر جمیلہ بھی باغ میں نہیں آئی۔

☆

بادل چھائے تھے مگر بارش نہیں ہوئی۔ رحیم داد نے باغ ہی میں کھانا کھایا اور کھانے سے فارغ ہوکر دیر تک بیٹھا رہا۔ اندھیرا ہر طرف پھیل گیا تھا۔ رحیم داد اٹھا اور مہمان خانے کی جانب چلا۔ وہ چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ ایک جھنڈ کے نیچے سے دارا نکلا اور رحیم داد کے سامنے آگیا۔ رحیم داد سراسیمہ ہوکر کھڑا ہوگیا۔ دارا کو دیکھ کر خوف اور پریشانی کے ساتھ اُس پر غصّہ بھی طاری ہوا مگر اُس نے خود کو سنبھال لیا۔

”تو نے مجھے پہچان لیا؟“ دارا نے آہستہ سے پوچھا۔

”ہاں۔“ رحیم داد آگے بڑھنے لگا۔ ”میرے ساتھ آ۔“

دونوں رات کے بڑھتے اور پھیلتے اندھیرے میں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

رحیم داد نے مہمان خانے کی جانب جانے کا ارادہ ترک کردیا، مڑا اور دارا کے ہمراہ نہر کی سمت بڑھنے لگا۔ عقب میں گاؤں تھا۔ مکانوں میں چراغوں کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ آسمان پر ہلکا ابر چھایا تھا۔ درختوں کے نیچے اندھیرا تھا۔ دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔

کچھ دور جاکے رحیم داد نے پوچھا۔ ”تو یہاں کیسے آیا؟“ اُس کا لہجہ تیکھا تھا۔

”میں نے تجھے اُس روز نہر کے کنارے دیکھا تھا۔ یاد ہے نا جب تو اپنی گھوڑی دوڑاتا جارہا تھا۔“ دارا آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ ”تبھی سے میں تیرے پاس آنا چاہتا تھا، پر تو اُتنا بدل گیا ہے کہ بالکل پہچانا نہیں جاتا۔ تیرے منہ پر یہ چوٹ کا نشان بھی نہیں تھا۔ تو گھوڑی پر بیٹھا بھی بہت شان سے تھا۔ سچ کہتا ہوں، میں تجھے پہچان نہیں سکا تھا۔“

”ایسا تھا تو اِدھر کیوں آیا؟“

”گل ایہہ ہے جی! تیرے بارے میں کچھ شبہ سا ہوا۔“ دارا نے وضاحت کی۔ ”میں نے تجھے

ادھر سے گھوڑی پر نکلتے دیکھا تھا۔ اب تجھ سے صاف صاف بتا دوں۔ میں دو بار پہلے بھی یہاں آیا اور چھپ کر تجھے خوب غور سے دیکھتا رہا۔"

"پر تُو ادھر کیسے آ گیا؟ تُو ڈھولہ امیر خاں میں ہوتا تھا نا؟ میں نے تجھے وہیں چھوڑا تھا۔"

"تیں نوں پتہ ہی نہ ہوگا۔ تیرے آنے کے بعد مجھ پر کیا بیتی۔" دارا نے گلہ کرنے کے انداز میں کہا۔

"جب تُو بیگماں اور اُس کے گھر والے مولا داد کا خون کر کے بھاگا۔"

"تیں نوں کیسے پتہ چلا کہ میں نے بیگماں اور مولا داد کا خون کیا؟" رحیم داد نے اُس کی بات کاٹ کر دریافت کیا، اُس کی آواز سے جھنجلاہٹ صاف جھلک رہی تھی۔

"نراض نہ ہو۔ تیں نوں پتہ ہی ہے، میں موجود نہیں تھا۔" دارا سہم کر نرم پڑ گیا۔ "میں جب پہنچا تو بیگماں مر چکی تھی، مولا داد دم توڑ رہا تھا۔ اُس کا بھائی اللہ داد زخمی تھا، پر زندہ تھا۔ اُسی نے بتایا کہ بیگماں اور مولا داد کا خون تُو نے کیا۔"

"بکواس کرتا ہے وہ۔" رحیم داد برافروختہ ہو کر بولا۔ "اُسے اچھی طرح پتہ ہے، بیگماں کو میں نے نہیں، مولا داد نے کلہاڑی سے کتل کیا۔ میں نے اُسے روکنا چاہا تو اُس نے مجھ پر بھی وار کیا۔ میں برابر بچنے کی کوشش کرتا رہا، پر جب میں نے دیکھا، وہ بیگماں کی طرح مجھے بھی ختم کرنے پر تُلا ہوا ہے تو میں نے اپنے بچاؤ کے لیے وار کیا اور اُسی کی کلہاڑی چھین کر کیا۔ کرتا بھی کیا۔ وہ بالکل پاگل ہو رہا تھا۔ اللہ داد بھی اسی لیے زخمی ہوا کہ وہ بھی مجھے کتل کرنا چاہتا تھا۔"

"تُو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" دارا نے جھٹ اُس کی تائید کی۔ "پر تیں نوں یاد ہوگا، جب تُو میرے گھر سے نکل کر کھیتوں کی طرف بھاگا، تو میں نے تجھے روکنے کی کوشش کی تھی۔ تُو رک کر اصلی گل بتا دیتا تو میں اللہ داد کی بات ہرگز نہ مانتا۔" وہ صفائی پیش کرتے کرتے شکوہ کرنے لگا۔ "میں نے تو تجھ سے پہلے ہی پوچھا تھا کہ اگر تُو نے بیگماں سے یاری لگا رکھی ہے۔"

رحیم داد نے اُسے آگے نہیں بولنے دیا۔ غصے سے آگ بگولا ہو کر ڈانٹا۔ "چپ کر۔ تُو نے فیر وہی بکواس شروع کر دی۔"

"اللہ داد بھی ایسی ہی گل کرتا تھا۔ دوسرے بھی یہی کہتے تھے۔" دارا نے گڑگڑانے کے انداز

میں آہستہ آہستہ کہا۔" اللہ داد نے پولیس کو بھی یہی بتایا۔"

"پولیس نے تجھ سے بھی پوچھ تاچھ کی تھی؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"کیوں نہیں کی۔ میرے گھر ہی میں دونوں کا خون ہوا تھا۔ پولیس مجھے کیسے چھوڑ دیتی۔" دارا نے بتایا۔ "تھانے دار سویرے پہنچا تھا اور پکڑ کر تھانے لے گیا۔"

"تو نے کیا بیان دیا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"میں نے کیا بیان دینا تھا جی! میں نوں تو کچھ پتہ نہیں تھا" دارا نے بتایا "پولسیوں نے چھتر مار مار کر چمڑی ادھیڑ ڈالی۔ پیٹھ اور کمر پر لمبے لمبے لاس پڑ گئے۔ انہوں نے مجھے ننگا کیا اور الٹا لٹکا دیا۔ ایک پولسیا میرے دونوں ہاتھ اپنے بوٹ سے دبا کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرا زور زور سے ٹھڈے مارتا تھا۔ میں درد سے چیخنے چلانے لگا پر اس نے ترس نہ کھایا۔ وہ مارتے مارتے تھک گیا تو تھانے دار کے حکم پر ایک اور پولسیا لگایا گیا۔ وہ خوب تگڑا تھا۔ اس نے سڑاک سڑاک پانی میں بھیگے ہوئے چمڑے کے چھترے مارے۔ میں نے ڈر کے وہی بیان دے دیا جو اللہ داد نے دیا تھا۔"

"پر تو وہاں موجود ہی کب تھا، جب مولاداد نے بیگماں کو قتل کیا اور مجھے قتل کرنے کے ارادے سے کلہاڑی اٹھا کر حملہ آور ہوا تو پہلے ہی گھر سے نکل کر جا چکا تھا۔ اللہ داد اور مولاداد تو تیرے جانے کے بہت بعد پہنچے تھے۔"

"تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے پر میں کب تک مار کھاتا۔" دارا نے اپنی صفائی پیش کی۔ "میں نے تو مار سے بچنے کے لیے ایسا بیان دیا تھا۔"

"تب تو پولیس نے تجھے چھوڑ دیا ہوگا۔" رحیم داد نے کہا۔

"کہاں چھوڑا جی!" دارا بولا۔ "وہ تیرے بارے میں بار بار پوچھتے تھے۔ تیں نوں پتہ ہی ہے میں نوں تیرے بارے میں کچھ بھی ملوم نہ تھا۔ نام تک کا پتہ نہ تھا۔ پر تھانے دار نے میری ایک نہ سنی گندی گندی گالاں نکالتا تھا۔ چیخ چیخ کر کہتا تھا۔ تیرے گھر میں واردات ہوئی۔ قاتل تیرے ساتھ کئی روز ٹھیرا رہا اور تیں نوں اس کے بارے میں کچھ اتا پتہ نہیں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں جتنی اپنی صفائی پیش کرتا اتنی ہی زیادہ وہ دبا کے میری پٹائی کرتا۔"

رحیم داد اُس کی روداد سُن کر متاثر ہوا۔ اظہار ہمدردی کے طور پر بولا "پولیس نے تجھ پر بہت ظلم کیا۔"

"نہ پوچھ کتنا ظلم کیا۔" دارا نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔" تھانے لے جانے کے بعد پولیس نے کئی راتوں تک بالکل نہیں سونے دیا۔ کھانے کو بھی نہیں دیا۔ پیاس لگتی، پانی مانگتا تو تھانے دار کے حکم پر کانسٹیبل ٹھنڈا ٹھنڈا پانی گلاس میں بھر کر میرے سامنے لاتا، میں ہتھ بڑھاتا۔ وہ گلاس پیچھے ہٹا لیتا، پانی نہ پلاتا۔ میں ہتھ جوڑتا، منتیں کرتا پر پانی دینے کی بجائے پولیسیے اور پٹائی کرتے۔ کئی بار میں بے ہوش ہوا۔ ہر بار وہ پانی کے چھینٹے میرے منہ پر مار مار کر ہوش میں لانے اور تیرے بارے میں پوچھتے۔ کبھی نرمی دکھاتے، پیار سے گل بات کرتے۔ کبھی گرمی دکھاتے اور گالاں نکالتے۔ تھانے دار چلا جاتا تو دیوان جی کی ڈیوٹی لگ جاتی۔ وہ اپنی کارگزاری ڈالنے کے لیے اور زیادہ ظلم کرتا۔"

"تو پولسیوں کے پنجے سے چھوٹا کیسے؟"

"وہ ایسا ہے جی! میرا زمیں دار بہت نیک بندہ ہے۔ تھانے دار سے اُس کی یاری بھی ہے۔" دارا نے بتایا" وہ ایک روز تھانے آیا۔ میری حالت دیکھ کر اُسے رحم آگیا۔ وہ اپنی ضمانت پر مجھے اپنے ساتھ لے آیا۔ تھانے دار سے اُس نے وعدہ کیا کہ جب ضرورت پڑے گی، مجھے پیش کر دے گا۔"

"پر تو وہاں سے نکل کر اِدھر کیسے پہنچ گیا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"ویسے تو جی زمیں دار کے پاس جب تک رہا، میری کڑی نگرانی ہوتی رہی۔" دارا نے بتایا۔ "مجھے باہر جانے کی بالکل اجازت نہیں تھی۔ رات کو تو کوٹھری میں بند کر دیا جاتا۔ پھر ایسا ہوا، ایک صبح میں ٹٹی کرنے نیائیں کی طرف گیا۔ ایک راکھا میرے ساتھ ساتھ تھا، وہ بھی ٹٹی کرنے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ میں نے رات ہی کو بھاگنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ اُٹھ کر اچانک اُس پر جھپٹا اور اُسے نیچے گرا کر اُس کا منہ دبایا، پگڑی سے اُس کے ہاتھ اور پیر باندھے اور پگڑی کا ایک سرا اُس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ ہر طرف ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ میں جھٹ کھیتوں میں گھس گیا، چھپتا چھپاتا پنڈ سے باہر نکلا اور تیزی سے دوڑ لگائی۔ میں سورج نکلنے سے پہلے ڈھولہ امیر خاں سے بہت دور

نکل جانا چاہتا تھا۔" اُس نے گہری سانس بھری "کئی روز تک برابر چلتا رہا۔ دن کو کسی جھنگر یا ویران بستی کے کھنڈر میں چھپ جاتا۔ رات کو سفر کرتا۔ بھوکا بھی رہا، پیاسا بھی۔ کسی نہ کسی طرح اِدھر آ گیا۔"

"اب تو کہاں رہتا ہے؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔" لگتا ہے نزدیک ہی کے کسی پنڈ میں ٹھہرا ہوا ہے۔"

"ہاں جی! میں چک ۴۸ میں رہتا ہوں۔" دارا بولا۔" یہاں سے زیادہ دور نہیں، ۵ میل کے لگ بھگ ہو گا۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے نہر کے قریب پہنچ گئے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ یہ برسات کی ایک تاریک رات تھی جگنوؤں کا غول ہوا کے جھونکے کے ساتھ ایک سمت سے نمودار ہوا اور اپنی جلتی بجھتی روشنیوں کا غبار فضا میں بکھیرتا ہوا درختوں کے گھنے جھنڈ میں غائب ہو گیا۔ رحیم داد نے جگنوؤں کا قافلہ گزرتے دیکھا: ٹھٹکا اور دارا کی طرف متوجہ ہوا۔

"تو کس کے پاس ٹھہرا ہے؟"

"میں تو جی ریاست بہاول پور کی طرف نکل جانا چاہتا تھا۔" دارا نے بتایا۔" رستے میں کامل مل گیا۔ میں نے تو چاہا تھا کہ اُس کی نظروں سے بچ کر نکل جاؤں پر اُس نے دیکھتے ہی دور سے ہانک لگائی۔ پاس آ کر چمٹ گیا۔ بہت دنوں بعد ملا تھا۔ میرا پرانا یار ہے۔ وہ میرے گلے پڑ گیا، ضد کر کے اپنے گھر لے گیا۔ وہ اپنے بیو کے ساتھ چک ۴۸ میں رہتا ہے۔"

"کامل زمیں دار ہے یا مزارع؟"

"وہ نہ زمیں دار ہے نہ مزارع۔" دارا نے جواب دیا۔" وہ تو جی پاکستان سے باہر کوئی جگہ ہے بحرین، اُدھر ہوتا ہے۔ وہاں بحرین پٹرولیم کمپنی میں کام کرتا ہے۔ آج کل چھٹی پر آیا ہوا ہے۔ لگتا ہے کمائی اچھی ہے۔ شان سے رہتا ہے۔"

"اُس کی چھٹی ختم ہو جائے گی تو واپس چلا جائے گا۔" رحیم داد نے کریدا۔" تب تو کیا کرے گا؟ کس کے پاس ٹھہرے گا؟"

"یہی تو جی فکر ہے۔ سمجھ نہیں آتی کیا کروں۔" دارا نے تشویش کا اظہار کیا۔" میں نوں پتہ

ہی ہے، پولیس میری تلاش میں ہے۔ کامل کے گھر میں آرام سے چھپا بیٹھا ہوں۔ اُس کے بحرین جانے کے بعد وہاں کیسے ٹھہر سکوں گا۔ اُس کا پیو مجھے نہیں ٹھہرائے گا۔ وہ اچھا بندہ نہیں۔ ویسے ہی میرے ٹھہرنے پر اکثر کڑ کڑ کرتا رہتا ہے۔ وہ تو کامل ہے جس نے روک رکھا ہے۔"

"کامل جانتا ہے کہ پولیس تیری تلاش میں ہے؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"ہاں جی! اُسے پتہ ہے پر اپنے پیو اور چاچا کو اُس نے کچھ نہیں بتایا۔ چاچا بھی ساتھ ہی رہتا ہے۔ ۸ اکلا سے اوپر ستھرا دھ زمین ہے۔ کامل کا پیو اور چاچا مل جل کر اُس پر کاشت کرتے ہیں۔" دارا اطمینان سے بتاتا رہا" کامل کمائی کر کے لایا ہے۔ اُس سے اور زمین خریدنے کی کوشش ہو رہی۔ ویسے وڈا ٹبر نہیں آرام نال گزر بسر ہو رہی ہے۔ کامل کی ایک ہی بھین ہے۔ اُس کا ویاہ بھی پچھلے دنوں ہو گیا۔ کامل اس میں شرکت کے لیے آیا تھا۔ وہ......"

رحیم کو کامل اور اس کی بہن کی شادی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔" یہ بتا، تو نے اگے کے لیے کیا سوچا؟"

"کامل کہتا ہے تو میرے ساتھ بحرین چل۔ تیں نوں بھی اُدھر پٹرولیم کمپنی میں لگوا دوں گا۔ اَج کل کمپنی میں بھرتی بھی ہو رہی ہے مزدوری اچھی ملے گی، عیش کرے گا۔ وہ جی! میرا بہت ہی اچھا یار ہے۔ میری مدد بھی کرنا چاہتا ہے۔"

"اس میں سوچنا کیا، چلا جا اس کے ساتھ۔" رحیم داد نے مشورہ دیا۔

"کیسے چلا جاؤں جی!" دارا نے مجبوری ظاہر کی۔ "پہلے کراچی جانا ہو گا۔ وہاں کمپنی کے لیے بھرتی کا دفتر ہے۔ بھرتی کرنے والے افسروں کی مٹھی گرم کرنی پڑتی ہے۔ اس کے بغیر کام نہیں بنتا۔ کامل بتاتا تھا، ۵ سو روپے کی ضرورت ہو گی۔ تیں نوں پتہ ہے، میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ اکٹھے ۵ سو روپے تو کامل بھی نہیں دے سکتا۔ ویسے اُس کے پاس اتنے روپے ہیں بھی نہیں۔ میں نے تو اُسے کہا تھا کہ روپے ادھار دے دے تو بحرین میں مزدوری کر کے ادا کر دوں گا پر وہ جو کچھ کما کر لایا تھا سب اپنے پیو کو دے چکا ہے۔"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ دونوں چپ چاپ چلتے رہے اور نہر سے ہٹ کر کھجور کے ایک

درخت کے نیچے اندھیرے میں کھڑے ہو گئے۔

دارا زیادہ دیر چپ نہ رہا۔ اُس نے جھجکتے ہوئے کہا "میں تیرے پاس اسی لیے آیا تھا۔" اُس کے لہجے میں خوشامد اور عاجزی تھی۔ "تیری بہت مہربانی ہوگی۔ تُو نے مجھے ۵ سو روپے دے دیے تو میں کامل کے ساتھ نکل جاؤں گا۔" اُس نے نظریں اُٹھا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "تو وڈّا زمیں دار ہے، میری اتنی مدد کر سکتا ہے۔ میرا بھی پولیس سے پنڈ چھوٹ جائے گا اور تیں نوں بھی آگے خطرہ نہیں رہے گا۔" اُس نے دبی زبان سے رحیم داد کو خبردار کیا "تیں نوں پتہ ہے، پولیس نے پکڑ لیا تو مار مار کر تیرے بارے میں سب کچھ اگلوا لے گی۔"

رحیم داد نے چونک کر دارا کو دیکھا۔ وہ دیکھنے میں جتنا سادہ لوح نظر آتا تھا، اُتنا تھا نہیں۔ اندر سے گھاگ نکلا۔ وہ رحیم داد کو بلیک میل کرنے پر تلا ہوا تھا۔ رحیم داد نے صورت حال کی نزاکت محسوس کی۔ دارا اُس کے لیے اتنا سنگین خطرہ بن گیا تھا کہ سرکاری گواہ بن کر اُسے پھانسی کے پھندے پر لٹکوا سکتا تھا مگر رحیم داد نے دارا پر کمزوری ظاہر نہیں ہونے دی، تیوری پر بل ڈال کر تیکھے لہجے میں بولا "مجھے کوئی خطرہ شطرہ نہیں۔ اپنے دل سے یہ خیال نکال دے۔ خالی تیرے بیان دینے سے کیا ہوتا ہے۔ تیرے سوا ڈھولہ امیر خاں میں کسی اور نے مجھے نہیں دیکھا۔ ایک بیگماں ہی تھی، وہ بھی اب نہیں رہی۔ اللہ داد بھی مجھے پہچان نہیں سکا۔ میں اُس کے سامنے منہ پر منڈاسا باندھے ہوئے تھا۔ تیری اکیلی گواہی سے کیا بنتا ہے۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" دارا نے اس سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ "ویسے بھی تو وڈّا زمیں دار ہے۔ پولیسیے تجھ پر آسانی سے ہتھ نہیں ڈال سکتے۔" اُس نے اپنے لہجے میں اور زیادہ نرمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "پر پولیسیے مجھے تنگ کر سکتے ہیں۔ تجھے بھی کچھ نہ کچھ پریشانی ہو سکتی ہے۔"

"تو میری فکر نہ کر۔" رحیم داد نے اپنے رویے سے خوف کی پردہ پوشی کی۔ چند لمحے خاموش کھڑا سوچتا رہا پھر اُس نے اپنے تند و تیز لہجے میں اعتدال پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو یہ سوچ رہا ہوں، پولیس نے تجھے دوبارہ پکڑ لیا تو زبردست مار لگائے گی۔ تیری جان بھی جا سکتی ہے۔ پہلے تھانے

میں تجھ پر جو ظلم کیا گیا، اُسے سن کر تو ایسا سوچنا غلط نہیں۔"

دارا ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔" تو نے ٹھیک ہی کہا۔ اس بار تو پولیسیے مجھے جان سے مار دیں گے۔"
اُس نے جھک کر رحیم داد کے پیر پکڑ لیے۔" تو میری اتنی مدد کر دے کہ میں کامل کے ساتھ ادھر سے نکل کر
بحرین چلا جاؤں۔ تیرا بہت احسان ہوگا۔ زندگی بھر دعائیں دوں گا۔"

"سیدھا کھڑا ہو۔" رحیم داد نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

دارا اٹھا اور نظریں جھکا کر رحیم داد کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد نے جان بوجھ کر اللہ دسایا کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ ملزموں کی مانند سہمے ہوئے
دارا کو نظر بھر کے دیکھا اور بھاری بھرکم لہجے میں بولا۔" دارا تو پریشان نہ ہو۔ تو نے بھی میری مدد کی ہے۔
میں اُسے بھولا نہیں ہوں۔" دارا نے نگاہیں اُٹھا کر رحیم داد کی جانب دیکھا مگر زبان سے ایک لفظ
نہیں نکالا۔ رحیم داد نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔" فکر نہ کر۔ میں تیری ضرور مدد کروں گا۔ تو کل سورج
ڈوبنے کے بعد اِسی جگہ پہنچ جانا۔ میرے پاس پنڈ میں آنے کی ہرگز کوشش نہ کرنا۔ میں تیرے پاس
خود ہی پہنچ جاؤں گا۔ دیر ہو جائے تو انتظار کر لینا۔ میں ضرور آؤں گا۔"

"جیسا تو نے کہا ہے، ویسا ہی کروں گا۔ تیری بہت بہت مہربانی۔" دارا نے خوشامد بھرے لہجے
میں کہا۔

"اچھا، اب تو ٹر جا۔ میں کل شام تجھ سے یہیں ملوں گا۔"

دارا خاموشی سے چلا گیا۔ رحیم داد کھجور کے درخت تلے چپ کھڑا اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ جب
وہ اندھیرے میں گم ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا تو رحیم داد مڑا اور گاؤں کی سمت بڑھنے لگا۔ اندھیرا
بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ مہمان خانے میں پہنچا تو پہر رات گزر چکی تھی۔ رحیم داد کو دیر تک نیند نہیں
آئی۔ آدھی رات سے بارش شروع ہو گئی مگر صبح مطلع صاف تھا۔ سورج چمک رہا تھا۔ بھیگے ہوئے درختوں
اور ہرے بھرے پودوں پر سنہری دھوپ چمک رہی تھی۔

رحیم داد کمرے سے باہر نکلا، تمام وقت دارا کے بارے میں سوچتا رہا۔ اُس نے دیوار پر کھونٹی سے لٹکی ہوئی بندوق کی جانب نظریں اٹھا کر کئی بار دیکھا اور ہر بار سوچا کہ شام کو جب دارا نہر کے کنارے ملے تو اُسے اندھیرے میں گولی مار کر ٹھکانے لگا دے لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی اُسے خوف زدہ کرتا رہا کہ گولی کی آواز سن کر گاؤں والے اکٹھے ہو سکتے ہیں اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو وہ اکیلا لاش کیسے چھپائے گا اور کہاں چھپائے گا۔ لاش سارا بھانڈا پھوڑ سکتی تھی۔ پولیس آتی، تفتیش ہوتی، اللہ وسایا کو خبر پہنچتی وہ لاش دیکھتے ہی دارا کو پہچان لیتا اور فوراً سمجھ جاتا کہ اُسے کس نے اور کیوں قتل کیا۔ اللہ وسایا اُس کے لیے دارا سے کم خطرناک نہیں تھا۔ وہ بیگماں اور مولا داد کے قتل کے بارے میں دارا کی زبانی پہلے ہی بہت کچھ سُن چکا تھا۔

کیا وہ اللہ وسایا کو بھی قتل کر دے؟ لیکن آخر وہ کتنے قتل کرے گا؟ خود کو بچانے کے لیے کس کس کی جان لے گا؟ بیگماں کو اسی پردہ پوشی کی کوشش میں مولا داد کے ہاتھوں اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ مولا داد کا قتل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ بیگماں اُس کی اکلوتی بہن تھی، اُسے ٹوٹ کر چاہتی تھی۔ اُس کا شوہر مولا داد بھی باپ کی خفگی کے باوجود اُس سے محبت اور خلوص سے ملتا۔ حالات نے اُسے ایسے خطرناک راستے پر ڈال دیا کہ وہ اتنی چاہنے والی بہن کے قتل کا سبب بنا۔ بیگماں کی یاد کے ساتھ سینے میں دھواں سا اٹھا اور آنکھوں میں آنسو بن کر منڈلانے لگا۔ وہ منہ لپیٹ کر رونے لگا۔

دن ڈھلے تک وہ شدید الجھن میں رہا، کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اسے دارا کے ساتھ ساتھ اللہ وسایا کے بارے میں بھی فیصلہ کرنا تھا۔ اور جلد سے جلد کرنا تھا۔ وہ دارا کو پانچ سو روپے دے کر بحرین جانے میں مدد دے سکتا تھا۔ اس طرح اُس کی طرف سے جو خطرہ تھا، خود بخود ٹل جاتا مگر اللہ وسایا بھی اُس کے سر پر تلوار بن کر لٹک رہا تھا۔ بہت غور و فکر کے بعد رحیم داد نے طے کیا کہ اُسے اس معاملے میں احسان شاہ سے رجوع کرنا چاہیے۔ وہ ان خطرات سے نمٹنے میں اُس کی رہنمائی کر سکتا ہے۔

سورج غروب ہونے سے پہلے اُس نے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ دھوپ، شام کے پھیلتے

اور بڑھتے دھندلکے میں تحلیل ہو کر ختم ہو گئی ۔ رحیم داد نے گھوڑی نکالی اور نہر کی جانب روانہ ہو گیا۔ اُس نے دارا کو دور ہی سے دیکھ کر پہچان لیا ۔ وہ کھجور کے درخت تلے سائے کے مانند نظر آرہا تھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ بارش سے نہر کی سطح بلند ہو گئی تھی۔ پانی گنگناتا ہوا تیزی سے بہہ رہا تھا۔

رحیم داد نے قریب پہنچ کر کہا۔ ”تو آگیا؟“

”کیسے نہ آتا، تو نے بلایا تھا۔“ دارا نے مستعدی سے جواب دیا۔

رحیم داد گھوڑی سے نیچے اترا ۔ اُس نے گھوڑی پر بیٹھے بیٹھے طے کیا کہ دارا کو بھی پیراں والہ لے جانا چاہیے۔ اُس نے دارا سے کہا۔ ”آ، میرے پیچھے گھوڑی پر بیٹھ جا۔“

دارا اس کے ہاتھ کا سہارا لے کر گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ رحیم داد نے گھوڑی کو ایڑ لگائی، وہ آگے بڑھی۔ دارا حیرت زدہ تھا۔ ”تو مجھے کہاں لے جا رہا ہے؟“ اُس نے بے چینی کا اظہار کیا۔

”تو نے پیراں والہ دیکھا ہے؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”نہیں جی! میں اُدھر کبھی نہیں گیا۔“ دارا نے جواب دیا۔ ”میں نے اُسے نہیں دیکھا۔“

”آج دیکھ لینا۔“ رحیم داد مسکرا کر بولا۔

”اُدھر جا کر کیا لینا ہے؟“ دارا ابھی تک حیرت زدہ تھا۔

”تیں نوں بحرین جانا ہے کہ نہیں؟“ رحیم داد نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

”کیوں نہیں جانا جی! تیری مہربانی ہوگی۔“

”تو فیر چپ کر کے بیٹھا رہ۔“ رحیم داد نے اُسے جھڑک دیا۔

دارا سہم کر رہ گیا۔ رحیم داد گھوڑی سنبھال کر دوڑاتا رہا۔ بارش سے کچے راستے پر جگہ جگہ گڑھے پڑ گئے تھے۔ اندھیرا بھی تھا۔ رحیم داد گھوڑی پر چوکس بیٹھا تھا۔ دارا دم بخود تھا مگر رحیم داد کسی قدر پریشان تھا۔ وہ دارا کے ہمراہ پیراں والہ جا تو رہا تھا مگر کچھ دور جانے کے بعد اُس کے ذہن میں یہ خدشہ بھی پیدا ہوا کہ دارا نے اگر اللہ وسایا کی طرح احسان شاہ یا اُس کے کسی ملازم کو بھی بیگماں اور مولا داد کی ہلاکت کے بارے میں بتا دیا تو اُس کے لیے ایک نئی

الجھن پیدا ہو جائے گی۔ وہ احسان شاہ کو بھی اس معاملے میں اعتماد میں لینا نہیں چاہتا تھا۔

رحیم داد نے دارا کو تنبیہ کی۔" میں تجھے پیراں والہ لیے تو جا رہا ہوں پر وہاں بیگماں اور مولا داد کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتانا۔ اپنے بارے میں بھی کچھ نہ بتانا۔ ہر ایک سے یہی کہنا کہ تو میرا پرانا نوکر رہ چکا ہے۔ بیچ میں کسی اور زمیں دار کی نوکری کرلی تھی، اب میرے پاس واپس آگیا ہے۔ میری بات سن رہا ہے نا؟"

"بالکل سن رہا ہوں جی!" دارا نے اونچی آواز میں کہا۔" جیسا تو کہہ رہا ہے ویسا ہی کروں گا۔ کسی کو بھی کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تو بالکل فکر نہ کر۔ میں نے ایسی باتیں بتا کر اپنے تئیں مصیبت میں نہیں ڈالنا۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔" رحیم داد نے کہا۔" تیرے لیے تو اب یہی ٹھیک ہے کہ کسی کو بھی اپنے بارے میں کچھ نہ بتا۔ جلد سے جلد پاکستان سے نکل کر بحرین پہنچ جا۔ کراچی جا کر اپنا نام بدل لینا بلکہ ابھی سے بدل لے۔"

"میں نے جی یہ پہلے ہی سوچ رکھا ہے۔ کامل کہتا ہے، بحرین جانے کے لیے کمپنی کی طرف سے وہ کیا ہوتا ہے جی، ہاں یاد آیا، پاسپورٹ بنایا جائے گا، اُس پر میری تصویر بھی لگے گی۔" دارا رک رک کر بولتا رہا۔" داڑھی بڑھا لوں گا۔ تب تصویر اتروا دُوں گا۔ ویسے بھی جی میرے لیے یہ ضروری ہے۔ پولیس میری تلاش میں ہے۔"

"تو نے نیا نام کیا سوچا؟ مجھے بتا دے تاکہ پیراں والہ میں تیرا وہی نام بتاؤں۔"

"ہاشم۔ میں نے اور کامل نے یہی نام سوچا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔" رحیم داد نے کہا۔" تو یہ طے رہا کہ پیراں والہ میں تجھے میں ہاشم کے نام سے پکاروں گا اور سب کو تیرا یہی نام بتاؤں گا۔ یاد رکھنا۔ بھول نہ جانا۔"

"بالکل نہیں بھولوں گا۔ فکر نہ کر۔"

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ رحیم داد گھوڑی بہت احتیاط سے دوڑا رہا تھا۔ ایک موڑ پر کیچڑ میں گھوڑی کا پیر رپٹا، وہ لڑکھڑائی۔ دارا بھی ایک طرف جھکا۔ اُس نے رحیم داد کی کمر مضبوطی سے تھام لی اور گرنے سے بال بال بچ گیا۔ رحیم داد نے بھی نہایت ہوشیاری سے گھوڑی کو سنبھال لیا۔ اسے

بے قابو نہیں ہونے دیا اور زیادہ محتاط ہو کر گھوڑی دوڑانے لگا۔

وہ دارا کے ہمراہ پیراں والہ پہنچا تو رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ شیدا نے دونوں کو دیوان خانے میں پہنچا دیا۔ رحیم داد نے برآمدے میں پڑی ہوئی ایک کرسی پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے احسان شاہ کے بارے میں دریافت کیا۔ "شاہ جی کدھر ہے؟"

"وہ تو جی حویلی میں ہے۔" شیدا نے جواب دیا۔ "میں اُسے تیرے آنے کی اطلاع کیے دیتا ہوں۔ تو آرام نال بیٹھ۔"

وہ جانے کے لیے مڑا۔ رحیم داد نے اُسے ٹوکا۔ "گل سن شیدے۔" اُس نے قریب کھڑے ہوئے دارا کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ میرا نوکر ہاشم ہے۔ اِسے بھی یہیں ٹھہرنا ہے۔ اِسے روٹی ٹکر کھلا دے۔"

شیدا نے دارا کو مخاطب کیا۔ "ہاشم! ایتھے آ میرے ساتھ۔" دارا اس کے ساتھ چپ چاپ برآمدے سے چلا گیا۔

رحیم داد کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی ہی دیر بعد احسان شاہ آ گیا اور ایک کرسی کھسکا کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "معاف کرنا چوہدری میں روٹی کھا رہا تھا۔"

"تو نے آج اتنی جلدی روٹی کھالی؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔

احسان شاہ نے بے تکلفی سے ہنس کر کہا۔ "آج سورج ڈوبنے سے پہلے ہی پینے پلانے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ دو پرانے یار آ گئے تھے۔ موسم بھی اچھا ہے۔ میں نے خاصی لگائی ہے۔ ویسے آج رات اوکاڑہ بھی جانا ہے۔"

"تیں نوں اوکاڑے جانا ہے تب تو میں نوں چلنا چاہیے۔" رحیم داد نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ "میں کل شام تیرے پاس آنے کی کوشش کروں گا۔" اُسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ "پر یہ بھی تو پتہ نہیں، تو کب تک لوٹے گا۔" اُس نے قدرے تامل کیا، مسکرا کر پوچھا۔ "تو کل واپس آ جائے گا نا؟"

"کل تو نہیں، پرسوں شام تک ضرور آ جاؤں گا۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "پر تو اتنی جلدی واپس کیوں جانا چاہتا ہے۔ اب تو آ ہی گیا ہے تو میں گھنٹے سوا گھنٹے بعد چلا جاؤں گا۔ ایسی جلدی بھی نہیں اوکاڑہ دور ہی کتنا ہے۔ بارش کی وجہ سے سڑکیں خراب ہو رہی ہیں۔ ورنہ کار سے لگ بھگ گھنٹے

بھر کا سفر بنتا ہے۔" اُس نے مسکرا کر رحیم داد کو دیکھا۔" میں تو روٹی کھا چکا پر تو نے ابھی تک نہیں کھائی ہوگی۔ تھوڑی سی دیسکی لگالے۔ ساری تھکن دور ہو جائے گی۔ ایک دم تازہ اور چاک و چوبند ہو جائے گا۔"

رحیم داد نے انکار کر دیا۔" میں کچھ لگاؤں گا نہیں۔ روٹی بھی بعد میں کھاؤں گا۔ آج تو میں تجھ سے بہت ضروری گل بات کرنے آیا ہوں۔"

"اللہ وسایا نے کچھ زیادہ گڑبڑ شروع کر دی؟"

"ہاں۔" رحیم داد نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔" تو نے ٹھیک ہی سوچا تھا۔ اُس کی نیت میں برائی لگتی ہے۔"

"میں نے تجھے غلط نہیں بتایا تھا۔ میرا منیجر غلط اطلاع دے ہی نہیں سکتا۔ وہ بہت ہوشیار بندہ ہے، وفادار بھی ہے۔" احسان شاہ گردن اونچی کر کے بول رہا تھا۔" یہ بتا نئی گل کیا ہوئی؟"

"میں نے درخواست کے بارے میں پوچھا تو اُس نے پہلے کی طرح اس بار بھی گول مول جواب دیا۔" رحیم داد نے کہا۔" کچھ بتانے کی بجائے آنکھیں نکال کر بولا۔" تو بار بار درخواست کے بارے میں کیوں پوچھتا ہے؟ ساتھ ہی اُس نے ایسی باتیں شروع کر دیں جن سے لگتا ہے، وہ مجھے ڈرانا دھمکانا چاہتا ہے۔ کسی کیس میں پھنسانا چاہتا ہے۔"

"اُس کے ان ارادوں کے بارے میں مجھے بہت پہلے اندازہ ہو گیا تھا۔ تجھ سے بتا بھی چکا ہوں۔" احسان شاہ نے لہجے میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا۔" دیکھ، اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ فی الحال تو اُس نے حویلی اور زمین اپنے قبضے میں لینے کا چکر چلایا ہے۔" اُس نے گہری نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔" مجھے تو ایسا نظر آ رہا ہے، وہ حویلی اور زمین لینے کے بعد تیرا پورا کلیم ہی ہتھیانے کی کوشش کرے گا۔ جس طرح اُس نے پہلے دستاویزوں پر دستخط لگوالیے، کسی نئے بہانے سے ایسے اسٹامپ پیپر بھی دستخط لگوا لے گا کہ تو اپنے کلیم سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ ایک روز اچانک پتہ چلے گا کہ تو اپنا کلیم اللہ وسایا کے ہاتھ کب کا بیچ چکا ہے۔"

رحیم داد نے پریشان ہو کر دریافت کیا۔" کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا۔" احسان شاہ مسکرا کر بولا۔ "اُس نے دس مربعے زمین پر دوبارہ جو کبضہ کیا ہے، وہ جمیلہ کے نام سے کلیم خرید کر ہی تو کیا ہے نا، تجھے تو اچھی طرح پتہ ہے، تیرے سامنے ہی تو کلیم کا سودا ہوا تھا۔ فرق صرف اتنا ہو گا کہ تیرے کلیم کا سودا بھی ہو جائے گا۔ اللہ وسایا کے نام منتقل بھی ہو جائے گا اور تجھے پتہ بھی نہ چلے گا۔ کاغذات اور دستاویزات میں جعل سازی اسی طرح ہوتی ہے۔ اللہ وسایا تو وکیل کے مشورے پر ہر کام پکا کر رہا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ تجھے اپنے جال میں پوری طرح جکڑ چکا ہے۔"

رحیم داد نے بے بسی سے کہا۔ "صاف گل ایہہ جی! اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ میرے ساتھ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ اپنا تو بالکل مغز کام نہیں کرتا۔" اُس کے چہرے پر پریشانی برسنے لگی۔

"میں نے تو تجھے پہلے ہی کہا تھا پر تُو نے میری بات مانی ہی کب۔"

"تیرا مطلب ہے، اللہ وسایا کو ختم کر دیا جائے؟" رحیم داد جھجکتے ہوئے بولا۔ اُس کے چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔

"بالکل یہی مطلب ہے۔ اس کے سوا اللہ وسایا کے پھیلائے ہوئے جال سے بچنے کا تیرے سامنے اور کوئی راستہ نہیں۔"

"پر یہ کام میں کیسے کر سکتا ہوں۔" رحیم داد نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "میں نے تو پہلے کبھی ایسا نہیں کیا۔ ویسے بھی سارے نوکر اور مزارع اللہ وسایا کے بندے ہیں۔ میرا تو پنڈ میں کوئی بھی نہیں ہے۔"

"میں تو ہوں۔ تُو کیوں فکر کرتا ہے۔" احسان شاہ نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ "ایک بار تجھ سے یاری کر لی تو پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ ہر مشکل میں تیرا پورا ساتھ دوں گا۔ اگے تجھے خود پتہ چل جائے گا۔"

"یہ کام تُو خود کرے گا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"نہیں۔" احسان شاہ نے بے نیازی سے کہا۔ "ایسے کاموں کے لیے میرے پاس کئی بندے ہیں۔" وہ لمحے بھر خاموش رہا۔ "اللہ وسایا پر تو میں دینے کو لگا دوں گا۔ وہ بہت ہوشیار اور زور آور ہے۔ تُو ڈرتا ہے تو میں خود بھی موجود رہوں گا۔ تیری یاری میں ایسا بھی کر لوں گا۔"

احسان شاہ کی بات سن کر رحیم داد کو فوراً دارا یاد آ گیا۔ اللہ وسایا کے قتل میں اسے بھی شریک کیا

جاسکتا ہے۔ رحیم داد نے اُس کے بارے میں اس پہلو سے بھی غور کیا تھا اور اسی مقصد سے وہ اُسے اپنے ہمراہ پیراں والہ لایا بھی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اللہ وسایا کے قتل میں دارا ملوث ہو جائے گا تو وہ بیگماں اور مولاداد کے قتل کی بنیاد پر اُسے خوف زدہ اور بلیک میل نہیں کر سکے گا۔ پولیس سے بچنے کے لیے سیدھا بحرین جانے کی کوشش کرے گا۔ قاتل بننے کے بعد وہ اُس کے لیے اتنا بڑا خطرہ نہیں رہے گا۔ رحیم داد کو دارا اور اللہ وسایا دونوں سے شدید خطرہ تھا۔ وہ دونوں ہی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے دارا کے ہاتھوں اللہ وسایا کا قتل نہایت کارگر حربہ تھا مگر دارا سے ایسا خطرناک کام لینے کی اُس میں ہمت نہیں تھی۔ وہ احسان شاہ کے مشورے کے بغیر ایسا کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ اُسے بخوبی علم تھا کہ ایسے کاموں کے لیے احسان شاہ نہایت تجربہ کار اور پرانا گھاگ ہے اللہ وسایا کے قتل کے لیے اُسی نے رحیم داد کو اکسایا بھی تھا۔

رحیم داد کو گہری سوچ میں دیکھ کر احسان شاہ نے پوچھا "چوہدری! تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

"میں سوچ رہا تھا جی، میرے پاس بھی ایک ایسا ہی بندہ ہے۔" رحیم داد نے کھل کر بات کرنے کی کوشش کی۔ "پہلے وہ میرا نوکر تھا۔ برسوں میرے پاس رہا۔ سال سوا سال سے اُس نے ایک اور زمیندار کی نوکری کر لی تھی۔ اب وہ کوئی سنگین جرم کر کے آیا ہے اور میرے ہی پاس چھپا ہوا ہے۔ وہ اپنے کسی یار کے ساتھ بحرین کی طرف نکل جانا چاہتا ہے۔ وہ اس کے لیے مجھ سے ۵ سو روپے مانگ رہا ہے۔ اُس کا نام ہاشم ہے۔ میں اُسے اپنے ساتھ لایا ہوں۔"

"اچھا کیا، تو اِسے اِدھر لے آیا۔ وہ تو بہت کام کا بندہ ہے۔" احسان شاہ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "سچ پوچھ تو سنگین واردات کرانے کے لیے ایسے ہی بندوں کو استعمال کرنا چاہیے۔ تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ اسے دینے کے ساتھ لگا دوں گا۔ وہ اللہ وسایا کو ٹھکانے لگا دے گا۔"

احسان شاہ نے نشیدا کو بلایا وہ آیا تو احسان شاہ نے حکم دیا۔ "دینا ابھی سویا تو نہیں ہوگا۔ سو بھی گیا ہو تو اُسے جگا کر لے آ۔" نشیدا چلا گیا۔

احسان شاہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ "چوہدری! تو اس کی فکر نہ کر کہ اللہ وسایا کو کس

طرح صاف کیا جائے گا، کیسے اس کا کتل ہوگا؟ یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے ٹھٹکا۔ "تو نے وہ بیلا تو آتے جاتے ہوئے دیکھا ہوگا جو نہر کی پٹی سے اگے پنڈ کی طرف مڑتے ہوئے رستے میں پڑتا ہے۔"

رحیم داد کو وہ مختصر جنگل یاد آگیا جس کے درمیان سے ایک راستہ پیراں والہ کو جاتا تھا۔ وہ اُس راستے سے کئی بار گزرا بھی تھا۔ اُس نے احسان شاہ سے کہا" بیلا میں نے دیکھا تو ہے۔"

"تیرا کام صرف اتنا ہے کہ کسی طرح اللہ وسایا کو شام کا اندھیرا ہونے کے بعد اِدھر اپنے ساتھ لے کر آجا۔" احسان شاہ نے کہا۔" اگے کی تو مجھ پر چھوڑ دے۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "تو فوراً واپس چلا جانا تاکہ تجھ پر شبہ نہ ہو۔ ویسے بھی تو ایسے کام کے لیے کچّا ہے۔ اللہ وسایا کا خون ہوتے دیکھ کر نہ جانے تیرا کیا حال بنے۔ تجھے تو جائے واردات پر موجود ہونا ہی نہیں چاہیے۔"

"میں اُسے اِدھر کسی نہ کسی بہانے لے تو آؤں گا پر تجھے اطلاع کیسے پہنچاؤں گا۔ میرے پاس تو ایسا کوئی بندہ نہیں۔ ہاشم اب اِدھر ہی تیرے پاس رہے گا۔ ویسے میں اب اُسے اپنے ساتھ رکھنا بھی نہیں چاہتا۔"

احسان شاہ نے دریافت کیا" یہ بتا، اللہ وسایا کہاں ہے؟"

" وہ وکیل کے پاس شہر گیا ہے۔"

"تب تو اُس کی واپسی کے فوراً بعد یہ کام ہونا چاہیے۔" احسان شاہ کے لہجے میں تشویش تھی۔" اس بار وہ کام پکّا کر کے لوٹے گا۔ تجھے بے دخل کرنے کی کوشش کرے گا۔ یا کوئی نیا چکّر چلائے گا؟"

"تو نے اس کا جواب نہیں دیا کہ میں اللہ وسایا کو بیلے میں لے آیا تو تجھے کیسے پتہ چلے گا؟"

"اللہ وسایا دو تین روز سے پہلے تو نہیں لوٹے گا، اس لیے تو اسے جلدی نہیں لا سکے گا۔ کل تو دینا بیلے میں جا کر دیکھے گا کہ کس جگہ اور کہاں گھات لگا کر بیٹھا جائے۔ پرسوں سے میں اس کی ڈیوٹی لگا دوں گا۔ وہ ہر شام اندھیرا ہوتے ہی اپنے بندوں کے ساتھ موجود رہے گا اور اللہ وسایا کا انتظار کرے گا۔ تو جب بھی آئے گا دینے کو بیلے میں پائے گا۔"

"یہ ٹھیک رہے گا" رحیم داد نے اتفاق کیا۔

احسان شاہ نے ہنس کر کہا "اطمینان رکھ۔ اللہ دسایا کا کانٹا جلد ہی نکل جائے گا پر جمیلہ ہاتھ سے نہ نکلنے پائے۔ نرمی اور پیار سے اُسے جلد سے جلد کابو میں کرنے کی کوشش کرنا" اُس نے بدمعاشی سے آنکھ دبائی " جمیلہ ایسی سوہنی اور پھڑک دار رن مل گئی تو زندگی کا لطف آجائے گا۔ تو ابھی سے اُسے اپنی گھر والی کے روپ میں دیکھنا شروع کر دے" وہ کھل کھلا کر ہنسا "جمیلہ کے ساتھ اُس کے دس مربعے بھی تو تجھے دہیج میں ملیں گے" رحیم داد مسکرا کر رہ گیا۔

شیدا آ گیا۔ اُس کے ساتھ دینا بھی تھا۔ اُس کی آنکھوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کچی نیند سے بیدار ہوا ہے مگر احسان شاہ پر نظر پڑتے ہی مستعدی سے ایک طرف سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

احسان شاہ نے دینا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رحیم داد سے کہا "چوہدری! یہ رہا دینا" وہ دینا کی طرف متوجہ ہوا " دینے! کل بیلے میں جا کر موکع نشو کع دیکھ لینا۔ تجھے ادھر کاروائی کرنی ہے۔ کیسے کرنی ہے اور کیا کرنی ہے، یہ میں اد کاڑے سے واپسی پر بتاؤں گا"

"اسے ہاشم سے بھی ملانا ہے" رحیم داد نے احسان شاہ سے کہا۔

"سویرے ملا دینا۔ جی چاہے تو ابھی ملا دے"

"سویرے ہی ملا دوں گا" رحیم داد بولا۔

"جیسے تیری مرضی" احسان شاہ نے شیدا کی جانب دیکھا "شیدے تو چوہدری کے لیے روٹی ٹکر کا بندوبست کر دینا" اُس نے رحیم داد کو مخاطب کیا "چوہدری! تجھے اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف شیدے کو بتا دینا۔ آرام سے رات بسر کرنا" وہ مسکرایا۔ مڑ کر شیدا اور دینا پر نظر ڈالی "اب تم دونوں جاؤ"

دونوں خاموشی سے چلے گئے۔

رحیم داد نے دبی زبان سے کہا "شاہ جی! ایک گل اور ہے"۔

"کیا؟ وہ بھی بتا دے۔ صاف صاف بات کر"

"میں سوچ رہا تھا، اگے کیا ہوگا" رحیم داد نے کھل کر کہا "پولیس بعد میں تفتیش کو آئے

گی۔ مجھ سے بھی پوچھ تاچھ کرے گی۔ میں نوں ڈر لگتا ہے، جانے کیا بات زبان سے نکل جائے۔"

"میں نوں پتہ ہے، تو بہت کچّا ہے۔" وہ آہستہ آہستہ ہنسنے لگا۔ "پروانہ کر، کوئی پولسیا تیرے پاس تفتیش کے لیے نہیں آئے گا۔ ادھر کا تھانیدار اپنا بندہ ہے۔ سب کام ٹھیک ٹھاک ہوگا۔ تو اطمینان رکھ۔ میں کبھی کچّا کام نہیں کرتا۔" اُس نے پہلو بدلا۔ "اب تو روٹی کھا، آرام سے سو۔ برسات کی بھیگی رات ہے۔ اکیلے کیسے سوئے گا۔ کسی رن کو بلا لینا۔ شیدا پہنچا دے گا۔" احسان شاہ کھڑا ہوگیا۔ رحیم داد بھی کھڑا ہوگیا۔ وہ احسان شاہ کے ساتھ ساتھ دیوان خانے کے دروازے تک گیا۔

احسان شاہ کو رخصت کرنے کے بعد رحیم داد نے کھانا کھایا۔

☆

کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ پلنگ پر صاف ستھرا بستر لگا تھا۔ باغ میں کھلنے والی کھڑکی سے بھیگے بھیگے جھونکے آرہے تھے۔ شیدا دہلیز پر چند لمحے خاموش کھڑا رہا پھر اُس نے پوچھا۔ "اور کوئی حکم جی؟"

رحیم داد اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا مگر اُس نے کوئی فرمائش نہیں کی۔ وہ اکیلا ہی سونا چاہتا تھا۔ اُس کا ذہن اُلجھا ہوا تھا۔ وہ اللہ وسایا اور دارا کے بارے سوچ رہا تھا۔ اُس نے شیدا کی حوصلہ افزائی نہیں کی، بے نیازی سے بولا۔ "نہیں، میں نوں اب کچھ نہیں چاہیے۔ اب صرف سونا ہے۔" شیدا مڑا اور برآمدے کے اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ رحیم داد بستر پر لیٹ گیا۔ اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔

سویرے ناشتے سے فارغ ہوکر اُس نے دارا کو بلوایا۔ تھوڑی دیر بعد وہ شیدا کے ہمراہ آیا۔ شیدا چلا گیا تو رحیم داد نے کہا۔ "دروازہ بند کردے۔" دارا نے اُٹھ کر دروازہ بند کردیا۔ رحیم داد کرسی پر بیٹھا تھا دارا اُس کے روبرو فرش پر بیٹھ گیا۔

رحیم داد نے پوچھا۔ "رات آرام نال سویا؟"

"بہت آرام نال سویا، روٹی بھی اچھی کھانے کو ملی۔" دارا نے بتایا۔ "شاہ جی تو بہت وڈا زمیں دار ہے۔ بہت شان ہے اُس کی۔ حویلی بھی بہت شان دار ہے۔ نوکروں چاکروں کی پوری پلٹن موجود ہے۔ پر جی اُس کے نام سے سب کی جان نکلتی ہے۔ بہت رعب ہے اُس کا۔"

"تُو نے اپنے بارے میں کچھ بتایا تو نہیں؟"

"وہی بتایا جو تُو نے کہا تھا،" دارا نے مستعدی سے جواب دیا۔ "شیدے اور دوسرے نوکروں کو بھی پتہ ہے کہ میرا نام ہاشم ہے اور میں تیرا پرانا نوکر ہوں۔"

رحیم داد نے دارا کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ لمحے بھر تک گھورتا رہا۔ "تُو زمیں دار اللہ وسایا سے بھی ملا تھا؟"

دارا کچھ نہ بولا۔ اُس کے چہرے پر پریشانی اور گھبراہٹ چھا گئی۔

رحیم داد نے ڈپٹ کر کہا۔ "چپ کیوں ہے؟ صاف صاف بتا؟"

"ملا تو تھا۔" اُس کی آواز میں ہلکی ہلکی کپکپاہٹ تھی۔ "میں نوں تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔"

"تُو نے اپنے اور میرے بارے میں اُسے سب کچھ بتا دیا۔ یہ ٹھیک ہے نا؟" رحیم داد کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

"میں تو جی اُسے کچھ بھی بتانا نہیں چاہتا تھا۔ میں تو تجھے ڈھونڈتا ہوا پنڈ میں گیا تھا۔" دارا نے گڑگڑا کر کہا۔ "اُس نے ایسے الٹے سیدھے سوال کیے کہ میں تو جی چکرا گیا۔ ویسے اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ تجھے اپنا بھائی سمجھتا ہے۔ تب میں نے اُسے بتایا کہ ڈھولہ امیر خاں میں میرے گھر کے اندر بیگماں اور مولا داد کا کیسے خون ہوا۔"

"تُو نے اور کس کس سے یہ باتیں میرے بارے میں بتائیں؟"

"اور کسی سے بھی ایسی گل بات نہیں ہوئی۔ میں تجھ سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔" دارا نے اُسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"غلط مت بول۔ کامل سے بھی تُو نے ایسی ہی باتیں کی ہیں؛ تُو نے مجھے خود بتایا تھا۔" رحیم داد کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔ "اب کہتا ہے، میں نے اور کسی کو ایسی باتیں نہیں بتائیں۔"

"میں نے غلط نہیں کہا۔" دارا نے عاجزی سے کہا۔ "میری کامل سے جب تیرے بارے میں گل بات ہوئی تب تک تو مجھے تیرا نام بھی ملوم نہیں تھا۔ یہ بھی پتہ نہ تھا کہ تو چوہدری ہے یا میاں، جاٹ ہے یا آرائیں۔" وہ بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ اُس نے حلق تر کرنے کی کوشش کی۔ "زمیں دار اللہ وسایا

سے ملنے کے بعد میری کامل سے تیرے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔" اُس نے مغرب کی سمت مڑ کر دونوں ہاتھ اُٹھا دیئے۔" رب دی سونہہ، ان دو کے سوا تیرے بارے میں کسی سے بھی میں نے کچھ نہیں بتایا۔"

"پر اللہ وسایا سے تو نے سب کچھ بتا دیا۔"

"ہاں جی، یہ غلطی ہو گئی۔" اُس نے جھک کر رحیم داد کے پیر پکڑ لیے۔" معافی دے دے، اب ایسی غلطی کبھی نہیں ہوگی۔"

"سیدھا بیٹھ۔" رحیم داد نے اُسے ڈانٹا۔ دارا نے اُس کے پیر چھوڑ دیے اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ بہت ڈرا سہما دکھائی دے رہا تھا۔ رحیم داد گردن جھکائے سوچتا رہا۔ کمرے میں خاموشی چھاگئی۔ پھر رحیم داد نے گہری سانس بھری، گردن اُٹھا کر دارا کو دیکھا۔" تو نے اللہ وسایا کو میرے بارے میں بتا کر بہت خطرناک کام کیا۔ وہ جھوٹ بولتا ہے مجھے کوئی بھائی شائی نہیں سمجھتا۔ میری اس کی سخت لگتی ہے۔ حویلی میری ہے۔ میرے نام الاٹ ہو چکی ہے۔ وہ اُس میں پہلے سے رہتا تھا۔ وہ اُسے خالی نہیں کرنا چاہتا۔ تیں نوں کی پتہ، میرا اُس کے ساتھ کیسا زبردست جھگڑا چل رہا ہے۔"

"تب تو جی، مجھ سے سخت غلطی ہو گئی۔" دارا نے تاسف سے کہا۔" اب تو غلطی ہو گئی ہے، تو میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"جو غلطی ہو گئی، اُسے ٹھیک ٹھاک بھی کیا جا سکتا ہے۔"

"کیسے جی؟" دارا نے حیرت سے منہ پھاڑا۔

"اللہ وسایا میرے ہی لیے نہیں، تیرے لیے بھی خطرناک بن گیا ہے۔ وہ پولیس سے مخبری کر کے دونوں کو پکڑوا سکتا ہے۔" رحیم داد نے دارا کو خوف زدہ کرنے کی کوشش کی۔" اب تو ایک ہی رستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ وسایا کو قتل کر کے خطرہ ہی مٹا دیا جائے۔"

"پر اُسے کیسے قتل کیا جا سکتا ہے۔ اُسے کون قتل کرے گا؟"

"تو نے اُسے قتل کرنا ہوگا۔" رحیم داد نے لہجے میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا۔" تو نے غلطی کی ہے، اب تو ہی اسے مٹا بھی سکتا ہے۔"

"میں نے تو جی ایسا کام کبھی نہیں کیا۔" دارا کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔" دیسے میں اکیلا اُسے

کیسے کتل کر سکتا ہوں۔ وہ تو مجھ سے بہت تکڑا اور زور آور ہے۔"

"فکر نہ کر، تو اکیلا نہیں ہوگا۔" رحیم داد نے اُس کا حوصلہ بڑھایا۔ "تیرے ساتھ دینا ہوگا۔ اور بھی کئی بندے ہوں گے۔"

"تو جی یہ کام تو اُنہی سے کیوں نہیں کرا لیتا۔" دارا نے ہاتھ جوڑ دیے۔ "مجھ سے یہ کام نہیں ہوگا۔"

"تجھے بحرین جانا ہے یا نہیں؟"

"جانا تو ہے اور ضرور جانا ہے۔ نہ گیا تو پولیس پکڑ کر اس دفعہ بالکل میری چمڑی ادھیڑ ڈالے گی۔ پتہ نہیں، کیا کیا ظلم کرے۔" اُس کا چہرہ خوف اور دہشت سے مٹیالا پڑ گیا۔

"حوصلے سے کام لے، تو پولیس کے چکر سے بھی بچ جائے گا اور بحرین جا کر کام سے لگ جائے گا۔" رحیم داد نے اُسے پھسلایا۔ "تو پانچ سو مانگتا ہے، میں تجھے ہزار روپے دوں گا۔"

دارا گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگا مگر رحیم داد نے اُسے زیادہ دیر سوچنے کا موقع نہیں دیا۔

"بول کیا کہتا ہے؟"

دارا نے گردن اُٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ "میں نے کرنا کیا ہوگا؟"

رحیم داد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "یہ دینا بتائے گا۔ میں تجھے اس سے ملا دوں گا۔ یوں سمجھ لے، اب تو اُس کے ساتھ ہی رہے گا۔"

"روپیہ کب ملے گا؟" دارا خوف اور دہشت کے حصار سے نکل چکا تھا۔ ہزار روپے کی چکاچوند نے اُسے گھبراہٹ اور پریشانی سے بے نیاز کر دیا تھا۔

رحیم داد چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولا۔ "واردات کے بعد سیدھا میرے پاس حویلی کے مہمان خانے میں آنا۔ اپنی ہزار روپے کی رکم لینا اور رات کے اندھیرے میں چک ۴۸ پہنچ جانا۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔" رحیم داد نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہے جی!" دارا کے لہجے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔

"دروازہ کھول اور رشیدے کو میرے پاس بلا لا۔"

دارا نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور باہر چلا گیا۔ واپس آیا تو شیدا اُس کے ساتھ تھا۔ رحیم داد اُسے دیکھتے ہی بولا" شیدے! جا کر دینے کو ادھر لے آ۔"

تھوڑی دیر بعد شیدا کے ہمراہ دینا آ گیا، ہاتھ جوڑ کر بولا" کیا حکم ہے جی؟"

رحیم داد نے دارا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا" یہ ہاشم ہے میرا پرانا نوکر۔ جو کام شاہ جی کل شام تینوں بتائے گا، اُس میں یہ بھی تیرے ساتھ شریک رہے گا۔"

" ٹھیک ہے جی" دینا نے مستعدی سے جواب دیا۔

" تو اسے لے جا۔ اب یہ تیرے ساتھ ہی رہے گا" رحیم داد نے کہا۔

دینا، دارا اور شیدا کمرے سے چلے گئے۔ رحیم داد بھی زیادہ دیر نہیں ٹھیرا۔ سورج چڑھ کر اوپر آ گیا تھا۔ ہر طرف چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ رحیم داد کمرے سے نکل کر برآمدے میں آیا۔ شیدا اُس کا منتظر تھا۔ رحیم داد اُس کے ہمراہ حویلی کے پھاٹک پر پہنچا۔ اُس کی گھوڑی تیار کھڑی تھی رحیم داد سوار ہوا اور گھوڑی کو ایڑ لگا کر آگے بڑھ گیا۔

نہر سے پہلے جنگل تھا۔ جنگل میں شیشم اور سرس کے گنجان درخت تھے۔ جنگل زیادہ وسیع نہیں تھا مگر خوب گھنا تھا۔ جنگل کے بیچوں بیچ سے ایک راستہ گزرتا تھا۔ رحیم داد نے گھوڑی جنگل کے اندر داخل کی اور اُس کی رفتار سست کر دی۔ درختوں کے نیچے خاصا اندھیرا تھا۔ احسان شاہ کی ہدایت کے مطابق اللہ وسایا کو یہیں لانا تھا۔ رحیم داد نے گردن اُٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ درختوں میں پرندے چہچہا رہے تھے۔ مگر تنہائی اتنی شدید تھی کہ گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ اُس نے گھوڑی کی رفتار تیز کی اور جنگل سے نکل گیا۔ آگے کھلا میدان تھا۔ چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

وہ نہر کے قریب پہنچا۔ آگے پُلیا تھی۔ رحیم داد نہر کے کنارے کنارے گھوڑی دوڑاتا کوٹلہ ہرکشن پہنچ گیا۔ مہمان خانے میں داخل ہوا۔ احمد اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی بولا" آج تو نے واپسی میں بہت دیری کر دی۔ بتا کر بھی نہیں جاتا۔"

رحیم داد نے اُس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا" کیا اللہ وسایا آ گیا؟"

" نہیں جی، ابھی نہیں آیا۔"

رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ تیز دھوپ میں سفر کرنے سے اُس کا جسم شرابور ہو رہا تھا۔ وہ غسل خانے میں گھس گیا۔ نہا دھو کر نکلا تو تازگی اور فرحت محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت وہ دھوتی باندھے ہوئے تھا اور اُس کے اوپر صرف بنیان تھی۔ وہ تھکا ہوا سا بستر پر دراز ہو گیا۔

دوپہر کو وہ کھانا کھانے بیٹھا تو دھوپ غائب ہو چکی تھی۔ باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ شام کو بارش قدرے تیز ہو گئی۔ رحیم داد کمرے سے باہر نہ جا سکا۔ رات کا کھانا بھی اُس نے کمرے میں کھایا۔ پہر رات گزری تو بارش بند ہو گئی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے لیکن ہوا بند تھی۔ کمرے میں حبس تھا۔ رحیم داد کی ہدایت پر احمد نے پلنگ اٹھا کر صحن میں بچھا دیا۔ اُس پر بستر بھی لگا دیا۔ رحیم داد بستر پر نہیں لیٹا۔ تمام دن کمرے میں پڑے رہنے سے وہ اکتا گیا تھا۔ وہ مہمان خانے سے باہر نکلا۔ اُس کا ارادہ کچھ دیر چہل قدمی کرنے کا تھا مگر وہ دور تک نہ جا سکا۔ راستوں میں جگہ جگہ بارش کا پانی کھڑا تھا۔ کیچڑ بھی تھی اور ہر طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ واپس مہمان خانے میں آیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ رات گئے تک اُسے نیند نہیں آئی۔ وہ خاموش لیٹا اُس خطرناک منصوبے کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اللہ وسایا کے قتل کے لیے احسان شاہ نے تیار کیا تھا۔ اُس میں اسے اہم کردار ادا کرنا تھا۔

اُس کے تصور میں بار بار اللہ وسایا سامنے آکر کھڑا ہو جاتا۔ اُس کے دو واضح روپ تھے۔ ایک اللہ وسایا وہ تھا، جس نے اُسے سہارا دیا تھا، پناہ دی تھی۔ اگر وہ اُسے پناہ نہ دیتا تو عین ممکن تھا کہ وہ پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا۔ گرفتاری کے بعد اُس کے خلاف جیل سے فرار ہونے اور سیف اللہ، حکیم صوفی نذر محمد چشتی، چوہدری نور الٰہی اور مولا داد کے قتل کے الزام میں مقدمہ چلتا اور پھانسی کے پھندے پر لٹکا کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ یہ اللہ وسایا، مہربان اور شفیق تھا۔ اس نے نہ صرف اُسے سزائے موت سے بچا رکھا تھا بلکہ اپنی کوششوں سے اس کے نام حویلی کے ساتھ ساتھ دس مربعے بھی الاٹ کروائے تھے۔ اُسے بڑا زمیں دار بنا دیا تھا۔ دوسرا اللہ وسایا وہ تھا جو دارا سے ملنے کے بعد نہایت خطرناک بن گیا تھا۔ وہ کسی بھی وقت پولیس سے مخبری کر کے اُسے تختہ دار تک پہنچا سکتا تھا وہ مختلف ہتھکنڈوں سے حویلی اور زمین دوبارہ اپنے قبضے میں کرنے کے لیے کوشاں تھا۔ رحیم داد ایک بار بڑا زمیں دار بن جانے کے بعد، اس سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اللہ وسایا

کے ساتھ جمیلہ بھی تھی۔ اُس کی دل کشی اور رعنائی سے وہ پہلے ہی روز سخت متاثر ہوا تھا۔ اُسے اپنانے کی خواہش سینے میں کبھی کبھی ہوک بن کر اٹھتی، وہ بے قرار ہو جاتا۔

اُس نے محسوس کیا کہ وہ دوراہے پر کھڑا ہے اور یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہے کہ کون سا راستہ اختیار کرے؟ اللہ وسایا کے قتل کا خیال دل سے نکال دے، کوٹلہ ہرکشن چھوڑ دے اور رات کے اندھیرے میں چھپتا چھپاتا کسی طرف نکل جائے یا احسان شاہ سے ساز باز کر کے اللہ وسایا کو راستے سے ہٹا دے، اُس خطرے سے خود کو محفوظ کرے جو اللہ وسایا کی جانب سے اُسے لاحق تھا۔ اپنی زمین داری برقرار رکھے اور جمیلہ سے نکاح پڑھوا کے اُس کے دس مربعے بھی اپنے قبضے میں کر لے۔ عیش و آرام سے زندگی بسر کرے؟ یہی سوچتے سوچتے اُس کی آنکھ لگ گئی مگر صبح ہونے سے پہلے پھر بارش شروع ہو گئی۔ احمد نے اُس کا پلنگ اٹھا کر کمرے میں ڈال دیا۔ رحیم داد کچھ دیر بعد سو گیا۔

☆

برسات کی بھیگی بھیگی صبح تھی۔

رحیم داد، کمرے سے باہر نکل کر صحن میں گیا۔ احمد موجود نہیں تھا۔ آسمان پر اودی اودی گھٹائیں تھیں۔ ہوا بھیگی ہوئی تھی۔ بار بار کوئی تیز جھونکا آتا اور سرسراتا ہوا گزر جاتا۔

موسم بڑا سہانا تھا۔ فضائیں فرحت اور شگفتگی رچی ہوئی تھی۔ حویلی کا باورچی خانہ زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اُدھر سے ملی جلی آوازوں کے ساتھ پکوان کی تیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ وہ غسل خانے میں گیا، باہر آیا اور کمرے میں پہنچ کر لباس تبدیل کیا۔ اُسے باغ کی جانب سے نسوانی قہقہوں کے ساتھ ساتھ ڈھولک کی تھاپ پر گانے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔

وہ اُس کھڑکی پر پہنچا، جو باغ کے ایک گوشے میں کھلتی تھی مگر اُسے کوئی نظر نہیں آیا۔ کچھ فاصلے پر آم اور جامن کے اونچے اونچے درخت تھے۔ رحیم داد ذرا ترچھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے دیکھا کہ درختوں میں جھولے پڑے تھے۔ گاؤں کی نوجوان مٹیاریں اونچے سُروں میں لہک لہک کر گا رہی تھیں۔ اُن کی سُریلی آوازوں میں جمیلہ کی آواز بھی شامل تھی۔ رحیم داد نے اُس کی آواز پہچان لی

ادھر جھک کر دیکھا۔ درختوں کے جھنڈ کے نیچے اُسے جمیلہ کی ایک جھلک نظر آئی۔ وہ جھولے پر لمبے لمبے پینگ لے رہی تھی، گا رہی تھی اور رک رک کر قہقہے بھی بلند کر رہی تھی۔

بادل ایک بار زور سے گرجے اور بوندا باندی شروع ہو گئی۔ بارش سے بھیگے ہوئے جھونکے کھڑکی کی راہ سے کمرے کے اندر آنے لگے۔ رحیم داد کھڑکی سے ہٹ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد احمد آ گیا مگر ناشتے میں صرف لسی کا ایک گلاس لایا۔

رحیم داد نے اُسے گھور کر دیکھا۔ ”تو سویرے سے اب تک کہاں تھا؟“

وہ دانت نکال کر ہنستے ہوئے بولا ”زمیں دارنی نے آج ساونی منائی ہے۔“ اُس نے باورچی خانے کی جانب ہاتھ اٹھایا۔ ”اِدھر پکوان پک رہا ہے۔ تو ابھی صرف لسی پی لے ورنہ پکوان کھانے کا مزا نہیں آئے گا۔“

رحیم داد نے لسی کا گھونٹ بھر کر دریافت کیا۔ ”زمیں دار ابھی تک نہیں لوٹا؟“

”نہیں جی! وہ ابھی تک تو آیا نہیں۔“ احمد نے بتایا۔ ”پر زمین دارنی اِدھر باغ میں ساونی منا رہی ہے۔ درختوں میں جھولے ڈالے ہیں۔ گانے ہو رہے ہیں۔ آج تو جی زبردست جشن رہے گا۔“

”تو اُدھر نہیں گیا؟“ رحیم داد نے مسکرا کر استفسار کیا۔

”میں نوں اتھے جا کر کی لینا۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ ”اُدھر تو جی سب زنانیاں ہی ہیں۔“ رحیم داد نے لسی پی کر گلاس خالی کر دیا۔ احمد نے گلاس اٹھایا اور باہر چلا گیا۔

باغ کی سمت سے گانے اور قہقہوں کی آوازیں مسلسل بلند ہو رہی تھیں۔ باورچی خانے سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کے ساتھ پکوان کی تیز خوشبو فضا میں بکھرتی جا رہی تھی۔ بارش رفتہ رفتہ تیز ہو گئی۔ اب موٹی موٹی بوندیں گر رہی تھیں۔ اُن کی آواز کمرے کی چھت پر صاف سنائی دے رہی تھی۔ بادل رک رک کر گرج رہے تھے۔ بارش بڑھتی جا رہی تھی۔

کہیں قریب ہی زور کے قہقہے بلند ہوئے۔ رحیم داد اُٹھ کر ایک بار پھر کھڑکی پر پہنچ گیا۔ اُس نے باغ میں جُھک کر دیکھا۔ دائیں ہاتھ کو گل چاندنی کی ایک گھنی جھاڑی کے پیچھے جمیلہ دبک کر چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس نے ایک ہاتھ منہ پر رکھ لیا تھا تاکہ اُس کی ہنسی نہ اُبھرے مگر اُس کے چہرے

پر شوخی اور مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ انگ انگ تازہ مچھلی کے مانند پھڑک رہا تھا۔ جھاڑی سے کچھ ہی فاصلے پر درختوں تلے گانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ گانے والیاں اونچے سروں میں بار بار گیت کا یہ بول الاپ رہی تھیں۔

گدّھے دے پیریے نی!

تیرے روپ نے پائیاں دُھاماں!

گیت کے اس بول کے ذریعے گانے والیاں جمیلہ سے براہِ راست مخاطب تھیں۔ "اے رقص کرنے والی حسینہ! تیرے حسن اور رعنائی نے دھاک بٹھا دی ہے۔" رحیم داد نے جمیلہ کی جانب دیکھ کر سوچا کہ گانے والیاں اس کے بارے میں ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ جمیلہ اس وقت گہرا سبز لاچا باندھے ہوئے تھی۔ اُس کے اوپر نصف آستینوں کی اودی کرتی تھی۔ گورے گورے سڈول بازوؤں پر ہاتھی دانت کا چوڑا تھا۔ پیروں میں چاندی کی پازیب تھی۔ بالوں میں طلّے کا سُرخ اور سنہرا پراندہ تھا جس سے اس کی چوٹی کی لمبائی بڑھ گئی تھی اور کمر کے نیچے جھول رہی تھی۔ اوڑھنی بھاگ دوڑ میں کہیں گر گئی تھی۔ رم جھم میں اُس کا پورا بدن پانی سے اس طرح شرابور تھا کہ لباس جسم کے ساتھ پیوست ہو گیا تھا۔ اُس کے شفاف اور گلابی بدن کے پیچ و خم سنگِ مرمر کے ترشے ہوئے مجسّمے کے مانند اُبھر کر نمایاں ہو گئے تھے۔

رحیم داد نے جمیلہ کو اس عالم میں دیکھا تو تڑپ اُٹھا۔ اُس نے بے قرار ہو کر سوچا، احسان شاہ ٹھیک ہی کہتا ہے، جمیلہ کو اس کے قبضے میں ہونا چاہیے۔ اُس کے بغیر نہ وہ زمیں دار بن سکتا ہے، نہ ہی زمیں داری کا مزا آئے گا۔ رحیم داد نے تصوّر میں پہلی بار اسے اپنی بیوی کی حیثیت سے دیکھا۔ اُس کی سانس تیز ہو گئی، دل کی دھڑکن بڑھ گئی اور وارفتگی سی طاری ہو گئی۔ وہ مبہوت ہو کر اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کے نرم اور گداز جسم کی حرارت اور خوشبو اُس نے اپنے قریب، بہت قریب پائی۔ یہ لذت اُس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

مگر جمیلہ اُس کی بے قراری اور اُس کے احساسات سے بے نیاز ایک الھڑ دوشیزہ کی طرح شوخی سے مسکراتی گل چاندنی کے پودوں کے ساتھ چمٹی کھڑی تھی۔ اُس کے دل آویز چہرے پر بکھرا ہوا تبسّم دم بدم بڑھتا گیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اُس کی ہنسی کی جھنکار سنتے ہی گانے والیاں قہقہے

بلند کرتی ہر طرف سے اُس کی جانب بڑھیں۔ سب ہی نوجوان، تن درست اور چنچل تھیں اور بارش کے پانی سے شرابور تھیں۔ قریب پہنچ کر وہ ٹھٹھا مار کر ہنسیں۔ انہوں نے بڑھ کر جمیلہ کا بازو پکڑا، اُسے آگے کھینچا۔ وہ تملائی اور شرما کر سر جھکا لیا۔ وہ اُس کے گرد حلقہ بنا کر پہلے چٹکیاں بجاتی رہیں پھر دونوں ہاتھ اٹھا اٹھا کر تالیاں بجانے لگیں۔ رفتہ رفتہ تالیوں میں ہم آہنگی پیدا ہوتی گئی۔ ساتھ ساتھ اُن کے جسم ڈولنے اور گردش کرنے لگے۔ وہ اپنے بازو اور گردن لچکاتی، کمر کو خم دیتی اُسے گھیرے میں لے کر رقص کرنے لگیں۔ رقص کرتے کرتے انہوں نے تالیوں کی تھاپ پر ایک گیت چھیڑ دیا۔

گدھا پا لے نی۔

سوَن کد، کد اَونا!

اس دفعہ بھی، وہ جمیلہ سے مخاطب تھیں اور اُسے خاموش پا کر شوخی سے چھیڑ رہی تھیں "سکھی گدھا ناچ لے، ساون روز روز نہیں آتا"۔ جمیلہ گیت کے بول سن کر ذرا دیر تو چپ چاپ کھڑی رہی پھر وہ بھی ہاتھ اٹھا کر تالیاں بجانے لگی۔ اُس نے اپنے جسم کو ایک جھٹکے کے ساتھ لہرایا اور تالیوں کے تال پر رقص کرنے لگی۔ مینہ چھما چھم برس رہا تھا۔ ہوا فراٹے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ بادل گرجتے رہے۔ رقص تیز اور تیز ہوتا گیا۔

رحیم داد کھڑکی سے لگا، دم بخود کھڑا تھا۔ اُس کی بے تاب نگاہیں جمیلہ پر جمی ہوئی تھیں جس کا ترشا ہوا بدن تیز بارش سے بھیگ کر اور نمایاں ہو گیا تھا۔ وہ نوجوان مٹیاروں کے حلقے میں سب سے زیادہ حسین اور دل کش نظر آ رہی تھی۔ رحیم داد اُسے تیکھی اور بھوکی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس پر محویت طاری تھی۔ یکایک اُس نے اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کی حرارت محسوس کی۔ چونک کر پلٹا۔ سامنے اللہ وسایا کھڑا مسکرا رہا تھا۔ رحیم داد نے سراسیمہ ہو کر اُسے دیکھا پھر سراسیمگی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔

"تو کب واپس آیا اللہ وسایا؟"

"تھوڑی ہی دیر پہلے لوٹا ہوں۔ سیدھا تیرے پاس چلا آیا"۔ اللہ وسایا نے بتایا "تجھے دیر سے کھڑا دیکھ رہا تھا پر تو کھڑکی سے لگا ایسا ہکا بکا کھڑا تھا کہ تجھے پتہ نہ چلا"۔ وہ کھل کر مسکرایا۔ "زنانیوں

کو ساؤنی مناتے دیکھ رہا تھا۔"

رحیم داد نے اللہ وسایا کے لہجے میں ہلکا ہلکا طنز محسوس کیا۔ اُس نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔" اکیلے بیٹھے جی گھبرا رہا تھا۔ اُٹھ کر کھڑکی پر چلا گیا۔"

اللہ وسایا نے کھڑکی سے لگ کر دیکھا۔ باغ میں جمیلہ نوجوان عورتوں کے ساتھ تالیاں بجا رہی تھی، ناچ رہی تھی، گا رہی تھی۔ قہقہے لگا رہی تھی، بارش میں بھیگ رہی تھی۔ ساون کا لطف اٹھا رہی تھی۔ اللہ وسایا نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا اور ہنس کر بولا۔" جمیلہ کو دیکھ رہا ہے۔ اسے تو ایسے ہی کھیل تماشوں میں مزا آتا ہے۔ کس طرح خوشی خوشی ناچ رہی ہے۔" اُس کے چہرے پر ایک سنجیدگی چھاگئی۔" مزارعوں کے گھروں کی زنانیاں اور بیٹیاں ہوں، تب بھی ٹھیک ہے۔ پرکمیوں اور لاگیوں کی زنانیوں کے ساتھ ناچتے گاتے، ذرا بھی تو نہیں سوچتی کہ وہ زمیں دارنی ہے۔ اُس کی انہی حرکتوں پر آس پاس کے سارے زمیں دار مجھ سے خار کھاتے ہیں۔"

" ویسے بُرا مناتے کی تو گل ہے جی!" رحیم داد بولا۔" زمیں دارنی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ کچھ تو زمیں داری کی شان رکھنا چاہیے۔"

" منع تو کرتا ہوں پر وہ کہاں سنتی ہے۔" اللہ وسایا نے کہا۔" ہر بار یہی کہتی ہے، تو زمیں دار ہے تو زمیں داری اور اُس کی اکڑ اپنے ساتھ رکھ، میں نوں اس سے کچھ نہیں لینا۔ چوہدری! ذرا سوچ یہ کیسے ہو سکتا ہے، میں اور وہ کوئی الگ تو نہیں ہیں۔"

اللہ وسایا کھڑکی سے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد بھی اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ باغ میں شوخ، چنچل قہقہوں اور تالیوں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ مینہ چھما چھم برس رہا تھا۔ بادل زور زور سے گرج رہے تھے۔ احمد دو نوکروں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے میز اٹھا کر اللہ وسایا اور رحیم داد کے درمیان رکھی اور اُس پر طرح طرح کے پکوان چن دیے۔ اُن میں بھلّے اور پکوڑے تھے۔ پوریاں تھیں۔ باجرے اور مکئی کی میٹھی روٹیاں، ڈوڈا، تھیں۔ سوجی کا حلوہ تھا۔ طرح طرح کے ساگ تھے۔ بھاجی تھی۔ اچار، رائتا، چٹنی، سبھی کچھ تھا۔ پکوان چٹ پٹا بھی تھا، نمکین بھی تھا، میٹھا بھی تھا۔ ساونی کی خاص سوغات، دودھ اور خربوزے کی کھیر بھی تھی۔ باہر سے اُونچے سروں میں گانے کی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔

ساون کھیر نہ کھاری نا۔

کیوں لی جمیوں اپرادھیا!

اللہ وسایا نے رحیم داد کی جانب دیکھا، مسکرا کر بولا "سن رہا ہے چوہدری! باہر زنانیاں کیا گا رہی ہیں؟" اُس نے کھیر کی طرف اشارہ کیا "پہلے اسے کھا" باغ میں لہک لہک کر گانے والیاں بھی گیت کے بولوں میں کہہ رہی تھیں" ساون میں بھی تُو نے کھیر نہیں کھائی۔ ایسی زندگی کا کیا مزا!" دونوں کھلکھلا کر بے تکلفی سے ہنسے۔ انہوں نے پہلے کھیر کھانی شروع کی۔ پکوان ڈھیر سارا تھا۔ ساتھ ہی پیتل کی ایک بڑی بالٹی تھی۔ اُس میں اوپر تک آم بھرے تھے۔

اللہ وسایا نے کھیر کھاتے ہوئے رحیم داد سے پوچھا "میرے پیچھے اِدھر دارا تو نہیں آیا؟"

رحیم داد پریشان ہو گیا مگر اُس نے جلد ہی خود پر قابو پا لیا "میں نے تو اُسے دیکھا نہیں آیا بھی ہوگا تو زمیں دارنی کو پتہ ہوگا۔ میرے پاس نہیں آیا۔ آئے گا بھی نہیں" اُس کے لہجے میں تلخی کا عنصر غالب تھا۔

اللہ وسایا چند لمحے خاموش رہا۔ باغ میں قہقہے اور گانے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اللہ وسایا نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ قدرے نرم لہجے میں دریافت کیا "سچ سچ بتا، تُو نے جس زنانی کو ڈھولے امیر خاں میں کتل کیا تھا، اُس سے تیری یاری تھی؟"

"میں نے کسی کو کتل شتل نہیں کیا" رحیم داد نے اللہ وسایا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ڈھٹائی سے کہا "میں تیرے ساتھ اتنے دنوں سے پھرا ہوں۔ تیں نوں پتہ ہے میں نے اِدھر کتنی زنانیوں سے یاری لگا رکھی ہے"

"تُو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں نوں پتہ ہے، تو ایسا بندہ نہیں۔ برائی زیادہ دن نہیں چھپتی، سامنے آ ہی جاتی ہے" اللہ وسایا نے اظہار اطمینان کرتے ہوئے کہا "پر دارا نے تیرے بارے میں ایسی گل بات کیوں کہی؟" اُس نے لسی کا بڑا گھونٹ بھرا "میں نوں ٹھیک ٹھیک بتا، اصلی گل کی ہے؟"

رحیم داد کو پورا پورا یقین تھا کہ اب اللہ وسایا سے دارا کی ملاقات کا کوئی امکان نہیں لہٰذا

وہ شیر ہو کر بولا۔ "ٹھیک ٹھیک گل تو دارا کو سامنے بٹھا کر ہی ہوگی۔ تو نے بھی پہلے یہی کہا تھا نا۔ اُسے آنے دے، تبھی میں اس معاملے میں گل بات کروں گا۔ تجھے بھی اچھی طرح پتہ چل جائے گا کہ میرے بارے میں اُس نے تجھ سے جو کچھ کہا ہے، اُس میں کتنی سچائی ہے۔"

"ٹھیک ہے، اُس کے آتے ہی پر گل بات ہوگی۔" اللہ وسایا نے بات آگے بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ اُس کے رویے میں کسی قسم کی تلخی یا کدورت نہیں تھی۔

دونوں اطمینان سے پکوان کھاتے رہے۔ اللہ وسایا سے زیادہ نہیں کھایا گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بالٹی سے چھانٹ کر اُس نے ایک آم نکالا اور چوسنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد کھڑکی کی سلاخوں کے پیچھے جمیلہ کا چہرہ اُبھرا۔ بھیگے ہوئے بالوں سے پانی کے قطرے اُس کے شفاف گلابی رخساروں پر ٹپک کر بکھرتے جا رہے تھے۔

جمیلہ نے شوخ نظروں سے اللہ وسایا کو دیکھا، مسکرا کر پوچھا: "تو آ گیا اللہ وسایا؟"

اللہ وسایا نے مڑ کر اُس کی جانب دیکھا، اُس کا پانی سے شرابور جسم دیکھا۔ قدرے تیکھے لہجے میں بولا۔ "میں تو کب کا آ گیا، پر تو کب تک ساونی مناتی رہے گی۔ دیکھ تو پانی سے کتنی بھیگ گئی ہے۔ ختم کر یہ رنگ رنگلیاں۔ جا کر کپڑے بدل۔ بیمار پڑ جائے گی۔"

"ارے ارے۔" وہ ہنس کر بولی۔ "تو اُپدیشک کب سے بن گیا؟" اُس نے شوخی سے آنکھوں کو گردش دی۔ "ساون روز روز نہیں آتا۔ ایک روز تو جی بھر کر ساونی منا لینے دے۔"

"میں تو تیرے ہی بھلے کی کہہ رہا ہوں۔" اللہ وسایا نے پیار سے کہا۔

"میرے بھلے کی چھوڑ۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ "لا مجھے ایک آم تو دے دے۔"

اللہ وسایا نے جھٹ بالٹی میں ہاتھ ڈالا۔ ایک آم نکالا، کھڑکی کے نزدیک گیا۔ آم جمیلہ کی طرف بڑھایا۔ جمیلہ نے انکار میں گردن ہلائی۔ "یہ نہیں۔" اُس نے ہاتھ آگے کیا اور اللہ وسایا کے ہاتھ سے وہ آم اچک لیا جو وہ چوس رہا تھا۔ جمیلہ نے آم چوستے ہوئے محبت سے اللہ وسایا کو دیکھا اور آنکھیں نچا کر بولی۔ "بہت مزے دار ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی اور آم چوستی ہوئی اندر چلی گئی۔

رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اُس کے چہرے پر نفرت اور دکھ کے ملے جلے تاثرات تھے۔

اُس نے تیکھی نظروں سے اللہ وسایا کو دیکھا، جو رحیم داد کے احساسات سے بے نیاز کھڑکی کے نزدیک کھڑا جمیلہ ہی کی سمت دیکھ رہا تھا۔ وہ دیر تک اُسے دیکھتا رہا۔ رحیم داد آہستہ سے کھنکارا۔ اللہ وسایا نے مڑ کر اُس کی جانب دیکھا، زیرِ لب مسکرایا، بالٹی سے ایک آم نکال کر چوستے ہوئے بولا؟،،

،، تو نے آم نہیں کھانے؟،،

اللہ وسایا آہستہ آہستہ قریب آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونوں بالٹی سے آم نکال نکال کر چوسنے لگے۔ آم میٹھے اور خوش ذائقہ تھے۔ انھوں نے خوب سیر ہو کر کھائے۔ آموں سے فارغ ہو کر دونوں نے گلاس بھر بھر کر دودھ پیا۔ نوکر بچا ہوا پکوان اور کھانے پینے کی دوسری اشیا اٹھا کر لے گئے۔ اللہ وسایا پر سفر کی تھکن کا غلبہ ہوا۔ اُس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو گئیں۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا: "چوہدری میں تو اب آرام کرنا ہے، بہت تھک گیا ہوں۔" وہ کمرے سے چلا گیا۔

رحیم داد بھی بستر پر لیٹ گیا۔ باغ میں رم جھم برستی ہوئی بوندوں کے مدھم آہنگ کے ساتھ ساتھ نوجوان عورتوں اور لڑکیوں کے جھنکارتے قہقہے اور سُریلے گیتوں کے بول اُبھر رہے تھے، ڈوب رہے تھے۔ کبھی شور، کبھی خاموشی۔ شور اور خاموشی کے درمیان رحیم داد کا ذہن ٹٹولتا رہا، جمیلہ کی آواز ٹٹولتا رہا، پہچانتا رہا پھر وہ سو گیا۔

اُس کی آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی۔ بارش ابھی بند نہیں ہوئی تھی۔ احمد نے کمرے میں لیمپ روشن کر دیا تھا۔ دوپہر کو اتنا کھا چکا تھا کہ رات کے کھانے کی اُسے کوئی خواہش نہیں تھی۔ اُس نے صرف لسّی کا گلاس پیا اور کمرے سے نکل کر برآمدے میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ صحن میں گرتی ہوئی بارش کی بوندوں کی جھالر ہوا کے تیز جھونکوں سے لہرا رہی تھی۔

رات بھر بارش ہوتی رہی۔ مینہ کی ایسی جھڑی لگی کہ دو روز تک آسمان پر بادلوں کی سرمئی چادر پھیلی رہی۔ تیسرے روز سہ پہر کو بادل ذرا چھٹے۔ اُن کے درمیان سے شیشے کی طرح جھلکتا ہوا نیلا نیلا آسمان نظر آنے لگا۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بادلوں سے دھوپ جھانکنے لگی۔

✡

رحیم داد مسلسل بارش کے باعث کہیں جا نہیں سکا تھا۔ تمام وقت کمرے ہی میں رہا۔ اس عرصے میں

اللہ وسایا سے بھی اُس کی ملاقات نہیں ہوئی۔ جمیلہ سے تو اور زیادہ عرصے سے نہیں مل سکا تھا۔ وہ سویرے سویرے اسکول چلی جاتی۔ دوپہر کو اپنے دونوں بچوں کے ساتھ لوٹتی تو بہت تھکی ہوئی ہوتی۔ شام کو وہ عام طور پر اسکول یا ڈسپنسری کے سلسلے میں کسی نہ کسی سے بات چیت میں مصروف ہوتی۔ کبیر والا سے واپسی کے بعد اُس نے جمیلہ کو جس وقت بھی دیکھا، وہ مصروف نظر آئی۔ اُن دنوں اُس پر ڈسپنسری قائم کرنے کی دھن سوار تھی۔ ڈسپنسری کی تعمیر کا کام اُس نے شروع کر دیا تھا مگر بارش کے باعث ملتوی کرنا پڑا۔

رحیم داد بھی اس عرصے میں دارا کے باعث ذہنی طور پر بہت پریشان رہا۔

وہ مہمان خانے سے نکلا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا اور دھوپ بہت تیز تھی۔ وہ کیچڑ اور پانی سے بچتا بچاتا کچھ دور گیا پھر واپس آگیا۔

شام کو رحیم داد باغ میں پہنچا۔ ہرے بھرے درخت اور پودے بارش کے پانی سے دھل کر نکھر گئے تھے۔ جدھر نظر اُٹھتی، ہریالی ہی ہریالی نظر آتی۔ بادل چھٹ چکے تھے۔ شام کے ہلکے ہلکے دھندلکے میں گہرے نیلے آسمان پر کہیں کہیں تارے ٹمٹمانے لگے تھے۔ رحیم داد کو باغ میں بیٹھے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اللہ وسایا آگیا۔

اللہ وسایا کے چہرے سے پریشانی ٹپک رہی تھی۔ وہ ایک کرسی پر نڈھال ہو کر بیٹھ گیا۔

رحیم داد بولا: "اللہ وسایا تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ تو کمزور اور پریشان نظر آرہا ہے۔"

"میری طبیعت تو ٹھیک ٹھاک ہے۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "پر جمیلہ کو سخت بخار ہے۔ ویسے طبیعت تو اُس کی سویرے سے گڑبڑ تھی۔ خود ہی دوا دارو کرتی رہی۔"

"اب اُس کی طبیعت کیسی ہے؟"

"بہت تیز بخار ہے۔" اللہ وسایا نے کہا۔ "اُس روز ساؤنی مناتی رہی اور بارش میں بھیگتی رہی۔ تیرے سامنے ہی میں نے منع بھی کیا تھا، پر وہ میری سنتی ہی کب ہے۔ اب بخار میں بھن رہی ہے۔ سر میں درد اتنا ہے کہ بار بار سر اِدھر اُدھر ٹپکتی ہے۔"

رحیم داد نے کہا۔ "اب تو شام ہو گئی۔ برکھا سے رستے بھی خراب ہو گئے ہیں۔ پاک پتن جانا اور ڈاکٹر خان کو لانا تو بہت مشکل ہو گا۔"

"یہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔" اللہ وسایا بولا۔" پر کسی ڈاکٹر حکیم کو تو لانا ہی پڑے گا۔ جمیلہ کی طبیعت بہت گڑبڑ ہو رہی ہے۔" اُس کے چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔" سمجھ نہیں آتی کیا کروں۔"

"لگتا ہے، زیں دارنی کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔"

"ہاں جی، بالکل پیلی پڑ گئی ہے۔" اللہ وسایا نے کہا۔" بخار سے سارا بدن جل رہا ہے۔ ہائے ہائے کر رہی ہے۔"

اللہ وسایا گردن جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اُس کے بشرے سے شدید پریشانی جھلک رہی تھی۔ رحیم داد بھی خاموش بیٹھا رہا۔ برسات کی بھیگی بھیگی شام سرمئی پڑ گئی تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے درختوں کے درمیان سے گزرتے۔ سرسراہٹیں اُبھرتیں، ہلکی ہلکی سیٹیاں بجتیں۔ سانولی سلونی شام گنگنا رہی تھی۔

رحیم داد نے نظریں اٹھا کر اللہ وسایا کو دیکھا۔ چند لمحے اُس کا چہرہ تکتا رہا۔ اُس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ اللہ وسایا کو اپنی جانب متوجہ کیا۔" اللہ وسایا! اُدھر عالم پور کے نزدیک ایک پنڈ میں حکیم ہے۔ شکور اُس کی بہت تعریف کرتا ہے۔ ایک بار مجھے بھی اُس کے پاس لے گیا تھا۔ پیٹ میں کچھ گڑبڑ تھی۔ بار بار سخت مروڑ اٹھتی تھی۔ رات بھی زیادہ ہو چلی تھی، درد سے نیند ہی نہیں آتی تھی۔ یہ اُن دنوں کی گل ہے، جب تو اپنی پھپھی کے دیاہ میں شرکت کرنے کیمبل پور گیا تھا۔ حکیم کی دوائی سے میں فوراً چنگا ہو گیا تھا۔ ایسا آرام ملا کہ سویرے دیر تک سوتا رہا۔"

"کتنی دُور ہے وہ پنڈ جہاں حکیم رہتا ہے؟"

"پنج چھ میل سے زیادہ دور نہ ہو گا۔"

"فاصلہ تو کوئی زیادہ نہیں۔" اللہ وسایا نے دلچسپی کا اظہار کیا۔" پر حکیم رات کو یہاں آ بھی جائے گا؟"

"ضرور آ جائے گا۔ ابھی تو شام ہے۔" رحیم داد نے کہا۔" ویسے وہ بہت نیک بندہ ہے۔ میں تو اُس کے پاس آدھی رات کو گیا تھا۔ اُس نے نکھرا نہیں کیا۔ شکور نے ہانک لگائی تو جھٹ باہر آ گیا۔ بہت پیار سے حال پوچھا۔ نبض دیکھی اور دوائی دے دی۔"

"تو کہنا ہے تو اُسی کو لے آتے ہیں۔" اللہ وسایا نے کہا۔" ورنہ رات میں جمیلہ کی طبیعت اور زیادہ

گڑبڑ ہو جائے گی۔ تیں نوں پتہ نہیں، میں اُس کی حالت دیکھ کر کتنا پریشان ہوں۔"

"وہ تو تیرا منہ دیکھ کر ہی پتہ چل رہا ہے۔" رحیم داد بولا۔ "فکر نہ کر۔ حکیم کی دوائی سے تیری گھر والی بالکل چنگی ہو جائے گی۔"

"حکیم کے پاس ہی چلتے ہیں۔" اللہ دسایا کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ اللہ دسایا نے کہا۔ "چوہدری! تو میرا انتظار کر۔ میں ذرا جمیلہ کا حال معلوم کر لوں۔ حکیم پوچھے گا تو کیا بتاؤں گا۔"

رحیم داد نے چونک کر اللہ دسایا کو دیکھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جمیلہ کو یا کسی کو بھی یہ پتہ نہ چلے کہ وہ اس کے ساتھ گیا ہے۔ اُس نے فوراً اللہ دسایا کو منع کیا۔ "زیبں دارنی کو نہ بتانا کہ تو میرے ساتھ حکیم کو لینے جا رہا ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وہ حکیم سے علاج کرانے پر راضی نہیں ہو گی وہ تو ڈاکٹری علاج ہی کو مانتی ہے۔"

"کہہ تو ٹھیک ہی رہا ہے تو۔" اللہ دسایا نے اتفاق کیا۔

رحیم داد نے مشورہ دیا۔ "اُسے تو یہی کہنا ہے کہ تو پاک پتن سے ڈاکٹر خان کو لینے جا رہا ہے۔"

"پر جب ڈاکٹر کی بجائے میں حکیم کو لے کر پہنچوں گا تو کیا ہو گا؟ یہ بھی تو سوچنا پڑے گا۔"

"تب کی تب دیکھی جائے گی۔" رحیم داد نے اُسے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ "ابھی سے کیوں پریشان ہو رہا ہے۔ کہہ دینا، ڈاکٹر نہیں ملا۔ حکیم کو لے آیا ہوں۔ تو ابھی اس کی دوائی پی لے۔ سویرے ڈاکٹر کو بلوا لوں گا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے، حکیم حال سن کر ہی دوائی دے دے اور اُسے لانا نہ پڑے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ حکیم دوائی دے دے تو اچھا ہے۔" اللہ دسایا بولا۔ "اُسے یہاں لانے میں تو دوائی لینے اُس کے ساتھ دوبارہ جانا پڑے گا۔ ڈاکٹروں کی طرح حکیم اپنے ساتھ دوائیاں تو رکھتے نہیں۔ حکیم کو تو لانے کی بجائے حال بتا کر دوائی لینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ آگے اُس کی مرضی۔ جیسا وہ کہے گا، کیا جائے گا۔"

اللہ دسایا حویلی کی جانب بڑھا۔ "میں جلدی ہی واپس آتا ہوں۔"

"میں نہر پر تیرا انتظار کروں گا۔" رحیم داد بہت محتاط تھا۔ "میں گھوڑی لے کر اُسی طرف جا رہا ہوں۔"

"ذرا دیر صبر کر لے۔ میں جلد ہی آ جاؤں گا۔" اللہ دسایا نے اصرار کیا۔

"میں کب کہہ رہا ہوں تُو جلدی نہیں آئے گا"، رحیم داد نے ہنس کر کہا۔" اُدھر ہی آ جائے گا تو کیا حرج ہو گا۔ یہاں اکیلے بیٹھے بیٹھے جی گھبرائے گا۔ پہلے ہی بارش کی وجہ سے کئی روز سے کمرے میں اکیلا پڑا ہوں۔"

"جیسی تیری مرضی"، اللہ وسایا نے ضد سے کام نہیں لیا۔ آگے بڑھ گیا۔

رحیم داد اصطبل کی جانب بڑھا۔ گھوڑی نکالی۔ اُس پر سوار ہوا اور تیزی سے دوڑاتا ہوا نہر کی جانب روانہ ہو گیا۔ نہر میں پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ شام کا سرمئی دھندلکا ہر طرف پھیلتا جا رہا تھا۔ رحیم داد نے نہر کے قریب پہنچ کر گھوڑی روک لی اور اللہ وسایا کا انتظار کرنے لگا۔

مگر اللہ وسایا جلدی نہیں آیا۔ اندھیرا بڑھنے لگا۔ اللہ وسایا کے آنے میں دیر ہوئی تو رحیم داد کو تشویش ہوئی۔ پندرہ سولہ منٹ گزرے ہوں گے کہ دور سے گھوڑا دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ ٹاپیں رفتہ رفتہ نزدیک آتی گئیں۔ اللہ وسایا ایک جھنڈ کی آڑ سے گھوڑی دوڑاتا ہوا نکلا۔ قریب پہنچ کر اُس نے معذرت کے انداز میں کہا۔" معاف کرنا چوہدری، مجھے کچھ دیر ہو گئی۔"

"میں نوں پتہ تھا تُو جلدی نہیں آئے گا۔ زمیں دارنی نے روک لیا ہو گا۔"

"تُو نے ٹھیک سوچا۔" اللہ وسایا ہنسنے لگا۔" جمیلہ نے روکے رکھا۔ بار بار کہتی تھی، اندھیرا ہو گیا، اس سمے نہ جا۔ سویرے ڈاکٹر کو لے آنا۔ میں دیر تک اُسے سمجھاتا بجھاتا رہا، تب اُس نے آنے دیا۔"

رحیم داد نے دیکھا کہ اللہ وسایا کے آگے بندوق رکھی ہے۔ اُس نے مسکرا کر پوچھا۔" تُو بندوک کس لیے لے آیا؟"

"اندھیرا ابھی بڑھ گیا ہے اور آگے احسان شاہ کا پنڈ ہے۔ تیں نوں پتہ ہے اُس سے میری پرانی لگتی ہے۔ اس طرح رات کو مسلح ہو کر ہی چلنا چاہیے۔" اللہ وسایا نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"زمیں دارنی نے بندوک لے جانے کو کہا ہو گا؟"، رحیم داد نے اللہ وسایا کو ٹٹولا۔

"اُسے تو میں نے بتایا ہی نہیں کہ اس طرف جانا ہے۔" اللہ وسایا نے وضاحت کی۔" اُسے تو میں نے یہی بتایا کہ ڈاکٹر خان کو لینے پاک پتن جا رہا ہوں۔"

"تُو اِدھر آنے کو کہتا تو وہ تجھے ضرور روک لیتی۔"

"بالکل۔" اللہ وسایا نے تائید کی۔" رات کو تو وہ مجھے ہرگز اس طرف نہ جانے دیتی۔"

دونوں نے اپنی اپنی گھوڑی کو ایڑ لگائی اور نہر کے کنارے کنارے گھوڑیاں دوڑانے لگے۔ کیچڑ اور اندھیرے کے باعث وہ بہت محتاط نظر آ رہے تھے۔ جھٹ پٹے میں دونوں آ گئے اور آگے بڑھتے گئے۔ سناٹا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی گاؤں قریب آتا تو گھروں کی روشنیاں دور سے ٹمٹماتی نظر آتیں۔ مویشیوں اور انسانوں کی ملی جلی مدھم آوازیں بھی سنائی دیتیں۔ ابھی گاؤں جاگ رہے تھے۔ نہر کا پانی گنگنا رہا تھا۔ آس پاس کے جھنگروں میں مینڈک زور زور سے ٹرا رہے تھے۔

دونوں نہر کی پلیا سے آگے بڑھے تو اللہ وسایا نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر دیکھا۔ وہ رحیم داد کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اُس کی جانب گردن بڑھا کر بولا "چوہدری! اب چوکس رہنا ہو گا۔ یہ رستہ خطرناک ہے۔ یہاں سے احسان شاہ کا علاکہ لگتا ہے۔"

"میں تو اِس رستے سے کئی بار گزرا ہوں۔ میں نے کبھی کھٹکا محسوس نہیں کیا۔" رحیم داد نے اُسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"تیری بات اور ہے۔" اللہ وسایا بولا "شاہ جی تو مجھ سے خار کھاتا ہے۔"

"حوصلے سے کام لے۔" رحیم داد نے کہا "تیرے پاس تو بندوک ہے اور بھری ہوئی بھی ہو گی؟"

"بھری ہوئی تو ہے، پر ہم دو ہی ہیں اور بندوک صرف ایک ہے۔" اللہ وسایا نے صورتِ حال رحیم داد پر واضح کرتے ہوئے کہا "احسان شاہ کے پاس تو مسلح غنڈوں کی پوری پلٹن ہے۔"

"ایسا ہے تو بندوک مجھے دے دے۔ میں آگے آگے چلتا ہوں۔" رحیم داد نے ہاتھ بڑھا کر بندوق مانگی۔ اللہ وسایا نے سادگی سے دے بھی دی، ہنس کر بولا "تیری مرضی ہے تو رکھ لے۔ ویسے میں ڈرنے مرنے والا بندہ نہیں۔ پہلے بھی احسان شاہ کئی بار مجھ پر کاٹلانہ حملے کرا چکا ہے پر کبھی سامنے نہیں آیا۔"

رحیم داد نے بندوق سنبھال کر آگے رکھ لی۔ گھوڑی کو ایڑ لگائی اور اللہ وسایا سے کچھ دور آگے نکل گیا۔ اللہ وسایا اُس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ دونوں آگے بڑھے تو شیشم اور سرس کے درختوں کے جھنڈ نظر آنے لگے۔ یہی وہ جنگل تھا جس میں احسان شاہ کے منصوبے کے مطابق دینا کو دارا اور دوسرے مسلح افراد کے ہمراہ موجود ہونا چاہیے تھا۔ رحیم داد نے اُس راہ پر گھوڑی ڈال دی جو جنگل کے درمیان سے

گزرتی تھی۔ اللہ دسایا نے گھوڑی بڑھائی۔ رفتار کسی قدر تیز کی۔ رحیم داد کے قریب پہنچا اور اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

دونوں گھنے درختوں کے نیچے تھے۔ شام کا مدھم اجالا شاخوں کے درمیان سے کہیں کہیں جھانک رہا تھا مگر ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ وہ چند ہی قدم آگے بڑھے ہونگے کہ دبی دبی آہٹیں اُبھریں مگر کوئی نظر نہیں آیا۔

اللہ دسایا نے خطرے کی بو محسوس کی۔ اُس نے رحیم داد سے جھجکتے ہوئے کہا" چوہدری! تُو نے ٹھیک رستہ نہیں پکڑا۔ یہ بہت ہی خطرناک بیلا ہے"

رحیم داد زور سے کھنکارا اور گھوڑی آگے بڑھاتے ہوئے اونچی آواز سے بولا" اللہ دسایا! حوصلے سے کام لے۔ رستہ ہی کتنا ہے۔ ذرا دیر میں بیلے سے دونوں باہر ہوں گے۔ گھوڑی تیز کر"

رحیم داد گھوڑی تیزی سے دوڑاتا آگے نکل گیا۔ اللہ دسایا نے بھی رفتار تیز کی مگر چند ہی قدم چلنے کے بعد گھوڑی زور سے ہنہنائی۔ اللہ دسایا نے دھندلی روشنی میں دیکھا کہ راستے میں موٹی رسی تنی ہے۔ اُس نے رکابیں سنبھال کر گھوڑی روکنے کی کوشش کی مگر اس کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ وہ رک نہ سکی۔ رسی سے اُلجھی اور لڑکھڑا کر گر پڑی۔ اللہ دسایا بھی اس کے ساتھ ہی لڑھک کر نیچے آگیا۔

وہ زمین پر آتے ہی زور سے چیخا" چوہدری! بندوک مجھے دے"

اسی وقت ایک طرف سے ٹارچ کی تیز روشنی اُبھری۔ رحیم داد نے گھوڑی روک لی۔ پلٹ کر دیکھا، ٹارچ کی تیز روشنی میں اللہ دسایا زمین پر پڑا تھا اور اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر بے بسی سے پکار رہا تھا" چوہدری! چوہدری!! تو کدھر چلا گیا" اللہ دسایا نے اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ درختوں کے نیچے سے سات آٹھ آدمی نکلے اور اللہ دسایا کی جانب تیزی سے بڑھے۔ اُن کے چہروں پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے۔ وہ بندوقوں، کلہاڑیوں، گنڈاسوں اور دوسرے خطرناک اسلحے سے لیس تھے۔ انہیں دیکھ کر اللہ دسایا تڑپ کر چیخا" چوہدری!" مگر وہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ ڈھاٹے باندھے ہوئے افراد چاروں طرف سے جھپٹے اور اللہ دسایا کو دبوچ لیا۔ ایک بار وہ زور

لگا کر اُن کی گرفت سے نکل گیا، تیزی سے پلٹا اور دوڑ کر فرار ہونے کی کوشش کی مگر پیچھے سے کسی نے گنڈاسے کا ایسا بھرپور وار کیا کہ اُس کا تیز پھل کئی اِنچ اللہ وسایا کے سر کے اندر اتر گیا۔

اللہ وسایا کے حلق سے ہائے کی دل دوز چیخ نکلی۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اُس کا چہرہ خون سے لت پت ہو گیا تھا۔ حملہ آوروں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اللہ وسایا کی مشکیں کس لیں۔ ٹارچ کی روشنی بجھ گئی۔ ہر طرف گہرا اندھیرا چھا گیا۔

رحیم داد نے اللہ وسایا کی بندوق وہیں پھینک دی۔ گھوڑی کی باگ موڑی۔ رفتار تیز کی اور جنگل سے باہر نکل گیا۔

۲۲

گاؤں کی چہل پہل اجڑ چکی تھی ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ گھروں سے کہیں کہیں روشنی جھلک رہی تھی۔ رات کالی کاجل بن چکی تھی۔ بادل گھر گھر کر آرہے تھے۔ آسمان تاریک ہو گیا تھا۔ ہوا تیز اور بھیگی ہوئی تھی۔ رحیم داد گھوڑی دوڑاتا حویلی کے باڑے پہنچا۔ باڑے کے مویشیوں کی گردنوں میں پڑی ہوئی پیتل کی گھنٹیوں اور گھنگرالوں کی جھنکار سناٹے میں رک رک کر ابھر رہی تھی۔ باڑے کا رکھوالا دروازے پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی جھٹ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد گھوڑی سے نیچے اترا۔ رکھوالے نے بڑھ کر راسیں سنبھال لیں۔

رحیم داد آگے بڑھا تو رکھوالے نے ٹوکا۔ ”زمیں دار تیرے ساتھ نہیں لوٹا؟“

”زمیں دار؟“ رحیم داد پہلے تو گھبرایا پھر سنبھل کر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ تو میرے ساتھ نہیں گیا تھا۔ کدھر ہے وہ؟“

”یہ تو جی میں نوں پتہ نہیں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ ”تیرے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ بھی گھوڑی لے کر نکلا تھا۔ میں سمجھا آگے تجھے مل گیا ہو گا۔ وہ بھی سوئے کی طرف گیا تھا۔“

”سوا تو سامنے ہی ہے۔“ رحیم داد نے نہر کی سمت ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”وہ ادھر تو نہیں پہنچا۔ کہیں اور گیا ہو گا۔ آتا ہو گا۔“

رحیم داد مہمان خانے کی جانب روانہ ہوا۔ رکھوالا گھوڑی کی راسیں سنبھالے اصطبل کی جانب بڑھا۔ رحیم داد مہمان خانے میں گیا۔ دروازہ کھلا تھا مگر احمد موجود نہیں تھا۔ رحیم داد نے اطمینان کی

سانس لی۔ وہ اس وقت احمد سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ احمد مہمان خانے میں ہوتا تو ضرور بات کرتا، عین ممکن تھا کہ اللہ دسایا کے بارے میں پوچھتا۔ رحیم داد پر گھبراہٹ اور پریشانی نے یلغار کر رکھی تھی۔ اس عالم میں نہ جانے کیا بات زبان سے نکل جاتی۔

رحیم داد نے صحن عبور کیا۔ کمرے کے آگے برآمدے میں اس کا پلنگ بچھا تھا۔ بستر بھی لگا ہوا تھا۔ اندر کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ رحیم داد کمرے میں گیا، کپڑے اتارے دھوتی باندھی۔ لیمپ کی لَو مدھم کی اور نڈھال ہو کر بستر پر دراز ہو گیا۔ اس نے رات کا کھانا کھانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بھوک ہی نہیں تھی۔ وہ دم بخود لیٹا رہا۔ دُور دُور تک نیند کا نام و نشان نہیں تھا۔ وہ شدید ذہنی اُلجھن میں مبتلا تھا۔ اُسے رہ رہ کر اللہ دسایا یاد آ رہا تھا۔ اُس کا خون میں لتھڑا ہوا چہرہ یاد آ رہا تھا، اُس کا تڑپ کر بار بار "چوہدری! چوہدری!!" پکارنا یاد آ رہا تھا۔

اس پر خوف، اور دکھ کے ملے جلے احساسات کا غلبہ تھا۔ وہ بے چین ہو کر اِدھر اُدھر کروٹ بدلتا مگر کسی پہلو قرار نہ آتا۔ آنکھیں بند کرتا۔ نیند کو بلانے کی کوشش کرتا مگر نیند روٹھی ہوئی تھی۔ اندھیرا کچھ اور گاڑھا ہو گیا۔ سناٹا زیادہ گہرا ہو گیا۔ رات دم بخود کھڑی تھی۔ یکایک گہری خاموشی میں مہمان خانے کے باہر کتوں کے زور زور سے رونے کی آواز ابھری۔ رحیم داد نے بدحواس ہو کر آنکھیں کھول دیں، کروٹ بدلی اور اُس دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔ جو مہمان خانے کے باہر میدان میں کھلتا تھا۔ کتوں کے رونے کی ڈراؤنی آوازیں سناٹے میں رک رک کر اُبھرتی رہیں۔

رحیم داد چپ لیٹا تھا۔ ذرا دیر بعد حویلی سے مہمان خانے میں داخلے کا دروازہ آہستہ سے چرچراتا ہوا کھلا۔ صحن میں قدموں کی آہٹ ابھری۔ رحیم داد کو گمان گزرا کہ احمد آیا ہو گا۔ اس وقت وہ اُس سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور مُسٹ مارے اس طرح خاموش پڑا رہا گویا بے خبر سو رہا ہو۔ چاپ رفتہ رفتہ قریب آتی گئی اور اس کے پلنگ کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ رحیم داد نے آنکھیں کھولیں نہ کروٹ بدلی۔ چند لمحے خاموشی سے گزرے پھر اُسے اپنے سرہانے چوڑیوں کی ہلکی ہلکی کھنک سنائی دی، ساتھ ہی آواز ابھری۔

"چوہدری! تُو سو گیا؟"

رحیم داد نے آواز پہچان لی۔ یہ احمد کی بیوی تھی۔ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر سوچا کہ اتنی رات گئے وہ اُس کے پاس کیوں آئی ہے؟ معاً اُسے خیال آیا۔ کہیں جمیلہ کی طبیعت زیادہ خراب تو نہیں ہو گئی؟ رحیم داد خاموش پڑا رہا۔ احمد کی بیوی زیادہ دیر چپ نہیں رہی۔ اُس نے رحیم داد کا بازو پکڑ کر آہستہ سے جھنجوڑا اور کسی قدر اونچی آواز سے بولی۔

"چوہدری! چوہدری!"

اب رحیم داد کے لیے چپ پڑے رہنا ممکن نہ رہا۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں اور دونوں ہاتھوں سے انہیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ احمد کی نوجوان بیوی اُس کے سرھانے کھڑی تھی۔ لیمپ کی مدھم روشنی اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اُس کا رنگ سانولا تھا مگر نقش و نگار تیکھے تھے۔ جسم سڈول اور صحت مند تھا۔

"میں حمدے کی گھر والی ہوں" وہ مسکرا کر بولی "میرا نام تاراں ہے جی۔"

اس کی مسکراہٹ سے رحیم داد کو اندازہ ہو گیا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ وہ حیرت کے انداز میں بولا "یہ تو میں نوں بھی پتہ ہے کہ تو حمدے کی گھر والی ہے، پر اتنی رات کو تو یہاں کیوں آئی ہے؟"

"وہ ایسا ہے جی، حمدے کو شام سے بکھار ہے۔ اُسی نے تیرے پاس بھیجا ہے۔ تو نے روٹی نہیں کھائی، بھوکا ہی سو گیا" تاراں ایک بار پھر الھڑ پن سے مسکرائی "تیرے لیے روٹی لے آؤں۔ روٹی کھالے، فیر آرام نال سو جانا۔"

رحیم داد منہ بگاڑ کر بولا "میرے پیٹ میں گڑبڑ ہے، روٹی نہیں کھاؤں گا۔"

تاراں خاموش کھڑی رہی۔ رحیم داد کا جی چاہا کہ وہ اس سے جمیلہ کی طبیعت کا حال معلوم کرے لیکن صورت حال کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ایسی بات نہ پوچھے اور زیادہ سے زیادہ محتاط رویہ اختیار کرے۔ وہ چپ رہا لیکن جو بات معلوم کرنا چاہتا تھا، وہ خود بخود تاراں کی زبان پر آ گئی "آج کل جی موسم بھی بہت گڑبڑ ہے۔ حمدے کو بکھار ہے۔ زمیں دارنی کو بھی بکھار ہے۔ پر اب تو اس کی طبیعت ٹھیک لگتی ہے۔ آرام نال سو رہی ہے۔ میں تھوڑی دیر پہلے اُس کے پاس گئی تھی۔" اُس کے چہرے پر ہلکی سی پریشانی چھا گئی۔ لہجے سے بھی تشویش جھلکنے لگی "پر زمیں دار اب تک نہیں لوٹا جی۔ وہ ڈاکٹر

لینے گیا تھا۔"

رحیم داد نے اُس کی تشویش نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا" زمیں دارنی کو کب بخار ہوا؟"

"وہ جی ایسا ہے، اُس نے پچھلے دنوں ساوَنی منائی تھی۔ برکھا میں سارا دن بھیگتی رہی، اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کرتی رہی۔ جھولا جھولتی رہی۔ فیر بکھار تو آنا ہی تھا۔" اُس نے شوخی سے آنکھوں کو گردش دی" میں نے بھی جی اُس کے ساتھ ساوَنی منائی تھی۔ بھیگی بھی بہت تھی، پر اپنے کو تو کچھ ہوا نہیں۔"

"تو زمیں دارنی سے بھی زیادہ جوان ہے۔" رحیم داد نے اُسے چھیڑا۔

"پر اپنی زمیں دارنی ہے بہت سُندر۔"

"ویسے تو بھی کم سوہنی نہیں۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا" حمدے کا نصیب تکڑا ہے کہ اُسے تیری ایسی اچھی گھر والی ملی۔"

"پر وہ میری کب پروا کرتا ہے۔" تاراں نے گلہ کیا" وہ تو جی پنڈ کی ایک مٹیار کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ اُس کا نام شندّو ہے۔ ویسے اُس نے اور بھی کیٹوں سے یاری لگا رکھی ہے۔ بہت تیز ہے۔" اُس کا لہجہ قدرے تلخ ہو گیا" میں نے کتنی بار حمدے کو منع کیا، منت سماجت کی، جھگڑا ٹنٹا کیا پر اُسے تو جب موکع ملتا ہے، شندّو کے گھر کی طرف نکل جاتا ہے۔ ایک بار تو اُس کے سامنے ہی میں نے حمدے سے جھگڑا کیا پر وہ باز نہیں آتا۔ اب بکھار میں پڑا ہائے ہائے کر رہا ہے۔ مجھ پر حکم چلاتا ہے۔ سر دبا دے، دودھ گرم کر کے پلا دے۔ یہ کر دے، وہ کر دے۔" اُس کی زبان کترنی کی طرح چل رہی تھی" اب تیرے پاس بھیجا ہے کہ روٹی کھلا دوں۔"

تاراں سے باتیں کر کے رحیم داد کو قدرے سکون ملا۔ اُس کا ذہنی کرب دب گیا۔ رحیم داد نے ذہنی خلفشار سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اُس کی جوانی نے انگڑائی لی۔ موسم بھی فتنہ انگیز تھا۔ بادل رک رک کر گرج رہے تھے۔ بوندا باندی شروع ہو گئی۔ رات اندھیری اور سنسان تھی اور تاراں اس کے قریب کھڑی تھی۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں اُس کا چہرہ نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔ اسے کسی لمحے قرار نہ تھا۔

رحیم داد تیکھی نظروں سے اُسے ٹٹولنے لگا۔ اب اُسے اللہ وسایا کا ڈر بھی نہیں تھا۔ اب وہی

گاؤں کا زمیں دار تھا اور زمیں داری کا ٹھاٹ باٹ اور دبدبہ وہ احسان شاہ کی حویلی میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور یہ بھی جان چکا تھا کہ زمین کے ساتھ ساتھ مزارعوں اور کمیّوں کی نوجوان بیویاں اور بیٹیاں بھی بڑے زمیں داروں کی ملکیت ہوتی ہیں۔ زمیں دار جب چاہے اور جسے چاہے اٹھوا لے اپنی حویلی میں ڈال لے۔ جب تک جی چاہے، اسے داشتہ یا کھیل بنا کر اپنے پاس رکھے اور جب جی چاہے، کسی دوسرے زمیں دار کے ہاتھ فروخت کر دے، قیمت لے کر یا بلا قیمت واپس کر دے۔ مزارع اور کمّی نہ اُس کے خلاف احتجاج کر سکتا ہے، نہ قانون اُس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔

رحیم داد نے تاراں کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ مسکرا کر گویا ہوا۔ "لے اب تو برکھا شروع ہو گئی۔ کہاں بھیگتی ہوئی جائے گی۔ تو بھی بیمار پڑ جائے گی۔ یہیں ٹھیر جا۔ سویرے چلی جانا۔"

تاراں اُس کی بھوکی نظروں کی تاب نہ لا سکی۔ اُس نے شرما کر پھلکاری کے پلّو سے اپنا سر ڈھکا اور آہستہ سے بولی: "نہیں جی، میں نوں جانا ہے۔ حمدا بکھار میں بھُن رہا ہے۔ نہ گئی تو بہت نراض ہوگا۔"

"چلی جانا، ایسی جلدی کیا ہے۔" رحیم داد نے اُسے روکنے کی کوشش کی۔ "حمدے سے تو کیوں ڈرتی ہے۔ وہ تیرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔"

"ایسی گل نہیں۔" وہ آنکھیں نچا کر بولی۔ "نراض ہونا ہے تو مارنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ تیں نوں پتہ نہیں، وہ کیسا زور آور ہے۔"

"زور آور!" رحیم داد حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر ہنسا۔ "تو نے بھی حد کر دی۔ دیکھنے میں تو وہ ڈڈا لگتا ہے۔" رحیم داد نے مڑ کر صحن کی طرف دیکھا۔ بارش کسی قدر تیز ہو گئی تھی۔ ہوا کے بپھرے ہوئے جھونکوں کے ساتھ مینہ کی ہلکی ہلکی پھوار برآمدے میں آ رہی تھی۔ تاراں قریب کھڑی تھی، اتنے قریب کہ اُس کے بوسیدہ لباس سے اٹھتی ہوئی پسینے کی تیز بُو اُس کے نتھنوں میں داخل ہو رہی تھی۔ رحیم داد نے تاراں کو نیچے سے اوپر تک دیکھا۔ "نہا دھو کر کپڑے تو اُجلے پہنا کر۔"

"حمدا مجھے کپڑے لتّے لا کر دیتا ہی کب ہے۔" اُس نے منہ بگاڑ کر شکوہ کیا۔ "اُسے میری ذرا پروا نہیں۔"

رحیم داد نے بے تکلفی سے مسکرا کر کہا۔ "تو بھی اُس کی پروا کرنا چھوڑ دے۔ میں تیرے لیے

اتنے ڈھیر سے کپڑے لتے بنوا دوں گا کہ روز نئے نئے پہننا۔ فکر نہ کر، حمدا تجھ پر اب نراض نہیں ہوگا۔"
اُس نے لہجے میں دبدبہ پیدا کرنے کی کوشش کی" میں نوں بھی دیکھنا ہے، وہ کیسے نراض ہوتا ہے۔
میں اُس کی چمڑی ادھیڑ ڈالوں گا۔" رحیم داد نے گردن اونچی کی، مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور تاراں
کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔

وہ خاموش رہی۔ اُس نے سہمی ہوئی نظروں سے حویلی میں کھلنے والے دروازے کی جانب
دیکھا۔ دبی زبان سے کہا:" حمدا میرا انتظار کرتا ہوگا۔ وہ ابھی سویا نہیں۔" وہ آگے بڑھی۔

رحیم داد نے اُسے روکنے کی کوشش کی۔" کہاں چلی؟"

اُس نے مسکرا کر رحیم داد کو دیکھا۔" میں نوں اب جانے دے۔ حمدا سو جائے گا تو تیرے پاس آجاؤں
گی۔" وہ تیز قدموں سے صحن میں پہنچی اور بارش سے بچتی بچاتی حویلی کی سمت بڑھی، ذرا دیر
بعد اندھیرے میں غائب ہوگئی۔

رحیم داد بستر پر لیٹ گیا اور مڑ مڑ کر بے چین نگاہوں سے وہ دروازہ تکنے لگا، جس سے
گزر کر تاراں نظروں سے اوجھل ہوئی تھی۔ رم جھم ہوتی رہی۔ رات دھیرے دھیرے اپنا سفر طے
کرتی رہی مگر تاراں نہیں آئی۔ رحیم داد انتظار کرتے کرتے سو گیا۔

☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ رحیم داد کی آنکھ آہٹ سے کھُل گئی۔ مہمان خانے کے
بیرونی دروازے پر آہستہ آہستہ آہٹ ہو رہی تھی۔ بارش اب تھم گئی تھی۔ رحیم داد خاموش لیٹا رہا
اور چوکنّا نظروں سے دروازہ تکتا رہا۔ دروازے پر کوئی رک رک کر ہولے ہولے دستک دے رہا تھا۔
رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ زور سے کھنکارا، پلنگ سے نیچے اُترا۔ آگے بڑھا۔ صحن کا کچّا فرش بارش
سے تر بتر تھا۔ ہر طرف پانی تھا، کیچڑ تھی، وہ سنبھل سنبھل کر دروازے پر پہنچا اور چند لمحے حیران و
پریشان کھڑا رہا پھر اُس نے ہاتھ بڑھا کر کنڈی کھولی اور ایک پٹ آہستہ سے کھینچا۔ اندھیرے میں کوئی
سائے کی مانند کھڑا تھا۔ اُس نے فوراً سرگوشی کی۔

"چوہدری! میں دارا ہوں۔"

رحیم داد نے اُسے پہچان لیا۔ دھیمے لہجے میں بولا "اندر آجا۔"

دارا اندر آگیا۔ رحیم داد نے جھٹ زنجیر چڑھا دی، برآمدے کی سمت ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "تو اُدھر چل۔" دارا برآمدے کی طرف چلا۔ رحیم داد آہستہ آہستہ حویلی کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا، دروازے کی کنڈی لگائی اور واپس برآمدے میں آیا۔ لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں دارا خاموش کھڑا تھا۔ اُس کے پیر کیچڑ میں لت پت تھے۔ لباس بھی بھیگا ہوا تھا۔ رحیم داد بستر پر پیر لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اُس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"اللہ وسایا کا کیا بنا؟"

"اُسے تو تیرے جاتے ہی ختم کر دیا گیا تھا۔" دارا نے بتایا۔

رحیم داد لرز کر رہ گیا۔ اُس کے ذہن میں غبار منڈلانے لگا۔ سینے سے دھواں اٹھا۔ وہ خاموش بیٹھا خود پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا پھر اُس نے جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔

"اُسے کس نے ختم کیا؟"

"میں نے کیا۔" دارا نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں سے سرخی جھلک رہی تھی اور چہرے پر وحشت طاری تھی۔ وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ "چوہدری! پانی پلا دے۔ میں نوں تو جیسے بھڑک لگ گئی۔ رستے بھر نہر سے پانی پیتا رہا۔ پر پیاس نہیں بجھی۔"

رحیم داد نے کمرے کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا "اندر چلا جا۔ میز پر جگ میں پانی بھرا ہے۔ گلاس بھی پاس رکھا ہے۔ جتنا جی چاہے پی لے۔"

دارا کمرے میں چلا گیا۔ وہ پانی پی کر آیا تو کسی قدر پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ وہ رحیم داد کے سامنے فرش پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد نے دریافت کیا "گولی چلائی تھی یا کلہاڑی سے قتل کیا تھا؟"

"ایک نہیں، دو گولیاں چلائی تھیں۔" دارا نے بتایا "دونوں ٹھیک نشانے پر بیٹھیں۔ پہلی سینے میں لگی، دوسری سر میں۔ تیں نوں پتہ ہے، میں بھی زمیندار رہ چکا ہوں۔ بہت شکار کھیلا ہے۔

نشانہ بہت اچھا ہے۔ پہلی گولی کھا کر، وہ زور سے تڑپا پر دوسری پر نہ سنبھل سکا۔ اُس نے دم توڑ دیا، چند منٹ میں سارا کھیل ختم ہو گیا۔"

"دینے نے گولی نہیں چلائی؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"نہیں جی۔" دارا بولا۔ "جب اللہ وسایا نے نکل بھاگنے کی کوشش کی تو اس پر دینے نے ہی گنڈاسا چلایا تھا، سر پر لگا تھا۔ اس چوٹ کے ساتھ ہی وہ گر پڑا۔ تو اُس وقت تو موجود ہی تھا۔"

"دینے نے گولی نہیں چلائی، یہ تو اچنبھے کی گل ہے۔"

"شاہ جی سے پوچھ لے۔ وہ تو موجود ہی تھا۔" دارا نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "دونوں بار گولی میں نے ہی چلائی تھی۔"

"شاہ جی وہاں کب پہنچا تھا؟"

"لگتا ہے تیں نوں کچھ پتہ نہیں۔" دارا نے تفصیل بیان کی۔ "ہوا یہ کہ سورج ڈوبتے ہی دینا، میں اور دوسرے بندے بیلے میں پہنچ گئے۔ ساری سکیم تو پہلے ہی سے تیار تھی۔ دو بندے نہر کی پلی سے کچھ آگے لگا دیے گئے تھے۔ انہوں نے جیسے ہی تم دونوں کی گھوڑیاں دوڑنے کی آواز سنی، فوراً بھاگتے ہوئے آئے اور اطلاع دی۔ اطلاع ملتے ہی سب گھات لگا کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ شاہ جی بھی اسی وکت پہنچا تھا۔ ویسے اُس کا ادھر آنے کا بالکل پروگرام نہیں تھا۔ دینے نے یہی بتایا تھا۔ جانے وہ کیوں آگیا۔ اُسی نے سب کی ڈیوٹی لگائی۔" دارا نے رحیم داد کا پریشان چہرہ غور سے دیکھا۔ "شاہ جی تو جی، ایک نمبر خرانٹ لگتا ہے۔ سارا کام اس طرح کرایا کہ ذرا بھی گڑبڑ نہیں ہوئی۔"

"پر یہ سارا کام ہوا کیسے؟" رحیم داد نے مزید تفصیل معلوم کرنے کی غرض سے استفسار کیا۔ وہ خود کو زیادہ سے زیادہ باخبر رکھنا چاہتا تھا۔ "میں جب وہاں سے چلا تھا، اللہ وسایا چوٹ کھا کر زمین پر پڑا تھا۔"

"تیرے جانے کے بعد وہی رسی کام میں لائی گئی جسے رستے میں تان کر اُس کی گھوڑی کو گرایا گیا تھا۔" دارا نے بتایا۔ "وہ ایسے ہوا جی کہ اللہ وسایا کو زمین سے اٹھایا گیا اور ایک درخت کے ساتھ رسی سے باندھ دیا گیا۔ شاہ جی نے بندوک مجھے دے دی۔ اُس نے رسی سے بندھے ہوئے اللہ وسایا

پر ٹارچ سے روشنی ڈالی۔ میں نے دیکھا اُس کے کپڑے ستے۔ کیچڑ سے گندے ہو گئے تھے۔ پگ ایک طرف پڑی تھی، اُس کی گردن جھکی ہوئی تھی اور سر کے بال بکھر کر منہ پر پھیل گئے تھے۔ ان میں بھی کیچڑ اور مٹی لگی ہوئی تھی۔" اُس نے لمبی سانس بھری۔" اللہ وسایا نے گردن اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اُس کا منہ خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ وہ زور زور سے ہانپ رہا تھا۔" اُس کے چہرے پر دکھ کا ہلکا ہلکا غبار پھیل گیا۔ "سچی گل ایہہ ہے جی، مجھے اُس پر اتنا ترس آیا کہ میں بندوک تان کر نشانہ باندھے کھڑا رہا۔ مجھ سے گولی نہیں چلائی گئی۔ تب شاہ جی نے نراض ہو کر زور سے ڈانٹا، گولی چلا۔ اُس کی ڈانٹ کے ساتھ ہی میں نے گولی چلا دی۔ دوسری بھی اُس کے کہنے پر چلائی۔"

"اللہ وسایا کی لاش کا کیا بنا؟"

"وہ دینے نے ٹھکانے لگا دی ہوگی۔ جیسا شاہ جی نے کہا ہوگا، اُس نے ویسا ہی کیا ہوگا۔" دارا نے جواب دیا۔" گولی مارنے کے بعد شاہ جی نے مجھ سے کہا، تیرا کام ختم ہوگیا۔ اب تُو ٹر جا۔ میں فوراً اِدھر آنے کے لیے بیلے سے باہر آگیا۔ آگے کیا ہوا، میں نوں کچھ پتہ نہیں۔"

"اللہ وسایا کی گھوڑی کہاں گئی؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"میں نے تو سُنا ہے جی! شاہ جی زبردست رسّہ گیر ہے۔ اللہ وسایا کی گھوڑی کو چھپانے کے لیے اُس نے اپنے بندوں کے ذریعے فوراً اُبھر میں پہنچا دیا ہوگا۔" وہ بے ڈھنگے پن سے مسکرایا۔" وہ اتنی اچھی گھوڑی کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ میرا تو جی ایسا ہی خیال ہے۔"

"تُو نے ٹھیک ہی سوچا ہے۔" رحیم داد نے اُس کے خیال سے اتفاق کیا۔" پر تُو یہاں اتنی دیر میں کیسے پہنچا؟"

"تیں نوں پتہ ہے، کتنا لمبا رستہ ہے۔ اوپر سے مینہ بھی برسنے لگا۔" اُس نے صفائی پیش کی۔

"اب تیرا کیا ارادہ ہے؟"

"تیں نوں تو سب کچھ معلوم ہی ہے۔ میں نے تیرا کام ٹھیک ٹھاک طرح سے کر دیا۔ شاہ جی تجھے خود بتا دے گا۔ اب اپنا وعدہ پورا کر۔ مجھے ہزار روپے دے دے میں کامل کے پاس جاؤں۔ کئی روز ہو گئے چک ۴۸ سے آئے ہوئے۔ کامل پریشان ہوگا۔ میں نوں اس کے پاس اب پہنچ جانا چاہیے۔"

"میں نے جو وعدہ کیا ہے، پورا کر دوں گا۔" رحیم داد بولا۔ "ویسے سچی گل پوچھ تو مجھے شاہ جی سے ملنے کے بعد ہی تجھے روپیہ دینا چاہیئے۔ ایسے معاملوں میں ایسا ہی ہونا ہے۔"

دارا بے چین ہو کر بیچ میں بول اٹھا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ تیں نوں میری بات کا اعتبار نہیں۔"

"تو نے پوری گل بات ہی نہیں سنی۔ میں نے کب کہا، مجھے تجھ پر اعتبار نہیں۔ میں تجھے ابھی اور اسی وقت ہزار روپے دے دوں گا۔" رحیم داد نے کہا۔ دارا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ لمحے بھر پہلے اس کے چہرے پر جو کدورت نظر آ رہی تھی، مٹ گئی۔ "تو مجھے یہ بتا، اِدھر سے نکل کر بحرین جانے کے لیے تو کراچی جائے گا کیسے؟ یہ سمجھ لے، پولیس تیری ناک میں ہے۔ جو کچھ کرنا ہے، بہت ہی سوچ سمجھ کر کرنا ہے۔" رحیم داد نے اُسے خبردار کیا۔ "اب تو پہلے سے زیادہ سنگین جرم کر چکا ہے۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے چوہدری!" دارا کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ شاید اُسے پہلی بار اپنے جرم کی سنگینی کا احساس ہوا۔ اُس نے رحیم داد کو بتایا۔ "اپنا تو جی یہ ارادہ تھا کہ کامل کے ساتھ اُونٹوں پر بیٹھ کر بھاول پور کی طرف نکل جاؤں۔ ریاستی بولی اچھی طرح بول سکتا ہوں۔ برسوں بولتا رہا ہوں۔ کپڑے لتے بھی بھاول پوری پہن لوں گا۔ کسی کو ذرا شبہ نہ ہو گا۔ ریاست میں پہنچ کر کسی چھوٹے سٹیشن سے کراچی کی گڈی پکڑ لوں گا۔" اُس نے رحیم داد کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "یہ ٹھیک نہ ہو تو جیسا تو بول، ویسے کروں؟"

"پروگرام تو تیرا ٹھیک ہی لگتا ہے۔" رحیم داد نے اختلاف نہیں کیا۔ "مجھے یہ بتا کامل تیری اتنی مدد کرنے کو تیار ہو جائے گا؟"

"وہ تو جی پہلے ہی سے تیار ہے بلکہ ساری سکیم ہی میں نے اُس کے ساتھ بیٹھ کر تیار کی ہے۔" دارا نے رحیم داد کو یقین دلایا۔ "چوہدری! وہ میرا بہت گہرا یار ہے۔ سچ پوچھ، میں نوں تو صرف روپیہ کا بندوبست کرنا تھا۔ اسی کی فکر تھی ورنہ پروگرام تو بہت دنوں سے بنا رکھا تھا۔ روپیہ پاس ہو تو کیا نہیں ہو سکتا۔ کوئی مصیبت بھی پڑ جائے تو کچھ دے دلا کر جان چھڑائی جا سکتی ہے۔"

رحیم داد اُس کی باتوں سے خاصا مطمئن ہو گیا۔ وہ اُٹھا، کمرے میں گیا۔ لیمپ کی لَو اونچی کی۔ اُسے ہاتھ میں سنبھالے کوٹھری کے دروازے پر پہنچا۔ اُس پر تالا لگا تھا۔ رحیم داد نے کنجی سے تالا کھولا۔ لیمپ

اُٹھائے کوٹھری میں گیا دروازہ اندر سے بند کیا۔ ٹرنک کھولا۔ ہزار روپے کے نوٹ نکال کر گنے۔ انہیں دھوتی کے ڈب میں رکھا، باہر آکر کوٹھری کے دروازے میں پھر تالا ڈالا۔

وہ برآمدے میں واپس پہنچا۔ دارا بے چین بیٹھا تھا۔ رحیم داد نے ڈب سے ہزار روپے نکال کر بڑھائے۔ نوٹ لیتے ہوئے دارا کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اُس نے کپکپاتے ہاتھوں سے نوٹ گنے اور نہایت احتیاط سے اپنی دھوتی کے ڈب میں رکھ لیے۔

رحیم داد نے کہا" تو ابھی چک ۴۸ جائے گا نا؟"

"ہاں جی ابھی چلا جاؤں تو اچھا ہے۔" وہ کھڑا ہو گیا" میرا یہاں ٹھیرنا ٹھیک نہیں۔ ویسے میرا چک یہاں سے بہت زیادہ دور بھی نہیں۔ تُو فکر نہ کریں آرام کے ساتھ سویرا ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

"اب تیرا چک ۴۸ میں زیادہ ٹھیرنا ٹھیک نہیں۔" رحیم داد نے مشورہ دیا" ہو سکے تو کل اندھیرا ہوتے ہی نکل جانا اور راتوں رات ریاست کی سرحد میں داخل ہو جانا۔"

"بالکل ایسا ہی کروں گا جی۔ روپیہ پاس ہوتا تو میں پہلے ہی نکل جاتا۔"

رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ آگے بڑھا۔ دارا اُس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں نے صحن عبور کیا، دروازے پر پہنچے۔ رحیم داد نے دروازہ کھولا۔ دارا نے جُھک کر رحیم داد کے گھٹنے کو ہاتھ لگایا اور چپ چاپ باہر چلا گیا۔

رحیم داد نے دروازے کی کنڈی ایک بار پھر چڑھا دی۔ آگے بڑھا، حویلی میں کھلنے والے دروازے پر پہنچا اور اُس کی کنڈی کھول دی۔ برآمدے میں واپس پہنچ کر وہ بستر پر لیٹ گیا۔

✡

یہ ایک گرم صبح تھی۔ زرد زرد چمکیلی دھوپ دیواروں سے نیچے اُتر رہی تھی۔ فضا میں حبس تھا۔ رحیم داد نہا دھو کر اُجلا لباس پہن چکا تھا۔

تاراں ناشتہ لے کر آئی تو رحیم داد کرسی پر بیٹھا تھا۔ تاراں نے جھک کر ناشتہ میز پر لگا دیا۔

رحیم داد نے اُس سے کوئی بات نہیں کی، نہ اُس کی جانب متوجہ ہوا، خاموشی سے ناشتہ کرنے لگا۔ تاراں اُس کے سامنے خاموش کھڑی رہی۔ ذرا دیر بعد اُس نے خود خاموشی توڑی، معذرت کے انداز میں بولی "معاف کرنا جی! رات حمدے نے آنے ہی نہیں دیا۔ اُسے بہت زور کا بکھار ہے۔ رات بھر نہیں سویا۔ ہائے ہائے کرتا رہا۔"

رحیم داد نے اُس کی جانب دیکھے بغیر پوچھا "اب کیسی ہے اُس کی طبیعت؟"

"اب تو جی ٹھیک ہی لگتی ہے" تاراں نے بتایا "کہتا تھا، زمیں دارنی سے دوائی لے کر کھاؤں گا"

رحیم داد نے دریافت کیا "زمیں دارنی اب کیسی ہے؟"

"میں سویرے سویرے اُس کے پاس گئی تھی" تاراں نے بتایا "اب تو وہ بالکل چنگی لگتی ہے پر بکھار سے اُس کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہے۔ ویسے وہ پریشان بھی ہے۔ زمیں دار شام کا گیا اب تک نہیں لوٹا۔"

"آتا ہی ہوگا" رحیم داد بے نیازی سے بولا "رات بھر بارش ہوتی رہی، آتا کیسے۔ پڑوس کے کسی زمیں دار کے پاس ٹھیر گیا ہوگا۔"

"پر اب تو سویرا ہوئے بہت دیر ہو گئی، اُسے اب تک آ جانا چاہیے تھا۔ زمیں دارنی تو اداس بیٹھی ہے۔"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا ناشتے سے فارغ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ تاراں نے برتن اُٹھائے اور کمرے سے چلی گئی۔ رحیم داد کھڑکی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ باغ میں گھاس اور پودوں پر بارش کی بوندیں جھلملا رہی تھیں۔ ایک کیاری کے پاس بوڑھا مالی سر جھکائے کھرپی سے جنگلی بوٹیاں اور گھاس پھوس کھود کھود کر نکال رہا تھا۔ آسمان پر بکھرے ہوئے بادلوں کے سفید سفید گالے تیزی سے دوڑ رہے تھے۔ اُن کے پیچھے گہرا نیلا آسمان کہیں کہیں سے جھانک رہا تھا۔ بادل کا ٹکڑا گزرا تو سورج بھی چمکتا نظر آیا۔ بھیگے ہوئے درختوں پر دھوپ پھیل گئی۔ دھوپ کی تیزی اور چمک دمک دیکھ کر رحیم داد نے اندازہ لگایا کہ پہر دن گزر چکا ہے۔ وہ پریشان ہو گیا۔ اُسے اللہ وسایا یاد آ گیا۔ وہ سوچنے لگا، احسان شاہ نے اللہ وسایا کی لاش نہ معلوم کس طرح ٹھکانے لگائی۔

اُس کے چہرے پر پریشانی بکھر گئی۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ مہمان خانے میں اُس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ تاراں بھی دوبارہ نہیں آئی۔ وہ خوف اور تشویش میں مبتلا چپ بیٹھا تھا۔ اسی اثنا میں حویلی کے اندر سے رونے اور بین کرنے کی آوازیں ابھریں اور رفتہ رفتہ اونچی ہوتی گئیں۔ رحیم داد فوراً تاڑ گیا کہ اللہ وسایا کی ہلاکت کی خبر حویلی میں پہنچ گئی ہے۔

رحیم داد کی پریشانی میں مزید اضافہ ہوگیا۔ اُسی وقت تاراں صحن میں داخل ہوئی اور سینے پر دو ہتڑ مار کر زور سے چیخی: "ہائے ربا! میں مرگئی۔ زمیں دار کو قتل کر دیا گیا۔"

رحیم داد تیزی سے آگے بڑھا۔ قریب پہنچا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا: "تیں نوں کیسے پتہ چلا کہ زمیں دار کو قتل کر دیا گیا؟"

"اُس کی لاش نہر میں پڑی ملی ہے۔" وہ سسکیاں بھرتے ہوئے بولی۔ "پڑوس کے چک کے دو مزارعوں نے لاش پہچان لی۔ وہی ادھر آئے تھے۔ بتاتے تھے، زمیں دار قتل کر دیا گیا۔"

رحیم داد گھبرایا ہوا حویلی کی جانب بڑھا۔ تاراں اُس کے ساتھ ساتھ چلی۔ دونوں دروازے سے گزر کر حویلی کے اندر پہنچے۔ وہاں ہر طرف کہرام برپا تھا۔ رحیم داد نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر جمیلہ کو تلاش کیا مگر وہ کہیں نظر نہ آئی البتہ اُس کے دونوں معصوم بچے طویل دالان کے ایک گوشے میں چپ کھڑے تھے۔ وہ حیرت سے ایک ایک کا منہ تک رہے تھے۔ رحیم داد کی اُن پر نظر پڑی تو تڑپ اٹھا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب گیا۔ دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اُس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ نہ نینا نے کچھ کہا، نہ گڈو بولا۔ دونوں بچے گم صم رحیم داد کو منہ اٹھائے دیکھ رہے تھے۔

دالان اور صحن میں گاؤں کی عورتیں اور حویلی کی خادمائیں اداس اور غم زدہ کھڑی تھیں۔ نوکر چاکر حیران و پریشان اِدھر اُدھر آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔ ایک کونے میں احمد دیوار سے ٹیک لگائے، منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔ رحیم داد نے نزدیک جا کر اُس سے دریافت کیا۔

"حمدے! زمیں دارنی کدھر ہے؟"

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا: "وہ تو جی لاش دیکھنے نہر کی طرف گئی ہے۔"

" اُسے گئے کتنی دیر ہو گئی؟" رحیم داد نے پوچھا۔" اکیلی ہی چلی گئی؟"

" وہ اکیلی کیسے جا سکتی ہے۔ اُسے تو کئی روز سے بخار بھی ہے۔" احمد کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔" وہ تانگے میں گئی ہے۔ نوکر بھی ساتھ گئے۔ اُسے گئے ہوئے دیر ہو گئی۔ اب تو وہاں پہنچ بھی گئی ہو گی۔"

" لاش نہر میں کہاں پائی گئی؟"

" یہاں سے چھ سات میل اُدھر حویلی روڈ پر ڈیرا میراں کے پاس ملی ہے۔" احمد نے مشرق کی سمت ہاتھ اٹھا کر بتایا۔" لاش نہر کی پُلی کے ساتھ پڑی ہے۔"

رحیم داد خاموشی سے حویلی کے پھاٹک کی جانب بڑھا۔ احمد کی باتوں سے اُسے یہ سراغ مل گیا تھا کہ احسان شاہ نے قتل کے بعد لاش راتوں رات اپنے علاقے سے میلوں دور نہر میں ڈلوا دی تھی۔ اُس کا گاؤں، پیراں والہ تحصیل دیپالپور میں واقع تھا اور مغرب کی سمت تھا۔ لاش نہر کے مشرقی حصے میں ملی تھی۔ اُس نے پوری احتیاط اور ہوشیاری سے کام لیا تھا۔ لاش تحصیل دیپالپور کی حدود سے باہر تحصیل پاک پتن کی سرحد پر ڈلوائی تھی تاکہ پولیس کو مغالطے میں ڈال دیا جائے اور قتل کا مقدمہ درج کرنے کے معاملے میں دونوں تحصیلوں کے تھانوں میں تنازع پیدا ہو جائے اور ابتدائی مرحلے ہی میں تفتیش التوا میں پڑ جائے۔

رحیم داد حویلی سے نکل کر باہر گیا۔ پھاٹک کے سامنے میدان میں درختوں تلے گاؤں کے بہت سے بوڑھے اور جوان جمع تھے۔ جو اب تک نہیں پہنچ سکے تھے، وہ کھیتوں اور گھروں سے نکل نکل کر حویلی کی سمت آ رہے تھے۔ مرد بھی تھے، عورتیں بھی تھیں۔ سب کے چہرے سوگوار اور آنکھیں ویران تھیں۔ کچھ زار و قطار رو رہے تھے، کچھ سر جھکائے غم سے نڈھال کھڑے تھے۔ عورتیں اونچی آواز سے بین کر رہی تھیں۔ رحیم داد کو اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہوا کہ گاؤں کے سبھی رہنے والے اللہ وسایا سے پرستش کی حد تک محبت کرتے تھے۔ اُن کی گریہ وزاری اور بے قراری یہی بتاتی تھی۔

رحیم داد کو دیکھ کر پھاٹک کے سامنے کھڑے ہوئے لوگوں نے اونچی آواز سے سلام کیا۔ رحیم داد آگے بڑھا اور سر جھکا کر اُن کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔ حویلی کے ایک نوکر نے جھٹ چارپائی ڈال دی۔

رحیم داد بیٹھ گیا۔ بادلوں کے درمیان سے جھانکتا ہوا سورج اب بہت بلندی پر پہنچ گیا تھا۔ وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ رحیم داد سوچتا رہا کہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔ آیا وہ گھوڑی پر بیٹھ کر وہاں جائے جہاں لاش پڑی ہے یا حویلی کے باہر پُرسے کے لیے آنے والوں کے درمیان بیٹھا رہے اور لاش آنے کا انتظار کرے؟ وہ اسی تذبذب میں افسردہ بیٹھا تھا کہ نہر کی جانب سے ایک نوجوان سائیکل دوڑاتا ہوا درختوں کی آڑ سے نکلا۔ رحیم داد نے اُسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ وہ اللہ وسایا کا ملازم نام دار تھا۔ تمام نظریں اُس کی جانب اُٹھ گئیں۔ وہ اطلاع ملتے ہی سائیکل پر لاش دیکھنے چلا گیا تھا، اب واپسی ہوئی تھی۔

نام دار قریب آیا تو سب اُس کے چاروں طرف حلقہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔ ہر طرف سے سوالات کی بوچھار شروع ہو گئی۔ رحیم داد نے اُسے اپنے پاس بلایا۔ "نام دار کیا خبر لایا۔ پتہ چلا کہ لاش کس کی ہے؟"

اُس نے مُنہ بسور کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "لاش تو جی اپنے زمیں دار ہی کی ہے۔ زمیں دارنی بھی پہنچ گئی ہے۔ اُس نے بھی لاش پہچان لی ہے۔"

یہ سنتے ہی اُمید کی ہلکی سی رمق بھی مٹ گئی۔ مجمع میں کہرام مچ گیا۔ کچھ لوگ تو اس قدر دل گرفتہ ہوئے کہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ سوگوار چہرے اور دھندلے پڑ گئے۔ ویران آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ آہوں اور سسکیوں سے فضا دھواں دھواں ہو گئی۔

آہ و زاری کا طوفان ذرا تھما تو رحیم داد نے نام دار سے دریافت کیا۔ "زمیں دارنی کب تک آئے گی؟"

"پتہ نہیں جی۔" نام دار نے بتایا۔ "لگتا ہے، وہ تو دیر ہی میں لوٹے گی۔"

"پولیسیے بھی پہنچے کہ نہیں؟"

"کیوں نہیں پہنچے جی۔" نام دار نے مستعدی سے جواب دیا۔ "تھانے دار دو کانسٹیبلوں کے ساتھ سویرے سویرے پہنچ گیا تھا۔ اُسی نے لاش نہر سے باہر نکلوائی۔ میں پہنچا تو لاش نہر کے پاس ریت پر چادر سے ڈھکی ہوئی پڑی تھی۔ تھانے دار اُن بندوں سے پوچھ تاچھ کر رہا تھا

جنہوں نے سب سے پہلے لاش نہر کی پُلی کے نیچے پڑی دیکھی تھی۔ وہ پاس کے پنڈ کے رہنے والے ہیں۔"

"تیں نوں پتہ ہے، لاش کب تک آئے گی؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"میں کیا بتا سکتا ہوں جی!" نام دار نے سادگی سے کہا۔ "ابھی تو جی تھانے دار بیانات شیانات لکھ رہا ہے۔ بعد میں اپنی کاروائی ڈال لے گا۔" اُس نے رحیم داد کی جانب غور سے دیکھا۔ "تیں نوں پتہ ہی ہوگا۔ کاروائی ختم ہونے کے بعد تھانے دار لاش کو۔ وہ کیا کہتے ہیں جی!" وہ بولتے بولتے اٹکا۔ "یاد آیا، پوسٹ مارٹم کے لیے شہر لے جائے گا۔ زمیں دارنی کہتی تھی، وہ بھی لاش کے ساتھ شہر جائے گی اور اُسے اپنے ساتھ ہی لے کر آئے گی۔" رحیم داد نے اور کچھ نہیں پوچھا نام دار آگے بڑھا اور تعزیت کے لیے آنے والوں کے ہجوم میں مل گیا۔

رحیم داد چارپائی پر خاموش بیٹھا تھا۔ کتنے ہی مزارع اور کمی اس کی چارپائی کے اردگرد فرش پر بیٹھے تھے۔ سب اللہ وسایا کی موت پر رنج والم کا اظہار کر رہے تھے اور سرگوشیوں میں قتل کے بارے میں قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ رحیم داد نے نہ کسی کو ٹوکا، نہ کسی کے سامنے اپنی رائے ظاہر کی۔ وہ غم زدہ بھی تھا اور خوف زدہ بھی۔

آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے۔ کبھی دھوپ نکل آتی، کبھی سایہ ہو جاتا۔ وقت گزرتا رہا دوپہر ہوگئی، سہ پہر ہوگئی۔ دن ڈھلنے لگا۔ نہ کوئی اپنے گھر گیا نہ کھیتوں پر کسی نے بھی اللہ وسایا کے سوگ میں کچھ نہیں کھایا۔ پیاس لگتی تو وہ ایک درخت کے نیچے رکھے ہوئے مٹی کے بڑے مٹکے سے پیالے میں پانی نکال کر پی لیتے۔ رحیم داد بھی اُن کے ساتھ بھوکا بیٹھا رہا۔ البتہ پانی بار بار پیتا رہا۔

سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے سرکاری اسپتال کی ایمبولنس گاؤں میں داخل ہوئی۔ اُسے دیکھتے ہی ہلچل مچ گئی۔ ایمبولنس حویلی کے پھاٹک کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ دروازہ کھلا۔ جمیلہ ایک نوکر کے ہمراہ اتری۔ اس کی آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں۔ بال بکھر کر پریشان ہو گئے تھے۔ پھول کی مانند شگفتہ چہرہ مرجھا کر مٹیالا پڑ گیا تھا۔ اللہ وسایا کی لاش اسٹریچر پر ڈال کر نیچے اتاری گئی۔ مرد بے قرار ہو کر لاش کی طرف بڑھے عورتیں بھی حویلی سے باہر آگئیں۔ زبردست ماتم ہونے

لگا۔ رحیم داد لرز کر رہ گیا۔

لاش اسٹریچر سے اٹھا کر اس چارپائی پر لٹا دی گئی جس پر کچھ دیر پہلے رحیم داد بیٹھا تھا۔ لاش پر اسپتال کی سفید چادر پڑی تھی، اُسے جلد ہی ہٹا کر دوسری چادر ڈال دی گئی۔ ڈرائیور اور اسپتال کے دوسرے ملازمین نے، جو لاش کے ساتھ ہی آئے تھے، چادر اور اسٹریچر اٹھا کر ایمبولنس میں رکھا۔ اُس میں دوبارہ سوار ہوئے۔ ایمبولنس کا انجن اسٹارٹ ہوا۔ ذرا دیر بعد وہ گاؤں کی حدود سے نکل گئی۔ لاش کچھ دیر پھاٹک کے سامنے میدان میں رکھی رہی، پھر حویلی کے اندر پہنچا دی گئی۔ جمیلہ پہلے ہی اندر جا چکی تھی۔

رحیم داد مزارعوں اور کمیوں کے درمیان باہر کھڑا رہا۔ لاش پہنچنے کی اطلاع ملتے ہی آس پاس کے گاؤں اور چکوں کے لوگ بھی پُرسے کو پہنچنے لگے۔ مجمع بہت بڑھ گیا تھا۔ حویلی سے عورتوں کے بین کرنے اور زور زور سے رونے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ برسات کی ملگجی شام آہستہ آہستہ در و دیوار سے نیچے اتر رہی تھی۔ دھندلکا پھیل کر تاریک ہو گیا۔ گاؤں کی مسجد سے اذان بلند ہوئی۔ رحیم داد دوسرے لوگوں کے ساتھ مسجد کی جانب روانہ ہوا۔

حویلی کی بیرونی دیوار کے ساتھ ٹین کی چھت کا طویل سائبان تھا۔ اُس میں کبھی حویلی کے تانگے کھڑے ہوتے تھے مگر فرقہ وارانہ فسادات کے دنوں میں جب تانگے بان دونوں تانگے لے کر چمپت ہو گئے تو سائبان عرصے تک اُجاڑ پڑا رہا پھر اللہ دوسایا نے اسے صاف کرایا۔ وہ اکثر شام کو وہاں کچہری لگاتا اور چارپائی پر بیٹھ کر مزارعوں کے ساتھ بات چیت کرتا۔ زمین داری کے مسائل طے کرتا۔ اب اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ ایک پیٹرومیکس روشن کر کے سائبان کے نیچے اسٹول پر رکھ دیا گیا تھا۔

سائبان کے نیچے اور سامنے کے میدان میں دریاں اور چٹائیاں بچھا دی گئی تھیں۔ پُرسے کے لیے آنے والے چٹائیوں اور دریوں پر بیٹھتے جا رہے تھے۔ سائبان کے قریب ہی ایک درخت کے نیچے گاؤں کا درزی چٹائی پر بیٹھا کفن تیار کر رہا تھا۔ رحیم داد نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے سیدھا سائبان کے نیچے پہنچا اور دیر تک پُرسا دینے والوں کے درمیان دری پر بیٹھا رہا۔

رات اُداس اور تاریک تھی۔ ہوا سسکیاں بھر رہی تھی۔ رحیم داد سائبان کے نیچے سے نکلا اور حویلی

میں چلا گیا۔ دالان میں بھی پیٹرومیکس روشن تھا۔ اُس کی تیز روشنی میں چارپائی پہ اللہ وسایا کی میت رکھی تھی۔ اُس پر چادر پڑی تھی۔ جمیلہ چارپائی کے سرہانے بیٹھی تھی۔ اُس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ تڑپ کر زور سے چیخی "چوہدری! میں لٹ گئی۔ ہائے ربا میں کیا کروں۔" اُس نے اپنے دونوں ہاتھ چارپائی کی پٹی پر زور سے مارے۔ کلائیوں میں پڑی ہوئی شیشے کی چوڑیاں چھنک سے ٹوٹ کر دُور تک بکھر گئیں۔ وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ اُس کے دونوں بچے قریب ہی بیٹھے تھے۔ ماں کی آہ وزاری دیکھ کر گڈو سہمی سہمی نظروں سے اُس کا منہ تکنے لگا۔ نیناں نے رونے کے لیے منہ لبسورا۔ چارپائی کے اردگرد بیٹھی ہوئی عورتیں بھی اونچی آواز سے رونے لگیں۔

رحیم داد کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ وہ سر جھکائے جمیلہ کے قریب چپ کھڑا رہا اور آہستہ آہستہ سسکیاں بھرتا رہا پھر اُس نے آنسو پونچھے۔ جمیلہ کو تسلی دینے لگا "زیں دارنی! صبر کر۔ اللہ کی یہی مرضی تھی۔" اُس کی آواز گلوگیر ہوگئی۔ آنکھوں میں دوبارہ آنسو اُمڈ آئے۔ وہ مڑا اور جمیلہ سے کچھ فاصلے پر ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔

عورتیں مسلسل پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ جمیلہ نے ایک بار پھر بے قرار ہو کر چیخ ماری "ہائے وے شیر جوانا۔" اُس نے اپنا سر چارپائی کی پٹی پر رکھ دیا اور سسکیاں بھرنے لگی۔ یکایک گریہ وزاری کی دردناک آوازوں کے درمیان ایک اونچی آواز اُبھری۔ یہ حویلی کی میراثن کی آواز تھی۔ اُس نے جواں مرگ اللہ وسایا کی بیٹنی پر الاہنی شروع کی۔ اس کی آواز کے ساتھ ہی ساری آوازیں دھیمی پڑ گئیں میراثن سوز کے انداز میں بین کرنے لگی۔

موت پھیندی آئی بیٹھی یاد اتل، ہائے وے شیر جوانا!!
گھنن نہ دیندی ساہ، کرن نہ دیندی گل، ہائے وے شیر جوانا۔

الاہنی کے بول پر عورتیں سینے پر دوہتڑ مارتیں۔ اونچی آواز سے تڑپ کر کہتیں "ہائے ہا، ہائے ہا۔" لیکن جمیلہ پٹی پر اپنی پیشانی ٹکائے صرف سسکیاں بھر رہی تھی۔ میت کے سرہانے عود ولوبان سلگ رہا تھا۔ اُس کے بل کھاتے، لہراتے مرغولوں میں سارے سوگوار چہرے دھواں دھواں نظر آرہے تھے۔ فضا پر موت کا سایہ منڈلا رہا تھا۔ میراثن درد بھری آواز میں نوحہ کر رہی تھی۔

پانی تتا کرایا شرطاں نال نہوایو

کھپن منگوایو زری دا ، لاڑے نوں پوایو

چو نہ جنیاں رل چکیو، منزلو منزل پچایو

جھکل آئی رات۔ اوس ہنیر کدی نہ جایو

ہائے وے شیر جوانا، ہائے وے شیر جوانا!

ساون کی کالی کلوٹی رات دم بخود تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا کے جھونکے سوز کی لے میں گھل مل کر میراثن کے ساتھ بین کر رہے تھے۔

پانی گرم کرایا گیا۔

میّت کو رواج کے مطابق غسل دیا گیا

زری کا کفن منگوایا گیا، دولھا کو پہنایا گیا

چار آدمیوں نے مل کر جنازے کو کندھا دیا

اُسے آخری منزل تک پہنچایا گیا

آج اُس کی زندگی کی شام ہے

جھکل کی رات ہے اور تاریکی نے ڈیرا ڈال رکھا ہے

اس اندھیری قبر میں کوئی نہ جائے

ہائے جواں مرگ شیر، ہائے جواں مرگ شیر!

میراثن دھیمے سُر میں الاہنی کے بول الاپتی رہی، بین کرتی رہی، ہوا کی سسکیاں اُبھرتی رہیں۔ جنازے کے پاس بیٹھی ہوئی عورتیں سینہ کوبی کرتی رہیں۔ بے قرار ہو کر ہائے ہا، ہائے ہا کی دل دوز صدائیں بلند کرتی رہیں۔ عود و لوبان کا دھواں لہراتا اور پھیلتا رہا۔ دکھ کا سایہ بن کر فضا میں منڈلاتا رہا۔ ساری آوازیں سو گئی تھیں۔ صرف ایک آواز جاگ رہی تھی۔ یہ الاہنی کے بولوں کی شکل میں موت کی آواز تھی۔

رات گزرتی جا رہی تھی۔ اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ رحیم داد خاموشی سے اُٹھا اور حویلی سے باہر آ گیا۔

سائبان کے نیچے پہنچ کر اُس نے گاؤں کے بڑے بوڑھوں سے مشورہ کیا اور یہ طے کیا گیا کہ لاش اب زیادہ دیر رکھنا ٹھیک نہیں، اِسے عشا کے بعد دفنا دیا جائے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد رحیم داد نے مسجد کے مُلّا کو بلایا اور اُس کے ہمراہ دوبارہ حویلی میں گیا۔ جمیلہ ابھی تک چارپائی کی پٹی پر سر رکھے سسکیاں بھر رہی تھی۔ دو عورتوں نے اُسے سنبھالا۔ ہولے سے کھینچ کر چارپائی کے قریب سے اُٹھایا۔ چارپائی میت کے ساتھ اُٹھا کر صحن کی پڑچھتی میں پہنچادی گئی۔ مُلّا نے میت کو غسل دیا۔ درزی نے کفن تیار کر دیا تھا۔ میت کفنا کر اُس پر سیاہ چادر ڈال دی گئی اور چارپائی پر رکھ کے آخری دیدار کے لیے ایک بار پھر اُسے دالان میں رکھ دیا گیا۔ دالان میں ہر سو کافوری تیز بُو پھیل گئی۔

کچھ دیر بعد جنازہ حویلی سے باہر لے جایا گیا۔ جمیلہ چیخ چیخ کر روتی ہوئی پھاٹک تک گئی۔ کئی عورتیں اُسے سنبھالے ہوئے تھیں۔ مردوں نے بڑھ کر جنازہ اُٹھایا۔ ایک بار پھر زبردست کہرام مچ گیا۔ رونے کی آوازیں رات کے سناٹے میں گونجنے لگیں۔ جنازہ مسجد کے دروازے تک پہنچایا گیا۔ نماز عشا کے بعد نماز جنازہ ہوئی۔ جنازہ دوبارہ کندھوں پر اُٹھایا گیا اور گاؤں کے قبرستان میں پہنچا دیا گیا۔ قبر پہلے ہی سے تیار تھی۔ میت قبر میں اتاری گئی۔ پھر مٹی ڈال کر قبر بھر دی گئی۔ مسجد کے مُلّا نے فاتحہ خوانی کی۔ ہاتھ اُٹھا کر اللہ وسایا کے لیے مغفرت کی دعا کی۔ سب لوگ واپس حویلی پہنچ گئے۔

کوڑا وٹا یا کڑوی روٹی مزارع لائے تھے۔ اللہ وسایا یا جمیلہ کا کوئی ایسا رشتہ دار یا شریکا نہ تھا جو کوڑا وٹا لاتا۔ مزارع یہ جانتے بھی نہیں تھے۔ وہ اللہ وسایا کے غم میں بُری طرح دل گرفتہ تھے۔ اُس روز گاؤں کے کسی گھر میں کھانا نہیں پکا۔ کسی باورچی خانے سے دھواں نہ اُٹھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ البتہ گاؤں کی کئی عورتیں حویلی میں موجود رہیں۔

رحیم داد نے بھی سب کے ساتھ ہی کھانا کھایا تھا۔ کھانے کے بعد وہ حویلی میں گیا۔ مہمان خانے پہنچا۔ احمد کی طبیعت ابھی ٹھیک نہیں تھی مگر وہ بھی مہمان خانے میں تھا۔

✡

صبح رحیم داد نہا دھو کر بیٹھا ہی تھا کہ احمد نے آکر اطلاع دی کہ تھانے دار ایک کانسٹیبل کے ہمراہ آیا

ہے۔ رحیم داد کا چہرہ فق ہو گیا۔ احمد اطلاع دے کر چلا گیا۔ رحیم داد کی پریشانی اور گھبراہٹ اس قدر بڑھی کہ اُس نے گھوڑی پر سوار ہو کے احسان شاہ کے پاس جانے کا ارادہ کیا، مگر اس ڈر سے نہیں گیا کہ گاؤں سے باہر جانے پر شک و شبہ پیدا نہ ہو۔ اُس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی اور تھانے دار کا انتظار کرنے لگا۔

رحیم داد کی نظریں ہر آہٹ پر بیرونی دروازے کی جانب اُٹھ جاتی تھیں۔

پھر دن گزر گیا۔ سورج چڑھ کر اُوپر آگیا مگر تھانے دار مہمان خانے میں نہیں آیا، صرف احمد آیا۔ رحیم داد نے اُس سے پُرسے کے لیے آنے والوں کے بارے میں اِدھر اُدھر کی بات کی پھر جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔

"پولیسے ابھی تک حویلی میں ہیں؟"

"وہ توجی کب کے چلے گئے۔ انہوں نے صرف زمیں دارنی سے پوچھ تاچھ کی تھی۔"

"کیا پوچھتے تھے؟"

"پتہ نہیں۔" احمد نے جواب دیا۔ "زمیں دارنی ہی کو ملوم ہو گا، پر جی وہ کیا گل بات کر سکتی ہے۔ اُس سے تو بولا بھی نہیں جاتا۔ چپ بیٹھی رہتی ہے یا رونے لگتی ہے۔ اُس کا توجی بہت بُرا حال ہے۔ کئی بار تو بے ہوش ہو چکی ہے۔"

رحیم داد مہمان خانے سے نکلا، سائبان کے نیچے پہنچا۔ وہاں سویرے سویرے پھوہڑی بچھا دی گئی تھی۔ پُرسے کے لیے آنے والے اُس پر بیٹھے تھے۔

رحیم داد بھی دیوار سے ٹیک لگا کر پھوہڑی پر بیٹھ گیا۔

مردوں سے زیادہ عورتیں تھیں۔ عورتیں حویلی کے اندر چلی جاتی تھیں۔ دالان میں بھی پھوہڑی بچھی تھی۔ یہ دریوں کا فرش تھا، جن پر چھپی ہوئی چادریں پڑی تھیں۔ جمیلہ دالان کے ایک ستون کے سہارے پھوہڑی پر نڈھال بیٹھی تھی۔ ہر ایسی عورت جو پہلی بار پاس پڑوس کے

کسی گاؤں سے آتی یا اللہ وسایا کے کنبے برادری سے اُس کا کوئی رشتہ ناتا ہوتا، وہ جمیلہ کے گلے سے لگ کر زور زور سے روتی۔ جمیلہ کے گرد نیم دائرے میں بیٹھی دوسری عورتیں بھی رونے لگتیں۔ سینے پر دوہتڑ مارتیں اور ہائے ہا! کے نعرے بلند کرتیں۔

حویلی کے اندر سے عورتوں کی آہ وزاری سن کر باہر بھوہڑی پر بیٹھے ہوئے مرد اونچی آواز سے کلمہ پڑھتے۔ دوپہر کو تعزیت کرنے والوں کی تعداد گھٹ کر بہت کم رہ گئی۔ وہ کھانا کھانے یا اپنے ضروری کام کاج کرنے کے لیے چلے گئے تھے۔ مگر شام ہوتے ہوتے تعزیت کرنے والوں کی تعداد میں پھر اضافہ ہوگیا۔ اندھیرا بڑھا تو پیٹرومیکس روشن کر دیا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد تاراں خوان پوش سے ڈھکا ہوا تھال سر پر رکھے حویلی سے نکلی اور سنبھل سنبھل کر قدم رکھتی ہوئی مسجد کی طرف روانہ ہوگئی۔ وہ ملّا کے لیے فاتحہ کا توشہ لے کر جا رہی تھی۔ یہ سیج کڑ کا تھا۔

تیسرے روز تیجا تھا۔ اُس روز بھی گاؤں کے سارے مرد اور عورتیں حویلی پہنچے۔ مسجد کے ملّا نے فاتحہ خوانی کی۔ سب نے کھانا کھایا۔ کھانے کے ساتھ گیہوں کی گھنگنیاں بھی تھیں۔ رحیم داد ڈرا سہما ہوا تھا۔ اُس کی نظریں بار بار اُس راستے کی طرف اُٹھ جاتیں جو نہر کی سمت جاتا تھا۔ اُسے پولیس کے آنے کا دھڑکا تھا۔ وہ رات گئے تک پریشان رہا مگر کوئی پولیس والا نہیں آیا۔

تیجے کے چند روز بعد ایک پولیس انسپکٹر دو کانسٹیبلوں کے ہمراہ آیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ رحیم داد مہمان خانے میں کھانا کھا رہا تھا۔ اُسے احمد سے پولیس کے آنے کی اطلاع ملی۔ وہ ایک بار پھر سراسیمہ ہوگیا۔ اُس کے لیے کھانا دوبھر ہوگیا لیکن اُس روز بھی کوئی پولیس والا اُس کے پاس نہیں آیا مگر جب تک انسپکٹر اور کانسٹیبل حویلی میں موجود رہے، اُس پر خوف طاری رہا۔ بعد میں اُسے احمد کی زبانی معلوم ہوا کہ پولیس نے جمیلہ کا بیان لیا، حویلی کے بعض نوکروں سے پوچھ گچھ کی۔ دن ڈھلے پولیس والے ضابطے کی کاروائی مکمل کر کے چلے گئے۔

دن گزرتے رہے۔ سات روز تک مسجد میں ہر شام ملّا کے لیے سیج کڑ کا بھیجا گیا۔ خیرات دی گئی۔ فاتحہ خوانی ہوئی۔ پُرسے کے لیے اکٹھا ہونے والوں نے بھی فاتحہ کے بعد کھانا کھایا۔

تیرہ روز تک حویلی کے اندر اور باہر بھوہڑی بچھی رہی۔ صبح سے شام تک پُرسا دینے والے

آتے رہے۔ رحیم داد سائبان میں اُن کے ساتھ بیٹھتا۔ بات چیت کرتا۔ اس تمام عرصے میں نہ اُس نے جمیلہ کو دیکھا، نہ اُس سے ملاقات ہوئی۔ عورتیں ہر وقت حویلی میں جمیلہ کے گرد اکٹھی رہتیں۔ رات گئے تک اُس کے ساتھ بیٹھی رہتیں۔ اُس کی دل جوئی کرتیں، تسلی دیتیں۔

رحیم داد نہ حویلی میں گیا نہ اُس نے جمیلہ سے ملنے کی کوشش کی۔ وہ ایسا کر بھی نہیں سکتا تھا۔ جمیلہ عدّت میں تھی۔ وہ حویلی کی چار دیواری سے باہر نہیں جاسکتی تھی نہ کسی نامحرم کے سامنے آسکتی تھی۔ مسجد کے مُلانے یہی بتایا تھا۔ رحیم داد بھی نامحرم تھا لہذا وہ جمیلہ سے نہیں ملا۔ نہ احسان شاہ کی حویلی گیا اور نہ اُس سے کوئی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔

تیرھویں روز شام کو پھوہڑی اُٹھا دی گئی اور رسمی طور پر اللہ وسایا کا سوگ ختم کر دیا گیا۔ البتہ عورتوں کی حد تک تعزیت کرنے کا سلسلہ چلتا رہا۔ گاؤں کی عورتیں جمیلہ کی دل جوئی کے لیے آتی رہیں۔ جمیلہ بات بات پر رونے لگتی۔ اللہ وسایا کی موت سے جو رنج و غم مسلّط ہوا تھا، وہ اُس سے ہنوز نہیں سنبھلی تھی۔

رحیم داد پھوہڑی اُٹھنے کے بعد مہمان خانے ہی میں رہتا۔ بارش نہ ہوتی تو شام کو باغ میں جاکر بیٹھ جاتا۔ ایک شام وہ تنہا بیٹھا تھا کہ جمیلہ نے اُسے حویلی میں بلوایا۔ رحیم داد گیا۔ جمیلہ دالان کے ایک گوشے میں پیڑھ موڑے کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہ سفید چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ اُس نے پلّو سے بکل مار کر اپنا پورا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ قریب ہی فرش پر پھاتاں بیٹھی تھی۔ رحیم داد دو قدم سے ذرا ہٹ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جھٹ پٹے میں حویلی پر ویرانی برس رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ کچھ دیر بعد جمیلہ کی آواز اُبھری۔

"چوہدری! میں نے تجھے اس لیے بلایا ہے کہ کل کبیر والا سے چوہدری اکرم کا چچا زاد بھائی آئے تھے۔ ویسے تو اللہ وسایا کے پُرسے کو آئے تھے پر چلتے چلتے انھوں نے بتایا کہ اکرم نے اپنی دھی کا رشتہ تیرے ساتھ توڑ دیا۔" جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری "میں تو رانڈ ہوگئی چوہدری پر میرے رانڈ ہونے سے تیرا گھر کیوں نہ بس سکا۔ لگتا ہے اللہ وسایا کی موت کو اکرم نے بدشگونی سمجھا اور رشتہ ختم کر دیا۔"

"زمیں دارنی! تیرے رانڈ ہونے سے میرے ویاہ کا کیا ناتا۔ تُو خاما خا اپنا دل میلا نہ کر۔ میرا تو پہلے بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تیں نوں پتہ ہی ہے کہ رشتہ جوڑنے والا تو اللہ وسایا ہی تھا، اُس کے ساتھ ہی رشتہ بھی ختم ہو گیا۔ اب چوہدری اکرم کچھ ہی کہے، سچ پوچھ تو میں خود اُسے توڑنے والا تھا۔ ذرا سوچ! ابھی اللہ وسایا کو گزرے دو ہی ہفتے ہوئے ہیں۔ میں کیسے ویاہ شیاہ کے بارے میں سوچ سکتا ہوں" رحیم داد نے جمیلہ کی دل جوئی کرنے کی کوشش کی۔ "زمیں دارنی! میری فکر نہ کر۔ اللہ وسایا کے بعد مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے چوہدری!" جمیلہ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "اللہ وسایا کے بنا ایسا لگتا ہے جیسے حویلی اُجڑ گئی، کچھ بھی نہ رہا۔ مجھ ابھاگن کو وہ اس حویلی میں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔"

جمیلہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ پھاتاں نے جمیلہ کو روتے دیکھا تو خود بھی رونے لگی۔ چند لمحے فضا بے حد سوگوار رہی پھر پھاتاں نے دوپٹے کے پلّو سے آنسو پونچھتے ہوئے دل گرفتہ آواز میں کہا۔ "بھین جی! اس طرح کب تک روتی رہے گی۔ مجھے دیکھ، سات سال پہلے میرا گھر والا بھی ایسے ہی چھوڑ کر اللہ کے پاس چلا گیا۔ تاجاں تو ان دنوں ذرا سی چھوہری تھی۔"

"پھاتاں!" جمیلہ کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ "اب تاجاں حویلی میں نہیں رہ سکتی۔ تُو اُسے اپنے گھر لے جا۔ میں ٹھیری رانڈ۔ میرا تو اس پر سایہ بھی نہیں پڑنا چاہیے۔ اب تو سہاگنیں مجھ سے دور بھاگیں گی۔ تاجاں تو ساہا بندھی کڑی ہے۔ مہینے دو مہینے بعد وہ بھی سہاگن بن جائے گی۔ اُسے اب میرے ساتھ نہیں رہنا چاہیے۔"

"بھین جی! تُو کیسی گل کر رہی ہے۔" پھاتاں نے کہا۔ "تُو رانڈ ہے تو میں کون سی سہاگن ہوں، میں بھی تو رانڈ ہوں۔ تاجاں اسی رانڈ کے سائے میں پل کر جوان ہوئی ہے۔ یہ تو سوچ، وہ تیرے نال نہیں رہ سکتی تو میرے نال کیسے رہے گی۔"

"تیری بات دوسری ہے، تُو اُس کی ماں ہے۔" جمیلہ بولی۔ "یہ سوچ تیرے کنبے برادری والے کیا کہیں گے۔ رانڈ بیوہ کو تو بدشگونی سمجھا جاتا ہے۔ ویسے میں تو چاہتی تھی تاجاں میرے ساتھ رہے اور یہیں سے ویاہ کر اپنے گھر والے کے سنگ جائے پر کیا کیا جائے، رانڈ کو بُرا سمجھا جاتا

ہے۔ دنیا کی یہی ریت ہے۔"

پھاتاں نے تیکھے لہجے میں کہا "بھین جی! میں نوں کسی کی پروا نہیں کرنی۔ سات سال سے ساری بدشگونیاں دیکھ رہی ہوں اور سن رہی ہوں۔ میرے لیے یہ نئی گل نہیں۔ تو کچھ ہی کہے، تاجاں یہیں رہے گی اور تیرے ہی نال رہے گی۔ اُس کا ویاہ بھی تُو کرے گی اور جب چاہے تب کرے گی۔"

"سوچ لے۔" جمیلہ آہستہ سے بولی "کنبے برادری والوں کے طعنے سہنے سننے پڑیں گے۔"

"پہلے بھی بہت سن چکی ہوں اور سن لوں گی۔ میں توں کنبے برادری سے کیا لینا۔" پھاتاں اپنی بات پر اڑی رہی۔ "ویسے دوسروں کے منہ میں زبان ہے تو میں بھی گونگی نہیں۔ تُو بالکل فکر نہ کر۔ تاجاں حویلی سے جائے گی تو ویاہ کر ہی جائے گی، ایسے نہیں۔ اب وہ میری نہیں، تیری امانت ہے۔ میں نے تو اُسے تیرے حوالے کر دیا۔ اب تُو جانے اور تیری تاجاں جانے۔ سارے کے بعد تو نے بھی تو یہی گل کہی تھی۔ اپنی ہی گل اور اپنا ہی وعدہ بھول گئی۔"

رحیم داد آہستہ سے کھنکارا اور جمیلہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا "زمیں دارنی! سنا ہے پولیس تفتیش کو آئی تھی۔ تجھ سے پوچھ تاچھ بھی کی تھی۔ اللہ وسایا کے قتل کے بارے میں بھی پولیس سے کچھ پتہ چلا؟"

"پولیس نے کیا بتانا۔ اُس نے تو اب تک کچھ نہیں کیا۔" جمیلہ کے لہجے میں تلخی تھی۔ "پہلے وہ تھانے دار آیا جس نے رپورٹ درج کی تھی۔ تفتیشی ٹیم کے ساتھ جائے واردات کا معائنہ کیا تھا۔ نہر سے لاش نکلوائی تھی۔ لکھا پڑھی کی تھی اور لاش پوسٹ مارٹم کے لیے پولیس سرجن کے پاس بھجوائی تھی۔ وہ دیر تک مجھ سے الٹے سیدھے سوال کرتا رہا۔ اُس کی باتوں سے تو ایسا لگتا تھا مانو اللہ وسایا کو میں نے ہی قتل کرایا ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔ "تُیں نوں کیسے پتہ چلا کہ اُسے تجھ پر شبہ ہے؟"

"کہتا تھا، ہر قتل کے پیچھے کسی رن کا ہاتھ ہوتا ہے اور اگر مقتول کے گھر میں مغویہ رن ہو تب تو قتل کا سبب عام طور پر وہی ہوتی ہے۔" جمیلہ نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "اس کے

بعد وہ مجھ سے ایسی گلاں کرنے لگا کہ میرا جی چاہا، اُس کا منہ نوچ لوں پر میں نے دھیرج سے کام لیا۔ رو کر صرف اتنا کہا، قتل کی وجہ پرانی دشمنی بھی ہو سکتی ہے۔ زمیں داروں کے قتل تو عام طور پر پرانی دشمنی ہی کے کارن ہوتے ہیں۔ میں نے تو یہی سنا ہے۔ اخباروں میں پڑھا بھی ہے۔"

"یہ بات سن کر وہ کیا بولا؟"، رحیم داد نے دریافت کیا۔

"پہلے تو اُس نے کہا کہ اب تک کی کاروائی سے تو کوئی ایسا سراغ ملا نہیں، فیر اُس نے پوچھا کہ مجھے کس کس پر شبہ ہے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اللہ وسایا کی صرف احسان شاہ سے دشمنی تھی۔ میں نے اُسے دشمنی کی ساری وجہ بھی بتا دی۔" اُس نے قدرے تامّل کیا۔ "مجھ سے گل بات کرنے کے بعد اُس نے حویلی کے نوکروں سے بھی پوچھ تاچھ کی۔ فیر دوبارہ آنے کا کہہ کر چلا گیا۔"

"وہ دوبارہ پوچھ تاچھ کرنے آیا تھا؟"

"وہ تو نہیں آیا۔ آنا بھی نہیں چاہیے تھا اُسے۔ میں نے اپنے وکیل عثمان رندھاوا کو بلوایا۔ اُسے ساری بپتا سنائی۔ وہ فوراً تھانیدار سے ملا اور جب اُسے بھی اندازہ ہو گیا کہ تھانیدار کیس دبا دینا چاہتا ہے تو اُس نے اعلیٰ حکام کو درخواستیں بھیجیں۔ اس کی دوڑ بھاگ اور کوشش کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایک نئے انسپکٹر کو تفتیش کے لیے لگایا گیا۔ اس نے نئے سرے سے تفتیش شروع کی۔" جمیلہ آہستہ آہستہ بولتی رہی۔ "وہ پچھلے دنوں میرے پاس آیا تھا پر اُس نے پہلے تھانے دار کی طرح الٹے سیدھے سوال نہیں کیے۔ میرا بیان لکھا۔ مجھے تسلی دی کہ کاتلوں کو جلد گرفتار کر لیا جائے گا۔ اُس نے بھی حویلی کے نوکروں سے پوچھ تاچھ کی۔ وہ تیرے بارے میں بھی پوچھتا تھا۔"

"میرے بارے میں؟"، رحیم داد نے حیران و پریشان ہو کر کہا۔ "میرے بارے میں کیوں پوچھتا تھا؟"

"پولیس کے بندوں کو تو جانتا ہی ہے کہ وہ ہر ایک پر شبہ کرتے ہیں۔" جمیلہ نے وضاحت کی۔ "پر میں نے جھٹ اُس کا شبہ دور کر دیا۔ اسے صاف صاف کہہ دیا۔ چوہدری تو میرے بھائی سمان ہے۔ اس کے بارے میں تو کسی شک و شبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میری باتوں سے وہ

ایسا مطمئن ہوا کہ تیرے پاس پوچھ تاچھ کے لیے بھی نہ گیا۔" اُس نے قدرے تامّل کیا۔" اس کے جانے کے بعد اب تک کوئی تفتیش کو نہیں آیا۔"

"نیں نوں تو یہ بھی پتہ نہیں ہوگا کہ دونوں تھانے داروں کی تفتیش کا کیا نتیجہ نکلا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"جب کوئی آیا ہی نہیں تو کیسے پتہ چلتا۔" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔" میں نے وکیل کو فیر بلوایا ہے۔ وہ پتہ لگا کر بتائے گا کہ پولیس نے اب تک ضابطہ کی کیا کاروائی کی ہے۔"

وکیل کے آنے کی اطلاع سے رحیم داد پریشان ہوگیا مگر اُس نے خود کو سنبھالا۔ جمیلہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے بولا۔" لگتا ہے، پولیس کیس میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہی اور جب پولیس ہی دلچسپی نہ لے تو مجرموں کو کیسے پکڑا جا سکتا ہے۔ پر یہ تو طے ہے کہ اللہ وسایا کو کتل کیا گیا ہے۔"

"یہ تو سبھی کو پتہ ہے۔ پولیس بھی مانتی ہے۔ تھانے دار کہتا تھا، پوسٹ مارٹم رپورٹ مل گئی ہے، اُس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ وسایا کو گولی مار کر کتل کیا گیا۔ ایک گولی اس کی چھاتی میں لگی، دوسری سر میں۔" جمیلہ بولی۔" پر کس نے کتل کیا، کیوں کیا، اُس کا اب تک کوئی سراغ نہیں ملا۔" اُس نے گہری سانس بھری۔" وہ جو بھی ہو پر اُس نے مجھے برباد کر دیا۔ ہائے ربّا یہ کیا ہوگیا۔" جمیلہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رحیم داد اُسے تسلی دیتا رہا۔ صبر کی تلقین کرتا رہا۔

کچھ دیر بعد رحیم داد حویلی سے اُٹھ کر مہمان خانے میں آگیا۔ احمد موجود نہیں تھا لیکن کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ رحیم داد مہمان خانے میں نہیں ٹھیرا۔ جمیلہ سے ملنے کے بعد وہ شدید ذہنی اُلجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اسی عالم میں وہ باغ میں پہنچا۔ وہاں گہرا سناٹا تھا۔ رحیم داد وہاں بھی نہیں رُکا۔ باغ سے نکل کر وہ نہر کی سمت چلنے لگا۔ کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ ماکھا اندھیرے سے نکل کر اُس کے سامنے آگیا۔ رحیم داد ششدر رہ گیا۔ اُس نے تیوری پر بل ڈال کر غصے سے پوچھا۔

"ماکھے! تو اُس طرح اندھیرے میں کیوں چھپا کھڑا ہے؟"

"میں تو شام سے تیرا انتظار کر رہا تھا۔" ماکھا گڑگڑا کر بولا۔" کئی بار باغ کی طرف بھی گیا پر تو نظر نہیں آیا۔ تجھ سے ملے بنا واپس بھی نہیں جا سکتا تھا۔"

"مجھ سے ملنا کیوں ضروری تھا؟"

"نراض نہ ہو" ماکھا عاجزی سے بولا۔ "شاہ جی نے کہلوایا ہے، تو کل شام تک اُس سے ضرور مل لے۔ کوئی ضروری گل کرنی ہوگی۔"

"ابھی تو میں اُس کے پاس نہیں جا سکتا" رحیم داد تذبذب میں پڑ گیا "شاہ جی سے کہنا، موکع ملا تو آ جاؤں گا۔"

"میں نے تو جی، جو بتانا تھا، بتا دیا۔ اگے تیری مرضی۔"

"اچھا اب تو ٹر جا" رحیم داد نے بیزاری سے کہا۔

ماکھا چپ چاپ چلا گیا مگر رحیم داد کے ذہن میں تلاطم برپا کر گیا۔ وہ احسان شاہ سے ملنا تو چاہتا تھا مگر کچھ عرصے بعد۔ فی الحال وہ اُس سے ملنے جلنے میں پوری احتیاط سے کام لینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے کانوں سے سُن چکا تھا کہ جمیلہ کو احسان شاہ پر شبہ ہے۔ وہ پولیس سے بھی اس کا برملا اظہار کر چکی تھی۔ گاؤں میں ہر طرف ابھی تک اللہ وسایا کے قتل کا چرچا تھا۔ ایسی صورت میں اس کا گاؤں سے باہر جانا تو خواہ مخواہ بدگمانی پیدا کر سکتا تھا۔ دوسری طرف اُسے یہ خیال بھی رہ رہ کر پریشان کر رہا تھا کہ احسان شاہ نے کوئی اہم اور ضروری ہی بات بتانے کے لیے اُسے بلایا ہوگا، ورنہ وہ ماکھا کو اُس کے پاس ہرگز نہ بھیجتا۔

رحیم داد کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اُس نے آگے جانے کا فیصلہ ملتوی کر دیا، مڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا مہمان خانے میں پہنچ گیا۔ احمد اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ رحیم داد کے پہنچتے ہی وہ کھانا لے آیا اور میز پر چن کر خاموشی سے قریب ہی فرش پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔

احمد نے جھجکتے ہوئے پوچھا "چوہدری! کچھ پتہ چلا، زمیں دار کو کس نے کتل کیا؟"

"میں کیا بتا سکتا ہوں" رحیم داد بے نیازی سے بولا "ابھی تو کوئی گرفتاری بھی نہیں ہوئی۔ میں نے یہی سنا ہے"

"کاتل تو جی پکڑے جا بھی نہیں سکتے۔"

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا "کیوں؟"

احمد نے اِدھر اُدھر چوکنّا نظروں سے دیکھا اور سرگوشی کرنے کے انداز میں آہستہ سے بولا "میں نوں توجی ایسا لگتا ہے، اللہ وسایا کو زمیں دارنی کے بھائیوں نے قتل کرایا ہے۔ وہ توجی قتل کر کے کب کے سرحد پار نکل گئے ہوں گے، اب انہیں کون پکڑ سکتا ہے۔"

رحیم داد نے چونک کر احمد کو دیکھا۔ دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا "تجھے کیسے پتہ چلا کہ اللہ وسایا کو زمیں دارنی کے بھائیوں نے قتل کیا ہے؟"

"میں نے توجی' یہ بات لوہار کے منڈے بابر سے سنی ہے اور اُسے پٹواری کے چھوٹے بھائی نے بتائی تھی۔ وہ برابر کے پنڈ میں رہتا ہے۔ بابر سے اُس کی پرانی یاری ہے۔" احمد دھیرے دھیرے بولتا رہا۔ "ویسے دیکھا جائے تو بات ٹھیک ہی لگتی ہے۔ زمیں دارنی کے بھائی اُسے اپنے ساتھ سرحد پار لے جانے کے لیے سمگلروں کے ساتھ کئی بار آچکے ہیں پر وہ نہیں گئی۔ انہوں نے سوچا ہوگا، اللہ وسایا کا ٹنٹا ہی ختم کر دو، تب وہ ان کے ساتھ چلی ہی جائے گی۔ اپنی سمجھ میں توجی یہی آتا ہے۔"

"صرف بابر ایسی گل کرتا ہے یا پنڈ کے دوسرے بندے بھی ایسے ہی سوچتے ہیں؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"سچی گل تو ایہہ ہے جی، جتنے منہ اتنی باتیں۔" احمد نے کہا۔ "کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ۔" اُس نے رحیم داد کی جانب نظریں اٹھائیں۔ "تیرا اپنا کیا خیال ہے چوہدری؟"

"تیری اور بابر کی گل سمجھ میں تو آتی ہے۔" رحیم داد نے اُس کی حوصلہ افزائی کی۔ "ایسا بالکل ہو سکتا ہے پر زمیں دارنی کو پتہ نہ چلے، وہ بہت ناراض ہوگی۔ اپنے بھائیوں کے بارے میں وہ ایسی گل کیسے سن سکتی ہے۔"

"توبہ کرو جی! اُسے تو بالکل پتہ نہیں چلنا چاہیے۔ ایک دم چڑھ جائے گی۔"

رحیم داد کھانے سے فارغ ہوا۔ احمد برتن اٹھا کر جانے لگا مگر جاتے جاتے ٹھٹکا اور جھجکتے ہوئے بولا۔ "میں جی دیر سے لوٹوں گا۔"

"ویسے بھی رات کی ردوٹی کھلا کر تو کب جلدی لوٹتا ہے۔ کبھی کبھی تو ساری رات نہیں آتا۔"

رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "تو نے شندّو کے پاس جانا ہو گا؟"

"تاراں نے تجھ سے شکایت لگائی ہو گی۔" احمد نے مسکین سی شکل بنا کر کہا۔ "وہ تو جی ایسے ہی الٹی سیدھی باتیں سوچتی رہتی ہے۔"

"تو اُسے ایسی باتیں سوچنے ہی کیوں دیتا ہے؟" رحیم داد نے کسی قدر سختی سے کہا۔ "وہ تیری گھر والی ہے، تیرے بچوں کی ماں ہے۔ تجھے چاہیے کہ اُسے خوش رکھے۔"

"میں تو جی اُسے خوش رکھنے کی اپنے طور بہت کوشش کرتا ہوں۔ پر وہ تو بیکار کا جھگڑا اکھڑا کر دیتی ہے۔"

رحیم داد نے تاراں کا ذکر جان بوجھ کر چھیڑا تھا۔ وہ اُسے احمد کے ذریعے بُلانا چاہتا تھا مگر ہمت نہ پڑی۔ احمد چلا گیا۔

رحیم داد صحن میں پڑی ہوئی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ ہوا نرم اور خنک تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں بادل بکھرے ہوئے تھے۔ بارش کا کوئی امکان نہیں تھا۔ رحیم داد زیادہ دیر خاموش نہ بیٹھ سکا۔ بے چین ہو کر اٹھا اور آہستہ آہستہ صحن میں ٹہلنے لگا۔ وہ ادھیڑ بن میں مبتلا تھا۔ بار بار سوچ رہا تھا کہ احمد نے اللہ دوسایا کے قتل کے بارے میں جس خیال کا اظہار کیا تھا، اگر اُسے گاؤں میں پھیلا دیا جائے اور پولیس کے کانوں میں بھی ڈال دیا جائے تو نہ صرف تفتیش کی نوعیت بدل جائے گی بلکہ قتل کی واردات کو دبانا بھی آسان ہو جائے گا مگر پولیس کو اس انداز سے سوچنے پر صرف احسان شاہ تیار کر سکتا تھا۔

اُس نے بستر پر لیٹتے ہوئے طے کیا کہ اُسے فوری طور پر احسان شاہ سے ملنا چاہیے۔ رحیم داد کو اُس نے بلایا بھی تھا۔

احمد رات بھر نہیں آیا مگر صبح وہ مہمان خانے میں موجود تھا۔ اُس نے نہایت مستعدی سے ناشتہ میز پر چنا۔ رحیم داد ناشتہ کرنے لگا۔ احمد نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے رات کو پتہ کیا، پنڈ کے کئی مزارعوں کا بھی یہی خیال ہے کہ اللہ دوسایا کو زمیں دار نی کے بھائیوں نے قتل کیا ہے۔"

"بابر ہی نے اُن سے بھی کہا ہو گا۔"

"پتہ نہیں جی! ویسے گل سمجھ میں بھی آتی ہے۔" احمد بولا۔ "وہ ایسا ہے جی، زمیں دارنی کا

پئیو ادھر کا بہت وڈا زمیں دار ہوتا تھا۔ اللہ دسایا اور اُس کا پیو تو اُس کا بہت معمولی مزارع تھا۔ میں تو جی اُن دنوں بھی اسی پنڈ میں تھا۔ بنسی لال مینیجر تھا۔ ساری زمیں داری کی دیکھ بھال، سچ تو یہ ہے، وہی کرتا تھا۔ اُس نے نراض ہو کر اللہ دسایا اور اُس کے پیو کو بے دخل کر دیا تھا۔"

رحیم داد درمیان میں بول پڑا۔" یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔"

احمد نے اُس کے ٹوکنے پر مطلق توجہ نہ دی۔" یہ تو سوچ، زمیں دارنی کے بھائی یہ کیسے دیکھ سکتے ہیں کہ اُن کی بہین انہی کے ایک معمولی مزارع اور وہ بھی مسلمان کی گھر والی بن کر رہے۔ عزت اور شان بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ میں نے تو جی زمیں دارنی کے بھائی ہردیال کو دیکھا ہے۔ کیا اکڑ اور آن بان تھی اُس کی۔ جب پنڈ میں آتا تھا تو مزارع اُس کے سامنے چُپ کر کے کھڑے رہتے تھے۔ اُس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔"

رحیم داد نے اُسے مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ کس طرح احسان شاہ کے پاس پہنچے۔ گھوڑی پر بیٹھ کر وہ اُس کے پاس جانا نہیں چاہتا تھا، شک و شبہ پیدا ہونے کا خدشہ تھا۔ اُس نے احسان شاہ کے پاس جانے کے لیے سڑک کا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ طویل اور خاصے چکر کا راستہ تھا مگر محفوظ تھا۔

رحیم داد نے ناشتے کے بعد احمد سے کہا۔" دوپہر کی روٹی کے بعد ٹانگا لے آنا۔"

"کہاں جانا ہے؟"

" میں نے چک بیدی جانا ہے۔ وہاں سے لاری پکڑوں گا۔ پاک پتن جاؤں گا۔"

احمد نے دریافت کیا۔" اُدھر کوئی کام ہے؟"

"نہیں۔" رحیم داد نے جواب دیا۔" پاک پتن میں بابا شاہ فرید شکر گنج کے مزار پر حاضری دوں گا۔"

" وہاں جانے کا مزا تو جی عرس پر آتا ہے۔" احمد بولا۔" پنج محرم کو عرس ہوتا ہے۔ دور دور سے بندے آتے ہیں۔ زبردست میلہ لگتا ہے۔"

"عرس پر بھی چلا جاؤں گا۔ پہلے بھی عرس پر جا چکا ہوں۔" رحیم داد نے لہجے میں افسردگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔" سچی گل پوچھ تو اللہ دسایا کے بعد دل بہت گھبراتا ہے۔ مزار پر حاضری دینے سے

دل کو آرام ملے گا۔ اِسی لیے جانا چاہتا ہوں۔"

"کب تک واپسی ہوگی؟" احمد نے پوچھا۔

"ارادہ تو رات ہی کو لوٹنے کا ہے پر مشکل لگتا ہے۔ بارشوں نے رستے خراب کر دیے ہیں۔ رات کو سفر کرنا ٹھیک نہیں۔ کل شام تک واپس آجاؤں گا۔ زمیں دارنی پوچھے تو بتا دینا۔"

"وہ تو جی کچھ نہیں پوچھے گی۔ وہ تو روتی رہتی ہے، نہ بولتی ہے، نہ بات کرتی ہے۔ اُسے تو جی زمیں دار کی موت کا بہت دکھ ہے۔ میں نوں نہیں پتہ تھا، وہ اُس سے اتنا زیادہ پیار کرتی ہے۔"

رحیم داد نے بات کا رُخ موڑا۔ "ناراں بھی تجھ سے اتنا ہی پیار کرتی ہے۔"

"توبہ کرو جی! وہ میری ذرا پروا نہیں کرتی۔" احمد نے گلہ کیا۔ "تیں نوں کی ملوم، وہ مجھ سے کتنا جھگڑا کرتی ہے۔ ذرا ذرا سی گل بات پر رولا گولا کرتی ہے۔"

رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ احمد چلا گیا۔

رحیم داد مہمان خانے سے نکلا اور کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ مزارعوں سے ملا، خریف کی فصل کے بارے میں اُن سے اِدھر اُدھر کی بات چیت کی۔ اللہ وسایا کے بعد اب زمیں داری کی دیکھ بھال اُسی کو کرنا تھا۔ وہ رفتہ رفتہ خود کو اس کے لیے تیار بھی کرنے لگا تھا۔ اُس نے زمیں داری کے معاملات میں دلچسپی لینا شروع کر دیا تھا۔

وہ مہمان خانے میں واپس آیا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ رحیم داد منہ ہاتھ دھو کر بیٹھا تھا کہ احمد کھانا لے کر آگیا۔ کھانا چُن کر اُس نے بتایا۔ "زمیں دارنی کے پاس وکیل آیا بیٹھا ہے۔"

رحیم داد پریشان ہو گیا۔ اُس نے جھٹ گلاس اُٹھا کر پانی پیا اور احمد سے پوچھا۔ "وکیل کب آیا؟"

"اُسے آئے تو دیر ہو گئی۔"

"تیں نوں پتہ ہے، زمیں دارنی سے کیا گل بات کر رہا تھا؟"

"میں تو جی زمیں دارنی کے پاس گیا ہی نہیں۔"

"ایسی گل ہے تو تیں نوں وکیل کے بارے میں کیسے پتہ چلا؟"

تاراں نے بتایا۔ وہ زمیں دارنی کے پاس بیٹھی تھی۔"

"اِدھر تو وکیل کا آنے کا ارادہ نہیں؟"

"ہاں، تاراں کہتی تھی کہ وہ تیرے پاس آنے کو بھی کہتا تھا۔" احمد نے بتایا۔

رحیم داد پر ایک بار پھر گھبراہٹ نے حملہ کیا۔ اُس نے روٹی کا لقمہ منہ میں رکھ لیا۔ گھبراہٹ پر ذرا قابو پایا تو اُس نے احمد سے کہا" تو میرے لیے تانگہ نہ لانا۔"

"کیوں، پاک پتن نہیں جانا؟"

"وکیل سے بات چیت میں نہ جانے کتنی دیر لگ جائے۔" رحیم داد نے بات بنائی" پھر کسی روز چلا جاؤں گا۔"

رحیم داد کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ وکیل محمد عثمان رندھاوا آگیا۔ اُس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے رسمی انداز میں پوچھا" چوہدری! کیا حال چال ہے؟"

رحیم داد نے اپنی گھبراہٹ اور پریشانی پر قابو پانے کے لیے چہرے پر افسردگی طاری کرنے کی کوشش کی۔ لہجے میں رقّت پیدا کرتے ہوئے بولا" اب کیا حال چال رہ گیا جی!" اُس نے ٹھنڈی سانس بھری۔" اللہ دسایا کے بعد کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ وہ اپنے ساتھ حویلی کی ساری خوشیاں اور ساری چہل پہل لے گیا۔"

"بہت اچھا بندہ تھا۔ اُس کا قتل بہت الم ناک حادثہ ہے۔" وکیل نے بھی غم زدہ لہجے میں بات کی۔

"زمیں دارنی کیا کہتی ہے؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"وہ بے چاری کیا کہے گی۔" وکیل بولا" اُسے تو کچھ پتہ نہیں۔ وہ تو حویلی کی چار دیواری کے اندر عدّت میں بیٹھی ہے۔"

"ایک چھوڑ دو تھانے دار تفتیش کے لیے آئے۔ لگتا ہے، کسی نے کچھ نہیں کیا۔ زمیں دارنی تو یہی بتاتی تھی۔"

"بتاتی تو مجھ سے بھی یہی تھی۔" وکیل نے کہا" پر میں نے کہا نا، اُسے کچھ پتہ نہیں۔"

رحیم داد نے چوکنا ہو کر وکیل کو دیکھا۔ اُس نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی "قاتلوں کا بھی کچھ سراغ ملا؟ کوئی گرفتاری شرفتاری ہوئی؟"

"ابھی تک تو کوئی گرفتاری نہیں ہوئی۔ میں یہاں آنے سے پہلے اُس سب انسپکٹر سے ملا تھا، جسے اب تفتیش پر لگایا گیا ہے۔ پہلے جو انسپکٹر تفتیش کر تا رہا تھا، اُس نے نامعلوم ملزمان کے خلاف صرف کیس رجسٹر کیا تھا اور کیس بگاڑنے کے لیے ایف آئی آر میں توڑ مروڑ کر غلط حالات اور واقعات درج کر دیے۔ زمیں دارنی نے جو ابتدائی رپوٹ لکھوائی تھی، اس میں اس طرح ردّو بدل کر دیا جس سے ملزمان کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔"

"یہ تو اس نے بہت گندی حرکت کی۔" رحیم داد نے منہ بگاڑ کر جھنجلاہٹ ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ "اُس کے خلاف کوئی کاروائی نہیں ہو سکتی؟"

"ہو تو سکتی ہے۔" وکیل نے توجیہہ پیش کی۔ "دفعہ ۱۵۴ ضابطہ فوجداری کی رُو سے متعلقہ پولیس افسر پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ابتدائی رپوٹ میں کسی بھی قسم کی ترمیم یا تبدیلی نہ کی جائے۔ اگر وہ خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کے خلاف تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ ۲۱۸ کے تحت کاروائی ہو سکتی ہے اور جرم ثابت ہونے پر ایسے پولیس افسر کو تین سال کی قید اور جرمانے کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔" وکیل نے قدرے توقف کیا پھر گویا ہوا۔ "مگر میں نے اِس سلسلے میں قانونی چارہ جوئی کرنے سے گریز کیا۔ سوچا اس مرحلہ پر پولیس سے بگاڑنا مناسب نہیں البتہ انسپکٹر جنرل پولیس کو میں نے جو درخواست پیش کی تھی اس میں اس قانونی پہلو پر روشنی ڈالی تھی۔ آئی جی نے اس کا ضرور نوٹس لیا ہو گا۔ چنانچہ اس کے حکم پر ایس پی نے اس کی بجائے ایک اور انسپکٹر کو تفتیشی افسر مقرر کر دیا۔ لگتا ہے، وہ کیس میں پوری دلچسپی لے رہا ہے۔"

"وہ کیا بتا تا تھا؟" رحیم داد نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

وکیل نے کہا۔ "اُس کا خیال ہے، اللہ دسایا کا قتل پرانی دشمنی کا نتیجہ ہے۔ اللہ دسایا کی صرف ایک ہی شخص سے دشمنی تھی۔ اور وہ احسان شاہ ہے۔ زمیں دارنی نے بھی اپنے بیان میں اُسی پر شبہ ظاہر کیا ہے۔"

"میں نے تو جی احسان شاہ کو دیکھا بھی نہیں۔ سنا ہے' اچھا بندہ نہیں ہے۔" رحیم داد نے صفائی پیش کی اور وکیل کو گمراہ کرنے کے لیے جھجکتے ہوئے بولا۔" پر میں نے ایک گل اور بھی سنی ہے۔"

وکیل رندھاوا نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔" وہ کیا گل ہے؟"

"سنا ہے' اللہ وسایا کو زیب دارنی کے بھائیوں نے قتل کیا اور رات ہی کو سرحد پار لوٹ بھی گئے۔" رحیم داد نے مسکین سی شکل بنا کر کہا۔" ایک بار تو آدھی رات کو زیب دارنی کا بھائی اور چاچا اُسے لینے آئے تھے' اُن کے ساتھ مسلح بندے بھی تھے' خود اُن کے پاس بھی بھرے ہوئے پستول تھے پر زیب دارنی نے اُن کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا۔ اللہ وسایا تو اُس رات شہر گیا ہوا تھا پر میں پہنچ گیا۔ ساری گل بات میرے سامنے ہوئی تھی۔"

"چوہدری! تو نے یہ بات کس سے سنی؟"

"مجھے تو حویلی کے نوکر حمدے نے سنائی تھی اور اُسے لوہار کے منڈے نے بنائی تھی۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔

"ویسے زیب دارنی کے کانوں تک یہ گل پہنچ چکی ہے۔"

"اُس نے کیا کہا؟" رحیم داد نے دھڑکتے دل سے دریافت کیا۔

"وہ کہتی ہے' یہ بالکل جھوٹ ہے۔ اُس کے بھائی اور چاچا ہرگز ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ اللہ وسایا کو کیوں قتل کرتے۔ وہ کبھی اُن کے راستے میں نہیں آیا۔ اس کا فیصلہ تو اُس نے زیب دارنی ہی پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ خود ہی اپنے بھائیوں کے ساتھ جانا نہیں چاہتی۔" وکیل نے جمیلہ کا موقف بیان کیا۔" زیب دارنی کا خیال ہے کہ تفتیش کو غلط راستے پر ڈالنے کے لیے یہ افواہ جان بوجھ کر پھیلائی گئی ہے۔"

"اور وکیل صاحب' تمہارا کیا خیال ہے جی؟" رحیم داد نے زور زور سے دھڑکتا ہوا دل قابو میں کرنے کی کوشش کی۔

"چوہدری! میرا بھی یہی خیال ہے۔" رندھاوا نے نہایت اعتماد سے کہا۔ رحیم داد پر

گھبراہٹ طاری ہونے لگی، اُسے وکیل سے اِس ردِّعمل کی توقع نہ تھی۔ وہ دم بخود بیٹھا رہا۔ وکیل نے بتایا۔" میں نے تفتیش کرنے والے پولیس انسپکٹر جنجوعہ سے جو کچھ معلوم کیا ہے، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس نے اللہ وسایا کے قتل کا کچھ سراغ نکال لیا ہے۔ اُس نے نئے سرے سے تحقیقات شروع کی ہے۔ وہ تو بہت پُرامید نظر آتا تھا۔ کہتا تھا۔ جلد ہی گرفتاریاں شروع ہو جائیں گی۔"

رحیم داد نے بڑی مشکل سے اپنی سراسیمگی چھپائی اور سینے پر ہاتھ مار کے جوش و خروش سے بولا۔" اگر یہ پتہ چل جائے کہ اللہ وسایا کا خون احسان شاہ نے کرایا ہے تو میں اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ چاہے جان جائے یا پھانسی ہو۔ میں اللہ وسایا کا بدلہ اُس سے ضرور لوں گا۔" اُس نے وکیل کی جانب تیکھی نظروں سے دیکھا۔" بُرا نہ منانا، مجھے تو پولیس کچھ کرتی شرتی لگتی نہیں۔ تھانے دار تو خالی پیلی باتیں کرتے ہیں۔ کچھ بھی نہیں کریں گے۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔" وکیل نے رحیم داد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔" پولیس میں سارے افسر بُرے نہیں ہیں۔ ایسے فرض شناس بھی ہیں، جن کو اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس ہے جو تھانے دار اب تفتیش کر رہا ہے، وہ بھی ایسا ہی پولیس افسر ہے۔ وہ تیرے پاس بھی آئے گا۔ اور جلدی آئے گا، پوچھ گچھ کرے گا، تیرا بیان بھی لے گا۔ تجھے جو کچھ معلوم ہو، صاف صاف بتا دینا۔"

"مان لو، کاتل اگر زمیں دارنی کے بھائی ہوئے، تب تھانے دار کیا کرے گا؟" رحیم داد نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کی غرض سے ایک بار پھر وکیل کو ورغلانے کی کوشش کی۔" وہ تو اب ہاتھ آنے سے رہے، راتوں رات سرحد پار چلے گئے ہوں گے، وہاں سے انہیں کیسے گرفتار کیا جا سکتا ہے؟"

"اگر ایسا ہے، تب تو قاتلوں کو گرفتار کرنا ممکن نہیں۔" وکیل نے کہا۔" مگر میرا خیال ہے کہ اللہ وسایا کو انھوں نے قتل نہیں کیا۔ زمیں دارنی کا بھی یہی خیال ہے اور انسپکٹر جنجوعہ کی باتوں سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔"

"ایسا ہی ہو گا جی!" رحیم داد نے ہتھیار ڈال دیے۔

وکیل نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔" چوہدری! میں تیرے پاس یہ بتانے آیا تھا کہ میں تیرے کلیم کے کاغذات جلد ہی لوٹا دوں گا۔ ابھی مجھے اُن کی ضرورت پڑے گی۔"

"جب تک جی چاہے اپنے پاس رکھو۔ میں نوٹ واپس لینے کی جلدی نہیں۔ اُن کے بارے میں مجھے کوئی فکر نہیں۔"

اُس درخواست کے بارے میں نہ رحیم داد نے کچھ کہا نہ وکیل نے، جس پر رحیم داد نے دستخط کیے تھے۔ جلد ہی وکیل کھڑا ہو گیا، مسکرا کر بولا: "مجھے اب جانا ہے۔" رحیم داد اُس کے ہمراہ بیرونی دروازے تک گیا۔

وکیل سے گفتگو کے بعد رحیم داد سخت پریشان ہو گیا۔ اُسے سب سے زیادہ تشویش اس بات کی تھی کہ اگر پولیس انسپکٹر جنجوعہ تفتیش کے لیے آیا تو اُسے تمام وقت یہ دھڑکا لگا رہے گا کہ کہیں وہ اسے پہچان نہ لے۔ اسی خطرے کے پیشِ نظر وہ کسی پولیس والے کا سامنا کرنے سے کتراتا تھا۔ وہ تفتیشی کارروائی میں کسی طور شریک ہونا نہیں چاہتا تھا۔ یہ بات وہ احسان شاہ سے بھی کہہ چکا تھا۔ احسان شاہ نے اُسے یقین دلایا تھا کہ اللہ وسایا کے قتل کے معاملے میں اُس سے مطلق پوچھ گچھ نہیں کی جائے گی۔ رحیم داد مطمئن بھی ہو گیا تھا اور یہ معلوم ہونے کے بعد اُسے مزید اطمینان ہو گیا تھا کہ دونوں پولیس انسپکٹروں میں سے کوئی بھی اب تک اُس کے پاس نہیں آیا تھا مگر اب وکیل سے ملنے کے بعد اُس کا اطمینان اور سکون درہم برہم ہو گیا تھا۔

دن اِسی الجھن میں گزرا۔ شام بھی پریشانی میں کٹی۔ غروبِ آفتاب کے وقت ہلکی سی بارش ہوئی مگر اب آسمان صاف تھا۔ کہیں کہیں بادلوں کے ہلکے پھلکے ٹکڑے تیزی سے دوڑتے نظر آ رہے تھے۔ رحیم داد کا پلنگ برآمدے میں بچھا تھا۔ وہ بستر پر خاموش لیٹا تھا۔ احمد بھی موجود تھا۔ رات گزرتی رہی۔ احمد اپنے بستر سے اُٹھا، آہستہ سے کھنکارا۔ رحیم داد جاگ رہا تھا مگر خاموش لیٹا رہا۔ اُس نے دیکھا کہ احمد دبے پاؤں دروازے پر پہنچا اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

☆

آدھی رات کے بعد بیرونی دروازہ دھیرے سے کھلا۔ رحیم داد ابھی تک جاگ رہا تھا اور کروٹ کے بل لیٹا ہوا تھا، نظریں دروازے ہی کی جانب تھیں۔ دروازہ کھلا تو اُس نے سوچا کہ احمد آیا ہو گا۔ آنے والا

دروازے میں داخل ہو کر آگے بڑھا تو تاروں کی دھندلی روشنی میں رحیم داد نے اُس کی وضع قطع سے اندازہ لگایا کہ وہ احمد نہیں ہے۔ رحیم داد گھبرا کر اُٹھ بیٹھا، غور سے دیکھا تو وہ دارا تھا۔ رحیم داد سخت گھبرایا۔

دارا قریب آیا تو رحیم داد نے دھیمی آواز میں پوچھا" دارا! تُو کیسے آیا؟" وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ رحیم داد نے اُسے روک دیا، دروازے کی جانب اشارہ کیا" پہلے کنڈی چڑھا دے۔"

دارا نے کنڈی لگائی اور آہستہ آہستہ رحیم داد کے روبرو آکر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا" تُو نے تو مجھے سخت پریشان کر دیا۔ اب تک کہاں رہا؟ تجھے تو ریاست بہاول پور کی طرف نکل جانا تھا۔"

دارا فرش پر بیٹھتے ہوئے عاجزی سے بولا" بالکل یہی ارادہ تھا۔ آج آدھی رات کے بعد میں اور کامل بہاول پور جانے کے لیے بالکل تیار تھے۔"

"پر تُو اِدھر کیسے آگیا؟" رحیم داد جھنجلا گیا۔

"وہ ایسا ہوا جی کہ میں روٹی کھا کر جلدی سو گیا۔" دارا نے بتایا۔" آنکھ کھلی تو کامل سامنے کھڑا جھنجوڑ رہا تھا۔ میں فٹافٹ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کامل بہت گھبرایا ہوا لگتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ پولیسیے تیری تلاش میں آئے ہیں، تُو فوراً پیچھے سے نکل جا۔" دارا نے دھیرے سے کھنکار کر گلا صاف کیا" میں نے جی ایسا ہی کیا۔ آنگن کی دیوار پھاند کر پچھواڑے گیا، اُدھر مکئی کے کھیت تھے۔ میں اِن میں گھس گیا اور چھپتا چھپاتا پگڈنڈیوں اور پیہوں سے گزرتا چک سے باہر نکل گیا۔"

"کامل نے تجھے یہ نہیں بتایا کہ پولیسیے تیری تلاش میں کیوں آئے تھے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"یہ تو جی اُس نے نہیں بتایا، وہ تو بہت ڈرا ہوا تھا۔ لگتا ہے پولیس نے اللہ وسایا کے کتل کا سراغ لگا لیا ہے۔"

رحیم داد کو فوراً وکیل کی بات یاد آگئی۔ وہ خوف زدہ ہو کے دارا کو دیکھنے لگا۔ دارا نے اُسے اس طرح گھورتے دیکھا تو پریشان ہو کر بولا" تُو مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہا ہے؟"

رحیم داد نے کہا" تجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ پولیسیے پہلے ہی اِدھر کے چکر کاٹ رہے

ہیں۔ روز ہی تفتیش کے لیے آتے ہیں۔"

"پر جانا کہاں؟" دارا نے مجبوری کا اظہار کیا "چھپنے کا یہی ایک ٹھکانا نظر آیا۔ تیں نوں پتہ ہے، کتنی مشکلوں سے پہنچا ہوں۔" دارا کے لہجے میں عاجزی تھی۔

رحیم داد کو غصہ تو بہت آیا مگر اُس نے ضبط سے کام لیا۔" اگے کے لیے تو نے کیا سوچا؟" رحیم داد نے قدرے نرمی سے پوچھا۔

"تو مجھے کسی طرح اِدھر سے نکال کر ریاست میں پہنچا دے۔" دارا نے کہا۔" اگے کی فکر نہ کر۔ کامل رحیم یار خاں پہنچ کر میرا انتظار کرے گا۔ وہ اپنے ایک یار کے ساتھ ٹھہرے گا۔ میں نوں اُس کا پتہ ملوم ہے۔ کامل کل کسی وکھت اُدھر نکل جائے گا۔ میں پہلے پہنچ گیا تو رحیم یار خاں میں اُس کے یار کے پاس رک کر اُس کا انتظار کروں گا۔ یہ پروگرام ہم دونوں پہلے ہی بنا چکے ہیں رحیم یار خاں سے ہم گڈی پکڑیں گے اور کراچی نکل جائیں گے۔"

رحیم داد کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اُسے بہاول پور کیسے پہنچائے۔ کوٹ ہرکشن میں اُس کے اعتماد کا کوئی ایسا شخص نہیں تھا لیکن اُس نے اپنی مجبوری ظاہر نہیں کی۔ دارا کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔" تو اب سو جا۔ فکر نہ کر۔ میں کل تجھے اُدھر پہنچانے کا بندوبست کر دوں گا۔" اُس نے دارا کو اوڑھنے کے لیے ایک چادر دے دی۔

دارا چادر لے کر برآمدے کے ایک گوشے میں فرش پر خاموشی سے لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ خراٹے بھر رہا تھا مگر رحیم داد نہیں سویا۔ وہ سخت پریشان تھا۔ دارا خطرہ بن کر بالکل اُس کے قریب آ گیا تھا۔ وہ خاموش لیٹا اس خطرے سے چھٹکارا پانے کی ترکیبیں سوچتا رہا۔ نہ وہ اُسے بہاول پور پہنچا سکتا تھا نہ اپنے پاس روپوش رہنے کی اجازت دے سکتا تھا۔ وہ شدید ذہنی الجھن میں تھا۔

تھکا ہارا دارا اطمینان سے چادر اوڑھے سو رہا تھا اور رحیم داد بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ احمد کی طرف سے وہ مطمئن تھا کیوں کہ صبح سے پہلے اُس کی واپسی ممکن نہیں تھی۔ وہ اکثر رات گئے چپ چاپ نکل جاتا تھا اور صبح تک غائب رہتا تھا۔ رحیم داد نے سوچا، رات تو کسی نہ

کسی طرح گزر جائے گی، صبح وہ دارا کو کوٹھری میں چھپا کر باہر سے تالا ڈال دے گا۔

مگر وہ اُسے اِس طرح کب تک چھپا کر رکھ سکتا تھا۔ وہ اُسے سویرا ہونے سے پہلے گاؤں سے نکل جانے کے لیے بھی کہہ سکتا تھا یا دن کوٹھری میں گزارنے کے بعد رات کو چلے جانے کے لیے کہتا۔ گاؤں کی حدود کے باہر نہر کے کنارے تک جاکر اُسے چھوڑ بھی آتا مگر اس میں خطرہ یہ تھا کہ اگر وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو کیا ہوگا۔ رحیم داد لرز کر رہ گیا۔ اُسے پھانسی کا پھندا سامنے لہراتا نظر آنے لگا۔

بہت غور و فکر کے بعد اُسے دارا سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ نظر آیا اور وہ یہ تھا کہ دارا کا خطرہ سر سے مٹا دیا جائے۔ اس سلسلے میں اُس نے یہ منصوبہ تیار کیا کہ دن بھر دارا کو نہایت رازداری سے کوٹھری میں چھپائے رکھے گا۔ رات کا اندھیرا پھیلتے ہی احمد کو چھٹی دے دے گا۔ احمد خوشی سے چلا جائے گا۔ اُس کے جانے کے بعد دارا سے کہے گا کہ وہ نہر کے کنارے پہنچ جائے اور اُس کا انتظار کرے۔ بعد میں وہ بندوق لے کر گھوڑی پہ نہر کے کنارے جائے گا اور دارا کو گھوڑی پر بٹھا کر دور ویرانے میں جائے گا پھر کسی جھنگر کے نیچے اُسے گولی مار دے گا۔ لاش نہر میں ڈال دے گا۔ بارش کے پانی کی وجہ سے نہر کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ لاش بہتی ہوئی دور نکل جائے گی۔ وہ اطمینان سے واپس آکر مہمان خانے میں سو جائے گا۔

اُسے منصوبہ مرتب کرکے کسی قدر سکون ملا۔ وہ گہری نیند سو گیا۔ صبح ہونے سے بہت پہلے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے پریشان ہو کر دیکھا۔ دارا غائب تھا اور مہمان خانے کا دروازہ کھلا تھا۔

۲۳

تانگہ ہچکولے کھاتا ہوا نہر کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ بارش کے باعث راستہ خراب تھا۔ جگہ جگہ کیچڑ تھی، گڑھے تھے۔ کوچوان بہت احتیاط سے تانگہ چلا رہا تھا۔ مگر جب کوئی پہیہ گڑھے میں چلا جاتا تو تانگہ ایک طرف جھک جاتا یا الار ہو جاتا۔ رحیم داد کو بار بار پہلو بدلنا پڑتا۔ وہ بہت چوکس اور محتاط بیٹھا تھا۔

آسمان پر ابر چھایا تھا۔ نہر کی جانب سے بھیگے ہوئے جھونکے آ رہے تھے۔ فضا سہانی اور خوشگوار تھی مگر رحیم داد گم صم بیٹھا تھا۔ چہرے سے تشویش جھلکتی تھی۔ تانگہ چک بیدی کی سمت جا رہا تھا۔ رحیم داد سویرے سویرے کوٹلہ ہرکشن سے روانہ ہوا تھا۔ اب پہر دن گزر چکا تھا۔ تانگہ نشیب سے نکل کر پلیا کی چڑھائی طے کرنے لگا تو معاً رحیم داد کو اللہ وسایا یاد آ گیا۔ اسی پلیا کے نیچے اس کی لاش نہر میں تیرتی ہوئی ملی تھی۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے اس طرف دیکھا تو چہرے پر خوف اور پریشانی طاری ہو گئی۔ کوچوان اس کے احساسات سے بے نیاز گھوڑے کی پیٹھ پر سٹراک سٹراک چابکیں مار رہا تھا۔ چڑھائی پر اس کی رفتار بہت سست پڑ گئی تھی۔ چابکیں پڑیں تو گھوڑے نے تیز قدم اٹھائے۔ تانگہ اوپر پہنچ گیا اور پختہ سڑک پر تیزی سے دوڑنے لگا۔

رحیم داد چک بیدی نہ گیا۔ اسے دراصل وہاں جانا بھی نہ تھا۔ چک بیدی سے پہلے فاضل پورہ کا اڈہ تھا۔ وہاں سے اسے لاری میں سوار ہونا تھا اور پاک پتن کے بجائے حویلی اسٹیشن پہنچنا تھا لیکن اسے فاضل پورہ بھی نہ جانا پڑا۔ نظیر والی کے قریب حویلی اسٹیشن جانے کے لیے سیلی ٹرانسپورٹ

کی لاری مل گئی۔ لاری روانہ ہونے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

رحیم داد جھٹ تانگے سے اُترا۔ کرایہ ادا کیا۔ اور لاری میں جا کر بیٹھ گیا۔ دوپہر کو وہ حویلی اسٹیشن پہنچ گیا۔ وہاں سے اُسے احسان شاہ کے گاؤں، پیراں والہ جانا تھا۔ اسٹیشن سے متن والہ تک کنکر کی بنی ہوئی سڑک تھی۔ سڑک بہت دور تک آگے بھی جاتی تھی۔ اُسی سڑک سے ایک پختہ سڑک پیراں والہ کو جاتی تھی۔ یہ سڑک احسان شاہ کی جاگیر میں واقع تھی۔ اسی نے بنوائی تھی اور اسی کی ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ متن والہ کی سمت جانے والی کنکر کی سڑک شدید بارشوں سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ لہٰذا اِن دنوں اس پر بہت کم لاریاں چلتی تھیں۔

رحیم داد نے لاری کا انتظار کرنے کے بجائے تانگہ لیا اور اِس میں بیٹھ کر پیراں والہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ سڑک خراب ہونے کے باوجود تانگہ سورج غروب ہونے سے پہلے ہی احسان شاہ کی حویلی پر پہنچ گیا۔ احسان شاہ گھوڑی پر سوار ہو کر ہوا خوری کے لیے روانہ ہونے والا تھا۔ حویلی کے پھاٹک پر رحیم داد سے اُس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ دیکھتے ہی جھٹ گھوڑی سے نیچے اُترا۔ بڑھ کر گرم جوشی سے رحیم داد کو گلے لگایا۔ ہوا خوری کا ارادہ ترک کیا۔ رحیم داد کو اپنے ہمراہ دیوان خانے میں لے گیا۔

احسان شاہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد کو بھی قریب بٹھایا۔ مسکرا کر پوچھا "چوہدری تو تانگہ میں کہاں سے آ رہا ہے؟"

"آ تو میں کوٹلہ ہرکشن ہی سے رہا ہوں" اس نے مسکرا کر کہا۔ "آگے بھی اسی رستے سے آتا رہوں گا۔"

"پر یہ تو بہت لمبا اور چکر کا راستہ ہے" احسان شاہ نے حیرت کا اظہار کیا۔ "تو نے یہ راستہ کیوں پکڑا؟"

"نہر کے کنارے کا رستہ چھوٹا ہے۔ میں گھوڑی پر بیٹھ کر آرام سے آ جا بھی سکتا ہوں۔ پر اس رستے کو استعمال کرنے سے شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اِسی لیے میں نے یہ چکر کا رستہ پکڑا۔"

"جیسی تیری مرضی" احسان شاہ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "اب تجھے کس کی پرواہ کرنی ہے؟ میں نے

تیرا راستہ بالکل صاف کر دیا ہے۔ تو اللہ دسایا سے ڈرتا تھا۔ وہ تو اب رہا نہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے پر مجھے بہت خوف لگ رہا ہے۔ ہر طرف خطرہ ہی خطرہ نظر آتا ہے۔" رحیم داد نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

"پرواہ نہ کر چوہدری۔ کوئی خطرے شطرے کی گل نہیں۔" احسان علی شاہ نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "یہ بتا تیرے پاس کوئی پُولسیا تو پوچھ گچھ کے لیے نہیں آیا؟"

"ابھی تک تو کوئی نہیں آیا۔" رحیم داد نے بتایا۔ "دو تھانے دار تفتیش کے لیے آئے۔ پہلے اس تحصیل کا تھانیدار۔ پر اب تفتیش پاک پتن تحصیل کے تھانے دار کے حوالے کر دی گئی ہے۔ وہ بھی جمیلہ اور حویلی کے نوکروں سے پوچھ تاچھ کر کے اور ان کے بیانات لے کر چلا گیا۔"

"مجھے اس کا پتہ ہے۔" احسان شاہ بیچ میں بول پڑا۔ "پر تجھ سے تو کسی نے بیان شیان نہیں لیا۔ نہ تیرے پاس آیا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ پر پچھلے دنوں وکیل آیا تھا۔ بتاتا تھا کہ اس نے زمیں داری کی طرف سے اوپر درخواست لگائی تھی۔ اسی درخواست پر تفتیش کا کام دوسرے تھانے دار کو دیا گیا۔ وکیل اس تھانیدار سے ملا تھا۔ کہتا تھا اس نے سراغ نکال لیا ہے۔ جلد ہی گرفتاریاں بھی ہونے والی ہیں۔" رحیم داد کے چہرے پر سراسیمگی اور پریشانی چھا گئی۔ "وکیل نے یہ بھی بتایا کہ تھانے دار جلد ہی میرے پاس بھی پوچھ تاچھ کرنے آئے گا۔"

"تو گویا گل اس طرح ہے۔" احسان شاہ نے بڑبڑانے کے انداز میں آہستہ سے کہا اور گردن جھکا کر سوچنے لگا۔

"پر وہ ابھی تک میرے پاس نہیں آیا۔"

"تجھے یہ اطلاع ملتے ہی فوراً میرے پاس آنا چاہیے تھا۔" احسان شاہ کے لہجے سے تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔ "میں نے ماکھے کو تجھے بلانے کے لیے بھیجا بھی تھا۔"

"میں تو جی وکیل سے بات کرنے کے بعد دوسرے ہی روز آنا چاہتا تھا۔ پر کئی روز تک ایسی زبردست برکھا ہوئی کہ رکی ہی نہیں۔ رستے بھی خراب ہیں۔ میں ایسے میں کیسے آتا۔ راتے کو بینہ رکا

تو میں سویرے سویرے تیرے پاس آنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔" رحیم داد نے صفائی پیش کی۔

"اچھا کیا تو آ گیا اور ساری باتیں مجھے بتا دیں۔" احسان شاہ نے اسے اطمینان دلایا۔" فکر نہ کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ تھانے دار جواب تفتیش کر رہا ہے، اس کا نام اسلم حیات جنجوعہ ہے نا؟"

"وکیل نے اس کا یہی نام بتایا تھا۔"

"لگتا ہے جمیلہ کی درخواست پر ہی اُسے ڈی۔ ایس۔ پی نے لگایا ہے۔" احسان شاہ بولا۔" جنجوعہ کارگزاری دکھانے پر تلا ہے۔" احسان شاہ مسکرایا۔" تو اس کی پرواہ نہ کر۔ اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔"

"میں نوں تو اس سے خوف آنے لگا ہے۔ میرے پاس پوچھ تاچھ کے لیے آیا اور اس نے الٹے سیدھے سوال کیے تو ڈر ہے نہ جانے کیا زبان سے نکل جائے۔ سچ پوچھ تو میں کبھی کتل شتل کے معاملوں میں پڑا نہیں۔ اسی لیے تجھ سے میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ایسا بندوبست کر دے کہ میں نوں پولیس کے چکروں میں نہ پڑنا پڑے۔"

احسان شاہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔" ابھی تو بہت کچا ہے۔ جلدی گھبرا جاتا ہے۔ ڈرتا بھی ہے۔ چوہدری! زمیں داری کرنی ہے تو وڈا دل رکھ۔ حوصلے سے کام لے۔" اس کا لہجہ بھاری بھر کم ہو گیا۔ "ایسے خطرے تو آگے روز ہی آتے رہیں گے۔ کب تک ڈرتا رہے گا؟" اس نے رحیم داد کو گہری نظروں سے دیکھا۔" پریشان نہ ہو۔ ایسا بھی وقت آئے گا اور جلدی آئے گا جب تجھے خطرہ، خطرہ نہ لگے گا بلکہ خطرہ مول لینے میں مزا آئے گا۔"

"میں نوں ڈر اس لیے بھی لگ رہا ہے کہ وکیل کہتا تھا۔ تھانے دار نے اللہ دسایا کے کتل کا پتہ چلا لیا ہے۔" رحیم داد نے کہا۔" لگتا ہے وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ تیں نوں پتہ نہیں پولیس نے دارا کے ٹھکانہ پر پچھلے دنوں رات کو چھاپہ مارا۔ وہ کسی نہ کسی طرح بچ کر نکل بھاگا۔ سیدھا میرے پاس آیا۔ میں حویلی کے مہمان خانے میں اس رات اکیلا ہی تھا۔ اسے اپنے ساتھ ٹھیرا لیا۔ پر وہ صبح ہونے سے پہلے ہی چپکے سے اٹھ کر بھاگ گیا۔ جانے کہاں ہے۔ پولیسیوں کے ہاتھ لگ گیا تب تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ اس کے اس طرح فرار ہونے نے مجھے اور بھی زیادہ خوف میں ڈال دیا۔" اس

کے بشرے سے پریشانی ٹپکنے لگی " شاہ جی! یہ تو سوچ، وہ گرفتار کر لیا گیا تو پولیس کو پکا ثبوت مل جائے گا۔"

" تیں نوں اب تک یہ بھی پتہ نہیں کہ دارا کہاں ہے؟"

" میں نوں کی پتہ جی۔" رحیم داد نے حیرت سے کہا۔" اس رات کے بعد سے وہ ملا ہی کب۔"

" میں تجھے بتاتا ہوں کہ دارا کہاں ہے۔" احسان شاہ نے بے نیازی سے مسکراتے ہوئے بتایا۔ " تیرے پاس سے وہ سیدھا اِدھر آیا۔ اور یہ اس نے اچھا ہی کیا۔ شیدا اسے میرے پاس لایا۔ میری اطلاع یہ ہے کہ پولیس نے اللہ وسایا کے قتل کے سلسلہ میں چھاپہ نہیں مارا تھا۔ وہ اسے کسی دوسرے ہی کیس میں گرفتار کرنا چاہتی تھی۔"

رحیم داد نے جھجکتے ہوئے دریافت کیا " یہ بات تجھے دارا نے بتائی تھی؟" رحیم داد کا دل خوف سے زور زور سے دھڑکنے لگا۔

" نہیں " احسان شاہ نے جواب دیا۔ " نہ میں نے اس بارے میں اس سے پوچھا۔ نہ اس نے بتایا۔ ویسے مجھے اس وکت تک کچھ پتہ بھی نہیں تھا۔ بعد میں معلوم کرنے پر یہ اطلاع ملی کہ پولیس کسی اور کیس میں اسے تلاش کر رہی ہے۔"

اب شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ دیوان خانے اور اس سے متصّل برآمدے میں لیمپ روشن کر دیے گئے تھے۔ نوکروں نے برآمدے کے آگے لان میں میز اور کرسیاں لگا دی تھیں۔ شیدا آہستہ آہستہ چلتا ہوا آیا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ احسان شاہ نے اس سے پوچھا۔" شیدے! تو نے اب تک کچھ بندوبست نہیں کیا؟" وہ مسکرایا۔" برسات کی یہ سوہنی شام ایسے ہی گزرتی جا رہی ہے۔ چوہدری بھی آیا ہوا ہے۔"

شیدا نظریں جھکا کر بولا۔" کرسیاں اور میز تو لگا دی ہیں جی۔ بوتل اور گلاس بھی لیے آتا ہوں۔"

احسان شاہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔" چوہدری، باہر آ جا۔ وہیں گل بات ہو گی۔"

رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں لان میں پہنچے اور کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ شیدا وہسکی کی بوتل، گلاس اور جگ میں پانی لے آیا۔ اس نے نہایت مستعدی سے دو پیگ بنائے اور

گلاس احسان شاہ اور رحیم داد کے آگے رکھ دیے۔ دونوں نے گلاس اٹھا کر وسکی کے گھونٹ بھرے۔

رحیم داد نے بے چین ہو کر پوچھا" تو نے یہ نہیں بتایا دارا اب کہاں ہے۔ اس کا کیا بنا؟"

" وہ ریاست بہاول پور کی طرف نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے اسی رات اسے ریاست کی حدود میں پہنچا دیا۔"

" تیں توں اچھی طرح پتہ ہے، وہ اُدھر پہنچ گیا؟"

" میرے کرندے ساتھ گئے تھے۔ اُسے اُدھر پہنچا کر مجھے انہوں نے اطلاع بھی پہنچا دی تھی۔"

احسان شاہ نے نہایت اعتماد سے کہا۔" میرا تو خیال ہے اب تک وہ کراچی پہنچ چکا ہوگا تو اس کی طرف سے بالکل فکر نہ کر۔ ویسے وہ بہت ہوشیار بندہ ہے۔ وہ جلد ہی کراچی سے بحرین کی طرف نکل جائے گا۔ مجھے تو وہیں جانے کے لیے کہتا تھا۔"

رحیم داد وسکی کی ہلکی ہلکی چسکی لگاتار ہا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔" شاہ جی! تجھ سے ایک گل پوچھنی تھی؟"

" ضرور پوچھ۔" احسان شاہ ہنس کر بولا۔

" اللہ وسایا کے کتل کے موکع پر تو بھی موجود تھا؟"

" ہاں!" احسان شاہ نے اعتراف کیا۔" ویسے میں عام طور پر ایسے موکعوں پر موجود نہیں رہتا۔ ایسے کام کے لیے میرے بندے بہت ہوشیار ہیں۔ پر اللہ وسایا ادھر کا اچھا وڈا زمیں دار تھا۔ ہوشیاری سے سوچ سمجھ کر کام کرنا تھا۔ اگے کا بھی تو دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ اس لیے میں خود پہنچ گیا۔ تجھے پتہ ہے بیلا میری حویلی سے بہت زیادہ دور نہیں۔ نزدیک کا معاملہ تھا۔ سوچا، اپنے سامنے ہی یہ کام کرا دوں۔ بات یہ ہے، پہلے بھی کئی بار میرے بندوں نے اسے کتل کرنے کی کوشش کی۔ پر وہ بچ کر صاف نکل گیا۔ میں چاہتا تھا اس بار بچ کر نکلنے نہ پائے۔" اس نے وسکی کا گھونٹ بھرا۔" پر یہ بات تجھے دارا نے بتائی ہوگی۔"

" وہ یہ بھی بتاتا تھا کہ اسی نے دونوں بار گولیاں چلائیں اور انہیں کے لگنے سے وہ مرا۔"

رحیم داد نے پوچھا۔" کیا یہ سچ ہے؟"

"دار نے ٹھیک ہی بتایا۔" احسان شاہ نے کہا۔ "میں نے جان بوجھ کر اسی سے گولیاں چلوائیں۔" وہ ایک آنکھ دبا کر عیاری سے مسکرایا۔ "میں نے تیری باتوں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ تو اسے کسی سنگین جرم میں پھنسا کر اپنے کابو میں رکھنا چاہتا ہے۔" وہ ہنسا۔ "میں نے غلط تو نہیں سوچا؟"

"تو نے ٹھیک ہی سوچا۔" رحیم داد انکار نہ کر سکا۔ مگر وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے اپنی پریشانی پر قابو پانے کے لیے وسکی کا بڑا گھونٹ بھرا۔ مسکرانے کی کوشش کی۔ "شاہ جی تیرا بھی جواب نہیں۔ حد کر دی تو نے۔"

"تو نے پتہ نہیں۔ مجھے روز ہی طرح طرح کے بندوں سے ملنا پڑتا ہے۔" احسان شاہ نے فخر سے گردن اونچی کرتے ہوئے کہا۔ "اگر اتنی سمجھ نہ رکھتا تو کوئی میرے پاس مشورے کے لیے کیوں آنے لگا۔ ساتھ رہے گا تو تجھے خود پتہ چل جائے گا۔ ابھی تو تیرے ساتھ میرا نیا نیا ملنا جلنا ہوا ہے۔"

"یہ تو بتا شاہ جی، تھانے دار جنجوعہ کا تو کیا بندوبست کرنے والا ہے۔" رحیم داد نے اپنی تشویش ظاہر کی۔ "جلد ہی کچھ ہونا چاہیے۔ ورنہ وہ کسی روز میرے پاس پہنچ جائے گا۔"

"فکر نہ کر وہ تیرے پاس کبھی نہیں پہنچے گا۔" احسان شاہ نے اسے اطمینان دلایا۔ "ادھر کا ایس پی فتح علی مرزا ہے۔ وہ ڈی۔ آئی۔ جی بننے کے چکر میں لگا ہے۔ ویسے ہے بھی سینئر افسر۔ میرے پاس کئی بار آ چکا ہے۔ تو نے پتہ نہیں میرا ایک پتر کراچی میں مرکزی حکومت میں وڈا افسر لگا ہے۔ دوسرا لاہور میں ہوتا ہے۔ تیسرا پنڈی میں۔ وہ دونوں بھی وڈے افسر ہیں۔ ویسے دوسرے افسروں اور اسمبلیوں کے ممبروں سے بھی یاری دوستی ہے۔ ان کے کام کراتا ہوں تو ان سے کام لیتا بھی ہوں۔" وہ نشے سے جھوم کر مسکرایا۔ "اطمینان رکھ۔ ایس۔ پی سے کہہ کر جنجوعہ کا تبادلہ کرا دوں گا۔ اور جلد ہی کرا دوں گا۔"

"ایسا ہو جائے تو بہت ٹھیک رہے گا۔ وکیل کی باتیں سن کر میں نوں خوف آنے لگا تھا۔"

"تیرے کہنے سے پہلے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تھانے دار جنجوعہ کارگزاری دکھانے کے لیے کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور کرے گا۔" احسان شاہ بولا۔ "میں نے اس کے تبادلے کے بارے میں سوچ رکھا تھا۔ کل ہی مرزا سے بات کروں گا۔"

شیدا پلیٹوں میں تلے ہوئے مرغ اور کباب لے کر آیا اور میز پر رکھ کر چپ چاپ چلا گیا۔ رحیم داد نے کباب اٹھا کر کھاتے ہوئے کہا۔" شاہ جی، اس بار کسی ایسے تھانے دار کو لگوا جو کیس کو بالکل دبا دے۔"

"پرواہ نہ کر بالکل ایسا ہی ہوگا۔"

" ویسے میں تجھے یہ بتا دوں، جمیلہ اپنے وکیل کے ذریعہ معاملہ کو اوپر تک لے جائے گی۔"

رحیم داد نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"لے جانے دے۔ جتنا چاہے اُوپر لے جائے۔" احسان شاہ نے پلیٹ سے تلا ہوا مرغ اٹھایا اور اس کی ایک ٹانگ نوچ کر علیحدہ کرنے لگا۔" پر کچھ ہونے کا نہیں۔"

" باتوں میں ایسا پھنسا کہ تیں نوں ایک گل بتانا بھول ہی گیا۔ اور وہ بہت کام کی گل ہے۔"

"کیا گل ہے، صاف صاف بتا۔"

" تھانے دار کا خیال ہے کہ اللہ وسایا کا کتل پرانی دشمنی کی وجہ سے ہوا۔" رحیم داد نے کہا۔

" یہ گل جمیلہ نے اُسے سمجھائی۔ جمیلہ نے پچھلے دنوں مجھے بلایا تھا۔ کہتی تھی اُس نے تھانے دار سے یہی کہا ہے۔ پہلا تھانیدار تو نہ مانا۔ پر اب جو تفتیش کر رہا ہے، وہ اسے مانتا ہے۔ جمیلہ نے تیرے بارے میں تھانے دار سے شبہ ظاہر کیا ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا۔"

" یہ تو بہت پہلے ہی مجھے پتہ چل گیا تھا۔" احسان شاہ کا لہجہ تیکھا تھا۔" تو نے یہ کوئی نئی گل نہیں بتائی۔ جمیلہ کو تو یہ کہنا ہی تھا۔"

" تو نے میری پوری گل نہیں سنی۔" رحیم داد نشہ کی ترنگ میں مسکرایا۔" میں نوں تجھے یہ بتانا ہے کہ اللہ وسایا کی پرانی دشمنی تو جمیلہ کے بھائیوں سے بھی تھی اور تجھ سے زیادہ تھی۔ اللہ وسایا ان کا مزارع تھا۔ اپنے معمولی مزارع، اور وہ بھی مسلمان مزارع کے گھر میں اپنی بہن کو اس کی گھر والی کے طور پر کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ وہ بھی تو اسے کتل کر سکتے ہیں۔"

" یہ بات تو نے سوچی ہے؟" احسان شاہ نے پوچھا۔

" نہیں، مجھے حویلی کے ایک نوکر نے بتائی ہے۔" رحیم داد نے کھل کر اظہار خیال کیا۔" وہ کہتا تھا کوٹلہ سرکشن میں اس کا بہت چرچا ہے کہ اللہ وسایا کو جمیلہ کے بھائیوں نے کتل کیا اور

رات ہی کو واردات کے بعد سرحد پار چلے گئے۔"

"نکتہ تو یہ بہت اچھا ہے۔" احسان شاہ نے اظہار پسندیدگی کیا۔" ان پر بالکل شبہ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح تفتیش کو ایسے رُخ پر ڈالا جا سکتا ہے کہ آگے ہی نہیں بڑھے گی۔"

"میں چاہتا ہوں تو اوپر کے پولس افسروں کے کان میں یہ بات ڈال دے۔" رحیم داد نے تجویز پیش کی۔" نیا تھانیدار تفتیش پر لگایا جائے تو وہ اس طرح آسانی سے کیس یہ کہہ کر دبا سکتا ہے کہ قاتل جمیلہ کے بھائی تھے۔ وہ سرحد پار جا چکے ہیں۔ ان کے خلاف کاروائی نہیں ہو سکتی۔" اس نے داد طلب نظروں سے احسان شاہ کی جانب دیکھا۔" ویسے یہ بات پنڈ میں سب ہی جانتے ہیں کہ جمیلہ کے بھائی کئی بار اسے لینے آئے۔ ایک بار تو میرے سامنے آئے تھے پر وہ نہیں گئی۔"

"تو نے ٹھیک سوچا چوہدری۔" احسان شاہ نے قہقہہ لگایا۔" یہ نکتہ پیدا کر کے تو نے دل خوش کر دیا۔ تو اندر سے اتنا گہرا ہے یہ مجھے پتہ نہ تھا۔"

احسان شاہ کھلکھلا کر ہنسا اور چند لمحے تک ہنستا رہا۔ وہ بہت خوش اور مگن نظر آ رہا تھا۔ رحیم داد نے جھجکتے ہوئے کہا۔" ویسے یہ بات جمیلہ تک بھی پہنچ چکی ہے۔ وکیل کہتا تھا، وہ یہ سن کر بہت ناراض ہوئی۔"

" اسے تو ناراض ہونا ہی تھا۔ وہ کیسے چاہے گی اللہ وسایا کے قتل کا الزام اس کے بھائیوں پر لگے۔" احسان شاہ نے وسکی کا گھونٹ بھرا۔" وہ تو اس بات کو کبھی نہیں مانے گی۔ پر اس کے ماننے نہ ماننے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

اس نے نشے کی جھونک میں لہرا کر رحیم داد کو خمار آلود نظروں سے گھور کر دیکھا۔" چوہدری! تو نے بہت اچھا نکتہ نکالا، بہت اچھا نکتہ نکالا۔ اس بنیاد پر آسانی سے کیس دبایا جا سکتا ہے۔ شبہ بھی نہ ہو گا۔ سننے والے اسے مان بھی لیں گے۔ جمیلہ کے مغویہ ہونے سے یہ فائدہ تو اٹھایا ہی جا سکتا ہے۔ یہ بات تو آس پاس کے علاقے میں بھی پھیلائی جا سکتی ہے۔ اور جلد ہی پھیل بھی جائے گی۔ یہاں سے سرحد ۳۰ میل سے زیادہ فاصلے پر نہیں۔ حویلی سٹیشن سے سرحد تک پکی سڑک جاتی ہے۔ اس سڑک پر رات تو رات، دن کو بھی سمگلروں کے اونٹھ اور ٹرک دوڑتے

پھرتے ہیں۔ قاتل آسانی سے واردات کے بعد فرار ہو سکتے ہیں۔"

"ایک گل تینوں اور بتانی تھی۔"

"بتا،بتا، ضرور بتا۔" وہ خوش ہو کر ہنسا۔ "آج تو بہت اچھی باتیں کر رہا ہے۔"

"گل ایہہ ہے جی، کبیر والہ کے جس زمین دار کی کڑی سے میرا ویاہ ہونے والا تھا، وہ رشتہ اس نے خود ہی توڑ دیا۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "جمیلہ نے یہی بتانے کے لیے مجھے بلایا تھا۔ اس کے پاس چوہدری اکرم کا چچیرا اور بھرجائی آئے تھے۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا۔" احسان شاہ بولا۔ "ویسے میں تجھے پہلے ہی خبردار کر چکا تھا کہ یہ بھی اللہ وسایا کا چکر ہے۔ اب تو نے خود ہی دیکھ لیا کہ اس کے مرتے ہی رشتہ ٹوٹ گیا۔ چوہدری اسچی گل تو ایہہ ہے کہ تجھ سے حویلی اور آراضی ہتھیانے کے لیے اللہ وسایا کی یہ بھی ایک چال تھی۔" اس نے قہقہہ بلند کیا۔ "تجھے اب کہیں اور ویاہ کرنے کی کیا ضرورت۔ جمیلہ موجود ہی ہے۔ اس سے نکاح پڑھا لینا۔"

"مشکل ہی ملوم ہوتا ہے۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لگتا ہے، وہ تو اب کسی سے نکاح شکاح نہیں کرنے کی۔ تو نے اس کا سیاپا نہیں دیکھا۔ ہر دم روتی ہی رہتی ہے۔"

"رانڈ ہونے کے بعد ہر زنانی ایسے ہی سیاپا کرتی ہے۔ بعد میں سب کچھ بھول جاتی ہے۔ جمیلہ نرالی زنانی نہیں۔ ابھی تو وہ بھرپور جوان ہے۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو سمجھانے کی کوشش کی۔

مگر وہ نہ مانا۔ کہنے لگا۔ "شاہ جی، وہ اور ہی طرح کی زنانی ہے۔ تیں نوں اس کے بارے میں ٹھیک سے پتہ نہیں۔"

"مجھے سب پتہ ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔ "تو دیکھتا جا۔ جیسا کہوں ویسا کر۔ جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ ابھی تو چوٹ تازہ ہے۔ اس سے ہمدردی جتا۔ اسے تسلی دے۔ اس کا دل بہلانے کی کوشش کر۔ اس کے بچوں سے پیار کر۔ ہر طرح اس کا غم بھلانے اور اس کے دل میں اپنی جگہ پیدا کرنے کی کوشش کر۔ فیر دیکھ وہ کیسے تیرے کابو میں آتی ہے۔ پکے پھل کی طرح تیری جھولی میں گرے گی۔"

"پر ابھی تو وہ عدّت میں ہے۔" رحیم داد نے بتایا۔" مجھ سے گل بات کی تو منہ بکل مار کر چھپا لیا تھا۔ بیٹھ موڑ کر بیٹھی تھی۔ ابھی تو وہ میرے سامنے آتی بھی نہیں۔ نہ ہی میں اس کے پاس جا سکتا ہوں۔ ملاّ کہتا ہے عدّت کے دنوں میں وہ نامحرم کے سامنے نہیں آ سکتی۔ میں اس کے لیے نامحرم ہی تو ہوں۔ میں اس کا کون سا سگا یا شریکا لگتا ہوں۔"

"اور وہ کون سی زبردست مسلمان ہے۔" احسان شاہ نے کہا۔" مجھے پتہ ہے وہ کیسے مسلمان ہوئی اور کیوں ہوئی۔" اس کا لہجہ قدرے تیکھا تھا۔" نہ کبھی اس نے پردہ شروع کیا۔ نہ وڈّے زمینداروں کی زنانیوں کی طرح گھر کے اندر بیٹھی۔ اس کا رہن سہن تو ہمیشہ ہندیوں جیسا رہا۔ تو نے اسے بہت نزدیک سے دیکھا ہے۔ خوب بن سنور کر اِدھر سے اُدھر تتلی کی طرح اڑی اڑی پھرتی تھی۔ وہ زیادہ دن ایسے بند ہو کر نہیں بیٹھے گی۔ زیادہ سے زیادہ عدّت کے دنوں میں حویلی سے باہر نہیں جائے گی۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ مگر احسان شاہ زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا۔ وہسکی کی چسکی لگاتے ہوئے بولا۔" چوہدری۔ آج رات ادھر ہی ٹھہر جا۔"

"آیا تو اسی ارادے سے تھا۔ واپسی کے لیے گھوڑی بھی میرے پاس نہیں۔"

"گھوڑی تو تجھے مل جائے گی پر اس سے شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔" احسان شاہ نے کہا۔" بلکہ اگے بھی تو گھوڑی کی بجائے اسی رستے سے آیا کر جس سے آج آیا ہے۔" وہ مسکرایا۔" جمیلہ کو ہرگز پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ میرا تیرا میل ملاپ ہے، ورنہ وہ بھڑک جائے گی۔"

"میں نے یہی سوچ کر یہ رستہ پکڑا ہے۔"

"اللہ وسایا تو مزارع تھا، مزارع ہی رہا۔" احسان شاہ نے کہا۔" اپنا تانگہ بھی نہ رکھا۔ پر تو ایسا نہ کرنا۔ تانگہ ضرور رکھنا۔ زمیں داری کے چکر میں روز ہی ادھر اُدھر جانا پڑتا ہے۔ میرے پاس تو کار بھی تھی۔ پر اب تو پرانی ہو کر بے کار پڑی ہے۔ ویسے پچھلے دنوں میں نے ایک جیپ خریدی ہے۔ لہور میں ہے۔ جلد ہی پہنچ جائے گی۔ اس کی مجھے سخت ضرورت تھی۔"

"شاہ جی تو ٹھہرا وڈّا زمیں دار بلکہ جگیردار۔ تو سواری کے لیے چاہے تو نئی موٹر بھی خرید سکتا ہے۔ پر میرے پاس اتنی رکم کہاں۔" رحیم داد نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔" اللہ وسایا کے

کے پاس بھی کچھ نہیں تھا۔ جو کچھ تھا اس سے ۱۲ مربع کا کلیم خرید لیا تھا۔ وہ بھی جمیلہ نے سکول اور ڈسپنسری بنانے کے لیے بچا کر رکھا تھا۔"

"سب بکواس ہے۔" احسان شاہ نے تلخی سے کہا۔ "اس کے پاس بہت پیسہ تھا۔ یہ تو اس نے تجھ سے چھپانے کے لیے سب کچھ کیا تھا۔ اُسے زمیں داری اپنے قبضے میں ہی رکھنی تھی۔ یہ دکھاکر وہ زمیں داری میں سے تجھے کچھ دینا نہیں چاہتا تھا۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "اب تجھے زمیں داری سنبھالنی ہے۔ اور اس طرح نہیں چلانی جیسے اب تک چلتی رہی۔ اللہ وسایا نے تو مزارعوں کے اتنے دماغ خراب کر دیئے تھے کہ سارے ہی اپنے تئیں زمیں دار بن گئے۔ میں نے سنا ویگار وہ نہیں کرتے۔ بٹائی میں بھی پورا پورا نصف حصہ لیتے ہیں۔ ایک گل ہو تو بتاؤں، تیرے پنڈ اور تیری زمیں داری کی ہر گل نرالی ہے۔" اس نے وہسکی کی چسکی لگائی۔ "سمجھ نہیں آتی تو ان بگڑے ہوئے مزارعوں اور کمیوں کے ساتھ کیسے کام چلائے گا۔"

"شاہ جی! تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ پنڈ میں بالکل ایسا ہی ہوتا رہا۔ جب تک اللہ وسایا زندہ تھا میں نے زمیں داری کے معاملہ میں کبھی نہ کچھ پوچھا اور نہ ہی اس میں حصہ لینے کی کوشش کی۔ ویسے میں نے جمیلہ سے بھی ابھی تک زمیں داری کے بارے میں کوئی گل بات نہیں کی۔"

"ابھی اس سے ایسی گل بات کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔" احسان شاہ نے مشورہ دیا۔ "پر اگے کے لیے تجھے ابھی سے سوچنا ہوگا۔ اور ایسے ہی زمیں داری چلانی ہوگی جیسے زمیں داری چلائی جاتی ہے۔"

"جیسا تو کہتا ہے، ویسا ہی کروں گا۔" رحیم داد نے مشورہ قبول کرتے ہوئے اسے صورتحال سے بھی آگاہ کیا۔ "شاہ جی! ویسے تو زمیندار اللہ وسایا ہی تھا۔ پر زمیں داری کے سارے معاملات عام طور پر جمیلہ ہی طے کرتی رہی ہے۔ حساب کتاب تو سارا ہی اسی کے پاس رہتا ہے۔ کسی مزارع کو ادھار دینا ہو یا وصولی کرنی ہو، ایسا ہر کام وہی کرتی ہے۔ مزارع اس سے خوش بھی بہت ہیں۔ اسے پیار سے بھین جی کہتے ہیں۔" اس کے رویہ سے مجبوری جھلکنے لگی۔ "تو خود سوچ میں زمیں داری کا کام اپنی مرضی سے کیسے چلا سکوں گا۔"

"پر جمیلہ تو اب حویلی سے باہر نہیں جا سکتی۔ اسے تو عدت کے چار مہینے دس دن پورے کرنے ہیں۔ اس عرصے میں تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔" اس کا لہجہ قدرے تیکھا ہو گیا۔ "لگتا ہے تو زمین داری سنبھالنے کو تیار ہی نہیں۔"

"ایسی گل نہیں۔ میں تو بالکل تیار ہوں۔" اس نے وسکی کا گھونٹ بھرا۔ "ایسا ارادہ نہ ہوتا تو اللہ وسایا کو اپنے رستے سے کیوں ہٹانے پر آمادہ ہوتا۔ مشکل یہ ہے کہ زمیں داری کو کیسے اپنے ہاتھ میں لیا جائے۔ جمیلہ سے اس معاملہ میں ابھی گل بات کرنی ٹھیک نہیں۔ ڈرتا ہوں اسے شبہ نہ ہو جائے۔"

"نہیں، تو جمیلہ سے ایسی بات نہ کرنا۔ میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔"

رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے استفسار کیا۔ "وہ کیا ہے جی؟"

"تو زمین داری کی دیکھ بھال کے لیے منیجر اور منشی رکھ لے۔ اسی کے ذریعے زمیں داری کا کام چلانے کی کوشش کر۔ وہ تیرا تنخواہ دار بندہ ہوگا۔ جیسا تو کہے گا ویسا ہی کرے گا۔ یوں سمجھ لے اس کے ذریعہ ساری زمیں داری تیرے ہاتھ میں آجائے گی۔"

"گل سمجھ تو آتی ہے۔" رحیم داد نے آہستہ آہستہ سر ہلایا۔ "پر ایسا بندہ میں لاؤں گا کہاں سے۔"

"فکر نہ کر۔ اس کا بندوبست میں کر دوں گا۔ بلکہ میری نظر میں اس کام کے لیے پہلے ہی سے ایک بندہ ہے۔" احسان شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس کا نام نادر خاں ہے۔ محکمۂ مال میں رہ چکا ہے۔ ڈیرہ غازی خاں کے ایک تمن دار کا کاردار بھی رہ چکا ہے۔ بہت تجربہ کار اور کام کا بندہ ہے۔ آج کل خالی ہے۔ پچھلے دنوں میرے پاس آیا تھا۔ اِدھر رحمت والی میں اس کی سسرال ہے۔ فی الحال وہیں ٹھہرا ہے۔"

"تنخواہ کیا لے گا؟"

"تنخواہ شنخواہ کی تو فکر نہ کر۔ وہ مجھ پر چھوڑ دے۔ وہ اتنا کام کا بندہ ہے کہ جتنی تنخواہ لے گا اس سے کہیں زیادہ تجھے فائدہ پہنچائے گا۔" احسان شاہ بے تکلفی سے کھلکھلا کر ہنسا۔ "وہ تجھے پکّا زمیں دار بنا دے گا۔ تو مہاجر ہے، ادھر کی زمیں داری کے رنگ ڈھنگ کا تجھے زیادہ پتہ نہیں

ایسا بندہ تجھے دوں گا کہ زمیں داری کا لطف آجائے گا۔"

رحیم داد کچھ کہنے ہی والا تھا کہ یکایک موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ بجلی زور سے کڑکی۔ آسمان میں روشنی کی تیز لکیر دور تک پھیل گئی۔ ساتھ ہی تیز بارش شروع ہوگئی۔ دونوں لان سے اٹھ کر برآمدے میں پہنچ گئے۔ شیدا اور دوسرے نوکروں نے بھاگم بھاگ میز اور کرسیاں اٹھا کر برآمدے میں لگا دیں۔

احسان شاہ اور رحیم داد پھر وسکی سے شغل کرنے لگے۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ بادل زور زور سے گرجتے۔ برآمدے میں تیز ہوا کے جھونکوں کے ساتھ کبھی کبھی ہلکی سی بوچھاڑ بھی آجاتی۔ دونوں بارش سے لطف اٹھاتے رہے اور وسکی کے نشے کو دو آتشہ بناتے رہے۔ احسان شاہ تو غٹاغٹ چڑھاتا رہا۔ مگر رحیم داد بھی اس رات حد سے تجاوز کر گیا۔ احتیاط کے باوجود کچھ زیادہ ہی پی گیا۔ وہ بے تکلفی سے قہقہے لگاتا۔ بات کرتا تو زبان کسی قدر لڑکھڑاتی۔ بہک کر کہیں سے کہیں نکل جاتا۔ احسان شاہ نشے کے ریلے میں بار بار بہہ جاتا۔ دونوں ہی سرخوشی کے عالم میں تھے۔

دس بجے سے کچھ دیر پہلے دونوں اٹھے اور ڈگمگاتے قدموں سے کھانے کی میز پر پہنچے۔ کھانا پُرتکلف اور خوش ذائقہ تھا۔ رحیم داد مزا لے لے کر خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ مگر احسان شاہ زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے ایک طرف ادب سے کھڑے ہوئے شیدا کو دیکھا۔ اشارے سے قریب بلایا۔

شیدا نزدیک آیا تو احسان شاہ نے کہا "چوہدری، آج رات یہیں ٹھہرے گا۔ کمرہ ٹھیک ٹھاک کرا دے۔" اس نے اپنی مخمور آنکھیں بند کرلیں۔ چند لمحے اسی حالت میں بیٹھا رہا۔ اس نے آنکھیں کھول کر شیدا کی جانب دیکھا۔ "ناجو کو چوہدری کے کمرے میں پہنچا دے۔"

شیدا خاموش رہا۔ کچھ نہ بولا۔ احسان شاہ نے اسے گھور کر تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ڈپٹ کر پوچھا "چپ کر کے کیوں کھڑا ہے؟"

شیدا نے دبی زبان سے کہا "ناجو تو جی۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے رک گیا۔

احسان شاہ نے اونچی آواز سے کہا "کیا ہو گیا ناجو کو؟ صاف صاف بتا۔ کوٹ سے نکل کر بھاگ تو نہیں گئی؟"

"نہیں جی ایسی کوئی گل نہیں"۔ شیدا بدستور خوف زدہ تھا۔

"فیر کی گل اے۔ ٹھیک بتا۔ کیا کہنا چاہتا ہے؟"

"وہ ایسا ہے جی" وہ ایک بار پھر اٹکا۔ لمحہ بھر خاموش رہ کر آہستہ سے بولا" اسے تو جی چھوٹے شاہ جی نے اپنے کمرے میں بلا رکھا ہے"۔

"اس کھوتی کے جنے نے یہ بھی نہ سوچا نا جو عمر میں اس سے کتنی بڑی ہے"۔ وہ غصہ سے آنکھیں نکال کر بولا۔ مگر جلد ہی نرم پڑ گیا۔ آہستہ سے ہنسا۔ رحیم داد کی جانب دیکھا" یہ جوانی بھی بہت ظالم ہوتی ہے۔ نہ جوڑ دیکھے نہ بے جوڑ۔ اندھا بنا دیتی ہے"۔ اس نے زور کا قہقہہ لگایا" چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ جاڑے میں اس کا ویاہ کرنے والا ہوں۔ ناجو اسے سارے گر بتا دے گی۔ بہت زوروں کی رن ہے"۔

رحیم داد بے نیازی سے بریانی کی پلیٹ سے لقمے اٹھا، اٹھا کر کھاتا رہا۔ شیدا سر جھکائے چپ کھڑا رہا۔ احسان شاہ آنکھیں بند کرکے ایک بار پھر مراقبے میں چلا گیا۔ چند لمحوں بعد وہ گردن اٹھا کر شیدا کی جانب متوجہ ہوا" شیدے!" وہ بات کہتے کہتے بھڑکا" ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ بلّو کیسی رہے گی؟ بالکل ٹھیک۔ اسے پہنچا دے۔ وہ نکھرا شکھرا بھی نہیں کرے گی۔ چوہدری کو تو ایسی ہی رن چاہیے"۔ اس نے رحیم داد کی سمت دیکھا" کیوں چوہدری کیا خیال ہے تیرا؟ اگر تجھے تیز اور گرم چاہیے تو بتا دے"۔

"میں نوں تو جی نہ گرم چاہیے، نہ ٹھنڈی۔ میں تو ایسے ہی سو جاؤں گا۔ تو میری فکر نہ کر"۔

"چوہدری تو زنانیوں کی طرح شرما کیوں رہا ہے؟ داڑھی رکھ کر تو بالکل ملّاں بن گیا" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا" ملّاں بن کر زمین داری نہیں چل سکتی۔ اور ملّاں بے چارے کو تو زنانی ملتی ہی کہاں ہے۔ وہ تو صرف اس کے خواب دیکھتا ہے۔ اور تو، تو" وہ ایک بار پھر بہکا اور دوسری طرف نکل گیا" جمیلہ بھی بہت زوروں کی رن ہے۔ جب اللہ وسایا اسے اٹھا کر لایا۔ یہ کوئی اٹھ سال اُدھر کی گل ہے۔ میں اسے دو ہزار دینار ہا کہ میری حویلی میں بھیج دے۔ پر وہ نہ مانا"۔ اس نے پلٹ کر شیدا کی جانب دیکھا جو سر جھکائے بت بنا کھڑا تھا" تو ابھی گیا نہیں۔ جا، جا کر چوہدری کے ٹھہرنے کا بندوبست

کر۔ بلّو کو پہنچا دے۔" اس نے رحیم داد کو پھر چھیڑا۔ "چوہدری! ساون کی یہ گرجتی برستی کالی راتیں روز روز نہیں آتیں۔ کیا سمجھا؟"

شیدا جانے کے لیے مڑا۔ احسان شاہ نے اسے ٹوکا۔ "ٹھہر! میں آج باڑی والے کمرے میں رہوں گا۔ رانی اور دلاراں، دونوں کو بھیج دے۔ جو ٹھیک لگے گی۔ اسے روک لوں گا۔ اب تو ٹر جا اور فٹافٹ سارا بندوبست کر دے۔"

شیدا چلا گیا۔ رحیم داد اطمینان سے کھانا کھانے میں جٹا تھا۔ احسان شاہ نے اسے مخاطب کیا۔ "چوہدری! یہ اپنا شیدا، بہت کام کا بندہ ہے۔ تجھے بھی ایسے ہی بندے کی ضرورت پڑے گی۔ فکر نہ کر۔ نادر خاں تیرا منیجر لگ گیا تو تیرے لیے کسی ایسے ہی بندے کا انتظام کر دے گا۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" رحیم داد نے بے نیازی سے کہا۔ پانی کا گلاس اٹھایا۔ اس کا ہاتھ ڈگمگایا۔ گلاس چھوٹ کر میز پر گرا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا۔ پانی میز پر دور تک پھیل گیا۔ رحیم داد نے چونک کر احسان شاہ کی جانب دیکھا۔ خفیف ہو کر بولا۔ "معاف کرنا شاہ جی۔"

"کوئی گل نہیں۔" احسان شاہ نے اسے احساسِ ندامت میں مبتلا نہ ہونے دیا۔ "پانی کے بجائے تو لسی پی لے۔ نشے کی تیزی ذرا کم ہو جائے گی۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "آج تو نے بھی جم کر لگائی ہے۔" احسان شاہ نے میز پر رکھے ہوئے جگ سے لسی ایک گلاس میں انڈیلی اور گلاس رحیم داد کی جانب بڑھایا۔

رحیم داد نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ لسی سے بھرا ہوا گلاس سنبھالا اور غٹاغٹ چڑھا گیا۔

☆

بارش کا زور اب ٹوٹ چکا تھا۔ بپھری ہوئی ہوا بھی مدھم پڑ گئی تھی۔ مگر بوندا باندی کا سلسلہ جاری تھا۔ کچھ دیر بعد شیدا آ گیا۔ اس کے پہنچتے ہی رحیم داد اور احسان شاہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ احسان شاہ باڑی کی طرف چلا گیا۔ رحیم داد نے شیدا کی رہنمائی میں آگے قدم بڑھائے

اس کے قدم بہکے بہکے تھے۔ نظریں کسی قدر دھندلی پڑ گئیں تھیں۔ دونوں راہداری سے گزر کر برآمدے میں پہنچ گئے۔

شیدا آگے آگے تھا۔ رحیم داد اس کے پیچھے چل رہا تھا۔

شیدا ایک کمرے کے سامنے جاکر ٹھہر گیا۔ اس نے کمرے کا بند دروازہ کھول دیا۔ اندر لیمپ روشن تھا۔ برآمدے کے آگے باغیچے میں سرس کے دو اُونچے اور گھنے درخت تھے۔ درختوں تلے اندھیرا تھا۔ اندھیرے میں کوئی دھندلے سائے کی مانند چپ چاپ کھڑا تھا۔ شیدا نے مڑ کر اُدھر دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

"ایتھے آجا۔"

درختوں کے نیچے آہٹ اُبھری۔ ذرا دیر بعد برآمدے کی سیڑھیاں طے کرکے ایک نوجوان عورت اندھیرے سے نکل کر سامنے آگئی۔ رحیم داد نے دیکھا، کمرے کے اندر سے پھوٹتی ہوئی لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں وہ شیدا کے قریب گم صم کھڑی تھی۔ اس کی عمر تیئس چوبیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ چھینٹ کی گھگھریلی پہنے تھی۔ سر پر لہریا دوپٹہ تھا۔ اس کا جسم قدرے پھیلا ہوا تھا۔ چہرہ بھی چوڑا چکلا تھا۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا۔ آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ اسے دیکھ کر پہلی ہی نظر میں اندازہ ہوجاتا تھا کہ ذرا ہی دیر پہلے اس نے تیل ڈال کر سر کے بال سنوارے تھے۔ آنکھوں میں کاجل لگایا تھا۔ اس کا لباس شوخ اور اُجلا تھا۔ مگر وہ خود سہمی ہوئی نظر آرہی تھی۔

شیدا نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے رحیم داد سے کہا "یہ بلّو ہے جی۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے کمرے کے اندر چلا گیا۔ شیدا نے بلّو کا بازو پکڑ کر ہولے سے گھسیٹا اور اس کے ہمراہ کمرے کے اندر داخل ہوگیا۔ اس نے دہلیز کے پاس رک کر کہا "چودھری! دروازہ اندر سے بند کرلینا۔ میں نوں شاہ جی کے پاس جانا ہے۔" وہ دروازے کے دونوں پٹ بھیڑ کر چلا گیا۔

کمرے کا دروازہ بند تھا۔ برآمدے میں گہرا سنّاٹا چھایا تھا۔ رات کالی اور بھیگی ہوئی تھی۔ کمرے کی کھڑکی سے نرم اور خنک جھونکے اندر آرہے تھے۔ باغ میں بارش کی بوندیں پتّوں پر

جل ترنگ بجا رہی تھیں۔ رحیم داد نے بلّو کو گہری نظروں سے دیکھا۔ نشے کا ایک زوردار ریلا آیا۔ بلّو ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئی، دھندلی پڑ گئی۔ ریلا گزر گیا تو وہ اور نکھر کر سامنے آ گئی۔ رحیم داد کی آنکھوں میں چراغ جل رہے تھے، بجھ رہے تھے۔ بلّو اوجھل ہو جاتی، نئی چھب دکھا کر سامنے آ جاتی۔ پھر ہوا کا تیز جھونکا آیا اور لیمپ بجھ گیا۔

سویرے جب رحیم داد کمرے سے نکلا تو بلّو موجود نہ تھی۔ اس وقت بھی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ رحیم داد نے نہا دھو کر ناشتہ کیا۔ ناشتہ پر اس کے ساتھ احسان شاہ بھی موجود تھا۔ اس کی آنکھیں نشے کے خمار سے اب تک سُرخ تھیں۔ ناشتہ پر وہ خاموش رہا۔

رحیم داد نے ناشتے سے فارغ ہو کر واپس جانے کا اظہار کیا۔

احسان شاہ نے پوچھا "چوہدری اب تو کب آئے گا؟"

"میں خود ہی آ جاؤں گا۔" رحیم داد نے دبی زبان سے کہا "پر تو ماکھے کو میرے پاس نہ بھیجنا۔ اس کے آنے جانے سے شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔" اس نے اپنا خدشہ ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"تو کہتا ہے تو اسے تیرے پاس نہیں بھیجوں گا۔ پر تجھ سے ملاقات ہوتی رہنی چاہیئے۔"

رحیم داد نے کہا "میں جلد ہی تیرے پاس آنے کی کوشش کروں گا۔ ویسے بھی اُدھر اکیلے میں بہت جی گھبراتا ہے۔" وہ بے تکلفی سے ہنسا۔

"پر تو جلدی نہ آنا۔" احسان شاہ نے کہا "میں ہفتہ بھر کے لیے لہور جا رہا ہوں۔ کچھ ضروری کام کرنے ہیں۔ تو دس باراں روز بعد آنا۔ میں اس بیچ میں نادر خاں کو بھی بلوا لوں گا۔ کام کا بندہ ہے۔ کہیں اور لگ گیا تو ایسا منیجر ملے گا نہیں۔ تیرے لیے تو وہ بہت ضروری ہے۔ تجھے اِدھر کی زمیں داری کا کچھ اتا پتہ نہیں۔ نادر تیرے ساتھ لگ گیا تو زمیں داری کو ایسا چمکا دے گا کہ تیرا بالکل جی نہ گھبرائے گا۔" اس نے قہقہہ بلند کیا "حد ہو گئی جی، زمیں دار کا اپنی ہی زمیں داری میں دل گھبرائے۔"

رحیم داد نے اس کی باتیں سُنیں اور صرف مسکرا کر رہ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ احسان شاہ

سے رخصت ہوا۔ اُسی کے ذاتی تانگے سے حویلی اسٹیشن پہنچا۔ جس راستے سے آیا تھا اُسی راستے سے کوٹلہ ہرکشن واپس پہنچا۔ پچھلی رات کی موسلا دھار بارش نے سڑکیں اور راستے اس قدر خراب کردیے تھے کہ جب وہ مہمان خانہ میں داخل ہوا تو شام ہو چکی تھی۔ احمد اس کا بے چینی سے منتظر تھا۔ دیکھتے ہی بولا۔ "چوہدری! تو نے بہت دیر لگا دی۔ میں تو رات سے تیرا انتظار کر رہا تھا۔"

"تیرا مغز تو نہیں چل گیا۔" رحیم داد نے جھنجلائے ہوئے انداز میں اسے ڈانٹا۔ "رات بھر بارش ہوتی رہی۔ میں ایسے میں کیسے سفر کر سکتا تھا۔"

احمد اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ جلدی سے صحن میں کرسی لا کر ڈال دی۔ رحیم داد اس پر بیٹھ گیا۔ احمد کمرے کے اندر سے دھوتی اور سلیپر نکال کر لایا۔ اس نے رحیم داد کے جوتے اتارے، پگڑی سنبھالی اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے کپڑے اتار کر دھوتی باندھی اور غسل خانے میں چلا گیا۔ نہا کر آیا۔ اجلا لباس پہنا۔ مہمان خانے سے نکل کر باغ میں چلا گیا۔ ہوا رُکی ہوئی تھی۔ فضا میں حبس تھا۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔

رحیم داد دن بھر کا بھوکا تھا۔ احسان شاہ کی حویلی میں ناشتہ کرنے کے بعد اس نے راستے میں کچھ نہیں کھایا تھا۔ باغ میں پہنچتے ہی اس نے احمد سے کھانا لانے کو کہا۔ کھانا آیا تو اس نے سیر ہو کر کھایا۔ رات گئے تک باغ میں بیٹھا رہا۔ جب سنّاٹا گہرا ہو گیا تو وہ مہمان خانے میں گیا دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔

☆

ساون بھادوں مل رہے تھے۔ کالے کالے بادل گھر گھر کر اُمڈتے رہے۔ زور زور سے گرجتے رہے، برستے رہے۔ پانچ روز تک مینہ کی جھڑی لگی رہی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ بادل اب برس کر نہ رکیں گے۔ آسمان سرمئی چادر بن گیا تھا۔ چھلنی کی مانند اس سے پانی برستا تھا۔ خدا خدا کر کے مینہ برسنا بند ہوا۔ ہر طرف جل تھل ہو گیا تھا۔ جدھر نظر اٹھتی پانی ہی پانی نظر آتا۔ گاؤں کے گلی کوچوں میں جگہ جگہ پانی کھڑا تھا یا کیچڑ تھی۔

پہر دن گزر چکا تھا۔ رحیم داد کمرے میں تھا۔ وہ باہر نکلنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور وکیل اندر داخل ہوا۔

آسمان پر بادلوں کا ہلکا ہلکا غبار چھایا تھا۔ ہوا بھیگی ہوئی تھی۔ موسم خوش گوار تھا مگر وکیل کا چہرہ خلافِ معمول زیادہ ہی سنجیدہ نظر آتا تھا۔ وہ بجھا بجھا لگتا تھا۔ جمیلہ سے پہلے ہی مل چکا تھا۔

رحیم داد نے اس کا اُترا ہوا چہرہ دیکھا تو اظہار ہمدردی کے طور پر پوچھا۔ "وکیل صاحب! کیا بات ہے جی۔ بہت پریشان نظر آ رہے ہو؟"

"پریشانی کی بات ہی ہے۔ اندھیر ہے، سراسر اندھیر ہے۔" وکیل نے شکوہ کیا۔

"کیا ہو گیا جی؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ہونا کیا تھا، پولیس، اللہ وسایا کے قتل کو دبانے کی ہر طرح کوشش کر رہی ہے۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

"پچھلی بار تو تم نے کہا تھا کہ تھانے دار نے کتل کا پتہ چلا لیا ہے۔ جلد ہی ملزموں کی گرفتاریاں شروع ہو جائیں گی۔ اب کیا ہو گیا؟"

"اب کچھ بھی نہیں ہو گا۔" وکیل نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "انسپکٹر اسلم حیات جنجوعہ پوری تن دہی اور دلچسپی سے تفتیش کر رہا تھا۔ اچانک اس کا تبادلہ کر دیا گیا۔"

"اس کا تبادلہ کر دیا گیا۔ کیوں؟ کوئی تو وجہ ہو گی۔"

"یہ تو افسران بالا ہی کو علم ہو گا۔ میں تو یہ جانتا ہوں پچھلے دنوں اس کا تبادلہ کر کے دوسرا تھانے دار لگا دیا گیا۔" وکیل محمد عثمان راٹھور نے بتایا۔ "یہاں آنے سے پہلے میں اس سے ملا تھا۔ کہتا تھا، اللہ وسایا کو اس کی گھر والی کے بھائیوں نے رات کے اندھیرے میں قتل کیا اور سرحد پار نکل گئے۔ ان کے خلاف کوئی کاروائی نہیں ہو سکتی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ پولیس نے اپنی تفتیش ختم کر دی۔ اگے کوئی کاروائی نہیں ہو گی۔"

"ایسا ہی لگتا ہے" راٹھور نے بتایا۔" چوہدری! تجھے تو پتہ ہے ایسی افواہ تو پہلے ہی سن نے میں آ رہی تھی۔ تو نے بھی مجھ سے یہی بات بتائی تھی۔ زمیں دارنی کو بھی اس کا پتہ چلا تھا۔ اور وہ اسے سن کر خفا بھی ہوئی تھی۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔" میں تو کہتا ہوں ایسی افواہ جان بوجھ کر پھیلائی گئی تاکہ کیس دبانے میں آسانی ہو۔ اسی لیے انسپکٹر جنجوعہ کا تبادلہ ہوا۔ مجھے تو اللہ وسایا کے قتل کے پیچھے گہری سازش نظر آتی ہے۔"

"اگے کچھ نہیں ہو سکتا؟" رحیم داد نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔

"زمیں دارنی، گورنر، وزیر اعلیٰ اور آئی جی پولس کو درخواستیں بھیجنے کو کہتی تھی۔" وکیل نے کہا۔" درخواستیں میں اس کے کہنے پر لگا دوں گا۔ پر اب کچھ ہوتا نظر نہیں آتا۔ کیس تفتیش کے ابتدائی مرحلے پر خراب کر دیا جائے تو اس کے بعد کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے یہی دیکھا ہے۔"

"اس کا مطلب تو صاف یہ ہوا کہ تفتیش اگے نہیں چلے گی۔"

"فی الحال تو تفتیش کا کام ختم کر کے کیس دبا دیا گیا حالانکہ پولس کے پاس زمیں دارنی کے بھائیوں کو ملزم ٹھہرانے کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں۔ تھانے دار نے خانہ پُری کے لیے اپنے لگے بندھے گرگوں کی شہادت کا سہارا لیا ہے اور یہ پولس کا پرانا حربہ ہے۔ کوئی نئی گل نہیں۔" وکیل نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔" کچھ دنوں بعد تو سن لینا کہ پولس نے کیس داخل دفتر کر دیا۔"

"یہ تو جی بہت اندھیر گردی ہے۔"

"ہے تو یہ" وکیل نے موضوع بدلتے ہوئے رحیم داد کو مخاطب کیا۔" چوہدری! میں تیرے پاس اس لیے آیا تھا کہ اللہ وسایا کے مرنے کے بعد مختار نامہ تو خود بخود ختم ہو گیا۔ اب کلیم کے ہر معاملہ سے تجھے خود نمٹنا پڑے گا۔"

"میں نوں کی نمٹنا شمٹنا جی۔" رحیم داد نے کہا۔" جیسا کہو گے ویسا کر دوں گا۔ پر ابھی تو کچھ نہیں کرنا۔"

"بات یہ ہے چوہدری! تیرے کلیم میں کچھ گڑبڑ ہے۔ اللہ وسایا نے اس کے بارے میں تجھے بتایا بھی ہو گا۔"

"اس نے تو جی مجھے کچھ نہیں بتایا" رحیم داد نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا "گھبرانے کی تو کوئی گل نہیں؟"

"معاملہ ویسے تو پیچیدہ ہے۔ پر میں کوشش کر رہا ہوں کہ ٹھیک ہو جائے۔" وکیل نے بتایا "مگر اس کے لیے پیسے کی ضرورت ہے۔ میں نے زمیں دارنی سے ذکر کیا تو اس نے ہزار روپے خرچ کو دیے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "ویسے اس کے پاس پیسہ بالکل نہیں۔ سب کچھ تو ۱۲ مربع آراضی کے کلیم کی خریداری میں دے دیا۔ ابھی اسے اللہ وسایا کا چالیسواں بھی کرنا ہے۔"

"تیرا مطلب چاہلیا کرنے سے ہے؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"ہاں میرا یہی مطلب ہے۔" وکیل نے کہا "زمیں دارنی اسے اپنی حیثیت کے مطابق ہی کرے گی۔ ایسا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ میں ابھی تو ہزار روپے سے کام چلانے کی کوشش کروں گا۔" اس نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا۔ "اگر معاملہ زیادہ اُلجھ گیا تو تگڑی رقم کھلائے بغیر کام نہیں بنے گا۔ تم کو مہینے، دو مہینے کے اندر کم از کم چار ہزار کا بندوبست کرنا ہو گا۔ ویسے یہ بات میں نے زمیں دارنی سے نہیں کہی وہ اور پریشان ہو جاتی۔ پر اب تم کو ہی زمیں داری کی دیکھ بھال کرنی ہے اور اس کلیم کا تو براہ راست تعلق اس جائیداد سے ہے جو تم کو الاٹ ہوئی ہے۔"

رحیم داد نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا "پر وکیل صاحب میں تو ابھی کچھ نہیں کر سکتا۔ زمین کا الاٹمنٹ ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ خریف کی فصل تیار ہو تو کچھ رکم ہاتھ آئے۔ تیں نوں پتہ ہی ہے پہلے بھی سب کچھ اللہ وسایا اور اس کی گھر والی ہی نے خرچ کیا تھا۔ زمیں داری کی اب تک دیکھ بھال بھی وہی دونوں کر رہے تھے۔ میں نے تو اس بارے میں ابھی کچھ سوچا بھی نہیں۔"

"اسی لیے میں نے تم کو دو مہینے دیے ہیں۔ اس عرصہ میں تم کو رقم کا بندوبست کرنا ہو گا جی چاہے تو زمیں دارنی سے بات کر لو۔ میں نے تم کو پہلے سے آگاہ کر دیا۔"

رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ وکیل اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ چلتے چلتے اس نے خبردار کیا "چوہدری! رقم کا انتظام کرنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ الاٹمنٹ منسوخ ہونے کا بھی امکان ہو سکتا ہے۔" وکیل

مڑا اور کمرے سے چلا گیا۔

وکیل سے گفتگو کے بعد رحیم داد کو یہ تو اطمینان ہو گیا کہ تھانے دار جنجوعہ کا تبادلہ کر دیا گیا تھا اور نئے تھانے دار نے ملزموں کو مفرور قرار دے کر تحقیقات ختم کر دی تھی۔ اللہ وسایا کا قتل اب اس کے لیے باعث تشویش نہ رہا تھا۔ احسان شاہ نے اس سلسلہ جو کچھ کہا تھا بالکل ویسا ہی ہوا۔ رحیم داد اس کے اثر و رسوخ سے بہت متاثر ہوا مگر اس تشویش سے نجات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ایک نئی پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ یہ کلیم اور اس کی بنیاد پر الاٹ ہونے والی آراضی اور جائیداد کا مسئلہ تھا۔ وکیل کی باتوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ کلیم میں کوئی گڑبڑ ہے۔ ہر چند کہ وہ بہت معمولی زمین دار رہ چکا تھا۔ مگر ہر زمیں دار کی طرح زمین اور جائیداد اس کی بھی بہت بڑی کمزوری تھی۔ وہ ہر قیمت پر کوٹلہ ہر کشن کے دس مربعے اور حویلی اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا تھا۔ بلکہ جمیلہ کے بارہ مربعوں پر بھی اس کی نظر تھی۔ اللہ وسایا کے قتل میں احسان شاہ کا آلہ کار بن نے کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی۔

رحیم داد مہمان خانے سے نکل کر کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ اس نے فصلوں کو دیکھا۔ مزارعوں سے ان کے بارے میں بات چیت کی۔ وہ بہت دیر تک مزارعوں کے ساتھ ہی رہا۔

اب اس کا یہ معمول ہو گیا کہ دن میں کسی وقت کھیتوں کی طرف چلا جاتا اور مزارعوں کے ساتھ کچھ وقت گزارتا۔ وہ زمیں داری کے کاموں میں ذاتی طور پر دلچسپی لینے لگا تھا۔ شام کو وہ باغ میں بیٹھتا۔ وہاں بھی مزارعوں کو بلا لیتا۔ ان کے ساتھ موسم اور فصلوں کے علاوہ بیماری اور شادی بیاہ کے بارے میں بھی باتیں ہوتیں مگر گھوم پھر کر اللہ وسایا کا ذکر ضرور ہوتا۔ اور ایک بار اس کا ذکر چھڑ جاتا تو دیر تک چلتا رہتا۔ رحیم داد کو ان کے رویہ سے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اللہ وسایا اور جمیلہ، دونوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ اور اس حد تک کرتے تھے کہ اللہ وسایا مرحوم کے بارے میں گفتگو کرتے کرتے ان کے چہرے اداس اور غم زدہ ہو جاتے۔ وہ دل گرفتہ ہو کر رو پڑتے۔ کبھی کبھی رحیم داد کو ان کا یہ رویہ بڑا شاق گزرتا۔

اللہ وسایا مر کر بھی زندہ تھا۔ اور جب تک وہ کسی نہ کسی روپ میں زندہ تھا، رحیم داد کو زمیں داری کے معاملات میں اپنا سکہ بٹھانے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے اسے

ایک ایسے تجربہ کار اور قابلِ اعتماد آدمی کی ضرورت تھی۔ جو مزارعوں کے ذہنوں میں جھلملاتا ہوا اللہ وسایا کی یادوں کا چراغ بجھا کر رحیم داد کی شخصیت کا چراغ روشن کر سکے۔ ایسا آدمی احسان شاہ نے مہیا کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر وہ اب تک پہنچا نہیں تھا۔ رحیم داد بھی احسان شاہ کے پاس جا نہ سکا تھا۔ موقع ہی نہ ملا۔

☆

کئی روز سے بارش نہ ہوئی تھی۔ ہوا بھی بند تھی۔ آسمان پر بادل چھائے رہتے۔ مگر کھل کر نہ برستے۔ کبھی کبھار ہلکا سا چھینٹا پڑتا۔ اس کے بعد حبس اور بڑھ جاتا۔ دن بھر سخت تپش رہتی۔ جسم پسینے سے شرابور ہو جاتا۔ سورج کبھی بادلوں کے پیچھے روپوش ہو جاتا۔ کبھی نکل کر سامنے آجاتا۔ اس کی چمک دمک بہت تیز ہوتی۔ دھوپ میں اس قدر تمازت اور چبھن ہوتی کہ بدن پگھلتا ہوا محسوس ہوتا۔

انھی دنوں اللہ وسایا کا چالیسواں تھا۔ جمیلہ نے اس سلسلہ میں رحیم داد سے کوئی مشورہ نہ کیا۔ صرف اتنا کیا کہ ایک شام جب وہ مہمان خانے سے باغ میں جانے کا ارادہ کر رہا تھا تو احمد حویلی کے دروازے سے نکل کر آیا اور اسے مطلع کیا۔

"چوہدری! زمیں دارنی نے تجھے کہا ہے کہ اللہ وسایا کا چالیہا ہونے والا ہے۔"

"کب ہو رہا ہے چالیہا؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔

"کل ہے جی۔" احمد نے بتایا۔

"اللہ وسایا تو ایسا نیک اور اچھا بندہ تھا کہ اس کا چالیہا تو اکٹھ کہلانا چاہیے۔" رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ چہرے کو افسردہ بنانے کی کوشش کی۔ "وکھت کتنی جلدی گزر جاتا ہے۔ کل اللہ وسایا کی موت کو چالی روز ہو جائیں گے۔ اس کا چالیہا اور اکٹھ ہوگا۔ سال بھر بعد وڈا اکٹھ ہوگا۔ دوسرے سال دورھیا۔ تیسرے سال تورھیا اور چوتھے سال چورھیا ہوگا۔ وکھت دھیرے دھیرے ایسے دھوپ چھاؤں کی طرح گزر جاتا ہے کہ کچھ پتہ نہیں چلتا۔"

احمد کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے رحیم داد کا چہرہ ٹکر ٹکر تکتا رہا۔ رحیم داد کچھ دیر گم صم کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا مہمان خانے سے باہر چلا گیا۔ اس کے چہرے پر افسردگی کے ہلکے ہلکے سائے پھیلے تھے۔ آنکھیں بجھی بجھی تھیں۔

جمیلہ نے چالیسویں کے لیے بڑے اہتمام سے کھانا پکوایا۔ گاؤں کے تمام ہی مزارع اور کمی، مرد اور عورتیں حویلی کے باہر اور اندر جمع ہوئے۔ پاس پڑوس کے گاؤں اور چکوں سے بھی لوگ آئے۔ مسجد کے ملّا نے فاتحہ خوانی کی۔ وہ نیا لباس پہنے ہوئے تھا جو جمیلہ نے اللہ وسایا کے نام پر اسے خیرات میں دیا تھا۔ فاتحہ کے بعد سب نے کھانا کھایا اور اللہ وسایا کے لیے دعائے مغفرت کی۔ رحیم داد اس روز بہت مصروف رہا۔ رات گئے تک حویلی کے باہر سائبان کے نیچے چالیسویں کی فاتحہ میں شریک ہونے والوں کے ساتھ رہا۔

حویلی کے اندر اور باہر خاصی چہل پہل رہی۔ مگر چالیسویں کے بعد حویلی اور زیادہ اُجاڑ اور سنسان نظر آنے لگی۔ رحیم داد کی بیشتر شامیں تنہا گزرتیں۔ جمیلہ سے بھی اس کی ملاقات نہ ہوئی۔ نہ اس نے بلایا اور نہ ہی بلائے بغیر وہ اس کے پاس جا سکتا تھا۔ شام کو وہ باغ میں مزارعوں سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا یا اکیلا بیٹھا رہتا۔

☆

یہ ایک اداس اور بے کیف شام تھی۔ رحیم داد باغ میں خاموش بیٹھا تھا۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ دونوں وقت مل رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ شام کا دُھندلکا دھیرے دھیرے فضا میں گھل رہا تھا۔

شام کی اس خاموشی میں دفعتہً درختوں تلے قدموں کی آہٹ ابھری۔ رحیم داد نے گردن کو خم دے کر اُس کی طرف دیکھا۔ درختوں کے نیچے سے ایک شخص نکل کر آہستہ آہستہ اُس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ رحیم داد نے اسے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ اس کے لیے قطعی اجنبی تھا اور نظریں جھکائے آگے بڑھ رہا تھا۔ رحیم داد کے سامنے پہنچ کر وہ ٹھہر گیا۔ اس کی عمر پچپن سے تجاوز کر

چلی تھی۔ مگر جسم ابھی تک مضبوط اور صحت مند تھا۔ چہرے پر ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ سر پر پگڑی بھی ڈھیلی ڈھالی تھی۔ آنکھوں پر عینک تھی۔ وہ قمیض اور شلوار پہنے تھا۔ گرمی اور حبس کے باوجود کوٹ بھی پہنے ہوئے تھا۔

رحیم داد نے اسے غور سے دیکھا۔ پہچان نے کی کوشش کی۔ مگر پہچان نہ سکا۔ اجنبی نے نظریں جھکالیں۔ ادب سے خاموش کھڑا رہا۔ رحیم داد نے پوچھا "تیں نوں کس سے ملنا ہے؟"

"میں نے جی چوہدری نورالہٰی سے ملنا ہے۔" اس کا لہجہ نرم اور محتاط تھا۔ "میرا نام نادر خاں ہے۔ مجھے سید احسان علی شاہ نے بھیجا ہے۔"

"تجھے شاہ جی نے بھیجا ہے۔" رحیم داد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یاد آیا، شاہ جی نے تیرے بارے میں مجھ سے پچھلے دنوں بات کی تھی۔"

نادر خاں نے جواب تک رحیم داد کے رو برو کھڑا تھا، نہایت ادب سے کرسی پر بیٹھنے کی اجازت چاہی۔ "میں بیٹھ سکتا ہوں جی؟"

"بیٹھ جا، ضرور بیٹھ جا۔" رحیم داد بولا۔ "شاہ جی آج کل پیراں والہ ہی میں ہوتا ہے نا؟ لہور سے تو لوٹ آیا ہوگا۔"

"یہ تو جی میں نوں پتہ نہیں۔" نادر خاں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "شاہ جی نے پرسوں مجھے بلوایا تھا۔ دیر تک تیرے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ سمجھاتا رہا۔ مجھے کیا کیا کام یہاں کرتے ہوں گے شام ہونے سے پہلے پہلے وہ اپنی جیپ لے کر ادھر آیا تھا اور نہر کے پاس مجھے چھوڑ کر آگے چلا گیا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاہ جی لہور سے جیپ بھی لے آیا۔"

"اس کے لئے ضروری بھی تھی۔ زمیں داری چلانے کے لیے جیپ یا کم از کم اپنی سواری بہت ضروری ہے۔ اب خالی گھوڑی سے کام نہیں چلتا۔ ویسے گھوڑی اور سیکل تو اب ہر چھوٹے موٹے زمیندار کے پاس بھی ہے۔"

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "تو کب سے کام شروع کر سکتا ہے؟"

"حکم کریں جی۔ میں کل ہی سے کام شروع کردوں گا۔ میں تو آیا ہی اسی ارادے سے ہوں۔"
نادر نے مستعدی سے جواب دیا۔

رحیم داد نے نادر کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا جو اس کے سامنے کرسی پر سکڑا سکڑایا، قدرے آگے جھکا ہوا ادب سے بیٹھا تھا۔ رحیم داد کی گردن کچھ اور تن گئی۔ اس نے لہجے میں رعب داب پیدا کرتے ہوئے پوچھا "تیرے بال بچے بھی ہیں؟"

"ہیں تو جی۔" نادر نے مسکین سی شکل بنا کر جواب دیا۔ "میں جی انہیں بعد میں لے آؤں گا۔ ابھی ایسی جلدی بھی نہیں۔" اس نے اپنی مستعدی اور فرض شناسی سے رحیم داد کو متاثر کرنے کی کوشش کی۔ "میں نے تو جی سب سے پہلے گھوم پھر کر پنڈ کا جائزہ لینا ہوگا۔ فصلوں کو دیکھنا ہوگا مزارعوں سے ملنا ہوگا۔ پٹواری کے پاس جانا ہوگا۔ اس کے بعد میں رپوٹ پیش کروں گا۔ فیر جو فیصلہ آپ نے کرنا ہے اُسے سامنے رکھ کر کام کرنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔" رحیم داد کی آواز گونج دار تھی۔ "تو آج رات ادھر ہی ٹھہر جا۔ سویرے سے کام شروع کر دے۔ تیری تنخواہ وغیرہ کا معاملہ شاہ جی سے ملنے کے بعد طے ہوگا۔ میں اُسے جلد ہی ملنے کی کوشش کروں گا۔"

"جیسی مرضی جی۔" نادر نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "شاہ جی نے بھی مجھ سے ایسی ہی گل بات کی تھی۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ نادر گردن جھکائے ادب سے بیٹھا رہا۔ شام کا اندھیرا ہر طرف پھیل گیا تھا۔ نوکر نے لیمپ روشن کیا اور احتیاط سے اسٹول پر رکھ دیا۔ نادر نے لیمپ کی روشنی میں رحیم داد کے چہرے پر نظر ڈالی۔ زیرِ لب مسکرایا۔ "چوہدری! تو دیکھنے میں بلوچ سردار یا تمن دار لگتا ہے۔ تو ڈیرے جات میں تو پہلے نہیں رہا۔" اس کے انداز میں خوشامد کا پہلو نمایاں تھا۔

رحیم داد اس کے رویہ سے خوش بھی ہوا۔ اس نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور مونچھوں کی نوکوں کو مروڑتے ہوئے بولا "نہیں جی، میں اُدھر نہیں گیا۔"

"حیرت کی گل ہے۔" نادر نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "میں تو پہلی نظر میں یہ سمجھا تو کھوسہ

تمن دار ہے ؟"

رحیم داد خاموش رہا مگر نادر زیادہ چپ نہ بیٹھ سکا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر اپنی پچھلی ملازمتوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ اس نے رحیم داد کو بتایا کہ محکمہ مال کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ ڈیرہ غازی خاں کے ایک دریشک تمن دار کی جاگیر کا کاردار مقرر ہو گیا تھا۔ اس ملازمت کے دوران اس نے کیا کیا کارگزاری دکھائی اور کیسے کیسے کارنامے انجام دیے، انہیں وہ تفصیل سے سناتا رہا۔ اس نے تمن داروں اور سرداروں کے رُعب و دبدبہ کے ساتھ ان کی دہشت گردی کی ہولناک داستانیں بھی سنائیں۔ مزاریوں اور لغاریوں کی رقابتوں اور ان کے مسلح تصادم کی واردات بیان کیں۔ باتوں باتوں میں وہ مزارعوں کو قابو میں رکھنے اور زمیں داری پھیلانے اور بڑھانے کے ہتھکنڈے اور گُر بھی بتاتا رہا۔ سرکاری افسروں سے تعلقات پیدا کرنے، ان سے کام نکلانے اور انہیں خوش رکھنے کے طور طریقے بھی بتاتا رہا۔

نادر خاں کا لہجہ شہری تھا۔ سرکاری نوکری کے سلسلہ میں وہ برسوں لاہور اور دوسرے شہروں میں رہ چکا تھا۔ جاگیرداروں اور رئیسوں کی ملازمت میں رہنے کے باعث خاصہ مزاج شناس بن گیا تھا۔ نادر خاں نے اپنی دلچسپ اور لچھے دار باتوں سے جلد ہی رحیم داد کے دل میں جگہ پیدا کر لی۔ وہ نادر خاں کے تجربے اور سوجھ بوجھ سے بہت متاثر ہوا۔ وہ اسے کام کا آدمی نظر آیا۔ دیر تک خاموش بیٹھا توجہ اور انہماک سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

جب وہ خاموش ہوا تو رحیم داد نے پوچھا "نادر! تُو نے تمن داروں کی نوکری کیوں چھوڑی؟"

"وہ ہوا یہ جی کہ میری گھر والی کا انتقال ہو گیا۔" نادر نے بتایا۔ "کچھ عرصے بعد ادھر رحمت والی میں دوسرا ویاہ کر لیا۔ چھ سات مہینے تو وہ میرے ساتھ ڈیرہ غازی خاں میں رہی۔ فیر اس کا دل ایسا اچاٹ ہوا کہ وہ کسی طور وہاں رہنے کو تیار نہ ہوئی۔ مجبوراً مجھے ملازمت چھوڑنا پڑی۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔ "ملازمت نہ چھوڑتا تو گھر والی کو چھوڑنا پڑتا۔ اس طرح میں نوکری چھوڑ چھاڑ اِدھر آ گیا۔ کچھ مدت تک آڑھت کا کاروبار کیا۔ وہ چل نہ سکا تو اسسٹینٹ کمشنر کے دفتر میں عرائض نویسی کرنے لگا۔ اس کے ساتھ، ساتھ کلیم بنوانے اور الاٹمنٹ کروانے کا دھندا بھی کرتا رہا۔ مگر اس

دھندے میں اب پہلی سی بات نہیں رہی۔ ایسی اندھیر گردی مچی ہے کہ کیا بتاؤں۔ اوپر سے نیچے تک ہر جگہ رشوت کا بازار گرم ہے۔" اس نے گہری سانس بھری۔" چار پانچ مہینے ہوئے عرائض نویسی کا کام ختم کر کے رحمت والی آ گیا۔ اس دوران سردار عزیز اللہ دریشک نے راجن پور بلوایا بھی پر گھر والی کسی طور راضی نہیں ہوئی۔"

"شاہ جی سے تیری کب سے جان پہچان ہے؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

نادر خاں نے بتایا۔" ویسے تو جی کوئی سال بھر سے اوپر ہوا لہور میں پہلی بار شاہ جی سے ملا تھا۔ لیکن جب میں رحمت والی آ گیا تو ان سے اکثر ملتا رہا۔"

رحیم داد نے سلسلۂ گفتگو منقطع کر دیا۔ نوکر سے کھانا لانے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں کھانا لگا دیا گیا۔ رحیم داد نے نادر خاں کو بھی کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ مگر اس نے انکساری اور حفظ مراتب کا مظاہرہ کرتے ہوئے انکار کر دیا۔ کہنے لگا۔" میری یہ حیثیت نہیں جی کہ آپ کے ساتھ بیٹھ کر روٹی کھاؤں۔ میں نے تو صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ مجھے کہاں ٹھہرنا ہو گا۔ اس کا انتظام کون کرے گا؟ آگے میرے بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

رحیم داد نے احمد کو بلوایا۔ وہ آیا تو رحیم داد نے نادر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" یہ مہمان خانے میں ٹھہرے گا۔ اسے اپنے ساتھ لے جا۔ اس کے ٹھہرنے اور روٹی ٹکر کا بندوبست کر دے۔"

نادر خاں نے احمد کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر اس کے ہمراہ چلا گیا۔ رحیم داد نے کھانا کھایا مگر فوراً مہمان خانے میں نہ گیا۔ باغ میں بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ رات گئے وہ مہمان خانے میں گیا۔ دیکھا صحن کے ایک گوشہ میں نادر خاں چارپائی پر گہری نیند سو رہا تھا۔ البتہ احمد جاگ رہا تھا۔ رحیم داد نے اس سے کوئی بات چیت نہ کی۔ کمرے میں گیا۔ کپڑے تبدیل کیے۔ رات گرم تھی۔ آسمان صاف تھا۔ مگر حبس تھا۔ احمد نے رحیم داد کا بستر چھت پر پلنگ بچھا کر لگا دیا تھا۔ رحیم داد نے دھوتی باندھی۔ بندوق اٹھائی اور چھت پر چلا گیا۔ اس نے بندوق سرہانے رکھی اور بستر پر لیٹ گیا۔

سویرے وہ چھت سے اُتر کر صحن میں آیا۔ نادر خاں کا بستر خالی تھا۔ احمد نے بتایا کہ وہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر باہر چلا گیا۔ رحیم داد نے ناشتہ کیا مگر نادر خاں ابھی واپس نہ آیا تھا۔

وہ دن بھر اسے نظر نہ آیا۔ غروب آفتاب کے وقت جب رحیم داد باغ میں بیٹھا تھا نادر خاں اسکول کی سمت سے باغ کی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ وہ آہستہ آہستہ قریب آتا گیا۔ اُس کا لباس گردِ وغبار سے اَٹا تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔

وہ سامنے آکر کھڑا ہوا تو رحیم داد نے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نادر خاں بیٹھ گیا۔ رحیم دلو نے حیرت سے پوچھا۔ "تو سویرے سویرے کہاں چلا گیا تھا؟ دوپہر کی روٹی بھی نہیں کھائی۔"

"کیا، کیا جائے جی، کام جو کرنا ہوا۔ ایک نہیں، کئی کام کرنے ہیں اور جلد سے جلد کرنے ہیں۔" اس نے اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

رحیم داد اس کی کارکردگی اور فرض شناسی سے متاثر بھی ہوا۔ مسکرا کر بولا۔ "شاہ جی ٹھیک ہی کہتا تھا۔ تو لگتا تو محنتی بندہ ہے۔ کیا کر آیا آج؟"

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا جی۔" اس نے ہاتھ باندھ کر انکساری سے کہا۔ "مجھے چند روز کی مہلت دیں۔ ہر معاملہ کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد ہی میں اپنی رپوٹ پیش کروں گا۔" اس نے اٹھنے کے لیے پہلو بدلا۔ "اس وکھت تو جی مجھے اجازت دی جائے۔ میں نے ابھی جا کر نہانا ہے۔ روٹی کھانی ہے۔ جلدی سو بھی جاؤں گا۔ کل بھی میں نے سویرے سے پنڈ کا راونڈ لگانا ہے۔ مزارعوں سے ملنا ہے۔ فصل کے بارے میں گل بات کرنی ہے۔ اور بھی کئی ضروری کام کرنے ہیں۔"

رحیم داد نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ "اچھا، اب تو جا۔"

وہ اٹھا اور مہمان خانے کی سمت روانہ ہو گیا۔ اس کے بعد کئی روز تک رحیم داد سے نادر خاں کی ملاقات نہ ہوئی۔ رحیم داد جب سو کر اٹھتا تو نادر خاں کا بستر خالی ہوتا۔ پھر رات گئے وہ باغ سے واپس آتا تو نادر خاں گہری نیند سویا ہوتا۔ وہ کھانا کھا کر جلد ہی سو جاتا اور فجر کی اذان سے پہلے ہی بیدار ہو جاتا۔

☆

دوپہر کو بارش کا چھینٹا پڑا تھا۔ دن ڈھلے موسم خوشگوار تھا۔ آسمان پر سرمئی بادل چھائے

تھے۔ ہوا فرّاٹے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ رحیم داد باغ میں اجلا لباس پہنے، زمیں دارانہ طمطراق کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھا نادر خاں پہلے روز کی طرح خاک دھول سے اٹا اس کی جانب آ رہا تھا۔ وہ قریب آیا تو رحیم داد نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ کرسی پر بیٹھ گیا تو اس کا بگڑا ہوا حلیہ دیکھ کر رحیم داد نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "نادر! تو نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

"کام کرنا جو ہوا جی۔" نادر خاں نے بے نیازی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔ "ہر چیز کو جب تک اپنی نظر سے دیکھا نہ جائے تب تک نہ کوئی مسئلہ سمجھ آتا ہے اور نہ اس کا حل۔"

"یہ بتا، اتنے دنوں میں تو نے کیا کیا دیکھا، کیا معلوم کیا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔ اس کے رویے سے صاف جھلکتا تھا کہ وہ زمیں داری کے معاملات جاننے کے لیے بہت بے چین ہے۔

"ایسا لگتا ہے جی، جیسے یہاں کا کوئی زمیں دار ہی نہیں۔ ہر مزارع خود کو زمیں دار سمجھتا ہے کمیوں تک کے دماغ آسمان پر ہیں۔" نادر خاں کا لہجہ قدرے نرم پڑ گیا۔ "اللہ وسایا مر گیا۔ اب اس کی کیا برائی کرنی جی۔ خدا اسے جنت نصیب کرے پر اسے زمیں داری چلانے کا ذرا تجربہ نہ تھا۔ مزارعوں کے مزاج ایسے بگاڑ دیے کہ وہ تو جی سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے۔ جو جس کا جی چاہتا ہے، کر رہا ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔"

"ویسے فصل تو ٹھیک لگتی ہے۔ پچھلے دنوں میں بھی کھیتوں پر جاتا رہا۔" رحیم داد نے کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہے۔" نادر خاں نے رحیم داد کی رائے سے اتفاق کیا۔ "خاص طور پر کماد اور مکئی کی فصل بہت اچھی جا رہی ہے۔ پھٹی بھی ٹھیک ٹھاک جان پڑتی ہے۔ پر پھٹی کی کاشت کا رکبہ بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اصلی کمائی تو آج کل کپاس کی فصل سے ہے۔ اِدھر اب تک کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ کوریا کی جنگ کی وجہ سے باہر کے ملکوں میں پاکستانی کپاس کی مانگ بہت بڑھ گئی ہے۔ کپاس کے اکسپورٹرز کے تو وارے نیارے ہو گئے۔ انہوں نے دبا کے کمائی کی۔"

نادر خاں نے اپنی معلومات سے رحیم داد کو مرعوب کرنے کی کوشش کی اور وہ مرعوب بھی ہو گیا۔ کہنے لگا۔ "تو جن باتوں کو سمجھتا ہے اللہ وسایا نہیں جانتا تھا۔ تب ہی تو اس نے پھٹی کا نہ رکبہ بڑھایا

نہ کمائی کر سکا۔ اب تو بتا پھٹی کی فصل کا رکبہ کیسے بڑھایا جائے؟"

"بہت سی زمین پڑیلی پڑی ہے۔ جگہ جگہ ڈھڈل اور جھلن ہیں۔ نہر کے نزدیک کا اپنا بہت سارکبہ جھنگڑ بن گیا ہے۔ آنی بہت سی زمین اُدھلاپی پر آسانی سے کابل کاشت بنائی جا سکتی ہے"
نادر خاں سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔" اپنی زمین پر آم اور امرود کے باغات لگائے جا سکتے ہیں۔ فارم بنائے جا سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے جی، اتنی بہت ساری زمین بیکار دیکھ کر مجھے بہت دکھ پہنچا۔"

"پر اس میں بہت سی تو شاملات کی زمین ہے۔" رحیم داد نے نادر خاں کو آگاہ کیا۔

"چوہدری تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔" نادر نے مسکرا کر کہا " تحصیل دار اور پٹواری کس لیے ہیں۔ ان کی مٹھی گرم کی جائے تو ساری زمین آسانی سے اپنے کھاتے میں منتکل ہو جائے گی ویسے بھی جی شاملات واملات کی کون پرواہ کرتا ہے۔ زمیں دار کا رُعب اور دبدبہ ہو تو کوئی چوں بھی نہیں کر سکتا۔"

رحیم داد نے دبی زبان سے اپنی مجبوری کا اظہار کیا:" پر تحصیل دار اور پٹواری شٹواری کی مٹھی گرم کرنے کے لیے پیسہ کہاں سے آئے گا؟ اب تک ساری زمیں داری کی دیکھ بھال تو اللہ وسایا کرتا تھا۔ اس نے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ جمیلہ کے پاس جو کچھ تھا وہ اس نے اللہ وسایا کی فاتحہ اور چاہلیا پر خرچ کر دیا۔"

نادر نے چند لمحے خاموش رہ کر کہا " جو کچھ ہونا تھا جی وہ ہو چکا اب تو آگے کی سوچنا ہے۔ میں نے پتہ کیا ہے مزارعوں پر اللہ وسایا بہت اُدھار چھوڑ گیا ہے۔ اس کی فوری وصولی ہونی چاہیے۔ کچھ تو ابھی مل ہی جائے گا۔ ورنہ کماد کی فصل سے کرضہ وصول کیا جا سکتا ہے۔"

"کماد کی فصل ہی سے کیسے کرضہ وصول کیا جا سکتا ہے؟" رحیم داد نے حیرت سے دریافت کیا۔
" وہ اس طرح جی کہ کٹائی کے بعد کماد کو شکر مل پہنچانے اور وزن کروانے کی پوری ذمہ داری تو زمیں دار ہی کی ہوتی ہے نا۔ ویسے تو تول ہی میں خاصی گنجائش نکل سکتی ہے۔" وہ عیاری سے مسکرایا۔" میرا مطلب تو سمجھ گیا نا؟"

" بالکل سمجھ گیا۔ آگے بتا۔" رحیم داد نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"اس کے علاوہ کماد کی سپلائی بھی زمیں دار ہی کرتا ہے۔" نادر خاں نے بتایا۔ "اس میں سے کماد سپلائی کرنے کا نصف کرایہ بھاڑا مزارع کے حصّے سے کٹتا ہے۔ آبیانہ اور چری کی فصل کی کیمت مُجرا کر کے ہر مزارع کو رسید دے دی جاتی ہے۔ کانون تو یہی ہے پر کون زمیں دار اس پر عمل کرتا ہے۔" اس نے رحیم داد کی طرف دیکھا۔ اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ "معاف کرنا جی۔ شاہ جی ٹھیک ہی بتلاتا تھا۔ اللہ وسایا تو زمیں دار تھا ہی نہیں اور نہ اس نے کبھی زمیں دار بن نے کی کوشش کی۔ وہ تو پیدائشی مزارع تھا۔ مرتے دم تک مزارع ہی رہا۔"

"اس نے کون سی غلطی کی؟"

"ایک غلطی ہو تو بتاؤں۔" نادر خاں نے مستعدی سے جواب دیا۔ "کماد کی شگر مل کو سپلائی کا معاملہ ہی لے لے۔ اللہ وسایا ہر مزارع کو پابندی سے رسید دیتا تھا۔ اسے ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تب ہی تو وہ مزارعوں سے اپنا کرض وصول نہ کر سکا۔"

"رسید دینے سے کرض کی وصولی کا کیا واسطہ؟"

"بہت اہم واسطہ ہے اور وہ اس طرح ہے کہ مزارعوں کو کماد کی سپلائی میں سے ان کی پیداوار کی رکم کا جو بھی حصہ دیا جائے، پہلے اس میں سے کرض کی رکم کاٹ لی جائے۔ اس کے بغیر کرض ادھار آسانی سے وصول نہیں ہوتا۔ سارے ہوشیار زمیں دار ایسا ہی کرتے ہیں۔ مزارعوں کو رسید دینے کی صورت میں ادھار کی رکم نہیں کاٹی جا سکتی۔ رسید کو سامنے رکھ کر ادائیگی کرنی پڑتی ہے۔"

"بات تو تیری سمجھ آتی ہے۔" رحیم داد نے اظہار پسندیدگی کیا۔

"آگے یہ رسید شسید کا چکر ختم کرنا ہوگا۔" نادر نے زور دے کر کہا۔

"پر اس میں ایک خطرہ ہے۔" رحیم داد نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

"وہ کیا ہے جی؟" نادر نے حیرت سے دریافت کیا۔

"اب تک ایسا ہوا نہیں۔ مزارع ناراض ہوں گے۔ کوئی گڑبڑ پیدا نہ ہو۔"

"فکر نہ کریں جی، کوئی گڑبڑ شڑبڑ نہیں ہوگی۔"

"مان لے انہوں نے کوئی گڑبڑ نہیں ڈالی، پر وہ جمیلہ کے پاس جا کر فریاد کریں گے۔ وہ ان کی بات ضرور مان لے گی۔ میں نوں پتہ ہے وہ ضرور ایسا کرے گی۔"

"اس کا تو مجھے بھی چند ہی دنوں میں اندازہ ہو گیا" نادر نے رحیم داد سے اتفاق رائے کیا۔ "مزارعوں کا تو جی یہ حال ہے کہ وہ ہر معاملہ میں اللہ وسایا کا حوالہ دیتے ہیں۔ بار بار اس کا ذکر کرتے ہیں یا جمیلہ کا" اس نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا۔ لمحہ بھر کے لیے بات کہتے کہتے ٹھٹکا "سچی گل تو ایہہ ہے جی کہ اللہ وسایا کے بعد پوری زمیں داری جمیلہ ہی کی سمجھتے ہیں۔ تجھے تو وہ زمیں دار مانتے ہی نہیں ان کی باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے۔"

"یہ تو میں نوں بھی پتہ ہے" رحیم داد نے اعتراف کیا "اسی لیے تو تجھے لگایا ہے۔"

"شاہ جی نے بھی مجھ سے یہ گل بتائی تھی" نادر خاں نے کہا "پر فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ وسایا تو اب رہا نہیں۔ جمیلہ بھی ان دنوں عدت میں بیٹھی ہے۔ نہ وہ حویلی کی چار دیواری سے باہر جا سکتی ہے نہ مزارعوں سے مل سکتی ہے۔ یہ اچھا موکع ہے۔ اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔"

"کیا کرے گا تو؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"جمیلہ کا اثر ختم کر کے مزارعوں پر تیری دھاک بٹھانی ہو گی۔ اس کے لیے زمیں داروں کا آزمودہ حربہ استعمال کرنا ہو گا۔"

"وہ کیا ہونا ہے؟" رحیم داد بیچ میں بول پڑا۔

"وہ یہ ہونا ہے کہ مزارعوں کے درمیان پھوٹ پیدا کرنی ہو گی" نادر نے بتایا "ہر زمیں داری میں مزارعوں کے درمیان چھوٹے موٹے جھگڑے تو ہوتے ہی ہیں۔ اس پنڈ کے مزارعوں میں بھی ہیں۔ ایسے جھگڑوں کو بڑھانا ہو گا۔ کچھ کی طرف داری کرنی ہو گی اور انہیں رعائتیں دے کر اپنے ساتھ ملانا ہو گا" وہ زیر لب مسکرایا "جو اپنے ساتھ نہ آئیں ان پر طرح طرح کے دباؤ ڈال کر تنگ کرنا ہو گا فیر ایسا وکھت بھی آئے گا جب سارے ہی مزارع تیرے بندے ہوں گے۔ جو کہے گا وہی کریں گے۔ تجھے ہی پنڈ کا اصلی زمیں دار مانیں گے۔"

"تیری گل ویسے تو ٹھیک ہی ہے۔ میں نوں پسند بھی آئی پر اتنا دھیان رکھنا کہ جب اللہ وسایا

زندہ تھا تب بھی جمیلہ زمیں داری کے معاملوں میں برابر حصہ لیتی تھی بلکہ سچ پوچھ تو زمیں داری وہی چلاتی تھی۔" رحیم داد نے نادر خاں کو خبردار کیا۔" تو نے یہ بھی اندازہ کرلیا ہوگا کہ سارے ہی مزارع اس کی بہت عزت کرتے ہیں۔ پیار سے اسے بھین جی کہتے ہیں۔ وہی ضرورت پڑنے پر انہیں ادھار دیتی ہے۔ سارا حساب کتاب اسی کے پاس رہتا ہے۔ مجھے ڈر ہے مزارعوں کو اپنا طرف دار بنانے میں جمیلہ نراض نہ ہو جائے۔ تیں نوں پتہ ہے اس کے تو زمیں داری میں بارا ں مرلے ہیں۔"

"میں نوں اس کا پتہ ہے جی۔"

"مزارعوں سے کرض کی وصولی میں سختی کی گئی یا انہیں تنگ کیا گیا تو جمیلہ میرے گلے پڑ جائے گی۔ بہت نراض ہوگی۔ میں اسے نراض نہیں کرنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں آگے بھی زمیں داری اس طرح چلائی جائے کہ نہ جمیلہ نراض ہو اور نہ ہی کسی طرح ایسا ظاہر ہو کہ اس کی اور میری زمیں داری الگ الگ ہے۔" رحیم داد نے زور دے کر کہا۔" زمیں داری تو پوری پوری ساتھ ساتھ ہی چلائی ہوگی۔ تیں نوں اسے سامنے رکھ کر کام کرنا ہوگا۔"

"ایسا ہی ہوگا جی۔ فکر نہ کریں۔" نادر نے اسے اطمینان دلایا۔" میں نے سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ آگے ہر معاملہ میں احتیاط سے کام لوں گا۔ جمیلہ کو شکایت کا موکع نہ دوں گا۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ وہ نظریں جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ نادر خاں نے چند لمحے خاموش رہ کر دریافت کیا۔" کس سوچ میں پڑ گئے جی؟"

"سوچ رہا تھا تو نے زمیں داری بڑھانے اور پھیلانے کے بارے میں کہا ہے۔ ہونا تو ایسا چاہیے پر اس کے لیے روپے کی ضرورت ہوگی۔" رحیم داد نے اپنی مالی مشکلات کا ایک بار پھر اظہار کیا۔" خریف کی فصل کی واڈھی میں تو ابھی کئی مہینے رہتے ہیں۔ مزارعوں سے کماد کی پیداوار میں کرض کی وصولی بھی تب ہی ہوگی۔ اب کیسے کام چلایا جائے۔"

"مزارعوں سے کچھ نہ کچھ وصولی تو ابھی ہو سکتی ہے۔" نادر نے تجویز پیش کی۔

رحیم داد نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔" جمیلہ سے پہلے مشورہ کرنا ہوگا۔ اس سے بات کیے بنا اس معاملہ میں کچھ نہ کرنا۔ تو نہیں سمجھتا یہ بہت ضروری ہے۔"

"ایک تجویز اس سلسلہ میں اپنی سمجھ میں آتی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" رحیم داد نے بے چین ہو کر پوچھا۔ اسے دراصل اس رقم کی فکر تھی جس کے بارے میں وکیل نے سختی سے تاکید کی تھی۔ اس کے پاس لالی کی رقم میں سے دارا کو ایک ہزار دے کر اب دو ہزار سے کچھ اوپر روپے رہ گئے تھے۔ مگر وکیل زیادہ رقم مانگتا تھا۔ رحیم داد اس سلسلہ میں نادر کو بھی اعتماد میں لینا نہ چاہتا تھا۔

نادر نے گردن آگے بڑھا کر راز داری کے انداز میں کہا "شاہ جی سے بھی کرض ادھار مل سکتا ہے۔ مجھے یکین ہے وہ ضرور تیری مدد کرے گا۔ وہ تیری بہت تعریف کرتا ہے اور مانتا بھی بہت ہے۔ وہ اتنا وڈا زمیں دار ہے کہ چار پانچ ہزار روپے ادھار دینا اس کے لیے معمولی بات ہے۔"

"امید تو ہے کہ وہ میری مدد کرے گا۔" رحیم داد نے نادر کی تائید کی "پر میں چاہتا ہوں تو پہلے اس سے اس سلسلہ میں گل بات کر۔"

"کروں گا جی۔ میں نے جلدی اسے ملنا بھی ہے۔"

"اور دیکھ کسی سے ہرگز یہ نہ بتانا کہ تجھے شاہ جی نے ادھر بھیجا ہے اور نہ ہی کسی کو یہ پتہ چلے کہ تیرا اس کے پاس آنا جانا ہے۔" رحیم داد نے تنبیہ کی "اور نہ کسی کو یہ بتانا کہ میرا اس کے ساتھ میل جول ہے۔" اس کا لہجہ اور مدھم پڑ گیا۔ اس نے چوکنا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا "کسی کو ادھر بالکل پتہ نہیں کہ میں اس کے پاس آنا جاتا ہوں۔"

"شاہ جی نے مجھے یہاں آنے سے پہلے ہی اس بارے میں خبردار کر دیا تھا۔ تب ہی تو میں نے کسی سے یہاں ایسی بات نہیں کی۔ اشارہ تک نہ دیا۔" نادر خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا "پر آپ کو بھی جی سخت احتیاط کرنی چاہیے۔"

"وہ تو میں کرتا ہی ہوں۔"

"مجھے تو مہمان خانے کا نوکر احمد بھی اعتبار کا بندہ نہیں لگتا۔" نادر نے کہا "وہ باتیں بہت کرتا ہے اور پیٹ کا بھی ہلکا ہے۔ اس پر بالکل بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسے ہٹا کر اپنے بھروسے کا بندہ رکھنا ہو گا۔ ویسے بھی جی نوکر تو اعتبار ہی کا ہونا چاہیے جیسے شاہ جی کے پاس شیدا ہے۔"

مجھے تیرے لیے بھی ایسا بندہ تلاش کرنا ہوگا جس پر پورا پورا بھروسہ ہو اور جس سے ہر طرح کا کام لیا جا سکے۔"

"مجھے بھی احمد ایسا بندہ نہیں لگتا جس پر بھروسہ کیا جا سکے۔ اسی لیے میں نے کبھی اس سے کوئی ایسی گل بات نہیں کی۔ شاہ جی کے پاس بھی جاتا ہوں تو اُسے اشارہ تک نہیں دیتا۔ اسے پتہ لگ جائے تو جھٹ جا کر جمیلہ سے بتا دے گا۔ وہ ایسا ہی بندہ ہے۔"

"تب تو اسے جلد سے جلد ہٹانا چاہیے۔" نادر نے کہا۔ "فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں جلد ہی ایسا اعتبار کا بندہ تلاش کر لوں گا۔ یہاں نہ ملا تو اپنے پنڈ سے لیتا آؤں گا۔"

"ٹھیک ہے اب نہا کر کپڑے بدل لے۔" رحیم داد نے نادر خاں کا میلا کچیلا لباس غور سے دیکھا۔ "تیرے کپڑے لتے بہت گندے ہو گئے ہیں۔"

"کپڑے لتے تو جی میں اپنے ساتھ لایا نہیں۔ اپنے پاس تو یہی کپڑے ہیں۔ دو بار انہیں دھو بھی چکا ہوں۔" نادر نے بتایا۔ "بات یہ ہے جی، میں یہاں ٹھہرنے کے ارادے سے تو آیا نہیں تھا۔ ورنہ کپڑے لتے لے کر تیاری سے آتا۔ بُرا نہ منائیں تو جی میں آج ہی اپنے پنڈ چلا جاؤں۔ کل شام نہیں تو پرسوں ضرور واپس آ جاؤں گا۔"

"تو اس وکت کیسے جائے گا؟" رحیم داد نے گردن گھما پھرا کر بڑھتے ہوئے اندھیرے کو دیکھا۔ "تو پہلے ہی بہت تھکا ہوا ہے۔ کس طرح جا سکے گا؟"

"فکر نہ کریں جی۔" نادر نے مسکرا کر کہا۔ "سورج ڈوبے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ میں آرام سے چلا جاؤں گا۔"

"تو پیدل جائے گا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"حویلی میں نوکروں کے لیے دو سیکلیں ہیں۔ ایک مل جائے تو اس پر چلا جاؤں گا۔ جلد ہی اپنے پنڈ پہنچ جاؤں گا۔ ورنہ رات بہت دیر سے پہنچوں گا۔"

رحیم داد نے ایک نوکر کو بلایا اور اس سے سائیکل منگوائی۔ وہ سائیکل لینے چلا گیا۔ رحیم داد نے کہا۔ "نادر! تو جلد ہی آ جانا۔ ویسے میرا ارادہ بھی شاہ جی کی طرف کل جانے کا ہے۔ تبھی نوں پتہ ہے

وہ اپنے پنڈ میں ہے؟"

" ہاں جی! وہ پیراں والہ ہی میں ہے۔" نادر نے جواب دیا۔" جہاں تک میرا خیال ہے اس کا فی الحال پنڈ سے باہر جانے کا کوئی پروگرام بھی نہیں۔"

نوکر سائیکل لے کر آگیا۔ رحیم داد کی ہدایت پر اس نے سائیکل نادر خاں کے حوالے کر دی۔ سائیکل سنبھال کر وہ کھڑا ہو گیا۔ آہستہ سے بولا۔" مہمان خانے میں جا کر روٹی کھالوں۔ اس کے بعد رحمت والی چلا جاؤں گا۔ اب واپسی ہی پر حاضر ہو سکوں گا۔"

نادر خاں چلا گیا۔ رحیم داد نے باغ ہی میں کھانا کھایا اور دیر تک بیٹھا ان باتوں پر غور کرتا رہا جو نادر خاں نے پچھلے چند روز کی بھاگ دوڑ کے بعد رپوٹ کی صورت میں اس کے سامنے پیش کی تھیں۔ یہ باتیں رحیم داد کے لیے قطعی نئی تھیں اور معلومات افزا بھی تھیں۔ اسے کوٹلہ ہرکشن کے متعلق بحیثیت زمیں دار بہت کم بلکہ کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ پہلے بھی وہ نام کا زمیں دار رہ چکا تھا۔ صرف گیارہ ایکڑ زمین اس کی ملکیت تھی۔ بنیادی طور پر وہ کاشت کار تھا۔ اس کا شمار چھوٹے کھاتے داروں میں ہوتا تھا۔ بڑے زمیں داروں کے ہتھکنڈے اور طور طریقوں سے وہ بڑی حد تک ناواقف تھا۔ نادر خاں نے اس کے سامنے جو تجاویز رکھیں تھیں وہ اسے پسند آئیں اور اس قدر زیادہ پسند آئیں کہ وہ انہیں عملی جامہ پہنانے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔

رات کو بستر پر لیٹا تو نادر خاں اس کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ وہ اسے بے حد ہوشیار اور تجربہ کار آدمی نظر آیا۔ اسے زمیں داری چلانے کے لیے ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ نادر خاں سے ملنے سے پہلے وہ بالکل اندھیرے میں تھا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ مزارع کس انداز سے سوچ رہے تھے۔ وہ کتنے خودسر اور بے لگام ہو گئے تھے۔ انہیں قابو میں لانے کے لیے کیا کیا جائے اور کیسا رویہ اختیار کیا جائے یہ کام وہ نادر خاں کی مدد ہی سے کر سکتا تھا۔

نادر خاں نے رحیم داد کو کم مایہ اور نہایت معمولی زمیں دار کے خول سے نکال کر اچانک ایک بڑے زمیں دار کی سوچ کے راستے پر ڈال دیا تھا۔ اس سوچ میں اس کے لیے سہانے خوابوں کی کشش اور دل فریبی تھی۔ وہ بہت مطمئن اور مگن تھا۔ بار بار خوشی سے مسکراتا۔ پہلو بدلتا۔

وہ خود کو سید احسان علی شاہ کی طرح ایک بڑے اور رعب و دبدبہ والے زمیں دار کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔ اس رات وہ بہت گہری نیند سویا۔

۴۶

رحیم داد نے نائی بلوایا۔ حجامت بنوائی۔ غسل کیا۔ صاف ستھرا لباس پہنا۔ وہ احسان شاہ کے پاس جا رہا تھا۔ احمد اس وقت مہمان خانہ میں موجود تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا "چوہدری آج جمعہ تو نہیں ہے؟"

"نہیں" رحیم داد نے حیرت سے کہا "تیں نوں پتہ نہیں آج تو منگل وار ہے"

"لگتا ہے تو کہیں جا رہا ہے"

"میں نوں تو کہیں نہیں جانا" رحیم داد نے انکار کر دیا۔ وہ اسے کچھ بتانا نہ چاہتا تھا۔ اس نے اس روز تانگہ بھی نہ بلوایا۔

احمد خاموش ہو گیا۔ رحیم داد کچھ دیر بعد مہمان خانے سے نکلا اور اس راستے پر چل دیا جو کرماں پورہ جاتا تھا۔ کرماں پورہ تین میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں سے ایک نیم پختہ سڑک گزرتی تھی کرماں پورہ موضع تھا۔ وہاں تانگوں کا اڈا بھی تھا۔ گاؤں سے کہیں دور جانا ہوتا تو کرماں پورہ ہی سے تانگہ بلوایا جاتا تھا۔

راستے کے دونوں جانب سایہ دار درخت تھے۔ کسی زمانہ میں یہ کنکر کی بنی ہوئی سڑک تھی۔ جسے جمیلہ کے باپ لالہ کرشن دیال نے بنوایا تھا۔ وہ جب گاؤں آتا تو ہمیشہ کار میں آتا اور اسی سڑک سے آتا تھا۔ ہر دیال اور جمیلہ کے دوسرے بھائی بھی جیپ یا کار سے اسی سڑک سے آتے جاتے تھے مگر اب یہ سڑک ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ بارش نے جگہ جگہ گڑھے ڈال دیے تھے

جن میں پانی بھرا تھا۔

سڑک کے نشان دھندلے پڑ چکے تھے۔ وہ کچا راستہ بن کر رہ گئی تھی۔ رحیم داد اس پر چلتا رہا۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ ہوا بھی چل رہی تھی۔ پہر دن گزرا تو رحیم داد کرمان پورہ پہنچ چکا تھا۔ اس نے تانگہ لیا اور اس میں سوار ہو کر حویلی روڈ کی جانب روانہ ہو گیا۔

حویلی روڈ پر اسے زیادہ دور نہ جانا پڑا۔ پہلے ہی اڈے پر اسے لاری مل گئی۔ اس نے تانگہ چھوڑا، کوچوان کو کرایہ ادا کیا اور لاری کے اندر داخل ہو گیا۔ لاری مسافروں سے کھچا کھچ بھری تھی رحیم داد کو کھڑے ہو کر سفر کرنا پڑا۔ مگر لاری نے میل سوا میل فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک بستی آ گئی۔ کئی مسافر اتر گئے۔ رحیم داد کو بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔

رحیم داد اطمینان سے بیٹھ گیا۔ لاری سڑک پر ہچکولے کھاتی ہوئی دوڑتی رہی۔ باہر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ موسم سہانا ہو گیا تھا۔ رحیم داد نے مسافروں پر ایک نظر ڈالی مگر ایک مسافر پر نظر پڑتے ہی اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ جمال دین تھا اور آنکھیں بند کئے اونگھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی نوراں بیٹھی تھی۔ دونوں بچے، کریما اور زینو، بھی ماں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ رحیم داد نے اپنی بیوی، بیٹے اور بیٹی کو دیکھا۔ وہ خوف زدہ بھی ہو گیا اور اسے دکھ بھی ہوا۔ نوراں کا رنگ روپ دھندلا گیا تھا۔ لباس بوسیدہ اور میلا کچیلا تھا۔ بچوں کا لباس اس سے بھی زیادہ پھٹا پرانا تھا۔

نوراں، بچوں کے ساتھ داہنے ہاتھ کی اگلی نشست پر بیٹھی تھی۔ رحیم داد دم بخود اسے اور بچوں کو دیکھتا رہا۔ یکایک نوراں نے گردن موڑی اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ چند لمحے بعد اس نے جھجکتے ہوئے نوراں کی طرف چھپلتی ہوئی نظر ڈالی۔ وہ بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ رحیم داد نے فوراً نظریں موڑ لیں۔ اور خود بھی اس قدر مڑا کہ اس کا چہرہ دوسری طرف ہو گیا۔

رحیم داد بہت پریشان تھا۔ وہ خود کو خطرے میں گھرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ جمال دین یا نوراں اسے پہچان لیتے تو وہ سخت مصیبت میں مبتلا ہو جاتا۔ اگلا اڈا آنے سے پہلے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے باہر نکلتے ہوئے سرسری نظروں سے دیکھا۔ جمال دین ابھی تک آنکھیں بند کئے اونگھ رہا تھا۔ نوراں خاموش بیٹھی تھی۔ وہ بدحال اور اجڑی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس

کے چہرے کا نکھار میلا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں بجھی بجھی تھیں۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ دل میں کسک اور چبھن محسوس کی۔ نوراں نے ایک بار پھر گردن موڑی۔ اسی لمحے لاری چل پڑی۔ رحیم داد لاری سے اتر کر باہر چلا گیا۔

باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ رحیم داد لاری کی جانب پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ لاری سے کچھ اور مسافر اترے۔ کچھ سوار ہوئے۔ انجن اسٹارٹ ہی تھا۔ ذرا دیر میں لاری پھر سڑک پر دوڑنے لگی۔ رحیم داد نے مڑ کر لاری کو دیکھا اور نگاہیں اٹھائے دور تک دیکھتا رہا۔ وہ ایک موڑ پر مڑی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

رحیم داد کے سینہ میں دھواں سا اٹھا۔ آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ اس نے احسان شاہ کے پاس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ اس وقت بہت غم زدہ اور دل گرفتہ تھا۔ کچھ دیر بعد ایک لاری آ گئی۔ وہ اس میں بیٹھا اور کوٹلہ ہرکشن کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆

رحیم داد کوٹلہ ہرکشن واپس پہنچا۔ مہمان خانے میں گیا۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ بوندا باندی جاری تھی۔ رحیم داد کے کپڑے بارش سے بھیگ گئے تھے۔ اس نے گیلے کپڑے اتار کر دھوتی باندھی۔ غسل خانے میں جا کر نہایا۔ اجلا لباس پہنا۔ دوپہر کا کھانا تاخیر سے کھایا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ وہ بستر پر لیٹ کر سفر کی تھکن دور کرنے لگا۔

نوراں، کریما اور زینو ابھی تک اس کے ذہن پر چھائے ہوئے تھے۔ کریما اس کا پہلوٹی کا بیٹا تھا اور زینو لاڈلی بیٹی تھی۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب کریما یا زینو میں سے کوئی بیمار پڑتا یا کسی تکلیف میں مبتلا ہوتا تو وہ تڑپ اٹھتا، بے قرار ہو جاتا۔ آج اس نے دونوں کو طویل مدت کے بعد دیکھا تھا۔ ان کے چہروں پر برستی ہوئی محرومی دیکھی تھی۔ ان کے لاغر اور گندے جسم دیکھے تھے۔ ان کا پھٹا پرانا لباس دیکھا تھا مگر وہ ان کے سر پر شفقت سے ہاتھ بھی نہ پھیر سکا۔ ان کے رخسار چومنے اور انہیں سینے سے لگانے کے بجائے انہیں دیکھ کر وہ ڈر گیا تھا، سہم گیا

تھا۔ ایسا محسوس ہوا گویا وہ بھیانک خواب دیکھ رہا ہے۔ حالات نے اسے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ نوراں، جس کی محبت سے سرشار ہو کر اس نے اپنے حقیقی چچا کو دشمن بنا لیا تھا۔ اس کی بیٹی "بیدی" کا رشتہ ٹھکرا کر نوراں کو بیاہ کر اپنے گھر لے آیا تھا اور اکلوتی بہن، بیگماں سے اس طرح جدا ہو گیا تھا کہ اس کے گھر کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس پر بند ہو گئے تھے اور جب وہ چھپ کر اس کے گاؤں ڈھولہ امیر خاں پہنچا اور اس سے ملا تو چوری چھپے کی یہ ملاقات بیگماں اور اس کے شوہر، مولا داد کی ہلاکت کا سبب بن گئی۔ اُسے دونوں کو خون میں لت پت تڑپتے اور دم توڑتے دیکھنا پڑا۔

چند ہی گھنٹے پہلے وہی چہیتی نوراں اسے نظر آئی تو وہ خوف اور دہشت سے لرز کر رہ گیا تھا۔ وہ اس کے لیے شدید خطرہ بن گئی تھی۔ جب تک وہ لاری میں رہا، اسے رہ رہ کر یہ اندیشہ ستاتا رہا کہیں وہ اسے پہچان نہ لے۔ اسے نوراں کا اجڑا ہوا چہرہ اور اس پر پھیلی ہوئی ویرانی دیکھ کر دکھ بھی ہوا اور سخت نفرت بھی ہوئی۔ وہ اپنے آشنا، جمال دین کے ساتھ بیٹھی تھی جو کبھی اس کا گہرا دوست تھا۔ ہر وقت کا ساتھی اور رفیق تھا۔ نوراں کی بے وفائی یاد کر کے وہ غصے سے تلملا اٹھا۔ اس نے بے چین ہو کر کروٹ بدلی اور ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔

وہ اسی بے چینی کے عالم میں لیٹا تھا کہ ناراں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی ہلکی ہلکی شوخ مسکراہٹ تھی۔ رحیم داد نے بستر پر لیٹے لیٹے بے نیازی سے پوچھا۔ "حما کدھر ہے؟"

"میں نوں پتہ نہیں جی وہ کدھر ہے۔" اس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "شدّو کے چکر میں گیا ہوگا۔"

"تو کیسے آئی ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"زمیں دارنی نے تجھے بلایا ہے۔ وہ حویلی میں تیرا انتظار کر رہی ہے۔"

رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پلنگ سے نیچے اترا۔ سر پر پگ رکھی۔ پیروں میں جوتے پہنے اور

تاراں کے ہمراہ بوندا باندی سے بچتا بچاتا حویلی کے اندر چلا گیا۔ جمیلہ اس وقت گول کمرے میں پرانی وضع کے ایک چوڑے چکلے صوفے پر بیٹھی تھی۔ اسی کمرے میں کبھی جمیلہ کا بڑا بھائی، لالہ ہردیال کچہری لگاتا تھا۔ زمیں داری کے معاملات طے کرتا تھا۔ سرکاری افسروں، بڑے زمیں داروں اور جاگیرداروں سے ملاقات کرتا تھا۔

کمرے میں دبیز قالین کا فرش تھا جس کے نقش و نگار قدرے دھندلے پڑ گئے تھے۔ دروازوں پر پڑے ہوئے پردوں کے رنگ بھی اڑ گئے تھے۔ کمرے کا فرنیچر پرانا تھا مگر قیمتی تھا۔ کمرے کی آرائش سے جاگیردارانہ آن بان ابھی تک جھلکتی تھی۔

جمیلہ اس وقت سفید ململ کا کرتہ اور لٹھے کی شلوار پہنے تھی۔ دوپٹہ بھی سفید ہی تھا۔ اور اس کے اوپر سیاہ چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ اس نے چادر سے سر اور چہرے کو بُکل مار کر بڑی حد تک چھپا رکھا تھا۔ اس کی گوری گوری کلائیاں بالکل خالی تھیں، چہرہ جو کبھی تازہ پھولوں کی مانند شگفتہ اور دل کش نظر آتا تھا، اب پچھلی رات کا زرد اور مٹیالا چاند بن گیا تھا۔

رحیم داد کمرے میں داخل ہوا۔ جمیلہ نے ہاتھ کے اشارے سے قریبی صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور اپنا چہرہ دیوار کی جانب موڑ لیا۔ تاراں اس کے قدموں کے قریب قالین پر بیٹھ گئی۔ اب جمیلہ کا چہرہ نظر نہ آتا تھا۔ کمرے میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ چند لمحے بعد جمیلہ کی آواز ابھری۔ اس نے رحیم داد سے دریافت کیا۔

"چوہدری! میں نے سنا ہے، تو نے زمیں داری کی دیکھ بھال کے لیے منیجر رکھ لیا ہے۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ ٹھٹکی "کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں جی!" رحیم داد کے لہجے سے صاف جھلکتا تھا کہ وہ اس سوال کے لیے پہلے سے ذہنی طور پر تیار تھا۔ اس نے بلا جھجک جواب دیا۔ "تو نے ٹھیک ہی سنا۔"

جمیلہ چند لمحے تک گم صم بیٹھی رہی۔ اس نے گہری سانس بھری۔ شکوہ کرنے کے انداز میں بولی "تو نے اتنا وڈا فیصلہ کر لیا اور مجھ سے پوچھا بھی نہیں۔"

"کیسے پوچھتا۔ تجھ سے ملنا ہی کب ہوا۔" رحیم داد نے بات بنائی۔ "خیر یہ بھی تو ہے کہ

تو اللہ دسایا کے سیاپے میں اتنی کھوئی ہوئی ہے کہ ایسے میں تجھ سے کیا گل بات کی جائے۔"

جمیلہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔" پر تو نے یہ تو سوچا ہوتا کہ ہمارے پاس کل ۲۲ مربعے زمین ہے۔ جب میرے پتا کے پاس ۲۲ سو مربعے سے اُوپر اراضی تھی تب اس کے پاس منیجر ہوتا تھا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔" پاکستان بنا تو سو سے بھی زیادہ مربعے احسان علی شاہ نے دبالیے۔ کچھ پر دوسرے زمیں داروں کے ساتھ مزارعوں نے بھی کیفضہ کرلیا۔ ۲۲ مربعے بھی اللہ وسایا نے زورا زوری دکھا کر بچالیے۔ اب اتنی سی زمیں داری کے لیے منیجر یا کاردار کی کیا ضرورت ہے؟" جمیلہ کے لہجے میں تلخی تھی۔

رحیم داد اس کے لہجے میں رچی ہوئی تلخی نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔" ضرورت تو ہے اور بہت زیادہ ہے۔ تو عدّت میں بیٹھی ہے۔ حویلی کی چاردیواری سے باہر نہیں جاسکتی۔ اور میں نوں یہاں کے معاملات کا کچھ اتا پتہ نہیں۔ زمیں داری کی دیکھ بھال کے لیے کوئی تو ہونا چاہیے اس طرح کب تک کام چلے گا؟"

" جیسے پہلے چل رہا تھا۔" جمیلہ اپنی بات پر اڑی رہی۔" ہمارے مزارع جان لڑا کر کام کرتے ہیں۔ جب ہی تو ہر فصل اچھی ہوتی ہے۔ تو نے ربیع کی فصل دیکھی تھی۔ اب خریف کی فصل تیرے سامنے ہے۔ ایمان نال بتا کیسی فصل ہے؟"

" فصل تو ویسے اچھی اور ٹھیک ٹھاک ہی لگتی ہے۔" رحیم داد نے اعتراف کیا۔" پر تو نے کبھی یہ بھی سوچا کتنی زمین پڑیلی ہے۔ کہیں ڈھنڈل اور جھلّن ہے۔ کہیں جھنگر ہے یہ ساری غیر مزرعہ زمین زیرِ کاشت لائی جاسکتی ہے۔ اس طرح زمین کے ساتھ ساتھ پیداوار میں بھی اضافہ ہوگا۔ زمیں داری کو بھی بڑھایا جاسکتا ہے۔"

" مگر اس میں سے بہت سی زمین تو شاملات کی ہے۔ وہ تو سارے پنڈ کی مشترکہ ملکیت ہے۔" جمیلہ نے وضاحت کی۔" ہاں یہ ٹھیک ہے کہ ہماری ایسی پڑیلی اور بنجر زمین بھی ہے جسے کھیتی باڑی کے لیے ٹھیک ٹھاک کیا جاسکتا ہے۔ پر میں اور اللہ وسایا، دونوں غافل نہیں تھے۔ احسان شاہ نے ایک کے بعد دوسرا کیس چلا کر مقدمہ بازی میں ایسا پھنسایا کہ اللہ وسایا کو

اتنی مہلت ہی نہ ملی کہ وہ اس بے کار اور بنجر زمین کی طرف دھیان دیتا۔" اس کا لہجہ پھر تلخ ہو گیا۔ "تجھے پتہ ہی ہے احسان شاہ نے یہ بچی کھچی زمین بلکہ حویلی تک ہمارے قبضے سے نکلوا دی تھی۔ وہ تو ہم کو بالکل تباہ کر دینا چاہتا تھا۔"

اسی وقت کمرے کے باہر تاراں کی بچی کے زور زور سے رونے کی آواز ابھری۔ تاراں نے بے چینی سے فوراً پہلو بدلا۔ جمیلہ نے اس سے کہا۔ "تاراں! دیکھ تو تیری چھوہری کیوں بلک بلک کر رو رہی ہے؟" تاراں خاموشی سے اٹھی اور تیز قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

رحیم داد نے چند لمحے خاموش رہ کر کہا۔ "جو ہونا تھا جی وہ تو ہو گیا۔" اس کے لہجے میں قدرے اکھڑ پن تھا۔ "صاف بات یہ ہے جی اب تو میں نے نادر خاں کو منیجر لگا ہی دیا۔ وہ جلد ہی کام شروع کر دے گا۔" رحیم داد کے رویّہ سے صاف ظاہر تھا کہ نادر خاں کے سلسلے میں وہ اپنی رائے بدلنے پر آمادہ نہ تھا۔

"جب تو نے فیصلہ کر ہی لیا تو اب بات کرنے سے کیا فائدہ۔ تجھے خرچ ہی بڑھانا ہے تو ضرور بڑھا۔ جو مرضی میں آئے کر۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" جمیلہ کے انداز میں جھنجلاہٹ تھی۔

رحیم داد نے بھی اس جھنجلاہٹ کو محسوس کیا۔ فوراً نرم پڑ گیا۔ اپنا رویّہ بدلا۔ "تو فکر نہ کر۔ جتنا خرچہ بڑھے گا۔ اس سے زیادہ ہی فائدہ ہو گا۔ اپنی سمجھ میں تو یہی آتا ہے۔ یہی سوچ کر نادر خاں کو لگانے کا بھی فیصلہ کیا تھا۔ میرا مطلب تو صرف اتنا ہے کہ زمیں داری کو بڑھایا جائے۔ ٹھیک ٹھاک طور پر چلایا جائے۔"

"مجھے اس معاملہ میں تجھ سے زیادہ پتہ ہے۔" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "ہمارا منیجر بنسی لال تھا۔ تنخواہ تو کیول اس کی اسّی روپے تھی۔ وہ بھی سولاں، ستاراں برس کی نوکری کے بعد ہوئی تھی۔ پر ہیرا پھیری اور گڑبڑ کر کے اس نے لودھراں میں اپنے پتر کے نام سے اتنی زمین خرید لی تھی کہ اس کا شمار تحصیل کے وڈے زمیں داروں میں کیا جاتا تھا۔ زمیں داری کی دیکھ بھال کے لیے اس نے اپنا منشی بھی لگا رکھا تھا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "ایسا بھی نہیں تھا کہ پتہ جی یا ہر دیال کو پتہ نہ تھا۔"

رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر استفسار کیا۔ "جب انہیں ملوم تھا تو انہوں نے بنسی لال کو کیوں رکھ چھوڑا تھا؟"

"اُسے ہٹانا آسان نہ تھا۔ اصلی جگیر دار تو سمجھو بنسی لال ہی تھا۔" جمیلہ نے بتایا۔ "سب کچھ وہی کرتا تھا۔ ہر کام اسی کی مرضی سے ہوتا تھا۔ وہ تو ہر فصل پر ایک مکررہ رکم دے دیتا تھا۔ پتا جی اور ہر دیال ہر بکھیڑے سے بچے رہتے۔ نہ بھاگ دوڑ کی ضرورت، نہ مزارعوں کے ساتھ بک بک جھک جھک۔ انہیں برس کے برس اتنی رکم مل جاتی جتنی وہ چاہتے تھے۔ بنسی لال خوشامد اور چاپلوسی الگ کرتا تھا۔ جب بھی دیال پور ہمارے گھر آتا ماتا جی کے لیے طرح طرح کی سوغات اور تحفے لے کر ضرور آتا۔"

"پر یہ تو زمیں داری نہ ہوئی۔ ٹھیکداری ہوئی۔"

"عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔" جمیلہ نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ "جب منیجر زمیں داری پر پوری طرح چھا جاتا ہے تو وہ ایک طرح سے ٹھیکے ہی پر زمیں داری چلانے لگتا ہے۔"

"تیری گل سمجھ نہیں آئی۔" رحیم داد نے مزید وضاحت چاہی۔

"بات یہ ہے چوہدری! زیادہ تر وڈّے زمیں دار یا جگیر دار شہر میں کوٹھیاں بنگلے بنوا کر رہتے ہیں۔ وہاں عیش کرتے ہیں اور زمیں داری منیجر، کاردار اور منشی چلاتے ہیں۔ ایسے ہی زمیں داروں کو انگریزی میں ابسن ٹیز لینڈ لارڈز کہا جاتا ہے۔"

"ایسا تو بہت ہوتا ہے۔" رحیم داد بولا۔ "میں کئی زمیں داروں کو جانتا ہوں، وہ لہور میں کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔ ان کے منیجر اور کاردار زمیں داری چلاتے ہیں۔ اس میں برائی کیا ہے زمینداروں کا تو کوئی نکصان نہیں ہوتا۔ انہیں فصل سے جتنا ملنا چاہیے وہ تو مل ہی جاتا ہے۔"

"پر اس طرح کی زمیں داری میں بے چارے مزارع بالکل تباہ ہو جاتے ہیں۔" جمیلہ نے رحیم داد کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "انہیں زمیں دار کے ساتھ ساتھ فصل میں سے منیجر کا حصہ بھی دینا پڑتا ہے۔ اگر ایسا نہ کریں تو انہیں بے دخل کر دیا جاتا ہے اور بے دخل کرنے کے لیے انہیں جھوٹے مکدموں میں پھنسایا جاتا ہے۔ ڈھور ڈنگر اٹھوا لیے جاتے ہیں۔ جوان گھر والیوں اور کڑیوں کو اٹھوا لیا جاتا

ہے۔ گھر بار جلوا دیا جاتا ہے۔ داڑھو فصلیں کاٹ لی جاتی ہیں۔ ان پر ہر ظلم اور اپرادھ ہوتا ہے۔ انہیں طرح طرح سے تنگ کیا جاتا ہے۔ بنسی لال نے اللہ وسایا اور اس کے پیو کو اسی طرح بے دخل کیا تھا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "اللہ وسایا اور میں نے اس پنڈ میں کبھی ایسا نہیں کیا۔ کسی مزارع کو نہ تنگ کیا نہ بے دخل۔ مجھے ڈر ہے اگے چل کر یہاں بھی ایسا ہی ہوتے لگے نگا۔"

"ایسا ہر گز نہیں ہوگا۔" رحیم داد نے جمیلہ کو یقین دلایا۔ "زمیں دارنی! جو تو کہے گی وہی ہوگا۔ تیری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔ تو اپنے دل سے ایسا شبہ بالکل نکال دے۔ پہلے بھی تو نے زمیں داری چلائی ہے۔ اگے بھی تیں توں ہی چلانی ہے۔"

"میرا کیا ہے۔ میں تو اب کچھ بھی نہیں رہی۔" جمیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "اللہ وسایا کے ساتھ میرا سب کچھ چلا گیا۔ سب کچھ اُجڑ گیا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ آگے نہ بول سکی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ آنسو پلکوں سے ڈھلک ڈھلک بکھرنے لگے۔ کمرے میں گہرا سکوت پھیل گیا۔ جمیلہ سر جھکائے خاموشی سے روتی رہی۔

☆

بوندا باندی کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ کمرے میں بھیگے ہوئے جھونکے آ رہے تھے۔ ہوا کی سرسراہٹ خاموشی میں رک رک کر اُبھر رہی تھی۔ تاراں ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔

رحیم داد نے کچھ دیر بعد اظہار ہمدردی کرتے ہوئے رقّت آمیز لہجے میں کہا۔ "زمیں دارنی! میں نوں پتہ نہیں تھا کہ تجھے اللہ وسایا سے اتنا زیادہ پیار تھا۔"

"پیار!" جمیلہ نے چادر کے پلّو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "نہیں چوہدری! مجھے کسی سے پیار نہیں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "پیار تو وہ کرتا ہے جسے اپنے سے پیار ہو۔ اور مجھے اپنے جیون سے، اپنی ذات سے کوئی پیار نہیں۔ ہو بھی نہیں سکتا۔ تو اس گل کو نہیں سمجھ سکتا۔"

رحیم داد واقعی اس کی بات کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ ہونق کی طرح آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں بعد خاموشی میں گہری سانس بھرنے کی مدھم آواز ابھری۔ جمیلہ بڑبڑانے کے انداز میں آہستہ آہستہ کہنے لگی "کبھی ایسا بھی تھا جب مجھے اپنے سے پیار تھا۔ یہ بیتے دنوں کی گل ہے۔ پر اب تو اسے ایک جگ بیت گیا۔ اس سمے میں پاردتی تھی اور کالج میں پڑتی تھی۔ تب میں نے کسی سے پیار کیا تھا اب تو وہ ساری ہی باتیں ایسی لگتی ہیں جیسے کوئی سہانا سپنا دیکھا ہو۔" اس کے لہجے میں درد کی کسک تھی۔ "ہاں وہ سپنا ہی تھا۔ ایک سندر کلپنا۔"

"کون تھا وہ؟" رحیم داد نے نہایت بھونڈے پن سے پوچھا۔

جمیلہ نے چونک کر گردن موڑی۔ رحیم داد کو دیکھا۔ حیرت سے اس کے چہرے کو تکتی رہی پھر اس نے سر جھکا لیا۔ اس کا افسردہ چہرہ اور مرجھا گیا۔

رحیم داد نے گھبرا کر کہا۔ "لگتا ہے تو نے میری گل کا برا منایا۔"

"ایسی گل نہیں۔" وہ مدھم لہجے میں بولی "چوہدری! تجھے سب ہی کچھ پتہ ہے۔ تجھ سے اب کیا چھپا رہ گیا ہے۔ تو اس کے بارے میں نہیں جانتا، وہ بھی جان لے۔" جمیلہ کی آواز میں درد رچا ہوا تھا۔ "اس کا نام دیرندر تھا۔ وہ لہور کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا۔"

"تیرا اس سے میل جول کیسے ہوا۔ تو بھی اسی کالج میں پڑھتی تھی؟"

"نہیں، میں تو کنیئرڈ کالج میں پڑھتی تھی۔" جمیلہ نے بتایا "جب تک مجھے ہوسٹل میں رہنے کو جگہ نہ ملی میں دیرندر کے پتا کی کوٹھی پر ٹھہری رہی۔ وہ میرے پتا جی کے بہت پرانے دوست تھے۔ جات کے کھتری تھے اور کھنہ بھی تھے۔ ویسے تو میں دیرندر کو پہلے سے جانتی تھی۔ پر جب ایک ہی کوٹھی میں ساتھ ساتھ رہنا ہوا تو میل ملاپ بڑھ گیا۔ میں ہوسٹل چلی گئی تب بھی میں اس سے ملتی رہی۔ جب ہمارا میل جول زیادہ بڑھا تو بات بڑوں تک پہنچی۔"

"تب تو گڑبڑ پیدا ہوئی ہوگی؟" رحیم داد نے اس کی باتوں میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"نہیں۔" جمیلہ نے بتایا۔ "دیریندر کے پتا مجھے اپنی نوہ بنانا چاہتے تھے۔ پر ماں جی نے صاف انکار کر دیا۔"

"اس نے ایسا کیوں کیا؟" رحیم داد بیچ میں بول پڑا۔

"بات یہ تھی کہ ماں جی نے ہردیال کا رشتہ دیریندر کی بہن سے بہت پہلے دیا تھا۔ پر دیریندر کی ماتا جی نے انکار کر دیا۔ اس کا کارن یہ تھا کہ ہردیال ان دنوں شراب پی کر گانا سننے اور ناچ دیکھنے کنجریوں کے کوٹھوں پر جاتا تھا۔" جمیلہ مدھم لہجے میں بتاتی رہی۔ "ماں جی کو آشا تھی کہ ہردیال کا ویاہ ہو جائے تو وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ کنجریوں کے پاس جانا چھوڑ دے گا۔ پر دیریندر کی بہن کا ہردیال سے ویاہ نہ ہو سکا۔"

"یہ تو وٹے سٹے کا ویاہ ہوا۔"

"ہاں کچھ ایسا ہی تھا۔" جمیلہ بولی۔ "دیریندر کی بہن کے ساتھ ہردیال کا رشتہ نہ ہو سکا۔ اسی لیے دیریندر کے ساتھ میرے ویاہ کا معاملہ بھی کھنڈت میں پڑ گیا۔ ہم دونوں کو بہت دکھ ہوا۔ ہردیال کو کسی طرح اس کا پتہ چل گیا۔ ہوا یہ کہ ایک روز اس نے مجھے روتے ہوئے دیکھ لیا۔ ان دنوں میں دیپال پور میں اپنے گھر ہی پر تھی۔ اس نے کوشش کر کے ماں جی کو راضی کر لیا۔ پتا جی تو پہلے ہی تیار تھے۔ کچھ سمے بعد شبھ گھڑی دیکھ کر سگن ہو گئے۔ اور یہ طے ہوا کہ اگلی پورن ماشی کو دیریندر کے ساتھ میری سگائی ہو جائے گی۔ میڈیکل کالج میں دیریندر کا آخری سال تھا اور اس کے بعد ہی ہمارا ویاہ ہونے والا تھا۔"

جمیلہ نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ یادوں کی اونچی نیچی لہروں پر ڈولتی نہ جانے کہاں سے کہاں نکل گئی۔ وہ گم صم بیٹھی تھی اور سامنے کی دیوار تک رہی تھی۔ بارش کا سلسلہ ابھی ختم نہ ہوا تھا۔ بھیگی ہوا مدھم سروں میں گنگنا رہی تھی۔ کمرے میں روشنی کم تھی اور سکوت گہرا تھا۔

رحیم داد نے پوچھا۔ "فیر کیا ہوا؟"

"فیر پاکستان بن گیا۔" جمیلہ بدستور دیوار کو تکتی رہی۔ "اس کے بعد مجھ پر جو کچھ بیتی وہ

تجھے پتہ ہی ہے۔ مجھے اللہ وسایا کسی نہ کسی طرح ولیا کے گھر سے نکال کر حویلی میں لے آیا۔" جمیلہ نے صوفے پر پہلو بدلا۔" اُدھر دیرندر لہور سے بچ بچا کر اوکاڑے پہنچ گیا۔ وہاں اس کے چاچا کا گھر تھا۔ میں دیپال پور ہی میں تھی تو مجھے اس کے اوکاڑے پہنچنے کی خبر ملی تھی۔ بعد میں اس پر کیا بیتی مجھے کچھ پتہ نہ تھا۔ پر اسے پتہ چل گیا کہ میں کوٹلہ ہرکشن میں ہوں۔"

"اُسے کیسے پتہ چل گیا، تو یہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" جمیلہ نے نہایت سادگی سے کہا۔" مجھے تو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ وہ زندہ تھا یا فسادات میں اوروں کی طرح مارا گیا۔ وہ ایسا سمے تھا، کسی کو کسی کا کچھ پتہ نہ تھا چاروں اور ہاہاکار مچی تھی۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔" میں اسے بھول چکی تھی۔ سب ہی کچھ بھول چکی تھی۔ یہ بھی بھول چکی تھی کہ میں کبھی پارونتی تھی۔ جیون مانو ایک ڈراؤنا سپنا بن گیا تھا۔"

"تیری اس سے فیر ملاقات نہیں ہوئی؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"بہت دنوں بعد کی گل ہے۔" جمیلہ نے بتایا۔" ان دنوں مردولا سارا بائی، مغویہ اور اُدھل زنانیوں کا کھوج لگانے اور ان کی واپسی کے لیے پنجاب کا دورہ کر رہی تھیں۔ ایک روز وہ اِدھر بھی آگئیں۔ اُن کے ساتھ دیرندر بھی تھا۔ وہ لوگ فوجی گاڑیوں میں آئے تھے۔ دونوں طرف کے سرکاری افسر بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس روز اللہ وسایا بھی موجود نہ تھا۔ وہ ملتان گیا تھا۔ مجھے جیسے ہی ان لوگوں کے پنڈ میں پہنچنے کی خبر ملی، میں جھٹ حویلی سے نکلی اور کھیتوں میں گھس گئی۔ خریف کی فصل تیار کھڑی تھی۔ میں کماد کی اونچی اونچی فصلوں کے اندر چھپ کر بیٹھ گئی۔"

جمیلہ خاموش ہوگئی۔ رحیم داد بھی چپ بیٹھا رہا۔ جمیلہ نے مڑ کر دروازے کی سمت دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ دالان خالی تھا اور صحن میں مینہ کی ہلکی ہلکی بوندیں آہستہ آہستہ گر رہی تھیں کمرے کی خاموشی میں جمیلہ کی آواز ابھری۔ وہ کہہ رہی تھی۔" کماد کے بوٹوں کی اوٹ میں سے دیرندر کو بہت دنوں بعد پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ بالکل پہلے ہی جیسا تھا۔ وہی ہلکے گھونگھریالے بال۔ وہی آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ اور ان کے نیچے چمکتی ہوئی اس کی موٹی موٹی کالی آنکھیں

رنگ روپ بھی پہلے ہی جیسا تھا۔ بلکہ دھوپ میں اس کا چہرہ اور گلابی ہو گیا تھا۔ پر اب وہ کچھ دُبلا ہو گیا تھا۔ سوٹ کی بجائے کھادی کا سفید کرتا، پائجامہ اور نہرو کٹ اونی جیکٹ پہنے تھا۔" جمیلہ نے ایک بار پھر گہری سانس بھری۔ "وہ سب سویرے سویرے آئے تھے پر دوپہر تک میرا کھوج نکالنے کی کوشش کرتے رہے۔ حویلی تو انہوں نے پوری طرح چھان ہی ڈالی اور پنڈ کے بھی ایک ایک گھر کی تلاشی لی۔"

"کماد کی فصل میں تلاشی نہیں لی؟"

"اس میں بھی بار بار جھانک کر دیکھا۔ پر میں ایسی دبکی بیٹھی تھی کہ کسی کو نظر ہی نہ آئی۔ اس سمے میں دبلی بھی تھی۔" جمیلہ نے کہا۔ "میں نے دیکھا دیر ندر بہت بے کل تھا۔ کبھی ادھر جاتا کبھی اُدھر۔ نومبر کا مہینہ تھا۔ پر بھاگ دوڑ سے اس کا سارا بدن پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ وہ بار بار ماتھے سے پسینہ پونچھتا۔ فر میں نے یہ بھی دیکھا، جب مردولا سارا بائی اور ان کے ساتھ کے تمام لوگ واپس جا رہے تھے تو دیر ندر کا چہرہ بیماروں کی طرح مرجھایا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ دور تک پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا اور میں کماد کی فصل کے اندر بیٹھی اسے چپ چاپ تکتی رہی۔ میرا من چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ ایسا لگا کہ میں اسے بھول کر بھی بھول نہ سکی تھی۔"

"جب ایسی گل تھی تو کماد کی فصل میں کیوں چھپ کر بیٹھ گئی تھی؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ "اس کے ساتھ چلی کیوں نہ گئی؟"

"کیسے چلی جاتی۔" جمیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "ان دنوں نینا میرے پیٹ میں تھی۔ وہ میرے پھولے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر جانے کیا سوچتا۔ اسے دُکھ ہی ہوتا۔ میں نے سوچا ایسی حالت میں وہ مجھے کیسے اپنے ساتھ لے جائے گا۔ ویسے بھی لاج کے مارے میں اس کے سامنے جانے کے لیے کہاں سے حوصلہ لاتی۔ میں تو ان میں سے کسی کے بھی سامنے جانا نہ چاہتی تھی۔ میں نے بار بار اٹھ کر باہر نکلنا چاہا پر ایسا لگا مانو پیروں میں اٹھنے کی شکتی نہ رہی تھی۔"

"اس کے بعد وہ دوبارہ نہیں آیا؟" رحیم داد نے دیر ندر کے ذکر میں دلچسپی کا اظہار کیا۔

"آیا تھا اور بالکل اکیلا آیا تھا۔" جمیلہ نے بتایا۔ "جاڑے کی ٹھنڈی رات تھی۔ اور میں

کمرے میں بالکل اکیلی تھی۔ ان دنوں میں اور اللہ وسایا نیچے ہی کے کمروں میں رہتے تھے۔ اس روز بھی اللہ وسایا موجود نہ تھا۔ دوپہر کو عارف والا گیا تھا اور واپس نہ آیا تھا۔ میں اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ اچانک دروازہ کھلا۔ میں نے دیکھا، دیرنند دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ اس کے کندھے پر اسٹین گن لٹک رہی تھی۔ اب وہ زیادہ ہی دبلا ہو گیا تھا۔ گالوں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں۔ رنگ بھی کم پڑ گیا تھا۔ سر کے بال خشک اور بکھرے ہوئے تھے۔ لیمپ کی پیلی پیلی روشنی میں وہ بیمار بیمار لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میں بھونچکا رہ گئی۔ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔"

"وہ تیرے کمرے تک پہنچا کیسے۔ حویلی کے راکھے اور نوکر چاکر اسے نہ دیکھ سکے۔ کسی نے اسے نہ روکا۔"

"پتہ نہیں وہ کیسے آیا۔ نہ میں نے پوچھا نہ اس نے بتایا۔ پر اتنا ضرور ہے۔ اس رات کہر بہت زیادہ تھی۔ چاروں اور گہری دُھند کی چادر تنی تھی۔ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ لگتا ہے وہ مہمان خانے کی اُور سے آیا تھا جو ان دنوں بالکل خالی تھا۔" جمیلہ نے آہستہ آہستہ بتایا۔" ہم دونوں ذرا دیر چپ چاپ ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ پھر وہ آگے بڑھا۔ نزدیک آیا۔ مسکرا کر بولا۔ پارو! میں تجھے لینے آیا ہوں۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور بستر پر سوتی ہوئی نینا کو ایک ہاتھ سے ہولے ہولے تھپکنے لگی۔ وہ اس سمے سال بھر سے کچھ اوپر تھی۔"

"نینا کو دیکھ کر تو وہ پریشان ہو گیا ہو گا؟"

"نہیں! وہ میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور نینا کو دیکھنے لگا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے پوچھا۔ پارو، یہ تیری بچی ہے؟ میں نے گردن ہلا کر ہاں کی۔ اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ آہستہ سے میرے نزدیک بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے نینا کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ مسکرا کر بولا۔ کتنی سوہنی ہے، بالکل تیری طرح۔ وہ جھکا اور نینا کا گال چوم لیا۔"

"حد کر دی جی اس نے۔" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔" عجب بندہ تھا وہ۔"

"ہاں وہ عجب ہی بندہ تھا۔" جمیلہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔" میں نے چاہا کہ وہ چلا جائے پر میں اس سے یہ بات کہہ نہ سکی۔ خاموش بیٹھی رہی۔ وہ چپ نہ رہا۔ میرے منہ کی اُور دیکھ

کر بولا۔ تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ میں نے نظریں جھکا لیں۔ اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے پوچھا۔ تو اب تک کہاں تھا؟ کہنے لگا کیا کرے گی جان کر۔ ویسے میں ایک بار پہلے بھی تیری کھوج میں اِدھر آیا تھا پر تو نہیں ملی۔ لگتا ہے اللہ وسایا تجھے اپنے ساتھ کہیں اور لے گیا تھا۔ کسی نے پہلے ہی مخبری کر دی ہوگی۔ میں نے کچھ نہ کہا۔ چپ کر کے بیٹھی رہی۔"

"اس نے اپنے بارے میں تجھے کچھ نہیں بتایا؟"

"بتایا تھا۔" جمیلہ بولی۔ "کہتا تھا جب فسادات کی آگ بھڑکی تو اس کے ماتا پتا اور ایک بھائی لاہور ہی میں مارے گئے۔ وہ دو بھینوں کے ساتھ نکل کر کسی نہ کسی طرح چاچا کے پاس ادکاڑہ پہنچ گیا۔ لیکن اس کے پہنچنے کے چند ہی روز بعد بلوائیوں نے ہلّا بول دیا۔ دیرندر کے چاچا کا نام نریندر ناتھ تھا۔ اس کے پاس اپنے بچاؤ کے لیے صرف ایک شاٹ گن تھی اور دو درجن کے لگ بھگ کارتوس تھے۔ وہ اپنی ماڑی کی چھت پر چڑھ گیا اور بلوائیوں کو گولی چلا کر روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ دیرندر اس کی مدد کرتا رہا۔ دوسری اور گھر کی زنانیوں نے دیکھا کہ بلوائیوں نے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور لوہے کا دروازہ توڑ ڈالا تو جن کے بچے تھے انہوں نے بچوں کو چھاتی سے لگا کر دودھ پلایا۔ گھر میں مٹی کے تیل کے دو کنستر موجود تھے۔ چاچی نے سب پر تیل چھڑکا اور اپنے اوپر بھی ڈالا اور آگ لگا لی۔ آگ کے شعلے بھڑکے تو چاچا نیچے بھاگا۔ اس کی بندوق میں صرف ایک کارتوس رہ گیا تھا۔ دیرندر دیوار پھاند کر برابر والے مکان کی چھت پر چلا گیا اور اس پر جھکے ہوئے ایک پیڑ پر چڑھ کر شاخوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ چاچا کے گھر سے گوشت کے جلنے کی تیز بو ابھر رہی تھی۔ بلوائی لوٹ مار کرنے کے بعد چلے گئے تو رات کے اندھیرے میں وہ درخت سے اتر کر گھر میں گیا دیکھا ساری زنانیاں جل کر مر چکیں تھیں۔ ان کی لاشوں کے نزدیک ہی چاچا خون میں ڈوبا ہوا پڑا تھا۔ اس نے گولی چلا کر خودکشی کر لی تھی۔"

"دیرندر وہاں سے کیسے نکلا؟" رحیم داد نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"وہ سویرا ہونے سے پہلے نکل کر اپنے پتا کے ایک دوست سردار جسونت سنگھ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اپنے ٹبّر کے ساتھ سرحد پار جانے والے تھے۔ انہوں نے ایک ٹرک کا بندوبست

بھی کر لیا تھا۔" جمیلہ مدّھم لہجے میں بتاتی رہی "دیرندر بھی ان کے ٹبّر کے ساتھ ٹرک میں بیٹھ گیا سردار جسونت سنگھ کے ساتھ اُس کے دو پُتر بھی تھے۔ ان کے علاوہ گھروالی تھی۔ جوان بہو بیٹیاں تھیں۔ رات کا اندھیرا ہوتے ہی ٹرک روانہ ہوا۔ دیپال پور ہی کے رستے سے گزرا تھا۔"

"دیرندر تیرے گھر نہیں پہنچا۔ تو بھی تو ان دنوں دیپال پور میں تھی؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"اس نے کوشش تو کی تھی۔ پر ڈرائیور تیار نہ ہوا۔ میرا گھر رستے سے تین میل دور تھا۔ ادھر گڑبڑ بھی بہت تھی۔ فیر دیرندر کو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ میں دیپال پور ہی میں ہوں۔ ان دنوں کچھ پتہ نہ تھا کہ کون کہاں ہے۔" جمیلہ نے رحیم داد کو بتایا "ٹرک دیپال پور سے گزرتا ہوا چک بیدی کے رستے حویلی روڈ پر بڑھا۔ یہی سڑک سرحد پار جاتی تھی۔ پر نانک پورہ سے آگے درختوں کو کاٹ کر سڑک پر رکاوٹ کھڑی کردی گئی تھی۔ اس سمے ڈرائیور آرام کر رہا تھا اور ٹرک سردار جسونت سنگھ کا پُتر چلا رہا تھا۔ اس نے سڑک پر دور سے رکاوٹ دیکھ لی۔ جھٹ ٹرک کو کچے راستے پر ڈال دیا پر چند ہی میل جانے کے بعد پٹرول ختم ہو گیا۔ سب نے دھکا لگا کر ٹرک ایک جھنگڑ میں چھپا کر کھڑا کر دیا۔ پروگرام یہ تھا کہ دن جھنگڑ میں گزار کر رات کو پیدل سفر کیا جائے۔ دن ٹھیک ٹھاک گزر گیا۔ شام ہوئی تو آگے جانے کے لیے اندھیرا ہونے کا انتظار ہونے لگا۔ نہ جانے کدھر سے ایک بوڑھا مسلمان اپنی مجھ ہنکاتا ہوا اُدھر سے گزرا۔ اس نے سب کو دیکھا تو مجھ چھوڑ کر بھاگا۔ اس کا پنڈ نزدیک ہی تھا اس نے نہ صرف اپنے پنڈ بلکہ آس پاس جتنے بھی پنڈ تھے، سب کو خبر کر دی۔ اندھیرا بڑھنے کے ساتھ دور سے شور سنائی دینے لگا۔ مشعلوں کی روشنی بھی دکھائی دی۔ بلوائی حملہ کرنے کے لیے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔"

"سردار اور اس کے پُتروں کے پاس کوئی ہتیار شتیار نہیں تھا؟"

"دیرندر بتاتا تھا ان کے پاس ریوالور کے علاوہ ایک تھری ناٹ تھری رائفل اور ایک سٹین گن بھی تھی؟"

"تب تو ان کے پاس اتنا اسلحہ تھا کہ بلوائیوں کو بھگایا جا سکتا تھا۔" رحیم داد نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"پر بلوائی بہت زیادہ تھے۔ ان کے پاس بھی اسلحہ تھا،" جمیلہ نے کہا۔" وہ ہوائی فیر چھوڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ سردار جسونت سنگھ کے دونوں پُتر رائفل اور سٹین گن کے ساتھ مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے۔ ادھر سردار جسونت سنگھ نے اپنے ٹبّر کی زنانیوں کو تین لائنوں میں پاس پاس بٹھا دیا۔ ہر ایک کی آنکھ پر اس کی اُوڑھنی سے پٹی باندھ دی۔ سردار کی ایک نوہ اپنے ننھے کاکے کو چھاتی سے لگاکر دودھ پلانے لگی۔ بیچ میں وڈّی سردارنی تھی۔ اس کے دائیں بائیں جوان کڑیاں تھیں۔ تینوں آگے کی لائن میں تھیں۔ ان کے پیچھے پُتروں کی گھر والیاں، اور پوتیاں تھیں۔ سردار جی نے ہولسٹر سے بھرا ہوا ریوالور نکالا اور گورو گرنتھ صاحب کے وار ملہار اشلوک کے ان شبدوں کا اونچی آواز سے جاپ شروع کر دیا۔

چلمل بسیار دنیا پھائی

کالوبے اکل من گور نہ مانی

من کمین کمترین تو دریاؤ کھدایا

ایک چیج مجھے دے اور جہر چیج نہ بھایا

سردار جی کی زبان پر گورو گرنتھ صاحب کا جاپ تھا اور آنکھوں سے آنسو ٹپکتے تھے۔"

رحیم داد نے جمیلہ کی بات کاٹ کر کہا۔" زمیں دارنی تجھے گورو گرنتھ صاحب کے شبد کیسے یاد رہ گئے؟" اس کے لہجے میں حیرت کا عنصر نمایاں تھا۔

"میں بچپن میں خالصہ سکول میں پڑھتی تھی۔ وہاں گورو گرنتھ صاحب کے اشلوکوں کا ہر صبح جاپ کرایا جاتا تھا۔ مجھے ان اشلوکوں کے اب تک بہت شبد یاد ہیں۔" جمیلہ نے وضاحت کی۔

"میں نے تو یہ بات ایسے ہی پوچھ لی تھی۔ تو سردار جسونت کے بارے میں بتا رہی تھی اس کا کیا بنا؟"

"میں بتا رہی تھی، سردار جی گورو گرنتھ صاحب کے شبدوں کا جاپ کر رہے تھے۔ ریوالور ان کے ہاتھ میں تھا اور سامنے زمین پر ان کے گھر کی مہلائیں تین لائنوں میں زمین پر بیٹھی تھیں۔ بلوائیوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ نزدیک ہوتا جا رہا تھا۔"

"سردار نے یہ سب کیوں کیا تھا؟" رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔

"سیدھی سی گل ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے گھر کی زنانیوں اور کڑیوں کو بلوائی اٹھا کر لے جائیں۔ ان کی عزت آبرو لوٹیں۔" جمیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ "پر بلوائیوں کا شور جب بالکل نزدیک آگیا اور روشنی درختوں کی اوٹ سے صاف نظر آنے لگی تو سردار جسونت سنگھ نے ریوالور دیرندر کے ہاتھ میں دے دیا۔ جیب سے سفید رومال نکالا اور دیرندر سے کہا۔ میں رومال ہلا کر تین تک گنتی گنوں گا۔ جب میں تین کہوں تو ریوالور سے سامنے بیٹھی ہوئی زنانیوں پر گولیاں چلنی شروع ہو جائیں۔"

"یہ کام تو سردار خود بھی کر سکتا تھا؟"

"کر تو سکتا تھا پر اس لیے کرنا نہ چاہتا تھا کہ آخری سمے شاید اس سے گولی نہ چلائی جائے کوئی بھی اتنا کٹھور نہیں ہو سکتا کہ اپنے ہی بال بچوں کو اپنے ہی ہاتھوں قتل کر دے۔ سردار اسی لیے یہ کام دیرندر سے کرانا چاہتا تھا۔ شور بہت نزدیک آگیا تو سردار جی نے رومال ہلا کر ایک کہا۔ ذرا دیر بعد دوسری بار رومال ہلایا اور دو کہا۔ اس نے رومال ہلانے کے لیے تیسری بار ہاتھ اٹھایا تو دور سڑک پر تیز روشنی ابھری۔"

"یہ بھی مشالوں کی روشنی تھی؟"

"نہیں، ٹرک کی روشنی تھی اور تیزی سے نزدیک آتی جا رہی تھی۔ دیرندر نے روشنی دیکھی تو مدد کے لیے اس طرف بڑھا۔ سردار جی نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ اونچی آواز سے کہا۔ اگر وہ مسلے ہوئے تو کیا ہوگا؟ پر دیرندر نہ رکا۔ اس نے سردار جسونت سنگھ کو سمجھایا۔ بلوائی بھی تو مسلے ہی ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ آنے والے ہندو یا سکھ ہوں۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا سڑک پر پہنچ گیا۔ دیکھا سامنے سے ایک ٹرک آ رہا ہے۔ دیرندر نے ہاتھ ہلا کر اسے روکا۔ ٹرک رک گیا۔"

"اس میں کون سوار تھا؟" رحیم داد نے سراپا استعجاب بن کر دریافت کیا۔

"وہ مسلمان فوجی تھے۔"

"اچھا!" رحیم داد حیرت سے چونک کر بولا۔ "تب تو بہت مشکل پڑی ہوگی۔"

"کوئی مشکل پڑی نہ کٹھنائی۔" جمیلہ نے نرم لہجے میں کہا۔ "دیریندر نے ان کی منّت کی۔ وہ نیک اور بھلے بندے تھے۔ فوراً مدد کرنے پر تیار ہو گئے۔ انہوں نے دیریندر کے ساتھ سردار جسونت سنگھ کے پورے ٹبّر کو اپنے فوجی ٹرک میں بٹھالیا۔ بلوائی شور مچاتے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ پر جب انہوں نے فوجیوں کو برین گنیں اور رائیفلیں سنبھالے دیکھا تو لوٹ گئے۔ فوجیوں نے دیریندر اور جسونت سنگھ کے بال بچوں کو آرام سے سرحد پار پہنچا دیا۔"

"یہ تو نے عجب گل سنائی۔" رحیم داد نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "دیریندر سرحد پار جا کر کیا کرتا رہا؟"

"بتاتا تھا، اس نے آگرہ جا کر میڈیکل کالج میں کسی نہ کسی طرح اپنی پڑھائی پوری کی اور ڈاکٹر بن گیا۔ اس کا سنسار میں کوئی نہ رہا تھا۔ سب مارے جا چکے تھے۔ وہ اکیلا بچا تھا۔ وہ غریبوں اور ضرورت مندوں کے مفت علاج کے لیے ایک ہسپتال بنانا چاہتا تھا۔ اُس کی آشا تھی کہ اس نیک کام میں، میں اس کی سہائتا کروں۔ دونوں مل جل کر اسپتال چلائیں۔"

"تو نے اس کی گل سن کر کیا جواب دیا؟"

"میں چپ بیٹھی رہی۔ وہ بولتا رہا۔ میں سنتی رہی۔ سر جھکائے پاس لیٹی ہوئی نینا کو ہولے ہولے تھپکتی رہی۔" جمیلہ نے بتایا۔ "دیریندر نہ جانے اور کیا کیا کہتا۔ اچانک کمرے کے باہر چاپ ابھری۔ میں نے پریشان ہو کر دروازے کی اُور دیکھا۔ اللہ وسایا کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے دیریندر کو میرے برابر بستر پر بیٹھے ہوئے دیکھا تو ٹھٹک کر دہلیز پر ٹھیر گیا۔"

رحیم داد نے کہا۔ "اللہ وسایا اُسے تیرے ساتھ اس طرح بیٹھے دیکھ کر غصّے سے پاگل ہو گیا ہو گا۔" اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

"نہیں، وہ چپ کر کے کھڑا ہم دونوں کو دیکھتا رہا۔" جمیلہ نے نہایت اطمینان سے بتایا۔ "ذرا دیر چپ رہنے کے بعد اس نے دیریندر کی اُور ہاتھ اٹھا کر پوچھا۔ یہ کون ہے، کس لیے آیا ہے؟ تیرا بھائی بھی نہیں لگتا۔ میں تو خاموش بیٹھی رہی پر دیریندر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا میرا نام ڈاکٹر دیریندر ناتھ کھنّہ ہے۔ میرا اس کا کیا ناتا ہے؟ یوں سمجھ لے، میں اس کا منگیتر ہوں

اور اسے لینے آیا ہوں۔ یہ کہتے کہتے اس نے جھٹ کندھے سے سٹین گن اتاری۔ اسے اللہ وسایا کی سمت تان کر بولا۔ میں اسے آج اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میرا رستہ کوئی نہیں روک سکتا۔ اللہ وسایا تو مرنا نہیں چاہتا تو میرے رستے سے ہٹ جا۔ اس کی آنکھیں غصے سے لال ہو رہی تھیں۔"

"اللہ وسایا تو نہتا تھا۔ ڈر کر اس کے سامنے سے ہٹ گیا ہوگا۔" رحیم داد نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"نہیں! وہ بالکل نہیں ڈرا۔ اسی طرح دیر ندر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔ وہ بہت نڈر اور حوصلے والا تھا۔" جمیلہ فخر سے گردن اونچی کرتے ہوئے بولی۔ "کچھ دیر تو وہ چپ رہا پھر اس نے میری اور ہاتھ اٹھا کر دیر ندر سے کہا۔ یہ تیرے ساتھ جانا چاہتی ہے تو خوشی سے جا سکتی ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے میں نے کبھی اس کا رستہ نہیں روکا اور اگر یہ نہیں جانا چاہتی تو ڈاکٹر دیر ندر تو اسے صرف میری لاش کے اوپر سے گزر کر ہی لے جا سکتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ دیر ندر کی سٹین گن کی نالی ایک ہاتھ سے کھسکا کر بولا۔ اسے ہٹا۔ اس نے مڑ کر میری اور دیکھا۔ پوچھا۔ جمیلہ تو کیا کہتی ہے؟ وہ تن کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔"

"تو نے کیا جواب دیا؟ اللہ وسایا نے تجھے کڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔"

"تو نے ٹھیک ہی سوچا۔" جمیلہ بولی۔ "مجھے سمجھ نہیں آئی، میں کیا کہوں۔ میں خاموش بیٹھی رہی پر دیر ندر خاموش نہ رہا۔ کہنے لگا۔ اس نے کیا کہنا ہے۔ یہ میرے ساتھ جائے گی۔ یہ کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھایا اور میرا بازو مضبوطی سے تھام لیا تب اللہ وسایا نے اسے گھور کر دیکھا۔ غصے سے بولا۔ ڈاکٹر اس کا بازو چھوڑ دے۔ تو اسے اس طرح یہاں سے نہیں لے جا سکتا۔ اللہ وسایا اس سمے بالکل سٹین گن کی نالی کے سامنے کھڑا تھا۔"

"دیر ندر نے تیرا بازو چھوڑ دیا؟"

"نہیں! اس نے میرا بازو اسی طرح پکڑے رکھا۔" جمیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ "اس نے اللہ وسایا کی اور دیکھا نہیں۔ میرا بازو ہولے ہولے جھنجوڑ کر بولا۔ تو نے میرے ساتھ چلنا ہے؟ صاف صاف بتا دے۔ مجھے پورا وشواس ہے تو انکار نہیں کر سکتی۔ اس کی آواز میں منت تھی۔

آنکھوں میں جیسے آنسو جھلملا رہے تھے۔ میں الجھن میں پڑ گئی۔ ایسا لگا کہ میں جمیلہ سے پھر پاروتی بن گئی ہوں۔ بھولے بسرے سپنے جاگ اٹھے تھے اور ان سپنوں میں بسنے والا دیر ندر میرے سامنے کھڑا تھا۔ ہاں وہی تھا۔ وہی اُلجھے ہوئے بال، وہی سنہری چشمے کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی موٹی موٹی کالی آنکھیں۔ وہ سرحد پار سے مجھے لینے آیا تھا" جمیلہ خود فراموشی کے عالم میں ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی "میں بالکل چپ تھی۔ کھوئی کھوئی بیٹھی رہی"

"اللہ وسایا بھی چپ کر کے کھڑا رہا۔ وہ کچھ نہ بولا؟"

"نہیں اُس نے اونچی آواز سے کہا تھا۔ بول، بولتی کیوں نہیں؟ تیں نوں اس کے ساتھ جانا ہے؟ اس کی آواز سے نینا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے رونا شروع کر دیا۔ نینا کو روتا دیکھ کر میں چونک پڑی۔ مڑ کر نینا کو دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے یاد آگیا کہ میں پاروتی نہیں جمیلہ ہوں۔ اللہ وسایا کی گھروالی اور اس کی دھی، نینا کی ماں ہوں۔ میں بے کل ہو گئی۔ تڑپ کر میں نے نینا کو اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی" جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری "میں نے آنسو بہاتے ہوئے دیر ندر کی اُور دیکھا۔ اس سے کہا۔ ڈاکٹر دیر ندر تو جس پاروتی کو لینے آیا تھا وہ تو کب کی مر چکی ہے۔ میں جمیلہ ہوں اور جمیلہ تیرے ساتھ نہیں جا سکتی۔ تو جا۔ میرا تیرا کوئی سمبندھ نہیں"

"تیری یہ بات سن کر دیر ندر کیا بولا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"وہ اپنی بات پر اڑا رہا" جمیلہ نے جواب دیا "اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ کہنے لگا تو جمیلہ ہو یا شمیلہ، میرے لیے تو پارو ہی ہے۔ میں آج یہ طے کر کے آیا ہوں کہ اکیلا واپس نہیں جاؤں گا۔ تجھے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ اس نے سٹین گن کی نالی کا رخ اللہ وسایا کی اُور کر دیا اور میری طرف مڑ کر تیزی سے بولا۔ میں نے یہ سوچ کر ہی سرحد پار کی تھی کہ تجھے اپنے ساتھ لے کر ہی لوٹوں گا۔ جو میرا رستہ روکے گا اُسے ختم کر دوں گا یا خود ختم ہو جاؤں گا۔ میں آج سر دھڑ کی بازی لگانے آیا ہوں۔ بول تجھے کیا کہنا ہے۔ اس کی آواز کپکپا رہی تھی"

"تو نے کیا کیا؟" رحیم داد نے دریافت کیا "تو ڈر گئی ہوگی۔ دیر ندر تو صاف صاف کہہ چکا تھا کہ وہ تیرے بنا نہیں جائے گا"

"میں بالکل نہیں ڈری۔ میں نے بھی اسے صاف صاف کہہ دیا: تیری پارو مرگئی۔ وہ زندہ نہیں ہوسکتی۔ میں اب صرف جمیلہ ہوں۔ توجمیلہ کو کتل کرکے اس کی لاش اپنے ساتھ لے جا۔ میں زندہ تیرے ساتھ نہیں جاسکتی۔ ہرگز نہیں جاسکتی۔ یہ کہہ کر میں نینا کو چھاتی سے لگاکر رونے لگی۔ دیرندر خاموش کھڑا رہا۔"

"تیری گل سن کر تو اسے چلا جانا چاہیے تھا۔" رحیم داد نے تبصرہ کیا۔

"نہیں۔" جمیلہ نے بتایا۔" اس نے درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا۔ ایک بار فیر سوچ لے۔ میں دوبارہ کبھی نہیں آؤں گا۔ وہ ٹکٹکی باندھے مجھے تکتا رہا۔" جمیلہ نے لمبی سانس بھری۔" میں نے سسکیاں بھرتے ہوئے اسے کہا میں چاہتی بھی یہی ہوں کہ تو دوبارہ یہاں نہ آئے۔ اس کے بعد وہ کچھ نہ بولا۔ سٹین گن کندھے پر لٹکائی اور میری اور دیکھے بنا دروازے کی طرف بڑھا۔ اللہ وسایا بھی اس کے ساتھ ہی مڑا۔ آگے بڑھا۔ دونوں چپ چاپ کمرے سے باہر چلے گئے۔"

"تو نے اللہ وسایا کو اس کے ساتھ جانے دیا۔ روکا کیوں نہیں؟"

"میرا جی تو یہی چاہتا تھا کہ اللہ وسایا کو اس کے ساتھ جانے نہ دوں پر مجھ سے یہ بات کہی نہ گئی۔ ہونٹوں میں جیسے تالا لگ گیا۔ میں نینا کو چھاتی سے چمٹائے خاموش بیٹھی روتی رہی۔" جمیلہ نے بتایا۔" اللہ وسایا دیر تک نہ لوٹا۔ میں اس کا انتظار کرتی رہی۔ وہ صبح تک نہ آیا۔"

"اللہ وسایا کہاں چلا گیا تھا؟"

"وہ دیرندر کے ساتھ سرحدی پنڈ شامار کے گیا تھا۔ دوپہر کو واپس آیا تو بہت تھکا ہوا اور اداس تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ دیرندر جیپ میں بیٹھ کر یہاں آیا تھا۔ اس کے ساتھ دو سمگلر تھے۔ وہ بھی پوری طرح مسلح تھے۔ دیرندر اصرار کرکے اللہ وسایا کو اپنے ساتھ سرحد تک لے گیا تھا۔"

"اور اللہ وسایا اس کے ساتھ چلا بھی گیا۔" رحیم داد حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔" اسے دیرندر اور اس کے ساتھ آنے والے مسلح سمگلروں سے ڈر بھی نہ لگا۔"

"وہ ڈرنے والا بندہ نہیں تھا۔ سدا کا نڈر اور جیالا تھا۔" جمیلہ نے اپنے لہجے میں زور

پیدا کرتے ہوئے کہا" تب ہی تو وہ بے دھڑک دیر ندر کے ساتھ جیپ میں بیٹھ کر چلا گیا۔ رات انہوں نے شمار کر کے ہیں گزاری۔ سویرے بہت تڑکے پہلے دیر ندر اٹھا۔ وہ رات بھر سویا نہیں تھا۔ اس نے اللہ وسایا کو جگایا اور اس کے ساتھ ستلج کی اور چلا" جمیلہ نے رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر اسے مخاطب کیا" چوہدری! تجھے پتہ ہے ستلج پار فیروز پور کی سرحد لگتی ہے۔ اور فیروز پور اب ہندوستان میں ہے" جمیلہ نے لمحہ بھر خاموش رہ کر ٹھنڈی سانس بھری" جب دونوں ستلج پر پہنچے تو دیر ندر نے اللہ وسایا کو گرم جوشی کے ساتھ گلے لگا لیا۔ اس کے ماتھے کو چوما اور چپ چاپ آگے بڑھ گیا"

"سرحد پار چلا گیا ہوگا؟" رحیم داد نے بے چین ہو کر استفسار کیا۔

"نہیں" جمیلہ بولی" وہ ستلج کے اس پار نہ گیا۔ اور جہاں دونوں ملکوں کی سرحدیں ملتی تھیں وہاں ٹھہر گیا۔ اس نے اچانک کندھے پر لٹکی ہوئی سٹین گن اتاری اور کنپٹی پر رکھ کر چلا دی"

"تب تو وہ مر گیا ہوگا؟" رحیم داد کے لہجے میں کپکپاہٹ تھی۔

"ہاں! اسی سمے اس کی مرتی ہو گئی۔ اس کی لاش سرحد کے بیچوں بیچ پڑی تھی۔ ادھر پاکستان تھا اُدھر ہندوستان" جمیلہ نے آہستہ سے کہا۔ اس کی آواز میں درد کی کسک تھی" مرنے سے پہلے اس نے اللہ وسایا کو سونے کی ایک انگوٹھی دی۔ اسے بتایا کہ وہ انگوٹھی، کڑمائی پر مجھے پہنانا چاہتا تھا پر وہ دن ہی نہ آیا کہ کڑمائی ہوتی اور وہ اپنی منگ کے طور پر مجھے انگوٹھی پہناتا۔ اس کی آشا تھی کہ میں اس کی نشانی سمجھ کر اسے پہن لوں۔ دیر ندر اس رات مجھے لینے اور کڑمائی کی انگوٹھی پہنانے ہی کے لیے آیا تھا"

"اس انگوٹھی کا کیا بنا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"یہ رہی وہ انگوٹھی" جمیلہ نے اپنا ہاتھ رحیم داد کے سامنے کر دیا۔ اس کی ایک انگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی۔ جس میں جڑا ہوا ہیرے کا سرخ نگینہ جھلملا رہا تھا" میں نے انگوٹھی اسی سمے پہن لی تھی۔ اور آج تک نہیں اتاری"

"اللہ وسایا نے اس کا برا نہ منایا؟"

"نہیں!" جمیلہ نے آہستہ آہستہ انکار میں گردن ہلائی۔" انگوٹھی اس نے خود اپنے ہاتھ سے پہنائی تھی۔ اس سمے اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ رہے تھے۔ انگوٹھی پہنا کر وہ رونے لگا تھا۔"

"اللہ وسایا بھی عجب بندہ تھا۔"

"ہاں! وہ بہت عجب بندہ تھا۔" جمیلہ کے لہجے میں دکھ کی چبھن تھی۔" اُسے تو یہ بھی پتہ تھا کہ میں ڈسپنسری، ڈاکٹر دیر بندر سی کی یادگار کے طور پر بنانا چاہتی ہوں۔ میں نے اسے جب اپنی اس آشا سے آگاہ کیا تو اس نے ذرا بھی بُرا نہ منایا۔ صرف مسکرا کر رہ گیا۔ چوہدری! سچ پوچھ تو دیر بندر کی موت پر اللہ وسایا بھی نراش اور دکھی تھا۔ بار بار کہتا تھا، تو اس کے ساتھ چلی جاتی تو وہ کبھی خودکشی نہ کرتا۔"

"اللہ وسایا ٹھیک ہی تو کہتا تھا۔ تو چلی جاتی تو وہ یوں جان نہ دیتا۔"

"پر میں اس کے ساتھ کیسے جاسکتی تھی۔" جمیلہ نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔" میں دیر بندر کے ساتھ سرحد پار چلی جاتی تو زمیں داری اللہ وسایا کے ہاتھ سے نکل جاتی۔ وہ زمیں دار سے فیر مزارع بن جاتا۔ جانے کیا ہوتا۔ میری نینا کا کیا بنتا۔ پتہ نہیں ادھر والے اس کے ساتھ کیسا سلوک کرتے۔ ایک نہیں، کتنی باتیں تھیں جو زنجیر بن کر میرے پیروں سے چمٹ گئی تھیں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔" اللہ وسایا کو چھوڑ کر دیر بندر کے ساتھ جانا آسان نہ تھا۔ میرے تو بھاگ اچھے تھے کہ مجھے اللہ وسایا کے روپ میں ایک نیک بندہ مل گیا تھا۔ اس کا من بہت اُجلا تھا۔ وہ بہت اچھا تھا۔"

رحیم داد نے جمیلہ سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔" پر زمیں داری تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔"

"میں اکیلی اس ظلم اور اپرادھ کا نشانہ نہیں بنی۔" جمیلہ نے غم زدہ لہجے میں کہا۔ "تجھے بھی اچھی طرح پتہ ہے، اِدھر اور اُدھر اور دونوں طرف لاکھوں ٹٹیاریں اور زنانیاں اُٹھائی گئیں اور اپنا سب کچھ لٹا کر مغویہ کہلائیں۔ میری طرح انہوں نے بھی آئندہ کے لیے جانے کیسے کیسے سہانے سپنے دیکھے ہوں گے۔ ان میں خوشیاں تھیں۔ چمکتی دمکتی آشائیں تھیں۔ زندہ رہنے

اور سندر جیون بتانے کی اُمنگیں تھیں۔" اس کا لہجہ اور غم زدہ ہو گیا۔" پھر ایک روز اچانک سب کچھ ملیامیٹ ہو گیا۔ جیون ڈراؤنا سپنا بن گیا۔ تجھے کیا پتہ ان پر کیا کیا نہ بیتی اور اب تک بیت رہی ہے۔"

رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری مگر خاموش رہا۔

☆

آسمان پر گہرا ابر چھایا تھا۔ ہوا تیز نہ تھی مگر بوندا باندی کا سلسلہ جاری تھا۔ حویلی پر سناٹا چھایا تھا۔ کمرے میں رحیم داد اور جمیلہ صوفوں پر بیٹھے تھے۔ دونوں خاموش تھے اور دل گرفتہ نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر دکھ کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ رحیم داد زیادہ دیر خاموش نہ رہا۔ بجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

" زمیں دار نی تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ فسادات میں زنانیوں کے ساتھ بہت ہی ظلم ہوا۔"

" نہ پوچھ، کیا کیا ظلم نہیں ہوا۔" جمیلہ نے تڑپ کر کہا۔" کالج میں میری ایک کلاس فیلو ہوتی تھی۔ اس کا نام چترا کپور تھا۔ لگتی بھی سندر چتر کی طرح تھی۔ اُسے اپنی سندرتا پر مان بھی تھا۔ تھی بھی چتر کار۔ میں نے اس کی بنائی ہوئی کئی پینٹنگز دیکھیں۔ اچھی خاصی سندر تصویریں بنا لیتی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں پتلی پتلی تھیں اور لمبی لمبی۔ بہت کومل اور بہت سوہنی تھی۔ میرے ساتھ اس کی بہت اچھی دوستی تھی۔ وہ بی۔ اے کرنے کے بعد پینٹنگ سیکھنے بمبئی جانا چاہتی تھی۔ جے۔ جے سکول آف آرٹس میں داخلہ لینے کا ارادہ تھا۔ اسے پینٹنگ سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا۔ ویسے بھی بات چیت، کپڑے لتے، رہن سہن، ہر انداز سے آرٹسٹ لگتی تھی۔"

" کسی اچھے ہی گھر کی لڑکی ہوگی؟"

" ہاں!" جمیلہ نے بتایا۔" اس کا پتا انجینئر ہوتا تھا۔ بس اس کے پتا سے کئی بار ملی بھی تھی۔ اس میں ذرا بھی اکڑ فوں نہ تھی۔ پر چترا میں ایسی اکڑ تھی کہ سب اُسے گھمنڈی کہتے تھے۔ پیار بھی بہت کرتے تھے۔ اس میں بات ہی ایسی تھی۔ بادام کی سی لمبی کالی کالی آنکھیں۔ اور رنگت ایسی

اجلی جیسے صبح کی ہنستی ہوئی دھوپ۔ جب وہ اپنی سوہنی گردن، راج ہنس کی طرح اٹھانے، ماتھے پر بکھری ہوئی بالوں کی لٹوں کو بار بار جھٹکتی ہوئی گزرتی تو دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے۔ مجھے اب تک یاد ہے ان دنوں وہ کتنی سوہنی اور شاندار لگتی تھی۔"

"پر اس کا بنا کیا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"یہ نہ پوچھ چوہدری۔" جمیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "دو اڑھائی برس اُدھر کی گل ہے میں پڑوس کے ایک زمیں دار کے پُتر کی جنج کے ساتھ پکھیالہ گئی۔ اللہ وسایا، بینا اور گڈو بھی ساتھ تھے۔ جنج کئی روز پکھیالہ میں ٹھہری ستمبر کا مہینہ تھا۔ موسم بہت خوش گوار تھا۔ ورکھا ختم ہو چکی تھی۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ خریف کی فصلیں سمجھو تیار ہی کھڑی تھیں۔ کپاس کے کھیتوں میں سفید سفید تو نبے پھوٹنے لگے تھے۔ ایک روز میں بینا کی انگلی تھامے ٹہلتی ہوئی پنڈ کی ایک گلی میں چلی گئی۔"

"یہ پکھیالہ کہاں ہوا جی؟"

"پکھیالہ، ضلع شیخوپورہ کی تحصیل فیروز والا میں ہے۔ اچھا وڈا موضع ہے۔" جمیلہ نے بتایا۔ "ہاں، تو میں کہہ رہی تھی۔ گلی سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا ایک زنانی دونوں ہاتھوں میں گوبر اٹھا اٹھا کر دیوار پر پاتھیاں تھُپ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ سدھے ہوئے تھے اور تیز تیز چل رہے تھے۔ دیوار پر تھپ تھپ پاتھیاں بنتی جا رہی تھیں۔ گوبر کے ڈھیر کے پاس دو گندے اور مریل سے بالک بیٹھے تھے۔ ان کے کپڑے میلے کچیلے تھے۔ وہ ٹانگوں سے بالکل ننگے تھے۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ لمحہ بھر کے لیے رکی۔ "مجھے ایسا لگا جیسے میں نے اُسے کہیں دیکھا ہے۔ اس میں مجھے چنترا کی جھلک نظر آئی۔ پر مجھے اپنی آنکھوں پر وشواس نہ آیا۔ اسے اچنبھے سے دیکھتی دھیرے دھیرے آگے بڑھی۔ وہ بالکل بے خبر، اپنی دھن میں مگن پاتھیوں کی تھپائی میں لگی تھی۔"

"دیکھنے میں کیسی نظر آتی تھی؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"وہ بالکل بدل چکی تھی۔" جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اس کے گندے اور الجھے ہوئے بال بار بار بکھر کر منہ پر پھیل جاتے اور وہ ہاتھوں کو چلاتے ہوئے بار بار ایک خاص انداز سے گردن جھٹک کر بالوں کو پیچھے لے جاتی۔ یہ انداز چنترا کپور ہی کا تھا۔ میں اس کے نزدیک پہنچ گئی۔ غور

سے دیکھا تو وہ چترا ہی تھی۔ نہ اب اس کا پہلا سا رنگ روپ رہا تھا۔ نہ سندرتا ہی رہی تھی۔ کالی کالی جگ مگ جگ مگ کرتی آنکھیں بجھ کر دھندلی پڑ گئی تھیں۔ کپڑے لتے پھٹے پرانے تھے۔ ان پہ گوبر اور کیچڑ کے جگہ جگہ داغ دھبے تھے۔ اس کے بدن سے جو کبھی چنبیلی کی سندر کلیوں کی مانند لچکتا تھا، مہکتا تھا، اس سمے گوبر اور پسینے کی تیز بو کے بھبکے اُٹھتے تھے۔ صورت سے وہ اُدھیڑ اور بیمار لگتی تھی۔ میں دُکھ اور خوف سے کپکپا کے رہ گئی۔"

"کیا وہ سچ مچ چترا کپور ہی تھی؟" رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں جمیلہ سے دریافت کیا۔

"ہاں وہی تھی۔" جمیلہ نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "پر اب وہ چترا سے سکینہ بن چکی تھی۔ میں نے پاس جا کر پوچھا۔ تو چترا کپور ہے نا؟ اس نے چونک کر میری اور دیکھا۔ پر کچھ نہ بولی۔ اس کی آنکھوں میں گھڑی بھر کے لیے دیوے جگمگائے اور بجھ گئے۔ میں نے غور کیا، اس کے ہاتھوں کی لمبی لمبی اور کومل انگلیاں بھدی اور کھُردری پڑ گئی تھیں۔ اسے ان کی ذرا چنتا نہیں تھی۔ اسے تو اپنی بھی کوئی چنتا نہ تھی۔ وہ مڑی اور اس کی انگلیاں ہاتھوں کے ساتھ ساتھ تیزی سے چلنے لگیں۔ وہ برابر تھپائی کرتی رہی۔"

"اس نے تجھے پہچان لیا تھا؟"

"ہاں، اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ پر مجھ سے مل کر وہ ذرا خوش نہ ہوئی۔ اس کے اجڑے ہوئے چہرے پر بکھری ہوئی جھنجلاہٹ اور کڑھن صاف نظر آ رہی تھی۔ ہونٹ اس طرح سکڑ گئے تھے مانو کڑوے کسیلے پڑ گئے ہوں۔ وہ پیٹھ موڑے جھک جھک کر گوبر اٹھا رہی تھی۔"

"تو نے اس سے گل بات نہیں کی؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"کی تھی۔" جمیلہ نے بتایا۔ "میں نے اپنی آواز میں نرمی اور مٹھاس پیدا کرتے ہوئے اس سے کہا۔ چترا رانی! میں اسے پیار سے چترا رانی ہی کہتی تھی۔ وہ تب بھی خوش نہ ہوئی۔ بگڑ کر بولی۔ کون چترا، کیسی چترا؟ میں کسی چترا شترا کو نہیں جانتی۔ میرا نام سکینہ ہے۔ میں نے اس کے ناراض ہونے کا ذرا برا نہ منایا۔ خاموش کھڑی رہی۔"

"بس اتنی ہی اس سے گل بات ہوئی؟"

"نہیں! میں نے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد آہستہ سے پوچھا۔ یہ تجھے کیا ہو گیا۔ تیری اندر کی آرٹسٹ اور اس کا آرٹ کہاں چلا گیا؟" اس نے میری طرف دیکھے بنا گوبر کی تھاپی دیوار پر مارتے ہوئے جواب دیا۔ یہ آرٹ دیکھ رہی ہے۔ اس نے دیوار پر تھپی ہو پاتھیوں کی سمت اشارہ کیا۔ یہ بھی تو آرٹ ہی ہے نا۔ دیوار کو کینوس سمجھ لے۔ اور پاتھیوں کو گل بوٹے۔ دیکھ کیسا شاندار لینڈ سکیپ بن گیا۔ وہ پلٹی، مجھے تیز اور تیکھی نگاہوں سے دیکھا۔ اور گوبر کے ڈھیر کے پاس بیٹھے ہوئے بالکوں کی اور ایک ہاتھ اٹھایا اور یہ میرے آرٹ کے زندہ شاہکار ہیں۔ وہ ٹھٹھا مار کر پاگلوں کی طرح ہنسی۔ تجھے میرا یہ آرٹ پسند آیا؟ اس نے گوبر پر تیزی سے ہاتھ مارا۔ گوبر کے ڈھیر پر بیٹھی ہوئی مکھیاں اڑیں اور بھنبھناتی ہوئی اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔ میں ہاتھ ہلا کر انہیں منہ پر سے اڑانے لگی پر چنترا نے ان پر کوئی دھیان نہ دیا۔ وہ آرام سے دیوار پر پاتھیاں تھوپتی رہی۔ وہ بیمار اور مریل دکھائی دینے کے ساتھ ساتھ پگلی بھی لگ رہی تھی۔ عجیب بہکی بہکی باتیں کرتی تھی۔"

"اسے واپس لینے کوئی نہ آیا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔ "اس کا بھی کوئی نہ کوئی تو ہو گا۔"

"پتہ نہیں۔ نہ میں نے اس بارے میں اس سے پوچھا۔ نہ اس نے بتایا۔ اس کے ساتھ زیادہ بات چیت کا موقع ہی نہ ملا۔" جمیلہ نے وضاحت کی۔ "میرے پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد گھر کا دروازہ کھلا۔ اندر سے ایک بوڑھی بڑبڑاتی ہوئی نکلی اور چنترا کو چیخ چیخ کر کوسنے لگی۔"

"وہ اس سے اتنی ناراض کیوں تھی۔ کوئی تو وجہ ہو گی؟"

"وہ اس لیے اتنے غصے میں تھی کہ چنترا نے پاتھیاں تھوپنے میں دیر لگا دی تھی اور گھر والے کے لیے کھیت پر بھتا نہ پہنچا سکی تھی۔" جمیلہ نے بتایا۔ "بوڑھی اصل میں چنترا کی ساس تھی۔ بہت کڑوی اور کٹھور لگتی تھی۔"

"چنترا نے اس کے رولا گولا کرنے پر کچھ نہ کہا؟"

"نہیں، وہ خاموشی سے دیوار پر پاتھیاں تھوپتی رہی۔ اس کے ہاتھ اور تیزی سے چلنے لگے۔" جمیلہ نے رحیم داد سے کہا۔ "بوڑھی کھڑی چیخ ہی رہی تھی کہ گلی میں ایک ادھکڑ بندا داخل ہوا۔ اس نے چنترا کو دیکھتے ہی ننگی ننگی گالاں نکالنی شروع کر دیں۔ وہ سخت غصے میں تھا۔"

"چنترا کا گھر والا ہوگا۔" رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

"ہاں جی، وہ اس کا گھر والا ہی تھا۔ وہ گٹھے قد کا بھدا اور بے ڈول بندہ تھا۔ یہ لمبے لمبے تو اس کے دانت تھے۔ پیلے پیلے اور گندے۔" جمیلہ نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "ساس اونچی آواز سے کوستی رہی۔ چنترا ساس کے کوسنے اور گھر والے کی گالیاں آرام سے سنتی رہی۔ زبان سے کچھ نہ بولی۔ پر اس شور شرابے سے گھبرا کر اس کے دونوں بالک منہ پھاڑ کر زور زور سے رونے لگے۔ چنترا جلی ہوئی تو پہلے ہی تھی۔ بالکوں کے رونے پر اور جھلا گئی۔ تیزی سے ایک پر جھپٹی اور اس کی پٹائی شروع کر دی۔ وہ بلبلا کر زیادہ زور سے رونے لگا۔ یہ دیکھ کر چنترا کا گھر والا اور بھڑک اٹھا۔ وہ گالاں نکالتا ہوا اس کی اور تیزی سے بڑھا۔ اسے بالوں سے پکڑ کر زور سے دھکا دیا۔ وہ دور جا کر گری۔ سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ گھر والا اس کے سر پر پہنچ گیا اور لگا لاتیں اور ٹھوکریں مارنے۔ چنترا کی دھوتی پلٹ گئی۔ ٹانگیں ننگی ہو گئیں۔ تب بھی وہ چپ کر کے پڑی رہی۔ نہ روئی، نہ چیخی۔ آنکھیں کھولے گھر والے کو گھورتی رہی۔" جمیلہ نے گہری سانس بھری۔ "لگتا تھا لاج کے ساتھ ساتھ اس کے اندر کی ناری بھی مر گئی تھی۔"

"تو بھی چپ کھڑی رہی۔ کچھ نہ بولی؟" رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔

جمیلہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے گویا ہوئی۔ "اُس کا گھر والا مارتے مارتے تھک گیا۔ ہانپنے لگا اور چپ کر کے کھڑا ہو گیا۔ چنترا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے پونچھا بھی نہیں۔ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس کا گھر والا آنکھیں نکال کر چیخا۔ اٹھ اندر چل، پر نہ وہ اٹھی اور نہ ہی زبان سے کچھ کہا۔ جیسے بیٹھی تھی ویسے ہی بیٹھی رہی۔ اس بار گھر والے نے چنترا کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا۔ دروازے کی اور بڑھا۔ میں اب چپ نہ رہ سکی۔ بڑھ کر اس کے سامنے گئی۔ اسے غیرت دلائی۔ غصے سے کہا، تو نے ایک کمزور زنانی پر ایسے ظلم کرتے شرم نہیں آتی۔ تو کیسا بندہ ہے۔ اس نے پلٹ کر مجھے لال لال آنکھوں سے گھورا۔"

"تجھ پر بھی وہ ناراض ہوا ہوگا۔"

"وہ غصے سے بولا۔ "تو ہمارے بیچ میں بولنے والی کون ہوتی ہے۔ یہ میرا اور میری گھر والی کا

معاملہ ہے۔ چل اپنا رستہ پکڑ۔ وہ چنترا کو بالوں سے فیر گھسیٹنے لگا۔ میں کچھ بولنے ہی والی تھی کہ پیچھے سے آواز آئی۔ کی گل اے جمیلے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ سامنے اللہ وسایا کھڑا تھا۔ وہ مجھے ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچ گیا تھا۔ میں نے چنترا کی اور اشارہ کیا۔ یہ چنترا کپور ہے۔ میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔ فیر میں نے گھٹے کی اور ہاتھ اٹھا کر کہا۔ یہ اس کا گھر والا لگتا ہے۔ چنترا کو مارتا تھا۔ میں نے روکا تو میرے گلے پڑ گیا۔ مجھے اس سے بہت غصہ تھا۔"

"تیری باتیں سن کر اللہ وسایا کیا بولا؟" رحیم داد نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"وہ چپ رہا۔ پر چنترا کا گھر والا تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ ہاں، میں نے اسے مارا ہے۔ ابھی اور ماروں گا۔ یہ کہہ کر اس نے بالوں سے پکڑ کر چنترا کو اٹھایا اور اس کے منہ پر زور زور سے چپیڑ مارنے لگا۔ اللہ وسایا نے اسے روکا۔ بس کر۔ وہ ناراض ہو کر اللہ وسایا پر چیخا۔ اوئے تو کون ہے۔ تینوں کی لینا۔ تو تھانے دار لگا ہے۔ اس نے اور زور سے چنترا کے گال پر ایک چپیڑ مارا۔" جمیلہ کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔" اللہ وسایا ایک دم ویسا ہی بن گیا، جیسے میں نے برسوں پہلے اسے ولیا کے گھر میں دیکھا تھا۔ بہت عرصے بعد وہ مجھے اتنا غصے میں نظر آیا تھا۔ زور سے چیخا۔ بکواس بند کر۔ ساتھ ہی تیزی سے جھپٹا۔ گھٹے کی کمر پر اس زور سے لات ماری کہ وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا پر اللہ وسایا کا غصہ کم نہ ہوا۔ وہ نزدیک پہنچا اور اسے گردن سے پکڑ کر اوپر اٹھا لیا۔ وہ اس کے ہاتھ میں جھولنے لگا۔ اس کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ منہ پھاڑ کر ہائے ہائے کرنے لگا۔"

"لگتا ہے اللہ وسایا کو بہت ہی زیادہ غصہ آ گیا تھا؟"

"ہاں، وہ بہت غصے میں تھا۔" جمیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ "چنترا پہلے تو چپ کر کے کھڑی رہی فیر گڑ گڑا کر اللہ وسایا کی منت کرنے لگی۔ اسے چھوڑ دے۔ اللہ وسایا نے اُسے چھوڑ دیا۔ چنترا بہت سہمی ہوئی تھی۔ اس کا گھر والا منہ پھاڑ کر زور زور سے سانس بھر رہا تھا اور اس کی بوڑھی ساس نے چیخ چیخ کر سارا پنڈ اکٹھا کر لیا۔ نمبردار بھی آ گیا۔"

رحیم داد نے پوچھا۔ "نمبردار کیا بولا؟"

"اس نے بھی چنترا کے گھر والے کو شرم دلائی۔ ناراض بھی ہوا۔ اللہ وسایا کو سمجھا بجھا

کر اپنی حویلی میں لے گیا۔" جمیلہ نے جواب دیا۔" رستے میں اس نے بتایا کہ چنترا کے گھر والے کا نام کرم دین ہے۔ وہ معمولی زمیں دار تھا۔ اس کے پاس رے اکلا اپنی زمین تھی۔ اس نے چنترا کو جو پہلے ہی سیکسنہ بن چکی تھی، ایک پولس کانسٹیبل کے ذریعہ چھ سو روپے میں خریدا تھا۔ وہ پہلے ایک جواری کے پاس تھی۔ وہ شیخوپورہ میں جوئے کا اڈہ چلاتا تھا۔ چرسیا بھی تھا۔ اس نے چنترا کو بھی اپنے رستے پر لگا دیا تھا۔ وہ چرس اور گانجا پینے لگی تھی۔ جواریوں کی سنگت میں کنجریوں کا سا جیون گزارتی تھی۔ فیر ایسا ہوا کہ اس کا جواری گھر والا جوا خانہ چلانے کے جرم میں پکڑا گیا۔ اُسے جیل ہوگئی۔ چنترا بالکل اکیلی رہ گئی اور ایک کانسٹیبل کے ہتھے چڑھ گئی۔ اس نے رکھیلی بنا کر اپنے پاس رکھا۔ جب اس کا جی چنترا کی طرف سے بھر گیا تو اس نے کرم دین کے ہاتھ اُسے بیچ دیا۔"

"تجھے جب وہ ملی تھی تب بھی وہ چرس پیتی تھی؟"

"مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں۔" جمیلہ نے بے نیازی سے کہا۔" نمبردار سے نہ میں نے پوچھا اور نہ ہی اس بارے میں اس نے بتایا۔ پر میرا وچار ہے ان دنوں وہ چرس شرس نہیں پیتی تھی۔ ملتی ہی نہ ہوگی۔ کرم دین ظالم اور کٹھور ہونے کے ساتھ ساتھ چنترا کی کڑی نگرانی بھی کرتا تھا۔ نمبردار ہی بتاتا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ چنترا کو بخار رہتا تھا۔ منہ سے خون آتا تھا۔ اسے ٹی۔ بی ہوگئی تھی۔"

رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ وہ چنترا کے بارے میں جمیلہ سے مزید بات چیت کرنا چاہتا تھا اسی اثناء میں احمد ٹرے میں چائے لے کر آگیا۔ چائے کے ساتھ سوجی کا گرم گرم حلوہ بھی تھا۔ احمد نے چائے کی پیالیاں اور حلوے کی پلیٹیں جمیلہ اور رحیم داد کے سامنے میز پر رکھ دیں۔

جمیلہ نے احمد سے پوچھا "نواب تک کدھر رہا؟"

"میں تو جی باہر دروازے پر دیر سے بیٹھا ہوں۔" احمد نے جواب دیا۔

جمیلہ مسکرا کر خاموش ہوگئی۔ احمد فوراً ہی واپس چلا گیا۔

رحیم داد نے حلوہ کھاتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔" زمین دارنی تو نے بہت دردناک بات سنائی ہے۔"

"ایسے تو ان گنت دردناک اور دکھ بھرے واقعات ہیں۔" جمیلہ کے لہجے میں درد

کی کسک تھی۔ ہر مغویہ اپنی جگہ ایک دکھ بھری کہانی ہے۔"

"چترا سے تیرا دوبارہ ملنا نہیں ہوا؟" رحیم داد نے پوچھا۔ ابھی تک اس کے ذہن پر چترا چھائی ہوئی تھی۔

"نہیں! وہ مجھے بعد میں کبھی نہیں ملی۔ میں دوبارہ پھیالہ نہیں گئی کسی سے اس کے بارے میں بات بھی نہیں ہوئی۔" جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "جانے اب تک زندہ بھی ہے کہ مر گئی۔"

☆

یکایک بادل زور سے گرجے۔ بارش تیز ہو گئی۔ کمرے میں خاموشی پھیلی تھی۔ دونوں ہی خاموش تھے اور اپنی اپنی جگہ سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ رحیم داد نے چائے کی پیالی ختم کی۔ کھنکار کر گلا صاف کیا۔ جھجکتے ہوئے جمیلہ سے پوچھا۔ "زمیں دارنی، تیری باتوں سے لگتا ہے تیں نوں اللہ وسایا سے پیار نہ تھا۔ تو اس سے پیار کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ حالات ہی ایسے ہو گئے تھے۔ میں نے غلط تو نہیں سوچا؟" رحیم داد نے جمیلہ کی طرف دیکھا۔ مگر وہ منہ موڑے دیوار کی سمت دیکھ رہی تھی۔

"تو نے اپنے تیئں ٹھیک ہی سوچا۔" جمیلہ نے چند لمحے خاموشی اختیار کرنے کے بعد جواب دیا۔ "اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ مجھے اللہ وسایا سے ویسا پیار نہ تھا جیسا دیر ندر سے تھا۔ یہ بات اللہ وسایا بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ پر اس نے اتنا بہت سا پیار دیا کہ اگر وہ مجھے اتنا پیار نہ دیتا تو جانے کب کی میں مر کھپ چکی ہوتی۔ اس نے اپنے پیار سے میرا من جیت لیا۔"

"اس کا نصیب بھی تو اچھا تھا کہ تیری ایسی سوہنی اور بھاگ بھری گھر والی ملی جس نے مزارع سے اسے وڈا زمیں دار بنا دیا۔" رحیم داد نے جمیلہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی۔

مگر وہ متاثر نہ ہوئی۔ بے نیازی سے بولی۔ "چوہدری! تجھے پتہ نہیں شروع شروع میں تو مجھے اپنے سے گھن آتی تھی۔ جی چاہتا تھا موت آ جائے۔ ان دنوں تو میں کئی کئی روز بے حال پڑی

رہتی۔ نہ نہاتی، نہ کپڑے بدلتی۔ نہ روٹی کھانے کو جی کرتا نہ بات کرنے کو۔ پر اللہ وسایا نے کبھی برا نہ منایا۔ جو میں نے کہا، اس نے وہی کیا۔ وہ مجھے خوش دیکھتا تو خوش ہو جاتا۔ نراش پاتا تو خود بھی نراش ہو جاتا۔"

"تو بھی تو اس کی ہر بات مانتی تھی۔ اس کے لیے تو نے اپنے بھائی اور چاچا کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے، پر اللہ وسایا نے اپنی بات منوانے کے لیے کبھی ضد نہ کی۔ زمیں دار بن کر بھی وہ کبھی زمیں دار نہ بنا۔ جیون بھر اپنے تئیں مزارع اور مجھے اپنے زمیں دار کی پتری سمجھتا رہا۔ بلکہ مجھے ہی زمین دار سمجھتا رہا۔ میں نے بہت چاہا، پر وہ زمیں دار نہ بنا۔ بہت لاڈ آتا تو مجھے زمیں دارنی کہہ کر پکارتا۔ یہی اس کا پیار تھا۔" جمیلہ کو اللہ وسایا کی خوبیاں بیان کرنے میں لذت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ روانی سے بولتی رہی۔ "ایسا پیار کرتا تھا کہ مجھے پریشان یا بیمار دیکھتا تو گھبرا جاتا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "تجھے شاید پتہ نہیں، آخری بار جب وہ مجھ سے جدا ہوا تو مجھے تیز بخار تھا۔ سرہانے بیٹھ کر دیر تک میرا سر دباتا رہا۔ فیر یہ کہہ کر چلنے کے لیے کھڑا ہو گیا، جمیلے! میں تیرے لیے ڈاکٹر بلا کر لاتا ہوں۔ میں نے روکا بھی۔ پر وہ نہ رکا۔ ایسا گیا کہ لاش ہی واپس آئی۔"

جمیلہ کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ آنکھیں چھلک پڑیں۔ رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ باہر مینہ کی بوندیں جل ترنگ بجاتی رہیں۔ ہوا چلتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ سسکیاں بھر رہی ہے۔ بادل رک رک کر گرجتے۔ بارش تیز اور تیز ہوتی گئی۔

رحیم داد نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "تو اس طرح کب تک روتی رہے گی۔" اس نے لمبی سانس بھری۔ "اللہ کی یہی مرضی تھی، جو ہونا تھا ہو گیا۔ آگے کی سوچ۔"

"کیا سوچوں۔ میرا تو مغز بھی کام نہیں کرتا۔"

رحیم داد ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔ جمیلہ سر جھکائے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ رحیم داد نے اس عالم میں اسے دیکھا تو ٹوہ لگانے کی غرض

سے دریافت کیا" کیا سوچ رہی ہے؟"

جمیلہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

رحیم داد نے چند لمحے چپ رہنے کے بعد جھجکتے ہوئے کہا" ایک بات پوچھوں بُرا تو نہیں منائے گی؟"

"تو کیا کہنا چاہتا ہے؟" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

رحیم داد نے اس کے لہجے کی کاٹ محسوس کی۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ جو کہنا چاہتا تھا کہہ نہ سکا۔ اتنی جرائت ہی نہ ہوئی۔ صرف اتنا کہا" تو نے اللہ دسایا کے قتل کے بارے میں اب تک کچھ نہیں کیا؟"

"میں کیا کر سکتی ہوں۔ حویلی کی چار دیواری سے باہر بھی نہیں نکل سکتی" جمیلہ نے اپنی مجبوری بیان کرنے کے ساتھ ساتھ شکوہ بھی کیا" پر چوہدری، تو نے اس بارے میں کیا کیا؟"

رحیم داد خفیف ہو کر صفائی پیش کرنے لگا" تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ پر تیں نوں یہ بھی پتہ ہے کہ میں تو اِدھر کسی کو جانتا بھی نہیں۔ نہ میرا کبھی کتل شتل کے کسی کیس سے کوئی واسطہ پڑا۔ وکیل جب بھی آیا میں نے اس سے گل بات کی۔ پولس دی تفتیش کے بارے میں پوچھا۔ تھانے دار کو میں بالکل نہیں جانتا۔ تیں نوں پتہ ہی ہے کبھی اس سے ملا ہی نہیں۔ تو کہہ تو وکیل کے پاس چلا جاؤں۔ اس کے ساتھ تھانے دار سے مل کر ملوم کروں کہ اس نے اب تک کیا کیا۔ کوئی گرفتاری شرفتاری بھی کی کہ نہیں؟"

"میں نے تو ویسے ہی ایک بات کہی تھی" جمیلہ نے اس کی صفائی سے متاثر ہو کر کہا" مجھے پتہ ہے تیری اِدھر کسی سے جان پہچان نہیں۔ ایسے میں تو کیا کر سکتا ہے" اس کا لہجہ دل گرفتہ ہو گیا" ویسے اب کیا بھی کیا جاسکتا ہے۔ جس تھانے دار نے کیس میں دلچسپی لی اور تفتیش کا کام آگے بڑھایا، اس کا تبادلہ کر دیا گیا۔ دوسرے نے کیس دبا دیا۔ تفتیش ختم کر دی۔ اسے لگایا ہی اس لیے گیا تھا"

"وکیل نے مجھے یہ باتیں بتائی تھیں۔ وہ بھی پریشان تھا" رحیم داد نے دبی زبان سے

کہا " وہ بتاتا تھا کہ تفتیش کے لیے جو نیا تھانے دار لگایا گیا ہے، اس نے قتل کا الزام تیرے بھائیوں اور شریکوں پر لگایا ہے۔"

"تفتیش ختم کرنے اور کیس داخل دفتر کرنے کے لیے وہ یہی کر سکتا تھا۔" جمیلہ نے گہری سانس بھری۔ "یہ اصلی ملزموں کو چھپانے کی کوشش ہے۔ اسی لیے پہلے ہی سے ایسی افواہیں پھیلا دی گئیں تھیں۔ میرے بھائی آخر اللہ وسایا کا قتل کیوں کرتے؟ اس نے مجھے ان کے ساتھ جانے سے کب روکا؟ تجھے پتہ ہے میں خود ہی نہیں گئی۔"

"اوپر درخواست نہیں لگائی جا سکتی؟" رحیم داد نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔

"اوپر درخواست لگانے سے بھی کیا ہوگا۔" جمیلہ نے کہا۔ "درخواست بھی دبا دی جائے گی۔"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔" رحیم داد نے مزید زور نہ دیا۔ وہ چاہتا بھی یہی تھا۔ کہنے لگا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اللہ وسایا کے قاتل کبھی نہیں پکڑے جائیں گے۔"

"نظر تو یہی آ رہا ہے۔ لگتا ہے اللہ وسایا کو پہلے سے سوچی سمجھی سکیم کے تحت قتل کیا گیا۔ وکیل کا بھی یہی وچار ہے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمڈا۔ جمیلہ منہ پھیر کر چادر کے پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔

رحیم داد نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "بہت ظلم ہوا جی۔"

جمیلہ نے کچھ نہ کہا۔

رحیم داد چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے لہجے میں اور نرمی پیدا کی۔ "پر تو اس طرح کب تک اللہ وسایا کے لیے روتی رہے گی؟"

"جب تک آنکھوں میں رونے کے لیے آنسو ہیں۔" جمیلہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

رحیم داد ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ بارش اب تھم گئی تھی مگر ہوا تیز تھی۔ رحیم داد نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ آہستہ سے بولا۔ "اب آگے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔"

"کیا سوچوں۔ کچھ سمجھ نہیں آتی۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"کچھ نہ کچھ تو سوچنا ہی پڑے گا۔ تیرے دونوں بچے ابھی بہت چھوٹے ہیں۔" رحیم داد

آہستہ سے بولا "تو ابھی جوان ہے۔ ایسے کس طرح کام چلے گا؟"

"تو کیا کہنا چاہتا ہے؟ میں تیری بات کا مطلب نہیں سمجھی۔" اس کا لہجہ تیکھا تھا۔

رحیم داد نے اس کے لہجے کی تیزی اور کاٹ محسوس کی۔ مگر اس نے ناراض ہونے یا خاموشی اختیار کرنے کی بجائے جرأت سے کام لیا۔ بہت سنبھلے ہوئے انداز میں کہا "میں یہ کہنا چاہتا ہوں جس طرح تو دیر ندر کو بھول گئی، تجھے اللہ دسایا کو بھی اسی طرح بھولنا ہوگا۔ حوصلے سے کام لے۔ تو بہت حوصلے والی ہے۔ پہلے تجھ پر کم ظلم ہوا۔ پر تو نے اسے جھیل لیا۔ بھول بھی گئی۔" رحیم داد کے لہجہ میں خوشامد کا پہلو نمایاں تھا "تیرا دل بہت وڈا ہے۔ تو، تو یہ بھی بھول گئی کہ کبھی تو پاردتی ہوتی تھی۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"نہیں تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" جمیلہ کے رویّہ سے اندازہ ہوتا تھا کہ رحیم داد کی باتوں نے اسے متاثر کیا تھا۔

"تیری طرح مجھ پر بھی ظلم ہوا۔ سب کچھ تباہ ہوگیا۔ بال بچے، گھربار، کچھ بھی نہ رہا۔ فیر بھی زندہ ہوں۔" اس نے جمیلہ کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ آواز میں رقّت پیدا کی۔

"کیا کیا جائے جب زندگی ملی ہے تو زندہ رہنا ہی پڑتا ہے۔ پر میرا جو دکھ ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "تو میرے دکھ کو سمجھ سکتی ہے۔ تو بھی تو ایسے ہی دکھوں کی ماری ہوئی ہے۔"

"ہاں چوہدری! تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔" جمیلہ کے روّیے میں ہمدردی کا پہلو نمایاں تھا۔ رحیم داد کی حوصلہ افزائی ہوئی تو اس نے کھل کر کسی قدر اپنا مدّعا بیان کرنے کی کوشش کی۔ جھجکتے ہوئے بولا "تو چاہے تو ہم دونوں ایک دوسرے کا دکھ بانٹ سکتے ہیں میرا مطلب ہے۔"

جمیلہ نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔ اسے اگے نہ بولنے دیا۔ "میں تیرا مطلب سمجھتی ہوں۔" اس کا لہجہ تیز اور تیکھا تھا۔ مگر رحیم داد خاموش نہ رہا۔ لہجے میں زیادہ نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا "اس میں ہم دونوں کا بھلا ہے۔ پوری زمین داری بھی اپنے پاس رہے گی۔ اسے پھیلانے اور بڑھانے میں دونوں مل جل کر کام کریں گے تو پہلے ہی کی طرح پورے پنڈ کی زمیں داری

رہے گی۔ ہر کام تیری مرضی سے ہوگا۔"

جمیلہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ آنکھوں سے آنسو ڈھلک ڈھلک کر رخساروں پر گرنے لگے۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔ وہ جمیلہ کا ردِ عمل جاننا چاہتا تھا۔ مگر وہ نہ بولی۔ رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں توں اب چلنا ہے۔" وہ آگے بڑھا۔ ٹھٹکا۔ مڑ کر جمیلہ کی جانب دیکھا۔ آہستہ سے بولا۔

"میں نے جو گل کی ہے، اس پر آرام سے سوچ لے۔ ابھی سوچنے کے لیے بہت وکت پڑا ہے مجھے جلدی بھی نہیں۔ پر میں یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے یہ بات بہت سوچ بچار کر اور اپنے اور تیرے فائدے کو سامنے رکھ کر کہی ہے۔"

جمیلہ نے کچھ نہ کہا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر چہرے پر رکھ لیے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رحیم داد دروازے کی سمت بڑھا۔ اسے اپنے عقب میں جمیلہ کی سسکیاں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

☆

رحیم داد کمرے سے نکل کر دالان میں پہنچا۔ صحن میں پانی تھا۔ کیچڑ تھی۔ بارش رکی ہوئی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ رحیم داد سنبھل سنبھل قدم اٹھاتا ہوا مہمان خانے میں پہنچ گیا۔ وہ برآمدے میں پڑی ہوئی ایک کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔

اندھیرا گہرا ہوتا گیا۔ برسات کی بھیگی ہوئی شام نے تاریکی کا ڈیرا ڈال دیا تھا۔ احمد نے لیمپ روشن کر دیا اور رحیم داد کے پاس خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد گم صُم بیٹھا رہا۔ اس نے احمد کی جانب مطلق توجہ نہ دی۔ احمد آہستہ سے صحن میں اترا اور حویلی میں چلا گیا۔

رحیم داد خاموش بیٹھا ان باتوں پر غور کرتا رہا جو اس نے کچھ دیر پہلے جمیلہ سے کہی تھیں۔ وہ پہلے سے کوئی منصوبہ بنا کر نہیں گیا تھا۔ گفتگو کچھ اس ڈھب سے چلی کہ دل کی بات زبان تک آ گئی۔ اب رہ رہ کر یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ اس نے جلد بازی سے کام لیا۔ نہ جانے جمیلہ نے اس

کے بارے میں کیا سوچا۔ اس نے جمیلہ کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھے تھے اور اس کی سسکیاں بھی سنی تھیں۔

اس کے ذہن میں کھلبلی مچی تھی۔ الجھن اور خلفشار سے گھبرا کر وہ کھڑا ہو گیا اور برآمدے میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ احمد واپس آیا۔ اس نے کمرے میں میز پر کھانا چن دیا۔ برآمدے میں پہنچ کر اس نے رحیم داد سے کہا۔

"چوہدری، روٹی کھا لے۔"

رحیم داد نے ہاتھ دھوئے اور کمرے میں جا کر چپ چاپ کھانا کھانے لگا۔ احمد دہلیز کے پاس فرش پر بیٹھا تھا۔ رحیم داد نے کھانا کھاتے کھاتے نظریں اٹھا کر احمد کو دیکھا۔ آہستہ سے پوچھا۔ "آج حویلی میں کچھ زیادہ ہی سناٹا لگ رہا ہے۔"

"ہاں جی، اب تو حویلی میں سناٹا ہی رہتا ہے۔" احمد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "زمیں دار اللہ وسایا کے بعد تو حویلی بالکل اجڑ گئی۔" اس نے مڑ کر حویلی کی جانب دیکھا۔ "دیکھ کیسی ویرانی برس رہی ہے۔"

"برسات میں رات کو ویسے بھی سناٹا کچھ زیادہ ہی لگتا ہے۔" رحیم داد نے بے نیازی سے کہا۔

"کچھ یہ بات بھی ہے۔" احمد نے اس کی تائید کی۔

رحیم داد اپنی بے چینی پر زیادہ دیر قابو نہ رکھ سکا۔ دبی زبان سے پوچھا۔ "زمیں دارنی کا کیا حال احوال ہے؟"

"اس کا حال احوال کیا ہونا ہے جی۔" احمد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "وہ تو جی گُپ چپ رہتی ہے یا روتی رہتی ہے۔" اس نے رحیم داد کی جانب نظریں اٹھا کر غور سے دیکھا۔ "تجھ سے تو آج دیر تک باتیں کرتی رہی۔"

"ابھی تک کمرے میں بیٹھی ہے؟"

"ناجی، وہ تو تیرے جانے کے بعد ہی اٹھ گئی تھی۔"

رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔ "اب کیا کر رہی ہے؟"

"میں تو جی اس کے پاس گیا نہیں۔" احمد نے بتایا۔ "تاراں روٹی لے کر گئی تھی۔ کہتی تھی اس نے روٹی بھی نہیں کھائی۔ نہ بات کی۔ وہ تو چادر سے منہ ڈھانکے رو رہی تھی۔ تاراں دیر تک بیٹھی رہی۔ پر اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔"

رحیم داد گھبرا گیا۔ اس نے گلاس اٹھا کر پانی پیا اور مونچھوں اور ڈاڑھی پر سے پانی کے قطرے پونچھتے ہوئے بولا۔ "مجھ سے بھی بات کرتے کرتے کئی بار روئی۔"

اسی اثنا میں تاراں آ گئی۔ اس نے تیکھی نظروں سے احمد کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ تھی۔ مگر اس نے احمد سے کچھ نہ کہا۔ رحیم داد سے مخاطب ہوئی۔

"یہ مجھے بہت تنگ کرتا ہے جی۔"

رحیم داد نے احمد کو ڈانٹا۔ "تو اسے کیوں تنگ کرتا ہے؟"

"میں نے تو جی کچھ نہیں کیا۔ یہ تو ایسے ہی میرے گلے پڑ جاتی ہے۔" احمد مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

"بتاؤں تو کیا کرتا ہے؟" تاراں نے دھمکی دی۔

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "تو زمیں دارنی کے پاس سے آ رہی ہے نا۔ کیسی طبیعت ہے اس کی؟"

"تیرے جانے کے بعد کمرے سے نکلی تو رو رہی تھی۔ اب تک اس کے آنسو نہیں تھمے۔ آج تو بہت زیادہ اداس لگتی ہے۔"

رحیم داد تو خاموش رہا۔ مگر احمد بول پڑا۔ "جب سے زمیں دار کی موت ہوئی ہے تب سے اس کے آنسو ہی کہاں رکے ہیں۔ جب دیکھو روتی ہی رہتی ہے۔"

"بات تو یہی ہے۔" تاراں نے اتفاق رائے کیا۔ "دونوں میں بہت پیار تھا۔ وہ بھی تو زمیں دارنی کو کتنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ڈاکٹر لانے ہی تو نکلا تھا کہ نہ جانے کس نے اسے کتل کر دیا۔"

رحیم داد کھانے سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس نے دونوں کو مزید بات چیت کا موقع نہ دیا۔ احمد سے مخاطب ہو کر کہا۔ "حمدے! برتن اٹھا اور واپسی میں دیر نہ کرنا۔"

احمد نے برتن اٹھائے اور تاراں کے ساتھ چلا گیا۔ رحیم داد کمرے سے نکل کر برآمدے میں پہنچا۔ صحن میں ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ وہ باہر نہ جا سکا۔ برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اس وقت بھی جمیلہ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے پہلے ہی خدشہ تھا کہ جمیلہ نے اس کی بات پسند نہ کی تھی۔ اسے شدید صدمہ پہنچا تھا۔ تاراں کی باتوں سے نہ صرف اس کی تصدیق ہو گئی تھی بلکہ اس کے اندیشے اور وسوسے سوا ہو گئے۔ وہ اپنی جلد بازی پر پشیمان تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے جو بے موقع قدم اٹھایا تھا اس کی تلافی کس طرح کرے۔ جمیلہ کے دل سے کدورت کیوں کر اور کیسے رفع کرے۔

وہ بستر پر لیٹ کر بھی اسی مسئلہ پر غور کرتا رہا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے طے کیا کہ جمیلہ سے جلد سے جلد ملنے کی کوشش کرے گا۔ اس سے معذرت کرے گا اور ایسا رویہ اختیار کرے گا کہ جمیلہ کی خفگی اور آزردگی کسی نہ کسی طرح دور ہو جائے۔

صبح اٹھ کر اس نے احمد کے ذریعہ جمیلہ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مگر وہ شام تک واپس نہ آیا۔ دوپہر کا کھانا حویلی کا ایک اور نوکر لے کر آیا۔ رحیم داد نے اس سے احمد کے بارے میں کچھ نہ پوچھا۔ وہ احمد کا انتظار کرتا رہا۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد احمد آیا۔

رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں اس سے پوچھا۔ "حمدے! تو دن بھر کہاں رہا؟"

"مجھے جی، زمیں دارنی نے ایک ضروری کام سے پڑوس کے چک بھیجا تھا۔"

"تو نے زمیں دارنی سے میرے بارے میں بات کی تھی؟" رحیم داد کے انداز سے بے چینی جھلک رہی تھی۔

"تو نے جو کہا تھا، وہ میں نے اس سے کہہ دیا۔ پر وہ کچھ نہ بولی۔ چپ کر کے بیٹھی رہی۔"

"لگتا ہے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" رحیم داد نے بات بنائی۔ "میں بھی اس کی

طبیعت ہی کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ کل شام ناراں کی باتیں سن کر میں نے یہی اندازہ لگایا تھا۔"

" ہاں جی اس کی طبیعت گڑبڑ ہی لگتی ہے۔"

" تو میری طرف سے اس کی طبیعت پوچھنا۔ کہنا میں نے زمیں داری کے بارے میں اس سے کچھ ضروری گل کرنی ہے۔" رحیم داد نے جمیلہ سے ملاقات کرنے کا بہانہ تلاش کیا۔

احمد نے کہا۔" اب تو جی کل ہی اس سے گل ہوگی۔"

" کوئی حرج نہیں، کل ہی گل کر لینا۔"

دوسرے روز رحیم داد بے چینی سے احمد کا انتظار کرتا رہا۔ صبح کے ناشتے کے بعد وہ دوپہر کا کھانا لے کر آیا تو رحیم داد نے دریافت کیا۔" احمدے! تو نے زمیں دارنی سے بات کی تھی؟"

" ہاں جی! میں نے تیری بات اسے پہنچا دی تھی۔"

" کیا کہا اس نے؟" رحیم داد اپنی بے چینی چھپا نہ سکا۔ احمد بھی بھانپ گیا۔" تو اس سے ملنا چاہتا ہے۔ کوئی ضروری کام ہوگا۔ پر ایسا لگتا ہے وہ تجھ سے ملنا نہیں چاہتی۔"

" تو نے کیسے سمجھا کہ وہ ملنا نہیں چاہتی؟"

" میری گل سن کر وہ پہلے کی طرح چپ کر کے بیٹھی رہی۔" احمد نے بتایا۔" میں نے دوبارہ کہا تو منہ بگاڑ کر بولی" مجھے زمیں داری سے کیا لینا۔ چوہدری سے کہنا جو اس کا جی چاہے کرے۔ بس جی اس نے اتنا ہی کہا۔"

رحیم داد نے احمد سے مزید استفسار نہ کیا۔ خاموشی سے کھانا کھانے لگا مگر رغبت سے کھانا نہ کھا سکا۔ اس کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ دن ڈھلا، شام ہوئی، رات ہوگئی۔ مگر رحیم داد کی ذہنی الجھن کم نہ ہوئی۔ اسی عالم میں وہ سو گیا۔

سویرے بیدار ہوا تو اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ ہاتھ پیروں میں اینٹھن کے ساتھ ساتھ سر میں درد تھا۔ ہلکا ہلکا بخار بھی تھا۔ دوپہر کو دو چار لقمے کھانے کے بعد ہاتھ کھینچ لیا۔ کھانا کھایا ہی نہ گیا۔ طبیعت اس قدر مضمحل اور گری گری تھی کہ وہ کمرے سے نکل کر برآمدے میں

بھی نہ گیا۔ صحن میں چھما چھم بارش ہو رہی تھی۔ رحیم داد بستر پر لیٹا بوندوں کا جل ترنگ سنتا رہا۔

شام ہوتے ہوتے اسے جوڑی چڑھی۔ جسم کپکپانے لگا۔ اس نے کھیس اچھی طرح لپیٹی اور بدن سکیڑ کر گٹھڑی بن گیا۔ اب بخار تیز ہو گیا تھا۔ احمد کھانا لے کر آیا تو رحیم داد نے جوڑی سے کپکپاتے ہوئے کہا ''حمدے کمبل لا کر مجھ پر ڈال دے۔'' احمد نے اس کی پیشانی چھو کر بخار کی شدت کا اندازہ لگایا اور خاموشی سے چلا گیا۔

رحیم داد کا جسم بخار کی تپش سے بھن رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے سکڑا سکڑایا بے سدھ پڑا رہا۔ اسے کچھ خبر نہ ہوئی کہ احمد کب واپس آیا۔ کب اس کے تھر تھراتے بدن پر اس نے کمبل ڈالا اور کب کمرے سے باہر گیا۔ رحیم داد پر گہری غنودگی طاری تھی۔ آنکھیں سلگ رہی تھیں۔ وہ رک رک کر سانس لے رہا تھا اور آہستہ آہستہ کراہ بھی رہا تھا۔

رات نہ معلوم کتنی گزر چکی تھی۔ باہر چھاجوں پانی برس رہا تھا۔ یکایک رحیم داد نے اپنی تپتی ہوئی پیشانی پر ٹھنڈک محسوس کی۔ یہ کسی کا نرم اور گداز ہاتھ تھا۔ اس نے لمبی سانس بھری اور آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا، جمیلہ اس پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ رحیم داد کی پیشانی پر تھا۔ رحیم داد کو یقین نہ آیا۔ اُس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے پہچاننے کی کوشش کی۔

ہاں وہ جمیلہ ہی تھی۔ وہی ستاروں کی مانند روشن آنکھیں، وہی گلابی ہونٹ، وہی تابندہ پیشانی۔ لیمپ کی زرد زرد روشنی میں اس کا چہرہ سوگوار اور بجھا بجھا ہونے کے باوجود دلکش نظر آ رہا تھا۔

وہ آنکھیں کھولے حیران و پریشان جمیلہ کے خوب صورت چہرے کو تکتا رہا۔ اس کے خشک ہونٹ آہستہ آہستہ لرز رہے تھے۔ وہ بولنا چاہتا تھا مگر بول نہ سکا۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا خواب دیکھ رہا ہے۔

جمیلہ بستر کے قریب پڑے ہوئے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئی بولی ''چوہدری تجھے تو بہت تیز بخار ہے۔ ملیریا لگتا ہے۔ جوڑی چڑھی تھی؟''

"ہاں!" رحیم داد نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی اور ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں بھرتے ہوئے کہا "طبیعت تو سویرے ہی سے گڑبڑ تھی۔ شام کو جوڑی چڑھی فیر ایسا تیز بخار ہوگیا کہ میں نوں بالکل سُدھ بدھ نہ رہی۔"

"چلتا نہ کر۔ کل پرسوں تک چنگا ہو جائے گا۔ تجھے ملیریا ہوگیا ہے۔" جمیلہ نے رحیم داد کو تشفی دی۔ مڑکر دروازے کے پاس کھڑے ہوئے احمد کی جانب دیکھا۔ ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ احمد نے بڑھ کر میز پر رکھا ہوا لکڑی کا بکس اٹھایا اور جمیلہ کو دے دیا۔ جمیلہ نے بکس کھولا۔ تھرمامیٹر نکالا۔ اسے ہاتھ میں دبا کر جھٹکا دیا۔ رحیم داد سے کہا "چوہدری! منہ کھول۔" رحیم داد نے چپ چاپ منہ کھول دیا۔ جمیلہ نے تھرمامیٹر اس کے منہ میں لگا دیا اور کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی جھک کر توجہ سے دیکھنے لگی۔

جمیلہ نے تھرمامیٹر رحیم داد کے منہ سے نکالا۔ لیمپ کی روشنی میں ہاتھ اٹھا کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی۔ آہستہ سے بولی "تجھے تو ۱۰۴ ٹمپریچر ہے۔" اس نے تھرمامیٹر دھو کر حفاظت سے بکس میں رکھ دیا۔ احمد سے گلاس میں پانی منگوایا۔ بکس کے اندر سے کونین کی ٹکیہ نکالی۔ احمد نے جمیلہ کی ہدایت پر رحیم داد کو تکیہ کے سہارے بٹھا دیا۔ رحیم داد گہری گہری سانس بھر کر آہستہ آہستہ ہانپتا رہا۔

جمیلہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ رحیم داد کو مخاطب کرتے ہوئے نرم لہجے میں بولی "چوہدری! یہ دوائی کھالے۔ آرام آجائے گا۔" رحیم داد نے ایک بار پھر منہ کھولا۔ جمیلہ نے جھک کر کونین کی ٹکیہ اس کے حلق میں ڈال دی۔ گلاس اٹھا کر رحیم داد کے ہونٹوں سے لگایا۔ رحیم داد پانی کے ساتھ ٹکیہ نگل گیا۔ دوا کھلانے کے بعد جمیلہ بولی۔

"اب تو آرام سے لیٹ جا۔"

رحیم داد چپ چاپ ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔ جمیلہ نے ایک بار پھر اس کی پیشانی چھو کر دیکھی۔ احمد سے کٹورے میں ٹھنڈا پانی منگوایا۔ احمد کمرے سے چلا گیا۔

کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔ جمیلہ کرسی پر گم صم بیٹھی تھی۔ باہر موسلا دھار بارش ہو

رہی تھی۔ رحیم داد آنکھیں بند کیے نڈھال لیٹا رہا۔ وہ چند لمحے اسی حالت میں پڑا رہا۔ پھر اس نے کراہتے ہوئے گردن موڑی۔ جمیلہ کی جانب دیکھا۔ رک رک کر کہنے لگا۔

" زیں دارنی! میں نے پچھلے دنوں تجھ سے ایک ایسی بات کہی تھی، جس پر تو نے برا منایا۔ سسکیاں لے کر رونے لگی۔ مجھے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ زیں دارنی تو"

جمیلہ نے اسے مزید بولنے کا موقع نہ دیا۔ بات کاٹ کر بولی " چپ کر کے لیٹا رہ۔ تجھے بہت تیز بخار ہے۔ سویرے سے تیری طبیعت اتنی گڑبڑ ہے۔ تو نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟ احمد تو یہیں تھا۔ مجھے پتہ چل جاتا تو اسی سمے دوائی کھلا دیتی۔ اتنا تیز بخار نہ چڑھتا"

" میں نے تجھے اس لیے خبر نہ کی کہ تو عدت میں ہے۔ سوچا تو یہاں کیسے آسکتی ہے۔" رحیم داد نے جمیلہ کی جانب دیکھے بغیر ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

" ایسے ہی آسکتی تھی جیسے اب آئی ہوں۔ دکھی بیماری کی تو بات ہی الگ ہے۔" جمیلہ نے بتایا " میں نے ملا کو بلا کر پوچھ لیا تھا۔"

احمد کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا بڑا کٹورہ تھا۔ احمد نے کٹورہ میز پر رکھ دیا اور میز اٹھا کر جمیلہ کے سامنے رکھ دی۔ جمیلہ نے پانی میں انگلیاں ڈبوئیں۔ پانی ٹھنڈا تھا۔ اس نے بکس کھولا۔ اندر سے ململ کا اجلا ٹکڑا نکالا۔ اسے پانی میں ڈال کر تر کیا۔ تہہ کر کے اس کی چار انگل چوڑی پٹی بنائی اور بھیگی ہوئی پٹی رحیم داد کی تپتی ہوئی پیشانی پر رکھ دی۔ رحیم داد کو اس کی ٹھنڈک سے بڑا سکون ملا۔

رحیم داد نے ایک بار پھر آنکھیں کھولیں۔ آہستہ سے بولا " زیں دارنی، سچ تیرا دل بہت وڈا ہے۔ تو"

جمیلہ نے اسے ٹوکا " چوہدری چپ کر کے پڑا رہ۔ تجھے آرام کی ضرورت ہے۔"

رحیم داد نے آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ آہستہ سانس بھرنے لگا۔

پٹی اس کی پیشانی پر رکھی رہی۔ گرم ہو جاتی تو جمیلہ اسے دوبارہ کٹورے کے ٹھنڈے پانی میں تر کرتی اور پیشانی پر رکھ دیتی۔ بخار کی تیزی دھیرے دھیرے کم ہوتی گئی۔ رحیم داد

کو ایسا سکون ملا کہ وہ سو گیا۔ اسے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ جمیلہ کتنی دیر اس کے سرہانے بیٹھی رہی اور کب اٹھ کر چلی گئی۔

۲۵

دن ڈھلے ایک تانگہ حویلی کے مہمان خانے کے دروازے پر رُکا۔ نادر خاں تانگے سے نیچے اترا۔ اس بار وہ اپنے ساتھ بستر اور ٹرنک لے کر آیا تھا۔ وہ سائیکل بھی تانگے میں رکھی تھی، جس پر وہ رحمت والی گیا تھا۔ اس نے تانگے والے کو کرایہ ادا کیا۔ سامان احمد کے سپرد کیا اور سیدھا رحیم داد کے پاس پہنچا۔

رحیم داد اس وقت کمرے کے باہر برآمدے میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ صحن میں دھوپ پھیلی تھی مگر اس کی تمازت میں تیزی نہ تھی۔ ہوا فراٹے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ درخت جھوم رہے تھے۔ آسمان پر بکھرے ہوئے بادلوں کے سفید سفید ٹکڑے سرپٹ بھاگتے نظر آتے تھے۔

نادر خاں کو دیکھتے ہی رحیم داد نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "تُو نے تو دوسرے روز آنے کا وعدہ کیا تھا۔ اتنے دن کہاں غائب رہا۔ بیمار تو نہیں پڑ گیا تھا؟" اس نے نادر خاں کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "ویسے تو بیمار شیمار تو نہیں لگتا۔"

"نہیں جی، بیمار تو نہیں رہا۔" نادر خاں سر جھکا کر معذرت کرنے لگا۔ "معاف کرنا جی، وہ ایسا ہوا کہ مجھے ملتان جانا پڑا۔"

"ملتان کیوں گیا تھا۔ تیں نوں تو یہاں پہنچنا تھا؟"

"آنا تو جی میں نے یہیں تھا پر کچھ ایسی مجبوری ہوئی کہ اچانک ملتان جانا پڑ گیا۔" نادر خاں کے لہجے میں عاجزی تھی۔

"کیا مجبوری ہوئی؟ تو کچھ پریشان پریشان دکھائی پڑ رہا ہے۔" رحیم داد نرمی سے بولا۔
"کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔ آرام سے بتا، بات کیا ہے؟"

نادر خاں نے قریب پڑے ہوئے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔ "وہ ایسا ہے جی، میری گھر والی کا چھوٹا بھائی ملتان ڈسٹرکٹ جیل میں ہے۔"

"جیل میں ہے!" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ جیل کیسے چلا گیا؟"

"کتل کے ایک مکدمے میں پھنس گیا تھا۔ سال بھر سے اوپر ہو گیا جیل کاٹتے ہوئے۔" نادر خاں نے رحیم داد کو آگاہ کیا۔ "میں یہاں سے رحمت والی گیا۔ دیکھا، گھر والی بہت پریشان تھی۔ کسی نے اطلاع دی کہ اس کا بھائی سخت بیمار ہے۔ ایک ہی بھائی ہے اس کا۔ روتے روتے بُرا حال کر لیا اس نے۔ اس کی حالت مجھ سے دیکھی نہ گئی۔ اُسے تسلی دی اور فوراً ملتان چلا گیا۔"

"اب وہ کیسا ہے۔ ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

"اُس سے تو جی میں مل ہی نہ سکا۔" نادر خاں نے جواب دیا۔ "بات یہ ہے جی۔ اس بار تو اوپر سخت بارش ہوئی ہے۔ چناب میں زبردست سیلاب آگیا۔ بستیاں کی بستیاں اُجڑ گئیں۔ خریف کی فصلیں تباہ ہو گئیں۔ بھکری سے آگے لوپ بند ٹوٹ گیا۔ جلال آباد اور شیر شاہ کو شدید خطرہ ہے۔ نہروں میں شگاف پڑ گئے ہیں۔ ریلوے لائن پانی کے تیز ریلے سے بہہ گئی ہے۔ جگہ جگہ سے اکھڑ گئی ہے۔ جدھر نظر جاتی ہے پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔"

"اس بار تو بہت تباہی مچا دی سیلاب نے۔" رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا۔ "پر یہ تو بتا تیری گھر والی کے بھائی کا کیا بنا؟"

"ہوا یہ جی کہ لوپ بند کی مرمت کے لیے ڈسٹرکٹ جیل کے کیدیوں کو بھی لگا دیا گیا ہے۔ ان میں میرا سالا بھی ہے۔" نادر خاں نے بتایا۔ "میں ملتان پہنچا تو پتہ لگا کہ کیدی بند کی مرمت کا کام ختم کر کے جلد ہی واپس آجائیں گے۔ میں انتظار کرنے لگا۔ دو ہفتے سے اوپر ہو گئے پر کیدی واپس جیل نہ آئے۔ بند کی مرمت کا کام ختم ہی نہ ہوا تھا۔"

"پر تیری گھر والی نے تو کہا تھا کہ اس کا بھائی سخت بیمار ہے۔ تو اور ہی گل سنا رہا ہے۔ یہ کیا چکر ہے؟" رحیم داد نے مسکرا کر نادر خاں سے پوچھا۔

"اطلاع ٹھیک نہیں ملی تھی جی" نادر خاں نے وضاحت کی۔ "بات سچی یہ ہے جی کہ بند کی مرمت کرنے والے کئی کیدیوں نے رات کے اندھیرے میں فرار ہونے کی کوشش کی۔ بلکہ کچھ تو فرار بھی ہو گئے۔" نادر نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "پر جب وہ فرار ہونے لگے تو ان کی نگرانی کرنے والے پہرے داروں کو پتہ چل گیا۔ انہوں نے بھاگتے ہوئے کیدیوں کا پیچھا کیا۔ گولی بھی چلائی۔"

"کئی تو جان سے مارے بھی گئے ہوں گے۔" رحیم داد نے نادر خاں کی بات میں لقمہ دیا۔

"نہیں جی مرا تو کوئی بھی نہیں۔ پر چار زخمی ضرور ہوئے۔" نادر خاں نے بتایا۔ "زخمی کیدیوں کو سرکاری ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ میری گھر والی کو اطلاع ملی تھی کہ ان میں اس کا بھائی بھی شامل ہے۔ پر وہ ان میں نہ تھا۔ میں نے اسپتال جا کر خود معلوم کیا تھا۔ جیل کے افسروں سے پوچھ گچھ کرنے پر پتہ چلا کہ میرے سالے نے فرار ہونے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ وہ دوسرے کیدیوں کے ساتھ بند کی ابھی تک مرمت کر رہا ہے۔"

قیدیوں کے فرار ہونے کی اطلاع سے رحیم داد قدرے پریشان ہو گیا۔ اسے فوراً لالی کا خیال آیا۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد آیا کہ اللہ وسایا اور جمیلہ کے ہمراہ کبیر والہ جاتے ہوئے منٹگمری اسٹیشن پر اچانک شاداں سے اس کی مڈھ بھیڑ ہو گئی تھی۔ وہ اسے پہچان تو نہ سکی، لیکن اس کی زبانی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ لالی بھی ڈسٹرکٹ جیل۔ ملتان میں ہے۔ وہ اس سے ملنے ملتان جا رہی تھی۔ رحیم داد سوچنے لگا، اگر لالی بھی بند کی مرمت کرنے والے قیدیوں میں شامل ہو گا تو اس نے ضرور نکل بھاگنے کی کوشش کی ہو گی اور کامیاب بھی ہو گیا ہو گا۔ وہ ایسے معاملات میں بڑا ہوشیار اور سنجھا ہوا تھا۔ وہ ضرور فرار ہو گیا ہو گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کسی روز کوٹلہ ہرکشن بھی پہنچ سکتا تھا۔ یہ سوال ذہن میں ابھرتے ہی رحیم داد کو تشویش ہوئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے خدشات اور وسوسوں پر قابو پا لیا۔

رحیم داد کو معاً خیال آیا کہ لالی، کوٹلہ ہرکشن کیسے پہنچ سکتا ہے۔ اسے تو یہی معلوم تھا کہ رحیم داد مر چکا ہے۔ پولس پارٹی کے ساتھ لاش کی شناخت بھی اسی نے کی تھی۔ اسے تو یہ بھی خبر نہ تھی کہ رحیم داد نام بدل کر چودھری نور الٰہی کی حیثیت سے کوٹلہ ہرکشن میں مقیم تھا۔ ویسے بھی رحیم داد کی وضع قطع اور حلیہ اس قدر تبدیل ہو چکا تھا کہ لالی اسے اب پہچان بھی نہ سکتا تھا۔

وہ خاموش بیٹھا لالی کے بارے میں سوچتا رہا۔ نادر نے اسے خاموش پایا تو دریافت کیا۔
"چوہدری! تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

رحیم داد نے جھٹ بات بنائی "میں شاہ جی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بہت دنوں سے اس کے پاس گیا نہیں۔ ایک تو مینہ کی جھڑی لگی رہی۔ اوپر سے میں بیمار بھی پڑ گیا۔"
"اوہو، تو پچھلے دنوں بیمار بھی رہا۔" نادر نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا "جب ہی تو کچھ کمزور، کمزور دکھائی دے رہا ہے۔ چہرہ بھی مرجھایا ہوا لگتا ہے۔ کس ڈاکٹر سے علاج کرایا تھا؟"
"ایسی زبردست برسات میں ڈاکٹر کہاں سے آتا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ رستے بند تھے۔" رحیم داد نے بتایا "جمیلہ نے دوائی دی تھی۔ اسی سے چنگا ہو گیا۔"
"زمیں دارنی ویسے تو بہت پڑھی لکھی ہے۔ پر میں نوں یہ پتہ نہ تھا کہ وہ ڈاکٹری بھی کر لیتی ہے۔"

رحیم داد نے مسکرا کر کہا "ڈاکٹری شاکٹری تو اس نے نہیں پڑھی۔ پر چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج کر لیتی ہے۔ چوٹ یا زخم آ جائے تو مرہم پٹی بھی کر لیتی ہے۔ اس کے پاس دوائیوں سے بھرا ہوا بکسہ ہے۔ اس میں دوا دارو کا ہر طرح کا سامان رہتا ہے۔ پنڈ میں کوئی بھی بیمار پڑے۔ چاہے مزارع ہو یا کمی، وہ جھٹ دوائیوں کا بکسہ سنبھال، اس کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ اس معاملہ میں اس کا دل بہت نرم ہے۔ آس پاس کے کسی پنڈ یا چک میں بھی کوئی بیمار پڑ جائے تو پتہ لگتے ہی وہاں پہنچ جاتی ہے۔ اپنے ہاتھ سے دوائی کھلاتی ہے۔ خود ہی مرہم پٹی کرتی ہے۔" رحیم داد کو جمیلہ کی درد مندی اور خوبیاں بیان کرنے میں لذت محسوس

ہو رہی تھی۔

نادر خاں نے جھجکتے ہوئے پوچھا "پر آج کل تو جی وہ عدت میں ہے۔ حویلی سے باہر نہیں جاسکتی۔ تجھے دوائی دینے اِدھر کیسے چلی آئی؟ ویسے تو اسے تیرے سامنے بھی نہیں آنا چاہیئے۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ بات تو ایسی ہی ہے۔" رحیم داد نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے بتایا تھا کہ اس کا دل بہت نرم ہے۔ وہ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔ جیسے ہی اسے پتہ چلا کہ مجھے بہت تیز بخار ہے، فوراً دوائیوں کا بکسہ لے کر آ گئی۔ ویسے یہ مہمان خانہ بھی حویلی سے الگ کہاں ہے۔" اس نے وضاحت کی۔ "وہ میرے سامنے کب آتی ہے۔ چندر کے پلّو سے بکّل مار کر منہ اس طرح چھپا لیتی ہے کہ آنکھیں بھی مشکل سے دکھائی پڑتی ہیں۔ عام طور پر تو منہ موڑ کر دوسری طرف کر لیتی ہے۔ اس معاملہ میں اس نے پنڈ کے ملّا سے بات کر رکھی ہے۔"

رحیم داد نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ احمد کھانا لے کر آ گیا۔ اس نے کھانا میز پر لگا دیا۔

رحیم داد نے نادر خاں کی طرف دیکھا۔ "تو نے روٹی کھالی؟"

"کھاؤں گا جی۔ میں نے تو ابھی نہا دھو کر کپڑے بدلنے ہیں۔"

نادر خاں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور احمد کے ہمراہ کمرے سے چلا گیا۔ رحیم داد اطمینان سے کھانا کھانے لگا۔ کھانے سے فارغ ہو کر حسبِ معمول وہ بستر پر لیٹ کر آرام کرنے لگا۔

دن ڈھلے رحیم داد کمرے سے باہر گیا۔ غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ رحیم داد مہمان خانے سے نکل کر باغ میں پہنچا۔ نوکروں نے پہلے ہی کرسیاں لگا دی تھیں۔ رحیم داد ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ برسات کی سہانی شام تھی۔ مشرق میں شفق کا الاؤ دہک رہا تھا۔ فضا گل رنگ تھی۔ ہوا مہکی ہوئی تھی۔ رحیم داد تنہا بیٹھا موسم کی رنگینی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر تاجاں پر پڑی۔ وہ مہمان خانے کے عقب سے نکل کر مویشیوں کے باڑے کی جانب جا رہی تھی۔

تاجاں کی عمر سولہ سترہ برس کے لگ بھگ تھی۔ مگر وہ صحت مند اور بھرپور جوان تھی۔ حویلی ہی میں رہتی تھی۔ مگر اس کی حیثیت نوکرانیوں اور خادماؤں سے قدرے مختلف تھی۔

جمیلہ اس پر بہت مہربان تھی۔ ہمیشہ محبت اور شفقت سے پیش آتی تھی۔ اسے اپنے پاس ہی رکھتی تھی۔ تاجاں کا باپ مرچکا تھا۔ پھاتاں اس کی بیوہ ماں تھی۔ اس نے تاجاں کو جمیلہ کی سپردگی میں دے دیا تھا۔ پچھلے چھ سال سے وہ حویلی میں تھی۔ وہیں پلی بڑھی اور جوان ہوئی۔ کھانے کو اچھی غذا اور رہنے کو بہتر ماحول ملا تو اس کا رنگ روپ نکھر گیا۔ صحت بھی اچھی رہی کام کاج اور محنت سے جسم بھی سڈول اور خوبصورت ہوگیا۔ جمیلہ اُسے اس قدر عزیز رکھتی تھی کہ اس نے خود تاجاں کا رشتہ طے کیا تھا۔ شادی کی تاریخ بھی مقرر ہوچکی تھی۔

رحیم داد نے تاجاں کو حویلی میں پہلے بھی دیکھا تھا مگر اس وقت وہ اسے زیادہ ہی خوب صورت اور سوہنی نظر آئی۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کی شلوار اور اسی رنگ کا کرتا پہنے ہوئے تھی۔ سر پر گہرا دھانی دوپٹہ تھا۔ یہی لباس ایک بار رحیم داد نے جمیلہ کے جسم پر بھی دیکھا تھا۔ مگر اللہ وسایا کی موت کے بعد جمیلہ صرف سفید لباس پہنتی تھی۔ اس نے اپنے رنگین کپڑے نئے نوکرانیوں کو دے دیے تھے۔ مگر سب سے زیادہ تاجاں کے حصے میں آئے۔ گلابی لباس میں رحیم داد کو تاجاں میں جمیلہ کی جھلک نظر آئی۔

شفق کی گہری نارنجی روشنی میں تاجاں کا چہرہ نکھر کر زیادہ ہی شگفتہ اور زیادہ ہی گلابی ہوگیا تھا۔ رحیم داد نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ تاجاں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ رحیم داد چپ چاپ بیٹھا دُزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ تاجاں قریب، اور قریب آتی گئی۔ چلتے چلتے اس نے نظر اُٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ ہاتھ اٹھا کر خاموشی سے سلام کیا۔ رحیم داد مسکرایا۔ انگلی کے اشارے سے اسے بلایا۔ وہ ٹھٹکی۔ چند لمحے خاموش کھڑی رہی پھر سر کو دوپٹے سے ڈھکتی، شرماتی، لجاتی آگے بڑھی اور رحیم داد کے روبرو نظر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔

رحیم داد نے نرم لہجے میں پوچھا۔ ”تو پھاتاں کی دھی ہے نا؟“

”ہاں جی!“ اس نے رحیم داد سے نظریں ملائے بغیر دبی زبان سے جواب دیا۔ ”میرا ناں تاجاں ہے جی۔“

"اچھا، اچھا، تو تا جاں ہے،" رحیم داد نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ "پر تو اس وقت کہاں جا رہی ہے۔ تو سا ہے بندھی منٹیار ہے۔ حویلی سے باہر کیسے آ گئی۔ میں تو تیرے سگن میں بھی شریک ہوا تھا۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ لہجے سے بے تکلفی جھلکنے لگی "تیری سسرال سے آئی ہوئی مٹھائی بھی میں نے کھائی تھی۔ یہیں باغ میں تو سگن کی ساری رسماں ریتاں ہوئی تھیں۔ پر تیں نوں ان کے بارے میں کی پتہ۔"

تا جاں اور شرما گئی۔ اس کے چہرے کے گلاب اور دہکنے لگے۔ آنکھوں میں چراغ جل اُٹھے۔ وہ نظریں جھکا کر دوپٹے کا آنچل انگلی میں لپیٹتے ہوئے بولی۔ "وہ ایسا ہے جی۔ بھین جی نے حمدے کو بلایا ہے۔ کوئی کام ہے۔ حویلی میں کوئی بھی نہ تھا۔ مجھے بھیج دیا۔ پر حمدا تو مہمان خانے میں نہیں ہے ڈھارے پر ہوگا۔ ادھر ہی جا رہی تھی۔" اس نے نگاہیں اٹھا کر رحیم داد کی جانب نہ دیکھا۔

"ایسے اِدھر اُدھر نہ گھوما کر۔" رحیم داد نے لہجے میں دبدبہ پیدا کرتے ہوئے کہا "تیری سسرال والوں کو پتہ چل گیا تو بُرا منائیں گے۔" یہ کہتے کہتے وہ زیرِ لب مسکرایا۔ "پنڈ کے کسی گھبرو کی نظر پڑ گئی تو تجھے اٹھا لے جائے گا۔"

"نہیں جی، میں ایسی نہیں ہوں۔" وہ گھبرا کر الھڑ پن سے بولی۔ "میں تو جی حویلی سے کبھی باہر نہیں جاتی۔"

"اچھا ہی کرتی ہے۔" رحیم داد نے دبی زبان سے اسے ٹٹولا۔ "تو ہے بھی تو سوہنی مٹیار۔ ان ریشمی کپڑے لتوں میں تو زیادہ ہی سوہنی لگتی ہے۔"

"پر جی یہ تو مجھے بھین جی نے دیئے ہیں۔"

"میں نوں پتہ ہے۔" رحیم داد آہستہ سے ہنسا۔ "یہ کپڑے لتے تجھے زمیں دارنی ہی نے دیئے ہیں۔ پر انہیں پہن کر تو رانڈ بھاتاں کی دھی نظر نہیں آتی۔ زمیں دارنی لگتی ہے۔" رحیم داد دھیرے دھیرے کھلتا جا رہا تھا۔ "تیں نوں تو زمیں دارنی ہی ہونا چاہیے تھا۔"

تا جاں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ نظریں نیچی کیے چپ چاپ کھڑی رہی۔ اس کے

چہرے پر گھبراہٹ بکھری تھی۔ شفق کی سُرخی کا الاؤ ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا۔ شام کا دھندلکا فضا میں گھلنے لگا تھا۔ رحیم داد کچھ دیر اور تاجاں سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی اثنا میں نادر خاں جامن کے ایک پیڑ کی آڑ سے نکل کر سامنے آگیا۔ رحیم داد نے چاپ سن کر اس کی جانب دیکھا۔

نادر اس کی طرف بڑھا۔ رحیم داد تاجاں کی سمت مڑا۔ اسے مخاطب کیا "تاجاں! حویلی میں جا۔ اندھیرا بڑھ گیا ہے۔ میں حمدے کو زمیں دارنی کے پاس بھیج دوں گا۔ تُو اسے بتا دینا۔"

تاجاں نے اس کی جانب دیکھے بغیر مدھم لہجے میں کہا "اچھا جی۔" وہ مڑی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی حویلی کی جانب چل دی۔

نادر خاں قریب پہنچا۔ اس نے گردن کو خم دے کر تاجاں کی سمت دیکھا اور رحیم داد کے روبرو نظریں جھکا کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ بے نیازی سے بولا "بیٹھ جا نادر۔"

نادر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ایک بار پھر تاجاں کی جانب دیکھا۔ وہ درختوں کے نیچے پھیلتے ہوئے شام کے دھندلکے میں گم ہوتی جا رہی تھی۔ نادر خاں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ دبی زبان سے بولا "سوہنی مٹیار ہے۔ کون ہے جی یہ؟"

"تاجاں نام ہے اس کا۔" رحیم داد نے بتایا "حویلی ہی میں رہتی ہے۔ حمدے کو بلانے اِدھر آئی تھی۔"

نادر خاں نے مسکین سی صورت بنا کر کہا "میں نے تو جی حویلی کو اب تک دیکھا ہی نہیں۔"

"دیکھ لینا، ضرور دیکھ لینا۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا "تجھے جمیلہ سے بھی ملانا ہے۔ وہ حویلی کے اندر ہی ملے گی۔" اس نے نظر بھر کر نادر کو دیکھا "پر وہ تجھ سے خوش نہیں ہے۔ یہ سوچ لے۔"

"مجھے پہلے ہی اندازہ تھا۔ پر ایک بار میں اس سے مل لوں۔ فیر وہ مجھ سے ناراض نہیں رہے گی۔"

رحیم داد نے ہلکا قہقہہ لگایا۔" تو اسے جانتا نہیں۔ وہ اور ہی طرح کی زنانی ہے۔ بہت تیز اور ہوشیار ہے۔"

"میں نے بھی یہی سنا ہے جی۔" نادر خاں نے بڑے اعتماد سے کہا۔" پر ہے تو وہ وڈے جگیردار کی دھی۔ ویسے خود بھی چھوٹی موٹی جگیردارنی ہی ہے۔ میں جگیرداروں کے مزاج بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ برسوں ان کی ملازمت میں رہا ہوں۔ کتنے ہی ٹیڑھے اور اونچے طرّوں والے جگیرداروں اور وڈّے زمیں داروں سے اپنا واسطہ رہا ہے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر انگلیوں سے کان چھوا۔" اللہ کے فضل سے کوئی مجھ سے نراض نہیں رہا۔"

"تو کہتا ہے تو جلد ہی تجھے اس سے ملوا دوں گا۔"

"میں نے اس سے کئی کام لینے ہیں۔" نادر خاں نے ذرا آگے جھک کر آہستہ سے کہا۔ "اور وہ کام میں ہی کرا سکتا ہوں جی۔ میں نے اس سے زمیں داری کے کاغذات لینے ہیں۔ مزارعوں سے کرض ادھار کی وصولی کے لیے رجسٹر اور بہی کھاتے لینے ہیں۔ اور بھی ایسی ہی کئی دستاویزات ہیں جو اس کے پاس ہیں۔ ان کا اب تیری تحویل میں ہونا بہت ضروری ہے۔"

"کہتا تو ٹھیک ہی ہے تو۔" رحیم داد نے اس کا مشورہ قبول کرتے ہوئے کہا۔" پر اتنا دھیان میں رکھنا، وہ نراض ہو تو چپ کر جانا۔ بات یہ ہے میں اسے نراض کرنا نہیں چاہتا۔" اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔" ویسے وہ دل کی بری نہیں۔ اب یہی دیکھ۔ میں بیمار پڑا تو عدت میں ہوتے ہوئے بھی گھبرا کر جھٹ چلی آئی۔ دوائی کھلائی۔ صبح تک میرے بستر کے پاس بیٹھی رہی۔ جب تک میں چنگا نہیں ہو گیا روز ہی آتی رہی۔ وہ جتنی خوب صورت اور سوہنی ہے۔ اتنی ہی دل کی اچھی بھی ہے۔"

"سنا تو میں نے بھی یہی ہے کہ زمیں دارنی بہت حسین اور خوب صورت ہے۔"

"اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔" رحیم داد بولا۔" ویسے اللہ وسایا کی موت کے بعد سے وہ مرجھا کر رہ گئی ہے۔ پر اب بھی بہت شاندار لگتی ہے۔"

"ویسے تو جی تاجاں بھی بہت زوردار مٹیار ہے۔" نادر خاں نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔

مگر رحیم داد نے حوصلہ افزائی نہ کی۔ اس کی بات صاف نظر انداز کر گیا۔ کہنے لگا "نادر تو دو چار روز آرام کر۔ مزارعوں کے پاس تیرا ابھی جانا ٹھیک نہیں۔ پرسوں جمعرات ہے۔ جمیلہ جمعرات کو اللہ وسایا کی نذر نیاز میں لگی رہتی ہے۔ جمعہ یا سنیچر کو تجھے اس کے پاس لے چلوں گا۔" وہ گردن اٹھا کر سوچنے لگا۔ پھر نادر خاں کی جانب متوجہ ہوا "سنیچر ہی ٹھیک رہے گا۔"

نادر خاں نے رحیم داد کی تجویز سے اتفاق کیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد نوکروں نے کھانا لگا دیا۔ نادر بھی کھانا کھانے مہمان خانے کی جانب روانہ ہو گیا۔ رحیم داد کھانے سے فارغ ہوا تو دو مزارع آ گئے۔ وہ ان کے ساتھ دیر تک بیٹھا سیلاب اور شدید بارش کی تباہ کاریوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔

☆

ہفتے کی صبح ناشتہ کرتے ہوئے رحیم داد نے احمد کو جمیلہ کے پاس بھیجا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد احمد نے واپس آ کر بتایا کہ جمیلہ اس کا انتظار کر رہی ہے۔ رحیم داد نے نادر خاں کو بھی بلوالیا۔ دونوں احمد کے ہمراہ حویلی میں گئے۔ جمیلہ بڑے کمرے میں صوفے پر بیٹھی تھی۔ وہ اس وقت بھی سفید لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس نے بکل مار کر چادر سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ دونوں نے اونچی آواز سے اسے سلام کیا۔ جمیلہ نے پہلو بدلا اور ترچھی ہو کر اس طرح بیٹھ گئی کہ اس کا منہ دیوار کی طرف ہو گیا۔ رحیم داد قریب پڑے ہوئے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ مگر نادر خاں نہ بیٹھا۔ نظریں نیچی کیے خاموش کھڑا رہا۔

جمیلہ نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر سرسری نگاہ سے نادر کی جانب دیکھا۔ رحیم داد کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "چوہدری! یہ نادر خاں تو نہیں ہے؟"

"ہاں جی، یہ نادر ہی ہے" رحیم داد نے یہ کہتے ہوئے نادر خاں کو دیکھا "بیٹھ جا نادر۔"

نادر خاں دونوں سے ذرا ہٹ کر صوفے کے بجائے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔ اس نے جمیلہ کی جانب دیکھنے کی کوشش نہ کی۔ جمیلہ نے چند لمحے

خاموش رہنے کے بعد دریافت کیا۔ "چوہدری! تو اسے میرے پاس کیوں لایا ہے؟" اس کے لہجے سے خفگی صاف عیاں تھی۔

رحیم داد نے جمیلہ کے لہجے کی تُرشی محسوس کی۔ نرمی سے بولا۔ "زمیں دارنی! میں نے سوچا اسے بھی تجھ سے ملوا دوں۔ اسے کام تو تیری ہی مرضی سے کرنا ہے۔"

"میری مرضی کیا ہے۔" جمیلہ نے بے رُخی سے کہا۔ "تیرا بنیجر ہے۔ تو جانے اور یہ جانے۔ مجھے اس سے کیا لینا۔" اس کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ "تو نے اسے مجھ سے پوچھ کر رکھا ہے؟"

"تیری مرضی نہیں تو میں اسے نہیں رکھتا۔ تو ناراض کیوں ہوتی ہے۔" رحیم داد نے ایک بار پھر مڑ کر نادر کی جانب دیکھا۔ "سُن رے بھئی نادر۔"

نادر خاں نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ بیٹھا رہا۔

"چوہدری! تو کیا چاہتا ہے؟" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "میرے سامنے ایسی بات کیوں کر رہا ہے۔ تجھے اچھی طرح پتہ ہے، اس کے بارے میں تجھ سے میں پہلے ہی گل بات کر چکی ہوں۔"

"تب ہی تو میں اسے تیرے پاس لایا ہوں۔" رحیم داد کے لہجے میں عاجزی تھی۔ "زمیندارنی جو تو کہے گی وہی ہوگا۔ یہ بات میں اسے صاف صاف کہہ چکا ہوں۔" رحیم داد نے پہلو بدلا۔ نادر خاں کی طرف متوجہ ہوا۔ "یہی گل ہے نا، نادر؟ خاموش کیوں بیٹھا ہے۔ بولتا کیوں نہیں؟"

"میں نے کیا بولنا جی۔" نادر خاں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "چوہدری! تو مجھے یہ بات نہ بھی بتاتا تب بھی میں نوں پتہ تھا کہ جو زمیں دارنی کی مرضی ہوگی وہی ہوگا۔ یہ بات تو اس پنڈ ہی کی نہیں، پورے موضع کو معلوم ہے۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ خوشامد پر اُتر آیا۔ "میں نوں پتہ ہے یہ بہت وڈے زمیں دار کی دھی ہے اور میں نے یہ بھی سنا ہے جی کہ اس کا دل بھی وڈا ہے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "میں تو جی بال بچے دار ہوں۔ پریشان ہوں۔ سوچتا تھا زندگی کے جو دن رہ گئے ہیں، اس حویلی کی خدمت کرتے گزار دوں گا۔ زمیں دارنی کی مرضی نہیں تو میں یہی سمجھوں گا، میرا نصیبہ ہی خراب ہے۔"

جمیلہ بولی۔ "مجھے کیوں دوش دیتا ہے۔" مگر اس دفعہ اس کا لہجہ قدرے نرم تھا۔

"میں تجھے کیوں دوش دینے لگا۔ میں تو اپنی بدنصیبی کی گل کر رہا ہوں۔" نادر خاں نے خوشامد کے ساتھ ساتھ لہجے میں رقت پیدا کرنے کی بھی کوشش کی۔

جمیلہ پر اس کوشش کا خاطر خواہ اثر بھی ہوا۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ "تیرا کوئی پتر نہیں ہے؟"

"نہیں زمیں دارنی، اب کوئی نہیں رہا۔" نادر خاں نے بتایا۔ "وڈا پتر پچھلی جنگ عظیم کے دوران فوج میں بھرتی ہو کر ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ افریکہ میں العلمین کے محاذ پر تھا۔ وہاں سے اس کے کئی خط بھی آئے۔ جرمن فوجوں کے خلاف لڑ رہا تھا۔ وہاں سے وہ واپس نہ آیا۔ صرف مرنے کی اطلاع ملی۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "دوسرا سال ہی بھر بعد ایک جھگڑے میں مارا گیا۔ یہی دو پتر تھے۔ دونوں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی موت سے میری کمر ٹوٹ گئی۔ گھر والی تو ان کے غم کو برداشت ہی نہ کر سکی۔ روتے روتے ایک روز چل بسی۔" اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اپنی بات کہتے کہتے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں گی اور وہ سسکیاں بھر کر رونے لگے گا۔

"تب تو، تو بالکل اکیلا رہ گیا۔" جمیلہ نے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے پوچھا۔ "کوئی بھی نہ رہا؟"

"نہیں زمیں دارنی، ایسا نہیں ہے۔" نادر خاں نے بتایا۔ "پاکستان بننے کے کچھ ہی دنوں بعد میں نے ادھر رحمت والی میں دوسرا ویاہ کر لیا تھا۔ اس سے تین اولادیں ہیں۔ پر ان میں پتر کوئی نہیں۔ تینوں ہی چھوہریاں ہیں۔ لگ بھگ سال بھر سے بے روزگار ہوں۔ زندگی بھر نوکری کی۔ وہی کر سکتا ہوں۔ اور کوئی کام نہ آتا ہے نہ کر سکتا ہوں۔"

تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ جمیلہ اس کی پریشان حالی سے بہت متاثر ہوئی۔ تڑپ کر بولی۔ "نادر خاں! تو بہت دکھی ہے۔ تیری باتوں سے ایسا ہی لگتا ہے۔ تجھے دکھ پہنچا کر مجھے کیا لینا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "میں تو خود دکھ جھیلتے جھیلتے راکھ ہو گئی۔ اللہ وسایا تھا، وہ بھی مجھے دکھ سہنے کے لیے اکیلا چھوڑ گیا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں کے آبگینے چھلک پڑے۔

فضا میں غم کی پرچھائیاں منڈلانے لگیں۔ کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ سب چپ بیٹھے تھے۔ باہر ملگجی دھوپ پھیلی تھی۔ آسمان پر بادلوں کا غبار تھا۔

جمیلہ نے چادر کے پلّو سے آنسو پونچھے اور رحیم داد کی جانب متوجہ ہوئی۔ "چوہدری! اب تو نے اسے رکھ ہی لیا ہے۔ لگا رہنے دے۔ اپنی مرضی میں میری مرضی بھی شامل کر لے۔"

"ایسا نہ کہہ۔ مرضی تو تیری ہی چلے گی زمیں دارنی۔" رحیم داد نے جمیلہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے چاپلوسی سے کام لیا۔ "تینوں اچھی طرح پتہ ہے۔ نہ میں نے پہلے کبھی اپنی مرضی چلائی۔ نہ اگے چلاؤں گا۔ نادر خاں کے معاملہ میں یہ بھول ہو گئی کہ جو گل بات آج تیرے سامنے ہوئی ہے، پہلے ہو جاتی تو ٹھیک تھا۔"

جمیلہ نے رحیم داد کو نظر انداز کیا۔ نادر خاں کو مخاطب کیا۔ "نادر! سچی بات یہ ہے کہ ہمیں منیجر شنیجر کی ضرورت نہیں۔ اپنی اتنی زمیں داری نہیں۔ اور نہ ہی ہمیں مزارعوں کی چمڑی اتارنی ہے۔ یہ بات چوہدری جانتا ہے۔ میں چاہتی ہوں تو بھی جان لے۔"

"میں نے کیا کرنا ہے جی، جیسا حکم ہو گا۔ ویسا ہی کروں گا۔" نادر نے نہایت مستعدی سے اسے یقین دلایا۔ "پر ایک گل میں نوں ضرور کہنی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" جمیلہ نے دریافت کیا۔

"اگر بڑیلی، جھنگر یا غیر مزروعہ زمین کو کابلِ کاشت بنانے کی کوشش کی جائے اُس میں تو کوئی حرج نہیں؟" نادر خاں بولا۔ "میرا مطلب یہ ہے جی، تنخواہ لوں تو اس کے بدلے کچھ کارگزاری بھی دکھاؤں۔ میں نے تجھ سے خیرات تو لینی نہیں۔" نادر نے نظریں اٹھا کر جمیلہ کی جانب دیکھا۔ "پچھلے دنوں میں نے گھوم پھر کر زمیں داری کا جائزہ لیا تھا۔ مجھے بہت سی زمین غیر مزروعہ اور بے کار پڑی نظر آئی۔"

جمیلہ نے بتایا۔ "ایسی غیر مزروعہ زمین کو اللہ وسایا بھی کابل کاشت بنانا چاہتا تھا پر مقدمہ بازی نے اس طرف دھیان دینے کی اسے مہلت ہی نہ دی۔ کئی بار پروگرام بنایا۔ اور ہر بار کوئی نہ کوئی اڑچن کھڑی ہو گئی۔"

"ایک گل اور بھی تجھ سے پوچھنی ہے۔"

"وہ بھی پوچھ لے۔"

"کتنے ہی مزارعوں پر برسوں سے اُدھار چلا آرہا ہے۔ ان کی وصولی کی ٹھیک طرح کبھی کوشش نہیں کی گئی۔" نادر خاں نے تجویز پیش کی۔ "یہ ادھار فصل کی واڈھی پر، خاص طور پر کماد کی پیداوار سے آسانی سے وصول کیا جاسکتا ہے۔"

"ایسے نہیں۔" جمیلہ نے اس کی تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ "تو روز ناشتے کے بعد میرے پاس آجا۔ میں سارے رجسٹر اور کاغذات تیرے سامنے رکھ دوں گی۔ تجھے بتاتی جاؤں گی، کس سے اگلی فصل کی واڈھی پر کتنا ادھار وصول کیا جاسکتا ہے۔ مجھے سب کا پتہ ہے۔ جو ادھار ادا کر ہی نہ سکتا ہو اس سے زبردستی تو وصولی نہیں کی جاسکتی۔"

نادر خاں انگلی سے گدی کے بال کھجاتے ہوئے بولا۔ "زمیں دارنی! اس طرح تو ادھار وصول کرنا مشکل ہو گا۔"

"ہوا کرے۔" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "میں نے اپنے کسی مزارع کو بھوکا نہیں مارنا اور نہ ہی بے دخل کرنا ہے۔ یہ بات میں تجھے صاف صاف کہہ دینا چاہتی ہوں۔ تُو نے اپنی کارگزاری دکھانے کے چکر میں مزارعوں کو تنگ کرنے کی کوشش کی تو یہ ٹھیک نہیں ہو گا۔ تو خود پریشان ہے، ویسے ہی دوسروں کی پریشانیوں کا وچار کر۔"

"نہیں جی، جیسا تو کہے گی زمیں دارنی ویسا ہی ہو گا۔ میں نوں تیرے حکم کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کرنی۔" نادر خاں نے جھٹ پینترا بدلا۔ "ویسے بھی میں روز کے روز تجھے کام کی رپورٹ پیش کرتا رہوں گا۔ جو بھی اگلی کاروائی کرنی ہو گی تجھ سے اس کے بارے میں مشورہ کروں گا۔"

"زمیں داری کا سارا بوجھ مجھ پر ڈالنے کی بجائے تو چوہدری کو کیوں نہیں ذمہ داری میں شریک کرتا۔ یہ کب تک زمیں داری کے کاموں سے دور دور اور الگ الگ رہے گا۔" جمیلہ نے بات کہتے کہتے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اُسے براہ راست مخاطب کیا۔ "چوہدری! ایسے کام نہیں چلے گا۔ تجھے بھی اب کچھ نہ کچھ ذمہ داری سنبھالنی ہی ہو گی۔ بلکہ ساری ہی سنبھال لے۔"

"جلدی نہ کر۔ تو جو کہے گی ویسا ہی کروں" رحیم داد نے اسے باور کرانے کی کوشش کی "پہلے نادر کو زمیں داری کے معاملات سمجھ لینے دے۔ تو کہہ تو میں بھی اس کے ساتھ آجایا کروں، ابھی تو میں نوں کچھ پتہ نہیں"

"ضرور آجایا کر۔ تجھے یہاں آنے سے کس نے روکا ہے" جمیلہ نے اس کی حوصلہ شکنی نہ کی۔ نرم لہجے میں بولی "چوہدری! جب تو نے اپنی مدد کے لیے نادر کو منیجر رکھ ہی لیا ہے تو زمیں داری کی دیکھ بھال بھی تجھے ہی کرنی چاہیے۔ میں کہاں تحصیلدار اور گرداور کے دفتروں اور کچہریوں کے چکر کاٹتی پھروں گی۔ زمیں داری تو سچ پوچھ اسی کا نام ہے ورنہ زمیں دار کون سا ہل چلاتے ہیں۔ نہ بوائی کرتے ہیں نہ فصل کی داڑھی۔ پر تو پیدا دار سے ادھار حصہ وصول کر لیتے ہیں۔ عام طور پر تو اس سے بھی زیادہ لیتے ہیں۔ ویسے بھی پیداگیری کے لیے زمیں داروں کے اور بھی نہ جانے کتنے دھندے اور ہتھکنڈے ہیں۔ طرح طرح کے ٹیکس اور ابواب ہیں"

نادر خاں نے دبی زبان سے اختلاف رائے کیا "زمیں داری میں تو جی ایسا کرنا ہی پڑتا ہے۔ ورنہ زمیں دار کا کام کیسے چلے۔ میں تجھ سے کیا بتاؤں زمیں دارنی۔ ان آنکھوں سے میں نے کیا کیا دیکھا ہے"

"ضرور دیکھا ہوگا" جمیلہ نے بے زاری سے کہا "مجھے بھی تھوڑا بہت پتہ ہے۔ تب ہی تو میں ایرا پھیری کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتی۔ میں تو سچ پوچھ اب سکول اور ڈسپنسری پر پوری طرح دھیان دینا چاہتی ہوں۔ عدت میں ہونے کے کارن سکول بھی نہیں جا سکتی۔ ڈسپنسری کا کام بھی ٹھیک سے شروع نہ ہو سکا" اس کا لہجہ قدرے تیکھا ہو گیا "پر میں سکول میں پڑھائی بند نہیں کر سکتی۔ اب تو ایک ہی ٹیچر رہ گیا ہے۔ وہ بھی روز روز بیمار رہتا ہے۔ چھٹی بھی مانگ رہا تھا۔ تب ہی تو بالکوں نے سکول جانا چھوڑ دیا۔ پہلے تو دور دور کے پنڈ سے بچے بالک پڑھنے آتے تھے" اس کے رویہ سے جھنجھلاہٹ جھلکنے لگی "میں سکول بند نہیں ہونے دوں گی۔ میں زیادہ دنوں تک اس طرح حویلی میں بند نہیں رہ سکتی"

"ملاں جی سے پوچھ لے" رحیم داد نے مشورہ دیا۔

"اس سے بھی پوچھ لوں گی۔" جمیلہ کا لہجہ بدستور تیز اور تیکھا تھا۔ ویسے سکول، حویلی کے سامنے ہی تو ہے۔ سو، سوا سو گز دور ہو گا۔ اور اس میں کیول بالک ہی تو ہوتے ہیں۔"
کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔ مگر نادر خاں زیادہ دیر چپ نہ رہ سکا۔ اس نے کہا۔" اچھا جی یہ تو طے ہو گیا، میں کل سویرے سے زمیں دارنی کے پاس پابندی سے آتا رہوں گا۔ زمیں داری کے معاملات سمجھوں گا۔ اگے جو کرنا ہو گا وہ زمیں دارنی ہی کے حکم اور مشورے سے کروں گا۔"

رحیم داد نے کہا۔" میں بھی تیرے ساتھ آتا رہوں گا۔ مہمان خانے میں خالی پڑے پڑے دل تنگ آگیا ہے۔ کچھ نہ کچھ تو کرتے ہی رہنا چاہیے۔"

" چودھری! تجھے تو اب بہت کچھ کرنا ہے۔" جمیلہ بولی۔" تو نے بہت دن آرام کر لیا تو ضرور نادر کے ساتھ آنا میں تو پہلے ہی یہ بات کہہ چکی ہوں۔"

بات چیت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ محفل برخاست ہو گئی۔ دونوں جمیلہ سے رخصت ہو کر باہر نکلے۔ واپسی پر وہ بہت مطمئن اور خوش نظر آتے تھے۔ وہ جو کچھ چاہتے تھے اور جیسا چاہتے تھے وہی ہوا۔ جمیلہ ان کی راہ میں حائل نہ ہوئی۔ وہ بغیر کسی تلخی اور جھک جھک کے سب کچھ ان کے حوالے کرنے پر رضامند ہو گئی تھی۔

☆

مہمان خانہ خالی تھا۔ احمد موجود نہ تھا۔ رحیم داد اور نادر خاں کمرے میں جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ نادر خاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔" میں تو جی ڈر رہا تھا کہ زمیں دارنی گڑبڑ کرے گی۔ آسانی سے نہ مانے گی۔ جھگڑا اکھڑا کرے گی۔ پر اس نے تو کچھ بھی نہ کہا۔ شروع میں ذرا اکھڑی اکھڑی تھی۔ بعد میں تو بالکل پٹڑی پر آگئی۔"

"میں نے تجھ سے پہلے ہی کہا تھا، وہ دل کی بُری نہیں۔" رحیم داد نے کہا۔" پر ایک بات ہے۔ تو ہے بہت ہوشیار۔ ایسے دکھ بھرے انداز میں اپنے بارے میں اسے بتایا کہ میرا دل بھی

ڈوبنے لگا۔ جمیلہ تو اس معاملہ میں ویسے ہی بہت کمزور اور نرم دل ہے۔ وہ کسی کو تکلیف اور دکھ میں تو دیکھ ہی نہیں سکتی۔"

"پر چوہدری، میں نے اُسے جو کچھ کہا، ٹھیک ہی کہا تھا۔" نادر خاں نے صفائی پیش کی۔" یہ الگ بات ہے کہ میں نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا، اُسے اس طرح بیان کیا کہ وہ موم کی طرح پگھل گئی۔ تیرا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ وہ دل کی بُری نہیں۔ اور جی یہ بھی سچی گل ہے کہ وہ دل کی جتنی اچھی ہے اتنی ہی خوبصورت اور سوہنی بھی ہے۔ رانڈ ہونے کے بعد بھی اس کا چہرہ اب بھی ایسا دمکتا ہے کہ نظر نہیں ٹھہرتی۔ جب رنگین ریشمی کپڑے پہن کر، سنگھار کیے ہوتی ہوگی تب تو اس کی اور ہی شان ہوتی ہوگی۔"

"تو نے جمیلہ کو ان دنوں نہیں دیکھا۔" رحیم داد نے اتنا ہی کہا تھا کہ باہر صحن میں قدموں کی آہٹ ابھری۔ رحیم داد خاموش ہوگیا۔ گردن بڑھا کر کمرے سے باہر دیکھا۔ وکیل مہمان خانے کے ملازم احمد کے ہمراہ صحن عبور کرکے برآمدے میں داخل ہو رہا تھا۔

وکیل محمد عثمان راٹھور کمرے کے اندر آگیا۔ احمد واپس چلا گیا۔ رحیم داد نے اٹھ کر وکیل سے مصافحہ کیا۔ کرسی پر بٹھایا۔ خیریت پوچھی۔ ہنس کر آنے کا مقصد معلوم کیا۔

"آج کیسے اِدھر آنا ہوا؟"

وکیل نے بتایا۔" چوہدری! میں تیرے کلیم کے بارے میں بات کرنے آیا تھا۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ ٹھٹکا۔ پلٹ کر نادر خاں کو مشتبہ نظروں سے دیکھا۔

رحیم داد فوراً بھانپ گیا۔ مسکرا کر بولا۔" یہ نادر خاں ہے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر نادر کی طرف اشارہ کیا۔" میں نے اسے زمیں داری کے لیے مینیجر لگایا ہے۔ اپنا ہی بندہ ہے۔ بے فکر ہو کر گل بات کرو جی۔"

"اچھا تو یہ تیرا منیجر ہے۔" وکیل نے نادر خاں کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔" ویسے میں نے اسے پہلی بار یہاں دیکھا ہے۔"

"اسے زیادہ دن نہیں ہوئے۔" رحیم داد نے بتایا۔" کچھ ہی دیر پہلے اسے زمیں داری کے

پاس بھی لے گیا تھا۔ اُس نے بھی اسے پہلی ہی بار دیکھا تھا۔" اس نے بات کا رُخ بدلا۔ پوچھا۔
"تو زیں دارنی سے نہیں ملا؟"

"نہیں، میں اس کے پاس نہیں گیا۔" وکیل نے جواب دیا۔" اس معاملہ میں تجھ سے ہی بات کرنی ہے۔ زیں دارنی تو عدت میں ہے۔ ویسے بھی وہ کیا کر سکتی ہے۔"

"میں تو جی ابھی تک یہی نہیں سمجھ سکا یہ چکر کیا ہے۔ مجھے تو اس بارے میں کسی نے بھی کچھ نہ بتایا۔" رحیم داد نے اللہ وسایا کے کیس کے بارے میں بھی پوچھا۔" اور جی اللہ وسایا کے معاملہ کا کیا بنا۔ کوئی گرفتاری شرفتاری ہوئی؟"

وکیل نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔" اب تک کچھ نہیں ہوا۔ لگتا ہے پولس نے کیس بالکل دبا دیا۔ میں نے جب بھی پوچھا، یہی جواب ملا کہ قاتلوں کا کوئی سراغ نہیں لگا۔ پولس کا خیال ہے کہ اللہ وسایا کا قتل زیں دارنی کے بھائیوں نے کرایا ہے۔ قاتل سرحد پار سے آئے اور واردات کے فوراً ہی بعد رات کے اندھیرے میں نکل گئے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ مگر نادر خاں بول پڑا۔" وکیل صاحب! یہ بات سمجھ نہیں آئی۔ زمیندار اللہ وسایا کے قتل کو اڑھائی مہینے سے اوپر ہی ہو گئے ہوں گے۔ اگر زیں دارنی کے بھائیوں نے اس کو قتل کرایا ہوتا تو وہ اب تک زیں دارنی کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتے۔"

"میں نے بھی پولس سے یہی سوال کیا تھا۔" وکیل نے بتایا۔

"کیا جواب ملا؟" نادر نے دریافت کیا۔

"پولس کا کہنا ہے کہ واردات کے بعد سے اس علاقے کی کڑی نگرانی شروع کر دی گئی۔" وکیل نے بتایا۔" زیں دارنی کے بھائیوں کو کسی نے یہ اطلاع پہنچا دی ہے۔ اس لئے انہوں نے ابھی ادھر آنے کی کوشش ہی نہیں کی۔"

"میں تو کہتا ہوں جی، زیں دارنی ان کے ساتھ جائے گی بھی نہیں۔" رحیم داد نے اپنی رائے ظاہر کی۔" وہ جانا چاہتی تو اللہ وسایا کی زندگی میں جا سکتی تھی۔ پر اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ تو یہیں رہنا چاہتی ہے۔ سچی بات یہ ہے جی، وہ جمیلہ سے دوبارہ پاروتی بننا نہیں چاہتی۔ ایک بار

مسلمان ہونے کے بعد وہ کیسے ہندنی بن سکتی ہے؟"

"میں نے بھی اس کی باتوں سے یہی اندازہ لگایا ہے۔" وکیل نے رحیم داد کی تائید کی۔" وہ یہاں سے ہرگز نہیں جائے گی۔"

رحیم داد نے گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے دریافت کیا۔"اچھا جی، اب یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ اپنے کلیم میں کیا گڑبڑ ہے؟"

"اللہ دسایا تو تجھے یہ بات بتانا نہیں چاہتا تھا پر میں تجھے بتاتا ہوں۔" وکیل نے کہا۔" بات یہ ہے چوہدری، کسی نے اوپر درخواست لگائی ہے کہ تیرا کلیم جعلی ہے لہٰذا اس کلیم کی بنیاد پر تجھے جو آراضی اور جائیداد الاٹ ہوئی ہے، اُسے منسوخ کیا جائے۔"

"کون ہے وہ جس نے میرے خلاف ایسی درخواست لگائی؟" رحیم داد نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی چھا گئی۔

"اللہ دسایا تجھے اسی لیے کچھ بتانا نہ چاہتا تھا کہ تو پریشان ہوگا۔"

"پریشانی کی تو جی بات ہی ہے۔" رحیم داد بولا۔" یہ درخواست لگانے والا ہے کون؟"

"اس کا نام محمد بشیر ہے۔ وہ بھی خود کو ضلع گورداسپور کا مہاجر بتاتا ہے۔" وکیل نے رحیم داد کو مطلع کیا۔

"میں تو کسی محمد بشیر کو نہیں جانتا۔" رحیم داد بدستور پریشان تھا۔" پر اُسے میرے خلاف درخواست لگانے سے کیا ملے گا؟"

"اگر درخواست درست ثابت ہوئی تو اسے انعام مل سکتا ہے۔" وکیل نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔" حکومت نے جعلی کلیموں کا سراغ بتانے والوں کے لیے انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔ یہ بات تو تجھے بھی معلوم ہوگی۔"

"میں نوں تو جی کچھ پتہ نہیں۔" رحیم داد نے سادگی سے اپنی بے خبری کا اعتراف کیا۔" پر اس درخواست کا بنا کیا؟"

"اس پر انکوائری کا حکم دیا جا چکا ہے۔" وکیل نے کھل کر بتایا۔" کلیم دوبارہ تصدیق

کے لیے بھیجا جا سکتا ہے۔ اور اس وقت تک کے لیے تیرا الاٹمنٹ بھی معطل کیا جا سکتا ہے۔"

"تو فیر اپنی طرف سے کیا کاروائی کی گئی۔ مینوں تو کچھ بھی ملوم نہیں۔" رحیم داد کے بشرے سے پریشانی صاف جھلک رہی تھی اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ وکیل کو باور کرانے کے لیے زور دے کر کہا۔" ویسے جی، یہ درخواست بالکل جھوٹی ہے۔ میرے کلیم میں ذرا بھی گڑبڑ نہیں۔"

"چوہدری! تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" وکیل نے اسے تسلی دی۔" لیکن جعلی کلیموں کا کاروبار آج کل اتنا بڑھ گیا ہے کہ سرکار کو ذرا بھی شبہ ہوتا ہے تو فوراً کاروائی کی جاتی ہے۔ محکمہ آبادکاری بہت چوکنا اور چوکس ہے۔ ہر درخواست پر جھٹ انکوائری کا حکم جاری کر دیا جاتا ہے۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔" کیا بنا انکوائری شنکوائری کا؟"

"اللہ وسایا کے مشورے پر میں نے انکوائری رکوا دی تھی۔" وکیل نے بتایا۔" اس طرح اس وقت معاملہ دب گیا تھا۔ پر اب اطلاع ملی ہے کہ دوبارہ انکوائری شروع ہونے والی ہے۔ اس سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ فائل ایک بار پھر دبوا دی جائے۔ پہلے ہزار روپے دیے تھے، اب دو ہزار دینے پڑیں گے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ دو ہزار روپے دے کر ایک بار فیر معاملہ دبا بھی دیا گیا تب بھی اگے کسی وقت اٹھ سکتا ہے۔"

"بالکل اٹھ سکتا ہے۔" وکیل نے اعتراف کیا۔" اور یہ بھی سمجھ لے کہ انکوائری اگر ایک بار شروع ہو گئی تو تیرا الاٹمنٹ بھی منسوخ ہو جائے گا۔ یہی سب سے بڑا خطرہ ہے اور اسی سے بچنے کے لیے پہلے بھی معاملہ کو دبا دیا گیا تھا۔"

"یہ تو بہت پریشانی کی گل ہے۔" رحیم داد کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے جھلکنے لگے۔ جن کو وہ بار بار پونچھتا۔

"اس خطرے سے مکمل طور پر بچنے کی ایک ہی صورت ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" رحیم داد نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"جو کلیم افسر انکوائری کر رہا ہے۔" وکیل نے بتایا۔" وہ پانچ ہزار روپے مانگتا ہے۔

کہتا ہے کہ درخواست کے ساتھ پوری فائل ہی تیرے سامنے پھاڑ کر جلا دے گا۔"

"ایسا ہو جائے تو سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔" رحیم داد کے چہرے سے قدرے اطمینان جھلکنے لگا۔ مگر جلد ہی پھر پریشانی چھا گئی۔ الجھے ہوئے لہجے میں بولا "پر سوال تو یہ ہے کہ پنج ہزار روپے آئیں گے کہاں سے۔ اتنا روپیہ نہ میرے پاس ہے نہ زیں دارنی کے۔"

"سوچ لے چوہدری! اس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ میں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہوں کہ افسر تحقیقات سے کچھ دنوں کی مہلت لے لوں۔"

"کتنے دنوں کی مہلت مل جائے گی؟" رحیم داد نے وکیل سے پوچھا۔

"میرے کہنے پر وہ مہینہ بھر انتظار کر سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔"

وکیل اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "مجھے اب جانا ہے۔ چوہدری! تو جلد سے جلد روپے کا بندوبست کر لے ورنہ الاٹمنٹ ایک بار معطل یا منسوخ ہو گیا تو دوبارہ حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ بات اصلی یہ ہے جی کہ کلیم ہولڈر مہاجر بہت زیادہ تعداد میں ہیں اور متروکہ جائیداد اب اتنی کم رہ گئی ہے کہ کلیم ہولڈر چھپی ہوئی متروکہ جائیداد کا پتہ لگانے کے لیے روپیہ بھی خرچ کر رہے ہیں اور بھاگ دوڑ میں بھی مصروف ہیں تاکہ حالیہ سرکاری احکامات کی رُو سے اس خدمت کے صلے میں انہیں اس کا الاٹمنٹ مل جائے۔"

"تیں نوں زیں دارنی سے نہیں ملنا؟" رحیم داد نے اُسے ٹوکا۔

"میں دوبارہ آؤں گا۔" وکیل نے کہا۔ "اس سے بھی ملوں گا اور تجھے صحیح صورتِ حال بتاؤں گا۔ اس عرصے میں تو رقم کا بندوبست کرنے کی کوشش کر۔"

وکیل چلا گیا۔ کمرے میں سکوت پھیل گیا۔ رحیم داد کے چہرے پر پریشانی چھائی تھی۔ زادرخان نے اسے اس قدر پریشان پایا تو دل جوئی کی کوشش کی۔

"چوہدری! فکر کرنے کی کوئی گل نہیں۔ ویسے تو احسان شاہ سے مل کر پانچ ہزار روپے کا بندوبست بھی کیا جا سکتا ہے۔ مجھے پورا پورا بھروسہ ہے وہ انکار نہیں کرے گا۔ تیری ہر طرح مدد کرے گا۔" اس نے نظر بھر کر رحیم داد کے چہرے کو دیکھا۔ "پر میں سمجھتا ہوں اس سے کم میں بھی کام ہو سکتا

ہے۔ آبادکاری کے محکمے میں اپنی بہت جان پہچان ہے۔ آئندہ وکیل آئے تو اس سے کلیم کے کاغذات واپس لے لینا۔ آگے کی تو مجھ پر چھوڑ دے۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔" ایک فائل بھی تو غائب کرانی ہے۔ اس کے لیے پانچ ہزار کی رقم بہت ہے۔ میں بہت کم میں کام کرا دوں گا۔ ہو سکتا ہے ہزار روپے میں کام ہو جائے۔ میری تو یہی کوشش ہوگی۔"

"صرف ہزار روپے میں!" رحیم داد حیرت زدہ ہو کر بولا" نہیں جی۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔"

"تو مجھے موکع تو دے۔" نادر نے گردن اونچی کی۔ مستعدی سے بولا۔" چوہدری! تو نے مجھے منیجر لگایا ہے۔ اب مجھے اپنی کارگزاری دکھانے کا موکع بھی تو دے۔ یہ تو کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ وکعت آنے پر تو خود دیکھ لے گا میں کتنے کام کا بندہ ہوں اور کیسی کیسی خدمت انجام دے سکتا ہوں۔ تو مجھ پر پورا پورا اعتماد کر سکتا ہے۔" اس نے ایک بار پھر رحیم داد کو تسلی دی۔" فکر کرنے یا پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

دونوں کچھ دیر اس مسئلہ پر بات کرتے رہے۔ رحیم داد اپنے کلیم کے بارے میں بہت پریشان اور گھبرایا ہوا تھا۔ اُسے اپنی زمین داری نکل جانے کا خطرہ رہ رہ کر ڈرا رہا تھا۔ لیکن نادر خاں نے اس طرح تسلی دی اور اس اعتماد کے ساتھ اس کا حوصلہ بڑھایا کہ وہ بہت حد تک مطمئن ہو گیا۔ نادر اب اس کی ایک اہم ضرورت بن گیا تھا۔

☆

رحیم داد اور نادر خاں پروگرام کے مطابق جمیلہ کے پاس پہنچے۔ وہ گول کمرے میں دونوں کا انتظار کر رہی تھی۔ ان کے پہنچتے ہی اُس نے زمین داری کے کاغذات اور رجسٹر منگوائے۔ وہ انہیں دیکھتی رہی اور ضروری تفصیلات بتاتی رہی۔ نادر خاں بیچ بیچ میں سوالات کرتا جاتا۔ جمیلہ ان کے جواب دیتی۔ وضاحت کرتی۔ جو بات نادر خاں کی سمجھ میں نہ آتی اُسے دوبارہ بیان کرتی۔ رحیم داد خاموش بیٹھا ان کی باتیں سنتا رہا اور زمین داری کے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کرتا رہا۔

کئی روز تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ نادر خاں ایک ایک دستاویز اور کاغذ دیکھتا۔ رجسٹروں کے اوراق الٹتا پلٹتا۔ ہر تحریر کو توجہ سے پڑھتا۔ جو پوچھنا ہوتا بے دھڑک پوچھتا۔ کہیں کہیں اپنی رائے کا بھی اظہار کرتا۔ مشورہ بھی دیتا جاتا۔ تبصرہ بھی کرتا۔ اس طرح وہ جمیلہ پر اپنے تجربے اور معلومات کی دھاک بٹھانا چاہتا تھا۔ اور اس میں وہ کامیاب بھی رہا۔ جمیلہ اس کی باتوں سے خاصی متاثر نظر آتی تھی۔

انھی دنوں کا ذکر ہے۔ ایک شام رحیم داد باغ میں بیٹھا تھا۔ نادر بھی موجود تھا۔ ان کے سروں پر صاف شفاف نیلا آسمان جھلک رہا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ ہواؤں میں نرمی اور شگفتگی تھی۔ برسات کے آخری ایام کی یہ دم بہ دم رنگ بدلتی شام بڑی سہانی اور خوشگوار تھی۔ رحیم داد فضا کی رنگینی سے کچھ اس قدر متاثر ہوا کہ اس کا چہل قدمی کو جی چاہا۔ وہ اٹھا تو نادر خاں بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں ٹہلتے ہوئے نہر کی طرف نکل گئے۔

سورج کی الوداعی کرنیں درختوں کی بلندیوں پر سونا بکھیر رہی تھیں۔ شام کا دھندلکا ہوتے ہوئے فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ روشنی مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ رحیم داد اور نادر خاں واپسی کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ دور سے شیدا آتا نظر آیا۔ نادر خاں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ کہنے لگا "چوہدری! یہ تو شاہ جی کا ملازم، شیدا نظر آتا ہے۔ لگتا ہے اسے شاہ جی نے تیرے پاس بھیجا ہے۔" دونوں ٹھہر گئے۔ ذرا دیر میں شیدا قریب آگیا۔

رحیم داد نے مسکرا کر اس سے پوچھا "شیدے! تو آج اِدھر کیسے آگیا؟"

وہ بولا "شاہ جی نے تجھے بلوایا ہے۔ کہا ہے کل شام اس کی جیپ یہاں پہنچ جائے گی۔ وہ تیرا انتظار کرے گا۔"

"شاہ جی سے بولنا، جیپ اِدھر نہ بھیجے۔" رحیم داد نے کہا "میں کل نہیں، پرسوں شام تک اس کے پاس پہنچ جاؤں گا۔" وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش رہا۔ پھر کچھ سوچ کر پوچھا "کوئی بہت ضروری کام تو نہیں؟"

"پتہ نہیں جی۔" شیدا بولا "کوئی کام ہی ہوگا۔ تب ہی تو بلوایا ہے۔"

رحیم داد نے مزید بات نہ کی۔ صرف اس قدر کہا" اب تو جا۔ شاہ جی سے کہنا میں ضرور آؤں گا"
شیدا چلا گیا۔ رحیم داد اور نادر گاؤں کی طرف واپس ہوئے۔ رحیم داد نے چلتے چلتے کہا" میں
شاہ جی سے خود بھی ملنا چاہتا تھا۔ ضروری بات چیت کرنی تھی۔ اب تو اس نے خود ہی بلوایا ہے۔
جانا ہی پڑے گا۔"

"شاہ جی، آپ کو جی بہت مانتا ہے۔ جب بھی میرے سامنے ذکر آیا اس نے ہمیشہ محبت
اور پیار سے یاد کیا۔ کہنے کو تو وہ ادھر کا بہت وڈا جگیردار ہے پر یاروں کا یار ہے۔ وکت پر کام آنے
والا۔ ایک بار جو وعدہ کرے گا۔ اسے پورا کرنے کی ہر طرح کوشش کرے گا۔ وڈے لوگوں کی یہی
تو خوبی ہوتی ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ اس نے نادر خاں کی باتوں پر کسی ردِّ عمل کا اظہار نہ کیا۔ کچھ دور تک
خاموش چلتا رہا۔ پھر اس نے مڑ کر نادر خاں کی جانب دیکھا۔ اسے مخاطب کیا" نادر! تو جمیلہ سے
زمیں داری کے معاملات جلد سے جلد سمجھنے کی کوشش کر۔"

"وہ تو جی میں کر ہی رہا ہوں۔"

"یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ پر اب میں تیرے ساتھ جمیلہ کے پاس نہ جا سکوں گا۔" رحیم داد
نے کہا" شاہ جی کے پاس جانا ضروری ہے۔ اس نے بلایا بھی ہے۔ مہمان خانے میں خالی پڑے
پڑے دل بھی گھبراتا ہے۔ شاہ جی کے ساتھ اچھا وکت گزرے گا۔"

"چوہدری! میں تو کہتا ہوں اس دفعہ تو شاہ جی کے ساتھ ہفتہ دس روز گزار۔ ذرا طبیعت
بہل جائے گی۔" نادر نے مشورہ دیا" ادھر کی فکر نہ کر۔ میں زمیں داری کا سارا حساب کتاب
سمجھ لوں گا۔ اگر اس نے کاغذات اور رجسٹر دے دیئے تو انہیں اپنی تحویل میں لے لوں گا۔ تو شاہ جی
کے ساتھ آرام سے وکت گزار۔ تو نے ادھر مجھے جس کام پر لگایا ہے اسے چنگی نال پورا کر لوں گا۔"

"کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔" رحیم داد نے اس کا مشورہ قبول کرنے کا عندیہ دیا" جمیلہ کے پاس
جا کر میں کرتا بھی کیا ہوں۔ چپ کر کے بیٹھا ہی رہتا ہوں۔ تم دونوں کی باتیں سنتا رہتا ہوں۔ زمینداری
کے بارے میں میں نوں جو کچھ سمجھنا تھا سمجھ لیا۔ اب تو تیرے سمجھنے اور جاننے کی باتیں ہیں۔ تو

انہیں سمجھ جائے گا۔ کاغذات اور رجسٹر جمیلہ آسانی سے دے سکے تو انہیں ضرور اپنے قبضے میں لینے کی کوشش کرنا۔"

"وہ تو جی میں کر ہی لوں گا۔ اُمید تو ہے کہ وہ کاغذات اور رجسٹر میرے حوالے کر دے گی۔" نادر خاں نے اپنے اعتماد کا اظہار۔" پر ایک گل سمجھ نہیں آرہی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" رحیم داد نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"تو اتنے دن پنڈ سے غیر حاضر رہنے کا زمیں داری سے کیا بہانہ بنائے گا؟" نادر خاں نے اپنی الجھن بیان کی۔

"یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔" رحیم داد نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔

دونوں باتیں کرتے ہوئے باغ میں واپس پہنچ گئے۔ شام کا اندھیرا اب ہر طرف پھیل گیا تھا۔ گاؤں کے گھروں سے چولھوں کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ جگہ جگہ چراغ جھلملاتے نظر آتے تھے۔ باغ کے ایک گوشہ میں نوکروں نے لیمپ روشن کر دیا تھا۔ رحیم داد تھکا ہوا ایک کرسی پر بیٹھ گیا مگر نادر خاں نہ ٹھیرا۔ وہ رحیم داد سے اجازت لے کر مہمان خانے کی سمت چلا گیا۔

صبح ناشتہ کے بعد معمول کے مطابق دونوں جمیلہ کے پاس پہنچے۔ نادر دیر تک جمیلہ سے زمیں داری کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرتا رہا۔ ضروری باتیں پوچھتا رہا۔ وہ اسے بتاتی رہی۔ ہر بات سمجھانے کی کوشش کرتی رہی۔ لگ بھگ سات سال کا حساب تھا۔ کچھ رجسٹروں میں درج تھا۔ کچھ رسیدوں اور کاغذ کے پرزوں پر متفرق شکل میں تھا۔ دستاویزات بھی اسی طرح منتشر اور بے ترتیب تھیں۔ نادر خاں ہر بات اور ہر تفصیل سمجھنا چاہتا تھا۔

جمیلہ حافظے اور یادداشت سے کام لیتی۔ بار بار الجھتی اور جب کسی معاملہ میں زیادہ اُلجھن میں پڑ جاتی تو بات ادھوری چھوڑ کر دوسرے روز بتانے کا وعدہ کرتی۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ نادر ایک پرانے بیع نامہ کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ جمیلہ کو صحیح طور پر اس کی نوعیت کا علم نہ تھا۔ اس نے بار بار ذہن پر زور دیا مگر کچھ یاد نہ آیا۔ آخر اس نے زچ ہو کر بے زاری سے کہا۔

" نادر! میں اس کے بارے میں کل سوچ کر بتاؤں گی۔ آج مجھے یاد نہیں آرہا۔ اللہ وسایا کے مرنے کے بعد مجھے بھولنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ پہلے ایسی نہ تھی۔ دماغ پر زور دیا تو فوراً یاد آجاتا تھا۔" اس نے گہری سانس بھری۔" جانے مجھے کیا ہو گیا۔" اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے نادر کو دیکھا۔" اچھا اب تو جا۔ تجھ سے کل سویرے گل بات ہو گی۔"

نادر خاں نے کسی قسم کا اصرار نہ کیا۔ مؤدب ہو کر بولا۔" ٹھیک ہے زمیں دارنی! جیسی تیری مرضی۔ کل بات ہو جائے گی۔" اس نے میز پر بکھرے ہوئے کاغذات سمیٹے۔ مسلیں اکٹھا کیں انہیں تہہ کر کے رجسٹروں پر رکھا اور بستہ باندھ کر جمیلہ کے سامنے بڑھا دیا۔ وہ رخصت ہونے کے لیے اٹھا۔ جمیلہ سے پوچھا۔" مجھے اجازت ہے جی۔ میں کل صبح آجاؤں گا۔"

رحیم داد، جو دیر سے چپ بیٹھا تھا۔ نادر کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔" نادر! تو جا۔ میں نوں زمیں دارنی سے کچھ ضروری گل بات کرنی ہے۔"

نادر چلا گیا۔

جمیلہ نے رحیم داد سے دریافت کیا۔" چوہدری! تجھے ایسی کیا ضروری گل بات کرنی ہے۔ کوئی خاص بات ہے؟"

" خاص بات تو نہیں۔" رحیم داد نے مدھم لہجے میں کہا۔" تیں نوں یہ بتانا تھا کہ میں کل بہاولنگر جا رہا ہوں۔ اب تجھ سے واپسی پر ہی مل سکوں گا۔"

جمیلہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دریافت کیا۔" چوہدری! تو بہاول نگر جا رہا ہے؟"

" جانا تو میں نوں تخت محل ہے۔" رحیم داد نے جواب دیا۔" پہلے پاک پتن جاؤں گا۔ وہاں سے بہاول نگر کے رستے تخت محل چلا جاؤں گا۔"

" پر تو نے وہاں کس لیے جانا ہے؟ پہلے تو کبھی بتایا نہیں۔" جمیلہ ابھی تک حیرت زدہ تھی۔

" کل شام ایسا ہوا کہ میں ٹہلتا ہوا نہر کی طرف چلا گیا۔ اچانک ادھر اپنا ایک پرانا یار مل گیا۔ وہ بھی مہاجر ہے۔ اس کا نام سلامت ہے۔ رہنے والا تو وہ ہوشیار پور کا ہے پر جب ہم مہاجر بن کر لہور پہنچے تو دونوں والٹن کیمپ میں اکٹھے تھے۔ مجھے خوشاب بھیجا گیا تو وہ بھی میرے

ساتھ ہی تھا۔ برسوں ہم اکٹھے رہے۔ کئی سال بعد کل اس سے ملاقات ہوگئی ہے۔"

"وہ کہاں رہتا ہے؟" جمیلہ نے پوچھا۔

"آج کل وہ اوکاڑے میں ہوتا ہے۔" رحیم داد نے بتایا۔" پچھلے دنوں وہ بہاول نگر گیا تھا۔ واپسی پر دیپال پور جا رہا تھا۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ میری گھر والی اور بچے تخت محل کے نزدیک ایک پنڈ میں ہیں۔ جب سے یہ سنا ہے دل چاہتا ہے چھیتی نال وہاں پہنچ جاؤں۔"

"یہ تو بہت ہی اچھی خبر ہے۔" جمیلہ خوشی سے مسکرانے لگی۔" چوہدری! تو آج ہی کیوں نہ چلا گیا؟"

"تجھے بھی تو یہ اطلاع پہنچانی تھی۔ اچانک چلا جاتا تو جانے تو میرے بارے میں کیا سوچتی۔" رحیم داد بھی مسکرانے لگا۔" اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ سلامت کل دوپہر تک پاک پتن پہنچے گا۔ وہاں میرا انتظار کرے گا۔ میں ایک روز پاک پتن میں اس کے ساتھ ہی ٹھیروں گا۔ اسے اپنے کاروبار کے سلسلہ میں اُدھر کچھ ضروری کام ہے۔ دوسرے روز وہ مجھے تخت محل لے جائے گا۔"

"چوہدری! تو نے سلامت کو یہیں بلا لیا ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی پاک پتن چلا جاتا۔"

"میں نے تو یہی کہا تھا پر وہ تیار نہ ہوا۔ اُسے کچھ بہت ضروری کام کرنے ہیں۔ وہ مجھے پاک پتن ہی میں ملنے کو کہہ گیا ہے۔" رحیم داد نے لہجے میں رقّت پیدا کرنے کی کوشش کی۔" زیں دارنی! دعا کر، مجھے میرے بچھڑے ہوئے بال بچے مل جائیں۔ یوں سمجھ، مجھے سب کچھ مل جائے گا۔ اپنی کھوئی ہوئی ساری خوشیاں پا لوں گا۔"

"میں نوں پتہ ہے چوہدری تو ان سے بچھڑ کر کتنا دکھی ہے۔" جمیلہ نے اظہار ہمدردی کیا۔" وہ تجھے مل جائیں تو نہ پوچھ مجھے کتنی خوشی ہوگی۔ میں انہیں اپنے ساتھ ہی حویلی کے اندر ہی ٹھیرا لوں گی۔"

"نہیں زیں دارنی! ان کے یہاں رہنے سے تجھے تکلیف ہوگی۔"

"کوئی تکلیف شکلیف نہیں ہوگی۔" جمیلہ نے زور دے کر کہا۔" تو چنتا نہ کر۔ میرے پاس رہنے کو اوپر کی منزل پر تین کمرے ہیں۔ چوہدری! ویسے یہ حویلی تو اب تیری ہی ہے۔ میں تو صرف دن کے

سمے نیچے رہنی ہوں۔ سارے ہی کمرے خالی پڑے ہیں۔"

رحیم داد خاموش رہا مگر جمیلہ خاموش نہ رہی۔ اس نے چند ہی لمحے سکوت کے بعد دریافت کیا۔" چوہدری! تجھے پورا وشواس ہے کہ اطلاع بالکل صحیح ہے۔"

"میں نوں تو پکا یقین ہے۔" رحیم داد نے جمیلہ کو باور کرانے کی کوشش کی۔" سلامت جھوٹا لیاڑی نہیں ہے۔ اسے مجھ سے ہمدردی بھی ہے۔ ویسے بھی اس نے ہمیشہ میری مدد کی ہے۔"

جمیلہ کے چہرے پر مسرت سے سرخی پھیل گئی۔ کہنے لگی۔" چوہدری! تو تخت محل جاکر فوراً انہیں یہاں لے آ۔ میں تیرے اور تیرے ٹبر کے رہنے کے لیے حویلی کے نچلے حصے میں بندوبست کرائے دیتی ہوں۔ تو واپس آئے گا تو تجھے سب کچھ بالکل ٹھیک ٹھاک ملے گا۔ تو ان کے ساتھ آرام سے رہے گا۔"

رحیم داد نے جمیلہ کی بات مان لی اور یہ وعدہ کیا کہ بیوی بچوں کو لے کر وہ حویلی ہی میں آئے گا۔ اور یہیں قیام کرے گا۔ جمیلہ یہ سن کر بہت خوش ہوئی۔ بات بات پر مسکراتی۔ اسے اس قدر خوش دیکھ کر رحیم داد نے اطمینان کی سانس لی۔ اسے یقین ہو گیا کہ پچھلے دنوں اس کے بارے میں، جمیلہ کے ذہن میں جو شک و شبہ پیدا ہو گیا تھا، اس اطلاع سے پوری طرح رفع ہو جائے گا۔ رحیم داد زیادہ دیر جمیلہ کے پاس نہ ٹھیرا۔ اُٹھ کر مہمان خانے میں آ گیا۔

✡

رحیم داد نے تانگہ بلوایا۔ اس میں سوار ہوا۔ بس اسٹینڈ پہنچا اور لاری سے حویلی اسٹیشن کے راستے سہ پہر تک احسان شاہ کے پاس پیراں والہ پہنچ گیا۔ احسان شاہ اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ حسب معمول بہت گرم جوشی سے ملا۔

دونوں باغ میں گئے اور ایک گھنے درخت کے سائے میں پڑی ہوئی کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ آسمان پر بادل تیزی سے دوڑ رہے تھے۔ کبھی سورج نکل آتا کبھی سایہ پھیل جاتا۔ ڈھلتے دن کی دھوپ میں تمازت کم ہو چکی تھی مگر ہوا ٹھیری ہوئی تھی۔ اُمس اور گھٹن بڑھ گئی تھی۔ رحیم داد لمبے سفر سے آیا تھا۔ اس کا جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ چہرے اور کپڑوں پر گرد جمی تھی۔

احسان شاہ نے اس کی یہ حالت دیکھی تو ہنس کر بولا "چوہدری! تو بہت تھکا ہوا نظر آرہا ہے۔ پہلے نہا دھو لے، پھر آرام سے گل بات ہوگی۔ تجھ سے تو بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔ تو آج رات یہیں ٹھیرے گا۔"

"اس بار تو میں تیرے ساتھ زیادہ ہی دن ٹھیرنے کے ارادے سے آیا ہوں۔ کپڑے لتّے بھی لایا ہوں۔ مہمان خانے میں خالی پڑے پڑے دل بہت گھبراتا تھا۔"

"تیرا ہی گھر ہے چوہدری! جب تک جی چاہے ٹھیر۔" احسان شاہ نے قہقہہ بلند کیا۔ "یہ بھی کوئی پوچھنے کی گل ہے۔ مجھے تو خوشی ہوگی۔ تیرے ساتھ اچھا وکت کٹ جائے گا۔ اب تو غسل خانے میں جا کر فٹا فٹ نہالے۔ شام کو تیرے ساتھ محفل جمے گی۔"

احسان شاہ نے شیدا کو بلایا۔ رحیم داد اس کے ہمراہ چلا گیا۔ شیدا نے اس کے ٹھیرنے کے لیے پہلے ہی ایک کمرے میں بندوبست کر دیا تھا۔ رحیم داد نے غسل کیا۔ کمرے میں آیا۔ ٹرنک سے اُجلے کپڑے نکال کر پہنے۔ تر و تازہ ہو کر دوبارہ باغ میں پہنچا۔ شام دبے قدموں درختوں کی بلندی سے نیچے اتر رہی تھی۔ احسان شاہ باغ کے ایک گوشہ میں بیٹھا تھا۔ سامنے میز پر وسکی کی بوتل اور دو گلاس رکھے تھے۔

رحیم داد بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مسکرا کر بولا "شاہ جی! تو شام ہوتے سے پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے۔"

احسان شاہ نے وسکی کا گھونٹ بھر کر گلاس میز پر رکھا۔ بھیگی ہوئی مونچھوں کو ہاتھ سے صاف کیا۔ ہنس کر گویا ہوا "چوہدری! اس کے بغیر زندگی میں کوئی لطف نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے سو رہا ہوں۔ تھک گیا ہوں۔ طبیعت بجھی بجھی رہتی ہے۔ پر دو ڈبل لگاتے ہی نہ سستی رہتی ہے نہ تھکن۔ انگ، انگ چہکنے لگتا ہے۔ ایمان لگتی گل ایہہ اے چوہدری۔" اس نے بوتل کی طرف اشارہ کیا "یہ بھی کیا زوردار چیز ہے۔ وہ کیا کہا ہے، کسی شاعر نے۔

ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب ہے۔

اس مصرعہ کو اپنی بھونڈی آواز میں گنگناتے ہوئے اس نے میز پر رکھے ہوئے دوسرے

گلاس میں وسکی انڈیلی۔ پانی ڈالا اور ایک بڑا پیگ بنا کر بولا۔ "چوہدری! اب تو بھی شروع ہو جا۔"

رحیم داد نے گلاس اٹھایا۔ گھونٹ بھرا۔ چند لمحے خاموش رہا۔ وسکی کی تلخی کا احساس کم ہوا تو بولا۔ "پچھلے دنوں تو بہت گڑبڑ معاملہ ہو گیا تھا۔"

"کیا ہو گیا۔ کوئی خاص گل بات؟"

"خاص ہی گل بات کہو رے۔" رحیم داد نے بتایا۔ "وہ ایسا ہوا جی کہ میں ایک روز جمیلہ کے پاس گیا۔ اس نے باتوں باتوں میں اپنے بارے میں پچھلی باتیں سنائیں۔ سب ہی کچھ بتا دیا۔ کچھ بھی نہ چھپایا۔ اس کی باتیں سن کر طبیعت میں ایسی اُبال اٹھی کہ میں نے اس سے دل کی بات کہہ دی۔"

"دل کی بات کہہ دی؟" احسان شاہ نے چونک کر حیرت سے پوچھا۔ "صاف صاف بتا۔"

"پہلے تو میں نے گول مول بات کی۔ فیر دبی زبان سے کہا کہ وہ میری گھر والی بن جائے۔"

رحیم داد نے بڑا گھونٹ بھرا۔

"کیا بولی وہ؟" احسان شاہ نے دریافت کیا۔

"بولی تو وہ کچھ نہیں۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ خوب ٹسوے بہائے۔ اس نے میری بات کو پسند نہیں کیا۔ اس کے اس طرح رونے پر میں نے یہی اندازہ لگایا۔"

"تو نے جلدی کی چوہدری۔" احسان شاہ کے لہجے میں تشویش کا پہلو نمایاں تھا۔ "ابھی ایسی بات کہنے کا وکت نہیں آیا تھا۔ تجھے صبر سے کام لینا تھا۔ ایسی باتیں اس طرح نہیں کی جاتیں۔ تو نے اس سے یہ بات کہنی ہی تھی تو کسی اور کے ذریعے کہلواتا۔ یہ جاننے کی کوشش کرتا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ تیرے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے۔" وہ لمحہ بھر سر جھکائے سوچتا رہا۔ پھر گردن اٹھا کر قدرے تیکھے لہجے میں بولا۔ "تو نے سارا معاملہ گڑبڑ کر دیا۔ اب ....."

"گڑبڑ تو ہو گیا تھا۔" رحیم داد اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "پر بعد میں سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔"

"وہ کیسے؟" احسان شاہ نے تعجب سے پوچھا۔

"بس ہو گیا۔ شاہ جی تو فکر نہ کر۔" رحیم داد نے احسان شاہ کو اطمینان دلایا۔ "اب اس کے

دار ہیں میری طرف سے کوئی شک و شبہ نہیں رہا۔"

"تجھے یقین ہے؟"، احسان شاہ نے استفسار کیا۔

"بالکل یقین ہے۔" رحیم داد نے مسکرا کر جواب دیا۔" واپس جاؤں گا تو مہمان خانے کی بجائے حویلی کے اندر ہی ٹھیروں گا۔ وہ اوپر کی منزل پر رہے گی اور میں نیچے کے حصے میں۔ اس نے خود ہی کہا بلکہ زور دے کر کہا۔ میں تو انکار کرتا رہا۔"

"چوہدری! تو نے کیا چکر چلایا۔ حویلی میں اس کے ساتھ رہا تو وہ آسانی سے تیرے ہاتھ آ جائے گی۔" احسان شاہ کھلکھلا کر ہنسا۔" پر اب جلد بازی نہ کرنا ورنہ کام خراب ہو جائے گا۔"

رحیم داد نے مزید تفصیل نہ بتائی۔ یہ بھی نہ بتایا کہ وہ تخت محل جا کر اپنے بچھڑے ہوئے بیوی بچوں کو لانے کا بہانہ کر کے پیراں والہ آیا تھا۔ وہ خاموشی سے وسکی کی چسکی لگاتا رہا۔

احسان شاہ نے پوچھا" نادر کیسا چل رہا ہے؟"

" وہ تو جی بہت کام کا بندہ ہے۔" رحیم داد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔" اس نے جمیلہ کو ایسا رام کیا کہ وہ ساری زمین داری اور اس کی دستاویزات میرے حوالے کرنے پر خود ہی راضی ہو گئی۔ آج کل وہ نادر کو زمین داری کے بارے میں ایک ایک بات سمجھا رہی ہے۔ ہر کاغذ اور ہر دستاویز کے بارے میں بتا رہی ہے۔ ویسے شاہ جی وہ دیکھنے میں جتنی ہوشیار اور تیز لگتی ہے اتنی ہے نہیں۔ اس کا دل بہت نرم ہے۔ پہلے تو وہ نادر سے بہت ناراض تھی۔ اس کو منیجر لگانے کے بہت خلاف تھی۔ پر جب نادر نے اپنی پریشانی اور بے روزگاری کا حال سنایا تو ایک دم موم کی طرح پگھل گئی۔ اسے رکھنے پر فوراً تیار ہو گئی۔ سچی گل تو ایہہ اے کہ وہ کسی کو تکلیف اور پریشانی میں نہیں دیکھ سکتی۔"

" مجھے جمیلہ کے بارے میں زیادہ پتہ نہیں۔ سنا ہی سنا ہے۔" احسان شاہ بولا" پر نادر بہت اونچی چیز ہے۔ وہ تیرے لیے بہت کارآمد ثابت ہو گا۔ اب تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں وہ زمین داری ایسے چلائے گا کہ تجھے بھی زمین داری کا مزا آ جائے گا۔ ابھی تک تو کوٹلہ ہرکشن میں مزارعوں کی چل رہی تھی۔ تو نے تو پتہ ہے اللہ وسایا تو مزارع تھا اور مزارع ہی رہا۔ اس نے مزارعوں

کا ناس مار دیا تھا۔ ان کا دماغ خراب کر دیا تھا۔"

"ان کا دماغ تو اب تک خراب ہی ہے۔" رحیم داد نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"اُس کا اثر آس پاس کے زمیں داروں پر بھی پڑا۔ وڈّے زمیں دار، جن کے پاس مزارعوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، بہت پریشان رہتے تھے۔" احسان شاہ نے اللہ وسایا مرحوم کے خلاف اپنی نفرت اور کدورت کا اظہار کیا۔ "تجھے معلوم نہیں اللہ وسایا کے کتل پر اِدھر کے سارے ہی وڈّے زمیں دار کتنے خوش ہوئے۔ سب اس سے خار کھاتے تھے۔"

"خطرہ تو اس کی طرف سے تجھے بھی تھا۔"

"بالکل تھا۔" احسان شاہ نے رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری! تیرے رستے کا کانٹا صاف ہو گیا۔ پسح کہتا ہوں اگر اللہ وسایا کا صفایا نہ ہوتا تو وہ کب کا تجھے صاف کر چکا ہوتا۔ وہ تیری جائیداد پر کبضہ کرنے کی پوری تیاری کر چکا تھا۔ اس کے ارادے بہت خطرناک تھے۔"

رحیم داد نے اس کی باتیں سُنیں۔ مگر کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا۔ چپ بیٹھا وہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔ احسان شاہ کو اس کی خاموشی ناگوار گزری۔ تیکھے لہجے میں بولا۔

"چوہدری، تجھے میری باتوں کا یکین نہیں؟"

رحیم داد ہڑبڑا کر بولا۔ "ہے بالکل ہے۔" اس نے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے بات بنائی۔ "وہ ایسا ہے جی۔ میں جمیلہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شاہ جی وہ بُری زنانی نہیں ہے۔"

"میں نے کب کہا کہ وہ بُری ہے۔" احسان شاہ نے کہا۔ "وہ تو ایسی زوردار چیز ہے کہ تیرے تو عیش ہو جائیں گے۔ پر پہلے جو غلطی کر چکا ہے اب اسے نہ دھرانا۔ اسے دھیرے دھیرے رستے پر لانا ہو گا۔ کیا سمجھا؟"

"سمجھ گیا، بالکل سمجھ گیا۔" رحیم داد گردن ہلا کر بولا۔

احسان شاہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ رحیم داد بھی ہنسنے لگا۔ احسان شاہ نے ترنگ میں آکر رحیم داد کے گلاس سے اپنا گلاس ٹکرایا۔ وہسکی کا بڑا گھونٹ بھرا۔

رحیم داد بولا۔ "شاہ جی، میں نے تجھے ایک خوش خبری تو سنائی نہیں۔"

"سُنا ضرور سنا۔" احسان شاہ اترا کر بولا۔

"یہ تو میں نیں نوں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ جمیلہ تھوڑے دنوں بعد زمین داری کے سارے کاغذات اور دستاویزات نادر کے حوالے کر دے گی۔" رحیم داد نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔" وہ تو زمین داری سے بالکل الگ ہو جانا چاہتی ہے۔ کہتی تھی کہ میں نے زمین داری سے کیا لینا۔ تو پوری ذمہ داری سنبھال لے میں نے تو اب سکول چلانا اور ڈسپنسری بنانا ہے۔"

احسان شاہ کے چہرے پر مسرت کے بجائے جھنجلاہٹ بکھر گئی۔ نفرت سے منہ بگاڑ کر بولا" یہ سکول شکول کا چکر ختم کر۔ اسے تو اللہ دسایا کے ساتھ ہی ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ کیا تو یہ چاہتا ہے کہ مزارعوں اور کمیوں کے بچے پڑھ لکھ کر ہمارے بچوں کی برابری کریں۔ قانون اور انصاف کی باتیں کریں۔ زمین داروں کو طرح طرح سے تنگ کریں ان کے خلاف گڑبڑ پھیلائیں۔"

"تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے شاہ جی، پر جمیلہ اس کے لیے تیار نہیں ہو گی۔" رحیم داد نے احسان شاہ کی خفگی رفع کرنے کی غرض سے اپنی مجبوری بھی بیان کی "تیں نوں پتہ ہے میں ابھی اسے ناراض نہیں کر سکتا۔ ورنہ سارا معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔"

"میں فوری طور پر سکول بند کرانے کو نہیں کہہ رہا ہوں۔ پر تجھے آگے چل کر ایسا کرنا پڑے گا۔" احسان شاہ نے رحیم داد کی مجبوری محسوس کرتے ہوئے کہا" پر تجھے یہ بات ضرور دھیان میں رکھنا چاہیے کہ زمیں داری شان سے چلانی ہے تو مزارعوں کو اَن پڑھ رکھنا ہو گا۔ یہ بہت ضروری ہے۔ ہر وڈا زمیں دار اور جگیر دار اس معاملہ میں چوکس رہتا ہے۔ میں اس سلسلہ میں تجھے سردار سر امام بخش مزاری کا واقعہ بطور مثال سناتا ہوں۔"

"کون تھا وہ؟"، رحیم داد نے دریافت کیا۔

"وہ ڈیرہ غازی خان کی تحصیل راجن پور میں روجھاں کے مزاریوں کا تمن دار تھا:" احسان شاہ نے بتایا" بہت وڈا جگیر دار ہوتا تھا۔ میرے پیو کا گہرا یار تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں جب بلوچوں نے بغاوت کی تو اسے دبانے میں سردار امام بخش نے بھی انگریزوں کی بہت مدد کی۔" احسان شاہ نے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ سرگوشی کے عالم میں قہقہہ بلند کیا" انگریزوں کی بھی کیا بات تھی۔ اپنے

دشمنوں کو کچلنے میں جتنے سخت تھے، دوستوں کے لیے اتنا ہی وڈا دل رکھتے تھے۔ سردار امام بخش نے ان کی بھرپور مدد کی تو اس کے صلہ میں انہوں نے اسے آنریری مجسٹریٹ بنا دیا اور جب رابرٹ سنڈیمن، ڈپٹی کمشنر لگا تو سردار امام بخش نے انگریزوں کی ہر طرح خدمت کی۔"

"یہ فورٹ سنڈیمن اسی رابرٹ سنڈیمن کے نام پر رکھا گیا تھا؟"

"ہاں جی، یہ وہی سنڈیمن تھا۔ اپنے زمانے کا بہت نامور افسر ہوتا تھا۔ بلوچوں نے بار بار بغاوت کی۔ ان میں بگٹیوں کے علاوہ مزاری بلوچ بھی شامل تھے۔ پر سردار امام بخش کی مدد نے ان کی بغاوتوں کو دبانے میں زبردست کام کیا۔" احسان شاہ ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔ "اس کی اس خدمت پر انگریز بہت خوش ہوئے۔ پہلے اسے نواب فیر سر اور فیر صوبائی درباری بنا دیا۔ خطابات کے ساتھ بہت وڈی جگیر بھی دی۔ انگریز اس پر ایسے مہربان ہوئے کہ اسے پنجاب اسمبلی کا ممبر بھی بنا دیا۔ ویسے سردار سر امام بخش ان کا بہت وفادار بندہ تھا۔ بہت ہوشیار اور سمجھ دار بھی تھا۔"

"تو اس کے بارے میں کوئی واکعہ سنانا چاہتا تھا۔" رحیم داد نے احسان شاہ کو یاد دلایا۔

"ہاں، میں تجھے یہ بتانا چاہتا تھا کہ سردار امام بخش مزاری کتنا ہوشیار تھا۔ ہمیشہ اگے کی سوچتا تھا۔ سچ پوچھ تو دریشکوں نے مزاریوں کو کب کا مٹا دیا ہوتا۔ ان کے ساتھ مزاریوں کی مسلسل لڑائیاں ہوتی رہیں۔ دونوں کبیلوں کے درمیان زبردست دشمنی رہی ہے۔"

"دشمنی ہوئی کس بات پر؟" رحیم داد نے جھوم کر پوچھا۔

"ان دنوں مزاری، خانہ بدوش چاک اور چرواہے ہوتے تھے۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "اپنی بھیڑ بکریاں اور چوکھر گنڈاری کی پہاڑیوں پر چرایا کرتے تھے۔ دریشک بھی خانہ بدوش ہوتے تھے۔ وہ مزاریوں کے چوکھر اور مویشی اٹھا کر لے جاتے۔ تب جمال خاں مزاریوں کا سردار ہوتا تھا۔ اس نے دریشکوں پر چڑھائی کر دی اور کوئی پندرہ دریشک مار ڈالے۔ اس کے بعد دونوں کبیلوں نے ایک دوسرے پر حملے کرنے شروع کر دیے۔ دریشکوں کے ایک حملے میں سردار

جمال خاں کی گھر والی بھی ماری گئی اور سردار کی ماں بھی زخمی ہو گئی۔ مزاریوں کے لیے یہ بہت بے عزتی کی بات تھی۔ اس بے عزتی کو وہ برسوں نہ بھولے۔ اس کا بدلہ لینے کے لیے دریشکوں سے لڑائیاں لڑتے رہے۔" احسان شاہ نے اچانک قہقہہ بلند کیا۔" پر اب مزاری اور دریشک تمن داروں نے مل کر لغاریوں، لنڈ اور کھتران تمن داروں کے خلاف مورچہ لگا رکھا ہے۔"

"تیرا مطلب ہے مزاریوں اور دریشکوں کی پرانی دشمنی ختم ہو گئی؟"

"ختم ہی ہو گئی۔ پر جب تک دونوں میں دشمنی رہی بہت خون خرابہ ہوا۔" احسان شاہ نے جواب دیا۔" ویسے رنجیت سنگھ کے زمانے میں سکھوں نے بھی مزاریوں کو بہت تنگ کیا۔ دیوان ساون مل کا نام تو سنا ہی ہو گا تو نے وہ رنجیت سنگھ کی طرف سے حاکم لگا ہوا تھا۔ اس نے مزاریوں پر سات ہزار فوج کے ساتھ چڑھائی کر دی۔ ان کے تمام ڈھور ڈنگر چھین لیے اور انہیں بھاگ کر پہاڑیوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا آخر لغاریوں کے سردار رحیم خاں نے سکھوں کے ساتھ مزاریوں کی صلح کرا دی۔ ساون مل نے ملتان میں دربار لگایا جس میں مزاریوں کا سردار بہرام خاں خود حاضر ہوا۔ ساون مل نے اسے جگیر کے ساتھ خلعت بھی دی۔"

"یہ تو نے عجب گل سنائی۔ لغاری پہلے مزاریوں کے دوست ہوتے تھے اور اب دشمن ہیں۔" رحیم داد آہستہ آہستہ ہنسنے لگا۔" یہ سردار بہرام خاں کیا سردار امام بخش کا پیو ہوتا تھا؟"

"ہاں، پر بہرام خاں کا پتر دوست علی خاں بھی تھا۔ بہرام خاں کے مرنے پر وہی مزاریوں کا سردار بنا۔ اس کے زمانے میں مزاریوں کا سکھوں سے دوبارہ جھگڑا شروع ہوا۔ سکھوں نے مزاریوں کی بغاوت کو کچل دیا اور انہیں سندھ کی جانب بھگا دیا۔ ادھر دیوان ساون مل بھی کچھ عرصہ بعد ایک لڑائی میں مارا گیا۔ اس کے پتر مول راج نے اس کی جگہ سنبھالی اور مزاریوں سے صلح کر لی۔ پر سردار دوست علی خاں بری عادتوں میں پڑ گیا تھا۔ اس لیے اسے ہٹا کر اس کے چھوٹے بھائی امام بخش خاں کو مزاریوں کے سردار کی حیثیت سے جرگہ میں منتخب کر لیا گیا۔"

احسان شاہ نشے کی جھونک میں بہک کر اصل موضوع سے ہٹ کر دوسری طرف نکل گیا تھا۔ رحیم داد بھی نشے کی دھن میں بھول چکا تھا کہ بات کہاں سے شروع ہوئی۔ سردار امام بخش کا

نام دوبارہ سن کر وہ چونکا۔ اس نے احسان شاہ کو ٹوکا۔

"شاہ جی۔ اس واکعہ کا کیا بنا؟ وہی سردار امام بخش والا جسے تو سنانا چاہتا تھا۔"

"یاد آگیا، بالکل یاد آگیا۔" احسان شاہ خجل ہو کر بولا۔ "بات کدھر سے نکل کر کدھر چلی گئی۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ "وہ ایسا ہوا کہ جن دنوں سردار امام بخش اسمبلی کا ممبر ہوتا تھا۔ اسے کسی کام سے کراچی جانا پڑا۔ سٹیشن سے باہر نکل رہا تھا تو ریلوے کا ایک بابو دوڑ کر آگے بڑھا۔ جھک کر سردار کے پیروں کو چھوا اور ہاتھ باندھ کر ادب سے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ سردار اُسے پہچان نہ سکا۔"

"وہ بندہ تھا کون؟" رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔

"وہ سردار سر امام بخش مزاری کے ایک مزارع کا پُتر تھا۔ بچپن میں گھر سے بھاگ کر کراچی پہنچ گیا تھا۔ وہاں کسی پارسی کا نوکر لگ گیا۔ اس نے اسے اتنا پڑھا لکھا دیا کہ جوان ہو کر وہ ریلوے میں لگ گیا۔ ویاہ بھی کر لیا تھا۔ بچے بھی تھے۔ اس نے خود ہی سردار کو بتایا۔ سردار میں تیرے باندھے کا باندھا ہوں۔ فیر اس نے اپنا اور اپنے پیو کا نام بتایا۔"

"کیا نام تھا اس کا؟" رحیم داد تشنے سے لہرا کر بولا۔

"یہ تو مجھے پتہ نہیں۔" احسان شاہ نے کہا۔ "سردار امام بخش خاں نے اسے غور سے دیکھا۔ کچھ سوچا اور سوچ کر اس سے پوچھا۔ ادھر تجھے کتنی تنخواہ ملتی ہے؟ اس نے بتایا کہ اسے ریلوے سے ۵۰ روپے تنخواہ ملتی ہے۔ سردار بولا۔ میں تجھے سو روپے تنخواہ دوں گا اِدھر کی نوکری چھوڑ اور میرے ساتھ روجھان چل۔ وہ تیار ہو گیا۔ سردار امام بخش مزاری اسے اپنے ساتھ روجھان لے آیا۔"

رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دریافت کیا۔ "شاہ جی یہ بات سمجھ نہیں آئی۔ سردار امام بخش مزاری اُسے دگنی تنخواہ پر کراچی سے اپنے ساتھ کیوں لے آیا؟"

"یہی تو اصلی گل ہے جو میں تجھے بتانا چاہتا ہوں۔" احسان شاہ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "سردار کے منیجر کو اس کے بارے میں پتہ چلا تو وہ بھی تیری طرح بہت حیران ہوا۔ اسے یہ بات پسند بھی نہ آئی۔ ایک روز باتوں باتوں میں اس نے سردار سے اس کے بارے میں گلہ کیا۔ کہنے لگا۔ سردار ایسا بندہ تو دیہہ

روپے سے بھی کم میں مل جائے گا۔ تو اسے سو روپے تنخواہ دے رہا ہے۔ منیجر نے اسے بالکل بیکار اور بہت مہنگا ثابت کر کے نوکری سے نکلوانے کی کوشش کی۔ مگر سردار تیار نہ ہوا۔" احسان شاہ نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔" چوہدری! تجھے پتہ ہے۔ سردار نے منیجر کا سارا گلہ شکوہ سن کر کیا جواب دیا؟"

"کیا جواب دیا اس نے؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"سردار نے اپنے منیجر سے ہنس کر کہا" تو اس راز کو نہیں سمجھ سکتا۔ وہ سو روپے مہینے میں بھی بہت سستا ہے۔ اور اس لیے سستا ہے کہ وہ کراچی میں رہتا تو اس کے بال بچے بھی پڑھتے لکھتے۔ ادھر وہ جہاں میں اپنے رشتہ دار مزارعوں کو ملنے آتے تو ان کے مغز خراب کرتے۔ انہیں طرح طرح سے بھڑکاتے۔ میں نے وہ رستہ ہی بند کر دیا۔ یہاں رہ کر وہ اَن پڑھ کے اَن پڑھ ہی رہیں گے۔ کبھی خطرہ بن کر سامنے نہیں آئیں گے۔ یہ بات سردار امام بخش مزاری نے میرے پیو کو سنائی تھی۔ اور میں نے اپنے پیو سے سنی۔" احسان شاہ نے وسکی کا گھونٹ بھرا۔" چوہدری! غور کر سردار امام بخش مزاری کتنا ہوشیار اور سمجھ دار تھا۔ تب ہی تو مزاریوں کا تمن دار اور اتنا وڈا سردار تھا۔ اسے خطابات ملے۔ جگیر ملی۔ بہت عزت ملی۔ انگریز اسے بہت مانتے تھے اپنا زبردست وفادار بندہ سمجھتے تھے۔"

"سردار امام بخش مزاری نے اپنے بال بچوں کو تو بالکل پڑھایا لکھایا نہیں ہوگا؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"چوہدری! تو بھی کیسی بچوں کی سی گل کرتا ہے۔" احسان شاہ ٹھٹھا مار کر زور سے ہنسا۔ "امام بخش خاں اپنے کبیلے کا سردار تھا۔ بہت وڈا جگیردار تھا۔ اس کے بال بچے بھی سردار اور جگیردار کے بال بچے تھے۔ کسی مزارع کے تو نہیں تھے۔ وہ کیوں نہ پڑھتے۔ انہیں تو تعلیم دلانے کے لیے اس نے لندن بھیجا۔ امریکہ بھیجا۔ بہت پڑھایا لکھایا۔ وہ اور ان کے پُتر بھی وڈے وڈے سرکاری افسر لگے۔ انگریزی راج نہ رہا جی تو کیا فرک پڑتا ہے۔ وہ آج بھی وڈے جگیردار ہیں، سردار اور تمن دار ہیں اور سرکاری افسر بھی لگے ہیں۔ یہ سب سردار سر امام بخش کی زبردست خدمات کا

صلہ ہے۔" اس کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔" سردار امام بخش مزاری کی طرح کے دور اندیش اور سمجھ دار جگیر دار نہ ہوتے نواب تک کتنی ہی جاگیریں کب کی ختم ہو چکی ہوتیں بلکہ جگیر داری اور زمیں داری ہی سرے سے ختم ہو جاتی۔ ایسے ہی جیسے ہندوستان میں ہوا اور مشرقی بنگال میں ہو رہا ہے۔"

☆

شیدا اندھیرے سے نکل کر سامنے آ گیا اور ادب سے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ احسان شاہ نے پوچھا" شیدے، تو نے کچھ کہنا ہے؟"

"ہاں جی، میں نے یہ بتانا ہے کہ سردار مراد خاں شاہانی آیا ہے۔"

" وہ اپنا بھکر والا شاہانی؟" احسان شاہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا" کدھر ہے وہ کب آیا؟" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور شیدا کے ہمراہ چلا گیا۔

رحیم داد خاموش بیٹھا وسکی سے شغل کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد احسان علی شاہ واپس آیا۔ رحیم داد نے برآمدے میں رکھے ہوئے لیمپ کی روشنی میں دیکھا، مراد خاں شاہانی اس کے ہمراہ تھا۔ شاہانی کا قد اونچا تھا۔ جسم مضبوط اور صحت مند تھا۔ خوب گھیر دار بڑی سی شلوار اور ڈھیلی ڈھالی ڈبل گھوڑا بوسکی کی قمیص میں وہ کچھ زیادہ ہی قوی ہیکل لگ رہا تھا۔ رنگت گندمی تھی۔ داڑھی صاف تھی۔ مونچھیں زیادہ گھنی نہ تھیں مگر چہرے پر رعب اور دبدبہ تھا۔ اس کی سرخ سرخ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ عمر میں وہ احسان شاہ سے بہت چھوٹا تھا۔

رحیم داد اس کی بھاری بھرکم شخصیت سے خاصہ مرعوب ہوا۔ وہ احسان شاہ کے ساتھ بے تکلفی سے ہنستا، قہقہے لگاتا آگے بڑھا اور رحیم داد کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ احسان شاہ نے رحیم داد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاہانی سے تعارف کرایا۔

" یہ اپنا یار چوہدری نور الٰہی ہے۔ کوٹلہ ہرکشن میں اس کی زمیں داری ہے۔ گورداسپور کا مہاجر ہے۔ میں پہلے بھی تجھ سے اس کا ذکر کر چکا ہوں۔"

" اچھا، اچھا!" مراد خاں شاہانی نے مسکراتے ہوئے رحیم داد سے کہا" سئیں چوہدری

تو ہے تو جاٹ پر تو نے حلیہ ایسا بنا رکھا ہے کہ پہلی نظر میں بلوچ سردار لگتا ہے۔" اس نے احسان شاہ کی جانب دیکھا۔" شاہ جی میں نے غلط تو نہیں سوچا؟"

" پتہ نہیں چوہدری تے یہ داڑھی کیوں رکھ چھوڑی ہے۔" احسان شاہ نے قہقہہ لگایا۔ ملاں بھی نہیں ہے۔ ہو بھی نہیں سکتا۔ ورنہ مسجد کا حجرہ چھوڑ کر یہاں کیوں بیٹھا ہوتا۔"

" شاہ جی، تو نے چوہدری کو میرے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں۔"

" تجھے کون نہیں جانتا۔ احسان شاہ بولا۔ اس نے مسکراتے ہوئے رحیم داد کی طرف دیکھا۔" چوہدری! یہ بھکر میں بیٹ کے علاکے کا وڈا زمیں دار ہے۔ بیٹ میں تین ہی تو زمیندار خاندان ہیں۔ شاہانی، نوانی اور ڈھانڈلے۔" اس نے گلاس میں وہسکی ڈالی۔" زمیں داری کیا، ان کی تو اُدھر اپنی حکمرانی ہے۔ جو چاہیں کریں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ان سے تو پولس اور حکومت بھی ڈرتی ہے۔" احسان شاہ نے پیگ بنا کر شاہانی کی جانب بڑھایا۔" لے میں نے تیرے لیے ڈبل پیالہ بنایا ہے تو آیا بھی تو دیر سے ہے۔ ہمارا ساتھ کیسے دے گا۔ ہم دونوں تو شام سے لگے ہیں۔"

شاہانی نے گلاس سنبھالا۔ ہونٹوں سے لگایا اور ایک ہی سانس میں غٹاغٹ آدھا گلاس چڑھا گیا۔ احسان شاہ نے دریافت کیا۔

" شاہانی تو اچانک کیسے آگیا؟"

" سئیں، بال بچوں کے ساتھ لہور آیا تھا۔" شاہانی نے بتایا تھا۔" لہور آکر تیرے پاس نہ آتا، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے بال بچوں کو واپس بھکر بھیجا اور خود تیرے پاس آگیا۔ لہور سے ایک سنگتی کی گاڑی مل گئی تھی۔ اچھا سفر گزرا۔" اس نے گلاس اٹھایا۔" پر ادھر تو بارشوں کا کوئی خاص اثر دکھائی نہیں دیتا۔"

" سُنا ہے بیٹ کے علاکے میں سیلاب نے بہت تباہی مچائی۔" احسان شاہ نے کہا۔

" بہت سے جھوک اور پنڈ سیلاب کی زد میں آگئے۔ بستیاں کی بستیاں ویران ہو گئیں۔"

" شاہ جی، وستیاں تو اجڑتی ہی رہتی ہیں۔" شاہانی نے بے نیازی سے کہا۔" برکھا میں

ہمیشہ سندھ چڑھتا ہے اور سال کے سال اپنا بھینٹ اور صدکہ بھی لیتا ہے۔ پر منجی کی فصلوں کو خوب سیراب کرتا ہے۔ اگر دریا نہ چڑھے تو بیٹ کے علاکے میں منجی کے بوٹے سوکھ کر زرد پڑ جائیں۔ یوں سمجھ اپنا تو ناس مار دے۔"

رحیم داد خاموش نہ رہ سکا۔ کہنے لگا" پر سیلاب سے کسان اور مزارع تو برباد ہو جاتے ہوں گے۔ کتنے تو مر بھی جاتے ہوں گے۔"

"مرتے بھی رہتے ہیں۔ بے گھر بھی ہوتے ہیں۔" مراد خاں کی بے نیازی میں فرق نہ آیا۔ "سیلاب کا ریلا وستیوں میں داخل ہوتا ہے تو مویشی اور گھر گرہستی، سب بہا کر لے جاتا ہے۔ جس کا جدھر منہ اٹھتا ہے نکل بھاگتا ہے۔ پر سیلاب کے اترتے ہی سب واپس آ جاتے ہیں اور راضی باضی ہو کر اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا" چوہدری! تو میری طرف کے مزارعوں کو نہیں جانتا۔ بہت صابر و شاکر بندے ہیں۔ کئی تو ایسے سیدھے سادھے ہیں کہ ہوائی جہاز اڑتا ہوا اوپر گزرتا ہے تو ڈر کر کھٹ کے نیچے چھپ جاتے ہیں۔ آج بھی بہت سے ایسے بندے تجھے ملیں گے جنہوں نے ریل تک نہیں دیکھی۔"

"اچھا جی، تیرے علاکے میں ایسے بندے بھی ہیں؟" رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا" یہ تو بہت انوکھی گل سنائی تو نے۔"

شاہانی نے اس دفعہ احسان شاہ کو مخاطب کیا" شاہ جی، ایسا کر، تو میرے ساتھ چل۔ چوہدری کو بھی لے لے۔ یہ اپنا علاکہ دیکھ لے گا۔ تیرا اچھا وکت کٹے گا۔"

"تیری طرف جانے کا یہ زمانہ نہیں۔ ابھی تک ادھر سیلاب کی تباہی مچی ہو گی۔" احسان شاہ رضامند نہ ہوا۔

شاہانی نے مطلع کیا" شاہ جی، تجھے پتہ نہیں۔ سیلاب تو کب کا اتر گیا۔ اب تو بہت اچھا موسم ہے۔"

"جاڑوں میں تیرے پاس آؤں گا۔ چوہدری کو بھی ساتھ لیتا آؤں گا۔" احسان شاہ نے یہ کہہ کر قہقہہ لگایا" ویسے تیرے علاکے میں اچھی رن نہیں ملتی۔"

"میری جگیر میں رن نہیں ملتی۔ ایسی گالہ نہ کر شاہ جی" مراد خاں شاہانی نے گردن اونچی کی۔ سگریٹ کا لمبا کش لگایا "بیٹ میں تو مزارع، سردار کی اجازت کے بغیر دھی کا پرنا بھی نہیں کر سکتا" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا "تو کہہ تو شاہ جی ریل کی ویگن بھر کر رناں بھیج دوں"

"ویگن سے اپنا کیا بنے گا۔ پوری سپیشل ٹرین بھیجنی ہوگی" احسان شاہ بھی ہنسنے لگا۔ "ویسے تیرے علاکے کی رن ٹھنڈی ہوتی ہے۔ گوشت تو اس کے بدن پر ہوتا ہی نہیں۔ تو انہیں کھانے کو روٹی نہیں دیتا"

"یہ بات نہیں شاہ جی۔ تیرا علاکہ ماجھے کی سرحد پر ہے، بلکہ ماجھے ہی میں ہوتا ہے" شاہانی نے وضاحت کی "تجھے تو ماجھے کی جٹیاں مل جاتی ہیں۔ مکھن کی طرح چکنی اور ملائم۔ ہاتھ رکھو تو پھسل جائے"

"کھلا پلا کر تیار کرتا ہوں انہیں۔ ایسے ہی چکنی اور ملائم نہیں بن جاتیں" احسان شاہ نے بڑے فخر سے کہا "جب انہیں اٹھواتا ہوں تو کئی تو کصائی کے کھونٹے پر باندھنے والی بچھ کی مانند کمزور اور مریل ہوتی ہیں۔ دو چار ہفتے یہاں رہنے کے بعد ان کا رنگ روپ نکھرتا ہے۔ ایسی جوانی چڑھتی ہے کہ روکھی سوکھی روٹی سے ایک دم گرما گرم پکوان بن جاتی ہیں۔ کیا سمجھا؟"

"سئیں سمجھتا ہوں، خوب سمجھتا ہوں" شاہانی نے گھونٹ بھرا "تیرے پاس تو باکاعدہ حرم ہے۔ ایک سے ایک فسٹ کلاس دانا چھانٹ کر رکھا ہے" وہ بے تکلفی سے ہنسا "اپنا حرم تو دکھا میرا مطلب تیرے کوٹ سے ہے۔ بہت عرصہ ہوا اسے دیکھے ہوئے۔ کچھ نیا تازہ مال آیا۔ کوئی نئی رن، کوئی نئی ڈال؟"

"وہ تو آتی ہی رہتی ہیں" احسان شاہ نے بے نیازی سے کہا "تو تھوڑی سی اور لگالے۔ فیر تجھے کوٹ میں لے چلوں گا" اس نے شیدا کو بلایا۔ وہ آیا تو احسان شاہ نے اسے مطلع کیا "میں کوٹ میں آرہا ہوں۔ شاہانی اور چوہدری بھی میرے ساتھ ہوں گے۔ تو اندر خبر کردے۔ میں پہنچوں تو سب ٹھیک ٹھاک ہونا چاہیے۔ سمجھ گیا؟"

شیدا نے سر کو ذرا سا جھکا کر نہایت ادب سے کہا۔ "سب ٹھیک ہی ٹھاک ملے گا جی۔"

شیدا چلا گیا۔ احسان شاہ، سردار مراد خاں شاہانی اور رحیم داد دیر تک بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔ ہنس ہنس کر بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔ بوتل ختم ہوگئی تو احسان شاہ نے دوسری منگوا لی۔ مگر شاہانی مزید پینے کے موڈ میں نہ تھا۔ رحیم داد نے پہلے ہی ہاتھ روک لیا تھا۔

پہر رات گزر چکی تھی۔ تینوں نشے میں جھومتے جھامتے کوٹ کی جانب بڑھے۔ شیدا ان کے پیچھے چل رہا تھا۔ حویلی کے پچھواڑے مختصر سا کھلا میدان تھا۔ اس میں کیکر اور بیری کی جھاڑیاں تھیں۔ میدان کی دوسری طرف کوٹ تھا۔ یہ حویلی کی فصیل نما چار دیواری کے اندر اونچی اونچی دیواروں کا ایک اور حصار تھا۔ دونوں میں فرق صرف اس قدر تھا کہ حویلی کی فصیل پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی تھی اور کوٹ کی دیواریں بلندی میں تو اتنی ہی تھیں مگر کچی تھیں۔ کوٹ کا دروازہ خاصا اونچا اور مضبوط تھا۔

کوٹ کی ڈیوڑھی میں لالٹین روشن تھی۔ اس کی روشنی میں مسلح پہریدار دروازے کے سامنے فرش پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ قریب ہی دیوار کے سہارے ان کی بندوقیں رکھی تھیں۔ شیدا بڑھ کر جھٹ ان کے سامنے پہنچا۔ پہریداروں نے جھپاک جھپاک اپنی بندوقیں سنبھالیں اور نظریں جھکا کر ادب سے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

۲۶

ڈیوڑھی کے آگے دور تک پھیلا ہوا وسیع آنگن تھا۔ آنگن کے تین طرف سلسلہ وار کوٹھریاں تھیں۔ کوٹ کی فصیل نما اونچی چار دیواری کی طرح کوٹھریوں کی دیواریں بھی کچّی اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں۔ کسی کوٹھری میں نہ کھڑکی تھی نہ روشن دان۔ آمد و رفت کے لیے صرف ایک دروازہ تھا۔ کوٹھریوں کے آگے پھوس کی چھت کا طویل برآمدہ تھا۔ برآمدہ آنگن کی سطح سے ڈیڑھ دو فٹ اونچا تھا۔ اور اتنا کشادہ تھا کہ لمبان میں چارپائی بچھانے کے بعد بھی اتنی جگہ بچ جاتی تھی کہ برآمدے میں گزرنے والوں کے لیے کوئی دشواری پیدا نہ ہوتی۔ آنگن کا فرش بھی کچّا تھا۔ اس میں کہیں کہیں نیم اور جنڈ کے گھنے درخت تھے۔ برآمدے میں کوٹھریوں کے آگے جگہ جگہ چارپائیاں بچھی تھیں۔ ہر کوٹھری میں چراغ روشن تھا۔

احسان شاہ، رحیم داد اور سردار مراد خاں شاہانی کے ہمراہ کوٹ کے صدر دروازے سے ڈیوڑھی میں داخل ہوا۔ ڈیوڑھی کے طاق میں چراغ جل رہا تھا۔ شیدا تیزی سے آگے بڑھا۔ اس دروازے کو کھولا جو آنگن میں کھلتا تھا۔ کوٹ میں عورتوں اور بچّوں کی ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور ابھر رہا تھا مگر احسان شاہ کے داخل ہوتے ہی کوٹ کے صدر دروازے پر لٹکے ہوئے پیتل کے گھنٹے پر گھڑیالی نے چوٹ لگائی۔ رات کے سناٹے میں گھڑیال کی آواز گونجی۔ کوٹ کے اندر تمام آوازیں اچانک اس طرح گہری خاموشی میں ڈوب کر گم ہوگئیں جیسے سوئچ دبانے سے بجلی کی روشنی بجھ جاتی ہے۔

احسان علی شاہ گردن اٹھائے نہایت رعب اور دبدبے کے ساتھ ڈیوڑھی سے نکل کر آنگن

میں پہنچا۔ آگے بڑھا۔ شاہانی اور رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ شیدا تینوں سے چند قدم آگے تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین لٹک رہی تھی۔

آنگن سے گزرتے ہوئے وہ برآمدے میں پہنچے۔ شیدا ایک کوٹھری کے دروازے پر رکا۔ اندر چراغ روشن تھا۔ سامنے مونج کی چٹائی پر ایک نوجوان عورت بھسکڑا مارے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کاجل تھا۔ بالوں میں خوشبودار تیل چمک رہا تھا۔ وہ بھڑک دار لباس پہنے ہوئے تھی۔ چراغ کی ہلکی زرد روشنی میں اس کا چہرہ اُجلا اُجلا نظر آرہا تھا۔ احسان شاہ کو دیکھتے ہی وہ اپنا ریشمی لاچا سنبھالتی ہوئی جھٹ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

شیدا نے لالٹین اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دی۔ احسان شاہ نے اسے غور سے دیکھا۔ شیدا سے پوچھا" کیا نام ہے اس کا؟"

مگر شیدا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ خود بول پڑی۔" میرا نام جیداں ہے جی۔"

جیداں کا جسم چھریرا تھا۔ ناک نقشہ تیکھا اور سبک تھا۔ عمر بیس سال سے کچھ ہی اُوپر تھی اس کی شادی کو تین سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے۔ صرف ایک بچی تھی اور وہ بھی اس کے ساتھ نہ تھی۔ جیداں سہمی ہوئی چپ چاپ کھڑی تھی۔ نظریں جھکی تھیں۔ سردار مراد خاں خمار آلود نظروں سے قصائی کی طرح جیداں کے بدن کے انگ انگ کو ٹٹول رہا تھا۔ پرکھ رہا تھا۔

احسان شاہ نے شاہانی کی بھوکی نظروں پر توجہ نہ دی۔ مڑ کر شیدا کو دیکھا" شیدے! یہ اتنی دبلی پتلی کیوں ہے۔ تو اسے کھانے کو روٹی نہیں دیتا؟"

شیدا نے دبی زبان سے بتایا" اسے آئے ہوئے جی، دو ہی مہینے ہوئے ہیں۔ میں رحمتے سے کہوں گا اسے کھانے کو اچھی طرح روٹی ٹکڑ دے۔ وہی ان کی انچارج ہوتی ہے جی۔"

" رحمتے کہاں ہے؟" احسان شاہ نے ڈپٹ کر پوچھا" وہ کیوں نہیں آئی۔ کدھر ہے وہ؟"

" شاہ جی!" شیدا گڑگڑانے لگا" اس کے سر میں شام ہی سے سخت درد ہے۔ اوپر چوبارے میں پڑی ہائے ہائے کر رہی ہے۔" شیدا نے زینے کے اُوپر بنی ہوئی ممٹی کی طرف اشارہ کیا" میں پہلے اسی کے پاس گیا تھا۔ پر اسے تو بکھار بھی ہے۔"

احسان شاہ نے رحمتے کے بارے میں مزید پوچھ گچھ نہ کی۔ وہ آگے بڑھنے لگا۔ لیکن شاہانی اپنی جگہ جما کھڑا رہا۔ احسان شاہ کو آگے بڑھتے دیکھ کر اس نے ٹوکا "شاہ جی! ذرا اسے ٹھیک سے دیکھ لینے دے۔" وہ جیداں کو چبھتی ہوئی نظروں سے گھور رہا تھا۔ مسکرا کر احسان شاہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"شاہ جی! میں تو کہتا ہوں، آج رات یہی چلے گی۔"

"تو یہیں پسر گیا۔" احسان شاہ بولا۔ "اسی کو بلوا لینا۔ پر آگے چل کر تو دیکھ۔ تو کوٹ میں میرا حرم دیکھنے آیا ہے ناں؟ اور بہت مدت کے بعد ادھر آیا ہے۔ اچھی طرح دیکھ بھال لے۔ فیصلہ کرنا۔"

شاہانی نے اصرار نہ کیا۔ تینوں آگے بڑھ کر دوسری کوٹھری پر پہنچے۔ اس کوٹھری میں بھی ایک نوجوان عورت خوب سنگھار کیے بیٹھی تھی۔ وہ انہیں دیکھ کر کھڑی ہوئی تو اس کا پھولا ہوا پیٹ صاف نظر آنے لگا۔

مراد خاں شاہانی ہنس کر بولا "سئیں! یہ تو پہلے ہی گبھن ہے۔ اس سے کیا لینا۔ آگے بڑھ شاہ جی۔"

احسان شاہ آگے بڑھا۔ شاہانی اور رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ چلے۔ شیدا بھی ان کے ہمراہ لالٹین سنبھالے آگے آگے چل رہا تھا۔ تیسری کوٹھری میں جو عورت تھی، وہ دلکش اور طرح دار تھی۔ رنگت تو سانولی تھی مگر آنکھیں ایسی خوبصورت تھیں کہ ان میں ستارے جھلملاتے تھے۔ شاہانی اُسے دیکھ کر پھڑک اٹھا۔ اس نے گرسنہ نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ مگر فوراً ہی اس نے بیزاری سے منہ بگاڑا۔

"یہ تو دھرلی بچ لگتی ہے۔"

عورت کی ابھری ہوئی چھاتیوں سے دودھ بہہ بہہ کر اس کے کرتے کے گریبان اور بالائی حصے کو گیلا کر رہا تھا۔ وہ سر جھکائے کبوتری کی مانند سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ کوٹھری کے عین سامنے برآمدے میں بچھی ہوئی چارپائی پر دو کم سن بچے سو رہے تھے۔ چھوٹا بار بار کلبلاتا۔

بے چین ہو کر ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتا۔ وہ ماں کو تلاش کر رہا تھا۔ اور اس کی ماں چراغ کی پیلی پیلی روشنی میں اس طرح چپ چاپ کھڑی تھی کہ نگاہیں زمین میں گڑی تھیں اور دل زور زور سے دھڑکتا تھا۔

رحیم داد بدستور خاموش رہا۔ شاہانی بولا "شاہ جی! اگے بڑھو۔"

تینوں آگے بڑھے۔ اگلی کوٹھری میں جو عورت تھی، وہ بھی بھرپور جوان تھی مگر اس کے چہرے پر زردی چھائی تھی۔ وہ بیمار تھی۔ ماتھے کے گرد دوپٹہ لپیٹے ہوئے تھی۔ اس کے سر میں شدید درد تھا جس کا اظہار آنکھوں میں منڈلاتی ہوئی بے چینی اور اضمحلال سے ہوتا تھا۔

احسان شاہ کے چہرے سے جھنجھلاہٹ برسنے لگی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے گھور کر شیدا کو دیکھا۔ تیکھے لہجے میں پوچھا "نوری کدھر ہے؟"

"وہ اگے ہے جی۔" شیدا خوف زدہ ہو کر آہستہ سے بولا۔

"اور رانو کہاں ہے؟"

شیدا نے مستعدی سے جواب دیا "وہ بھی اگے ہے جی۔"

مراد خاں شاہانی نے ہنس کر کہا "سئیں شاہ جی! جلدی کیا ہے۔ انہیں بھی دیکھ لینگے۔"

احسان شاہ کچھ نہ بولا۔ اس کا چہرہ غصے اور جھنجھلاہٹ سے تمتمایا ہوا تھا۔ تینوں آہستہ آہستہ آگے بڑھے اور ہر کوٹھری پر رکتے رہے۔ انہوں نے آٹھ کوٹھریاں دیکھیں مگر کوئی عورت احسان شاہ کی نظروں میں نہ جچی۔ اس کی آنکھوں سے بے قراری جھلک رہی تھی۔ شاہانی کی نگاہوں میں ابھی تک جیداں گھوم رہی تھی۔ کسی اور میں اس نے دلچسپی اور رغبت کا اظہار نہ کیا۔

انہوں نے مزید کوٹھریاں دیکھیں۔ مگر احسان شاہ کے چہرے پر چھائی ہوئی خشونت کم نہ ہوئی۔ وہ بے چینی سے کسی نوجوان عورت کو تلاش کر رہا تھا۔ اور وہ ہنوز نظر نہ آئی تھی۔ ایک کے بعد دوسری کوٹھری کا دروازہ آتا اور ہر دروازے کی دہلیز کے اس پار بناؤ سنگھار کئے ہوئے کوئی نوجوان عورت نظر آتی۔

احسان شاہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا ایک دروازے پر ٹھٹکا اور جم کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ ہونٹوں پر تبسّم بکھر گیا۔ سامنے چراغ کی روشنی میں ایک عورت پتھر کے تراشے ہوئے مجسمے کی مانند استادہ تھی۔ کھلتی ہوئی چمپئی رنگت، آنکھیں روشن، بال گھنے اور چمکیلے، کولہے چوڑے۔ وہ بھرپور جوان تھی۔ جسم بھرا بھرا اور گداز تھا۔ ناک میں فیروزے کا کوکا تھا۔ ہونٹ قدرے موٹے تھے اور ان کے بالائی حصے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلملا رہے تھے۔

احسان شاہ نے نشے میں ڈوبی ہوئی آواز میں مراد خاں شاہانی سے کہا۔ "لے بھئی شاہانی! یہ رہی رانو۔" وہ کوٹھری کے اندر داخل ہو گیا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے رانو کے پاس گیا۔ ہولے سے اس کے رخسار میں چٹکی بھری۔ رانو نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر مسکراتے ہوئے احسان شاہ کو ایک خاص ادا سے دیکھا۔

احسان شاہ نے اونچی آواز سے شاہانی کو مخاطب کیا۔ "شاہانی! بول کیا کہتا ہے؟"

"کہنا کیا ہے، ایک دم فسٹ کلاس ہے۔" شاہانی نے قہقہہ لگایا۔

احسان شاہ کوٹھری سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔ "آگے بھی دیکھ لے۔"

تینوں آگے کی کوٹھریوں کی جانب بڑھے۔ وہ ہر کوٹھری میں بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھتے، پرکھتے آگے بڑھتے گئے۔ ایک کوٹھری کے دروازے پر رک کر احسان شاہ نے شیدا سے پوچھا۔

"شیدے! یہ نوراں ہے ناں؟"

نوراں کا نام سن کر رحیم داد ٹھٹکا۔ اسے اپنی بیوی نوراں یاد آ گئی۔ اس نے دھڑکتے دل اور اور سہمی ہوئی نظروں سے کوٹھری میں مونج کی چٹائی پر بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھا۔ وہ فوراً اپنا لاچا سنبھالتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ مگر وہ رحیم داد کی نوراں نہ تھی۔ اس کی بیوی کی طرح خوبصورت اور طرح دار بھی نہ تھی۔ مگر یہ نوراں بھی بری نہ تھی۔ رنگت اجلی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور گہری سیاہ تھیں۔ لیکن رحیم داد کو اس کا کسا ہوا سڈول جسم زیادہ پسند آیا۔

رحیم داد نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ خاموش کھڑا نوراں کو دیکھتا رہا۔ جب تینوں اس کوٹھری کے دروازے سے آگے بڑھے تو رحیم داد نے چلتے چلتے مڑ کر نوراں کو ایک بار پھر دیکھا۔ اس کے ہونٹوں،

پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔ نشے میں ڈوبی ہوئی آنکھوں میں چراغ جھلملا رہے تھے۔

احسان شاہ نوری کی کوٹھری پر رکا۔ اندر گیا۔ نوری کے رخسار میں اس نے پیار سے چٹکی بھری۔ مسکرایا اور باہر آگیا۔ آگے بڑھا۔ اس نے نوری کے بجائے اپنے لیے ریشماں کو پسند کیا۔ اُسے تین سال قبل اٹھوا کر کوٹ میں لایا گیا تھا۔ یہیں اس کے دو بچے بھی ہوئے۔ دو پہلے بھی تھے اور اس کے شوہر کے پاس تھے۔ لیکن ریشماں پر چار بچوں کی ماں ہونے کے باوجود جوبن تھا۔ اس کا لاچا ہلکا نیلا تھا اور قمیض گہری سرخ تھی۔ ہونٹوں پر سرخی تھی اور آنکھوں میں کاجل تھا۔ احسان شاہ کو دیکھتے ہی اس نے اپنا لاچا اشتعال انگیز انداز میں ایک ہاتھ سے سنبھالا اور گردن کو ذرا سا خم دے کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے ترچھی نظروں سے احسان شاہ کو دیکھا۔ مسکرا کر اس طرح شرمائی کہ احسان شاہ تڑپ اٹھا۔ جھومتا جھومتا اس کی جانب جھپٹا۔ قریب گیا اور ریشماں کو سینے سے لگا کر شیدا کی جانب دیکھا۔

”شیدے! اسے میرے کمرے میں پہنچا دے۔“

تینوں نے ۲۱ عورتیں دیکھیں۔ کچھ کوٹھریوں کے دروازے بند تھے۔ کچھ خالی تھیں۔ ان میں رہنے والی عورتیں حویلی میں کام کاج کر رہی تھیں یا اس حالت میں نہیں تھیں کہ نہا دھو کر اور بن سنور کر احسان شاہ اور اس کے مہمانوں کے سامنے آسکیں اور ان کے خلوت کدوں کی زینت بن سکیں۔

کوٹ کی کوٹھریوں کا معائنہ کرنے کے بعد احسان شاہ نے چلتے چلتے رحیم داد سے دریافت کیا۔

”چوہدری! تو نے اپنے لیے کوئی رَن پسند نہیں کی؟“

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ خاموش رہا۔

احسان شاہ مسکرایا۔ اصرار کیا۔ ”چوہدری! ایسے کام نہیں چلے گا۔ کھل کے بتا۔ کسے اپنے پاس بلانا چاہتا ہے؟“

رحیم داد اب چپ نہ رہ سکا۔ نشے سے جھوم کر بولا۔ ”نوراں میرے لیے ٹھیک رہے گی۔“

”نوراں!“ احسان شاہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ ”وہ کون سی تھی؟“ نشے کی جھونک میں نوراں کا نام احسان شاہ کے ذہن سے نکل گیا تھا۔

”شاہ جی! تنیں نوں تو سب کے نام بھی یاد نہیں۔“ شاہانی ہنس کر بولا۔ ”یاد پڑتا ہے ان

بیں نوراں بھی تھی اور تو نے ہی اسے پہچانا بھی تھا۔"

"ہوگی، ضرور ہوگی۔" احسان شاہ کھلکھلا کر زور سے ہنسا۔ "کس کس کے نام یاد رکھوں۔ سوچتا ہوں، ان کے لیے تو ایک رجسٹر رکھنا پڑے گا۔" اس نے قہقہہ بلند کیا۔ تشیدا کی جانب متوجہ ہوا۔ "نوراں کو چوہدری کے کمرے میں پہنچا دینا۔" اس نے مڑ کر مراد خاں شاہانی کی طرف دیکھا۔ پوچھا۔ "تو نے تو رانو کو پسند کیا ہے نا؟"

"پر جیداں کو ایک بار اور دیکھ لینے دے۔" شاہانی نے نشے کی ترنگ میں لہرا کر کہا۔

مراد خاں شاہانی آگے بڑھا۔ احسان شاہ نے اسے ٹوکا۔ "گل سُن۔" مگر شاہانی سُنی ان سُنی کرتے ہوئے جیداں کی کوٹھری کی جانب بڑھنے لگا۔ احسان شاہ نے شیدا کو اشارہ کیا۔ وہ ہاتھ میں لالٹین سنبھالے شاہانی کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں جیداں کے پاس پہنچے۔ وہ دروازے کی جانب بیٹھ موڑے چراغ کی دھندلی روشنی میں مونجھ کی چٹائی پر گم صم بیٹھی تھی۔

قدموں کی آہٹ سن کر جیداں نے مڑ کر دیکھا۔ دہلیز پر شاہانی کھڑا تھا۔ اس کے ہمراہ شیدا بھی تھا۔ جیداں ہڑبڑا کر اپنا لاچا سنبھالتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور آنکھوں کا کاجل پھیل گیا تھا۔

شاہانی نے حیرت سے کہا۔ "لگتا ہے تو رو رہی ہے۔"

جیداں خاموش کھڑی رہی۔ اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے اور پلکیں صاف بھیگی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ شاہانی نے اسے خمار آلود نظروں سے دیکھا۔ جھوم کر بولا۔ "تو ضرور رو رہی تھی۔ صاف صاف بتا۔ تو رو رہی تھی نا؟"

"ہاں جی۔" جیداں نے آہستہ آہستہ سر ہلایا۔ "مجھے اپنی نکی یاد آ رہی ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈے اور چھلک پڑے۔

شاہانی بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ پوچھا۔ "کہاں ہے تیری نکی؟"

"میرے گھر والے کے پاس ہے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے میری نکی سے ملوا دے۔" اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک ٹپک کر رخساروں پر بکھرنے لگے۔ شاہانی نے اس کی پیٹھ

ٹھٹکتے ہوئے کہا" ضرور ملوا دوں گا بلکہ اسے تیرے ہی پاس منگوا دوں گا" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا "لے، اب تو ہنس دے۔"

جیداں مسکرائی اور جلدی جلدی آنسو پونچھنے لگی۔

احسان شاہ بھی رحیم داد کے ہمراہ جیداں کی کوٹھری کے دروازے پر پہنچ گیا۔ شاہانی کو جیداں کے قریب کھڑے ہوئے دیکھا۔ ہنس کر بے تکلفی سے بولا" لگتا ہے، تجھے یہ زیادہ ہی پسند آگئی۔"

"شاہ جی! اسی کو میرے پاس بھجوا دے" اس نے احسان شاہ کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

احسان شاہ نے مڑ کر شیدا کی جانب دیکھا۔ جیداں کی طرف اشارہ کیا" کیا نام ہے اس کا؟"

شیدا نے مستعدی سے جواب دیا" جیداں۔"

"جیداں، جیداں" احسان شاہ نشہ کی ترنگ میں جیداں کے نام کی گردان کرنے لگا۔ پھر وہ مسکرایا، شیدا کو مخاطب کیا" شیدے! اسے شاہانی کے کمرے میں پہنچا دینا۔"

"پہنچا دوں گا جی، بالکل پہنچا دوں گا" شیدا نے احسان شاہ کو یقین دلایا۔

احسان شاہ خاموش رہا۔ اس نے نہ جیداں کے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھا اور نہ ہی اس کی آنکھوں کے پھیلے ہوئے کاجل کی جانب توجہ دی۔ اس نے شاہانی کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ آہستہ آہستہ تھپ تھپایا اور اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ رحیم داد بھی آگے بڑھا۔

تینوں برآمدے سے اتر کر آنگن میں پہنچے۔ اسے عبور کیا۔ ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ کوٹ کی اونچی اونچی فصیلوں سے باہر نکلے۔ پہریدار صدر دروازے پر سر جھکائے ادب سے کھڑے تھے۔ انہوں نے پہریداروں کی جانب مطلق توجہ نہ دی۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آہستہ آہستہ دیوان خانے کی جانب بڑھنے لگے۔

☆

شیدا، ڈیوڑی کے دروازے ہی پر ٹھہر گیا۔ اسے ابھی کئی اہم کام انجام دینا تھے۔ ریشماں جیداں اور نوراں کو ایک علیحدہ کوٹھری میں اکٹھا کرنا تھا اور وہاں سے انہیں احسان شاہ،

مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کے کمروں میں پہنچانا تھا۔ ان کی اس وقت تک کڑی نگرانی بھی کرنا تھی جب تک وہ مقررہ ٹھکانوں پر نہ پہنچ جائیں۔ اسے ڈر تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تینوں عورتوں میں سے کسی کو احسان شاہ کا کوئی بیٹا پہلے ہی اٹھائے جائے۔ احسان شاہ کے ایک دو نہیں پورے دس بیٹے تھے۔ دو سرکاری ملازمتوں میں تھے اور اعلیٰ افسر تھے۔ ایک انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اور اس سے چھوٹا لاہور میں پڑھ رہا تھا۔ حویلی میں چھ بیٹے تھے مگر تین جوان ہو چکے تھے اور سن وسال کے اعتبار سے کچھ پہلے ہی جوان ہو گئے تھے۔

احسان شاہ کے یہ تمام بیٹے صرف دو نکاحی بیویوں سے تھے۔ ویسے اس نے چار عورتوں سے باقاعدہ نکاح کیا۔ پہلی ٹائیفائڈ میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئی۔ اس سے احسان شاہ کی کوئی اولاد نہ تھی۔ تیسری سے چار بیٹیاں ہوئیں۔ وہ اولاد نرینہ کے لیے سخت پریشان رہتی تھی۔ چھپ چھپ کر درگاہوں اور مزاروں پر حاضری دیتی۔ منتیں مانتی۔ گڑگڑا کر دعائیں مانگتی۔ بیٹے کے ارمان میں ہر وقت سرگرداں رہتی۔ اسی ارمان میں وہ ایک پیر کے چکر میں آگئی۔ پیر کے حجرے میں جاتی تو گھنٹوں اس کے ساتھ خلوت میں رہتی۔ حویلی کی ایک خادمہ، فیروزہ اس کی محرم راز تھی۔ مگر وہ احسان شاہ کی بھی منظور نظر تھی۔ اس نے احسان شاہ کو ایک روز تنہائی میں سب کچھ بتا دیا۔

اُسے بیوی کی ان حرکتوں کا علم ہوا تو غصے سے دیوانہ ہو گیا۔ یہ اس کی عزت و ناموس کا سوال تھا۔ اس نے ایک رات برافروختہ ہو کر بیوی کا اس طرح گلا گھونٹا کہ وہ مر گئی۔ احسان شاہ نے رازداری سے لاش ٹھکانے بھی لگا دی لیکن پیر سے بازپرس کرنے یا انتقام لینے کی اسے جرائت نہ ہوئی۔

اب اس کی دو منکوحہ بیویاں رہ گئیں تھیں۔ اور ان کے تین جوان بیٹے حویلی ہی میں رہتے تھے۔ مزارعوں اور کمیوں کی لڑکیوں اور بیویوں کے بارے میں ان کا رویہ اپنے باپ سے مختلف نہ تھا۔ احسان شاہ جن عورتوں کو اٹھوا کر کوٹ میں قید رکھتا، وہ اس کے تصرف میں بھی رہتیں اور اس کے نوجوان بیٹوں کے شبستانوں کی بھی زینت بنتیں۔

شیدا حویلی کے ہر راز سے واقف تھا۔ وہ احسان شاہ کا نہایت قابلِ اعتماد اور منہ چڑھا ملازم

تھا۔ مگر اس کے غصے اور خونخوار مزاج سے خائف بھی رہتا۔ کوشش کرتا کہ ہر کام احسان شاہ کی مرضی کے مطابق ہو۔ اگر اس رات احسان شاہ کا کوئی بیٹا ریشماں، جیداں یا نوراں میں سے کسی کو بھی اپنے کمرے میں لے جاتا تو احسان شاہ بیٹے سے تو کچھ نہ کہتا مگر شیدا کی شامت آجاتی۔ لہذا شیدا پوری طرح چوکنا اور چوکس تھا۔ اس نے کوٹ سے باہر قدم ہی نہ نکالا۔ وہ ریشماں، جیداں اور نوراں کو جلد سے جلد احسان شاہ، مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کے کمروں میں پہنچانے کے بندوبست میں لگا رہا۔

☆

احسان شاہ کوٹ سے نکل کر شاہانی اور رحیم داد کے ہمراہ ایک بار پھر دیوان خانے میں پہنچا۔ تینوں باغ میں نہ بیٹھے۔ اب وہاں خنکی تھی۔ اوس بھی پڑ رہی تھی۔ وہ باغ سے ملحقہ برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ رات کسی قدر گہری ہو چکی تھی۔ ہوا کے نرم نرم جھونکے سرسراتے ہوئے چلتے تھے۔ انہوں نے کچھ دیر وسکی سے اور شغل کیا۔ اس عرصہ میں نوکروں نے کھانا لگا دیا۔ تینوں شراب نوشی سے فارغ ہوئے تو کھانے پر جٹ گئے۔ کھانا کھا کر وہ اپنے اپنے کمروں کی جانب چلے گئے۔

رحیم داد نے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھولا۔ دیکھا نوراں وہاں موجود تھی۔ وہ بستر کے ایک کونے پر پیر نیچے لٹکائے خاموش بیٹھی تھی۔ رحیم داد نے خمار آلود نگاہوں سے اسے دیکھا اور لمحہ بھر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی بیوی، نوراں، اپنے آشنا، جمال دین، کو چھوڑ کر واپس آگئی ہے۔ وہ ڈگمگاتے قدموں سے آگے بڑھا۔ اور نوراں کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔

وہ کچھ نہ بولی۔ نہ پہلو بدلا۔ نہ کسمسائی۔

رحیم داد بھی خاموش رہا۔ کئی لمحے گزر گئے۔ کمرے میں گہرا سکوت چھایا تھا۔

آخر رحیم داد نے خاموشی سے اکتا کر بات چھیڑی۔ پوچھا: "تیرا نام نوراں ہے ناں؟"

"اخو جی!" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ ایک بار پھر رحیم داد نے خاموشی کو توڑا، دریافت کیا۔ "تیرا گھر والا ہے؟"

وہ رحیم داد کی جانب نظریں اُٹھائے بغیر بولی "ہے تو جی۔"

"بچے بھی ہیں؟"

"دو ہیں جی۔" نوراں نے بتایا۔

رحیم داد نے اجنبیت کا احساس زائل کرنے کی غرض سے بات آگے بڑھائی۔ پوچھا "تو اسی پنڈ کی رہنے والی ہے؟"

"نہیں جی، میرا پنڈ تو اُدھر ماڑی کمبوہ کے پاس ہے۔" اس نے مغرب کی سمت ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "میرا زمیں دار تو میاں رحمان وٹو ہے۔"

"تو شاہ جی کے کوٹ میں کیسے آئی؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ "شاہ جی تو تیرا زمیں دار بھی نہیں۔ فیر تو کیسے اِدھر پہنچی؟"

"یہ تو میں نوں بھی پتہ نہیں۔" نوراں نے سادگی سے بتایا۔ "میں نوں تو جی اتنا یاد ہے۔ میں سویرے بہت تڑکے ٹٹی کرنے نیائیں گئی تھی۔ زمین پر بیٹھنے کے لیے جھکی تو کسی نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر میرا منہ دبا لیا۔ وہ پانچ تھے۔ منہ پر منڈاسے باندھے ہوئے تھے۔ مجھے اٹھا کر وہ زمیں دار کی ماڑی میں لے گئے۔ چھ سات مہینے میں وٹو کی ماڑی میں رہی۔ فیر ایک رات اس نے مجھے شاہ جی کے پنڈ پہنچا دیا۔ تب سے جی میں یہاں ہوں۔"

"کتنے دن ہو گئے تینوں یہاں آئے ہوئے؟"

"اگلے جاڑوں میں جی پورے دو سال ہو جائیں گے۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میرے گھر والے کو تو سال بھر بعد پتہ چلا کہ میں اِدھر پیراں والہ میں ہوں۔ وہ ایک بار یہاں آیا بھی تھا۔"

"تجھ سے ملا تھا؟" رحیم داد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"نا جی ناں۔" وہ بولی۔ "شاہ جی نے مجھے اس سے بالکل ملنے نہ دیا۔ اسے چار روز حویلی میں کیدی بنا کر رکھا۔ چھت سے الٹا ٹکا کر بہت پٹائی کی۔ فیر پتہ نہیں دوبارہ آیا کہ نہیں۔ میں نوں تو یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے اور کیسا ہے۔ بچوں کے بارے میں بھی کچھ پتہ نہیں۔"

"یاد تو آتے ہوں گے۔" رحیم داد نے غیر شعوری طور پر اس کے زخموں کو چھیڑ دیا۔

نوراں تڑپ کر بولی۔" کیوں نہیں یاد آتے۔ جب بہت یاد آتے ہیں تو چپکے چپکے رو لیتی ہوں۔"

اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے جھلملانے لگے۔ رحیم داد نے اس کی جانب نہ دیکھا۔ بستر پر خاموش بیٹھا رہا۔

باغ میں کھلنے والی کھڑکی سے ہوا کے بے قرار جھونکے اندر آ رہے تھے۔ رحیم داد اٹھا اور کھڑکی کے ایک پٹ کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ باغ میں گہرا سناٹا تھا۔ قریب ہی پھولوں سے لدی رات کی رانی مہک رہی تھی۔

گیارہ بجے کا عمل تھا۔ سونے والے سو رہے تھے، رات جاگ رہی تھی۔ خوشبوئیں رچے ہوئے جھونکے بار بار اُمنڈتی لہروں کی مانند آتے۔ رحیم داد گہری سانس بھرتا۔ نشے کا ریلا رک رک کر آتا۔ رحیم داد کا سر ہر ریلے کے ساتھ جھومتا۔ قدم ڈگمگاتے۔ آنکھوں میں چراغ جلتے بجھتے۔ سیاہ پردے لہراتے۔ وہ دیر تک کھڑکی کا سہارا لیے جھومتا رہا۔ کھڑکی کا پٹ ساتھ نہ دے سکا تو اس نے چوکھٹ کو مضبوطی سے تھام لیا۔

رحیم داد نے پلٹ کر نوراں کو دیکھا اور ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ نوراں نے بھی نظریں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ رحیم داد نے مسکرا کر پوچھا۔

"تو نوراں ہی ہے ناں؟"

وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ آہستہ آہستہ گردن ہلانے لگی۔ رحیم داد کا چہرہ دمکنے لگا۔ آنکھیں نشے سے مدہوش ہو گئیں۔ وہ وارفتگی کے عالم میں جھومتا جھامتا نوراں کی طرف بڑھا۔ اب وہ ایک تند اور تیز بگولہ تھا جو اُٹھنے اور اُمڈ کر بکھرنے کے لیے بے تاب تھا۔

سویرے رحیم داد کی آنکھ کھلی تو نوراں موجود نہ تھی۔

☆

سردار مراد خاں شاہانی اب جا چکا تھا۔

وہ پیراں والہ میں پانچ روز قیام کرنے کے بعد لاہور چلا گیا۔ مگر پانچ ہی روز میں وہ رحیم داد سے بہت گھل مل گیا تھا۔ وہ بیٹ کے علاقے کا خاندانی جاگیردار تھا۔ لیکن رحیم داد نے اس میں خاندانی جاگیرداروں والا طنطنہ اور طمطراق نہ پایا۔ وہ یاروں کا یار تھا۔ ہنس مکھ اور فراخ دل تھا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے زور دے کر رحیم داد کو اپنی جاگیر میں آنے اور چند روز قیام کرنے کی دعوت دی۔

مراد خاں شاہانی کے جانے کے بعد رات کی محفلیں قدرے سونی پڑ گئیں۔ بات یہ تھی کہ شاہانی بڑا زندہ دل اور یار باش تھا۔ بات بات پر قہقہے لگاتا۔ دبا کے شراب پیتا مگر مطلق نہ بہکتا۔ جاگیرداروں اور بڑے زمین داروں کی عام روایت کے مطابق عورت اس کی بھی کمزوری تھی اور اس حد تک تھی کہ اسے ہر عورت گوارہ تھی۔ اپنی اس کمزوری کو وہ چھپاتا بھی نہ تھا۔ نہایت دھڑلے سے بتاتا تھا۔ لاہور روانہ ہونے سے ایک روز قبل رات کو معمول کے مطابق وہسکی کا دور چل رہا تھا۔ شاہانی عورتوں کے بارے میں اپنے تجربات ہنس ہنس کر سنا رہا تھا۔ بات کہتے کہتے اس نے زور کا قہقہہ بلند کیا اور ایک آنکھ دبا کر بولا۔

"مرد کے بڑھاپے کی پہچان تو یہ ہے سئیں، جب وہ بڈھی اور جوان، خوبصورت اور بدصورت رن میں فرق محسوس کرنے لگے تو سمجھو وہ بڈھا ہو گیا۔"

رحیم داد اس کی یہ منطق سن کر چونکا۔ حیرت سے بولا "نہیں جی یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ بھی اس وقت نشے کی ترنگ میں تھا۔ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔

"ایہہ گل اے تو یہ بتا تو رچھنے کے ساتھ سو سکتا ہے؟"

"سو سکتا ہوں، ضرور سو سکتا ہوں۔" مراد خاں شاہانی اپنی بات پر اڑا رہا۔ "آزما کے دیکھ لے۔"

احسان شاہ نے مداخلت کی۔ وہ سردار شاہانی کے مزاج سے بخوبی واقف تھا۔ مدت سے شناسائی تھی۔ اس نے رحیم داد کو مخاطب کیا "چوہدری! اس سے اڑی نہ کر۔" وہ کھلکھلا کر زور سے ہنسا۔ "یہ بہت خنزیر ہے۔" اس نے بے تکلفی سے شاہانی کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "تو

اسے نہیں جانتا۔ یہ رحمتے کے ساتھ بھی سو جائے گا۔"

رحیم داد کو پھر بھی یقین نہ آیا۔ کہنے لگا۔ "نہیں شاہ جی! ایسا نہیں ہو سکتا۔" اس نے شاہانی کی طرف مڑ کر دیکھا۔ "شاہانی! تو نے رحمتے کو دیکھا ہے؟" یہ کہہ کر وہ احسان شاہ کی جانب متوجہ ہوا۔

"شاہ جی! رحمتے کو بلوا لے۔ تب دیکھوں گا یہ اس کے ساتھ سو سکتا ہے کہ نہیں۔"

"شاہ جی، بلوا لے، اسے بھی بلوا لے۔" شاہانی کے رویہ میں مطلق فرق نہ آیا۔ وہ زندہ دلی سے مسکراتا رہا۔

احسان شاہ نے منع بھی کیا۔ مگر شاہانی باز نہ آیا۔ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اس نے اصرار کیا۔ "شاہ جی، تو رحمتے کو بلوا لے۔ میری کھاطر بلوا لے۔"

احسان شاہ نے شیدا کو بلایا۔ اس سے کہا۔ "رحمتے کو یہاں لے آ۔"

شیدا خاموشی سے مڑا اور برآمدے سے چلا گیا۔ واپس آیا تو رحمتے اس کے ساتھ تھی۔ وہ ڈھلتی عمر کی پستہ قد عورت تھی۔ جسم پھیلا ہوا تھا۔ رنگت گہری سانولی تھی۔ چہرہ چوڑا چکلا اور گوشت سے بھرا ہوا تھا۔ ناک بھونڈی اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ ایک رخسار پر بڑا سا مسا تھا۔ بال خوب گھنے اور سیاہ تھے۔ جن میں کہیں کہیں سے سفیدی جھلکتی تھی۔ وہ بدصورت بھی تھی اور سن بھی چالیس سے اوپر ہی تھا۔ وہ اس وقت میلے کچیلے کپڑے پہنے تھی جن سے پسینے کی تیز بو اٹھتی تھی۔

سردار شاہانی نے نظر بھر کر رحمتے کو دیکھا۔ قہقہہ مار کر ہنسا۔ احسان شاہ کو مخاطب کیا۔ "شاہ جی! تو نے یہ سانول دانا کہاں چھپا رکھا تھا۔" یہ کہتا ہوا وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وسکی سے بھرا ہوا گلاس ہونٹوں سے لگایا اور غٹاغٹ چڑھا گیا۔ اس نے خالی گلاس میز پر رکھا۔ رحمتے کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچا۔ اور اس کے رو برو کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر رحمتے کے پھولے پھولے گالوں کو انگلیوں سے پکڑ کر ہولے ہولے ہلایا۔ بے تکلفی سے ہنسا۔

"میں صدقے ونجاں۔" اور رحمتے کے بازو میں بازو ڈال کر بولا۔ "ادھر آ دل جانی۔"

رحمتے اس کے پہلو میں کسمسائی۔ شاہانی نے قہقہہ بلند کیا۔ "دے نکھرا چھوڑ۔ رناں دے چالے نہ کر۔ سِدھی سِدھی چل۔" شاہانی نے ہولے سے اسے ٹھوکا دیا اور رحمتے کے سہارے ڈگمگاتے قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگا۔

رحیم داد حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتا رہا۔ احسان شاہ بے نیازی سے میٹھا وہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔

اس واقعہ کے دوسرے ہی روز شاہانی چلا گیا۔ مگر رحیم داد ٹھیرا رہا۔ تیسرے روز تحصیل دار آگیا۔ وہ سرکاری دورے پر نکلا تھا لیکن اس کا قیام احسان شاہ کی حویلی میں رہا۔ تحصیل دار جب پہنچا تو شام گہری ہو چکی تھی۔ احسان شاہ اور رحیم داد باغ کے ایک گوشہ میں بیٹھے تھے وہسکی کا دور چل رہا تھا۔ احسان شاہ تحصیل دار کو دیکھتے ہی اٹھا اور بڑی گرم جوشی سے بغل گیر ہوا۔

دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ احسان شاہ نے تحصیل دار کی طرف ہاتھ اٹھا کر رحیم داد سے کہا "یہ اپنی تحصیل کے تحصیل دار، منوّر خاں ہیں۔" تحصیل دار کو اپنے روبرو بیٹھے دیکھ کر رحیم داد بدکا، گھبرایا بھی۔ لیکن احسان شاہ اس کی گھبراہٹ اور پریشانی سے بے نیاز کہتا رہا۔

"اور جی یہ کوٹلہ ہرکشن کا زمیں دار، اپنا یار، نور الٰہی ہے۔"

شیدا نے اسی وقت گلاس لا کر میز پر رکھا۔ احسان شاہ نے گلاس میں وہسکی ڈالی۔ ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "جان پہچان کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔" اس نے باری باری تحصیل دار اور رحیم داد کو دیکھا "جو کمی رہ گئی ہے وہ تم دونوں ابھی خود ہی پوری کر لوگے۔" اس نے پیگ بنا کر تحصیل دار کے سامنے رکھا اور بے تکلفی سے بولا "یار منور خاں! اب تو شروع ہو جا۔" تحصیل دار نے گلاس اٹھا کر ہاتھ بلند کیا۔ مسکرایا، گلاس ہونٹوں سے لگایا اور فوراً شروع ہو گیا۔

تحصیل دار بھی بڑا یار باش اور زندہ دل تھا۔ رحیم داد کا ہم عمر بھی تھا۔ اس نے سردار مراد خاں شاہانی کی کمی پوری کر دی۔ ایک ہی رات میں وہ رحیم داد سے اس قدر مانوس اور بے تکلف ہو گیا کہ رات کو عورت کا انتخاب بھی اس نے رحیم داد کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ رحیم داد نے گریز کیا تو وہ سر ہو گیا۔ نشہ میں جھوم کر بار بار شیدا سے کہتا "شیدے! میرے لیے تو وہی عورت آئے گی

جسے چوہدری کہے گا" احسان شاہ بے نیازی سے گھونٹ گھونٹ وہسکی پیتا رہا۔

اس کی ضد کے سامنے رحیم داد کو ہتھیار ڈالنا پڑے۔ شیدا سے کہا" تحصیل دار کے لیے رانو کو لے آ۔"

شیدا تھوڑی دیر بعد رانو کو لے آیا۔ اسے دیکھ کر تحصیل دار منوّر خاں بہت خوش ہوا اور اس قدر خوش ہوا کہ رانو کے بجائے بڑھ کر رحیم داد کا منہ چوم لیا۔ اس وقت وہ نشے میں دھت تھا۔ چڑھا بھی زیادہ گیا تھا۔

تحصیل دار سویرے سویرے ہی دورے پر نکل گیا اور شام تک نہ لوٹا۔ احسان شاہ اور رحیم داد حسب معمول وہسکی سے شغل کر رہے تھے۔ شام کی رنگت کالی ہوئی اور اندھیرا بڑھا تو تحصیل دار بھی آ گیا۔ سیدھا باغ کے اس گوشے میں پہنچا جہاں احسان شاہ اور رحیم داد بیٹھے تھے۔ تحصیل دار منوّر خاں کے ہمراہ علاقے کا تھانے دار بھی تھا۔ وہ وردی میں تھا۔

تھانے دار کو دیکھتے ہی رحیم داد کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس کا ہاتھ لرز کر رہ گیا۔ گلاس بھرا ہوا نہ تھا ورنہ چھلک پڑتا۔ لیکن تھانے دار نے رحیم داد پر کوئی توجہ نہ دی۔ بیٹھتے ہی ڈکیتی کی ایک واردات کا ذکر چھیڑ دیا جس میں گاؤں والوں نے جم کر ڈاکوؤں سے مقابلہ کیا تھا۔ اور انہیں فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر گاؤں کا ایک نوجوان ڈاکوؤں کی اندھا دھند فائرنگ سے ہلاک بھی ہو گیا تھا۔ تھانے دار اسی واردات کی تفتیش کے بعد لوٹا تھا۔

تھانے دار ڈاکے کی واردات کے بارے میں ایک ایک تفصیل احسان شاہ کو سناتا رہا اور رحیم داد سہما ہوا خاموش بیٹھا رہا۔ احسان شاہ نے تحصیل دار اور تھانے دار کے سامنے بوتل کے ساتھ دو گلاس بھی رکھ دیے۔ دونوں نے خود ہی اپنے لیے پیگ تیار کیے اور گلاس ہونٹوں سے لگا کر ایک ایک گھونٹ بھرا۔

وہسکی کا دور چلتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ ادھر اُدھر کی باتیں بھی ہونے لگیں۔ حجابات اٹھنے لگے۔ تکلفات مٹتے گئے۔ قہقہے بلند ہونے لگے۔ نشہ چڑھا اور تیز ہوا تو سب ایک ہی رنگ میں رنگ گئے۔ فاصلے قربتوں میں بدل گئے۔ رحیم داد کے ذہن پر چھایا ہوا خوف اور خطرے کا

احساس رفتہ رفتہ زائل ہوتا گیا۔ وہ بھی گفتگو میں حصہ لینے لگا اور پھر ایسا مرحلہ آگیا کہ احسان شاہ اور تحصیل دار منور خاں کی طرح وہ تھانے دار سے بھی مانوس اور بے تکلف ہو گیا۔

شراب نوشی سے جب چاروں فارغ ہوئے تو رات بھیگ چکی تھی۔ رحیم داد اور تھانیدار ایک دوسرے کے اس قدر زیادہ قریب آچکے تھے کہ ہنس ہنس کر بے دھڑک باتیں کرتے تھے۔ مگر رحیم داد نے نشے میں چور ہونے کے باوجود تھانے دار سے اللہ وسایا کے قتل کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ احسان شاہ نے بھی اس سلسلہ میں اجتناب برتا اور تھانیدار نے بھی اس کا ذکر نہ چھیڑا۔

☆

تھانے دار نے صرف رات بھر حویلی میں قیام کیا۔ وہ سویرے اٹھ کر چلا گیا۔ البتہ تحصیل دار منور خاں چار روز ٹھیرا۔

رحیم داد نے دو ہفتے سے بھی زیادہ عرصہ تک قیام کیا۔ دن کا بیشتر حصہ وہ سو کر گزارتا۔ شام ہوتے ہی احسان شاہ کے ساتھ مے نوشی کرتا۔ ہر رات نوراں کو اپنے کمرے میں بلوا لیتا۔ وہ رحیم داد سے خوش بھی تھی۔ ہر رات خوب بن سنور کے اس کے پاس آتی۔ رحیم داد نشے سے جھومتا جھامتا کمرے میں داخل ہوتا تو وہ ہنستی مسکراتی اٹھ کر کھڑی ہو جاتی۔ آگے بڑھتی اور جھٹ رحیم داد کا بازو تھام لیتی۔ اسے سہارا دے کر بستر پر لاتی اور اس کے پہلو میں سمٹ کر بیٹھ جاتی۔

رحیم داد کبھی اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتا۔ کبھی ہولے سے رخسار میں چٹکی بھرتا۔ کبھی پیار سے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیتا۔ چھیڑ چھاڑ کرتا۔ ہنستا، قہقہے لگاتا اور ہر رات نوراں کو پانچ روپے دیتا۔ کبھی وہ روٹھ جاتی تو مناتا۔ مضمحل اور پریشان نظر آتی تو اس کی دل جوئی کرتا۔

نوراں میں رحیم داد کی بڑھتی ہوئی دلچسپی دیکھ کر ایک شام وہسکی کا گھونٹ بھرتے ہوئے احسان شاہ نے مسکرا کر بے تکلفی سے کہا: "چوہدری، تجھے نوراں بہت پسند ہے تو اسے ساتھ لے جا۔"

مگر رحیم داد آمادہ نہ ہوا، کہنے لگا۔" شاہ جی! میں تو یہ بھی نہیں چاہتا کہ جمیلہ کو یہ پتہ چلے کہ میں تیرے پاس ٹھہرا تھا۔ نوراں پہنچ گئی تو جمیلہ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ تینوں نوں پتہ ہی ہے، میں ہمیشہ اس سے چھپ کر تیرے پاس آتا ہوں۔"

" جیسی تیری مرضی۔" احسان شاہ بے نیازی سے بولا۔" پر جمیلہ سے تو اس طرح کب تک ڈرتا رہے گا؟"

"شاہ جی! تو نے تو مشورہ دیا تھا کہ جلد بازی سے کام نہ لے۔" رحیم داد نے ہنس کر کہا۔" اب خود ہی کہہ رہا ہے کہ ڈرنے سے کام نہیں چلے گا۔ میں تیری کون سی گل ٹھیک سمجھوں۔"

" میرا کہا مان، تو یہاں سے جاتے ہی جمیلہ کو کابو میں کرنے کی کوشش کر۔" احسان شاہ نے آنکھ مار کر کہا۔" وہ رن ہے اور جوان بھی ہے۔ میں نے تو نہ جانے کتنی ٹیڑھی زنانیوں کو سیدھا کر دیا۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔" جمیلہ تیرے کابو میں نہ آئے تو میرے پاس بھیج دے۔ منہ زور اور اڑیل گھوڑی کو جیسے سدھایا جاتا ہے، ویسے ہی اُسے بھی ٹھیک ٹھاک کر دوں گا۔ ایک دم لائن پر آ جائے گی۔ کیا سمجھا؟"

مگر رحیم داد نے اس کی بات سمجھ کر بھی سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ اس کی حوصلہ افزائی سے گریز کیا۔ نہایت سنجیدگی سے بولا۔" فکر نہ کر شاہ جی، وہ میرے کابو میں آ جائے گی اور تو دیکھ لینا جلد ہی آ جائے گی۔ میں نے اسے رکھیلی بنا کر نہیں رکھنا۔ گھر والی بنا کر رکھوں گا۔ ملّا کو بلا کر باقاعدہ اس سے نکاح پڑھواؤں گا۔"

" یہ ضروری بھی ہے۔" احسان شاہ نے رحیم داد کی تائید کی۔ ساتھ ہی مشورہ بھی دیا۔" پوری زمیں داری اب تیرے ہی پاس ہونی چاہیے۔ ویسے بھی تو جوان ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنسا۔" تجھے ایک زنانی کی ضرورت بھی ہے۔ جمیلہ ہتھے چڑھ گئی تو عیش ہو جائیں گے تیرے۔" احسان شاہ نے قہقہہ لگایا۔ رحیم داد بھی بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔

اسی طرح ہنسنے، قہقہے لگاتے اور وہسکی کی چسکی لگاتے ستره روز گزر گئے۔

☆

رحیم داد حویلی اسٹیشن کے راستے واپس کوٹلہ ہر کشن پہنچا۔ وہ اسی راستے سے احسان شاہ

کے پاس پیراں والہ آیا تھا۔ گاؤں میں پہنچ کر اس نے تانگہ حویلی کے پھاٹک پر رکوایا۔ نوکروں سے سامان اتروایا اور سیدھا حویلی کے اندر چلا گیا۔ احمد اسے ایک کمرے میں لے گیا۔ کمرہ صاف ستھرا تھا اور کشادہ بھی تھا۔ کمرے میں دو پلنگ بچھے تھے۔ ان پر اُجلے بستر لگے تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر ہلکے سبز رنگ کے پردے لہرا رہے تھے۔ وسط میں بڑی سی گول میز تھی۔ اس پر رکھے ہوئے گل دان میں تازہ پھول مہک رہے تھے۔

احمد نے بتایا کہ کمرے کی صفائی اور اس کی آرائش جمیلہ نے اپنی نگرانی میں کرائی تھی۔ اسی کی ہدایت پر ہر صبح گل دان میں تازہ پھول لگائے جاتے۔ جھاڑ پونچھ کی جاتی۔ وہ ہر روز بے چینی سے رحیم داد کی واپسی کا انتظار کرتی۔ مگر وہ اس وقت اسکول میں تھی۔ رحیم داد کے جانے کے چند ہی روز بعد اس نے اسکول میں بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا تھا۔

مہمان خانے کی طرح اس کمرے کے ساتھ بھی کوٹھری تھی۔ رحیم داد نے کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ دیکھا، اس کا سامان مہمان خانے سے لا کر کوٹھری میں حفاظت کے ساتھ رکھ دیا گیا تھا۔ کمرے کا ایک دروازہ ملحقہ کمرے میں کھلتا تھا۔ رحیم داد اس کمرے میں گیا۔ اس میں بھی دو پلنگ بچھے تھے اور ان پر بھی بستر لگے تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے بھی پڑے تھے۔ یہ کمرہ دیکھتے ہی رحیم داد سمجھ گیا کہ وہ بچوں کے قیام کے لیے تھا۔ اس کی صفائی اور آرائش بھی جمیلہ کی نگرانی ہی میں کی گئی تھی۔

رحیم داد کمرے میں پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ رحیم داد سفر کی تکان سے نڈھال ہو رہا تھا۔ کپڑے گرد آلود تھے۔ چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ مگر اس نے غسل نہ کیا۔ چپ چاپ بیٹھا جمیلہ کا انتظار کرنے لگا۔

شام کا اندھیرا پھیلتے ہی جمیلہ کمرے میں داخل ہوئی۔ لیکن دہلیز ہی پر رک گئی۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں دریافت کیا ”چوہدری! تو بھابی کو نہیں لایا۔ بچے کدھر ہیں؟“

رحیم داد نے پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کوئی جواب نہ دیا۔ منہ لٹکائے خاموش بیٹھا رہا۔ جمیلہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی رحیم داد کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ حیران و پریشان نظر آرہی تھی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے دبی زبان سے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"کیا اس بار بھی تیری گھر والی اور بچے نہیں ملے۔ سلامت نے تجھے غلط اطلاع دی تھی؟"

"نہیں، اس نے ٹھیک ہی اطلاع دی تھی۔" رحیم داد نے چہرے پر افسردگی طاری کرنے کے ساتھ ساتھ لہجے میں بھی رقّت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "میری گھر والی، رابعہ، تخت محل ہی میں ہے۔ بچے بھی اس کے ساتھ ہیں۔"

"پر وہ تیرے ساتھ آئی کیوں نہیں؟"

رحیم داد کی آواز گلوگیر ہوگئی۔ "وہ اب میرے پاس نہیں آسکتی۔"

"وہ تیرے پاس کیوں نہیں آسکتی؟ جمیلہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔" ایسا کیوں ہے؟ صاف صاف بتا۔"

"صاف گل سننا چاہتی ہے تو وہ بھی سن لے۔" رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ چند لمحے نظریں اٹھائے چپ چاپ دیوار کو تکتا رہا۔ اس نے جمیلہ کی طرف نہ دیکھا۔ کھوئے کھوئے انداز میں آہستہ سے کہا۔ "وہ اب کسی اور کی ہو چکی ہے۔ اس نے ایک پٹواری سے ویاہ کرلیا ہے۔ اور اس بات کو بھی تین سال سے اوپر ہو چکے ہیں۔ پٹواری سے اس کے دو بچے بھی ہیں۔" اس نے مڑ کر افسردہ نگاہوں سے جمیلہ کو دیکھا۔ "زمیں دارنی! تو ہی بتا، اب وہ میرے ساتھ کیسے رہ سکتی ہے۔"

"پر اس نے ایسا کیوں کیا؟ تیرا انتظار بھی نہ کیا۔" جمیلہ کا لہجہ بھی دکھ بھرا تھا۔

"چار سال تک رابعہ میرا انتظار کرتی رہی۔" رحیم داد نے بوجھل لہجے میں رک رک کر بتایا۔ "وہ بچوں کو ساتھ لیے جگہ جگہ مجھے ڈھونڈتی رہی۔ زیور بیچ بیچ کر اور گھروں میں کام کاج کر کے کسی نہ کسی طرح اپنا اور بچوں کا پیٹ پالتی رہی۔" رحیم داد ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ "جب بہت پریشان ہوگئی اور میرے ملنے کی کوئی آس نہ رہی، تب یہ سوچ کر کہ میں بھی

دوسرے مسلمانوں کی طرح فسادات میں مارا گیا، اس نے مجبور ہو کر پٹواری سے نکاح پڑھوالیا۔ وہ اس کی دوسری گھر والی ہے۔ پہلی مدت ہوئی مر گئی۔"

"تجھے یہ ساری گل بات کیسے معلوم ہوئی؟"

رحیم داد نے بتایا۔" میں دو ہفتے تک تخت محل میں سلامت کے ایک یار کے ساتھ ٹھہرا رہا۔ رابعہ سے کسی نہ کسی طرح ملنے کی کوشش کرتا رہا۔ ایک رات جب پٹواری بہاول نگر گیا تھا میں چپکے سے اس کے گھر میں گھس گیا۔ رابعہ نے مجھے دیکھا تو حیران رہ گئی۔ دیر تک اسے یقین ہی نہ آیا کہ میں زندہ ہوں۔"

"جب اسے دھیان ہو گیا تو اس کا گھر والا چوہدری نور الٰہی ہے تب اس نے کیا کیا؟" جمیلہ نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے استفسار کیا۔

"وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دیر تک آنسو بہاتی رہی۔" رحیم داد نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔ ہولے سے آہ بھری۔" اس نے رو رو کر مجھے اپنی بپتا سنائی۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ ٹھٹکا۔" کیا، کیا جائے اپنے نصیب ہی میں اس طرح مل کر بچھڑنا لکھا تھا۔ میرا گھر ایسا اجڑا کہ اب اس کے دوبارہ بسنے کی کوئی امید نہیں۔"

"ہاں تیری طرح نہ جانے کتنوں کے گھر اسی طرح اُجڑ گئے۔" جمیلہ کی آواز بھرا گئی۔ رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ جمیلہ بھی چپ ہو گئی۔ اس نے آنکھوں میں اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کی دل گرفتہ ہو کر بولی۔" تو اپنے بچوں سے بھی ملا؟"

"نہیں۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔" انہیں صرف نزدیک سے دیکھا تھا۔ وہ اس وقت سو رہے تھے۔ میں نے انہیں جگانے کی کوشش نہیں کی۔ اب تو اتنے دن بیت گئے کہ وہ مجھے پہچان بھی نہ پاتے۔" اس نے جمیلہ کی طرف غم زدہ نظروں سے دیکھا۔" زیں دارنی! ویسے انہیں تو یہی پتہ ہے کہ اُن کا بیو مر چکا ہے۔ ماں نے ان کو یہی بتا رکھا ہے۔" رحیم داد نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس بھری۔" آٹھ سال میں سب کچھ بدل گیا۔ بچے بڑے ہو گئے۔ ایک بیٹی تو جوان ہو چکی ہے۔"

"چوہدری! تو ایسا کر جوان دھی کو یہاں لے آ۔" جمیلہ نے مشورہ دیا۔ "یہاں رہے گی تو تجھے بھی آرام ملے گا۔ اچھا وَر مل جائے تو اس کا ویاہ کر دینا۔"

"رابعہ اس کے لیے تیار نہ ہوگی۔" رحیم داد نے فوراً بات بنائی۔

"کیوں نہیں تیار ہوگی؟" جمیلہ نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔

"میں تو صرف ایک دھی کو نہیں، سب بچوں کو اپنے ساتھ لانا چاہتا تھا۔" رحیم داد نے بتایا۔ "میری یہ بات سن کر رابعہ رونے لگی۔ سسکیاں بھر کر بولی۔ انہیں مجھ سے الگ نہ کر۔ میں نے بہت دکھ جھیل کر انہیں پالا پوسا ہے۔ انہی کے سہارے تو میں اب تک زندہ رہی۔ تیں نوں ان سے کیا لینا۔ تو انہیں بھی میری طرح مرا ہوا سمجھ کر صبر کر چکا تھا۔ اگے بھی صبر کر لے۔ اس کی یہ باتیں سن کر میں چپ ہو گیا۔ کر بھی کیا سکتا تھا۔ چوری سے چھپ کر تو اس کے گھر میں گیا تھا۔"

"پر یہ تو کوئی گل بات نہ ہوئی۔" جمیلہ اپنی بات پر بدستور اڑی رہی۔ "سب نہیں، وڈی کڑی کو تو وہ دے ہی سکتی ہے۔ اس میں اس کا بھی لابھ ہے۔ کبھی نہ کبھی تو رابعہ کو دھی کا ویاہ کرنا ہی ہوگا۔ وہ ہر طرح کی چنتا سے بچ جائے گی۔"

"وہ یہ بات نہیں سمجھتی۔"

"تو مجھے رابعہ کے پاس لے چل۔ میں اسے راضی کروں گی۔"

"نہیں زمیں دارنی، تیرا وہاں جانا ٹھیک نہیں۔ ویسے بھی تو عدت میں ہے۔ تو کیسے تخت محل جا سکتی ہے؟" رحیم داد نے جمیلہ کو ٹالنے کی کوشش کی۔ "میں نے تیرے بارے میں رابعہ کو کچھ نہیں بتایا۔ تجھے دیکھ کر جانے وہ کیا سوچے۔"

"سوچنے دے۔ اس کے سوچنے سے کیا ہونا ہے۔" جمیلہ نے بے نیازی سے کہا۔

"تو اپنی بتا۔ تیری کیا مرضی ہے؟"

"پہلے مجھے کوشش کر لینے دے۔ فیر تو کوشش کرنا۔" رحیم داد نے جمیلہ کو دلاسا دیا۔

"میں کچھ دنوں بعد دوبارہ تخت محل جاؤں گا۔"

" جیسی تیری مرضی۔" جمیلہ نے مزید اصرار نہ کیا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ رحیم داد سے مخاطب ہو کر بولی "چوہدری! اب تو اشنان کر لے۔ تھکا ہوا بھی ہے۔ روٹی کھا کر آرام سے سو جا۔" جمیلہ چلی گئی۔ رحیم داد بہت خوش اور مطمئن تھا کہ جمیلہ نے اس کی ہر بات پر یقین کر لیا تھا۔ کسی بھی حیلے بہانے پر اس نے مطلق شک و شبہ کا اظہار نہ کیا۔ وہ جمیلہ کی ہمدردی حاصل کرنے میں پوری طرح کامیاب رہا تھا۔ ساتھ ہی احسان شاہ کے پاس جانے اور اس کی حویلی میں گل چھرے اڑانے کا ایک موثر بہانہ بھی ہاتھ آگیا تھا۔

سویرے رحیم داد نے حویلی کے نائی کو بلوایا۔ ویسے اسے نائی کو بلوانے کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ ہر جمعہ کی صبح، وہ نہایت باقاعدگی سے رحیم داد کی حجامت بنانے پہنچ جاتا۔ مگر پچھلے سترہ روز کی غیر حاضری نے اس معمول میں خلل پیدا کر دیا تھا۔ نائی آیا اس نے رحیم داد کی ڈاڑھی اور سر کے بال تراشے۔ تیل ڈال کر دیر تک سر کی مالش کی۔ رحیم داد نے اس روز بالوں کی تراش خراش اس طرح کرائی کہ ڈاڑھی ہلکی اور قدرے مختصر ہوگئی۔

حجامت سے فارغ ہونے کے بعد اس نے صبح کا غسل کیا۔ اجلے کپڑے پہنے۔ ڈاڑھی اور سر کے بالوں میں کنگھی کی۔ اور جب وہ بن سنور کر حویلی کے بڑے کمرے میں پہنچا تو نادر خاں وہاں پہلے سے موجود تھا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی وہ ادب سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ رحیم داد کو غور سے دیکھا۔ مسکرا کر بولا "چوہدری! سچی بات یہ ہے کہ اب تو تجھ پر بہت شان آگئی ہے۔" اس نے رحیم داد کی خوش نودی کے لیے خوشامد سے کام لیا۔ مگر اس خوشامد میں بڑی حد تک صداقت بھی تھی۔ رحیم داد اس وقت خاصہ وجیہ اور باوقار نظر آرہا تھا۔ اس کی رنگت نکھر کر اجلی ہوگئی تھی۔ رخساروں سے سرخی جھلکتی تھی۔ وہ قدر آور جوان تھا۔ دبلے پتلے لمبے جسم پر گوشت چڑھنے اور بڑھنے سے وہ زیادہ ہی جچنے لگا تھا۔

رحیم داد نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے نادر خاں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خاموشی سے اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی اور دبدبہ تھا۔ عینک کے شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھیں سوچتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ احسان شاہ کی صحبت میں رہ کر وہ

جاگیرداروں اور رئیسوں کے طور طریق کسی قدر سیکھ گیا تھا۔ اور انہیں اپنا بھی چکا تھا۔

نادر خاں زیادہ دیر خاموش نہ رہا۔ دبی زبان سے بولا" اجازت ہو تو جی ایک بات کہوں؟"

"کہہ کیا کہنا ہے تیں نوں" رحیم داد ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے بولا۔

"چشمے کا یہ فریم ٹھیک نہیں لگتا جی" نادر نے رحیم داد کی آنکھوں پر لگی ہوئی عینک کی کی طرف اشارہ کیا" اسے تو بدل دینا چاہیے"

"اس میں تیں نوں کی خرابی نظر آئی ہے؟" رحیم داد نے پوچھا" ویسے تیرے خیال میں کیسا فریم ہونا چاہیے"

"چوہدری! یہ تو مجھ پر چھوڑ دے" نادر خاں نے کہا" ویسے تو یہ کپڑے بھی تیری شان کے مطابق نہیں لگتے۔ لہور سے میرا ایک بھتیجا آیا ہے۔ شام کو واپس جا رہا ہے۔ وہاں ایک راشن ڈپو پر نوکری کرتا ہے۔ وہ لہور سے تیرے لیے عمدہ فریم کا چشمہ بنوا کر اور نئے کپڑے سلوا کر لے آئے گا۔ مجھے اپنا چشمہ اور ناپ کے لیے ایک جوڑا قمیض اور شلوار دے دینا۔ وہ جلدی واپس آ جائے گا۔ دیر نہیں لگے گی"

"اس پر خرچ کتنا آئے گا؟"

"تو اس کی فکر نہ کر" نادر خاں بولا" تیری غیر حاضری میں مزارعوں سے میں نے کچھ وصولی کی ہے۔ وہ میرے پاس موجود ہے۔ چوہدری! تیرا حکم ہو تو میں نئے چشمے اور کپڑوں کے لیے کچھ روپے اپنے بھتیجے کو دے دوں؟"

"دیدے" رحیم داد نے مسکرا کر کہا" پر یہ بتا مزارعوں سے وصولی کیسے ہوئی اور کتنی ہوئی؟" اس نے قدرے تیکھی نظروں سے نادر خاں کو دیکھا" تو پہلے تو کہتا تھا مزارع ادھار ادا کرنے کو تیار نہیں"

"ویسے تو جی کوئی خاص وصولی نہیں ہوئی۔ باراں سو کے لگ بھگ روپیہ ہے" نادر خاں نے بتایا" ادھار تو زیادہ ہی وصول ہو جاتا۔ پر زمیں دارنی بار بار اڑچن ڈال دیتی تھی۔ جو مزارع اس کے پاس پہنچ کر فریاد کرتا۔ اُسے معاف کر دیتی۔ میں نے اسے کہا بھی یہ طریقہ ٹھیک نہیں

وہ ایک دم بھڑک اٹھی۔ میں اس کی ناراضگی سے ڈر گیا۔ تو نے بھی یہی حکم دیا تھا کہ اسے ناراض نہ کیا جائے۔"

"ٹھیک ہی کیا تو نے۔" رحیم داد نے سنجیدگی سے کہا۔ "جتنی بھی وصولی ہو گئی ٹھیک ہے۔ خریف کی فصل تو اب تیار ہی ہونے والی ہے۔ اس کی واڈھی پر اپنی سکیم کے مطابق ادھار وصول کر لینا۔"

"مجھے ڈر ہے، فصل کی واڈی پر بھی زمیں دارنی اڑبنگا ڈالے گی۔"

"تو فکر نہ کر۔ میں اسے سمجھا بجھا لوں گا۔ پیسے کی تو سچ پوچھ اُسے بھی ضرورت ہے۔ وصولی کی رکم کے بارے میں تو نے زمیں دارنی کو بتا دیا تھا؟"

"بالکل بتا دیا تھا جی۔" نادر خاں نے مستعدی سے جواب دیا۔ "ایک ایک پیسے کا اُسے حساب دے دیا تھا۔"

"اس نے وصولی کی رکم تجھ سے مانگی تو نہیں؟"

نادر نے بتایا۔ "میں نے اسے کہا بھی تھا۔ پر اس نے رکم نہ لی۔ کہنے لگی اپنے ہی پاس رکھ چوہدری کو بتا دینا۔ اور رجسٹر میں اسے وصولی کی مد میں لکھ لے۔ جو خرچ ہو وہ بھی روز کے روز رجسٹر میں لکھ لیا کر۔"

"جیسا اس نے بتایا تو ویسا ہی کر رہا ہے ناں؟"

"بالکل ویسا ہی کر رہا ہوں جی۔" نادر خاں بولا۔ "ویسے میں نے کاغذات دیکھ کر اور مزارعوں سے ملنے جلنے کے بعد زمیں داری چلانے کے لیے اگے کا ایک پروگرام بنایا ہے۔ اس کے مطابق ہی کام کرنا ہوگا جی۔ ایسے تو زمیں داری نہیں چل سکتی۔"

"تو نے زمیں دارنی کو بھی اپنا پروگرام بنایا؟"

"نہیں جی۔" نادر خاں نے جواب دیا۔ "میں تیری واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ تو جب موجود ہوگا تو تیرے سامنے ہی زمیں دارنی سے اس کے بارے میں گل بات کروں گا۔ مجھے اس کی ناراضگی سے خوف آتا ہے۔"

رحیم داد نے نادر سے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی اس سلسلہ میں جمیلہ سے ملنے اور بات کرنے کی

کوشش کرے گا۔

کئی روز گزر گئے مگر جمیلہ سے رحیم داد کی ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ منہ اندھیرے چادر سے اپنے جسم کو پوری طرح چھپائے ہوئے اسکول چلی جاتی۔ دوپہر کا کھانا بھی وہیں منگوا لیتی۔ اور جب شام کا دھندلکا ہر سو پھیل جاتا تو دونوں بچوں کے ہمراہ اسکول سے واپس آتی۔ ان دنوں وہ اسکول کی ترقی اور ڈسپنسری کی تعمیر کے کاموں میں الجھی ہوئی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ خریف کی فصل کی کٹائی سے رقم حاصل ہو تو تعمیر کا کام پوری سرگرمی سے شروع کیا جائے۔

☆

اتوار کو اسکول میں چھٹی تھی۔ جمیلہ حویلی کی بالائی منزل پر تھی۔ اس کا تمام وقت اب اسکول یا اوپر کی منزل کے کمروں کے اندر ہی گزرتا تھا۔ وہیں وہ گاؤں کی عورتوں سے ملتی جلتی تھی۔ جب سے رحیم داد کا قیام حویلی میں شروع ہوا تھا۔ اس نے اپنا یہی معمول بنا لیا تھا۔

اس روز رحیم داد نے تاراں کے ذریعے جمیلہ کو حویلی کے بڑے کمرے میں بلوایا اور نادر خاں کے ہمراہ اس سے بات چیت کرنے کی غرض سے پہنچا۔ کچھ دیر تک اسکول اور ڈسپنسری کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ جمیلہ نہایت جوش و خروش سے اپنا منصوبہ بتاتی رہی۔ رحیم داد اور نادر خاموشی سے سنتے رہے۔ رحیم داد کوئی بات پوچھتا۔ جمیلہ اس کا جواب دیتی۔ اپنے منصوبے کی تفصیل سے اسے آگاہ کرتی۔

جمیلہ نے اسکول اور ڈسپنسری کا ذکر ختم کیا تو رحیم داد نے نادر خاں کی طرف دیکھا۔ اسے مخاطب کیا۔ "نادر! تو آگے کے لیے زمیں داری چلانے کی گل بات کرنا چاہتا تھا۔ اب زمیں داری کے سامنے اسے بتا۔"

نادر خاں نے رحیم داد کے بجائے جمیلہ ہی کو مخاطب کیا۔ "زمیں دارنی! میں نے کاغذات اور حسابات کے رجسٹر ایک بار نہیں، کئی بار دیکھے۔ انہیں دیکھ کر میں تو جی اس نتیجے پر پہنچا کہ زمیندارا اسی طرح چلتی رہی تو حویلی کا خرچ بھی پورا نہیں ہو سکے گا۔ تو سکول کو بڑھانا اور ترقی دینا چاہتی

ہے۔ ڈسپنسری لگانا چاہتی ہے۔ یہ سب کچھ کیسے ہوگا؟ کل بادی مربعے کی تو زمیں داری ہے۔ اور اسے بھی اب تک ٹھیک سے نہیں چلایا گیا۔"

"تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ صاف صاف گل کر۔" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں نادر خاں سے کہا۔

"تو برا نہ منائے زمیں دارنی تو میں نے صاف ہی صاف گل بات کرنی ہے۔" نادر خاں نے لہجے میں نرمی اور عاجزی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ سہما ہوا نظر آرہا تھا۔

"میں ہر بات صاف ہی صاف سننا چاہتی ہوں۔"

"اپنی زمیں داری کا حال تو یہ ہے جی، نہ مزارعوں سے ویگار لی جاتی ہے، نہ خرچہ، نہ ملشیانا اور نہ کمیالہ ہی وصول کیا جاتا ہے۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "دوسرے سارے ہی وڈے زمیں دار تو مزارعوں سے گھر میں نیا دروازہ یا کھڑکی بنانے پر بھی دروازہ ٹیکس اور کھڑکی ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ مزارع نئی بھینس خریدے تو بھینس ٹیکس، لکڑ پالے تو لکڑ ٹیکس تک وصول کرتے ہیں۔ زمیں دار کے یہاں موت ہو جائے یا زچگی ہو، مونڈن ہو یا ختنہ، سب ہی کا ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔"

"کہہ تو ٹھیک ہی رہا ہے تو۔" رحیم داد نے نادر خاں کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "سارے ہی وڈے زمیں دار یہی کرتے ہیں اور جی سدا سے کر رہے ہیں۔"

"پر اپنی زمیں داری میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔" نادر خاں نے لہجے میں افسردگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "اپنے زمیں دار اللہ وسایا کا انتقال ہوا۔" اس نے جمیلہ کو مخاطب کیا۔ "زمیندارنی! اس کا کفن دفن، تیجا، چالیسواں، سب تو نے اپنے ہی ڈب سے کیا۔ مزارعوں نے کچھ بھی نہ دیا۔ اپنی زمیں داری میں تو مزارعوں کو بٹائی کا حصہ بھی نصفا نصف دیا جاتا ہے۔ جب کہ دوسرے زمیں دار ۷۵، بلکہ ۸۰ فی صد سے بھی اوپر حصہ وصول کرتے ہیں۔"

"نادر خاں تو کیسی گل کر رہا ہے۔ جب ۱۹۵۲ء کے قانون میں زمیں دار کا حصہ پیداوار میں ۴۰ فی صد مقرر کیا گیا ہے۔ تو ہم اس سے زیادہ کیسے وصول کر سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ نصفا نصف

بٹائی بھی غلط ہی ہے۔ پتہ نہیں اب تک مزارعوں نے چپ کیوں سادھ رکھی ہے۔"

"زمیں دارنی! تو تو آدھی سے بھی زیادہ بٹائی دینے کی گل کر رہی ہے۔" نادر مسکرایا۔" لگتا ہے، میری باتوں کا تو الٹا ہی اثر ہوا۔" اس نے جمیلہ کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا۔" میں تو جی ان ٹیکسوں کی گل بات کر رہا تھا جو وصول نہیں کیے جاتے۔ میرا مطلب ہے۔"

"میں تیرا مطلب اچھی طرح سمجھتی ہوں۔" جمیلہ اس کی بات کاٹ کر تیکھے لہجے میں بولی۔" تیری یہ طرح طرح کے ٹیکسوں والی گل سمجھ نہیں آتی۔ تجھے پتہ نہیں، میں نے تو اللہ وسایا کو نمبردار بھی بننے نہ دیا۔ اسے بار بار نمبرداری پیش کی گئی۔ پر میں نے ہر بار اس کی نندا کی۔"

"تو نے یہ ٹھیک نہیں کیا زمیں دارنی۔ نمبرداری سے زمیں دار کی شان اونچی ہو جاتی ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لیے تو تگڑی رشوت چلتی ہے۔ سفارشیں پہنچائی جاتی ہیں۔ افسروں کی منت سماجت کی جاتی ہے۔" نادر خاں نے دبی زبان سے احتجاج کیا۔" پر نہ مانا زمیں دارنی، جب ہی تو اپنی زمیں داری بڑھنے کی بجائے سکڑتی جا رہی ہے۔"

"میں نے زمیں داری بڑھانی بھی نہیں۔" جمیلہ نے گھور کر تیکھی نظروں سے نادر خاں کو دیکھا۔ "میرے پتا کی پانچ ہزار ایکڑ سے بھی اوپر زمیں داری تھی۔ اسے اپنے بیو کی طرف سے ترکہ میں اتنی وڈی زمیں داری نہیں ملی تھی۔ میرا پتا جات کا کراڑ تو نہیں تھا پر اس کا ساہوکارے کا بھی کاروبار تھا۔ اور بہت پھیلا ہوا تھا۔ سچ پوچھ تو اس نے اپنے ساہوکارے ہی سے اتنی وڈی زمیں داری بنائی تھی۔"

"وہ کیسے؟" رحیم داد نے حیرت سے دریافت کیا۔

"وہ زمین اور جائیداد رہن رکھتا تھا۔ اگاہی پر زمیں داروں اور کسانوں کو ادھار دیتا تھا۔" جمیلہ نے بتایا۔" جب ادھار بیاج کے ساتھ بہت بڑھ جاتا تو وہ وصولی کے لیے عدالت میں نالش کرتا۔ زمیں دار اور کرضائی کے خلاف ڈگری نکلواتا۔ ان کے گھر بار، ڈھور ڈنگر، زمین کُرک کراتا۔ انہیں بے دخل کر کے زمین ہتھیاتا۔ اس طرح وہ اپنی زمیں داری بڑھاتا رہا۔" جمیلہ کا لہجہ تلخ ہوتا گیا۔" تجھے کیا پتہ، اس کے منیم اور کرندے زمیں سے بے دخلی کے لیے کیسا کیسا ظلم اور ایذا کرتے۔ گھروں

پر کرکی بٹھا نے۔ فصلیں اٹھوا لے جاتے۔ پولس کو رشوت دے کر گرفتاریاں کراتے۔" اس کی آواز رفتہ رفتہ تیز اور اونچی ہوتی گئی۔" زمیں داری کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے کارن جو ظلم ڈھایا گیا۔ اس کا کیا نتیجہ نکلا؟"

جمیلہ نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ رحیم داد اور نادر کی جانب دیکھا۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ جمیلہ نے گہری سانس بھری۔" یہ فسادات اور بلوے کیا تھے۔ کراڑوں اور ساہوکاروں کے اپرادہ اور لوٹ مار کے خلاف قرض ادھار میں جکڑے ہوئے مسلمان کسانوں اور زمیں داروں کی نفرت ہی تو تھی۔ میں نے تو کتابوں میں پڑھا ہے ۱۹۱۶ء میں بھی ملتان، مظفر گڑھ، جھنگ اور دوسرے ضلعوں میں اسی طرح کراڑوں اور ساہوکاروں کے خلاف مسلمان کسان اور زمیں دار اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ کسان وو روہیوں نے ہندو ساہوکاروں کے گھروں پر ہلّہ بول دیا۔ ان کے گھر لوٹ لیے، آگ لگائی۔ بہت خون خرابہ کیا۔ اتنی گڑبڑ مچائی کہ ددروہی کسانوں پر کابو پانے کے لیے انگریزوں کو فوج لگانی پڑی۔ جگہ جگہ ددروہیوں اور فوج کے درمیان زبردست لڑائیاں ہوئیں۔ یہ گڑبڑ تھوڑے دنوں نہیں، سال ڈیڑھ سال تک چلتی رہی۔"

نادر خاں بولا۔" پر زمیں داری ۴۷ء کے فسادات اور بلوؤں میں تو ہزاروں کتل ہوئے۔ پورے پورے پنڈ اجڑ گئے۔ بستیاں کی بستیاں لوٹ لی گئیں۔ بہت زبردست تباہی ہوئی۔ بہت خون خرابہ ہوا۔" اس نے جمیلہ کی طرف دیکھا اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی۔

"تو نے ٹھیک ہی کہا کہ فسادات اور بلوے ہندو بنیوں اور ساہوکاروں کے ظلم و ستم اور ان کی دھاندلیوں کے خلاف مسلمان کسانوں اور دوسرے قرض داروں کی نفرت کا اظہار تھا۔ مگر فسادات کی صرف یہی ایک وجہ نہیں تھی۔"

"اور بھی وجہ تھی۔ کئی طرح کی باتیں تھیں۔" رحیم داد نے نادر خاں کی تائید کی۔

"پنڈی، ملتان، منٹگمری، لہور اور نہ جانے کتنی جگہ تو یہ بھی ہوا کہ ہندوؤں اور سکھوں کا مال اسباب لوٹنے اور ان کی زمینوں اور املاک پر کبضہ کرنے کی غرض سے سیاسی لیڈروں اور وڈے زمیں داروں نے باقاعدہ منصوبے کے تحت مسلمانوں کو طرح طرح سے اشتعال دلایا۔

اپنے بندوں کے ذریعہ فسادات اور بلوے کرائے۔ لوٹ مار اور خون خرابہ کرایا۔" نادر خاں نے اپنی بات کہتے کہتے ایک بار پھر نظریں اٹھا کر جمیلہ کی جانب دیکھا۔" زمیں دارنی! یہ تو تینوں پتہ ہی ہے، ایک بار جب نفرت اور غصے کی آگ سلگ جاتی ہے تو فیر ہر طرف پھیلنے لگتی ہے۔ سوال صرف چنگاری لگانے کا ہے۔" اس کے ہونٹوں پر زہر خند بکھر گیا۔" میں نے ان گنہگار آنکھوں سے دیکھا کہ لہور میں کس طرح لیڈروں اور وڈے لوگوں نے مختلف ہتھکنڈوں سے فسادات کی آگ بھڑکائی۔"

جمیلہ تو خاموش رہی، مگر رحیم داد خاموش نہ رہا۔ اس نے پوچھا۔" فسادات کے دنوں میں تو ادھر ہی ہوتا تھا؟"

"میں ان دنوں لہور میں تھا۔" نادر خاں نے بتایا۔" پس مجھے امرتسر بھی جانا پڑا تھا۔"

"تو فسادات کے زمانے میں امرتسر گیا تھا؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔" ان دنوں تو مسلمان بھاگ کر ادھر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تو کیوں امرتسر چلا گیا؟ وہاں تو اس وکت ہر طرف مسلمانوں کا خون بہایا جا رہا تھا۔ گھر بار لوٹے جا رہے تھے۔ تجھے اس جلتی آگ میں جانے کی کیا سوجی؟ اپنی سمجھ میں تو تیری گل آئی نہیں۔"

"وہ ایسا ہوا جی کہ میرا وڈا بھرا، منظور خاں، امرتسر کی ایک ٹکسٹائل مل میں سپروائزر لگا تھا۔" نادر خاں نے بتایا۔" جب اس نے حالات بگڑتے دیکھے اور آنے والے خطرے کی بو محسوس کی تو گھر والی کو بچوں کے ساتھ لہور بھیج دیا۔ خود نوکری کی خاطر امرتسر میں رہا۔ جب امرتسر اور مشرقی پنجاب کے دوسرے حصوں سے مسلمانوں کے خون خرابے اور لوٹ مار کی خبریں ادھر پہنچنے لگیں تو میری بھابی نے گھر والے کے لیے رو رو کر برا حال کر لیا۔ گڑگڑا کر میری منّت کی۔ مجھ سے اس کا یہ دکھ دیکھا نہ گیا۔ ویسے بھی منظور میرا سگا بھرا تھا۔ آخر اسے لینے مجھے امرتسر جانا ہی پڑا۔ یہ نہ پوچھ کیسے وہاں پہنچا۔"

"حد کر دی تو نے۔" رحیم داد کے لہجے میں استعجاب تھا۔" تو وہاں سے نکل کر ادھر پہنچا کیسے؟ منظور تجھے مل گیا تھا؟"

"ہاں جی! وہ مجھے مل گیا تھا۔" نادر خاں نے کہا۔" وہ کٹڑا کنھیاں میں اپنے ایک ہندو جاننے

والے، گینش پرشاد، کے گھر میں چھپا ہوا تھا۔ میں امرتسر پہنچنے کے بعد مسجد غزنویہ میں ٹھہر گیا۔ مسجد کے ساتھ مدرسہ بھی تھا۔ اس کے مہتمم سے میری جان پہچان تھی۔ تب ہی تو میں وہاں ٹھہر سکا تھا۔ دوسرے محلّوں اور علاقوں کے مسلمان بھی بھاگ بھاگ کر شریف پورہ یا مسجد غزنویہ پہنچ رہے تھے۔ میں نے منظور کو کسی نہ کسی طرح اپنے پہنچنے کی اطلاع بھجوائی اور اسے کہا کہ وہ بھی کوشش کر کے مسجد پہنچ جائے۔ مسجد غزنویہ ان دنوں بہت محفوظ جگہ تھی۔ فیر جی ایسا ہوا کہ ایک رات منظور مسجد غزنویہ پہنچ ہی گیا۔ اس نے ایسا بھیس بنایا تھا کہ پہلی نظر میں تو میں اسے ہندو سمجھا۔ دوسرے بھی یہی سمجھے اور اسے پکڑ کر میرے پاس لائے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی گلے سے لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔"

نادر نے ٹھنڈی سی سانس بھری۔" وہ تو جی سمجھو موت کے منہ سے نکل کر آیا تھا۔ ان دنوں مسجد میں اور اس کے آس پاس بہت مسلمان اکٹھے تھے اور روز بروز ان کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی تھی۔"

"میں نے تو سنا ہے کہ امرتسر کی مسجد غزنویہ میں مسلمانوں کا بہت خون بہا۔ بہت تباہی ہوئی۔" رحیم داد نے دریافت کیا۔" میں نے غلط تو نہیں سنا؟"

"تو نے ٹھیک ہی سنا چوہدری۔" نادر خاں نے جواب دیا۔" میں نوں اب تک وہ بھیانک رات یاد ہے۔" اس کے چہرے پر دکھ کے سائے پھیلنے لگے۔" میں بھولا نہیں۔ ایک ایک بات یاد ہے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ مسجد میں دن رات کلام پاک کی تلاوت ہوتی۔ وعظ ہوتا۔ دعائیں مانگی جاتیں۔ ۱۴ اگست کو جب پاکستان بننے کا اعلان ہوا تو ہم دونوں بھائی مسجد غزنویہ ہی میں تھے۔ رمضان کی ۲۷ تاریخ تھی۔ نہ پوچھ کیسی خوشی منائی گئی۔ ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے تھے۔ گرم جوشی سے گلے ملتے تھے۔"

"اس وقت تک مسجد محفوظ رہی ہوگی؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"ہاں جی۔ پر تباہی بھی اس روز ساتھ ہی آئی۔" نادر خاں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"عید سے تین روز پہلے کا ذکر ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ مسجد کے صحن میں اور اس کے آس پاس پڑے ہوئے مسلمان رات کو بھی جاگ ہی رہے تھے۔ ہر طرف سے تلاوت کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ اچانک آدھی رات کو زبردست شور اٹھا۔ پتہ چلا کہ ریاستی اور گورکھا فوج نے مسجد پر دھاوا

بول دیا تھا۔"

"فیر کیا ہوا جی؟" رحیم داد نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"ہونا کیا تھا۔ نہتے مسلمان فوج کے مسلح سپاہیوں کا کس طرح مقابلہ کر سکتے تھے۔ ڈر کر اِدھر اُدھر چھپنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم دونوں بھائی بھی مدرسے کے ایک حجرے میں چھپ گئے۔" نادر خاں نے بتایا۔ "رات کے اندھیرے میں ہر طرف چیخ پکار مچی تھی۔ کچھ سمجھ نہ آتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ بہت دیر بعد جب شور شرابہ رکا اور یہ اطلاع ملی کہ حملہ آور فوجی قتل غارت گری کر کے چلے گئے تو منظور کے ساتھ میں حجرے سے نکل کر مسجد میں پہنچا۔ دیکھا صحن میں ہر طرف لاشیں بکھری تھیں۔ کچھ سسک رہے تھے۔ کچھ دم توڑ رہے تھے۔ کچھ زخموں سے تڑپ رہے تھے۔ کوئی مرہم پٹی کرنے والا بھی نہ تھا۔ مسجد میں جدھر نظر جاتی، خون ہی خون نظر آتا۔"

"زنانیاں اور بٹیاریں نہیں تھیں؟" جمیلہ بہت دیر بعد بولی۔

"بہت تھیں جی۔" نادر خاں نے کہا۔ "کچھ کی تو ننگی لاشیں مسجد کے صحن میں خون میں لتھڑی پڑی تھیں۔ کسی کا پیٹ چاک تھا۔ کسی کی چھاتیاں کٹی ہوئی تھیں۔ کچھ کو حملہ آور فوجی اور بلوائی اٹھا کر لے گئے۔ کچھ نے اپنی آبرو بچانے کے لیے مسجد کے کنوئیں میں چھلانگیں لگائیں اور ڈوب کر مر گئیں۔ ان کی لاشیں پانی پر تیرتی دکھائی دے رہی تھیں۔"

"بہت ظلم اور اپرادھ ہوا۔" جمیلہ نے دکھ بھرے لہجے میں اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا۔

رحیم داد نے نادر خاں سے دریافت کیا۔ "تو اور منظور اس خون خرابے کے بعد مسجد ہی میں ٹھیرے رہے؟"

"نہیں جی، بلوچ رجمنٹ کی نگرانی میں دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ہم دونوں کو بھی شریف پورہ کے ریلیف کیمپ میں پہنچا دیا گیا تھا۔" نادر نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "ایک روز ایسا ہوا کہ علاقہ مجسٹریٹ میجر پورن سنگھ، شریف پورہ کیمپ کے مسلمان پناہ گزینوں کا حال احوال معلوم کرنے آیا۔ اس سے فریاد کی گئی۔ ظلم و ستم کا حال بتایا گیا۔ میجر پورن سنگھ بہت متاثر ہوا۔ اس نے شہر کے معائنہ کا ارادہ کیا۔ ساتھ ہی کئی مسلمانوں کو بھی لیا۔ ان میں میں بھی شامل تھا۔"

"اچھا، تو بھی معائنہ پر مجسٹریٹ کے ساتھ گیا تھا؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "کیا حال تھا شہر کا؟"

"حال کی کیا پوچھتے ہو جی" نادر نے رقّت انگیز آواز میں کہا۔ "مسلمان محلّوں میں تو ہر طرف تباہی نظر آتی۔ جدھر نظر اٹھتی جلے ہوئے مکانات اور کھنڈر دکھائی دیتے۔ شہر کے گلی کوچوں میں رستوں اور سڑکوں پر خون ہی خون نظر آتا۔ لاشیں پڑی سڑتی ہوتیں۔ کسی کا سر کٹا ہوا، کسی کے ہاتھ اور کسی کے پیر۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "کوچہ رنگریزاں سے معائنہ ٹیم میجر پورن سنگھ کے ساتھ باہر نکلی تو ایک مکان کے پرنالے سے لال لال تازہ خون بہہ رہا تھا۔ میجر کے ساتھ مکان کی چھت پر جاکر دیکھا۔ ایک نوجوان زنانی اور اس کا ننھا سا لڑکا خون میں ڈوبے پڑے تھے۔ زنانی کے بدن کے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ پر لڑکا اس نے چھاتی سے لگا رکھا تھا۔ دونوں ہی مر چکے تھے اور انہیں مرے ہوئے زیادہ دیر بھی نہ گزری تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک جلتے ہوئے مکان کی چھت کے جنگلے کی سلاخوں سے ایک زنانی کی جلی ہوئی بے جان ٹانگیں نیچے جھول رہی تھیں۔ ہر طرف گوشت کے جلنے کی بو پھیلی تھی اور مردہ زنانی کی جھولتی ہوئی ٹانگوں سے چربی پگھل پگھل کر نیچے گر رہی تھی۔"

"بس کر نادر۔" جمیلہ نے پریشان ہو کر نادر خاں کو منع کیا۔ "تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بہت ظلم اور ابرادہ ہوا۔ کتنے ہی سب پاگل ہو گئے تھے۔ پر سوال یہ ہے کہ وہ پاگل کیوں ہو گئے تھے۔ اس کا کوئی نہ کوئی کارن تو ضرور ہی ہو گا؟ ایسے ہی تو کوئی پاگل نہیں ہو جاتا۔ میں تجھے یہی بتانا چاہتی تھی کہ یہ پاگل پن کیوں ہوا۔ کیسے ہوا؟"

نادر خاں نے کہا۔ "ایک گل اور بھی ہے۔ فسادات اور بلوؤں کے بعد ہندو بنیئے اور ساہوکار چلے گئے۔ پر ان کی جگہ مسلمان سناریوں اور زمیں داروں نے لے لی۔ وہ بھی اگاہی پر کرض ادھار دیتے ہیں۔ سود اور بیاج کھاتے ہیں۔ فرق کیا پڑا جی۔"

"تیرا مطلب ہے مزارعوں سے ویگار لی جائے۔ مُنشیانا اور کمائیہ لیا جائے۔ زبردستی طرح طرح کے ٹیکس وصول کئے جائیں۔" جمیلہ کے چہرے پر جھنجھلاہٹ بکھر گئی۔ لہجہ تلخ ہو گیا۔ "تو یہی کہنا چاہتا ہے ناں؟" اس نے صاف انکار کر دیا۔ "مجھے اس طرح زمیں داری نہیں بڑھانی۔"

"برا نہ منا" نادر خاں کے لہجے میں عاجزی تھی۔ "زمیں دارنی! یہ تو جانتی ہے نا کہ تو اپنا سکول وڈا بنانا چاہتی ہے اور ڈسپنسری بھی لگانی چاہتی ہے میں کہتا ہوں ضرور ایسا کر۔ مزارعوں سے کوئی اور ٹیکس وصول نہ کر۔ پر سکول اور ڈسپنسری ٹیکس تو فصل کی واڈھی پر وصول کرنا ہی چاہیے"

"کیوں وصول کرنا چاہیے؟" وہ آنکھیں نکال کر بولی۔

"اس لیے کہ سکول اور ڈسپنسری تو انہیں کے لیے ہوں گے نا؟" نادر خاں نے جمیلہ کی خفگی نظرانداز کرتے ہوئے اپنے مشورے پر زور دیا۔

"نہیں نادر! مجھے سکول اور ڈسپنسری کے لیے کوئی ٹیکس شیکس نہیں لینے" جمیلہ کا لہجہ بدستور تیکھا تھا" مجھے ٹیکس کے چکروں میں نہ ڈال۔ ایک بار ٹیکسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تو نت نئے لگنے شروع ہو جائیں گے۔ فریبے دخلیاں ہوں گی۔ ظلم ہوگا۔ اپرادہ ہوگا۔ مجھے اس سے خوف آتا ہے" اس نے انکار میں ہاتھ ہلایا" میں نے تجھے بتایا نا کہ میرے پتا کی بہت وڈی زمیں داری تھی۔ میں نے وہ زمیں داری دیکھی ہے۔ مزارعوں سے طرح طرح کے ٹیکس وصول ہوتے ہوئے بھی دیکھے ہیں اور ان کے بل بوتے پر زمیں داری کے ٹھاٹھ باٹ بھی دیکھے ہیں۔ میں نے بہت کچھ دیکھا" اس نے بڑے جوش سے اپنے سینے پر ہاتھ مارا" فسادات اور بلوے دیکھے۔ اچھے بھلے بندوں کو پاگل اور وحشی ہوتے دیکھا۔ اور اس پاگل پن کا شکار بھی ہوئی۔ تجھے کیا پتہ کہ وہ پاگل پن کیسا بھیانک تھا۔ ایک ڈراؤنا سپنا۔ ہاں، اب تو سپنا ہی لگتا ہے" اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ "مجھے اس بھینکر کلپنا کی یاد نہ دلا"

رحیم داد اور نادر خاں دم بخود بیٹھے رہے۔ جمیلہ نے چادر کے پلّو سے قطرہ قطرہ ٹپکتے ہوئے آنسو پونچھے۔ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ نادر خاں بھی کھڑا ہو گیا۔ جمیلہ نے مڑ کر اس کی سمت دیکھا" نادر! میں بہت ابھاگن اور دکھی ہوں۔ ایسا نہ کر کہ مجھے اور دکھ پہنچے" اس کی آواز میں زخمی دل کی فریاد رچی تھی۔

"نہیں زمیں دارنی، تو ایسا نہ سوچ" نادر خاں نے مستعدی سے جواب دیا۔

رحیم داد بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جمیلہ کو یقین دلانے کی کوشش کی" تو جیسا کہے گی

بالکل ویسا ہی ہوگا۔ تو فکر نہ کر۔ تیری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔"

"چوہدری! مجھے تجھ سے یہی امید تھی۔" جمیلہ مطمئن ہوکر بولی "تو بھی تو کم دکھی نہیں۔ تو نے بھی بہت ظلم اور ایذا اٹھایا ہے۔ تو جانتا ہے اور اچھی طرح جانتا ہے کہ ظلم اور ایذا کیا ہوتا ہے۔"

جمیلہ آگے بڑھی۔ کمرے سے نکل کر دالان میں گئی۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اوپر کی منزل کے زینے پر پہنچی اور سیڑھیاں طے کرنے لگی۔

اس ملاقات کے بعد جمیلہ سے پھر بات چیت نہ ہوئی۔ نہ رحیم داد نے کوشش کی اور نہ ہی جمیلہ نے۔

☆

رحیم داد نے زمیں داری کے معاملات میں پوری توجہ کے ساتھ دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ وہ روزانہ نادر خاں کے ساتھ کھیتوں کی طرف نکل جاتا۔ فصلوں کو دیکھتا۔ کپاس کے پودوں میں ڈوڈے پھوٹنے لگے تھے۔ مکئی کے لمبے لمبے پتوں کے درمیان گڈیاں اور سٹے ہوا کے جھونکوں سے ہولے ہولے جھومتے اور لمادک کے اونچے اونچے پودوں پر پاندے پھیلتے جا رہے تھے۔

رحیم داد مزارعوں سے ملتا۔ بات چیت کرتا۔ فصلوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے نجی معاملات میں بھی دلچسپی کا اظہار کرتا۔ ان سے نرمی اور ہمدردی کا اظہار کرتا۔ دوپہر تک اس کا وقت عام طور پر کھیتوں کے درمیان گھومتے پھرتے اور مزارعوں سے باتیں کرتے ہوئے گزرتا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر وہ سو جاتا۔ شام کو پابندی سے باغ میں جا کر بیٹھ جاتا۔ وہاں بھی مزارعوں سے ملتا۔ مگر حویلی کے باہر کے اس سائبان کے نیچے وہ کسی روز نہیں بیٹھا جہاں اللہ وسایا مزارعوں سے اکثر و بیشتر ملتا تھا اور گھنٹوں بیٹھا ان کے ساتھ بات چیت کرتا رہتا تھا۔ رحیم داد کبھی کبھی ٹہلتا ہوا گاؤں میں چلا جاتا یا نہر کی طرف نکل جاتا۔ نادر ہمیشہ اس کے ہمراہ ہوتا۔

زمیں داری کی مصروفیات سے اکتا جاتا تو وہ دل بہلانے کے لیے احسان شاہ کے پاس چلا

جاتا۔ دو تین روز ٹھہرتا۔ شام کو وہسکی کی چسکی لگاتا۔ رات کو کبھی نوراں اور کبھی کسی اور نوجوان عورت کو کوٹ سے بلوالیتا۔ مگر احسان شاہ کی حویلی میں اس کا قیام اب طویل نہ ہوتا۔ چند ہی روز ٹھہرنے کے بعد واپس کوٹلہ ہر کشن آجاتا۔

احسان شاہ کی حویلی میں قیام کرنے اور اس کے ساتھ وقت گزارنے کا رحیم داد کو سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سرکاری افسروں اور بڑے زمیں داروں سے ملنے اور تعلقات پیدا کرنے کا اُسے پورا پورا موقع ملا۔ اس کے ذہن میں پولیس کے افسروں کی طرف سے جو خوف و خطرے کا احساس تھا وہ بھی رفتہ رفتہ زائل ہو چکا تھا۔ وہ سب سے بے دھڑک ملتا لیکن وہ احسان شاہ کے پاس ہمیشہ چوری چھپے جاتا اور تخت محل جانے کا بہانہ کرتا۔

موسم دھیرے دھیرے بدلتا جا رہا تھا۔ دوپہر کو کسی قدر گرمی ہو جاتی مگر صبح خوش گوار او سہانی ہوتی۔ شام کو ہلکی ہلکی خنکی ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ رحیم داد نے اب شام کو باغ میں بیٹھنے کا سلسلہ بند کر دیا تھا۔

☆

جمیلہ سے پچھلے کئی ہفتوں سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ وہ ان دنوں رحیم داد کو نظر ہی نہ آتی۔ عدت میں ہونے کے باعث اس نے پٹھاناں کے مشورے سے تاجاں کی شادی کی تاریخ بڑھادی تھی۔ سسرال والوں نے بھی اس عذر کو قبول کر لیا تھا۔ جمیلہ نے جیسا کہا انھوں نے ویسا ہی کرنے پر رضا مندی کا اظہار کیا۔ نہ حجت کی نہ اصرار کیا۔

عدت ختم ہونے میں اب تھوڑی ہی مدت رہ گئی تھی۔ خریف کی فصل تیار ہو چکی تھی۔ جمیلہ فصل کی کٹائی کے بعد ہی تاجاں کی شادی کر دینا چاہتی تھی۔ دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ جمیلہ اسکول کی مصروفیات کے ساتھ ساتھ شادی کی تیاریوں میں الجھی ہوئی تھی۔

نادر خاں نے بھی اب اپنی بیوی کو بلا لیا تھا۔ بیوی اور تینوں بچوں کے ساتھ وہ مہمان خانے ہی کے ایک حصہ میں مقیم تھا مگر وہاں مستقل رہنا نہ چاہتا تھا۔ رحیم داد بھی یہی چاہتا تھا۔ نادر کا

ارادہ تھا کہ فصل کٹنے کے بعد ڈسپنسری کی تعمیر شروع ہو تو بھٹے سے آنے والی اینٹوں سے مہمان خانے کے قریب ہی اپنی رہائش کے لیے مکان بنوالے۔ اپنی اس خواہش کا اظہار وہ رحیم داد سے کر چکا تھا۔ اور رحیم داد نے اسے مکان بنانے کی اجازت بھی دے دی تھی۔

نادر کی بیوی کا نام جنت بی بی تھا۔ وہ خوب صورت تو نہ تھی مگر رنگ صاف تھا۔ جسم گداز اور بھرا بھرا تھا۔ عمر ۳۵ برس کے لگ بھگ تھی۔ نادر خاں بھی اس کا دوسرا شوہر تھا۔ پہلے شوہر سے اس نے طلاق لے لی تھی۔ اس سے دو بچے بھی تھے۔ جو باپ کے ساتھ ہی قصور رہیں رہتے تھے۔

جنت گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر روزانہ جمیلہ کے پاس چلی جاتی۔ شام کو تو اس کا بیشتر وقت جمیلہ ہی کے پاس گزرتا۔ وہ رفتہ رفتہ جمیلہ سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ جمیلہ کا رویہ بھی اس کے ساتھ خوش گوار اور مشفقانہ تھا۔ تاجاں کی شادی کی تیاریوں میں اس نے جنت کو بھی شریک کر لیا تھا۔ اس طرح وہ جمیلہ سے اور قریب ہو گئی۔ شادی بیاہ کی رسم ورواج کے سلسلہ میں وہ جمیلہ کو مشورے بھی دیتی۔ جمیلہ ان کو مان بھی لیتی۔ وہ ہندو گھرانے میں پیدا ہوئی تھی اور اسی ماحول میں پروان چڑھ کر جوان ہوئی تھی۔ لہٰذا مسلمانوں کی رسوم اور روایات سے پوری طرح اسے واقفیت نہ تھی جنت اس سلسلہ میں اس کی ایک اچھی مشیر ثابت ہوئی۔

جنت بی بی ایک بار عدت کی مدت بھی گزار چکی تھی۔ اس معاملہ میں وہ تجربہ کار بھی تھی۔ جمیلہ کی عدت ختم ہونے کو آئی تو اس نے نادر کو بتایا کہ عدت کے خاتمہ پر کیا کیا ہونا چاہیے۔ وہ چاہتی تھی کہ عدت جس روز ختم ہو رحیم داد کی جانب سے جمیلہ کو نیا جوڑا اور چوڑیاں بھیجی جائیں۔ ویسے جوڑا اور چوڑیاں میکے سے آنا چاہیے تھیں۔ مگر جمیلہ کا کوٹلہ ہرکشن میں بیٹھا ہی کون تھا جو اس فرض کو ادا کرتا۔

نادر خاں نے رحیم داد سے اس سلسلہ میں بات کی۔ وہ اس وقت رحیم داد کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ نادر کی بات سن کر رحیم داد بولا "ایسا کر نادر تو جمیلہ سے بھی پوچھ لے۔"

"اس سے کیا پوچھنا ہے جی" نادر نے مستعدی سے جواب دیا "ویسے تو یہ زمیں دارنی کے کسی رشتے ناتے دار کی طرف سے ہونا چاہیے تھا۔ لیکن تیں نوں پتہ ہی ہے ادھر اس کا کوئی بھی نہیں۔ اب تیں نوں

ہی اس کا بندوبست کرنا ہوگا۔ اس معاملہ میں جمیلہ سے بات کرنا مناسب نہیں لگتا۔ یہ رسم اسی طرح ہوتی ہے۔"

رحیم داد نے کوئی حجت نہ کی۔ صرف اتنا کہا۔ "کسی کو آج ہی لہور بھیج کر کپڑا منگوا لے۔ مگر کپڑا ریشمی ہو۔" وہ چند لمحے نظریں جھکائے سوچتا رہا۔ "رنگ گلابی ہونا چاہیے۔ جمیلہ کو یہ رنگ بہت پسند ہے۔ چوڑیاں بھی عمدہ ہوں۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔ "میں تو کہتا ہوں تو خود ہی چلا جا۔ کپڑا لا کر اپنی گھروالی کو دے دینا۔ وہ ناپ لے کر خود ہی تیار کروا لے گی۔ یہ زنانیوں کا کام ہے۔ اس کا نہ تجھے پتہ ہے اور نہ مجھے۔ ایسے سارے ہی کام ہمیشہ زنانیوں ہی کے لیے چھوڑ دینے چاہئیں۔" وہ بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔

دوسرے ہی روز نادر خاں لاہور چلا گیا۔ دوپہر کو رحیم داد بھی احسان شاہ کے گاؤں، پیراں والہ چلا گیا۔ مگر رحیم داد نے وہاں صرف رات بھر کے لیے قیام کیا۔ سویرے اٹھ کر حویلی اسٹیشن کے راستے پاک پتن پہنچا۔ بازار گیا۔ بھاول پوری چوڑی گردوں کے بنائے ہوئے ہاتھی دانت کے چوڑے خریدے۔ باہوں میں پہننے کے لیے باہیں خریدیں۔ بھاول پوری لہریا ریشمی لنگی، سرخ گل بوٹوں کا کڑھا ہوا دوشالہ، چاندی کے کرن پھول، مندریاں اور چھلوں کے علاوہ ناک میں پہننے کا قیمتی بھاول پوری بوپا اور سونے کے کنگن خریدے۔ وہ اسی شام واپس آگیا۔ نادر خاں دو روز بعد لاہور سے لوٹا۔

عدّت کی مدّت کے چار مہینے دس دن پورے ہونے سے پہلے ہی جنت نے ریشمی جوڑا سلوا لیا تھا۔ جس روز عدّت ختم ہوئی۔ جمیلہ نے صبح اٹھ کر غسل کیا۔ جنت نے اصرار کیا تو اس نے گلابی ریشمی جوڑا پہن لیا۔ کلائی میں چوڑیاں بھی ڈال لیں۔ مگر اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اللہ وسایا اسے بار بار یاد آتا۔ اس نے آنسو پونچھے۔ کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالا۔ جنت نے کنگھی سے جمیلہ کے بال سنوارے۔ آنکھوں میں کاجل لگایا۔ پھر وہ حویلی کی چند خادماؤں کے ہمراہ جمیلہ کو مسجد لے گئی۔ مسجد کے دروازے پر پہنچ کر جمیلہ نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ جنت نے جمیلہ ہی کے ہاتھ سے مسجد کے ملا کو پانچ روپئے دلوائے۔

اب جمیلہ پر حویلی سے بے دھڑک باہر جانے اور کسی نامحرم کے سامنے آنے کی پابندی اٹھ چکی تھی۔ مگر جمیلہ مسجد سے واپس آنے کے بعد سیدھی اوپر کی منزل پر گئی اور اپنے کمرے

میں تنہا لیٹی رہی۔ رحیم داد بڑے کمرے میں بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ نیچے نہ اتری۔

دن ڈھلنے لگا۔ رحیم داد غسل خانے میں گیا۔ نہا دھو کر ڈبل گھوڑا بوسکی کی نئی قمیص اور شلوار پہنی۔ آنکھوں پر سنہری فریم کا نیا چشمہ لگایا۔ یہ لباس اور چشمہ نادر خاں کا بھتیجا لاہور سے خرید کر لایا تھا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد رحیم داد نے سر کے بالوں کے لمبے لمبے پٹے خوشبودار تیل ڈال کر جمائے۔ ڈاڑھی کو کنگھی سے سنوارا۔ آنکھوں میں سرمہ ڈالا۔ عطر لگایا۔ اور آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر دیر تک اپنی سج دھج دیکھتا رہا۔ وہ اس وقت وجیہہ اور باوقار لگ رہا تھا۔ چہرے پر تازگی تھی۔ رخساروں پر سرخی جھلکتی تھی۔ آنکھوں میں طراوٹ اور تابندگی تھی۔

اس نے احمد کی بیوی تاراں کو بلایا اور وہ تمام ساز و سامان، جو اس نے چند روز قبل پاک پتن سے خریدا تھا ایک طشت میں رکھ کر جمیلہ کے پاس بھجوا دیا۔ وہ کچھ دیر اپنے کمرے میں بیٹھا رہا۔ پھر حویلی سے باہر جانے کے ارادے سے نکلا تو تاراں کی زبانی یہ پیغام ملا کہ جمیلہ نے اسے اپنے کمرے میں بلایا تھا۔

☆

یہ گلابی جاڑوں کی ہنستی مسکراتی شام تھی۔ فضا میں خنکی تھی۔ کہر کا ہلکا نیلگوں دھندلکا ڈوبتے سورج کی نارنجی شعاعوں میں گھلتا جا رہا تھا۔ رحیم داد کی آنکھوں میں سنہرے خواب جاگ رہے تھے۔ اس نے دھڑکتے دل سے سیڑھیاں طے کیں۔ اوپر پہنچا زینے کی مٹی کے سامنے کھلی چھت تھی۔ چھت کے ایک سرے پر تین کمرے تھے۔ دو کمروں کے آگے برآمدہ تھا۔ تیسرے کی صرف کھڑکیاں چھت کی جانب کھلتی تھیں۔ اس میں آمد و رفت کے لیے دروازہ ملحقہ کمرے ہی میں کھلتا تھا۔

رحیم داد نے دیکھا، بائیں ہاتھ کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اس میں وہ ایک بار پہلے بھی آ چکا تھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے کمرے کے اندر نظر دوڑائی۔ لیمپ کی گہری زرد روشنی میں جمیلہ مونڈھے پر بیٹھی تھی۔ وہ گلابی لباس میں پھول کی مانند شگفتہ اور دلکش نظر آ رہی تھی۔ سامنے میز پر طشت میں وہ تمام اشیاء اسی طرح رکھی تھیں، جس طرح رحیم داد نے تاراں کے ہاتھ

بھجوائی تھیں۔

رحیم داد کو دیکھ کر جمیلہ نے کہا۔ ”چوہدری! اندر آجا۔“ اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”بیٹھ جا۔“

وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ جمیلہ نے سامنے رکھے ہوئے طشت کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”تو نے یہ سب کچھ کس لیے بھیجا ہے؟“

”تیرے ہی لیے بھیجا ہے۔“ رحیم داد نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”سوچا تیری عدت تو ختم ہو چکی ہے۔ تجھے ان کی ضرورت ہو گی۔ اب تو انہیں پہن سکتی ہے۔“ وہ بے تکلفی سے کھل کر مسکرایا۔ ”میں نے غلط تو نہیں سوچا؟“

”ہاں، اب میں انہیں پہن سکتی ہوں۔ تو نے ٹھیک ہی سوچا۔“

”ہوا یہ کہ تخت محل سے واپسی پر میں بھاول نگر گیا تھا۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”بازار گیا تو تیرے لیے یہ چیزیں خرید لیں۔ پہلے بھی خرید لیتا۔ پر تب تو انہیں پہن نہیں سکتی تھی۔“

”لایا تو اچھی اور شاندار چیزیں ہے۔“ جمیلہ نے طشت سے کنگن اٹھائے۔ دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ہاتھی دانت کے چوڑے دبائے۔ مسکرائی۔ پوچھا۔ ”بھاول پوری چوڑی گروں کے ہاتھ کے بنے ہوتے ہیں ناں؟ بہت سندر ہیں۔“

”تیری کلائیوں اور باہوں پر بہت اچھے لگیں گے۔“ رحیم داد خوش ہو کر بولا۔ ”انہیں پہن لے۔“

”نہیں! میرے پہننے کا سمے بیت گیا۔“ وہ اچانک سنجیدہ ہو گئی۔ ”یہ تو داجلو گہنے پاتے ہیں۔ تاجاں کے دہیج کے لیے ٹھیک رہیں گے۔ وہ ڈیڑھ دو مہینے بعد مائیاں بیٹھ جائے گی۔“

”اس کے دہیج کے لیے اور لے آؤں گا۔“ رحیم داد نے اصرار کیا۔ ”میری خوشی ہے تو انہیں ابھی میرے سامنے پہن لے۔“ اس نے جمیلہ کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ ”تو تاجاں کی فکر نہ کر۔“

”نہیں۔ میں انہیں نہیں پہنوں گی۔“ جمیلہ نے صاف انکار کر دیا۔

مگر رحیم داد نا امید نہ ہوا۔ ہنس کر پوچھا "کیوں نہیں پہنے گی؟"

"میرا من نہیں چاہتا" جمیلہ کے چہرے پر دکھ کا غبار بکھرنے لگا" مجھے مجبور نہ کر"

رحیم داد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھرپور نظروں سے دیکھا۔ اور ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ جمیلہ نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ رحیم داد نے آہ بھرنے کے انداز میں گہری سانس بھری۔ آہستہ سے کہا" جمیلے!"

جمیلہ نے چونک کر اُسے دیکھا۔ رحیم داد نے پہلی بار اللہ وسایا کے پیار بھرے انداز سے اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ تڑپ کر بولی" کہہ۔ کیا کہنا چاہتا ہے؟"

"بُرا نہ منا" رحیم داد موم کی طرح پگھل گیا۔ اس کے لہجے میں عاجزی کے ساتھ ساتھ لگاوٹ بھی تھی "تیں نوں پتہ نہیں، تو کتنی سوہنی ہے۔ اور جوان بھی ہے۔ کب تک اللہ وسایا کو یاد کرتی رہے گی۔ وہ اب واپس آنے سے تو رہا"

"میں نے پتہ ہے۔ وہ واپس نہیں آسکتا" جمیلہ نے بہت سنبھلے ہوئے انداز میں کہا" سچ پوچھ تو اب مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں۔ بہت دن بیتے جب مجھے ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ اللہ وسایا کے روپ میں مجھے وہ سہارا مل بھی گیا تھا" اس نے ٹھنڈی سانس بھری" اب میرا سہارا اپنا اور گڈو ہیں۔ مجھے کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔ میں کیول ان دونوں کے لیے زندہ رہنا چاہتی ہوں"

"تو ضرور ان کے لیے زندہ رہ پر کچھ اپنا بھی تو خیال کر" رحیم داد نے لہجے میں رقت پیدا کی۔ "تیں نوں کسی کے سہارے کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ پر مجھے تیرے سہارے کی ضرورت ہے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں"

"میں نے پتہ ہے تو کیا چاہتا ہے" جمیلہ اس کی بات کاٹ کر بولی" پر جو تو چاہتا ہے وہ نہیں ہو سکتا۔ اس وچار کو اپنے من سے نکال دے۔ اُسے بھول جا"

"کیسے بھول جاؤں" رحیم داد نے چہرے پر افسردگی طاری کرنے کی کوشش کی۔ عاجزی سے بولا" میں بھی تیری طرح دکھی ہوں۔ اُجڑا ہوں۔ برباد ہوا ہوں" اس نے بجھی بجھی نظروں سے

جمیلہ کو دیکھا۔" اُجڑ کر ایک بار فیر سنبھلنے کا موقع ملا تھا۔ تیں توں پتہ ہے۔ اب وہ بھی نہ رہا۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ رابعہ دوسرے کی ہو چکی ہے۔ اس نے منّت کرنے پر بھی دھی کو میرے سامنے نہ آنے دیا۔"

جمیلہ نے کسی ردّ عمل کا اظہار نہ کیا۔ چپ بیٹھی رہی۔

رحیم داد چند لمحے خاموش رہنے کے بعد غم زدہ لہجے میں گویا ہوا۔" جمیلہ! مجھے سمجھنے کی کوشش کر۔ میرا دکھ تو جانتی ہے۔"

" میں تجھے اور تیرے دکھ کو اچھی طرح جان چکی ہوں۔" جمیلہ کے لہجے میں تلوار کی کاٹ تھی۔

" صاف صاف سننا چاہتا ہے تو سن لے۔" وہ ہانپنے کے انداز میں تیز تیز سانسیں بھرنے لگی۔ " تو مجھ سے بہانہ کر کے احسان شاہ کے پاس جاتا رہا۔ اس کی حویلی میں ٹھیرتا اور ہر بار مجھ سے جھوٹ بولتا۔"

رحیم داد سخت سٹ پٹایا۔ بدحواس ہو کر بولا۔" تجھے یہ کس نے بتایا۔ یہ بالکل غلط ہے۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے الجھا۔" کسی نے تجھے بہکا دیا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔"

" چوہدری! چپ کر۔ زیادہ بکواس نہ کر۔" جمیلہ نے اسے غصّے سے ڈانٹا۔" احسان شاہ کا پنڈ، پیراں والہ یہاں سے دور ہی کتنا ہے۔ چند میل کا تو فاصلہ ہے۔ تو نے یہ نہ سوچا کہ یہ بات کب تک چھپی رہے گی۔ کسی پنڈ میں کوئی نیا بندہ آ جائے تو آس پاس کے ہر پنڈ میں اس کی خبر پھیل جاتی ہے۔ تو تو بہت دنوں سے احسان شاہ کے پاس جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ کئی کئی روز ٹھیرتا رہا ہے۔"

اسی اثنا میں تاراں دروازے پر نمودار ہوئی۔ وہ جمیلہ کے لیے کھانا لے کر آئی تھی۔ جمیلہ نے تاراں کو دیکھتے ہی کہا۔" چوہدری، اب تو جا۔" رحیم داد خاموشی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ کمرے سے باہر آیا۔ رات در و دیوار سے نیچے اتر رہی تھی۔ سناٹا گہرا ہو گیا تھا۔ ہر طرف اندھیرا چھایا تھا۔ کہر کی دھند میں لپٹی ہوئی حویلی اونگھ رہی تھی۔

۴۷

حویلی کے شمال میں گاؤں کا رَڑ تھا۔ رَڑ کے اس پار دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ خریف کی فصل تیار ہو چکی تھی۔ مکئی اور کماد کے پودے خوب اونچے ہو گئے تھے۔ ان کے لمبے لمبے پتے کہیں کہیں سے زرد پڑ گئے تھے۔ مکئی کے سٹوں سے اِدھر اُدھر نکلے ہوئے، بھلوں کے سفید اور باریک سوت بکھرے ہوتے تو جھالر بن کر لہراتے اور سمٹ کر گتھ جاتے تو پھندنے معلوم ہوتے۔ کماد کے بعض پودے اتنے زیادہ پک گئے تھے کہ پتوں پر آگری نکل آئی تھی۔ کپاس کے پودے گھنے اور چھوٹے تھے۔ اُن کے ڈوڈوں سے روئی کے سفید سفید توبنے پھوٹ کر باہر نکل آئے تھے۔ یہ پھٹی تھی۔ مکئی، چری اور کماد کے پودوں کی کٹائی کے ساتھ پھٹی کی چنائی بھی شروع ہونے والی تھی۔

رحیم داد ناشتہ کر چکا تھا۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے رَڑ کے اُس پار کھیتوں کو دیکھ رہا تھا۔ کھیتوں پر کہر کی ہلکی تہہ پھیلی ہوئی تھی۔ پچھلے کئی روز سے وہ کھیتوں کی طرف نہیں گیا تھا۔ اُس کا بیشتر وقت کمرے کے اندر ہی گزرتا۔ دن ڈھلے کبھی کبھار نہر کی طرف نکل جاتا مگر نہ احسان شاہ کے گاؤں پیراں والہ گیا۔ نہ اس کا ایسا ارادہ تھا۔

نادر خاں سے اُس کی ملاقات اُن دنوں عام طور پر صبح کے وقت ہوتی۔ نادر نے اس کی خلافِ معمول بڑھی ہوئی عزلت پسندی اور خاموشی محسوس کی۔ ایک روز کرید کر سبب معلوم کرنے کی کوشش بھی کی لیکن رحیم داد نے اُس کی مطلق حوصلہ افزائی نہ کی۔ نہ کچھ بتایا نہ اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔ اُس نے جمیلہ سے اپنی ملاقات تک کا اس سے ذکر نہیں کیا۔ البتہ زمیں داری کے بارے

میں وہ ہر روز نادر خاں سے بات چیت کرتا اور اکثر دیر تک باتیں کرتا۔

رحیم داد خاموش بیٹھا نادر خاں کا انتظار کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ ابھری۔ رحیم داد نے اندازہ لگا لیا کہ جمیلہ اوپر کی منزل سے نیچے آ رہی ہے۔ چاپ رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔ پچھلے سات آٹھ روز سے جمیلہ سے اس کی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ نہ رحیم داد نے کوئی کوشش کی اور نہ ہی جمیلہ نے اس کی جانب کوئی توجہ دی۔ جمیلہ ہر صبح اوپر سے نیچے آتی۔ رحیم داد کے کمرے کے سامنے سے چپ چاپ گزرتی اور اپنے دونوں بچوں کے ہمراہ اسکول چلی جاتی۔ واپسی پر بھی وہ بے نیازی سے اوپر چلی جاتی۔ اسکول کے علاوہ اس کا زیادہ وقت اوپر کی منزل پر گزرتا۔ کوئی ملنے آتا تو اسے بھی وہ اوپر ہی بلوا لیتی۔

جمیلہ ذرا دیر بعد رحیم داد کے سامنے پہنچ گئی۔ گڈو اس کی انگلی پکڑے ہوئے تھا اور نینا ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ان کے پیچھے تاجاں تھی۔ وہ بچوں کے بستے، سرخ اون کا بڑا سا گولا اور اس میں پھنسی ہوئی بنائی کی سلائیاں اٹھائے ہوئے تھی۔ جمیلہ کا لباس سفید اور صاف ستھرا تھا۔ وہ ہلکی اونی شال اوڑھے ہوئے تھی۔ سیاہ شال پر سنہری بوٹیوں کی کشیدہ کاری تھی۔ زری کے کام کے ساتھ سبز اور سرخ ریشمی دھاگوں کی کڑھائی بھی تھی۔ وہ گردن اونچی کیے چل رہی تھی۔ رحیم داد اسے بجھی بجھی نظروں سے دیکھتا رہا۔

جمیلہ چلتے چلتے ٹھٹکی۔ دہلیز پر رکی۔ گردن کو خم دے کر اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ رحیم داد جھٹ کھڑا ہو گیا۔ جمیلہ نے اسے مخاطب کیا۔

"چوہدری! تو آج کل کھیتوں کی اور نہیں جاتا۔ خریف کی فصل تیار ہے۔ اس کی واڈھی کا بھی بندوبست کرنا ہے۔"

"زمیں دارنی! میری طبیعت پچھلے کئی روز سے گڑبڑ رہتی ہے۔" رحیم داد نے معذرت کے انداز میں آہستہ سے کہا۔ "تو فکر نہ کر۔ نادر خاں ہر کام کی پوری طرح دیکھ بھال کر رہا ہے۔"

"کیا دیکھ بھال کر رہا ہے وہ؟" جمیلہ کا لہجہ تیز اور تیکھا تھا۔ "اسے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ پھٹی میں لال سونڈی لگ گئی ہے۔ کئی بوٹوں پر چست نیلا اور سفید مکھی بھی نظر آئی۔ ڈوڈے

سکڑ کر رہ گئے ہیں۔ کئی کھیتوں میں تو ڈوڈوں سے تو نبے پھوٹے ہی نہیں۔ مجھے کل ہی رحمان نے بتایا۔ میں خود دیکھنے گئی تھی۔ اپنی آنکھوں سے پھٹی کے بوٹوں میں سونڈی اور دوسرے کیڑے دیکھے۔" اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی جھنجلاہٹ اُبھرنے لگی۔" اس طرح کیسے کام چلے گا۔ کپاس کی ساری فصل تباہ ہو جائے گی۔"

"ابھی نادر آتا ہو گا۔ میں اس سے بات کروں گا۔" رحیم داد نے کرسی کی جانب اشارہ کیا اور اور لہجے میں عاجزی پیدا کرنے کی کوشش کی۔" ذرا دیر یہاں ٹھہر جا۔ نادر سے بات کر لے۔ جو کچھ کرنا ہے۔ اُسے سمجھا دے۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے لمحے بھر کے لیے رُکا اور سر کے بال انگلی سے کریدنے لگا۔ "سمجھ نہیں آتی پھٹی میں سونڈی کیسے لگ گئی اور نادر نے اس کے بارے میں کیوں نہیں بتایا۔ روز سویرے میرے پاس آتا ہے۔ پہلے مجھ سے گل بات کرتا ہے۔ بعد میں کھیتوں کی طرف جاتا ہے۔"

"مجھے کیا پتہ، وہ کیا کرتا ہے اور تجھے کیا بتاتا ہے۔" وہ بے زاری سے بولی۔

"تو ذرا دیر کے لیے بیٹھ تو جا۔" رحیم داد نے نرمی سے اصرار کیا۔" نادر آنے ہی والا ہے۔ میں چاہتا ہوں تیرے سامنے ہی اُس سے گل بات ہو۔ بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ تو خود اُس سے پوچھ تاچھ کر۔ تنخواہ لیتا ہے۔ مفت تو کام نہیں کرتا۔"

"میں نے تو اب سکول جانا ہے۔" جمیلہ نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔" پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ تو خود ہی نادر سے گل کرنا۔ ویسے بھی زمیں داری تجھے ہی سنبھالنی ہے۔ میں نے اُس سے کیا لینا۔"

رحیم داد نے جھجکتے ہوئے جمیلہ کی سمت دیکھا۔ لہجے میں اور زیادہ نرمی پیدا کی۔" زمیں دارنی! ایسی بات نہ کر۔ یہ بتا، میں نوں نادر سے کیا کہنا ہے؟"

"کیا کہنا ہے؟" اس دفعہ جمیلہ کے رویّے میں جھنجلاہٹ کے بجائے سنجیدگی کا پہلو نمایاں تھا۔" اُس سے کہہ کہ پھٹی کے بوٹوں پر فوراً کیڑے مار دوا کا سپرے کرائے ورنہ کپاس کی فصل کا ستیاناس ہو جائے گا۔"

ننھے گڈو نے ماں کے کرتے کا دامن کھینچا اور مچلنے کے انداز میں بولا۔" ماں جی! سکول

نہیں جانا۔ میں نے پڑھائی کرنی ہے۔"

"چلتی ہوں، ابھی چلتی ہوں"۔ جمیلہ نے پیار سے گڈو کا رخسار تھپ تھپایا۔ پھر رحیم داد کی جانب متوجہ ہوئی" چوہدری! میں تو سکول جا رہی ہوں۔ تو نادر سے بات کر لینا۔ بات کیا کرنی ہے۔ یہ کام تو تجھی کو کرنا ہو گا اور ترت کرنا ہو گا۔ آج ہی بوٹوں پر دوائی چھڑکنے کا بندوبست کر۔ پہلے ہی بہت خرابی ہو چکی ہے۔"

جمیلہ آگے بڑھی۔

"ٹھیک ہے جیسا تو کہتی ہے وہی کروں گا"۔ رحیم داد آہستہ سے بولا" نینا اور گڈو کو سکول جانے دے، تو تھوڑی دیر ٹھہر جا۔"

"اب مجھے ٹھہر کر کیا کرنا ہے۔ جو گل بات نادر سے کرنی تھی وہ میں نے تجھے سمجھا ہی دی اب مجھے کیوں روک رہا ہے؟"

"میں نوں تجھ سے کچھ اور ضروری گل کرنی ہے"۔ رحیم داد کے لہجے میں التجا تھی۔

جمیلہ کچھ نہ بولی۔ آگے بھی نہ بڑھی۔ وہ گردن اٹھائے کچھ سوچتی رہی۔ پھر اس کی آواز ابھری۔ "بس دوپہر کو واپسی پر تیرے پاس آؤں گی"۔ اس نے رحیم داد کی جانب نہ دیکھا، خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔ دونوں بچے بھی اس کے ساتھ چلے۔ تاجاں بھی ان کے پیچھے پیچھے بڑھی۔

رحیم داد نظریں اٹھائے جمیلہ کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کی چال میں وہی پہلی سی تمکنت تھی۔ بانکپن تھا۔ سادگی کے باوجود اس کے گلابی چہرے کے تیکھے نقش و نگار دل کش اور حسین نظر آ رہے تھے۔ جمیلہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ رحیم داد مضمحل ہو گیا۔ اس نے گہری سانس بھری، پلٹا اور کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ نڈھال اور تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

رحیم داد کمرے سے باہر نہیں گیا۔

پہر دن گزر گیا۔ سورج چڑھ کر بلندی پر پہنچ گیا۔ مگر نادر نہیں آیا۔ رحیم داد نے حویلی کے ملازم نام دار کو بلایا۔ اسے نادر خاں کی تلاش میں بھیجا۔ وہ جلد ہی واپس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ نادر کسی ضروری کام سے نزدیک کے چک میں گیا ہے۔ وہ سویرے سویرے نکل گیا تھا۔ دوپہر تک لوٹے

گا۔ یہ اطلاع نادر کی بیوی جنت بی بی نے دی تھی۔ رحیم داد نے نام دار سے مزید بات نہیں کی۔ وہ چلا گیا۔

رحیم داد بے قراری سے جمیلہ کا انتظار کرنے لگا۔

☆

وقت زخمی سانپ بن گیا۔ آہستہ آہستہ رینگتا رہا۔ رحیم داد کی بے قراری بڑھتی گئی۔ سورج آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ گیا۔ حویلی کے وسیع صحن میں دور تک پھیلی ہوئی چمکیلی دھوپ کی تمازت بڑھ گئی۔ دوپہر ہو گئی۔ جمیلہ واپس ہوئی۔ دونوں بچے اس کے ہمراہ تھے۔ اس دفعہ ان کی کتابیں احمد اٹھائے ہوئے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ قدموں کی آہٹ سن کر رحیم داد کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

جمیلہ کمرے کے سامنے پہنچی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بے نیازی سے آگے بڑھ گئی۔ اُس نے رحیم داد کے کمرے کی جانب نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ رحیم داد کا دل ایک بار زور سے دھڑکا۔ پھر ٹھہر کر گویا سرد پڑ گیا۔ وہ بجھ کر رہ گیا۔ اس نے کرسی کی پشت سے گردن ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

اس عالم میں وہ نہ جانے کتنی دیر بیٹھا رہا۔ یکایک چاپ ابھری۔ رحیم داد نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا، دہلیز پر جمیلہ کھڑی تھی۔ رحیم داد چند لمحے ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھتا رہا پھر ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ اُلجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

"میں تو سمجھا تھا، آج تو نہیں آئے گی۔"

جمیلہ نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اُس کے ہاتھوں میں ایک فائل دبی تھی۔ رحیم داد بھی چپ چاپ قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

جمیلہ نے چند لمحوں کے سکوت کے بعد پوچھا۔ "بتا، تو نے کون سی ضروری گل بات کہنے کے لیے مجھے بلایا ہے؟" اُس کے لہجے سے بے زاری صاف ظاہر تھی۔

"تجھ سے کسی نے غلط بتایا کہ میں احسان شاہ کے پاس جاتا ہوں۔" رحیم داد نے صفائی پیش کرنے کی ایک بار پھر کوشش کی۔ "اُس روز تو بہت ناراض تھی۔ اس لیے میں تجھے ٹھیک سے سمجھا نہ

سکا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے پتہ ہے تو کیا کہنا چاہتا ہے۔" جمیلہ نے رحیم داد کو آگے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ "چوہدری! مجھے بہت پہلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ تو احسان شاہ کے پنڈ پیراں والہ جاتا ہے اور اس کی حویلی میں کئی کئی روز ٹھہرتا ہے۔ پر میں نے وشواس نہ کیا، ہر بار یہی سوچ کر من کو سمجھا لیا کہ تو ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"اب تو نے کیسے وشواس کر لیا؟" رحیم داد نے جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔

"یہ بھی سننا چاہتا ہے تو سن لے۔" جمیلہ کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "پچھلے دنوں اپنا وکیل، محمد عثمان راٹھور آیا تھا۔ تو اس روز احسان شاہ کے پاس گیا تھا۔" جمیلہ نے رحیم داد کی جانب گہری نظروں سے دیکھا۔ "تجھے پتہ نہیں، راٹھور نے لہور میں پریکٹس شروع کر دی ہے۔ آج کل وہ تیرے اور احسان شاہ کے یار، سردار مراد خاں شاہانی کے ایک کیس میں پیروی کر رہا ہے۔ شاہانی نے احسان شاہ کے ساتھ تیرے میل ملاپ کے بارے میں جو کچھ بتایا، اس کے بعد میرے وشواس نہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔" جمیلہ نے ہاتھ میں دبی ہوئی فائیل رحیم داد کی جانب بڑھا دی۔ "یہ تیرے کلیم کے کاغذات ہیں۔ وکیل انہیں واپس دے گیا ہے۔ کلیم میں جو گڑبڑ ہے وہ تجھے خود ٹھیک کرانی ہو گی۔ وکیل اب یہ کام نہیں کرے گا۔"

رحیم داد نے گھبرا کر کہا۔ "میں کلیم تسلیم کو کہاں ٹھیک کراتا پھروں گا۔" اس نے کاغذات کی فائل سنبھال لی۔

"یہ مجھے نہیں پتہ تو نے کیا کرنا ہے۔" وہ تلخی سے بولی۔ "میں تو کیول یہی کاغذات واپس کرنے آئی تھی ورنہ میں نے پتہ تھا، تو نے مجھ سے کیا کہنا ہے۔"

رحیم داد نظریں جھکائے پریشان بیٹھا رہا۔ کمرے پر سکوت طاری ہو گیا۔ جمیلہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ رحیم داد نے اس کی بے چینی شدت سے محسوس کی۔ دبی زبان سے پوچھا۔ "وکیل کب آیا تھا؟"

جمیلہ نے تیکھے لہجے میں بتایا۔ "جن دنوں تو تخت محل جانے کا بہانہ کر کے احسان شاہ کی حویلی میں ٹھہرا تھا۔"

"تیرا مطلب ہے، میں تخت محل نہیں گیا تھا؟" رحیم داد نے ہڑبڑا کر تردید کی کوشش کی۔ "پتہ نہیں میرے بارے میں تو نے ایسی باتیں کہاں سے سن رکھی ہیں؟"

"چوہدری! خاما خاہٹ دھرمی نہ کر۔" جمیلہ نے اُسے گھور کر ناگواری سے دیکھا" مجھے ایک ایک بات کا پتہ ہے۔ میں نے پتہ ہے تو کبھی تخت محل نہیں گیا اور نہ تخت محل میں تیرے بال بچے ہیں۔ میں نے کھوج لگایا تو معلوم ہوا کہ تخت محل کے پٹواری کی گھر والی کا نام رابعہ نہیں، نسیم بی بی ہے۔ وہ اُس کی پہلی گھر والی ہے۔ پچھلے سولاں سال سے اُس کے ساتھ ہے۔ وہ بھاول نگر ہی کی رہنے والی ہے۔ کبھی گورداس پور نہیں گئی۔ اُس کی کوئی جوان دھی نہیں۔ پُتر سب سے وڈا تھا، پچھلے سال مر گیا۔ اور جاننا چاہتا ہے، وہ بھی بتا دوں؟"

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ اُس کے چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ جمیلہ نے گہری سانس بھری۔ اُس کے لہجے کی تلخی افسردگی میں بدل گئی۔ "میں نے تو یہ بھی سُنا ہے کہ اللہ وسایا کے قتل میں تو بھی احسان شاہ کے ساتھ شریک تھا۔"

اب رحیم داد خاموش نہ رہ سکا، اُس نے احتجاج کیا۔ "یہ بالکل جھوٹ ہے۔" رحیم داد نے تلملاتے ہوئے کہا۔ "میں نوں تو یہ بھی پتہ نہیں کہ اللہ وسایا کو کس نے قتل کیا اور کیسے کیا۔ تو مجھے اتنا نیچ اور کمینہ سمجھتی ہے۔ میں تو کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"شاید تو ٹھیک کہہ رہا ہو۔" جمیلہ نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات ظاہر کر رہے تھے کہ رحیم داد نے اپنی باتوں سے اُسے خاصا متاثر کیا ہے۔ جمیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "میں تجھے دوش نہیں دیتی، کسی کو بھی نہیں دیتی۔ میرے بھاگ ہی میں یہ دکھ جھیلنا لکھا تھا۔ اب ان باتوں میں اُلجھنے سے کیا ملے گا۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔"

اُس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو اُمڈے اور پلکوں پر لرزنے لگے۔ رحیم داد نے لہجے میں رقّت پیدا کرتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ "میں ہاری! تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ میں توں پتہ ہے تو بہت دُکھی ہے۔ اس طرح نہ رو۔" اُس نے جمیلہ کی دل جوئی کے ساتھ ساتھ اپنی صفائی پیش کرنے کی بھی کوشش کی۔ "میرے بارے میں تو نے جو کچھ سنا ہے، اُس میں کتنا سچ ہے۔ کتنا جھوٹ

میں نوں اب کچھ نہیں کہنا۔" اُس نے آواز میں مزید افسردگی پیدا کی اور آخری حربے کے طور پر جمیلہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔" اب تو میرے لیے ایک ہی رستہ رہ گیا ہے۔ تو کہہ تو میں یہاں سے چلا جاؤں۔"

" نہیں چوہدری! تجھے یہاں سے جانے کی ضرورت نہیں۔" جمیلہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

" میں اپنے دونوں بچوں کو لے کر خود یہاں سے چلی جاؤں گی۔ اب یہ حویلی میری نہیں رہی، یہ پنڈ میرا نہیں رہا۔" اُس نے گہری سانس بھری۔" میں نے بہت پہلے یہ بات سوچ لی تھی۔ تجھے چنتا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

" یہ نہیں ہو سکتا۔" رحیم داد منت سماجت پر اتر آیا۔ عاجزی سے بولا۔" مجھے معاف کر دے زمیں دارنی! تُو جو کہے گی ویسا ہی ہوگا۔ سچ کہتا ہوں، ویسا ہی ہوگا۔ تُو مجھے آزما لے۔"

" دیکھ چوہدری! میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔ یہ ہم دونوں کے لیے اچھا ہے۔" جمیلہ نے رحیم داد کو سمجھانے کی کوشش کی۔" میں نے تو اب یہاں سے چلا ہی جانا ہے۔"

" سرحد پار اپنے گھر والوں کے پاس جائے گی؟" رحیم داد نے جھجکتے ہوئے اپنے شبے کا اظہار کیا۔

" نہیں۔" جمیلہ نے سختی سے انکار کیا۔ اُس کے چہرے پر جھلاہٹ آگئی۔" ان کے پاس جانا ہوتا تو پہلے کس نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا؟ اب تو میرے وہاں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

" تو کہیں بھی جا۔ پر یہاں سے جا کر کیا کرے گی؟" رحیم داد نے نرمی سے کہا۔" ایسا خیال دل سے نکال دے۔ یہ تو سوچ، تو یہاں سے جا کر کہاں رہے گی؟ کیا کرے گی۔ کس کے پاس رہے گی؟"

" چنتا نہ کر چوہدری!" جمیلہ نے نہایت اعتماد سے کہا۔" میں اتنی پڑھی لکھی ہوں کہ آرام سے کسی سکول میں لگ جاؤں گی۔ رہ گئی زمیں داری، تو مجھے نہ پہلے اس سے کوئی دلچسپی تھی نہ اب ہے۔ میں تو اپنے گڈو کو بھی زمیں دار نہیں بنانا چاہتی۔ میں نے اُسے ڈاکٹر بنانا ہے۔ تو نے پتہ ہے میں اُسے کیوں ڈاکٹر بنانا چاہتی ہوں۔" اس نے گہری سانس بھری۔" ایسا کر کے میں دیر مندر کی آتما کو خوش کرنا چاہتی ہوں۔"

" تو یہاں رہ کر بھی گڈو کو ڈاکٹری پڑھا سکتی ہے۔"

"چوہدری! مجھے روکنے کی کوشش نہ کر۔ میں یہاں زیادہ روز نہیں رہوں گی" جمیلہ نے دو ٹوک جواب دیا۔ "میں تو پہلے ہی یہاں سے چلی جاتی پر اب تک اس کارن نہیں گئی کہ میری آشا ہے کہ تاجاں کا ویاہ کروں۔ اُسے گلے لگا کر بدا کروں۔ میں نے اس کی ماں بھاتاں کو جو وچن دیا ہے اُسے پورا کرنا چاہتی ہوں۔" اُس کا لہجہ دل گرفتہ ہوگیا۔ "چوہدری! تو اگر مجھے سکھ پہنچانا چاہتا ہے۔ مجھے خوش دیکھنا چاہتا ہے تو اس کام میں میری مدد کر۔ میرا ارادہ ہے کہ فصل کٹنے کے بعد تاجاں کا ویاہ کر دوں۔ اس کے بعد نینا اور گڈو کے ساتھ لہور چلی جاؤں گی۔"

"تو مجھ سے ناراض ہو کر جارہی ہے، یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ ایسا نہیں ہوگا۔" رحیم داد نے جوش و خروش سے کہا۔

اسی وقت نادر خاں کمرے میں داخل ہوا۔ وہ نڈھال اور تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی رحیم داد نے جمیلہ کی جانب دیکھا "لے زیں دارنی! اب تو نادر آہی گیا۔ تیں نوں بھٹی کے بارے میں جو کچھ کہنا ہے، خود اُس سے کہہ دے۔"

"میں نے اس سے کچھ نہیں کہنا۔ سب کچھ تو تجھے بتا چکی ہوں۔ تُو اسے بتا دینا۔" وہ کھڑی ہوگئی۔ "میں نے جا کر اب روٹی ٹکائی ہے۔"

رحیم داد نے اُسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کمرے سے چلی گئی۔ نادر نے اس کے جانے کے بعد پوچھا "زیں دارنی کو مجھ سے کیا گل بات کہنی تھی؟" وہ پریشان اور گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔

"بیٹھ جا۔ آرام سے بات ہوگی۔" رحیم داد نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

نادر خاں خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر چپ رہ کر بولا۔ "پریشانی کی تو کوئی گل بات نہیں؟"

"پریشانی ہی کی گل ہے۔" رحیم داد نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "بھٹی میں سونڈی لگ گئی اور تیں نوں پتہ ہی نہ چلا؟ میں پوچھتا ہوں تو کرتا کیا ہے؟" رحیم داد کے چہرے سے جھنجلاہٹ ٹپکنے لگی۔ "گلاں تو وڈی وڈی کرتا ہے۔ یہ کروں گا جی۔ وہ کر دوں گا جی۔ اور کیا کرایا کچھ نہیں۔"

اُس نے قہر آلود نظروں سے نادر کو دیکھا" اس طرح تو نے منیجری کی تو اپنی زمیں داری کا تو بیڑا ہی گرک ہو جائے گا۔ میں نوں اچھی طرح پتہ ہے کہ خریف کی فصل کی تو اصل کمائی کپاس سے ہوتی ہے۔ اور تو نے اسی پر دھیان نہیں دیا۔"

نادر نے گردن جھکا کر نرم لہجے میں کہا:" تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ پھٹی میں سونڈی لگ گئی ہے۔ پر بہت تھوڑے سے بوٹوں میں لگی ہے۔ جیسے ہی مجھے پتہ چلا خود جا کر وہ بوٹے دیکھے۔"

" پر تو نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ جب کہ تو روز میرے پاس آتا رہا۔"

" میں نے تجھے اس لیے نہیں بتایا کہ تو خامخا پریشان ہوگا۔" نادر خاں نے اُسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔" فکر کی کوئی گل نہیں۔ میں نے سونڈی لگے بوٹوں پر کرم کش دوائی چھڑکنے کا بندوبست کر لیا ہے۔ اسی سلسلے میں سویرے سویرے نکل گیا تھا۔ آج ہی بوٹوں پر سپرے کر دیا جائے گا۔ پریشانی کی کوئی گل بات نہیں۔ سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ تو پرواہ نہ کر۔ کپاس کی پیداوار اس دفعہ پہلے سے کم نہیں زیادہ ہو گی۔"

" تیرے آنے سے پہلے زیں دارنی سے بات ہوئی تھی۔" رحیم داد کا لہجہ بدلا ہوا تھا وہ نادر خاں کی باتوں سے مطمئن ہو گیا تھا۔" وہ پھٹی میں سونڈی لگنے سے بہت پریشان نظر آتی تھی۔ تو اُسے بھی سمجھا دینا۔"

" اطمینان رکھیں جی۔" نادر خاں نے کہا۔" میں اُسے آج ہی سب کچھ بتا دوں گا۔ تو کہہ تو ابھی اس کے پاس چلا جاؤں؟"

" ابھی جانے کی ضرورت نہیں۔" رحیم داد نے اُسے منع کر دیا۔" بوٹوں پر کیڑے مار دوائی چھڑک جائے تب جمیلہ سے بات کرنا۔" اُس نے اپنی بات پر زور دے کر پوچھا۔" سپرے آج ہی ہو جائے گا ناں؟ اس میں بالکل دیر نہیں ہونی چاہیے۔"

" آج ہی سپرے ہو جائے گا۔ بالکل ہو جائے گا۔ فکر نہ کریں جی۔" نادر خاں نے اعتماد کا اظہار کیا۔

" میں فصل کی واڈھی کی تیاری میں پھنسا رہا۔ پھٹی کی طرف پوری طرح دھیان ہی نہ دے سکا ورنہ

سونڈی لگتے ہی دوائی چھڑکنے کا کب کا بندوبست ہو چکا ہوتا۔ تیں نوں پتہ نہیں چوہدری۔ میں نے تو پھُٹی کی چنائی کے لیے چوڑیوں سے بات چیت بھی کر لی ہے۔"

"پر ابھی تو اپنی فصل پوری طرح تیار نہیں ہوئی۔" رحیم داد نے کہا "تین چار ہفتے تو لگ ہی جائیں گے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے پر کئی علاقوں میں تو خریف کی واڈھی شروع بھی ہو چکی ہے۔" نادر خاں نے بتایا۔ "اپنی فصل کچھ دیر میں تیار ہوئی پر واڈھی کی تیاری تو پہلے ہی کر لینی چاہیے۔ یہ بات تو بھی اچھی طرح جانتا ہے۔"

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ اُس نے وہ فائل نادر خاں کی طرف بڑھائی جو جمیلہ نے اُسے دی تھی۔ نادر خاں نے فائل سنبھالتے ہوئے پوچھا "یہ کیا ہے؟" وہ حیرت زدہ نظر آ رہا تھا۔

"یہ میرے کلیم کے کاغذات ہیں۔ جمیلہ واپس دے گئی ہے۔" رحیم داد نے بتایا۔ "اگے جو کچھ کرنا ہے تیں نوں ہی کرنا ہو گا۔ وکیل کا نٹا بیچ سے نکل گیا۔"

"یہ تو اچھا ہی ہوا جی۔" نادر نے مسکرا کر کہا۔ "فکر نہ کریں جی۔ جلد ہی سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ آباد کاری کے محکمے میں اپنی جان پہچان کے بہت بندے ہیں۔ خوشی سے اپنا کام کر دیں گے اور تھوڑی رشوت لے کر کر دیں گے۔"

رحیم داد بولا "ویسے تو کام جلد ہی کرانے کا ہے۔ پر تو ابھی کہیں نہ جانا۔ میری طبیعت اِدھر ٹھیک نہیں رہتی۔ سوچتا ہوں کچھ دنوں کے لیے احسان شاہ کے پاس چلا جاؤں۔"

"ضرور چلا جا۔" نادر نے اُس کی حوصلہ افزائی کی۔ "میں نے غور کیا ہے، چوہدری تو کچھ عرصے سے پریشان پریشان نظر آتا ہے۔ لگتا ہے جیسے بیمار ہو۔ شاہ جی کے پاس چلا جائے گا تو وہاں طبیعت بالکل چنگی ہو جائے گی۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔ "اِدھر کی تو فکر نہ کر۔ ہر کام بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ پھُٹی پر سپرے تو آج ہی ہو جائے گا۔ آباد کاری کے محکمے میں کچھ روز بعد چلا جاؤں گا۔" اُس نے رحیم داد کا چہرہ غور سے دیکھا۔

"شاہ جی کے پاس کب تک جانے کا ارادہ ہے؟"

"آہستہ بول۔" رحیم داد نے چوکنا نظروں سے کمرے کے باہر دیکھا۔ "ارادہ تو آج ہی جانے کا تھا پر اب تو دیر ہو گئی۔ کل چلا جاؤں گا۔ تو جمیلہ سے آج ہی ملنے کی کوشش کرنا۔ وہ آج نہ ملے تو کل میرے جانے کے بعد ضرور ملنا۔ بلکہ کل ہی تیرا ملنا ٹھیک رہے گا۔ اس کو بھٹی کے بوٹوں پر سیرے اور فصل کی واڈھی کے بارے میں ہر بات اس طرح بتا دینا کہ وہ بالکل مطمئن ہو جائے۔ سمجھ گیا نا؟"

"بالکل سمجھ گیا۔" نادر نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ "تو پروا نہ کر میں زمیں داری کو اچھی طرح مطمئن کر دوں گا پر تیرے بارے میں اگر وہ پوچھے تو کیا کہوں؟"

"ویسے تو ہو سکتا ہے وہ یہ بات پوچھے ہی نہیں پر تو خود اُس کے کان میں ڈال دینا کہ میں کلیم کے چکر میں ملتان گیا ہوں۔" رحیم داد نے نادر خاں کو سمجھایا۔

نادر خاں نے اُسے باور کرایا۔ "تو جیسا کہتا ہے وہی کروں گا۔ تو بالکل بے فکر ہو کر شاہ جی کے پاس جا۔ واپسی پر تجھے ہر کام ٹھیک ٹھاک ملے گا۔" اُس نے پہلو بدلا۔ "اجازت ہو تو جی گھر جا کر روٹی کھا لوں؟"

"ضرور روٹی کھا۔" رحیم داد مسکرا کر بولا۔

نادر خاں چلا گیا۔ رحیم داد نے کھانا منگوایا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ آرام کرنے لیٹ گیا۔ شام کو تھوڑی دیر کے لیے ٹہلتا ہوا نہر کی طرف چلا گیا۔ واپسی پر وہ جمیلہ کا انتظار کرنے لگا۔

جمیلہ کچھ ہی دیر قبل پھاتاں کے ہمراہ حویلی سے باہر گئی تھی۔ رحیم داد نے اُسے جاتے دیکھا تھا۔

☆

رحیم داد چاہتا تھا کہ احسان شاہ کے پاس جانے سے قبل جمیلہ سے ایک بار اور مل لے۔ اُس کی کدورت دور کرنے کی کوشش کرے۔

جمیلہ واپس آئی تو خاموشی سے رحیم داد کے کمرے کے سامنے سے گزر گئی۔ اس نے نگاہ اُٹھا کر کمرے کے دروازے کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ رحیم داد بے چین بیٹھا انتظار کرتا رہا کہ وہ اس

کی طرف دیکھے تو بات کرنے کی کوشش کی جائے مگر جمیلہ نے یہ موقع ہی نہیں دیا۔ رحیم داد دل برداشتہ ہو کر ڈریسنگ کرسی پر بیٹھا رہا پھر بستر پر لیٹ کر سو گیا۔

سویرے جمیلہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ اسکول چلی گئی۔ اس وقت بھی رحیم داد کی جانب اس نے مطلق توجہ نہ دی۔ گردن اٹھائے بے نیازی سے اس کے کمرے کے سامنے سے گزر گئی۔

پھر دن گزر گیا۔ رحیم داد نے تانگہ منگوایا اُس میں ٹرنک اور ضرورت کا سفری ساز و سامان رکھوایا اور احسان شاہ کے گاؤں کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس دفعہ بھی وہ ہفتے بھر سے زیادہ ٹھہرنے کے ارادہ سے چلا تھا۔ سہ پہر کو وہ احسان شاہ کی حویلی پہنچ گیا۔ شیدا پھاٹک ہی پر مل گیا۔ اُس کی زبانی اطلاع ملی کہ احسان شاہ گاؤں سے گیا ہوا ہے۔ رحیم داد کو سخت کوفت ہوئی۔

رحیم داد واپسی کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ شیدا بولا" چوہدری! تو سردار مراد خاں شاہانی سے تو مل لے۔ وہ کئی روز سے ادھر ہی ٹھہرا ہے۔"

رحیم داد نے واپس کوٹلہ ہرکشن جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ شیدا کے ہمراہ حویلی کے دیوان خانے میں پہنچا۔ شاہانی کچھ ہی دیر پہلے سو کر اٹھا تھا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی اُس نے زور کا قہقہہ بلند کیا۔ بڑھ کر گرم جوشی سے اُسے گلے لگایا" سئیں چوہدری! تو بہت موکے سے آیا۔ میں اکیلا یہاں گھبرا رہا تھا۔ تیرے ساتھ اچھی شام گزرے گی۔ سویرے میں لاہور چلا جاؤں گا۔"

"تو چند روز ٹھہر نہیں سکتا؟ تو چلا جائے گا تو میرا کیا بنے گا۔ میں تو یہاں ہفتے دو ہفتے ٹھہرنے کے ارادے سے آیا تھا۔"

"چوہدری ٹھیک ٹھیک بتا تو یہاں کب تک ٹھہرنا چاہتا ہے؟"

"شاہ جی سے مل کر ہی جاؤں گا۔ آیا تو یہی سوچ کر ہوں۔ اُس سے ملنا ضروری بھی ہے۔" رحیم داد نے شاہانی کو بتایا۔

"پر شاہ جی کا تو جلد لوٹنے کا کوئی پروگرام نہیں۔ پتہ نہیں کب تک آئے۔ تو کہاں تک انتظار کرے گا۔" شاہانی نے اُسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔" اچھا تو ایسا کر پہلے نہا دھو کر کپڑے بدل۔

جانے کس رستے سے آیا ہے۔ ذرا اپنا حلیہ تو دیکھ، کپڑوں پر کتنی خاک دھول ہے۔ تھکا ہوا بھی نظر آ رہا ہے۔ میں بھی نہانے ہی جا رہا ہوں۔ تو بھی تیار ہو جا۔ فیر محفل جمے گی۔"

سردار شاہانی غسل کرنے چلا گیا۔ رحیم داد بھی اُس کمرے میں پہنچا جس میں شیدے نے اُس کے قیام کا بندوبست کیا تھا۔ رحیم داد نے کمرے میں پہنچتے ہی ٹرنک سے اُجلے کپڑے نکالے اور نہانے کے لیے غسل خانے میں گھس گیا۔ پانی گرم تھا۔ رحیم داد کو غسل کرنے میں لطف آیا۔ وہ دیر تک نہاتا رہا۔ غسل کرنے کے بعد طبیعت تر و تازہ ہو گئی۔ اُس نے لباس تبدیل کیا اور بن سنور کر ہال میں پہنچ گیا۔ مراد خاں شاہانی پہلے ہی سے موجود تھا۔ وہ رحیم داد کا انتظار کر رہا تھا۔

شام دبے قدموں حویلی کی اونچی اونچی فصیل نما دیواروں سے نیچے اتر رہی تھی۔ اندھیرا آہستہ آہستہ فضا میں گھلتا جا رہا تھا۔ شیدا نے لیمپ روشن کیا اور کونے میں رکھے ہوئے اونچے اسٹول پر رکھ دیا۔ کمرے کے باہر برآمدے میں پیٹرومکس بھی جل رہا تھا۔ اُس کی تیز روشنی باغ میں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ باغ سنسان تھا۔ درختوں پر کہرا چھایا تھا۔

شیدا نے وہسکی کی بوتل مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کے سامنے پڑی ہوئی میز پر رکھ دی۔ اس کے ساتھ طشت میں گلاس تھے اور پانی سے بھرا ہوا جگ تھا۔ وہسکی کے دو پیگ پہلے شیدا ہی نے بنائے۔ شاہانی اور رحیم داد کو پیش کیے۔ وہ چند لمحے ان کے قریب ادب سے سر جھکائے کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا دور چلا گیا۔

مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کے گلاس سے اپنا گلاس ٹکرایا۔ ہاتھ اونچا کیا اور مسکرا کر وہسکی کا ایک گھونٹ بھرا۔ رحیم داد نے بھی گھونٹ بھرا۔ ذرا دیر تک دونوں چپ بیٹھے مے نوشی کرتے رہے۔ پھر شاہانی کی آواز ابھری۔ اس نے پوچھا

"چوہدری! تیں نوں یہاں کتنے روز ٹھہرنا ہے؟"

"اب یہاں ٹھہر کر کیا کروں گا۔" رحیم داد نے شاہانی سے کہا "تو نے ہی تو بتایا تھا، شاہ جی کی واپسی کا کچھ ٹھیک سے پتہ نہیں۔ جانے کب آئے۔ میں کب تک اس کا یہاں انتظار کروں گا۔"

"تو کیا تُو بھی کل صبح یہاں سے چلا جائے گا؟"

"کل صبح نہیں۔" رحیم داد کھل کر مسکرایا۔ "دو تین روز ٹھہر کر ہی جاؤں گا۔"

"نوراں کے لیے ٹھہرنا چاہتا ہے؟" مراد خاں شاہانی نے آنکھ مار کر قہقہہ بلند کیا۔ "پر نوراں تو اب یہاں سے نہیں۔ پچھلے دنوں جہان آباد سے ملک منصور خاں ٹوانہ ادھر آیا تھا۔ نوراں اسے اتنی پسند آئی کہ وہ اُسے لے گیا۔ شاہ جی بھی منصور خاں کے ہمراہ گیا ہے۔"

"تجھے یہ اطلاع کیسے ملی؟" رحیم داد کا چہرہ اُتر گیا۔ نوراں کے جانے کی خبر سن کر اسے ملال ہوا۔

"شاہ جی اور ملک منصور ٹوانہ کل ہی دوپہر کو یہاں سے گئے ہیں۔" شاہانی نے بتایا۔ "مجھے حویلی میں ٹھہرے ہوئے پانچ روز ہو گئے۔"

"شاہ جی نے تیں نوں بتایا نہیں کہ کب تک لوٹے گا؟"

"اس کا لمبا ہی پروگرام ہے۔ جہان آباد سے وہ کچھ دنوں کے لیے ملک خضر حیات خاں ٹوانہ کے پاس کالرا اسٹیٹ جائے گا۔" شاہانی نے وہسکی کی چسکی لگائی۔ "ویسے اس کا ارادہ ٹوانوں کے علاوہ نونوں سے بھی ملنے کا ہے۔ وہ سردارپور نون، نور پور اور بھلوال شہر جانے کو کہتا تھا۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "سئیں! مجھے تو یہ اس کا سیاسی دورہ لگتا ہے۔ تیں نوں پتہ ہے شاہ جی سیاست بھی تو لڑاتا ہے اور بہت اونچی سیاست لڑاتا ہے۔"

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "تو اس کے ساتھ ہی لہور کیوں نہیں چلا گیا؟"

"چلا تو جاتا۔ ارادہ بھی یہی تھا پر زینت کے لیے ایک رات اور رک گیا۔"

"زینت کون؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"بہت زوردار رن ہے۔ ایک دم پوپٹ۔ دیکھے تو دیکھتا ہی رہ جائے گا۔" شاہانی نے ہنس کر بتایا۔ "پچھلے ہی ہفتے شاہ جی اسے اٹھوا کر کوٹ میں لایا ہے۔" اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔

"ایک بات اور بھی ہے اس میں۔" سردار شاہانی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"وہ کیا بات ہے؟" رحیم داد نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

"پہلے وہ ہندنی ہوتی تھی۔ فسادات کے دنوں میں ایک مسلمان کمہار کے ہتھے چڑھ گئی" شاہانی نے وہسکی کی چسکی لگاتے ہوئے کہا۔ "میں اس بار یہاں آیا تو شاہ جی نے زینت کا ذکر اس طرح کیا کہ میں نے زور دے کر اسی رات اسے اپنے کمرے میں بلوایا۔ مجھے اتنی پسند آئی کہ روز ہی اسے بلوالیتا ہوں۔ دو روز تو چپ چپ رہی۔ پوچھنے پر بھی نہ بولی۔ بعد میں اس نے اپنے بارے میں سب کچھ بتادیا۔"

"کیا کیا بتاتی تھی؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"کہتی تھی پہلے اس کا نام شکنتلا ہوتا تھا۔ پیو ملتان میں ڈاکٹری کرتا تھا۔" مراد خاں شاہانی ٹھہر ٹھہر کر بتاتا رہا۔ "فسادات اور بلوؤں میں اس کا سارا ہی ٹبر تتر بتر ہوگیا۔ وہ اکیلی رہ گئی تو ہندوؤں کے ساتھ سرحد پار جانے کے ارادے سے جیجہ وطنی پہنچی۔ وہیں ان کے کافلے پر رات کے اندھیرے میں حملہ ہوا۔ بلوائیوں میں ایک کمہار بھی تھا۔ وہ اسے اٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔ اسی نے اسے مسلمان بنایا۔ شکنتلا سے اس کا نام زینت بی بی رکھا۔"

"اب تک وہ کمہار ہی کے گھر میں تھی؟"

"نہیں!" شاہانی نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "وہ کمہار کے گھر میں لگ بھگ تین سال رہی۔ ایک لڑکا بھی پیدا ہوا۔ بعد میں کمہار نے اسے بیچ دیا۔ اس بار اسے رکن پور کے ایک سکول ماسٹر کی گھر والی بننا پڑا۔ زینت مجھے بتاتی تھی ماسٹر بہت نیک بندہ تھا اس کے پاس وہ بہت آرام سے تھی۔ ماسٹر سے بھی ایک بچہ ہوا۔ دوبارہ حاملہ تھی کہ مغویہ عورتوں کی بازیابی کرنے والی ایک فوجی پارٹی نے اس کا کھوج نکال لیا اور اپنے ساتھ فیروزپور لے گئی۔" شاہانی نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "فیروزپور میں اس کا ایک چاچا ہوتا تھا۔ زینت کو اس کے سپرد کردیا گیا۔ وہ زینت بی بی سے ایک بار پھر شکنتلا بن گئی۔"

"پر وہ واپس کیسے آگئی؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

شاہانی ہنس کر بولا۔ "جو ذال تین سال سے بھی اوپر مسلمانوں کے پاس رہ چکی ہو۔ دو بچے بھی جن چکی ہو اور تیسرا پیٹ میں ہو اسے ہندو کیسے کبول کر لیتے۔ کہتی تھی خود اس کا چاچا اور چاچی اس کے ساتھ اچھوتوں کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ اپنے کھانے پینے کے برتن تک اسے چھونے نہ دیتے تھے۔

زینت کے دو چچیرے بھی تھے۔ وہ اُس کے دونوں بچوں کو مار ڈالنے کی گھات میں تھے۔ زینت کو اس بات کا پتہ چل گیا۔ وہ بہت پریشان ہوئی۔ آخر ایک رات وہ گھر سے چھپتی چھپاتی نکلی۔ دونوں بچے ساتھ تھے۔ سرحد کے نزدیک ایک مسلمان سمگلر مل گیا۔ اس نے اپنے سارے زیور اور روپیہ سمگلر کو دے دیا۔ اور اس نے زینت اور اس کے بچوں کو کسی نہ کسی طرح سرحد پار پہنچا دیا۔ وہ دوبارہ رکن پور گئی۔"

"وہاں تو اُسے اپنا گھر والا سکول ماسٹر مل ہی گیا ہو گا؟"

"سئیں اس کا نصیبہ ہی خراب تھا۔ سکول ماسٹر کا رکن پور سے دیپال پور تبادلہ ہو گیا تھا۔" مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کو بتایا۔" وہ اس کی تلاش میں دیپال پور جا رہی تھی کہ رستے میں شاہ جی کا ایک مزارع سلامو اُسے مل گیا۔ اس نے زینت کو اکیلا پایا تو ڈرا دھمکا کر زبردستی اپنے گھر لے گیا۔"

"اور سلامو کے گھر سے اسے شاہ جی نے اٹھوا لیا۔" رحیم داد نے ہنس کر اپنے فوری ردّعمل کا اظہار کیا۔" لگتا ہے زینت بہت سوہنی زنانی ہو گی۔"

"سوہنی ہے۔ بھرپور جوان ہے اور پڑھی لکھی بھی ہے۔ گھر والے نے اسے ایک سکول میں پڑھانے پر بھی لگوا دیا تھا پر دوسری مسلمان استانیاں ہندنی کہہ کر اتنا تنگ کرتی تھیں کہ اس نے سکول کی نوکری چھوڑ دی۔" شاہانی نے ہلکا قہقہہ لگایا۔" میں کہتا ہوں زینت اتنی سوہنی ہے کہ سب اس سے جلتی ہوں گی۔ خار کھاتی ہوں گی۔"

"پر تجھے تو سوہنی اور جوان رن پسند نہیں۔" رحیم داد نے مراد خاں شاہانی کو مسکرا کر چھیڑا۔

"تیں نوں تو رجنے پسند ہے۔"

"چوہدری! تو اس رمز کو نہیں سمجھ سکتا اناڑی جو ٹھیرا۔" وہ کھل کھلا کر ہنسا۔" کبھی کبھی تو رجنے بھی مزا دے جاتی ہے۔ پر روز روز نہیں۔" اس نے گلاس اٹھا کر وسکی کی چسکی لگائی۔" تو نے زینت کو دیکھا نہیں۔ تین خصموں کے پاس رہ چکی ہے۔ بچے بھی جن چکی ہے پر اب تک اس کا بدن ریشم کی طرح ہے۔ نرم اور ملائم۔ چہرہ تو ایسے دمکتا ہے جیسے صبح کی اُجلی دھوپ۔"

"لگتا ہے زینت تجھے کچھ زیادہ ہی پسند آ گئی ہے۔" رحیم داد نے شوخی سے کہا۔" اتھرے جانے کا تو ارادہ نہیں؟"

"شاہ جی راضی ہو جائے تو ضرور دے جاؤں گا۔" شاہانی نے نشے میں جھوم کر کہا۔ "پردہ زینت کو ابھی اپنے کوٹ سے کہیں جانے نہ دے گا۔ زینت اسے بھی اچھی لگتی ہے۔"

اس دفعہ رحیم داد نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ شاہانی بھی چپ رہا۔ دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے اور رک رک کر وہسکی کے گھونٹ بھرتے رہے۔ آخر رحیم داد نے خاموشی ختم کی۔ "شاہانی! میں نوں ایک گلہ ہے تجھ سے۔"

"مجھ سے گلہ ہے؟" شاہانی نے حیران و پریشان ہو کر کہا۔ "کس بات کا گلہ؟"

"محمد عثمان راٹھور تیرا وکیل ہوندا ہے ناں؟"

"بالکل ہوندا ہے۔" مراد خاں شاہانی ہنوز حیرت زدہ تھا۔ "پر تجھے اس سے کیا لینا؟"

"تیں نوں پتہ ہے، وہ اللہ وسایا کا بھی وکیل ہوندا تھا۔"

"یہ تو راٹھور ہی نے مجھے بتایا تھا۔" شاہانی نے وضاحت کی۔ "میں تو کبھی اللہ وسایا سے نہیں ملا۔ شاہ جی سے کبھی کبھار اس کا ذکر ضرور سنا تھا۔ راٹھور نے اللہ وسایا کے بارے میں بات کرتے کرتے تیرا بھی تذکرہ کیا تھا۔ ویسے صاف گل بات یہ ہے چوہدری، میں راٹھور کو زیادہ عرصے سے نہیں جانتا۔ میں نے پہلی بار اپنے کیس کی پیروی کے لیے اُسے کھڑا کیا ہے۔"

"پر تو اتنی جلدی اس پر ایسا مہربان ہو گیا کہ میرے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا۔ یہ بھی بتا دیا کہ میں شاہ جی سے برابر ملتا جلتا رہتا ہوں۔ اس کے ساتھ گہری یاری ہے اور اس کی حویلی میں کئی کئی روز ٹھہرتا بھی ہوں۔"

"میں نے جھوٹ تو نہیں کہا۔" مراد خاں شاہانی نہایت سادگی سے بولا۔ "اس میں بُرا ماننے کی کون سی گالھ ہے۔"

رحیم داد جل کر بولا۔ "بیڑا غرک کر دیا اپنا۔ اُوپر سے پوچھتا ہے اس میں بُرا منانے کی کون سی گل ہے۔" نشے کی ایک تیز لہر اٹھی۔ رحیم داد غصے سے بھڑک اٹھا مگر اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔ وہ شاہانی سے خواہ مخواہ الجھنا نہ چاہتا تھا۔ صرف اتنا شکوہ کرنے پر اکتفا کیا۔ "راٹھور وکیل سے گل بات کرنے سے پہلے مجھ سے تو پوچھ لیا ہوتا۔"

" صاف صاف بتا، گالہ کی اے ؟" شاہانی نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔" تیری باتیں اب تک بالکل سمجھ نہیں آئیں۔ تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"

" صاف بات یہ ہے جی! میں یہ نہیں چاہتا کہ جمیلہ کو یہ معلوم ہو کہ میں شاہ جی سے ملتا ہوں۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔" میں اُس سے چھپ کر یہاں آتا ہوں۔"

" یہ جمیلہ تو اللہ وسایا کی رنڈ ہے نا؟"

" ہاں وہی ہے۔" رحیم داد نے بتایا۔" اور تجھے یہ بھی پتہ ہے۔ زمین داری میں وہ میرے ساتھ ساجھے دار بھی ہے۔"

شاہانی نے کسی قدر بے نیازی سے کہا۔" پر میں جمیلہ کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تو نے بھی نہیں بتایا۔" اُس نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔" مجھے کیا پتہ تو اُس سے چھپ کر یہاں آتا ہے۔ میں نے تو ایسے ہی باتوں باتوں میں وکیل سے تیرا ذکر کیا تھا۔" اُس نے قہقہہ لگایا۔" جمیلہ کو اس بات کا پتہ چل گیا تو کیا ہوگا۔ وہ تیرا کیا بگاڑ سکتی ہے؟"

" تجھے کیا پتہ، اپنا تو سارا کھیل بگڑ گیا۔ جمیلہ مجھ سے سخت ناراض ہے۔"

" اُسے گھر والی بنانے کا تو ارادہ نہیں تیرا؟" شاہانی نے مسکرا کر بے تکلفی کا اظہار کیا۔ سُنا ہے جمیلہ بہت سوہنڑی ہے۔ مجھ سے دل کی صاف صاف بات بتا؟"

" دل کی بات پوچھنا ہے تو سن لے۔ جمیلہ مجھے نہ صرف پسند بلکہ بہت پسند ہے۔ میں اس سے ویاہ کرنا چاہتا ہوں۔ شاہ جی کی بھی یہی رائے ہے۔" رحیم داد نے کھل کر بات کی۔" پر تو نے وکیل سے میرے اور شاہ جی کے میل ملاپ کے بارے میں بات کر کے سارا معاملہ گڑبڑ کر دیا۔ جب سے اُسے اس بات کا پتہ چلا ہے، وہ بہت روٹھی ہوئی ہے۔ سمجھ نہیں آتی اب کیا کروں۔" رحیم داد نے جلدی سے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔" سچ پوچھ تو میں اسی سلسلے میں شاہ جی کے پاس مشورہ کرنے آیا تھا۔ وہ یہاں ہے نہیں۔ یہ بھی پتہ نہیں کب تک لوٹے گا۔"

" معاف کرنا چوہدری، مجھے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا ورنہ میں وکیل سے کیوں ایسی گالہ کرتا۔" شاہانی نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔" ایسا کر تو میرے ساتھ لہور چل۔ وہاں سے دونوں

بھکر چلیں گے۔ تو کچھ روز میرے ساتھ بھکر میں رہ کر یہاں آجانا۔ تب تک شاہ جی بھی واپس آجائے گا۔" شاہانی نے اصرار کیا۔" اب تو میرے ساتھ تجھے ضرور چلنا ہو گا۔ بھکر میں تیرا دل بہل جائے گا۔ یہاں اکیلا پڑا پڑا کیا کرے گا۔ اپنے پنڈ جائے گا تو وہاں بھی پریشان ہی رہے گا۔" اس نے پیار سے رحیم داد کو ڈانٹا۔" دیکھ چوہدری، انکار نہ کرنا۔ جیسا کہہ رہا ہوں ویسا کر۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔" اس نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا۔" شاہ جی سے ضرور مل لے۔ وہ اچھا ہی مشورہ دے گا۔ فکر نہ کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔" رحیم داد نے شاہانی کی بات مان لی۔ اس کے ہمراہ جانے پر رضامند ہو گیا۔

دونوں نے کھانا کھایا اور اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

رحیم داد کمرے میں داخل ہوا تو میداں پہلے سے موجود تھی۔ وہ چھریرے بدن کی خوش شکل عورت تھی۔ عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ وہ اُسے احسان شاہ اور مراد خاں شاہانی کے ساتھ کوٹ کی ایک کوٹھڑی میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ وہ اُسے اچھی بھی لگی تھی۔ میداں کو دیکھ کر اس کی ساری کدورت رفع ہو گئی۔

☆

پہر دن چڑھے رحیم داد اور شاہانی کار میں بیٹھ کر لاہور روانہ ہو گئے۔ سہ پہر تک دونوں لاہور پہنچ گئے۔ رات انہوں نے لارنس روڈ پر واقع ایک کوٹھی میں بسر کی۔ دوسرے روز دوپہر کی ٹرین سے سرگودھا کے راستے بھکر روانہ ہو گئے۔

سرگودھا شہر سے گزر کر ٹرین خوشاب کی حدود میں داخل ہوئی۔ بڈالی سے آگے مٹھا ٹوانہ ریلوے اسٹیشن تھا۔ ٹرین مٹھا ٹوانہ پہنچی تو رحیم داد نے وہاں اترنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ جہان آباد جا کر احسان شاہ سے ملنا چاہتا تھا۔ اُسے بھکر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر مراد خاں شاہانی آمادہ نہیں ہوا۔ اُس نے مخالفت کرتے ہوئے کہا۔

"چوہدری! یہ بھی تو ٹھیک سے پتہ نہیں کہ شاہ جی جہان آباد میں ہے یا کالرا سیٹ میں۔"

رحیم داد نے اصرار کیا "جہان آباد سے یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ شاہ جی کہاں ہے۔ اُس کے سارے پروگرام کا پتہ چل جائے گا۔"

مراد خاں نے رحیم داد سے اتفاق نہیں کیا "تو خاماخا پریشان ہوگا۔ اوّل تو شاہ جی سے ملنا ہی مشکل ہے۔ مل بھی گیا تو ٹھیک سے بات نہیں ہوگی۔ اُس سے تو واپسی پر ملنا۔ اس کی حویلی ہی میں ٹھیک سے بات ہو سکتی ہے۔"

رحیم داد نے کوشش بھی کی مگر شاہانی کو آمادہ نہ کر سکا۔ مراد خاں شاہانی سیدھا کنڈیاں پہنچنا چاہتا تھا۔ وہاں اُسے ضروری کام تھا جو فوری طور پر نمٹانا تھا۔ چنانچہ سفر جاری رہا۔ کنڈیاں پہنچ کر دونوں اسٹیشن سے نکلے۔ انہوں نے میاں شاہ علی کی حویلی میں قیام کیا۔ شاہ علی ٹرانزیں دار اور شاہانی کا گہرا یار تھا۔ مگر کنڈیاں میں دونوں صرف ایک روز ٹھہرے۔

کنڈیاں سے وہ بھکر کی جانب ٹرین میں چلے۔ تھل سے گزرے۔ راستے میں دور دور تک بنجر اور ریتلے ٹیلے نظر آتے تھے۔ اس قدر خاک دھول اڑی کہ بھکر پہنچتے پہنچتے دونوں گرد سے اٹ گئے۔

بھکر میں شاہانی کی خاندانی حویلی تھی۔ اُس کے آس پاس بھی شاہانیوں کے مکانات اور حویلیاں تھیں۔ مگر مراد خاں دوسرے محلے میں رہتا تھا۔ اُس کی یہ حویلی دو منزلہ تھی۔ اور کسی زمانے میں دیوان لڈا مل کے خاندان کے ایک ہندو رئیس دیوان کرم چند کی ملکیت تھی۔ فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑکی تو بھکر بھی اُس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ کرم چند کے کنبے کو بھی شہر کے دوسرے ہندوؤں کے ساتھ بھکر چھوڑنا پڑا۔ مراد خاں نے اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ صرف تیرہ ہزار میں کرم چند کی عالی شان حویلی خریدلی اور اسی میں مستقل رہائش اختیار کرلی۔

مراد خاں شاہانی اور رحیم داد نے لمبا سفر کیا تھا۔ دونوں تھکن سے نڈھال تھے۔ جوڑ جوڑ دکھتا تھا۔ مراد خاں شاہانی ذرا دیر بیٹھ کر زنان خانے میں چلا گیا۔ رحیم داد کے قیام کا بندوبست مہمان خانے کے ایک کمرے میں کر دیا گیا۔ یہ مہمان خانہ ڈیرا کہلاتا تھا۔

رحیم داد کے کمرے میں پہنچتے ہی فوراً نائی آگیا۔ اس نے رحیم داد کی داڑھی اور سر کے بال

تراشے۔ نائی کے جاتے ہی حویلی کا مالشیا آگیا۔ اُس نے رحیم داد کے سر میں موتیے کے پھولوں میں بسا ہوا کڑتے کا تیل ڈالا جس کی دور دور تک شہرت ہے۔ بھکر کی خاص سوغات ہے۔ مالشیے نے ایسی چابک دستی اور مہارت سے چمپی کی کہ رحیم داد کی آنکھیں غنودگی سے بند ہونے لگیں۔ سر کی چمپی کے بعد مالشیے نے بدن کی مالش کی۔ ایک ایک جوڑ اور ایک ایک پٹھے کی اینٹھن اور تشنج، انگلیوں اور ہاتھوں کے مساس سے رفع کیا۔ رحیم داد کو بہت سکون ملا۔ ساری تھکن کافور ہو گئی۔ مالش سے فارغ ہو کر اس نے غسل کیا۔ کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ کر گہری نیند سو گیا۔

شام ہوئی اور اندھیرا پھیلا تو شاہانی کمرے میں آیا۔ رحیم داد بیدار ہو چکا تھا۔ مراد خاں شاہانی اُسے قریب کے ایک کمرے میں لے گیا۔ ذرا سی دیر میں بوتل آگئی۔ گلاس آگئے۔ پانی آگیا۔ دونوں شغل کرنے لگے۔ شاہانی بہت مسرور اور تر و تازہ نظر آرہا تھا۔ بات بات پر قہقہے لگاتا مگر رحیم داد چپ چپ تھا۔ اُس کا چہرہ مضمحل تھا اور آنکھوں کی چمک دھندلی اور دھواں دھواں تھی۔

مراد خاں نے اُسے افسردہ اور پریشان دیکھا تو سرگوشی کے عالم میں ہنس کر بولا "چوہدری! تیری حالت دیکھ کر تو صاف پتہ چلتا ہے کہ تجھے جمیلہ سے پیار ہو گیا ہے۔" اس نے قہقہہ بلند کیا۔ "یہی بات ہے ناں؟"

رحیم داد دل کی بات چھپا نہ سکا۔ گہری سانس بھر کر بولا "جب سے جمیلہ نے مجھ سے یہ کہا ہے کہ وہ پنڈ چھوڑ کر لہور چلی جائے گی، اُس دکت سے جی پریشان رہتا ہے۔" اُس کے لہجے میں کسک تھی۔ "سچ کہتا ہوں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔"

"پریشانی کی ایک بات یہ بھی تو ہے کہ جمیلہ کے ساتھ اُس کے مربعے بھی چلے جائیں گے۔" شاہانی نے رحیم داد پر چوٹ کی۔ "تجھے مربعوں کی فکر زیادہ ہو گی۔" وہ کھلکھلا کر ہنسا "نکاح پڑھا لے۔ جمیلہ کے ساتھ اس کی زمین اور جائیداد سب تیرے کبضے میں آجائے گی۔ میں نے غلط تو نہیں کہا ہے؟"

"مجھے مربعوں کے نکل جانے کی فکر تو ہے پر جمیلہ چلی جائے یہ میں کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا۔" رحیم داد بولا۔ "ویسے اس کی باتوں سے لگتا ہے کہ اپنی زمین تو شاید مجھی کو دے

جائے۔ وہ بہت حوصلے والی ہے۔ دل بھی اتنا وڈا رکھتی ہے۔" اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔" سمجھ نہیں آتی وہ چلی گئی تو میرا کیا بنے گا۔" رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری گلاس ہونٹوں سے لگایا اور آہستہ آہستہ گھونٹ بھرنے لگا۔ اُس کے چہرے پر غم کا سایہ پھیلتا جا رہا تھا۔

مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھا اور چند لمحے ٹکٹکی باندھے تکتا رہا۔ پھر اس نے نشہ کی ترنگ میں کہا۔" چوہدری! پرواہ نہ کر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پریشان نہ ہو۔ میں تجھے کل شام نکھے پیر کی زیارت پر لے چلوں گا۔ نکھے پیر کے مزار پر دور دور سے بندے آتے ہیں۔ منت مانتے ہیں اور ان کی مراد پوری ہوتی ہے۔" اُس نے قہقہہ لگایا۔" تو بالکل فکر نہ کر۔ اٹھا گلاس۔ تو نے تو ابھی کچھ پی ہی نہیں۔ اچھی طرح جم کر لگا لے طبیعت بالکل چنگی ہو جائے گی۔" اُس نے گلاس اٹھایا اور غٹا غٹ چڑھا گیا۔

دونوں رات گئے تک بادہ نوشی کرتے رہے۔

✡

دن ڈھلے مراد خاں شاہانی نے گیرج سے اپنی لمبی چوڑی پیکارڈ نکالی۔ رحیم داد کو ساتھ بٹھایا اور نکھے پیر کی درگاہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ کار مراد خاں خود چلا رہا تھا۔ وہ بہت تیز رفتار سے کار دوڑاتا رہا۔ اچھا اور ماہر ڈرائیور تھا۔ اُس نے کئی موڑ خطرناک تیزی سے کاٹے۔ رحیم داد کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا مگر شاہانی اطمینان سے اسٹرنگ سنبھالے بیٹھا رہا۔ ہنس ہنس کر رحیم داد سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔

مراد خاں نے روانگی سے قبل دودھ اور گھی میں گندھی ہوئی میدے کی پانچ بڑی بڑی میٹھی گوگیاں تیار کرائیں۔ منوتی کی یہ گوگیاں حویلی کے تنوریئے نے غسل کر کے اور اُجلے کپڑے پہن کر تنور میں لگائی تھیں۔ صاف ستھرے کپڑے میں لپیٹ کر ان کو مٹی کے کورے کونڈے میں رکھا تھا۔ گوگیاں اب کار کی پچھلی سیٹ پر احتیاط سے رکھی تھیں۔ منڈی ہیلہ کے بڑے بازار سے گزرتے ہوئے مراد خاں شاہانی نے چاندی کا ایک چراغ بھی خریدا۔

سڑک کے دونوں کناروں پر خوانچے والے بیٹھے تھے اور طرح طرح کی صدائیں بلند کر رہے تھے۔
انگور بیچنے والا جھوم جھوم کر گا رہا ہے

"موتی، سچے موتی۔ آ بھی موتیئے دیاں لڑیاں کھا، چمن دے میوے کھا"
انار کی ڈھیری سامنے رکھے خوانچے والا زور زور سے آواز لگا رہا تھا۔
"کابل تے کندھار بھی کابل تے کندھار"

اسی طرح گنڈیریاں بیچنے والا لہک لہک کر گاہکوں کو اس طرح بلاتا "مکھن پیڑے کھا۔
یار آ مکھن پیڑے کھا"

خوانچے والوں، دکانداروں اور گاہکوں کی ملی جلی آوازیں ابھرتی رہیں۔ رحیم داد سنتا رہا۔
مراد خاں شاہانی چراغ خرید کر دکان سے باہر آیا۔

کار آن کی آن میں تیزی سے دوڑتی بازار سے نکل گئی۔ بازار میں ابھرتی ہوئی آوازوں کا
شور رفتہ رفتہ دھیما پڑ گیا۔

دونوں بھکر اسٹیشن پہنچے۔ یہ نیچی چھت کا مختصر سا ریلوے اسٹیشن تھا۔ مگر اس کا احاطہ
خاصا وسیع تھا۔ احاطے کے ایک حصے میں تکھے پیر کا مزار تھا۔ مراد خاں شاہانی نے کار اسٹیشن کے
باہر ایک طرف کھڑی کی اور رحیم داد کے ہمراہ تکھے پیر کی زیارت کی جانب چلا۔

مزار پر زائرین اور منت مرادیں ماننے والوں کا ہجوم تھا۔ عورتیں بڑی تعداد میں تھیں۔
شاہانی کو دیکھتے ہی مجاوروں نے آگے بڑھ کر گرم جوشی اور تپاک سے اس کا اور رحیم داد کا
خیر مقدم کیا۔ رحیم داد نے مجاوروں کی ہدایت کے مطابق مزار پر میٹھی گوگیاں چڑھائیں۔

وہ جھکا ہوا گوگیاں چڑھا رہا تھا تو قریب کھڑی ہوئی ایک نوجوان عورت اولادِ نرینہ کے
لیے گڑگڑا کر منت مان رہی تھی "سوہناں چنڑ پیرا، خدا کنوں میکوں پتر گھن ڈے۔ میں دجدی
واجیں آ ڈساں تے تیڈی خنکا تے اٹا گھٹا ڈیساں"

میٹھی روٹی اور گوگیاں مزار پر چڑھانے کے بعد ایک مجاور کی ہدایت پر رحیم داد نے
اپنے ہاتھ سے چاندی کا چراغ روشن کیا، آگے بڑھا اور نہایت عقیدت اور احترام سے

نے پر راضی ہو جائے۔ جب تک

راد پوری ہو جائے گی تو میں تیری

چراغ روشن کردوں گا۔"

ہو گئے۔ باہر جاتے ہوئے شاہانی

حاطے سے نکلے تو شام کا دھندلکا

کی اور واپس گھر جانے کے بجائے

دونوں وہاں پہنچے تو اندھیرا گہرا ہو

ی۔ ٹیلے پر پیلو کے درختوں کے

بھنگ گھونٹی جا رہی تھی۔

دیے رہے تھے۔ نشہ کی ترنگ میں کوئی من چلا اٹھ کر ہیجڑوں کے ساتھ ناچنے لگتا تو قہقہوں کا زبردست شور بلند ہوتا۔ ڈھولک پر زور سے چوٹ لگائی جاتی ناچ اور تیز ہو جاتا۔ مراد خاں شاہانی نے کار ٹیلے سے ذرا ہٹ کر ایک طرف کھڑی کر دی۔

دونوں کار سے اتر کر باہر نکلے اور کار کے مڈگارڈ سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ مراد خاں شاہانی نے ٹیلے کی سمت ہاتھ اٹھا کر رحیم داد کو بتایا" چوہدری! اس ٹبے پر اکثر ایسی ہی میل لگتی ہے۔ ساوی پی جاتی ہے اور اس کے نشہ میں مست ہو کر عیش ہوتے ہیں۔ ہیجڑوں اور منڈوروں کے علاوہ ناچ گانے کے لیے کنجریاں بھی آتی ہیں۔ زبردست رونق رہتی ہے۔" اس کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا" یہ غریب لوگ ہیں۔ ان کی یہی تفریح ہے۔ دن بھر ڈٹ کر محنت مزدوری کرتے ہیں شام کو میل لگا کر ساوی سے شغل کرتے ہیں، تھکن اتارتے ہیں۔ اپنے دل خوش کرتے ہیں۔" وہ ہنسنے لگا۔

"لگتا ہے ادھر بھی ساوی کا زیادہ ہی رواج ہے۔" رحیم داد نے کہا۔

"بہت زیادہ" مراد خاں شاہانی بولا" تجھے بھی ساوی پلواؤں گا۔ میرے پاس ایک مظفر گڑھیا بھنگیڑا ہے۔ بہت محنت سے گھٹائی کر کے ساوی تیار کرتا ہے۔ اس کے ہاتھ کی تیار کی ہوئی ساوی پیئے گا تو لطف آ جائے گا۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا" تو نے کبھی ساوی پی ہے؟"

"ملتان میں تھا تو کبھی کبھی پی لیتا تھا۔" رحیم داد نے جواب دیا" پر ادھر ایک مدت سے کبھی نہیں پی۔ ملی ہی نہیں۔ جمیلہ کسی طرح کا نشہ پسند نہیں کرتی۔ اس لیے میں نے اپنی حویلی میں کبھی نشہ پانی نہیں کیا۔ اللہ وسایا بھی نہیں کرتا تھا۔"

"تب تو تجھے ضرور ساوی پلواؤں گا۔" شاہانی نے مسکرا کر رحیم داد کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ مارا" نکھے پیر کی زیارت پر تو نے منت مانی ہے۔ تیری منت ضرور پوری ہو گی۔ جمیلہ بھی تجھے ملے گی اور اس کے مربعے بھی۔ نکھے پیر کی زیارت پر مانی ہوئی منت خالی نہیں جاتی۔" اس نے حسب معمول قہقہہ بلند کیا" اسی خوشی میں ایک جشن ہو جائے۔

اپنی حویلی میں میل لگے۔ اس میں تجھے بلوچوں کا جھمر دکھاؤں گا۔ اس نے ٹیلے پر ناچتے ہوئے ہیجڑوں کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ناچ تو یہ بھی جھمر ہی ہے۔ پر یہ کوئی جھمر ہے۔" اُس نے ناپسندیدگی کے طور پر منہ بگاڑا۔

"میں واپسی پر میل کا بندوبست کراتا ہوں۔"

رحیم داد خاموشی سے شاہانی کی باتیں سنتا رہا۔ تکھے پیر کے مزار پر منّت ماننے کے بعد وہ سکون محسوس کر رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی کا غبار کسی قدر چھٹ چکا تھا۔ مگر مراد خاں شاہانی نے اُسے خاموش دیکھا تو سمجھا کہ منّت کے بعد بھی اس کی پریشانی رفع نہیں ہوئی۔ مراد خاں نے رحیم داد کی پیٹھ آہستہ سے تھپ تھپائی۔

"تو ابھی تک پریشان کیوں نظر آ رہا ہے؟"

رحیم داد نے کہا۔" ایسی تو کوئی گل نہیں۔"

"تو کچھ ہی کہہ، پر تو ابھی تک پریشان ضرور ہے۔" مراد خاں نے اُس کی دل جوئی کی۔ "پریشان نہ ہو۔ تجھے بلیّاں والا پیر کے مزار پر بھی لے چلوں گا۔ تو وہاں بھی منّت ماننا۔ ضرور پوری ہوگی۔ زبردست زیارت ہے۔ بلیاں والا پیر کی خنگاہ پر بھی دور دور سے منّتیں ماننے والے آتے ہیں۔" اُس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔" تیری منّت پوری ہو جائے تو بلیّوں کو دودھ پلا دینا۔ متوتی پیر کی زیارت پر تجھے بہت بلیّاں نظر آئیں گی۔ وہ منّت ہی کا دودھ پیتی ہیں۔" اس نے ایک بار پھر محبّت سے رحیم داد کی پیٹھ تھپ تھپائی۔" چوہدری! پرواہ نہ کر زیارتیں اور مزار بہت ہیں۔ اُن کے بارے میں زبردست کرامتیں اور معجزے مشہور ہیں ویسے زیارتوں کے علاوہ پیر بھی ہیں۔ یہ میاں والی کا علاقہ ہے۔ اسے بھی ایک پیر میاں علی نے بسایا تھا۔ اسی کے نام پر اس کا نام میاں والی پڑ گیا ہے۔"

"اچھا تو اس ضلع کا نام میاں والی اس لیے پڑ گیا؟" رحیم داد نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

"یہ پیروں اور پہنچے ہوئے بزرگوں کی سرزمین ہے۔" مراد خاں شاہانی نے بتایا۔" یہاں ہر موضع، ہر ڈھوک بلکہ ہر خاندان کا اپنا پیر ہوتا ہے۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "تب تو تیرا بھی پیر ہوگا۔"

"ہاں سئیں، میرا بھی ایک پیر ہے۔" شاہانی نے کہا۔ "بہت اللہ والا بزرگ ہے۔ چہرہ ایسا نورانی کہ دیکھو تو دیکھتے ہی رہ جاؤ۔ میرا پیر خریف کی واڈھی کے بعد آئے گا۔ دو سال میں ایک بار دورے پر نکلتا ہے۔ اپنے خاص خاص مریدوں کے پاس چند روز کے لیے ٹھہرتا بھی ہے۔"

رحیم داد چپ رہا۔ اُس نے شاہانی کے پیر میں دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ مراد خاں نے چند لمحے خاموش رہ کر پوچھا "کیا ارادہ ہے تیرا؟ بلیاں والا پیر کی زیارت پر چلے گا؟ وہاں بھی منت مان لینا۔"

"نہیں جی، ایک ہی منّت کافی ہے۔" رحیم داد رضامند نہیں ہوا۔ "میرا دل کہتا ہے نکھے پیر کی منّت کا ضرور اثر ہوگا۔"

شاہانی نے مزید اصرار نہیں کیا۔ دونوں کچھ دیر ٹیلے کے پاس ٹھہرے رہے۔ ڈھولک کی تھاپ پر ہیجڑے ناچتے گاتے رہے۔ کٹّو نے اور مصلّی بھنگ چڑھا کر قہقہے لگاتے رہے شور مچاتے رہے۔ اب اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ مشعل کی روشنی میں وہ سایوں کی مانند لہراتے نظر آ رہے تھے۔

شاہانی اور رحیم داد کار میں سوار ہوئے اور حویلی میں پہنچ گئے۔

☆

صبح ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کو اپنا ڈاگ ہاؤس دکھایا۔ ڈاگ ہاؤس حویلی سے متصل ہی تھا۔ ڈاگ ہاؤس کیا تھا، اچھا خاصا بڑا مکان تھا۔ طرزِ تعمیر کے اعتبار سے کسی سرکاری افسر کا بنگلہ لگتا تھا۔ اُس میں کتّوں کے رہنے اور آرام کرنے کے لیے کمرے تھے اور کوٹھریاں تھیں۔ کتوں کو نہلانے کے لیے غسل خانے تھے، چہل قدمی کے لیے برآمدے تھے۔

ڈاگ ہاؤس میں دو درجن سے زیادہ کتے تھے۔ اُن میں بیشتر نایاب اور اعلیٰ نسل کے کتے تھے۔ کتّوں کو نہلانے دھلانے، راتب دینے، چہل قدمی کرانے اور ان کی دیکھ بھال

کے لیے پندرہ ملازم تھے۔ وہ کوٹی کہلاتے تھے اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ڈاگ ہاؤس کے وسیع احاطے کے ایک حصے میں رہتے تھے۔ کتوں کے علاج معالجے کے لیے ایک سلوتری بھی مقرر تھا۔ وہ صبح شام باقاعدگی سے کتوں کا معائنہ کرتا تھا۔

شاہانی کو کتّے پالنے کا دیوانگی کی حد تک شوق تھا۔ وہ بھکّر میں ہوتا تو ہر صبح کتوں کو دیکھنے ڈاگ ہاؤس ضرور جاتا۔ انہیں بڑے لاڈ پیار سے پچکارتا۔ اُن کے منہ سہلاتا۔ پیٹھ اور گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرتا۔ کوٹیوں سے اُن کے بارے میں طرح طرح کے سوالات کرتا۔ کسی کتے کو سست پاتا تو تشویش کا اظہار کرتا۔ فوراً سلوتری کو بلواتا۔ کتے کو دکھاتا اور اُس کی بیماری اور تکلیف کے بارے میں تحقیقات کراتا۔ پوری دلچسپی کے ساتھ اس کا علاج کراتا۔ روز اس کے متعلق پوچھ گچھ کرتا۔

کتوں کو سویرے سویرے غسل دیا جاتا تھا۔ دو بکرے روزانہ ذبح ہوتے تھے۔ اُن کے گوشت سے کتّوں کے لیے راتب تیار کیا جاتا۔ راتب دیتے وقت مراد خاں شاہانی عام طور پر خود موجود ہوتا۔ کرسی ڈال کر سامنے بیٹھ جاتا اور کتوں کو گوشت کھاتے دیکھتا رہتا۔

مراد خاں شاہانی کو اپنے کتّوں پر بڑا ناز تھا۔ وہ بڑے فخر سے مہمانوں کو اپنا ڈاگ ہاؤس اور اس میں رہنے والے کتّے دکھاتا۔ ہر کتّے کے بارے میں ایک ایک تفصیل نہایت وضاحت سے بیان کرتا۔ کسی سرکاری افسر یا جاگیردار کے پاس اعلیٰ نسل کا کتّا دیکھتا تو اس کے بچے حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ یہاں تک کہ انہیں چوری چھپے اٹھوا لینے میں مطلق عار محسوس نہ کرتا اور بڑے دھڑلّے سے ہنس ہنس کر ایسے کتوں کے بارے میں بتاتا کہ انہیں اُس نے کس طرح حاصل کیا تھا۔

کتّے اس کی جاگیردارانہ شان و شوکت کی علامت تھے اور شکار کے لیے بھی کام آتے تھے۔ وہ اکثر کتوں کی دوڑ کراتا۔ کبھی کبھی ان کو ریچھوں سے بھی لڑاتا۔ اور اُن پر لمبی لمبی شرطیں لگاتا۔ کتوں کی دوڑ کرانا اور انہیں لڑانا، علاقے کے دوسرے بلوچ سرداروں اور جاگیرداروں کی طرح مراد خاں شاہانی کا بھی محبوب مشغلہ تھا۔

ڈاگ ہاؤس حویلی کے پچھواڑے تھا۔ مویشیوں کا باڑا اور گھوڑوں کا اصطبل بھی قریب

ہی تھا۔ مراد خاں کے پاس اچھی نسل کے گھوڑے بھی تھے۔ مگر اُسے کتّوں سے زیادہ دلچسپی اور انسیت تھی۔ جب سے اس نے نئی کار اور جیپ خریدی تھی گھوڑے کی سواری چھوڑ دی تھی ایک زمانہ تھا جب وہ صبح تڑکے اٹھ کر اصطبل میں جاتا کوئی گھوڑا نکالتا اور اس پر سوار ہو کر دور تک دوڑاتا چلا جاتا مگر اب اُس نے گھوڑوں پر توجہ دینا کم کر دیا تھا۔ کتّوں ہی میں اُس کی دلچسپی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔

مراد خاں نے چلتے چلتے رحیم داد کو مخاطب کیا اور فخر سے کہا "چوہدری! اپنے کو تو صرف دو چیزوں کا شوق ہے۔ کتّے اور رنّاں۔ پر کتّا اونچی نسل کا ہو۔ رن تو جیسی بھی مل جائے کام چل جاتا ہے۔" اُس نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا "مطلب یہ ہے کہ رن ہونی چاہیے اور نئی سے نئی ہونی چاہیے۔"

رحیم داد صرف مسکرا کر رہ گیا۔ اس نے نہ کوئی تبصرہ کیا نہ کسی خاص ردِ عمل کا اظہار کیا۔

دونوں ڈاگ ہاؤس میں داخل ہوئے تو سورج چڑھ کر آسمان کے اوپر پہنچ چکا تھا۔ رحیم داد نے اندر جا کر دیکھا۔ سامنے وسیع احاطہ تھا۔ احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ سلسلے وار کچے مکانات تھے۔ مکانوں کے سامنے جال اور ڈھگل کے درخت تھے۔ درختوں کے نیچے کہیں کہیں چارپائیاں پڑی تھیں۔ چارپائیوں کے پائے اونچے اونچے تھے۔ کئی چارپائیوں کے ساتھ چادروں کے بنے ہوئے پنگوڑے لٹک رہے تھے۔ ان میں شیر خوار بچے لیٹے تھے۔ قریب ہی عورتیں بیٹھی چاٹی میں دودھ بلو رہی تھیں۔ ٹوکریاں بن رہی تھیں یا کسی اور کام کاج میں مصروف تھیں۔ وہ اپنا کام بھی کرتی رہتیں اور رک رک کر پنگوڑا بھی ہلاتی جاتیں۔ دھیمے سروں میں کوئی لوری بھی گنگناتیں۔

کوٹھیوں اور مکینوں کے کچے اور بوسیدہ مکانات سے ہٹ کر احاطے کے مشرقی گوشے میں پختہ عمارت تھی۔ اُس پر کھپریل کی چھت تھی۔ سامنے کے رُخ پر طویل برآمدہ تھا۔ برآمدہ خوب کشادہ تھا۔ درمیان سے ایک تنگ راستہ گزرتا تھا جس کے دوسرے سرے پر دروازہ تھا۔ وہ ایک بڑے کمرے میں کھلتا تھا۔ راستے کے دونوں طرف لوہے کی سلاخوں کا مضبوط

جنگلا تھا۔ جنگلے کے اندر کتے بند تھے اور اس وقت راتب کھا رہے تھے۔

ڈاگ ہاؤس میں ہر طرف کچے گوشت کی بساند پھیلی ہوئی تھی۔ جنگلے کے قریب ہی ایک گھنے درخت کے نیچے چند کوتی زمین پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے میں جوار اور باجرے کی روٹیاں تھیں۔ ایسی روٹیوں کو ڈوڈھا کہا جاتا ہے۔ کوتی شلجم کے پتوں کے ساگ اور لہسن کے ساتھ ڈوڈھے کھانے میں مشغول تھے۔ مٹی کے ایک پیالے میں مکھن اور دوسرے میں جنڈ کی پھلیوں کا اچار بھی کھانے کے لیے موجود تھا۔

مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کو دیکھتے ہی وہ کھانا چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ہر طرف ہلچل مچ گئی۔ عورتیں بھی کام کاج چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ہر گوشے اور ہر سمت سے صدائیں بلند ہونے لگیں۔

"سئیں، صدا جیویں، سکھی صحت ہووے۔"

دو کوتی بھاگم بھاگ کرسیاں اٹھا کر لائے اور لوہے کے جنگلے کے عین سامنے درخت کے سائے میں رکھ دیں۔ مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کوتی کرسیوں کے پیچھے نظریں جھکا کر ادب سے کھڑے ہو گئے۔

شاہانی نے کچھ دیر بعد پلٹ کر ان کی جانب سرسری سی نظر ڈالی، ہاتھ سے اشارہ کیا، اونچی آواز سے کہا۔ "جاؤ روٹی کھاؤ۔" اس کے لہجے میں رعونت تھی۔

وہ چپ چاپ چلے گئے اور فرش پر بیٹھ کر ساگ ڈوڈھا کھانے میں جٹ گئے۔

مراد خاں کتوں کو گوشت کا راتب کھاتے دیکھتا رہا اور ہر کتے کی جانب انگلی اٹھا کر رحیم داد کو بتاتا رہا۔ "یہ کالے کالے دھبوں والا فاکس ہاؤنڈ ہے۔ یہ کوکر سپینیل ہے۔ یہ السیشن ہے، وہ گرے ہاؤنڈ ہے، اس کے ساتھ والا مٹیف ہے، یہ بل ٹیریر ہے، یہ پوڈل ہے، وہ کونے والا برنارڈ ہے۔ یہ باکسر ہے، یہ لبراڈ ریٹریور ہے، یہ نیو فاونڈ لینڈ ہے۔ وہ دیوار کے ساتھ ابرڈین ٹیریر ہے۔ یہ کولی ہے۔" وہ جس کتے کی جانب انگلی اٹھاتا اس کی نسل اور خصوصیات کے بارے میں بھی نہایت ذوق و شوق سے بتاتا جاتا۔

رحیم داد کو کتوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی مگر مراد خاں شاہانی کی خوش نودی کی خاطر ہر بات توجہ سے سنتا رہا۔ ویسے وہ شاہانی کا ڈاگ ہاؤس دیکھ کر خاصہ مرعوب ہوا تھا۔ وہ حیرت سے نظریں اٹھا کر ایک ایک طرف دیکھتا اور شاہانی کی باتیں سنتا رہا۔

اسی حیرت اور استعجاب کے عالم میں اُس نے شاہانی سے پوچھا۔ ”شاہانی! اتنا شان دار ڈاگ ہاؤس رکھنے پر تو بہت خرچ آتا ہوگا؟“

”ہا سئیں! کوئی دس بارھاں ہزار روپے مہینہ تو خرچ ہونا ہی ہوگا۔“ سردار شاہانی نے بے نیازی سے کہا۔

رحیم داد کی حیرت میں اور اضافہ ہوگیا۔ ”یہ تو بہت ہوا جی۔“

”کہاں بہت ہوا۔“ شاہانی بے تکلفی سے قہقہہ لگا کر بولا۔ ”چوہدری! یہ تو اپنے اپنے شوک کی بات ہے۔ میں نے تو کتوں کے ایسے شوکین اور ان سے گہری دلچسپی رکھنے والے دیکھے ہیں جو ایک کتے کے صرف دوا دارو پر پانچ ہزار خرچ کر دیتے ہیں۔“

”نہیں جی! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں کہا۔

”میں نے تجھ سے غلط نہیں کہا۔“ شاہانی نے اپنی بات پر زور دیا۔ ”میرا ایک یار دشت خاں بگٹی ہے۔ وڈا بلوچ سردار ہے۔ زیادہ تر کوئٹہ میں ملتا ہے۔ اُسے بھی کتے رکھنے کا زبردست شوک ہے۔ بہت اعلیٰ نسل کے کتے اُس کے پاس ہیں۔ میں کبھی کبھی گرمیوں میں اُس کے پاس چلا جاتا ہوں۔ سچ پوچھ تو اُس کے کتے ہی دیکھنے جاتا ہوں۔“

”اُس کے پاس بھی ڈاگ ہاؤس ہوگا؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”بالکل ہے اور بہت شاندار ہے۔“ شاہانی نے کہا۔ ”میں تجھے اس کے ایک کتے کی دوا دارو کے بارے میں بتا رہا تھا جس پر پانچ ہزار روپے خرچ آیا تھا۔“

”پنج ہزار تو بہت ہوا، اور وہ بھی ایک کتے کے علاج پر۔“

”بالکل اتنا ہی روپیہ خرچ ہوا تھا۔“ مراد خاں شاہانی نے زور دے کر کہا۔ ”میں ان دنوں کوئٹہ ہی میں تھا جب سردار دشت خاں بگٹی کا ایک سپینیل بیمار پڑا تھا۔ تین ہفتے کے

لگ بھگ اس کی دوا دارو ہوتی رہی۔ پہلے اسے گھوڑا ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ وہاں اس کی بیماری کم نہیں ہوئی تو برودری روڈ کے ریسرچ سینٹر میں علاج کے لیے بھیجا گیا۔ سینٹر میں چار وٹنری ڈاکٹروں نے تین مرتبہ آپریشن کیا۔ تین انجکشن روزانہ صبح، دوپہر اور شام کو پابندی سے لگائے جاتے تھے۔ ایک انجکشن ۳۰ روپے میں آتا تھا۔"

"تیس روپے کا انجکشن!" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں سیکس! اتنے ہی میں آتا تھا۔ میں تو وہاں موجود تھا۔ کئی بار تو انجکشن میرے سامنے منگوائے گئے۔" مراد خاں شاہانی تفصیل سے بتا رہا۔ "ان انجکشنوں کے علاوہ آپریشن کے دوران کتے کو گلوکوز چڑھایا گیا اور طاقت کے انجکشن بھی ساتھ ساتھ لگائے جاتے۔ اسے روزانہ ریسرچ سینٹر کار میں بھیجا جاتا۔ سینٹر شہر سے چھ میل دور ہے۔ جب تک کتا بیمار رہا۔ دو نرسیں دن رات اس کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔" سردار شاہانی نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "ململ کا پورا ایک تھان تو کتے کی زخموں کی مرہم پٹی پر لگا۔"

"تب تو ۵ ہزار سے اوپر ہی خرچ آیا ہوگا۔" رحیم داد نے شاہانی کی باتوں سے متاثر ہو کر کہا۔ "پر اتنے مہنگے علاج کے بعد کتا بالکل چنگا ہو گیا ہوگا۔"

"نہیں! وہ تمام دوا دارو کے بعد بھی نہ بچ سکا۔" سردار شاہانی نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بیماری ایسی خطرناک تھی کہ اس کی جان ہی لے کر ٹلی۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "چوہدری! بہت شاندار کتا تھا۔ ایسے شاندار اور خالص نسل کے کتے کم دیکھنے میں آتے ہیں۔" اس نے قدرے تامل کے بعد بتایا۔ "سردار دشت خاں بگتی اس کے غم میں پاگل ہو گیا تھا۔ سارے کوتیوں کی مار مار کر چمڑی ادھیڑ ڈالی۔ دو کو تو جیل میں ڈال دیا۔ دوسرے وڈے بلوچ سرداروں کی طرح اس کی بھی اپنی جیل ہے۔"

رحیم داد نے مزید تبصرے سے گریز کیا۔ سردار شاہانی بھی خاموش رہا۔

سامنے جنگلے کے اندر کتے تازہ تازہ گوشت کھا رہے تھے اور ان کے نزدیک ہی زمین پر بیٹھے ہوئے کوتی شلجم کے پتوں کے ساتھ جوار باجرے کا ڈوڈھا کھا رہے تھے۔ خشک

ڈوڈھا حلق میں پھنستا تو وہ جلدی جلدی لسّی پیتے یا مٹی کے پیالے میں انگلی ڈال کر ذرا سا مکھن نکالتے اور منہ میں رکھنے سے پہلے ڈوڈھے پر لگاتے تاکہ وہ آسانی سے حلق کے نیچے اتر جائے۔

سردار مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کتوں کی جانب توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ اسی اثنا میں ایک نوجوان عورت آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دونوں کے قریب آئی۔ وہ اُجلی منجھلی باندھے ہوئے تھی۔ اس کے اوپر چھینٹ کا کرتا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں ایک نوزائیدہ بچہ دبا تھا۔ بچے کے جسم کے گرد سفید کپڑا اس طرح کس کر لپیٹا گیا تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں جکڑ کر رہ گئے تھے۔ صرف گردن کا کچھ حصّہ اور چہرہ نظر آتا تھا۔ بچے کا رنگ کھلتا ہوا تھا۔ پیشانی پر کاجل کا سیاہ ٹیکہ لگا تھا۔ وہ آنکھیں کھولے ماں کا چہرہ تک رہا تھا۔

عورت نے ایک ہاتھ سے بچے کو سنبھالا اور دوسرے سے دوپٹے کا آنچل کھینچ کر سر اس طرح ڈھکا کہ اس کے چہرے کا بیشتر حصّہ بھی چھپ گیا۔ وہ آگے بڑھی اور جھک کر بچے کو مراد خاں شاہانی کے سامنے کر دیا۔ شاہانی نے پہلے بچے کو دیکھا پھر مڑ کر عورت پر نظر ڈالی، مسکرایا اور رحیم داد کو مخاطب کیا۔

"چوہدری! یہ کچھ کمزور لگتا ہے۔"

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے تعجّب سے دریافت کیا۔ "اس کے بدن پر اتنا کپڑا کیوں لپیٹا ہوا ہے۔ یہ تو ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلا سکتا۔"

"ایسا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔" سردار شاہانی نے مسکرا کر کہا۔ "ایسا نہ کیا جائے تو یہ زور آور اور تگڑا کیسے ہوگا۔ بال بچوں کو زور آور بنانے کے لیے اپنی طرف کا یہی دستور ہے۔ ہم تو پیدا ہوتے ہی اِسے مکھن کھلاتے ہیں۔ تب ہی تو دھر تگڑے اور جڑیا جوان نظر آتے ہیں۔" اس نے نگاہیں اٹھا کر عورت کی جانب دیکھا۔ بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔ "اِسے مکھن کھلاتی ہے ناں؟"

"ہاں سئیں!" عورت نے مستعدی سے جواب دیا۔ "کھلاتی ہوں، روز کھلاتی ہوں۔"

سردار مراد خاں شاہانی نے بچے کا رخسار ہولے سے تھپ تھپایا۔ اس کا چہرہ غور

سے دیکھا اور عورت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دریافت کیا: "اس کی شکل تو تیرے خاوند جیسی لگتی ہے۔"

"خاوند سے شکل نہیں ملے گی تو کس سے ملے گی؟" رحیم داد بے تکلفی سے مسکرا کر بولا۔ "سردار شاہانی! تو بھی کمال کرتا ہے۔"

"چوہدری! تو یہ گالہ نہیں سمجھ سکتا۔ ایسی چٹی اور پوپٹ رَن میں چھوڑ سکتا ہوں۔ یہ اس کا پلو بھٹا ہے۔ کس کا ہے؟ اس بھید کو یہ اچھی طرح جانتی ہے۔" شاہانی نے گردن کو خم دے کر ترچھی نظروں سے دیکھا، مسکرایا اور نہایت ڈھٹائی سے پوچھا: "جانتی ہے ناں؟"

عورت نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا البتہ اقرار کرنے کے انداز میں ہولے ہولے گردن ہلائی۔ اس کا چہرہ شرم سے سُرخ پڑ گیا۔ رحیم داد گم صم بیٹھا دونوں کو حیرت سے دیکھتا رہا۔

شاہانی نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اونچی آواز سے کہا: "بختاور ہووے۔ بھاگیں بھریا ہووے۔"

یہ دعائیہ کلمات سردار کی زبان سے سن کر عورت کا چہرہ خوشی اور دفور جذبات سے دمک اٹھا۔ اس نے بچے کو سینے سے لگایا اور چپ چاپ چلی گئی۔

✡

کتے نہایت انہماک سے راتب کھا رہے تھے۔ کتوں کے چپڑ چپڑ گوشت کھانے اور ہڈیاں چبانے کی آوازیں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ یکایک کسی بچے کی چیخ ابھری۔ شاہانی اور رحیم داد نے پلٹ کر اس طرف دیکھا۔ ڈاگ ہاوس کے پھاٹک کے نزدیک ایک بچہ کھڑا تھا۔ اس کے منہ میں بھنے ہوئے گوشت کی بوٹی دبی تھی اور ایک عورت اس پر جھکی ہوئی منہ سے گوشت کی بوٹی نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اس کی ماں تھی۔ بچہ ضد کر رہا تھا، تلملا کر چیخ رہا تھا۔ شاہانی لمحے بھر تک دونوں کو دیکھتا رہا پھر دیکھتے دیکھتے اس کا چہرہ غصے سے خونخوار ہو گیا۔ تیوری پر بل پڑ گئے۔ رحیم داد بھی اس کے چہرے سے ٹپکتی ہوئی

جھنجھلاہٹ دیکھ کر پریشان ہوگیا۔

شاہانی نے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈپٹ کر عورت سے کہا: "اسے ادھر لا۔"

عورت نے گردن اٹھا کر سہمی ہوئی نظروں سے شاہانی کو دیکھا۔

بچہ بھی خاموش ہوگیا۔ اس کے چہرے پر خوف کا سایہ پھیل گیا۔ جنگلے کے قریب کھانا کھانے والے کوتیوں کے ہاتھ رک گئے۔ احاطے کی دوسری عورتوں کے چہرے بھی خوف اور دہشت سے زرد پڑ گئے۔ ڈاگ ہاؤس پر گہری خاموشی چھا گئی۔

سردار مراد خاں شاہانی کی آواز دوبارہ ابھری۔ اس نے چیخ کر عورت سے کہا: "تو نے سُنا نہیں۔ اسے لے کر میرے پاس آ۔"

عورت نے بچے کا بازو پکڑا اور ڈری سہمی ہوئی مراد خاں شاہانی کی جانب بڑھی۔ قریب پہنچ کر اُس نے گڑگڑا کر کہا: "سئیں سردارا! یہ باہر سے گوشت لایا ہے، یہاں تو پکتا ہی نہیں۔ اجازت ہی نہیں۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے: "اس سے بھول ہوگئی، معافی دے دے۔ تیرا لال جیوے۔ رب راضی ہووے۔"

"بکواس نہ کر۔" مراد خاں شاہانی زور سے دھاڑا: "خانہ خراب۔ تو نے پتہ ہے یہاں گوشت نہیں پک سکتا اور نہ اندر آسکتا ہے۔"

"پتہ ہے سئیں، بالکل پتہ ہے۔" عورت نے جلدی جلدی گردن ہلا کر اُس کی تائید کی۔

سردار شاہانی نے اُسے نظر انداز کر کے جنگلے کے نزدیک بیٹھے ہوئے کوتیوں کی جانب دیکھا اور بلند آواز سے کہا: "رمضے! ادھر آ۔" فوراً ایک کوتی اٹھ کر کھڑا ہوگیا، تیزی سے مراد خاں کی جانب لپکا، نزدیک آیا اور خاموش کھڑا ہوگیا۔ وہ اونچے قد کا قوی ہیکل جوان تھا۔ عورت اُس کے عقب میں خوف اور دہشت سے آنکھیں پھاڑے خاموش کھڑی تھی۔ بچہ اُس کے پہلو سے لگا حیران اور ششدر کھڑا تھا۔ اُس کی عمر پانچ سال سے زیادہ نہیں تھی۔

سردار شاہانی نے رمضے سے پوچھا: "تو نے پتہ ہے، ڈاگ ہاؤس میں گوشت پکانے یا لانے کی سزا کیا ہے؟"

"خیر ہو سئیں سردار! میں نے سب بتا دیا ہے۔" رمضے نے سینہ تان کر نہایت مستعدی سے جواب دیا۔

"تو جیسا ہمیشہ اس معاملے میں ہوتا ہے۔ ویسا ہی کر۔" اُس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "دروازہ کھول۔" اُس نے لوہے کے جنگلے کی جانب اشارہ کیا۔ جس میں کتے بند تھے۔ اُس نے مڑ کر بچے کو دیکھا۔ "اسے بگھیلے کے سامنے ڈال دے۔"

"سردار سئیں! ایسا نہ کر۔" عورت نے تڑپ کر کہا۔ "اسے معافی دے دے۔"

"چپ کر۔" شاہانی نے اُسے زور سے ڈانٹا۔

مگر وہ چپ نہ رہی۔ "سزا ہی دینی ہے تو مجھے کتوں کے سامنے ڈال دے۔" یہ کہتی ہوئی وہ مراد خاں کے قدموں پر جھکی۔ مراد خاں شاہانی نے اُس کے پیٹ پر زور سے لات ماری۔ "ہٹ جا سامنے سے۔"

عورت لات کھا کر گری اور زمین پر دور تک گیند کی مانند ڈھلکتی چلی گئی۔ مراد خاں نے رمضے کو حکم دیا۔ "منہ کیا تک رہا ہے۔ دروازہ کھول۔" اُس نے بچے کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ "اسے اندر ڈال دے۔"

رمضے نے آگے بڑھ کر جنگلے کے دروازے کا قفل کھولا، واپس آیا اور بچے کا ہاتھ پکڑ کر جنگلے کی سمت بڑھا۔ بچے نے تلملا کر اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ رمضے نے جھٹکا دے کر اسے زور سے کھینچا۔ بچہ سہم کر دم بخود رہ گیا۔ رمضا اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا دروازے کے قریب پہنچا، دروازہ کھولا اور دھکا دے کر بچے کو جنگلے کے اندر پھینک دیا۔ بچے کے اندر پہنچتے ہی کئی کتے غرا کر زور زور سے بھونکنے لگے۔

بچے کی ماں اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ پکڑے ہوئے تھی۔ اس کے بال بکھر کر منہ پر آ گئے تھے۔ ان پر خاک جمی تھی۔ چہرہ خوف اور دہشت سے ڈراؤنا نظر آ رہا تھا۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ بے قرار ہو کر بار بار پہلو بدل رہی تھی اور مراد خاں شاہانی کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔

شاہانی نے اس کی جانب مطلق توجہ نہیں دی۔ اُس نے جنگلے کے اندر گوشت کھاتے ہوئے ایک خوں خوار بل ٹیریر کو للکارا۔ "بگھیلے"۔ کتّے نے گردن اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ سردار شاہانی نے بچے کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بل ٹیریر کو شنشکارا۔ کتّے نے غرّا کر بچے کو خوف ناک نظروں سے دیکھا۔ بچے نے اُسے غرّاتے دیکھا تو سہم کر پیچھے ہٹنے لگا۔

اُس کی ماں اٹھ کر تیزی سے آگے بڑھی اور رحیم داد کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ اُدھر جنگلے کے اندر بل ٹیریر زور سے بھونکا اور غرّاتا ہوا بچے پر جھپٹا۔ اُس نے دانت نکال کر بچے کی گردن دبوچ لی۔ بچہ بلبلا کر زور سے چیخا۔ اُس کی دل سوز چیخ سن کر ماں رحیم داد کے پیروں سے چمٹ کر پھڑکنے لگی اور رو رو کر فریادی ہوئی۔

"سئیں! میرے نکّے کو بچالے۔"

وہ تڑپ کر چیخی۔ "سئیں! میری زاری سن لے، اسے بچالے۔ رب راضی ہووے۔ تیرا لال جیوے، میرے نکّے کو چھڑا لے۔"

اُس کی آہ و زاری پر رحیم داد تڑپ اٹھا۔ بے قرار ہو کر اُس نے مراد خاں کو مخاطب کیا۔

"شاہانی! اِسے معافی دے دے۔"

"چوہدری! چپ کر کے بیٹھا رہ۔" مراد خاں نے اُسے غصّے سے جھڑک دیا۔ "تو اس معاملے میں نہ بول۔"

بچے کی ماں رحیم داد کے پیروں سے چمٹی گڑگڑاتی رہی۔ بچہ بار بار تلملا کر چیختا۔ بل ٹیریر نے اُسے فرش پر گرا دیا تھا اور دانت نکال کر اُس کا بدن بھنبھوڑ رہا تھا۔ بچہ تکلیف سے بے چین ہو کر چیخا۔ "اماں!"

اُس کی آواز کے ساتھ ہی ماں نے رحیم داد کے پیروں پر زور سے سر مارا اور مچھلی کی طرح تڑپنے لگی۔ وہ بار بار دہائی دیتی۔

"میں صدقے تھیواں سئیں! میں نوں معافی دلا دے، سردار تیری سن لے گا۔"

وہ بلبلا کر چیخی۔ "بچالے میرے نکّے کو۔ سئیں بچالے اسے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر

رونے لگی۔

عورت کی بے قراری دیکھ کر رحیم داد کا دل پسیج گیا۔ ماں کی ممتا اُس کے قدموں پر تڑپ رہی تھی، گریہ وزاری کر رہی تھی۔ اُس نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر سردار مراد خاں شاہانی کی جانب دیکھا، اُس کی طرف جھکا، ایک ہاتھ آگے بڑھایا، ٹھوڑی چھو کر عاجزی سے بولا۔

"سردار شاہانی! اسے معافی دے دے۔ میری خاطر معاف کر دے۔"

مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کی جانب مڑ کر دیکھا۔ اس کا چہرہ خونخوار نظر آرہا تھا۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ وہ چند لمحے رحیم داد کی جانب گھورتا رہا پھر اس نے مڑ کر اپنے بل ٹیریر پر نظر ڈالی۔

"بگھیلے! چھوڑ دے اسے۔"

کتے نے دھیان نہیں دیا، بدستور بچے کو بھنبھوڑتا رہا۔ سردار شاہانی نے اسے زور سے ڈانٹا۔ "ہٹ جا بگھیلے!" کتا اس قدر سدھا ہوا تھا کہ ڈانٹ سنتے ہی اُس نے بچے کو چھوڑ دیا، گردن اٹھا کر شاہانی کو دیکھا، اپنی جگہ واپس گیا اور گردن جھکا کر راتب کھانے لگا۔

شاہانی نے رمضے کو حکم دیا۔ "رمضے! اسے باہر نکال لے،" اُس نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ "چوہدری میرا مہمان ہے اور مہمان کی بات ماننی ہی پڑتی ہے۔"

رمضا جنگلے کے اندر گیا اور بچے کو اٹھا کر باہر لے آیا۔ اُس کے جسم پر جگہ جگہ بل ٹیریر کے دانتوں اور پنجوں کے کھرونچے تھے، خراشیں تھیں۔ اُن سے خون رس رہا تھا۔ بچہ خوف اور دہشت سے نیم جاں ہو رہا تھا۔ بچے کے باہر آتے ہی ماں دیوانہ وار دوڑی، بچے کو اٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔

رحیم داد نے اُس سے کہا۔ "اسے فوراً ڈاکٹر کے پاس لے جا یا اسپتال چلی جا۔"

عورت نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ اس کے دل میں رحیم داد کے لیے جو جذبۂ عقیدت تھا وہ پلکوں پر آنسوؤں کے قطرے بن کر جھلملا رہا تھا۔ وہ بچے کو اپنے بازوؤں میں دبوچے ہوئے چپ چاپ آنسو بہاتی کچّے اور بوسیدہ مکانات کی طرف چلی گئی۔ شاہانی گم صم بیٹھا تھا۔

اُس کے چہرے پر ہنوز خشونت طاری تھی۔

سردار مراد خاں شاہانی خاموش بیٹھا کتوں کو راتب کھاتے دیکھتا رہا مگر زیادہ دیر نہیں ٹھہرا، اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ رحیم داد بھی اس کے ساتھ اُٹھ گیا۔

رحیم داد اور سردار شاہانی ڈاگ ہاؤس سے باہر نکلے۔ خاموشی سے آگے بڑھے۔ حویلی کے صدر دروازے پر پہنچے۔ دروازہ خوب کشادہ ہونے کے ساتھ اس قدر اونچا تھا کہ اونٹ کجاوے کے ساتھ اُس کے نیچے سے بہ آسانی گزر سکتا تھا۔ حویلی کے دروازے پر بیٹھے ہوئے ملازم ہڑبڑا کر کھڑے ہوگئے۔

شاہانی نے ان پر توجہ نہیں دی، اندر چلا گیا۔ رحیم داد اس کے ہمراہ تھا۔ دروازے کے سامنے کھلی جگہ تھی۔ یہ حویلی کا چوک تھا۔ چوک کے وسط میں طویل پختہ چبوترا تھا۔ گرمیوں میں اسے شہ نشین کے طور پر استعمال کیا جاتا۔ دن ڈھلتے ہی اس پر چھڑکاؤ کر دیا جاتا۔ کرسیاں ڈال دی جاتیں۔ بیچ میں سردار شاہانی کی کرسی ہوتی۔ وہ اس پر بیٹھ کر ملنے جلنے والوں اور سرکاری افسروں سے ملاقات کرتا تھا۔ کبھی کبھی کچہری بھی لگاتا۔ اس میں جاگیر کے معاملات طے کیے جاتے۔ یہیں جاگیر سے آنے والوں کی پیشی ہوتی۔ وہ اس کے روبرو فرش پر بیٹھتے۔ شاہانی ان کے بارے میں شکایات سنتا اور فیصلے صادر کرتا۔

چبوترے کے آخری کنارے سے کچھ ہی فاصلے پر پاکھر کا گھنا درخت تھا۔ اُس کے نیچے باورچی خانہ تھا۔ قریب ہی پانی کھینچنے کا ہینڈ پمپ تھا۔ چبوترے کے دونوں طرف برآمدے جیسی طویل راہ داری تھی، راہ داری کے پیچھے کمرے تھے۔ ان کے دروازے برآمدے میں کھلتے تھے۔ البتہ کمروں کی کھڑکیاں پچھواڑے گلی میں کھلتی تھیں۔ گلی حویلی ہی کا ایک حصہ تھی۔ اس کی دیواریں قدِ آدم اونچی تھیں۔

چوک حویلی کا مردانہ حصہ تھا۔ اُسی میں ڈیرہ تھا۔ باہر سے آنے والے مہمان ڈیرے کی دو منزلہ عمارت میں نیچے یا اوپر کی منزل کے کمروں میں ٹھہرتے تھے مگر حویلی کا دیوان خانہ نیچے ہی تھا۔ اُسے بیٹھک کہا جاتا تھا۔ یہ ایک کشادہ ہال تھا۔ اس میں قیمتی قالین کا فرش تھا۔

بڑے بڑے دبیز صوفے تھے۔ کرسیاں تھیں اور میزیں تھیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے پڑے تھے۔ ہال کے بیچوں بیچ چھت سے بلوّریں جھاڑ لٹک رہا تھا۔ دیواروں پر شاہانی کے بزرگوں اور معروف بلوچ سرداروں کی بڑی بڑی تصویروں کے علاوہ پرانی وضع کی بندوقیں قرابینیں، ڈھالیں اور تلواریں سلیقے سے آویزاں تھیں۔ کمرے کی آرائش سے مراد خاں شاہانی کی جاگیردارانہ سطوت اور شان و شوکت جھلکتی تھی۔

مراد خاں بیٹھک میں داخل ہوا اور ایک صوفے پر تھکا ہوا سا چپ چاپ بیٹھ گیا۔ رحیم داد بھی قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ مراد خاں کے چہرے پر خلاف معمول سنجیدگی کی گہری چھاپ تھی۔ رحیم داد نے اسے اس طرح خاموش اور سنجیدہ پایا تو اُسے شاہانی کی خفگی کا شدت سے احساس ہوا۔

رحیم داد نے سردار مراد خاں شاہانی کو منانے کی کوشش کی۔ "تو ابھی تک مجھ سے ناراض ملوم ہوتا ہے۔" اُس کے لہجے میں نرمی اور معذرت کرنے کا انداز تھا۔

"سئیں یہ گل نہیں۔" شاہانی نے کہا۔ "تو ان کمیّوں اور ہڈحراموں کو نہیں جانتا۔ ان کے ساتھ ذرا بھی نرمی یا رحم دلی دکھائی جائے تو یہ میرے کتّوں کو بھوکا مار دیں۔ ان کا سارا راتب چرا کر کھا جائیں بلکہ میری جگیر تک کھا جائیں۔" اس کا لہجہ رفتہ رفتہ تلخ ہوتا جا رہا تھا۔ چہرے پر جھنجلاہٹ ابھر رہی تھی۔ "یہ سارے ہی بے ایمان اور حرام کے تخم ہیں۔ ان کو تو بے رحم اور سخت بن کر ہی کابو میں رکھا جا سکتا ہے۔ ہمارے وڈّے اور جدی پشتی ان کے ساتھ ایسا سخت سلوک نہ کرتے تو یہ زمیں داری اور جگیر کب کی ختم ہو چکی ہوتی۔ اس علاکے میں زمیں داری چلانا مخول نہیں ہے۔ دل کی جگہ پتھر رکھنا پڑتا ہے۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" رحیم داد نے خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "پر یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ تیرا کتا چھوکرے کو چیر پھاڑ کر ختم کر دیتا۔ لگتا تو ایسا ہی تھا۔ تب کیا ہوتا؟"

"کچھ بھی نہ ہوتا۔" شاہانی نے نہایت بے نیازی سے کہا۔ "پہلے بھی کئی بار ایسا

ہو چکا ہے۔ تجھے پتہ نہیں پہلے یہ کتوں کے راتب کا گوشت نہ صرف چرا کر کھا جاتے تھے بلکہ بازار میں بیچ بھی دیتے تھے۔ میں نے منع کیا، ڈانٹا، پٹائی بھی کی پر چوری کی عادت ختم نہیں ہوئی تب میں نے ڈاگ ہاؤس میں رہنے والے کوتیوں اور دوسرے ملازموں کے لیے گوشت کھانے پر سخت پابندی لگادی۔"

"پر تو نے ایسا تو نہیں کیا کہ سزا ہی سزا میں کتے چیر پھاڑ کر کھا جائیں۔"

"میں نے کہا نا، کئی بار ایسا بھی ہوا۔" شاہانی نے بتایا۔ "دو کوتیوں کو تو کتوں نے نہ صرف گرا دیا بلکہ ان کا گوشت بھی نوچ نوچ کر کھا گئے۔ ان میں سے ایک نے تو میرا بہت اعلیٰ السیشین چوری کیا اور ڈیرہ غازی خاں کے ایک کھوسہ سردار کے پاس پہنچا دیا اور خود تھل کلاں کی ایک جھنگی میں روپوش ہو گیا۔ پر میرے کرندے اور کامے تلاش کر کے اسے پکڑ ہی لائے۔ میں نے سویرے سویرے اُسے کتوں کے سامنے ڈال دیا۔ وہ رات بھر کے بھوکے بھی تھے۔ ایسے جھپٹے کہ ذرا ہی دیر بعد بدن سے گوشت غائب تھا۔ صرف ہڈیوں کا پنجر پڑا تھا۔ دوسرے نے راتب چوری کیا تھا۔ اُس کا بھی یہی انجام ہوا۔"

"تو سچ کہہ رہا ہے؟" رحیم داد نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔ "کسی نے تیرے خلاف تھانے میں پرچہ چاک نہیں کرایا؟ صاف ۳۰۲ کا مکدمہ بن سکتا تھا۔"

"سئیں چوہدری! تو کیسی گل کر رہا ہے۔" شاہانی نے ناگواری سے گھور کر رحیم داد کو دیکھا۔ "تو پناہ گیر ہے، تجھے اِدھر کا کچھ پتہ نہیں۔ کوئی میرے خلاف پرچہ چاک کرانے جاتا تو الٹا اُس کے خلاف چوری کا مکدمہ بن جاتا۔ حوالات میں بند کر کے چھتر سے ایسی پٹائی ہوتی کہ چمڑی اُدھڑ جاتی۔" اُس نے گردن اونچی کی اور نہایت رعونت سے بولا۔ "چوہدری! یہ ہماری جدی جگیر ہے۔ یہاں ہمیشہ ہماری عمل داری رہی ہے۔ انگریز کے راج میں بھی اور آج بھی اِدھر ہمارا ہی کنون چلتا ہے۔"

"اور پولس کیا کرتی ہے؟" رحیم داد بدستور حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔

"پلسیئے اور تھانے دار بھی ہمارے ہی بندے ہیں۔ ہماری مرضی کے بغیر کوئی بھی سرکاری افسر یہاں نہیں ٹھیر سکتا۔" وہ بے تکلفی سے ٹھٹھا مار کر پہلی بار ہنسا۔ "سئیں، تو ابھی اس علاکے

کو ٹھیک سے نہیں سمجھ سکتا۔ کچھ روز اپنے ساتھ رہے گا تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔"
رحیم داد خاموش رہا۔ وہ سردار مراد خاں کی باتوں سے بہت مرعوب نظر آرہا تھا۔ مراد خاں زیادہ دیر نہیں ٹھیرا، اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "چوہدری! مجھے اب جانا ہے۔ تو روٹی کھالینا۔ مجھے بالکل بھوک نہیں۔"
مراد خاں آہستہ آہستہ زنان خانے کی جانب چلا گیا۔ رحیم داد اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ وہ نڈھال اور تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔

۲۸

شام ہو گئی۔ ایک دن اور ختم ہوا۔ اندھیرا پھیلنے لگا۔ فضا دھواں دھواں ہو گئی۔ سردار مراد خاں شاہانی اور رحیم داد پھر مل بیٹھے۔ شراب کا دور چلا۔ شاہانی نے شیواز ریگل کی بوتل منگوائی تھی۔ قیمتی اور عمدہ اسکاچ وہسکی تھی۔ اُس کے ساتھ ویسا ہی اہتمام بھی کیا تھا۔ پانی کی بجائے میز پر سوڈے کی بوتلیں تھیں۔ تلے ہوئے مرغِ مسلّم تھے۔ تکّے اور کباب تھے۔

مراد خاں نے وہسکی کی چسکی لگاتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ ”چوہدری! کل شام میل ہے۔ حویلی کے چوک میں محفل جمے گی۔ ساوی کا دور چلے گا۔ ناچ گانا ہوگا۔ راگ رنگ ہوگا۔ کچھ اور مہمانوں کو بھی بلایا ہے۔ اچھا زوردار میل ہوگا۔“

”کون کون آ رہا ہے؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”یہ تو کل ہی تجھے پتہ چلے گا۔“ مراد خاں شاہانی نے ہنس کر بتایا۔ ”رات بھر جشن رہے گا۔ سب سے تیری جان پہچان ہو جائے گی۔ ویسے سارے ہی اپنے بے تکلّف یار ہونگے۔“ اُس نے مسکرا کر آنکھ ماری۔ ”لہور سے بھی میں نے ایک کنجری بلائی ہے۔ ایسی پہ پٹ اور پھڑک دار ہے کہ بدن میں جیسے بجلی بھری ہو۔ مجرا تو اس کا ایسا زوردار ہوتا ہے کہ محفل میں آگ لگا دیتی ہے۔ اپنی پرانی یاری ہے اُس سے۔“

رحیم داد نے پوچھا۔ ”تیری رکھیلی ہے؟“

”نہیں۔“ شاہانی نے صاف گوئی سے بتایا۔ ”پر جب بھی لہور جاتا ہوں، گانا سننے کے

لیے اُس کے کوٹھے کا ضرور چکر لگاتا ہوں۔" اس نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "سچ پوچھ تو کبھی کبھی صرف اس کے مجرے کی خاطر لہور جاتا ہوں۔ اُس میں بات ہی کچھ ایسی ہے۔ تجھ سے زیادہ کیا بتاؤں کل خود دیکھ لینا۔"

رحیم داد طوائف کا نام پوچھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ حویلی کے زنان خانے سے نسوانی چیخیں ابھریں۔ کوئی عورت پاگلوں کی مانند زور زور سے چیخ چلا رہی تھی، آہ و زاری کر رہی تھی۔ چیخوں کے اُبھرنے کے ساتھ ہی مراد خاں شاہانی کی آنکھوں میں ڈولتا ہوا نشہ کا تلاطم غائب ہو گیا۔ دمکتا ہوا چہرہ بجھ گیا۔ اس پر رفتہ رفتہ پریشانی چھانے لگی۔

رحیم داد نے نہ تو پراسرار چیخوں کے بارے میں پوچھا، نہ شاہانی سے پریشانی کا سبب معلوم کیا۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ شاہانی بھی گم صم تھا۔ اس کی آنکھوں سے بے چینی جھلک رہی تھی۔ وہ اس عالم میں زیادہ دیر نہیں بیٹھا۔ گلاس میز پر رکھا، گھبرایا ہوا اٹھا، کمرے سے نکلا، دہلیز پر ٹھٹھک کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ اُلجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا "چوہدری! میں تھوڑی دیر بعد آتا ہوں۔" اس نے رحیم داد کے جواب کا انتظار بھی نہ کیا۔ تیزی سے قدم اٹھاتا ایک راہ داری میں داخل ہوا اور اس سے گزر کر زنان خانے کی جانب چلا گیا۔

زنان خانہ ڈیوڑھی سے ملحق ہی تھا مگر بیچ میں کشادہ گلی تھی۔ زنان خانے کے گرد اونچی چار دیواری تھی۔ چار دیواری کے پیچھے وسیع صحن تھا۔ اس میں تین طرف کمرے تھے، دالان تھے۔ صحن چیاں اور کوٹھریاں تھیں۔ کمروں میں شاہانی کی بیوی کے علاوہ بیوہ ماں اور بہنیں رہتی تھیں۔ کوٹھریاں خادماؤں اور باندیوں کے رہنے کے لیے تھیں اور صحن کے ایک گوشے میں کمروں اور صحن چیوں سے ذرا ہٹ کر الگ تھلگ تھیں۔ یہ ساری تفصیلات حویلی کا مالشیا باتوں باتوں میں رحیم داد کو بتا چکا تھا۔ وہ حویلی کا پرانا ملازم تھا۔ اس کا بچپن حویلی ہی میں گزرا تھا۔ اب وہ پورا جوان ہو چکا تھا۔ سخت باتونی بھی تھا۔ مالش کرنے کے ساتھ ساتھ مسلسل بولتا رہتا تھا۔

رحیم داد وسکی کی چسکی لگاتا رہا اور شاہانی کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ زنان خانے سے رُک رُک کر چیخیں ابھرتی رہیں۔ کبھی دھیمی پڑ جاتیں، کبھی تیز ہو جاتیں۔ اب رات گہری ہو کر کا جل

رحیم داد نے حیرت سے کہا۔ ''تیرا مطلب ہے وہ مراد خاں کی بھین ہے۔'' وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ''کرمے! تو سچ کہہ رہا ہے؟''

''ہا سئیں! بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔'' وہ نہایت اعتماد سے بولا۔ ''وہ سردار کی سگی وڈی بھین ہے۔ اُس کا ناں حمیدہ ہے۔''

رحیم داد مخمصے میں پڑ گیا۔ اُس نے کھنکار کر گلا صاف کیا، رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ''تو نے میرے پاس اُس کے آنے سے پہلے ہی یہ بات کیوں نہیں بتائی؟''

''سئیں! اس نے منع کر دیا تھا۔ میں اس کے حکم کے خلاف کیسے بول سکتا تھا۔'' وہ صفائی پیش کرنے لگا۔ ''میں مصیبت دا ماریا غریب نوکر ہوں۔'' وہ گڑگڑانے لگا۔ ''سردار کو بالکل پتہ نہ چلے۔ وہ جی بہت ظالم ہے۔ اسے پتہ چل گیا تو مجھے جان سے مار دے گا۔ تجھے بھی نہیں چھوڑے گا۔'' اُس نے گہری سانس بھری۔ ''اسی بھین کے چکّر میں پہلے بھی دو خون کر چکا ہے۔''

''کون تھے وہ؟'' رحیم داد نے سراسیمہ ہو کر پوچھا۔

''ایک تو کوندراں والی کا وڈا زمیں دار ہوتا تھا۔ تیری ہی طرح وہ بھی سردار کا یار تھا۔ حویلی کے ڈیرے میں کچھ روز کے لیے مہمان کے طور پر ٹھیرا تھا۔ ایسا ڈاڈھا چنگا جوان تھا، تجھے کیا بتاؤں۔'' کرامت رک رک کر بتاتا رہا۔ ''دوسرا سردار کا کم دار تھا۔ یہ کریم بخش راڈھانی تو پچھلے ہی سال لگا ہے۔ اس سے پہلے جو کم دار ہوتا تھا، اُس کا ناں اکبر خاں نیازی تھا۔ میانوالی کا رہنے والا تھا۔ اچھّا روپ رنگ تھا۔ جرّیا جوان تھا۔''

رحیم داد نے کہا۔ ''پولس شولس نہیں آئی؟''

''پولس کیسے آتی سئیں!'' کرامت نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پولیسے بھی اِدھر آتے ڈرتے ہیں۔'' اس کے لہجے سے خوف اور گھبراہٹ کا عنصر ختم ہوتا جا رہا تھا۔ ''سارے وڈے افسروں سے سردار کی یاری ہے۔ اُس کے ساتھ بیٹھ کر روز ہی رات کو پیتے پلاتے ہیں۔''

رحیم داد اس کی باتیں سن کر گہری خاموشی میں ڈوب گیا۔ کرامت نے اُسے اس طرح

گم صم پایا تو کریدکے پوچھا۔ "سئیں تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

"حمیدہ کا گھر والا نہیں ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"گھر والا کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ بولا۔ "اس کا پرنا ہی کب ہوا۔" اس نے چوکنا نظروں سے ایک بار پھر دروازے کی جانب دیکھا۔ "سردار اُس کا پرنا کرنا ہی نہیں چاہتا۔"

رحیم داد کو یہ سن کر سخت تعجب ہوا کہ حمیدہ کا اب تک بیاہ نہیں ہوا اور شاہانی اس کا بیاہ کرنا بھی نہیں چاہتا۔ وہ الجھن میں پڑ گیا۔ اس نے یہ راز معلوم کرنے کی غرض سے دریافت کیا۔ "کرمے! یہ تو بتا، سردار نے اب تک حمیدہ کا پرنا یا ویاہ کیوں نہیں کیا؟"

"گالہ یہ ہے سئیں۔" کرامت نے بتایا۔ "حمیدہ کا پرنا ہو گیا تو اس کے ساتھ زمیں داری کا حصہ بھی دینا ہو گا۔ اب تو جی اس کی عمر بھی زیادہ ہو گئی۔ اس سے چھوٹی بہین رشیدہ ہے۔ اس کا بھی پرنا نہیں ہوا۔ اس کی عمر بھی پکّی ہوتی جا رہی ہے۔ وہ بھی سردار سے وڈّی ہے۔ سردار سب سے چھوٹا ہے۔ اس کا کوئی بھائی نہیں۔ صرف دو بہینیں ہیں۔ تب ہی تو وہ نہیں چاہتا کہ زمیں داری کم ہو جائے۔ وہ تو زمیں داری بڑھانا چاہتا ہے۔" اس کے ہونٹوں پر زہر خند ہویدا ہوا۔ "اِدھر کے تو سارے ہی جگیردار اور وڈّے زمیں دار ایسا ہی کرتے ہیں۔ ان کی بہینیں اور بیٹیاں بنا پرنے کے حویلیوں کے کمروں میں بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو جاتی ہیں اور جی ان کی کڑی نگرانی کی جاتی ہے۔"

"نگرانی کی جاتی ہے تو حمیدہ اس طرح رات کو کیسے میرے کمرے میں چلی آئی؟" رحیم داد نے پوچھا۔ "اسے بلا کر تو ہی تو لایا تھا نا؟"

"اس کی مرضی جو تھی۔ مجھے اس نے بخشیش میں پنج روپے بھی دیئے تھے۔" کرامت نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "وہ شام کو تجھے حویلی کے چوک میں ٹہلتے دیکھ چکی تھی۔ اسے یہ بھی پتہ تھا کہ ڈیرا خالی ہے۔ تیرے سوا نہ کوئی مہمان ہے، نہ نوکر۔" اس کا لہجہ مدھم ہو گیا۔ اس پر سنجیدگی غالب آ گئی۔ "جوانی تو جی بری ہوتی ہے۔ بس وہ چلی آئی۔" اس نے قدرے توقف کیا، پھر مسکرا کر گویا ہوا۔ "ابھی تو جی وہ جوان ہی ہے۔ سوہنڑی بھی ہے۔ ویسے سئیں، ایک گالہ

اور بھی ہے۔ اس کا مغز ٹھیک سے کام نہیں کرتا۔ کبھی کبھی تو اتنی چیختی چلاتی ہے کہ دور دور تک اس کی آواز جاتی ہے۔"

چند ہی روز پہلے حویلی کے زنان خانے سے نسوانی چیخیں رحیم داد نے بھی سنی تھیں اور سردار مراد خاں شاہانی انہیں سنتے ہی گھبرایا ہوا اٹھ کر زنان خانے میں چلا گیا تھا۔ ذہن میں اس پس منظر کے ساتھ رحیم داد نے کہا۔" ایک رات تو میں نے بھی سنیں تھیں۔ حمیدہ ہی چیختی چلاتی ہوگی پر وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟"

"اُس کے تو سئیں چیختے چیختے ہاتھ پیر بھی اکڑ جاتے ہیں۔ منہ سے سفید سفید جھاگ نکلتا ہے۔"

"مرگی تو نہیں ہے اُسے؟" رحیم داد کے چہرے پر پریشانی کا غبار بکھر گیا۔ اُسے معاً حکیم نذر محمد چشتی یاد آگیا جسے مرگی کا دورہ پڑنے کے دوران اس نے نہر باری دوآب کے پار ویران ٹیلوں کے درمیان بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔

"مرگی شرگی بالکل نہیں ہے۔" کرامت نے رحیم داد کی غلط فہمی رفع کرنے کی کوشش کی۔" اُسے تو جی جن تھیون ہے۔ آسیب بتانے ہیں۔ جب اس پر جن آتا ہے تو اس کی آنکھیں لال انگارا ہو جاتی ہیں۔ ایسی لال لال کہ دیکھ کر خوف آتا ہے۔ اس وکھت تو سئیں اس کی آواز بھی بدل کر ایک دم بھاری ہو جاتی ہے۔ کسی ذال یا رن کی آواز ہی نہیں رہتی لگتا ہے کوئی مرد بول رہا ہے۔"

"اس کا دوا دارو نہیں کرایا گیا؟"

"ماں آسیب اتارنے کے لیے کتنے ہی پیروں فکیروں اور اللہ والوں کو بلا چکی ہے۔ اس کا اپنا خاندانی پیر بھی ہے۔" کرامت دھیمے لہجے میں حمیدہ کے بارے میں بتاتا رہا۔ کسی نے تعویذ دیا کسی نے جھاڑ پھونک کی۔ ماں اُسے زیارتوں اور خنگاہوں پر بھی لے گئی۔ منّت بھی مانی۔ پر سئیں! کچھ نہیں ہوا۔ جن اب تک اس پر آتا ہے۔ تب ہی تو سردار بھی اس سے ڈرتا ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔" ڈرتا تو جی سچ پوچھو وہ اس کے آسیب سے ہے۔ اُسے

توکبھی کچھ نہیں کہتا پر اس کے یاروں کو ضرور کتل کرا دیتا ہے۔ دو تو میرے سامنے ہوئے پہلے بھی ہو چکے ہوں گے۔"

رحیم داد کی سٹی گم ہو گئی۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ آہستہ سے پلنگ سے اترا۔ کونے میں رکھے ہوئے ٹرنک کے پاس گیا، اسے کھولا، اندر سے سونے کا کنٹھا نکالا۔ کرامت کے پاس پہنچا۔ کنٹھا کرامت کے حوالے کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "لے، یہ حمیدہ کو دے دینا۔" اُس نے تیکھی نظروں سے گھور کر کرامت کو دیکھا۔ "کرمے! دیکھ آگے نہ تو میرے پاس کبھی آنا اور نہ حمیدہ کو لانا۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "ورنہ سردار مجھے بھی کتل کرا دے گا اور تجھے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔" رحیم داد کے چہرے پر خوف کا سایہ منڈلانے لگا۔ "میں نوں اچھی طرح پتہ ہے سردار کتنا ظالم اور خوں خوار ہے۔"

"سئیں! تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔" کرامت نے آہستہ سے کہا۔ "ایک گالہہ تو نیکوں بتانا بھول ہی گیا۔" اس نے ہاتھ میں دبا ہوا کنٹھا رحیم داد کے سامنے کر دیا۔ "یہ مالھان حمیدہ کی نہیں، اس کی بھرجائی کی ہے۔ وہ سردار کی ذال ہے۔ تب ہی تو حمیدہ اس مالھان کے لیے اتنی پریشان اور گھرائی ہوئی ہے۔ اُسے لینے تو وہ تیرے پاس ضرور آ جاتی۔ لگتا ہے اسے موکع نہیں ملا۔ ویسے اس کی بھرجائی کو مالھان کے بارے میں ابھی تک کچھ پتہ نہیں۔"

رحیم داد نے جیب سے دس دس کے دو نوٹ نکالے اور کرامت کو دیتے ہوئے بولا۔ "یہ رکھ لے اور اب تو ٹر جا۔ سویرے سورج نکلنے سے پہلے یہاں سے نکل جانا۔ تیرا اس پنڈ میں زیادہ ٹھیرنا خطرے سے خالی نہیں۔"

کرامت نے نوٹ لے کر کنٹھے کے ساتھ ہی اپنے منجھلے کے ڈب میں احتیاط سے رکھے اور رحیم داد سے رخصت ہوتے ہوئے گویا ہوا۔ "سئیں، تو راضی سکھی ہو۔" وہ آگے بڑھا اور دروازہ کھول کر کمرے سے چلا گیا۔

رحیم داد بستر پر بت بنا بیٹھا رہا۔ ذرا ہی دیر بعد اس نے سنا، کتے زور زور سے بھونک رہے تھے۔ وہ خوف زدہ ہو گیا۔ جلدی سے دروازے پر پہنچا۔ ایک پٹ کھول کر

باہر دیکھا۔ کہر کی دھند اس قدر گاڑھی تھی کہ اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ حویلی کے احاطے کے باہر کتوں کے بھونکنے کی آوازیں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔

رحیم داد نے دروازہ بند کیا اور نڈھال ہو کر بستر پر دراز ہوگیا۔ وہ خود کو تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا، ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ کتے اب حویلی سے کہیں دور بھونک رہے تھے۔ ان کی آوازیں رفتہ رفتہ رات کی خاموشی میں ڈوب کر ختم ہوگئیں مگر رحیم داد دیر تک جاگتا رہا اور مراد خاں کی بڑی بہن حمیدہ کے بارے میں سوچتا رہا۔

☆

مراد خاں شاہانی سہ پہر کو شکار سے واپس آگیا۔ وہ کئی خرگوش اور بہت سی مرغابیاں مار کر لایا تھا۔ واپسی پر وہ سیدھا رحیم داد کے پاس پہنچا۔ اس کا حال معلوم کیا۔ رحیم داد کی طبیعت اب ٹھیک تھی۔ بخار اتر چکا تھا۔ سر میں درد بھی نہیں تھا۔ سردار شاہانی اس کے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ کچھ دیر شکار کے بارے میں باتیں کرتا رہا پھر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ بہت تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔

شام کو سردار مراد خاں نے رحیم داد کو اس کمرے میں بلوایا جسے دربار ہال کہا جاتا تھا۔ ہال میں روشنی بھی زیادہ تھی اور فرش پر قالین بچھا تھا۔ مراد خاں اونچی کرسی پر بیٹھا تھا کرسی پر زربفت کا غلاف چڑھا تھا۔ غلاف کا رنگ اڑ کر پھیکا پڑ گیا تھا مگر اس کے سنہری گل بوٹے تیز روشنی میں جھل ملا رہے تھے۔ دو نوکر مستعدی سے کرسی کے پیچھے کھڑے تھے۔

سردار مراد خاں نے اس شام دربار لگایا تھا۔ وہ بارہ کلیوں والا ریشمی پیرہن پہنے ہوئے تھا۔ اس میں سامنے کے رخ پر دوہرے تسمے لگے تھے جنہیں تنیاں کہا جاتا ہے۔ تین تسمے چاندی کے تھے۔ گریبان اور گلے پر کلابتو لگا تھا۔ تکمہ بھی کلابتو کا تھا۔ سر پر بڑی ریشمی پگڑی تھی۔ کمر پر سنہرا پٹکا تھا۔ یہ وہ خلعت تھی جو اس کے باپ سردار نجیب خاں شاہانی کو انگریزوں کی خدمات کے صلے میں لاٹ گورنر کی جانب سے عطا کی گئی تھی۔ نوابی اور

ڈھانڈلہ سرداروں کو بھی ان کی وفاداری اور خدمات کے صلے میں ایسی ہی خلعتیں دی گئی تھیں۔ یہ خلعتیں جب علاقے کے خیر خواہ اور جاں نثار بلوچ سرداروں کو پیش کی گئی تھیں تو انگریز ڈپٹی کمشنر نے باقاعدہ دربار لگایا تھا۔ وفادار سرداروں کی اعلیٰ خدمات کو سراہا تھا۔ انکی کارگزاری کی تعریف اور توصیف کی تھی۔ ہر خلعت کے ساتھ ایک قیمتی پیش قبض بھی دیا گیا تھا۔ اس کا دستہ سونے اور چاندی سے مرصّع تھا۔

انگریز افسروں کی تقلید میں بلوچ سردار بھی دربار لگاتے تھے، خاص طور پر ہر فصل کی کٹائی کے بعد جب وہ اپنے مزارعوں سے طرح طرح کے ٹیکس اور نذرانے وصول کرتے۔ انہوں نے اپنی شان دار حویلیوں میں دربار لگانے کے لیے باقاعدہ ہال تعمیر کرائے تھے۔ یہ دربار ہال کہلاتے تھے۔ مراد خاں کا باپ سردار نجیب خاں بھی اسی ہال میں دربار لگاتا تھا۔ اس موقع پر وہ لاٹ گورنر کی عطا کی ہوئی خلعت پہنتا تھا۔ پٹکے کے ساتھ پیش قبض لگا ہوتا۔ وہ اسی کرسی پر بیٹھتا تھا جس پر اس وقت مراد خاں شاہانی نہایت آن بان اور کرّوفر سے بیٹھا تھا۔ وہ بھی سنہرے پٹکے کے ساتھ مرصّع دستے کا پیش قبض لگائے ہوئے تھا۔ اس کی مونچھیں مدم لگا کر حویلی کے نائی نے بڑی مہارت سے چڑھائی تھیں، نوکیلی اور سخت بنائی تھیں۔

سردار مراد خاں شاہانی کے کندھوں پر کشمیری شال پڑی تھی۔ وہ بہت وجیہہ اور باوقار نظر آرہا تھا۔ چہرے سے رعب اور دبدبہ ٹپک رہا تھا۔

دربار ہال کے باہر گاؤں کے مزارع ٹھنڈے فرش پر جگہ جگہ ٹولیوں میں بٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ وہ سرگوشیوں میں آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔ ان میں اکثریت بوڑھوں کی تھی۔ وہ خریف کی فصل کی کٹائی کے بعد اپنے بیٹوں، بیٹیوں، بھائیوں اور بہنوں کی شادی کرنا چاہتے تھے مگر شادی سے پہلے سردار کی اجازت حاصل کرنا ضروری تھا۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی شادی بیاہ نہیں ہو سکتا تھا۔ شادی کی اجازت کے لیے انہیں سردار کو نذرانہ پیش کرنا پڑتا جسے ڈالی کہا جاتا ہے۔ یہ برنا ٹیکس تھا۔ اس ٹیکس کی شرح فی مربع ایکڑ زیر کاشت رقبے پر تیس روپے مقرر تھی۔ دوسرے ٹیکسوں کے برعکس برنا ٹیکس کی وصولی غلے کے بجائے

نقدی کی صورت میں کی جاتی ہے، البتہ کاردار فصل کی کیفیت کے مطابق ٹیکس یا ڈالی کی مقررہ رقم میں کمی بیشی کی سفارش کر سکتا تھا۔ ایسی سفارش سردار عام طور پر منظور کر لیتا تھا۔ علاقے کا ہر جاگیردار اور بڑا زمیں دار پر نالہ ٹیکس وصول کرنا اپنا حق سمجھتا تھا۔

کریم بخش رادھانی ایک کرسی پر سردار مراد خاں شاہانی کے بائیں طرف بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے چھوٹی سی میز تھی۔ میز پر رجسٹر رکھا تھا۔ پہلے ایک بوڑھا ہال میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ بیوی بھی تھی۔ دونوں کے درمیان ان کی نوجوان بیٹی تھی۔ وہ دوپٹے سے اپنا چہرہ ناک تک چھپائے ہوئے تھی۔ تینوں سہمے ہوئے آگے بڑھے۔ انہوں نے پیشانی تک ہاتھ اٹھا کر سردار کو سلام کیا۔ بیٹی چند قدم آگے بڑھنے کے بعد سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ بوڑھا باپ بھی اس کے ساتھ ہی رک گیا۔ البتہ ماں آگے بڑھتی گئی۔ اس نے سردار مراد خاں شاہانی کی درازیٔ عمر اور ترقی کے لیے گڑگڑا کر روائتی دعائیہ جملے کہے، جھک کر اس کے پیروں کو ہاتھ لگایا اور الٹے قدموں واپس بیٹی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے واپس آنے کے بعد لڑکی کا باپ آگے بڑھا۔ اس نے بھی سردار کے قدم چھوئے۔ بیوی کی طرح اونچی آواز سے دعائیں دیں۔

"سئیں سدا جیوے۔ سکھی صحت ہووے۔ رب راضی ہووے یرا!"

بوڑھے نے جیب سے نوٹ نکالے اور دونوں ہاتھوں پر رکھ کر سردار مراد خاں شاہانی کو ڈالی پیش کی۔ سردار نے نوٹوں پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر ہٹا لیا۔ بوڑھے نے ٹیکس کی رقم کریم بخش رادھانی کو دے دی۔ اس نے رقم لے کر رجسٹر میں اندراج کر لیا۔ بوڑھا ہاتھ باندھ کر بیوی اور بیٹی کے ساتھ سردار کے روبرو نظریں جھکائے کھڑا رہا۔

سردار مراد خاں نے مسکرا کر کہا۔ "راضی باضی ہو۔ دھی کا پرنجن کر۔ بختاور ہووے۔" یہ سردار کی جانب سے شادی کی اجازت تھی۔

بوڑھے نے خوش ہو کر دونوں ہاتھ اٹھائے اور بلند آواز سے بولا "رب راکھا، اللہ بیلی۔" وہ پیچھے ہٹا اور بیوی اور بیٹی کے ساتھ ہال سے چلا گیا۔

دوسرا آیا۔ وہ ادھیڑ تھا۔ وہ بیٹے کے بیاہ کا طلب گار تھا۔ وہ بھی بیوی اور نوجوان بیٹے

کو حسب دستور ساتھ لایا تھا۔ اس نے پرناٹیکس ادا کیا۔ اجازت حاصل کی اور سردار کی جان و مال کو دعائیں دیتا رخصت ہوگیا۔

اسی طرح دوسرے بھی بیٹی یا بیٹے کو اور اگر بیوی حیات ہوتی تو اسے بھی ساتھ لاتے۔ سردار شاہانی کی اجازت حاصل کرتے اور خوش و خرّم دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوتے۔ چار ایسی عورتیں بھی بیٹی یا بیٹے کے ہمراہ سردار کے روبرو حاضر ہوئیں جن کے شوہر انتقال کر گئے تھے یا بیمار اور معذور تھے یا طلاق دے کر چھوڑ چکے تھے۔ ایسے نوجوان بھی آئے جن کے ماں باپ مر چکے تھے اور وہی اپنے کنبے کے کفیل تھے۔ وہ بہن یا بھائی کے بیاہ کی اجازت لینے سردار کے دربار میں حاضر ہوئے۔ پرناٹیکس نذرانے کی صورت میں پیش کیا اور مسکراتے چہروں کے ساتھ دعائیں دیتے واپس گئے۔

رحیم داد خاموش بیٹھا سردار مراد خاں کا طنطنہ اور جاگیردارانہ جاہ و جلال دیکھتا رہا۔ اس نے اس نوجوان کو بھی دربار میں حاضر ہوتے دیکھا جس کا لباس بہت میلا کچیلا اور بوسیدہ تھا۔ دبلا پتلا مریل جسم، ڈاڑھی بڑھی ہوئی، چہرے پر ویرانی برستی ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی تھی۔ وہ ملگجے دوپٹے سے اپنا چہرہ چھپائے ہوئے تھی۔

دونوں ڈرے سہمے لرزتے قدموں سے آگے بڑھے۔ لڑکی چند قدم چل کر دستور کے مطابق رک گئی۔ نوجوان آگے بڑھا، سردار کے قریب پہنچا، اس کے قدموں کو ہاتھ لگا کر پیر بن پودن کیا۔ سر سے پگڑی اتاری اور سردار کے قدموں پر ڈال دی۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹا اور ہاتھ باندھ کر سردار کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس نے دوسروں کی طرح سردار کو ڈالی کی رقم پیش نہیں کی تھی۔

سردار مراد خاں نے اسے گھور کر دیکھا، رعب دار لہجے میں ڈپٹ کر بولا ”کیا چاہتا ہے؟“

وہ عاجزی سے گویا ہوا۔ ”سئیں سردار! میں تیرا راجی رعیت ہوں۔ شامت دا ماریا ہوں۔ میرے کھیت کھارے دریا کنارے ہیں۔ پچھلی برکھا میں دریا چڑھا۔ ایک رات اچانک زبردست ڈھا آیا۔ میری ساری رڑھ فصل، چھل میں بہہ گئی۔ پانی کا ریلا گھر بار، جمع جتھا،

سب کچھ بہالے گیا۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔ رات کے اندھارے میں ڈھا کا پانی تیزی سے داخل ہوا، سب جان بچانے کے لئے مجدھر منہ اٹھا اُدھر بھاگے۔ جن کو بھاگنے کا رستہ نہ ملا وہ درختوں پر چڑھ گئے۔"

اس نے ہاتھ اٹھا کر لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔"یہ میری بھین ہے۔ یہ میرے ساتھ کسی نہ کسی طرح نکل آئی۔ اماں اندھی تھی، وہ نہیں آسکی۔" اس نے دل گرفتہ ہو کر ٹھنڈی سانس بھری۔" بعد میں اس کی لاش دو میل آگے دریا کنارے ملی۔" وہ گڑگڑاتے لگا۔" سئیں! میں مصیبت دا ماریا بالکل تباہ ہوگیا۔"

سردار مراد خاں نے مڑ کر رادھانی کی جانب دیکھا۔" ٹھیک کہہ رہا ہے یہ؟"

"سئیں! ابھی بتاتا ہوں۔" رادھانی نے سردار سے مہلت مانگی اور نوجوان کی جانب متوجہ ہوا۔" نیرا ناں کیہ ہے؟"

وہ لکنت سے بولا۔" سئیں! میرا ناں فرید خاں شاہانی ہے۔"

"یوں کہہ تو فریدا ہے۔" کریم بخش رادھانی نے درشت لہجے میں اس کے نام کی تصیح کی۔ فریدا نے جھٹ اپنی غلطی تسلیم کرلی، عاجزی سے بولا۔" ہا سئیں! میں فریدا ہی ہوں۔ میں تو تیرے پاس پہلے بھی آتا رہا ہوں۔"

رادھانی نے فریدا کی بات نظر انداز کرتے ہوئے سردار مراد خاں شاہانی کو مخاطب کیا۔

"سئیں سردار! یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس کی فصل اور گھر بار سیلاب میں برباد ہو گئے۔"

مراد خاں نے سرسری نظر سے فریدا کو دیکھا، بے زاری سے پوچھا۔" جب تجھے ڈالی نہیں دینی تو یہاں آیا کیوں ہے؟"

"سئیں سردار! میرے کولہ ڈالی دینے کے لیے کچھ نہیں۔ میں سوالی ہوں، اللہ راسی ہوں، تو فیاضی اے۔" فریدا ہاتھ جوڑ کر فریادی ہوا۔" سئیں میں ابھی ڈالی نہیں دے سکتا۔ ربیع کی واڈھی پر ڈالی کی رکم ادا کردوں گا۔"

"اس کے پرنے کی نیکوں اتنی جلدی کیوں ہے؟" سردار نے لڑکی کی طرف ہاتھ سے

مراد خاں نے دیکھا۔ لڑکی کی آنکھیں بھی خوبصورت اور دل کش تھیں۔ وہ زیرِ لب مسکرایا۔ چہرے پر چھائی ہوئی خشونت اور برہمی زائل ہو گئی۔ خوش ہو کر بولا "رنگ روپ سے تو یہ انگوری لگتی ہے۔" اس نے فریدا کی جانب رخ کیا۔" فریدے! اس کا ناں کیہ ہے؟"

"سیئیں! اس کا ناں حمیدہ ہے۔" فریدا نے سردار کو بتایا۔

رحیم داد نے چونک کر لڑکی کو دیکھا۔ وہ سردار مراد خاں شاہانی کی نہیں، فرید خاں شاہانی کی بہن تھی جو فرید خاں شاہانی نہیں صرف فریدا رہ گیا تھا۔ مراد خاں کا چہرہ بھی متغیر ہو گیا مگر فریدا نے بھی شاید اپنی غلطی محسوس کی۔ وہ ہکلانے لگا۔

"سسس سسس سیئیں! یہ میدہ ہے میدہ۔ اسے سب میدہ ہی کہتے ہیں۔"

سردار مراد خاں کے چہرے پر چھایا ہوا غبار چھٹ گیا۔ وہ زیرِ لب مسکراتا رہا۔ اس نے اللہ بخش جوڑا کو مخاطب کیا۔" جوڑے! میدہ کو اس کا بوچھن دے دے۔"

جوڑا نے فرش پر پڑا ہوا دوپٹہ اٹھایا اور لڑکی کے سر پر ڈال دیا لیکن دوپٹہ پھسل کر نیچے گر گیا۔ میدہ خاموش کھڑی رہی۔ اس نے دوپٹے کو ہاتھ نہ لگایا۔ اس کے چہرے پر چھائی حیا پر رفتہ رفتہ جھنجلاہٹ حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ ہال میں گہری خاموشی تھی۔ چند لمحے بعد سردار مراد خاں کی گرج دار آواز خاموشی میں ابھری۔

"جوڑے! میدہ کو اندر پہنچا دے۔"

رحیم داد نے دیکھا، فریدا کی بہن میدہ لمحے بھر تک ہونٹ بھینچے خاموش کھڑی رہی پھر اس نے جھک کر اپنا دوپٹہ اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں ستارے جھلملانے لگے۔ پلکوں پر آنسوؤں کے قطرے ابھرے اور ٹپ ٹپ رخساروں پر ٹپکنے لگے۔ اس نے میلے کچیلے دوپٹے کے آنچل سے لٹکل مار کر ایک بار پھر اپنا چہرہ چھپالیا۔ جوڑا نے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور وہ اس کے پیچھے پیچھے اس دروازے کی سمت بڑھی جو مراد خاں شاہانی کی خواب گاہ میں کھلتا تھا۔

دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ٹھٹکی، مڑ کر فریدا کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں مگر فریدا نے نظریں موڑ کر سر نیچا کر لیا۔ میدہ آگے بڑھی اور سردار مراد خاں کی خواب گاہ میں داخل ہو گئی۔

مراد خاں نے پلٹ کر کریم بخش رادھانی کی جانب دیکھا۔ نرم لہجے میں گویا ہوا۔" فریدا نے منگناں کرن سے پہلے ڈالی نہ دینے کی معافی چاہی تھی، اسے معافی دے دی گئی۔ پر میدہ اب ادھر ہی رہے گی۔ یہ فیصلہ بعد میں ہوگا کہ میدہ کو کب فریدا کے حوالے کیا جائے۔"

" جیسی سئیں کی مرضی۔" رادھانی نے مستعدی سے جواب دیا اور جھک کر رجسٹر میں سردار کے حکم کا اندراج کر لیا۔

سردار مراد خاں نے فریدا کو مخاطب کیا۔" فریدے!" وہ کھل کر مسکرایا۔" نواب تو راضی با رضی ہے۔ اپنے حالات ٹھیک کر لے فیر جب چاہے میدہ کا پرنا کرنا، مکلاوا کرنا، اسے اپنے گھر سے بدا کر کے سسرال ساہورے بھیجنا۔ ڈالی کی رکم فصل کی واڈھی پر ادا کر دینا۔" سردار نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔" فریدے! جا عیش کر، موجاں اڑا۔ میری طرف سے تجھے میدہ کے پرنے کی اجازت ہے۔"

فرید خاں شاہانی عرف فریدا چند لمحے بت بنا جہاں تھا وہیں کھڑا رہا پھر اس کے جسم میں حرکت ہوئی۔ وہ آگے بڑھا۔ سردار کے قدموں پر پڑی ہوئی اپنی پگڑی اٹھائی، چار پانچ پیچ دے کر اسے سر پر باندھا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر دعائیں دیں۔" سئیں سردارا! تو سدا جیوے، سکھی صحت ہووے، رب راضی ہووے۔" اس نے نظریں گھما کر اس دروازے کی جانب دیکھا جس میں اس کی بہن اللہ بخش جوڑا کے ساتھ داخل ہوئی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند ہو چکا تھا اور جوڑا واپس آ کر سردار مراد خاں شاہانی کی پشت پر مستعدی سے کھڑا ہو گیا تھا۔

فریدا ذرا دیر ٹھہر کر الٹے قدموں پیچھے ہٹا، مڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا دربار حال کے صدر دروازے پر پہنچا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے پشت پر پڑا پگڑی کا شملہ ایک ہاتھ بڑھا کر پکڑا۔ چہرے پر لے گیا اور اس سے رک رک کر آنکھوں کو ملنے لگا۔ رحیم داد نے محسوس کیا کہ وہ رو رہا تھا۔

سردار مراد خاں شاہانی اونچی کرسی پر لباس فاخرہ زیب تن کئے نہایت آن بان سے بیٹھا تھا اس کا چہرہ جاہ و جلال سے دمک رہا تھا۔ فریدا کا چہرہ مرجھا کر زرد پڑ گیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے بڑھا، دروازہ عبور کیا اور باہر پھیلے ہوئے اندھیرے میں گم ہو گیا۔

۲۶

ہموں والی میں رحیم داد کے قیام کا نواں روز تھا کہ صبح صبح نادر خاں پہنچا۔ رحیم داد کمرے میں ناشتہ کر رہا تھا۔ نادر خاں کو اچانک اپنے روبرو پا کر وہ گھبرا گیا۔ اس نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔

"نادر! تو یہاں کیسے پہنچ گیا۔ کوئی پریشانی کی گل بات تو نہیں؟" اس کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔

"نہیں چوہدری! گھبرانے کی کوئی گل نہیں۔" نادر خاں نے مسکرا کر رحیم داد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "میں تو تیں نوں یہ بتانے آیا تھا کہ تیرے کلیم کا معاملہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ میں نے محکمۂ آبادکاری کے دفتر جا کر اپنے سامنے وہ درخواست ہی پھڑوا دی جو تیرے خلاف لگائی گئی تھی۔ اور جس پر تیرے کلیم کے بارے میں تحکیکات کرنے کے احکامات جاری ہوئے تھے۔ میں نے درخواست کے ساتھ متعلقہ کاغذات بھی ضائع کروا دیئے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔" وہ اپنی کارگزاری پر مسرور نظر آ رہا تھا۔

"یہ تو نے بہت زوردار کام کیا۔" رحیم داد نے بھی مسرت کا اظہار کیا۔ "اس پر خرچ کتنا آیا؟"

"صرف چار سو روپے۔" نادر خاں نے فخر سے گردن اونچی کی۔ "وکیل اسی کام کے دو ہزار مانگتا تھا۔ چوہدری یہ وکیل تو ایسے ہی چکر چلا کر جیب کاٹتے ہیں۔ میرا تو ان سے بہت معاملہ رہا ہے۔"

نادر خاں ابھی تک رحیم داد کے سامنے کھڑا تھا اور نہایت مستعدی سے اپنی کارگزاری سنا رہا تھا۔ رحیم داد اس کی باتیں سن کر بہت متاثر ہوا۔ ہنس کر بولا۔ "تو کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔ آرام سے بات کر۔"

وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوا۔ "محکمہ آبادکاری میں جانے سے کئی عجیب باتوں کا پتہ چلا۔" اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "ایک تو بالکل تعجب انگیز بات کا پتہ چلا۔"

"کون سی ایسی عجیب گل تھی جس پر تجھے اتنا تعجب ہوا؟"

"تیں نوں پتہ ہے۔ تیرے خلاف کس نے درخواست لگوائی تھی؟" نادر خاں نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔

"وکیل بتاتا تھا، گورداس پور ہی کا کوئی مہاجر ہے جس نے میرا کلیم ختم کرا کے اپنے نام کوٹلہ ہرکشن کی اراضی اور حویلی الاٹ کرانے کے لالچ میں درخواست لگائی تھی۔" رحیم داد نے نادر خاں کو مطلع کیا۔ "یاد پڑتا ہے، وکیل نے اس کا نام محمد بشیر بتایا تھا۔"

"اس کا تو جی صرف نام ہی نام تھا۔" نادر خاں نے ہنس کر کہا۔ "چوہدری! تجھے یہ سن کر بہت اچنبھا ہوگا کہ تیرے خلاف احسان شاہ نے درخواست لگوائی تھی۔"

"تیرا مطلب ہے اپنے شاہ جی نے؟" رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں کہا۔ "نادرا یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ شاہ جی ایسا نہیں کر سکتا۔" اُس نے نادر خاں کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "تیں نوں پکا یقین ہے؟"

"پہلے تو جی مجھے بھی یقین نہیں آیا۔" نادر نے اُسے باور کرایا۔ "پر میں نے درخواست خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے، اس پر محمد شفیع گیلانی کا پتہ لکھا تھا، دستخط البتہ محمد بشیر کے تھے۔ تو نے پتہ ہے محمد شفیع گیلانی کون ہے؟"

"میں نے تو اس کا نام پہلی بار سنا ہے۔" رحیم داد نے استفسار کیا۔ "کون ہے یہ محمد شفیع گیلانی؟"

"وہ شاہ جی کے پتر حسن شاہ کا سگا سالا ہے۔ لہور میں رہتا ہے۔" نادر خاں نے کہا۔ "اُس کی بسیں اور لاریاں چلتی ہیں۔ وڈا ٹرانسپورٹر ہے۔ شاہ جی کا پتر بھی اُس کے کاروبار میں ساجھے دار ہے۔"

"سمجھ نہیں آتی، شاہ جی نے ایسا کیوں کیا؟" رحیم داد بدستور تذبذب میں مبتلا تھا۔ اُس کے رویے سے صاف جھلکتا تھا کہ اُسے نادر کے بیان پر ابھی تک شبہ ہے۔ رحیم داد نے اس کا برملا اظہار بھی کیا۔ "نادر! تو سچ بول رہا ہے؟"

"بالکل سچ بول رہا ہوں جی! مجھے تو محکمہ آبادکاری والوں نے یہاں تک بتایا کہ اس معاملے میں شاہ جی آبادکاری کے افسروں سے کئی بار ملا بھی۔ اُسی کے زور دینے پر انکوائری کرانے کے آرڈر ہوئے تھے۔"

رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پر شاہ جی نے میرے خلاف یہ کاروائی کیوں کی؟ وہ تو مجھے اپنا یار بیلی کہتا ہے۔ تیں نوں بھی پتہ ہے، وہ مجھ سے کتنا پیار کرتا ہے۔"

"تو نے ٹھیک ہی کہا چوہدری! اُس نے ہمیشہ میرے سامنے تیری تعریف کی۔ محبت ہی کا اظہار کیا۔"

"ایسا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نے یہ کاروائی میرے خلاف کیوں کی۔ تُو نے اس بارے میں کچھ سوچا؟"

"مجھے تو ایسا لگتا ہے، شاہ جی نے تیرے خلاف یہ کاروائی اللہ وسایا کی دشمنی میں کی ہوگی۔" نادر نے اظہارِ خیال کیا۔ "اللہ وسایا کا تو نام سنتے ہی آج بھی شاہ جی کے منہ پر جھنجلاہٹ چھا جاتی ہے حالانکہ اب وہ زندہ بھی نہیں ہے۔ اُسے مرے ہوئے مدت ہو گئی پر شاہ جی کی نفرت کم نہیں ہوئی۔ وہ اس سے سخت نفرت کرتا ہے۔" نادر نے سوالیہ نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "اپنی سمجھ میں تو جی یہی وجہ آتی ہے۔ سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ تجھ سے تو اسے کوئی گلہ شکوہ نہیں۔ جب بھی تیرے بارے میں اس سے بات چھڑی، اُس نے ہر بار تجھے اچھے لفظوں سے یاد کیا۔"

کے پاؤں دبا رہا تھا۔ اسے بے چین دیکھ کر کرامت نے ہمدردی کا اظہار کیا۔

"سئیں لگتا ہے تجھے نیند نہیں آرہی۔"

"میں دوپہر بعد سو گیا تھا اور شام تک سوتا رہا۔" رحیم داد نے نیند نہ آنے کا جواز پیش کیا۔

"سئیں! اصلی گالھ ایہہ ہے، تو جوان ہے۔ جوان بندے کو اکیلے نیند نہیں آتی۔" وہ شوخی سے مسکرایا۔ رحیم داد نے کسی ردِعمل کا اظہار نہ کیا۔ اسے خاموش پاکر کرامت کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ وہ زیادہ بے باک ہوگیا۔ اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور ایک آنکھ دبا کر گویا ہوا۔ "سئیں! تو کہہ تو آلس دور کرنے کو کسی کو تیرے پاس بھیج دوں؟"

رحیم داد اس کی بات سمجھ کر بھی سمجھ نہ سکا۔ اسے معلوم تھا کہ سیّد احسان علی شاہ کی طرح سردار مرادِ خاں شاہانی کی حویلی میں کوئی ایسا کوٹ نہیں ہے۔ جس میں مزارعوں اور کمیّوں کی نوجوان عورتوں کو اٹھوا کر قید رکھا جاتا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو شاہانی اس کا اظہار ضرور کرتا۔ وہ اس سلسلہ میں کرید کر پوچھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ کرامت اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب نہیں دیکھا۔ چپ چاپ کمرے سے چلا گیا۔

رحیم داد الجھن میں پڑ گیا۔ نیند پہلے ہی آنکھوں میں نہیں تھی۔ اب بالکل اڑ گئی۔ اس نے بند دروازے کی جانب بے قرار نظروں سے دیکھا۔ کچھ دیر کروٹ کے بل لیٹا رہا اور دروازے کو تکتا رہا۔ مگر نہ دروازہ کھلا نہ کوئی اندر آیا۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ سنّاٹا گہرا ہوگیا۔ رحیم داد نے کروٹ بدلی، آنکھیں بند کیں اور ایک بار پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے کرامت کا خیال جھٹک کر ذہن سے نکال دیا۔

نیند دھیرے دھیرے رحیم داد کی آنکھوں میں اترنے لگی۔ رات خاصی گزر چکی تھی۔ حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ دفعتہً گہری خاموشی میں کمرے کا دروازہ ہولے سے چرچرایا۔ رحیم داد کی نیند اچاٹ ہوگئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں سامنے دیوار پر ایک پرچھائیں لہرائی۔ رحیم داد نے جھٹ گردن موڑ کر دروازے کی جانب دیکھا دروازے کے قریب کرامت کے بجائے ایک عورت کھڑی تھی۔ اس کی پیٹھ رحیم داد کی جانب تھی۔

اس نے کمرے کا دروازہ آہستہ سے بند کیا اور پلٹی۔ رحیم داد نے دیکھا، وہ سرمئی رنگ کی اونی دوہر اوڑھے ہوئے تھی اس کا چہرہ دوہر سے اس طرح چھپا تھا کہ صاف نظر نہیں آرہا تھا وہ سرو قامت تھی۔ جسم گداز اور قد سے بھاری تھا۔ کولھے چوڑے تھے اور نچلا دھڑ خاصا پھیلا ہوا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے رحیم داد کی جانب بڑھی۔

رحیم داد اٹھ کر تکیے کے سہارے بیٹھ گیا اور حیرت سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ خوب گھیر دار ریشمی گھگھرا پہنے ہوئے تھی۔ وہ نظریں جھکائے خاموشی سے قریب آئی اور اپنا گھگھرا سمیٹ کر رحیم داد کے قریب بستر پر بیٹھ گئی۔ وہ ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہی تھی اس کی سانسیں کمرے کے سکوت میں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

رحیم داد نے بے قرار ہو کر پہلو بدلا، ہاتھ بڑھایا اور اس کے چہرے سے دوہر ہٹا دی۔ اس کا چہرہ اب رحیم داد کے سامنے عیاں تھا۔ اس کا رنگ صبح کی دھوپ کی مانند اُجلا تھا۔ رخساروں پر شفق کی سرخی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور کالی تھیں۔ سر کے بال لمبے اور گھنے تھے۔ وہ سرخ اور نیلے دھاگوں سے کڑھا ہوا جوگیا چولا پہنے ہوئے تھی۔ وہ خوبصورت عورت تھی۔ آنکھوں میں کاجل لگا کر اور بال سنوار کر بن ٹھن کر آئی تھی۔ مگر اس کا سن چالیس برس سے کم نہیں تھا۔ اس کی جوانی کا سورج ہر چند کہ ڈھل چکا تھا۔ لیکن ابھی تک اس میں غضب کی دل کشی اور رعنائی تھی۔

رحیم داد کو وہ بہت اچھی لگی۔ اس نے مسکرا کر بات چیت شروع کی ”تیرا نام کیا ہے؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ چہرہ اور سرخ ہو گیا تھا۔

رحیم داد نے دوبارہ اس کا نام پوچھا۔ وہ پھر بھی نہ بولی۔ رحیم داد نے تنگ ہو کر تیکھے لہجے میں کہا ”بولتی کیوں نہیں۔ تو گونگی تو نہیں ہے؟“

اس دفعہ اس نے اپنی نظریں اٹھائیں۔ اس کی سیاہ اور روشن آنکھیں جھلملائیں۔

لمحے بھر کے لیے دونوں کی نظریں ملیں مگر اس نے جھٹ نظریں ایک بار پھر نیچی کر لیں۔ رسان سے بولی ”میں تجھ سے باتیں کرنے نہیں آئی ہوں۔“

رحیم داد نے کچھ اور کہنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ بڑھا کر رحیم داد کے منہ پر رکھ دیا۔ رحیم داد نے بے ساختہ اس کا نرم و گداز ہاتھ تھام لیا۔ اس کی کلائی میں پڑی ہوئی چوڑیاں آہستہ سے جھن جھنائیں۔ اُس کے لب تھرتھرا رہے تھے۔ رحیم داد گومگو کے عالم میں اسے تکتا رہا۔

کمرے میں سکوت چھایا ہوا تھا۔ رات کا قافلہ دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کرتا رہا۔

رات کے پچھلے پہر وہ اٹھ کر جانے لگی تو رحیم داد نے اس کی کلائی تھام کر نرم لہجے میں کہا ”چلی جانا۔ ابھی بہت رات رہتی ہے۔“

وہ مزید ٹھہرنے پر آمادہ نہ ہوئی ”سئیں! میکوں اب جانا ہے۔“ اس نے اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کی ”میری نلی چھوڑ دے۔ میں اب نہیں رک سکتی۔“

”تو نے تو کوئی گل بات ہی نہیں کی۔“ رحیم داد نے اس کا ہاتھ نہ چھوڑا۔ ”اپنا نام تو بتا دے۔“

وہ قدرے تیکھے لہجے میں بولی ”یہ نہ پوچھ۔“ اس نے جھٹکا دے کر اپنی کلائی رحیم داد کی گرفت سے آزاد کرا لی۔ بستر پر پڑی ہوئی اُونی دوہر اٹھائی، اسے اس طور اوڑھا کہ ایک بار پھر اس کا چہرہ چھپ گیا۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی۔ آہستہ سے ایک پٹ کھولا۔ جاتے جاتے دہلیز پر ٹھٹکی، مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ آہستہ سے بولی ”سردار سے میرے بارے میں گالہہ نہ کرنا، ہرگز ہرگز نہ کرنا۔“ اس نے سختی سے تاکید کی ”کسم کھا۔ اس سے کچھ کہے گا تو نہیں۔“

”جیسی چاہے کسم لے لے۔“ رحیم داد نے اسے یقین دلایا۔ ”رب سوں، میں نوں اسے ایک لفظ نہیں کہنا۔ تو بالکل فکر نہ کر۔ مجھ پر بھروسہ کر۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”کل بھی آئے گی ناں؟ سردار تو کل رات بھی واپس نہیں آئے گا۔ وہ پرسوں شام سے پہلے نہیں آئے گا۔ مجھے یہی بتا کر گیا ہے۔“ اس نے زور دے کر پوچھا ”بول، کیا کہتی ہے؟“

اس نے رحیم داد کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ دھیرے سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔

رحیم داد گم صم بیٹھا رہا اور نظریں اٹھائے دروازے کو تکتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ پلنگ سے نیچے اترا۔ دروازہ بند کیا اور بستر پر واپس جا کر لیٹ گیا۔ وہ دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ عورت نے اپنے بارے میں اُسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہاں تک کہ نام بتانے سے بھی گریز کیا تھا۔ وہ کون تھی۔ کہاں سے آئی تھی اور کیسے آئی تھی۔ رحیم داد کو کچھ معلوم نہ تھا۔ وہ نہ جانے کب تک اس پراسرار عورت کے بارے میں غلطاں و پیچاں رہا۔ آخر اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح آنکھ کھلی تو رحیم داد نے دیکھا۔ بستر پر ایک طرف چادر کی سلوٹوں میں دبا ہوا سونے کے موٹے موٹے منکوں کا ایک کنٹھا پڑا تھا۔ کنٹھا خاصا وزنی اور قیمتی تھا۔ اُسے فوراً رات والی عورت یاد آگئی۔ اس نے کنٹھا اٹھا کر تکیے کے نیچے رکھ دیا اور خاموش بیٹھا عورت کے بارے میں اندازے لگاتا رہا مگر بہت سوچ بچار کے باوجود وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔

رحیم داد نے نہا دھو کر ناشتہ کیا لیکن تمام عرصے وہ اس عورت کے متعلق سوچتا رہا جو ہنوز اس کے لیے ایک معمّہ تھی۔ کرامت بھی نہیں آیا۔ اس کی تلاش میں رحیم داد کمرے سے نکل کر چوک میں گیا۔ وہ تمام نوکر چاکر واپس آگئے تھے جو رات کو حویلی سے غائب ہو گئے تھے۔ وہ اپنے کام کاج میں مصروف تھے۔ رحیم داد نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں مگر نوکروں میں اسے کرامت نظر نہ آیا۔

ڈیرا ابھی تک خالی تھا۔ شام ہو گئی لیکن نہ کوئی مہمان آکر ٹھہرا نہ سردار مراد خاں شاہانی واپس آیا۔ چوک میں کہر کا نیلگوں غبار گاڑھا پڑتا جا رہا تھا۔ فضا دھواں دھواں تھی۔ خاموشی بڑھتی جا رہی تھی۔ رحیم داد کو رات کا انتظار تھا اور رات جیسے رینگ رینگ کر آ رہی تھی۔

رحیم داد اوّل شب ہی اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ وہ بستر پر لیٹا ہوا باہر سے اُبھرنے والی آوازیں سنتا رہا۔ بے قراری کا یہ عالم تھا کہ وہ ٹھیک سے کھانا بھی نہ کھا سکا۔ کبھی وہ اٹھ کر ٹہلنے لگتا کبھی دروازے پر جا کر چوک کی طرف دیکھنے لگتا۔ چوک رفتہ رفتہ سنسان پڑ گیا۔ نوکر چاکر اپنی اپنی کوٹھریوں میں جا کر لیٹ چکے تھے۔ رحیم داد کو توقع تھی کہ وہ ضرور آئے گی۔ اس کا سونے کا کنٹھا رحیم داد کے پاس تھا۔ کنٹھا واپس لینے اسے آنا چاہیے تھا۔ وہ بے چینی سے اس کی راہ تکتا رہا۔

باہر گونگی رات ساکت کھڑی تھی۔ فضا پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

آدھی رات سے کچھ پہلے دروازہ آہستہ سے کھلا۔ رحیم داد بے قرار ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے دروازے کی جانب اشتیاق سے دیکھا مگر دروازے پر وہ نہیں تھی کرامت تھا۔ وہ ٹھٹک کر چند لمحے تک دروازے کے قریب کھڑا رہا۔ پھر نظریں اٹھا کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔

رحیم داد نے گلہ کیا۔ "کرمے! تو دن بھر کہاں رہا؟ نظر ہی نہیں آیا۔"

"سئیں، میں سویرے سویرے دریا خاں چلا گیا تھا۔ اندھارا ہونے کے بعد لوٹا ہوں۔"

رحیم داد نے اس کا چہرہ دیکھا۔ چہرے پر گرد جمی ہوئی تھی۔ وہ سفر کی تکان سے نڈھال نظر آرہا تھا۔ رحیم داد نے ہمدردی کے طور پر اس سے کہا۔ "کرمے! میں نوں پیر نہیں دبوانے۔ تو بہت تھکا ہوا لگتا ہے۔ جا کر آرام کر۔"

"سئیں، جیسی تیری مرضی۔" کرامت نے جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔ "تجھ سے ایک ضروری گالہہ پوچھنی تھی۔"

"ضرور پوچھ۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ کیا پوچھنا چاہتا ہے۔ کرامت نے دبی زبان سے پوچھا۔ "سئیں! تو نے سونے کی ایک مالھان تو نہیں دیکھی؟"

"کیسی مالھان؟" رحیم داد نے انجان بننے کی کوشش کی۔

"سئیں، رات اس کے گلے سے مالھان اتر کر یہاں گر گئی تھی۔ وہ اس کے لیے بہت پریشان ہے میں اس کی مالھان لینے آیا تھا۔"

رحیم داد نے ہاتھ بڑھا کر تکیے کے نیچے سے کنٹھا نکالا، کرامت کے سامنے کیا اور زیر لب مسکرا کر بولا۔ "یہ رہی اس کی مالھان۔ اسے لینے تو کیوں آیا، وہ خود کیوں نہیں آئی؟"

"یہ تو جی وہی بتا سکتی ہے، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" کرامت نے گول مول جواب دیا۔

"ٹھیک ٹھیک بات کر۔" رحیم داد نے ڈپٹ کر کہا۔

"سئیں، میکوں کی کہنا اے۔" کرما مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ "اس کی مرضی ہے

جی، آنا چاہے تو آجائے گی۔"

"پر کل رات تو اُسے تو یہاں لایا تھا نا؟"

"نا سئیں، ایسی گالھہ نہیں۔" کرمانے انکار میں گردن ہلائی۔" اس کی مرضی نہ ہوتی تو میں اُسے کیسے لاتا۔"

"تو اس کے ساتھ ساتھ آیا تھا؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔" پر وہ کمرے میں بالکل اکیلی آئی تھی۔"

"میں تو اسے تیرے کمرے تک چھوڑ کر چلا گیا تھا۔" کرمانے وضاحت کی۔

"جب وہ واپس گئی تب تو کہاں تھا؟"

"سئیں! میں اس کا انتظار کرتے کرتے سو گیا تھا۔ میکوں پتہ تھا وہ دیر سے لوٹے گی"
اس نے مسکرا کر رحیم داد کو بتایا۔" اس نے واپسی پر مجھے جگایا تھا۔"

"آج بھی وہ آئے گی؟" رحیم داد نے بے قرار نظروں سے کرامت عرف کرما کو دیکھا۔

"پتہ نہیں جی۔" وہ آہستہ سے بولا۔" ویسے سچی گل پوچھ تو مجھے لگتا نہیں کہ وہ آج بھی آئے گی۔"

"تو نے کیسے اندازہ لگایا کہ وہ نہیں آئے گی؟"

"سئیں! اُسے آنا ہوتا تو مالھان لینے خود آتی۔ میکوں تیرے پاس نہ بھیجتی۔"

"اچھا یہ بتا، وہ ہے کون؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"سئیں، یہ تو میں ہرگز ہرگز نہیں بتاؤں گا۔" کرمانے صاف انکار کر دیا۔" میں اس کے بارے میں تیکوں کچھ نہیں بتا سکتا۔"

"کیوں نہیں بتا سکتا؟" رحیم داد نے جھلا کر سوال کیا۔

کرامت نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ بت بنا خاموش کھڑا رہا۔

"بولتا کیوں نہیں؟" رحیم داد نے اُسے ڈانٹا۔" صاف صاف بتا۔" اس کی آواز

قدرے اونچی تھی۔

"سئیں، دھیرے بول" کرما نے مڑکر دروازے کی جانب دیکھا" تیکوں پتہ نہیں، یہ عزت اور لاج کی گالھ ہے" اس کا لہجہ تیکھا ہوگیا" میں تجھے کیسے بتاسکتا ہوں" اس کے چہرے پر خوف کی جگہ جھنجلاہٹ آگئی" میں نے تجھے پہلے ہی کہا تھا کہ اس کے بارے نہ پوچھ۔ میکوں کچھ نہیں بتانا۔"

رحیم داد نے اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھے تو منانے کی کوشش کی۔ لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے گویا ہوا" نہ بتانا تیری مرضی پر اتنا تو بتا دے اس کا نام کیا ہے؟"

رحیم داد کو توقع تھی کہ کرامت اس کا نام بتا دے گا مگر اس کی توقع پوری نہ ہوئی۔ کرامت آمادہ نہ ہوا۔

"نا سئیں نا، میں یہ بھی نہیں بتا سکتا۔ اس کے بارے میں تو میں تجھے کچھ نہیں بتا سکتا۔"

عورت کی شخصیت کا معمہ کرما نے اپنی باتوں سے اور پیچیدہ بنا دیا۔ رحیم داد کا اشتیاق بڑھا" تو عجیب گال کر رہا ہے" رحیم داد کے لہجے میں اس دفعہ کسی قدر تلخی تھی۔

"ہا سئیں، یہ عجیب ہی گالھ ہے۔ اس میں بدنامی اور لوک کا ڈر ہے" وہ اپنی ضد پر اڑا رہا" تو ہزار پوچھ۔ میکوں اس کے بارے میں کچھ نہیں بتانا۔ میں ہرگز کچھ نہیں بتاوں گا۔"

"تو فیر یہ بھی صاف صاف سن لے، میں نے مالھان تجھے نہیں دینی" رحیم داد جل کر بولا" اس نے کنٹھا ایک بار پھر تکیے کے نیچے رکھ دیا" اسے کہہ دے، مالھان لینی ہے تو خود آکر لے جائے۔ میں تجھے نہیں دوں گا۔"

"سئیں نراض نہ ہو" کرامت نرم پڑگیا۔ اس کے لہجے میں عاجزی پیدا ہوگئی" مالھان دیدے، تیری مہربانی ہوگی۔ رب راضی ہووے، تو سدا راضی ہو، خوش ہو۔"

"تو کچھ ہی کہہ مالھان میں نے تجھی نہیں دینی" رحیم داد اپنی بات پر جما رہا" مالھان

صرف اور صرف اسی کو دے سکتا ہوں۔" کرامت سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ رحیم داد نے ڈپٹ کر کہا۔" کھڑا کیوں ہے؟ جو میں نے کہا ہے اسے جا کر بتا دے۔ وہ کوئی بھی ہو مالیھاں لینی ہے تو اسے خود چل کر یہاں آنا پڑے گا۔" رحیم داد بستر پہ دراز ہو گیا۔" اب تو یہاں سے جا۔ میں نوں سونا ہے۔ اُونگھ آرہی ہے۔ رات بھی بہت ہو گئی۔"

کرامت مڑا اور ہولے ہولے کولہے مٹکاتا باہر چلا گیا۔

رحیم داد بستر پر لیٹا انتظار کرتا رہا۔ رات گزرتی گئی۔ سناٹا بڑھتا گیا۔ رات آدھی ہو گئی۔ گھڑی ہو کر ڈھلنے لگی۔ لیکن نہ کرامت آیا، نہ وہ آئی۔ رحیم داد انتظار کرتے کرتے سو گیا۔ صبح اٹھ کر کمرے سے باہر آیا تو ملازموں کی زبانی معلوم ہوا کہ مراد خاں شاہانی واپس آگیا ہے۔

ناشتے پر شاہانی بھی پہنچ گیا۔ اس نے رحیم داد کے ساتھ ہی ناشتہ کیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر مراد خاں نے جیپ نکالنے کا حکم دیا اور خود بھی گیرج کی طرف چلا گیا۔ رحیم داد اس کے ہمراہ ہموں والی جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے دروازے پر آہٹ سنی، مڑ کر دیکھا، کرامت سامنے کھڑا تھا۔ رحیم داد نے پوچھا

"تو پچھلی رات کیوں نہیں آیا، اب کس لیے آیا ہے؟"

"سئیں! تو نے صاف انکار کر دیا تھا۔ میکوں آ کر کی لینا تھا۔"

"اسے اپنے ساتھ لاتا۔ وہ کیوں نہیں آئی؟"

"سئیں، آہستہ بول۔" اس نے سراسیمہ نظروں سے باہر چوک میں دیکھا۔" تیکوں پتہ ہے، سردار واپس آگیا ہے۔"

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔" میں نوں یہ بتا، وہ کیوں نہیں آئی؟" رحیم داد کا لہجہ اس دفعہ دھیما تھا۔

"سئیں، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" کرمانے سرگوشی کی۔" اس کی مرضی، نہیں آئی۔ تو نے جو کہا تھا، میں نے اسے کہہ دیا۔"

"کیا بولی تھی وہ؟"

"اس نے میری گالہہ سنی پر کچھ بولی نہیں" کرامت نے رحیم داد کو بتایا۔ "سئیں! اس کی مالہھان دیدے" وہ گڑگڑانے لگا۔ "تیری بہت مہربانی ہو گی۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "وہ بہت پریشان ہے۔ اسے تنگ کرے گا تو وہ تجھ سے ناراض ہو جائے گی۔"

"اسے کہنا ناراض نہ ہو۔" رحیم داد مسکرا کر بولا۔ "میں چند روز بعد واپس آ جاؤں گا۔ اس کی مالہھان تب ہی دوں گا۔ وہ آ کر خود لے جائے گی۔ فکر نہ کر مالہھان میرے پاس حفاظت سے ہے گی۔"

کرامت کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مراد خاں شاہانی مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا لیکن کرامت پر نظر پڑتے ہی اسکے چہرے سے مسکراہٹ اڑ گئی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے گھور کر کرامت کو دیکھا۔ "کرمے! تو ادھر کیا کر رہا ہے؟" اس کا لہجہ تند اور کڑوا تھا۔

رحیم داد نے جھٹ بات بنائی۔ "شاہانی میں نے اسے بلایا تھا۔" اس نے مڑ کر کرامت کی جانب دیکھا۔ "مجھے فٹا فٹ ایک گلاس پانی لادے۔ تجھے اسی لیے بلایا تھا۔"

کرامت کمرے سے چلا گیا۔ مراد خاں شاہانی خاموش کھڑا رہا۔ رحیم داد نے اس کے بشرے سے اندازہ لگایا کہ کرامت کا وہاں آنا اُسے ناگوار گزرا تھا۔ رحیم داد نے غور کیا کہ کرامت اس کے لیے پانی نہیں لایا بلکہ حویلی کا ایک اور ملازم پانی سے بھرا ہوا گلاس لے کر اندر آیا۔ رحیم داد نے اس سے کرامت کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ گلاس لیا اور اس طرح ہونٹوں سے لگا کر غٹا غٹ پی گیا گویا بہت پیاسا ہو۔

مراد خاں شاہانی نے کرامت کو کمرے میں دیکھ کر جو درشت رویہ اختیار کیا تھا اس نے رحیم داد کی نظروں میں اس عورت کو اور پراسرار بنا دیا۔

✡

جیپ حویلی کے صدر دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ رحیم داد اور مراد خاں جیپ میں بیٹھ گئے۔ جیپ نے حرکت کی اور آگے بڑھ گئی۔ اسے ڈرائیور چلا رہا تھا۔ اس کے برابر شاہانی کا ایک نوجوان ملازم ہاتھ میں بھری ہوئی بندوق سنبھالے بیٹھا تھا۔ مراد خاں شاہانی پچھلی نشست

پر رحیم داد کے ساتھ بیٹھا تھا۔ دونوں خاموش تھے۔ جیپ گرد کے بادل اڑاتی تیزی سے پرپیچ راستوں پر دوڑ رہی تھی۔

بھکرؔ شہر سے نکل کر جیپ اس سڑک پر پہنچ گئی جو ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ وہ بہل اسٹیشن کی سمت تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ سڑک کے بائیں طرف ریلوے لائن تھی اور دائیں طرف کھیتوں سے گھری ہوئی بستیاں تھیں۔ جھڑ اور جنگل تھے جو حدنگاہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ دریائے سندھ کا ساحلی علاقہ ہے جو بیٹ کہلاتا ہے۔ یہ بھکرؔ سے بہل تک پندرہ میل لمبی اور پانچ میل چوڑی سرسبز و شاداب پٹی ہے اور اپنی زرخیزی کے لیے مشہور ہے۔ جدھر آنکھ اٹھتی ہے۔ ہریالی ہی ہریالی نظر آتی ہے۔ بیٹ کا علاقہ شاہانیوں، ڈھانڈلوں اور نوانیوں کی جاگیروں میں بٹا ہوا ہے مگر ڈھانڈلوں کی زمین داری شاہانیوں اور نوانیوں کے مقابلہ میں زیادہ بڑی ہے۔

بیٹ نشیب میں واقع ہے۔ سامنے دریائے سندھ بہتا ہے۔ جس کا پاٹ میلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ دریا کے درمیان جگہ جگہ خشکی کے دوآبے نظر آتے ہیں جنہوں نے جزیروں کی شکل اختیار کرلی ہے۔ ان جزیروں کو کچےؔ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ کچے غیر آباد اور ویران نہیں ہیں۔ ان میں بستیاں آباد ہیں۔ زمین نہایت زرخیز ہے اور ان کے باشندے سخت محنتی اور جفاکش ہیں۔ کھیتی باڑی کرنا اور مویشی پالنا ان کا پیشہ ہے اور یہی ان کا ذریعہ معاش ہے۔ ان کا رہن سہن بہت سیدھا سادا ہے۔ مکانات مٹی کے بنے ہوئے ہیں اور ان کی چھتیں عام طور پر پھوس اور تپوار کی ہوتی ہیں۔ گھروں کی چاردیواری کے اندر کشادہ آنگن ہیں۔ جن میں گھنے اور سایہ دار درخت ہوتے ہیں۔ آنگنوں میں چارپائیاں بھی ہوتی ہیں۔ مرد فرصت کے اوقات میں چارپائیوں پر بیٹھ کر حقے گڑگڑاتے ہیں۔ باتیں کرتے ہیں۔ دل بہلاتے ہیں۔ آنگنوں میں درختوں اور کھونٹوں سے بندھے ہوئے مویشی جگالی کرتے رہتے ہیں۔ مرغیاں کڑکڑاتی ہوئی اِدھر اُدھر گھومتی پھرتی ہیں۔ مرد جب سورج طلوع ہوتے ہی ہل پنجالی سنبھال کر کھیتوں پر کام کرنے نکل جاتے ہیں تو عورتیں گھروں میں مشین پر چارہ کاٹتی ہیں۔ گائے بھینسوں اور بکریوں کے لیے غذا

مہیا کرتی ہیں۔ گائے بھینسوں کے تھنوں سے بالٹیاں بھر بھر کر دودھ نکالتی ہیں جس سے مکھن اور کھوئے کے علاوہ طرح طرح کی لذیز مٹھائیاں تیار کی جاتی ہیں۔

مرد دودھ، کھویا اور مٹھائیاں لے کر دریا عبور کرتے ہیں اور گرد و نواح کے بازاروں میں انہیں فروخت کرتے ہیں۔ دریا عبور کرنا بھی ان کا ایک فن ہے۔ وہ دودھ سے بھری ہوئی گاگریں اور مٹکے، مٹھائیوں اور سبزیوں کے ٹوکرے کمر اور ٹانگوں سے باندھ کر یا سر پر رکھ کر اس مہارت اور ہوشیاری سے دریا سے گزرتے ہیں کہ کوئی بھی شے پانی سے خراب نہیں ہوتی۔ دریا پار کرنے کے لیے وہ اپنے سینے سے چمڑے کی ایک چھوٹی سی مشک باندھ لیتے ہیں جسے سندھاری کہا جاتا ہے۔ ان کا یہ سفر بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سندھاری کا چمڑا کہیں سے کھل جاتا ہے یا پانی میں بہتی ہوئی درختوں کی شاخوں کی کوئی نوک یا کانٹا چبھ جاتا ہے تو وہ سخت مشکل میں پڑ جاتے ہیں۔ وہ ایسے خطرات سے نمٹنا جانتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی اس طرح پھنس جاتے ہیں کہ دریا کی لہریں ان کو نگل جاتی ہیں۔ مگر عورتیں، بوڑھے اور بچے ملاحوں کو کرایہ دے کر کشتیوں سے دریا عبور کرتے ہیں اور ایسا سفر وہ شادی بیاہ، میلوں ٹھیلوں اور کسی خاص تقریب کے موقع ہی پر کرتے ہیں۔ مرد بھی کشتیوں سے سفر کر سکتے ہیں مگر وہ اپنا اور اپنے ساز و سامان کا بھاری کرایہ ملاحوں کو ادا کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

کچّے کا علاقہ اس کے باسیوں کے لیے اس وقت میدان حشر بن جاتا ہے جب دریا میں سیلاب آتا ہے جسے مقامی بولی میں ڈھا کہا جاتا ہے۔ ڈھا آتا ہے اور دریا کا پانی چڑھتا ہے تو ہر چیز کو اپنے ساتھ بہائے جاتا ہے۔ بستیاں پانی میں ڈوب جاتی ہیں۔ کچے مکانات گر جاتے ہیں۔ ہر طرف تباہی مچ جاتی ہے۔ ڈھا سے بیٹ بھی نشیب میں ہونے کے باعث محفوظ نہیں رہتا۔ وہ بھی تباہی اور بربادی کا شکار ہوتا ہے۔ ڈھا بالکل اچانک آتا ہے اور اگر رات کے اندھیرے میں آتا ہے تو لوگوں کے لیے جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ جس کا جدھر منہ اٹھتا ہے اُدھر بھاگتا ہے۔ جسے بھاگنے کا موقع نہیں ملتا وہ جان بچانے کے لیے درختوں پر چڑھ جاتا ہے۔ ڈھا کی تباہی اور بربادی کے باوجود کچّے کے رہنے والے اسے چھوڑ کر کہیں اور نہیں جاتے وہ از سر نو

اپنی آباد کاری کرتے ہیں۔ منہدم مکانوں کی تعمیر کرتے ہیں اور زندگی کا سفر نئے عزم سے شروع کرتے ہیں۔

ڈھا اگر زحمت ہے تو باعث رحمت بھی ہے۔ سیلاب کا زور جب ٹوٹتا ہے اور پانی اترتا ہے تو ڈھا اپنے ساتھ جو مٹی لاتا ہے اس سے کچے کی زمین خوب زرخیز ہو جاتی ہے، جس پر گندم، چنے، جوار، باجرے، لمادہ، تارہ میرا اور گوارے کے ساتھ ساتھ سبزیاں بھی کاشت کی جاتی ہیں۔ یہاں خربوزے اور تربوز بھی پیدا ہوتے ہیں جو نہایت خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔ دریا کی رفتار جن دنوں سست پڑ جاتی ہے اور اس میں ٹھہراؤ آجاتا ہے تو دوسرے خودرد پودوں کی طرح پیڑا بھی اگتا ہے۔ اسے کوندر بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے ریشوں سے بان تیار کیے جاتے ہیں اور پتلی پتلی شاخوں سے جو جھاؤ کہلاتی ہے، جھاڑو اور ٹوکریاں بنائی جاتی ہیں۔ جھاڑو اور ٹوکریاں تیار کرنا کچے کی گھریلو صنعت میں شامل ہے، جن کی بازار میں ہمیشہ مانگ رہتی ہے۔

کچے کے جزیروں کا علاقہ بھی بیٹ کے ساتھ شاہانیوں، ڈھانڈلوں اور نوانیوں کی جاگیر میں بٹا ہوا ہے۔

✡

جیپ بہل سے پہلے ہی کچے راستے پر مڑ گئی اور ہچکولے کھاتی ہوئی موضع ہموں والی کی جانب بڑھنے لگی۔ ہموں والی ہی میں مراد خاں کی جاگیر تھی جو کم و بیش تین ہزار مربع ایکڑ پر پھیلی ہوئی تھی۔ جیپ گاؤں میں داخل ہوئی تو ہر طرف مراد خاں کی آمد کا غلغلہ مچ گیا۔ ڈرائیور نے جیپ اس کی قیام گاہ کے سامنے روکی۔ یہ قدیم وضع کی حویلی تھی۔ اس کی بوسیدہ چار دیواری جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ سردار شاہانی کا کاردار رحیم بخش رادھانی پہلے ہی سے موجود تھا۔ مراد خاں شاہانی اور رحیم داد جیپ سے اتر کر اندر چلے گئے۔ حویلی بہت بڑی تھی۔ اس کا احاطہ کشادہ اور وسیع تھا۔ کہیں کہیں گھنے اور سایہ دار درخت تھے۔ احاطے کے ایک حصے میں

مہمانوں کے قیام کے لیے ڈیرا تھا۔ ڈیرا حویلی کی عمارت سے الگ تھلگ کچھ فاصلے پر تھا۔ ڈیرے کے ایک کمرے میں رحیم داد کے ٹھہرنے کا بندوبست کیا گیا۔

شام کو سردار مراد خاں نے کچہری لگائی۔ وہ ایک کرسی پر گردن اونچی کیے نہایت آن بان اور دبدبے سے بیٹھا تھا۔ رحیم داد بھی اس کے ساتھ ہی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ کمرے کے باہر دالان میں دور دور تک گاؤں کے مزارع اور کمی جمع تھے۔ وہ باری باری سردار کے روبرو حاضر ہوتے، دروازے سے داخل ہوتے ہی اونچی آواز سے کہتے۔

سئیں سردارا! سلام ولاون، خوش ہو، راضی ہو، بالیں بچیں، جان، مال، ڈھگی خیر اے۔ ہئی تیری سب خیر اے۔"

سردار مراد خاں شاہانی ہولے ہولے نخوت سے گردن ہلا کر جواب دیتا "شکر اے شکر اے" آنے والے نظریں نیچی کیے۔ سنبھل سنبھل کر آگے بڑھتے۔ قریب پہنچ کر مراد خاں شاہانی کے پیر چھوتے اور ہاتھ جوڑ کر بلند آواز سے دعائیں دیتے۔

"سئیں سدا جیوے۔ سکھی صحت ہووے۔ حیاتی والا ہوویں۔"

دو گھنٹے بعد کچہری برخاست ہو گئی۔ باہر بیٹھے ہوئے جن لوگوں کو سردار کے روبرو حاضر ہونے کا موقع نہیں ملا تھا، وہ دوسرے روز آنے کا ارمان دلوں میں لیے واپس چلے گئے۔ ان میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی تھیں۔ بوڑھے بھی تھے اور جوان بھی۔

سردار مراد خاں نے دوسرے روز صبح کچہری لگائی۔ شام کو بھی کچہری لگائی۔ ہر روز ایسا ہی ہوا۔ مزارع اور جاگیر میں بسنے والے دوسرے لوگ سردار کے سامنے حاضری دیتے، اپنے تنازعات اور مسائل، مقدمات کی صورت میں اس کے سامنے پیش کرتے۔ سردار شاہانی ایک منصف کی صورت ہر ایک کا مقدمہ سنتا۔ ان پر غور کرتا۔ ضروری سمجھتا تو کاردار رادھانی سے بھی مشورہ کر لیتا۔ رادھانی اس کے قریب ہی ذرا پیچھے ہٹ کر کرسی پر بیٹھا تھا۔ سردار شاہانی کسی مقدمے کو آئندہ پیشی کے لیے ملتوی کر دیتا۔ کسی کا فوری فیصلہ سناتا۔ اس کا ہر فیصلہ قطعی اور آخری ہوتا۔ اس کا کوئی بھی فیصلہ عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔

چار روز تک صبح شام، دونوں وقت یہ سلسلہ چلتا رہا۔ کسی بھی روز کچہری دو گھنٹے سے پہلے ختم نہ ہوتی۔ کبھی کبھی صبح سے دوپہر ہو جاتی مگر سردار مراد خاں شام کی کچہری زیادہ طویل نہ ہونے دیتا۔ اندھیرا بڑھتے ہی اس کے معمولات کا وقت شروع ہو جاتا، بدن ٹوٹنے لگتا اور ذہن بوجھل ہو جاتا۔ یہ گویا بادہ نوشی کا تقاضہ ہوتا اور اس میں تاخیر رفتہ رفتہ اذیت ناک بنتی جاتی۔ اس کی قوتِ فیصلہ جواب دینے لگتی۔ وہ اکتا کر اچانک کھڑا ہو جاتا۔ رادھانی اس کا مزاج شناس تھا۔ وہ اٹھنے سے پہلے ہی سردار شاہانی کی کیفیت سے بھانپ جاتا اور کچہری برخاست ہونے کا اعلان کر دیتا۔

کچہری کا سلسلہ ختم ہوا تو مراد خاں بستی چانڈیہ کے ایک بڑے زمیں دار اور بارڈر ملٹری پولیس کے ایک کمانڈر کے ہمراہ شکار کھیلنے چلا گیا۔ اس کے ساتھ شکاری کتے تھے اور شکار کا ہانکا کرنے والے ملازم اور مزارع بھی تھے۔ ان کے پاس لمبی لمبی لاٹھیاں، ڈھول اور ٹین کے پیپے تھے۔ کریم بخش رادھانی بھی سردار شاہانی کے ساتھ چلا گیا مگر رحیم داد نہ جا سکا۔ اُسے پچھلی رات سے ہلکا ہلکا بخار تھا۔ سر میں درد بھی تھا۔ گاؤں کے حکیم نے اسے دوا دی تھی اور آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ ویسے بھی جب سردار مراد خاں شاہانی شکاریوں کے ہمراہ روانہ ہو رہا تھا تو رحیم داد اس قدر نڈھال اور مضمحل تھا کہ اس میں شکار پر جانے کی سکت نہ تھی اور نہ کوئی خواہش۔ وہ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا رہا۔ سردار شاہانی شکار پر جانے سے پہلے دیر تک اس کے پاس بیٹھا تسلی اور دل جوئی کی باتیں کرتا رہا۔

مراد خاں دن چڑھے شکار کے لیے روانہ ہوا اور رحیم داد سے دوسرے روز صبح واپس آنے کا وعدہ کر گیا۔ رحیم داد نے اس روز کھانے کے بجائے صرف گرم دودھ پر گزارہ کیا۔ شام کو بھی وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ مگر اس کی طبیعت میں افاقہ تھا۔ بخار اتر چکا تھا۔ صرف کمزوری باقی تھی۔

وہ بستر پر خاموش لیٹا تھا۔ رات کہر آلود اور سرد تھی۔ گاؤں دھند میں لپٹا خاموش نظر آ رہا تھا۔ سکوت لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ دُور سے رک رک کر کتوں کے زور زور سے

بھونکنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ رحیم داد ابھی سویا نہیں تھا۔ آنکھوں میں ہلکی ہلکی غنودگی تھی۔ اسی عالم میں اس نے کمرے کے باہر دبے قدموں کی آہٹ سنی۔ آہٹ قریب آتی گئی، پھر دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔

رحیم داد نے آنکھیں کھول دیں۔ دروازہ آہستہ سے کھلا۔ رحیم داد نے حیرت سے دیکھا کہ کرامت کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ اُس نے دروازہ بند کیا اور رحیم داد کے روبرو نظریں جھکا کر ادب سے کھڑا ہو گیا

رحیم داد نے پوچھا "کرمے! تو کیسے آیا ہے؟"

"نیکوں پتہ ہی ہے سئیں میں کیوں آیا ہوں۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔

رحیم داد خاموش رہا۔ اس نے ہولے سے کراہتے ہوئے کروٹ بدلی۔ کرامت نے چہرے پر پریشانی کے تاثرات پیدا کرتے ہوئے اظہار ہمدردی کے طور پر پوچھا "سئیں! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ خیر و عافیت اے ؟"

"سر میں درد ہے۔ بکھار بھی تھا۔ پر اب نہیں لگتا۔ حکیم نے دوائی دی ہے۔" رحیم داد نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔

کرامت آگے بڑھا اور سرھانے بیٹھ کر آہستہ آہستہ رحیم داد کا سر دبانے لگا۔ رحیم داد چپ لیٹا رہا۔ سر دباتے دباتے کرامت نے دبی زبان سے پوچھا "سئیں! تو نے مالھان کے بارے میں کیا سوچا؟"

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا "تو آیا کب؟"

"میں تو جی کل ہی آ گیا تھا۔" کرامت نے جواب دیا۔ "پر مجھے مالھان لے کر ضرور جانا ہے۔ دے دے تو سویرے سویرے بھکر چلا جاؤں گا۔"

"سردار کو پتہ ہے، تو یہاں ہے؟"

"نہیں سئیں! اُسے بالکل پتہ نہیں۔" وہ آہستہ سے بولا "اُسے میرے آنے کا پتہ بھی نہ لگے۔ میں چاہتا ہوں اُس کی واپسی سے پہلے ہی یہاں سے چلا جاؤں۔ تو نے دیکھ

ہی لیا۔ اُس روز تیرے کمرے میں مجھے دیکھ کر وہ کتنا ناراض ہوا تھا۔ اُسے پتہ چل گیا تو سئیں وہ بہت ظلم کرے گا۔ اس کا گصہ بہت خطرناک ہے۔"

رحیم داد چند لمحے ٹکٹکی باندھے سامنے کی دیوار تکتا رہا۔ دیوار پر کرامت کا سایہ لیمپ کی روشنی میں دھیرے دھیرے ہل رہا تھا۔ رحیم داد نے لمبی سانس بھری۔ اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھری۔ "کرمے! سچ سچ بتا، وہ تیری بھین تو نہیں ہے؟"

"توبہ کرو جی۔" وہ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "سئیں! تو نے تو حد کر دی۔ وہ میری بھین کیسے ہو سکتی ہے۔ میں تو حویلی کا بہت معمولی نوکر ہوں۔"

"سردار کی رکھیلی ہے؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"سئیں! تو کیسی گالھ کر رہا ہے؟" کرامت کے لہجے میں ناگواری کا پہلو نمایاں تھا۔ "تیکوں ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔"

"فیر کون ہے وہ؟" رحیم داد نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تو بتاتا کیوں نہیں۔ صاف صاف بات کر۔"

"سئیں! میں صاف صاف بات نہیں کر سکتا۔" وہ عاجزی سے بولا۔

"نہیں بتاتا تو نہ بتا۔" رحیم داد جھنجلا کر بولا۔ "میں تجھے بالٹھان نہیں دوں گا۔ ہرگز نہیں دوں گا۔" اس نے نظریں اٹھا کر کرامت کے چہرے کی جانب دیکھا اور سیدھی سیدھی دھمکی دی۔ "تو نہیں بتائے گا تو بالٹھان سردار کو دے دوں گا۔"

"سئیں! ایسا نہ کرنا۔" کرامت کا پورا جسم لرز اٹھا۔ رحیم داد نے بھی اُس کی شدید پریشانی محسوس کی۔ کرامت نے رحیم داد کا سر دبانا بند کر دیا۔ چند لمحے بت بنا بیٹھا رہا۔ پھر اس کی مدھم آواز ابھری۔ "سئیں! کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔" اُس نے مڑ کر دروازے کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اُس کے لہجے میں ہلکی ہلکی تھرتھراہٹ پیدا ہو گئی۔ "سئیں! سچی گالھ یہ ہے کہ وہ ملوک زادی ہے۔" کرامت بات کہتے کہتے لمحہ بھر کے لیے رُکا پھر اس نے بتایا۔ "وہ سردار کی بھین ہے سئیں۔"

رحیم داد نے حیرت سے کہا۔ "تیرا مطلب ہے وہ مراد خاں کی بھین ہے۔" وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ "کرمے! تو سچ کہہ رہا ہے؟"

"ہا سئیں! بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔" وہ نہایت اعتماد سے بولا۔ "وہ سردار کی سگی وڈّی بھین ہے۔ اُس کا ناں حمیدہ ہے۔"

رحیم داد مخمصے میں پڑ گیا۔ اُس نے کھنکار کر گلا صاف کیا، رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "تو نے میرے پاس اُس کے آنے سے پہلے ہی یہ بات کیوں نہیں بتائی؟"

"سئیں! اس نے منع کر دیا تھا۔ میں اس کے حکم کے خلاف کیسے بول سکتا تھا۔" وہ صفائی پیش کرنے لگا۔ "میں مصیبت دا ماریا غریب نوکر ہوں۔" وہ گڑگڑانے لگا۔ "سردار کو بالکل پتہ نہ چلے۔ وہ جی بہت ظالم ہے۔ اسے پتہ چل گیا تو مجھے جان سے مار دے گا۔ تجھے بھی نہیں چھوڑے گا۔" اُس نے گہری سانس بھری۔ "اسی بھین کے چکّر میں پہلے بھی دو خون کر چکا ہے۔"

"کون تھے وہ؟" رحیم داد نے سراسیمہ ہو کر پوچھا۔

"ایک تو کوندراں والی کا وڈّا زمیں دار ہوتا تھا۔ تیری ہی طرح وہ بھی سردار کا یار تھا۔ حویلی کے دیرے میں کچھ روز کے لیے مہمان کے طور پر ٹھیرا تھا۔ ایسا ڈاڈھا چنگا جوان تھا، تجھے کیا بتاؤں۔" کرامت رک رک کر بتاتا رہا۔ "دوسرا سردار کا کم دار تھا۔ یہ کریم بخش رادھانی تو پچھلے ہی سال لگا ہے۔ اس سے پہلے جو کم دار ہوتا تھا، اُس کا ناں اکبر خاں نیازی تھا میانوالی کا رہنے والا تھا۔ اچھّا روپ رنگ تھا۔ جڑیّا جوان تھا۔"

رحیم داد نے کہا۔ "پولس شولس نہیں آئی؟"

"پولس کیسے آتی سئیں!" کرامت نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پولیسے بھی اِدھر آتے ڈرتے ہیں۔" اس کے لہجے سے خوف اور گھبراہٹ کا عنصر ختم ہوتا جا رہا تھا۔ "سارے وڈّے افسروں سے سردار کی یاری ہے۔ اُس کے ساتھ بیٹھ کر روز ہی رات کو پیتے پلاتے ہیں۔"

رحیم داد اس کی باتیں سن کر گہری خاموشی میں ڈوب گیا۔ کرامت نے اُسے اس طرح

گم صم پایا تو کرید کے پوچھا: "سئیں تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

"حمیدہ کا گھروالا نہیں ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"گھروالا کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ بولا۔ "اس کا پرنا ہی کب ہوا۔" اس نے چوکنا نظروں سے ایک بار پھر دروازے کی جانب دیکھا۔ "سردار اُس کا پرنا کرنا ہی نہیں چاہتا۔"

رحیم داد کو یہ سن کر سخت تعجب ہوا کہ حمیدہ کا اب تک بیاہ نہیں ہوا اور شاہانی اس کا بیاہ کرنا بھی نہیں چاہتا۔ وہ الجھن میں پڑ گیا۔ اس نے یہ راز معلوم کرنے کی غرض سے دریافت کیا۔ "کرمے! یہ تو بتا، سردار نے اب تک حمیدہ کا پرنا یا ویاہ کیوں نہیں کیا؟"

"گالھ یہ ہے سئیں" کرامت نے بتایا۔ "حمیدہ کا پرنا ہو گیا تو اس کے ساتھ زمیں داری کا حصہ بھی دینا ہوگا۔ اب تو جی اس کی عمر بھی زیادہ ہو گئی۔ اس سے چھوٹی بہن رشیدہ ہے۔ اس کا بھی پرنا نہیں ہوا۔ اس کی عمر بھی پکی ہوتی جا رہی ہے۔ وہ بھی سردار سے وڈی ہے۔ سردار سب سے چھوٹا ہے۔ اس کا کوئی بھائی نہیں۔ صرف دو بھینیں ہیں۔ تب ہی تو وہ نہیں چاہتا کہ زمیں داری کم ہو جائے۔ وہ تو زمیں داری بڑھانا چاہتا ہے۔" اس کے ہونٹوں پر زہر خند ہویدا ہوا۔ "اِدھر کے تو سارے ہی جگیر دار اور وڈے زمیں دار ایسا ہی کرتے ہیں۔ ان کی بھینیں اور بیٹیاں بنا پرنے کے حویلیوں کے کمروں میں بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو جاتی ہیں اور جی ان کی کڑی نگرانی کی جاتی ہے۔"

"نگرانی کی جاتی ہے تو حمیدہ اس طرح رات کو کیسے میرے کمرے میں چلی آئی؟" رحیم داد نے پوچھا۔ "اسے بلا کر تو ہی تو لایا تھا نا؟"

"اس کی مرضی جو تھی۔ مجھے اس نے بخشش میں پنج روپے بھی دیئے تھے۔" کرامت نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "وہ شام کو تجھے حویلی کے چوک میں ٹہلتے دیکھ چکی تھی۔ اسے یہ بھی پتہ تھا کہ ڈیرا خالی ہے۔ تیرے سوا نہ کوئی مہمان ہے، نہ نوکر۔" اس کا لہجہ مدھم ہو گیا۔ اس پر سنجیدگی غالب آ گئی۔ "جوانی تو جی بری ہوتی ہے۔ بس وہ چلی آئی۔" اس نے قدرے توقف کیا، پھر مسکرا کر گویا ہوا۔ "ابھی تو جی وہ جوان ہی ہے۔ سوہنڑی بھی ہے۔ ویسے سئیں، ایک گالھ

اور بھی ہے۔ اس کا مغز ٹھیک سے کام نہیں کرتا۔ کبھی کبھی تو اتنی چیختی چلاتی ہے کہ دور دور تک اس کی آواز جاتی ہے۔"

چند ہی روز پہلے حویلی کے زنان خانے سے نسوانی چیخیں رحیم داد نے بھی سنی تھیں اور سردار مراد خاں شاہانی انہیں سنتے ہی گھبرایا ہوا اٹھ کر زنان خانے میں چلا گیا تھا۔ ذہن میں اس پس منظر کے ساتھ رحیم داد نے کہا۔" ایک رات تو میں نے بھی سنیں تھیں۔ حمیدہ ہی چیختی چلاتی ہو گی پر وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟"

"اس کے تو سئیں چیختے چیختے ہاتھ پیر بھی اکڑ جاتے ہیں۔ منہ سے سفید سفید جھاگ نکلتا ہے۔"

"مرگی تو نہیں ہے اسے؟" رحیم داد کے چہرے پر پریشانی کا غبار بکھر گیا۔ اُسے معاً حکیم نذر محمد چشتی یاد آگیا جسے مرگی کا دورہ پڑنے کے دوران اس نے نہر باری دوآب کے پار ویران ٹیلوں کے درمیان بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔

"مرگی شرگی بالکل نہیں ہے۔" کرامت نے رحیم داد کی غلط فہمی رفع کرنے کی کوشش کی۔" اُسے تو جی جن تھیون ہے۔ آسیب بتاتے ہیں۔ جب اس پر جن آتا ہے تو اس کی آنکھیں لال انگارا ہو جاتی ہیں۔ ایسی لال لال کہ دیکھ کر خوف آتا ہے۔ اس وکھت تو سئیں اس کی آواز بھی بدل کر ایک دم بھاری ہو جاتی ہے۔ کسی زنال یا رن کی آواز ہی نہیں رہتی لگتا ہے کوئی مرد بول رہا ہے۔"

"اس کا دوا دارو نہیں کرایا گیا؟"

"ماں آسیب اتارنے کے لیے کتنے ہی پیروں فکیروں اور اللہ والوں کو بلا چکی ہے۔ اس کا اپنا خاندانی پیر بھی ہے۔" کرامت دھیمے لہجے میں حمیدہ کے بارے میں بتاتا رہا۔ کسی نے تعویذ دیا کسی نے جھاڑ پھونک کی۔ ماں اُسے زیارتوں اور خانقاہوں پر بھی لے گئی۔ منتّ بھی مانی۔ پر سئیں! کچھ نہیں ہوا۔ جن اب تک اس پر آتا ہے۔ تب ہی تو سردار بھی اس سے ڈرتا ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔" ڈرتا تو جی سچ پوچھو وہ اس کے آسیب سے ہے۔ اُسے

توکبھی کچھ نہیں کہتا پر اس کے یاروں کو ضرور کتل کرا دیتا ہے۔ وہ تو میرے سامنے ہوئے پہلے بھی ہو چکے ہوں گے۔"

رحیم داد کی سٹی گم ہوگئی۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ آہستہ سے پلنگ سے اترا۔ کونے میں رکھے ہوئے ٹرنک کے پاس گیا، اسے کھولا، اندر سے سونے کا کنٹھا نکالا۔ کرامت کے پاس پہنچا۔ کنٹھا کرامت کے حوالے کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "لے، یہ حمیدہ کو دے دینا۔" اس نے تیکھی نظروں سے گھور کر کرامت کو دیکھا۔ "کرمے! دیکھ آگے نہ تو میرے پاس کبھی آنا اور نہ حمیدہ کو لانا۔" اس کا لہجہ تلخ ہوگیا۔ "ورنہ سردار مجھے بھی کتل کرا دے گا اور تجھے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔" رحیم داد کے چہرے پر خوف کا سایہ منڈلانے لگا۔ "میں نوں اچھی طرح پتہ ہے سردار کتنا ظالم اور خوں خوار ہے۔"

"سئیں! تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔" کرامت نے آہستہ سے کہا۔ "ایک گالہہ تو تیکوں بتانا بھول ہی گیا۔" اس نے ہاتھ میں دبا ہوا کنٹھا رحیم داد کے سامنے کر دیا۔ "یہ مالھان حمیدہ کی نہیں، اس کی بھرجائی کی ہے۔ وہ سردار کی ذال ہے۔ تب ہی تو حمیدہ اس مالھان کے لیے اتنی پریشان اور گھبرائی ہوئی ہے۔ اسے لینے تو وہ تیرے پاس ضرور آجاتی۔ لگتا ہے اسے موکع نہیں ملا۔ ویسے اس کی بھرجائی کو مالھان کے بارے میں ابھی تک کچھ پتہ نہیں۔"

رحیم داد نے جیب سے دس دس کے دو نوٹ نکالے اور کرامت کو دیتے ہوئے بولا۔ "یہ رکھ لے اور اب تو ٹر جا۔ سویرے سورج نکلنے سے پہلے یہاں سے نکل جانا۔ تیرا اس پنڈ میں زیادہ ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں۔"

کرامت نے نوٹ لے کر کنٹھے کے ساتھ ہی اپنے منجھلے کے ڈب میں احتیاط سے رکھے اور رحیم داد سے رخصت ہوتے ہوئے گویا ہوا۔ "سئیں، تو راضی سکھی ہو۔" وہ آگے بڑھا اور دروازہ کھول کر کمرے سے چلا گیا۔

رحیم داد بستر پر بت بنا بیٹھا رہا۔ ذرا ہی دیر بعد اس نے سنا، کتے زور زور سے بھونک رہے تھے۔ وہ خوف زدہ ہوگیا۔ جلدی سے دروازے پر پہنچا۔ ایک پٹ کھول کر

باہر دیکھا۔ کہر کی دھند اس قدر گاڑھی تھی کہ اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ حویلی کے احاطے کے باہر کتّوں کے بھونکنے کی آوازیں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔

رحیم داد نے دروازہ بند کیا اور نڈھال ہو کر بستر پر دراز ہوگیا۔ وہ خود کو تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا، ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ کتّے اب حویلی سے کہیں دور بھونک رہے تھے۔ ان کی آوازیں رفتہ رفتہ رات کی خاموشی میں ڈوب کر ختم ہوگئیں مگر رحیم داد دیر تک جاگتا رہا اور مراد خاں کی بڑی بہن حمیدہ کے بارے میں سوچتا رہا۔

☆

مراد خاں شاہانی سہ پہر کو شکار سے واپس آگیا۔ وہ کئی خرگوش اور بہت سی مرغابیاں مار کر لایا تھا۔ واپسی پر وہ سیدھا رحیم داد کے پاس پہنچا۔ اس کا حال معلوم کیا۔ رحیم داد کی طبیعت اب ٹھیک تھی۔ بخار اتر چکا تھا۔ سر میں درد بھی نہیں تھا۔ سردار شاہانی اس کے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھیرا۔ کچھ دیر شکار کے بارے میں باتیں کرتا رہا پھر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ بہت تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔

شام کو سردار مراد خاں نے رحیم داد کو اس کمرے میں بلوایا جسے دربار ہال کہا جاتا تھا۔ ہال میں روشنی بھی زیادہ تھی اور فرش پر قالین بچھا تھا۔ مراد خاں اونچی کرسی پر بیٹھا تھا کرسی پر زربفت کا غلاف چڑھا تھا۔ غلاف کا رنگ اڑ کر پھیکا پڑ گیا تھا مگر اس کے سنہری گل بوٹے تیز روشنی میں جھل ملا رہے تھے۔ دو نوکر مستعدی سے کرسی کے پیچھے کھڑے تھے۔

سردار مراد خاں نے اس شام دربار لگایا تھا۔ وہ بارہ کلیوں والا ریشمی پیرہن پہنے ہوئے تھا۔ اس میں سامنے کے رُخ پر دوہرے تسمے لگے تھے جنہیں تنیاں کہا جاتا ہے۔ تین تسمے چاندی کے تھے۔ گریبان اور گلے پر کلابتو لگا تھا۔ تکمہ بھی کلابتو کا تھا۔ سر پر بڑی ریشمی پگڑی تھی۔ کمر پر سنہرا پٹکا تھا۔ یہ وہ خلعت تھی جو اس کے باپ سردار نجیب خاں شاہانی کو انگریزوں کی خدمات کے صلے میں لاٹ گورنر کی جانب سے عطا کی گئی تھی۔ نوانی اور

ڈھانڈلہ سرداروں کو بھی ان کی وفاداری اور خدمات کے صلے میں ایسی ہی خلعتیں دی گئی تھیں۔ یہ خلعتیں جب علاقے کے خیر خواہ اور جاں نثار بلوچ سرداروں کو پیش کی گئی تھیں تو انگریز ڈپٹی کمشنر نے باقاعدہ دربار لگایا تھا۔ وفادار سرداروں کی اعلیٰ خدمات کو سراہا تھا۔ انکی کارگزاری کی تعریف اور توصیف کی تھی۔ ہر خلعت کے ساتھ ایک قیمتی پیش قبض بھی دیا گیا تھا۔ اس کا دستہ سونے اور چاندی سے مرصع تھا۔

انگریز افسروں کی تقلید میں بلوچ سردار بھی دربار لگاتے تھے، خاص طور پر ہر فصل کی کٹائی کے بعد جب وہ اپنے مزارعوں سے طرح طرح کے ٹیکس اور نذرانے وصول کرتے۔ انہوں نے اپنی شاندار حویلیوں میں دربار لگانے کے لیے باقاعدہ ہال تعمیر کرائے تھے۔ یہ دربار ہال کہلاتے تھے۔ مراد خاں کا باپ سردار نجیب خاں بھی اسی ہال میں دربار لگاتا تھا۔ اس موقع پر وہ لاٹ گورنر کی عطا کی ہوئی خلعت پہنتا تھا۔ پٹکے کے ساتھ پیش قبض لگا ہوتا۔ وہ اسی کرسی پر بیٹھتا تھا جس پر اس وقت مراد خاں شاہانی نہایت آن بان اور کر و فر سے بیٹھا تھا۔ وہ بھی سنہرے پٹکے کے ساتھ مرصع دستے کا پیش قبض لگائے ہوئے تھا۔ اس کی مونچھیں موم لگا کر حویلی کے نائی نے بڑی مہارت سے چڑھائی تھیں، نوکیلی اور سخت بنائی تھیں۔

سردار مراد خاں شاہانی کے کندھوں پر کشمیری شال پڑی تھی۔ وہ بہت وجیہہ اور باوقار نظر آرہا تھا۔ چہرے سے رعب اور دبدبہ ٹپک رہا تھا۔

دربار ہال کے باہر گاؤں کے مزارع ٹھنڈے فرش پر جگہ جگہ ٹولیوں میں بٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ وہ سرگوشیوں میں آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔ ان میں اکثریت بوڑھوں کی تھی۔ وہ خریف کی فصل کی کٹائی کے بعد اپنے بیٹوں، بیٹیوں، بھائیوں اور بہنوں کی شادی کرنا چاہتے تھے مگر شادی سے پہلے سردار کی اجازت حاصل کرنا ضروری تھا۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی شادی بیاہ نہیں ہوسکتا تھا۔ شادی کی اجازت کے لیے انہیں سردار کو نذرانہ پیش کرنا پڑتا جسے ڈالی کہا جاتا ہے۔ یہ پرنا ٹیکس تھا۔ اس ٹیکس کی شرح فی مربع ایکڑ زیر کاشت رقبے پر تیس روپے مقرر تھی۔ دوسرے ٹیکسوں کے برعکس پرنا ٹیکس کی وصولی غلے کے بجائے

نقدی کی صورت میں کی جاتی ہے، البتہ کاردار فصل کی کیفیت کے مطابق ٹیکس یا ڈالی کی مقررہ رقم میں کمی بیشی کی سفارش کر سکتا تھا۔ ایسی سفارش سردار عام طور پر منظور کر لیتا تھا۔ علاقے کا ہر جاگیردار اور بڑا زمیں دار پرنا ٹیکس وصول کرنا اپنا حق سمجھتا تھا۔

کریم بخش رادھانی ایک کرسی پر سردار مراد خاں شاہانی کے بائیں طرف بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے چھوٹی سی میز تھی۔ میز پر رجسٹر رکھا تھا۔ پہلے ایک بوڑھا ہال میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ بیوی بھی تھی۔ دونوں کے درمیان ان کی نوجوان بیٹی تھی۔ وہ دوپٹے سے اپنا چہرہ ناک تک چھپائے ہوئے تھی۔ تینوں سہمے ہوئے آگے بڑھے۔ انہوں نے پیشانی تک ہاتھ اٹھا کر سردار کو سلام کیا۔ بیٹی چند قدم آگے بڑھنے کے بعد سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ بوڑھا باپ بھی اس کے ساتھ ہی رک گیا۔ البتہ ماں آگے بڑھتی گئی۔ اس نے سردار مراد خاں شاہانی کی درازیٔ عمر اور ترقی کے لیے گڑگڑا کر روائتی دعائیہ جملے کہے، جھک کر اس کے پیروں کو ہاتھ لگایا اور الٹے قدموں واپس بیٹی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے واپس آنے کے بعد لڑکی کا باپ آگے بڑھا۔ اس نے بھی سردار کے قدم چھوئے۔ بیوی کی طرح اونچی آواز سے دعائیں دیں۔

"سئیں سدا جیوے۔ سکھی صحت ہووے۔ رب راضی ہووے یرا!"

بوڑھے نے جیب سے نوٹ نکالے اور دونوں ہاتھوں پر رکھ کر سردار مراد خاں شاہانی کو ڈالی پیش کی۔ سردار نے نوٹوں پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر ہٹا لیا۔ بوڑھے نے ٹیکس کی رقم کریم بخش رادھانی کو دے دی۔ اس نے رقم لے کر رجسٹر میں اندراج کر لیا۔ بوڑھا ہاتھ باندھ کر بیوی اور بیٹی کے ساتھ سردار کے روبرو نظریں جھکائے کھڑا رہا۔

سردار مراد خاں نے مسکرا کر کہا۔ "راضی باضی ہو۔ دھی کا پرنجن کر۔ بختاور ہووے۔" یہ سردار کی جانب سے شادی کی اجازت تھی۔

بوڑھے نے خوش ہو کر دونوں ہاتھ اٹھائے اور بلند آواز سے بولا۔ "رب راکھا، اللہ بیلی۔" وہ پیچھے ہٹا اور بیوی اور بیٹی کے ساتھ ہال سے چلا گیا۔

دوسرا آیا۔ وہ ادھیڑ تھا۔ وہ بیٹے کے بیاہ کا طلب گار تھا۔ وہ بھی بیوی اور نوجوان بیٹے

کو حسب دستور ساتھ لایا تھا۔ اس نے پرنا ٹیکس ادا کیا۔ اجازت حاصل کی اور سردار کی جان و مال کو دعائیں دیتا رخصت ہوگیا۔

اسی طرح دوسرے بھی بیٹی یا بیٹے کو اور اگر بیوی حیات ہوتی تو اسے بھی ساتھ لاتے۔ سردار شاہانی کی اجازت حاصل کرتے اور خوش و خرّم دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوتے۔ چار ایسی عورتیں بھی بیٹی یا بیٹے کے ہمراہ سردار کے روبرو حاضر ہوئیں جن کے شوہر انتقال کر گئے تھے یا بیمار اور معذور تھے یا طلاق دے کر چھوڑ چکے تھے۔ ایسے نوجوان بھی آئے جن کے ماں باپ مر چکے تھے اور وہی اپنے کنبے کے کفیل تھے۔ وہ بہن یا بھائی کے بیاہ کی اجازت لینے سردار کے دربار میں حاضر ہوئے۔ پرنا ٹیکس نذرانے کی صورت میں پیش کیا اور مسکراتے چہروں کے ساتھ دعائیں دیتے واپس گئے۔

رحیم داد خاموش بیٹھا سردار مراد خاں کا طنطنہ اور جاگیردارانہ جاہ و جلال دیکھتا رہا۔ اس نے اس نوجوان کو بھی دربار میں حاضر ہوتے دیکھا جس کا لباس بہت میلا کچیلا اور بوسیدہ تھا۔ دبلا پتلا مریل جسم، ڈاڑھی بڑھی ہوئی، چہرے پر ویرانی برستی ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی تھی۔ وہ ملگجے دوپٹے سے اپنا چہرہ چھپائے ہوئے تھی۔

دونوں ڈرے سہمے لرزتے قدموں سے آگے بڑھے۔ لڑکی چند قدم چل کر دستور کے مطابق رک گئی۔ نوجوان آگے بڑھا، سردار کے قریب پہنچا، اس کے قدموں کو ہاتھ لگا کر پیر بیں پودن کیا۔ سر سے پگڑی اتاری اور سردار کے قدموں پر ڈال دی۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹا اور ہاتھ باندھ کر سردار کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئیں تھیں۔ اس نے دوسروں کی طرح سردار کو ڈالی کی رقم پیش نہیں کی تھی۔

سردار مراد خاں نے اسے گھور کر دیکھا، رعب دار لہجے میں ڈپٹ کر بولا "کیا چاہتا ہے؟"

وہ عاجزی سے گویا ہوا۔ "سئیں سردار! میں تیرا راجی رعیت ہوں۔ شامت دا ماریا ہوں۔ میرے کھیت کھارے دریا کنارے ہیں۔ پچھلی برکھا میں دریا چڑھا۔ ایک رات اچانک زبردست ڈھا آیا۔ میری ساری رڑھ فصل، چھل میں بہہ گئی۔ پانی کا ریلا گھر بار، جمع جتھا،

سب کچھ بہالے گیا۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔ رات کے اندھارے میں ڈھا کا پانی تیزی سے داخل ہوا، سب جان بچانے کے لیے مجدھر منہ اٹھا اُدھر بھاگے۔ جن کو بھاگنے کا رستہ نہ ملا وہ درختوں پر چڑھ گئے۔"

اس نے ہاتھ اٹھا کر لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔"یہ میری بھین ہے۔ یہ میرے ساتھ کسی نہ کسی طرح نکل آئی۔ اماں اندھی تھی، وہ نہیں آسکی۔" اس نے دل گرفتہ ہو کر ٹھنڈی سانس بھری۔" بعد میں اس کی لاش دو میل آگے دریا کنارے ملی۔" وہ گڑگڑاتے لگا۔"سئیں! میں مصیبت دا ماریا بالکل تباہ ہو گیا۔"

سردار مراد خاں نے مڑ کر رادھانی کی جانب دیکھا۔"ٹھیک کہہ رہا ہے یہ؟"

"سئیں! ابھی بتاتا ہوں۔" رادھانی نے سردار سے مہلت مانگی اور نوجوان کی جانب متوجہ ہوا۔" تیراناں کیہ ہے؟"

وہ لکنت سے بولا۔"سئیں! میراناں فرید خاں شاہانی ہے۔"

"یوں کہہ تو فریدا ہے۔" کریم بخش رادھانی نے درشت لہجے میں اس کے نام کی تصیح کی۔ فریدا نے جھٹ اپنی غلطی تسلیم کرلی، عاجزی سے بولا۔" ہا سئیں! میں فریدا ہی ہوں۔ میں تو تیرے پاس پہلے بھی آتا رہا ہوں۔"

رادھانی نے فریدا کی بات نظر انداز کرتے ہوئے سردار مراد خاں شاہانی کو مخاطب کیا۔ "سئیں سردارا! یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس کی فصل اور گھر بار سیلاب میں برباد ہو گئے۔"

مراد خاں نے سرسری نظر سے فریدا کو دیکھا، بے زاری سے پوچھا۔" جب تجھے ڈالی نہیں دینی تو یہاں آیا کیوں ہے؟"

"سئیں سردارا! میرے کولہ ڈالی دینے کے لیے کچھ نہیں۔ میں سوالی ہوں، اللہ راسی ہوں، تو فیاضی اے۔" فریدا ہاتھ جوڑ کر فریادی ہوا۔" سئیں میں ابھی ڈالی نہیں دے سکتا۔ ربیع کی واڈھی پر ڈالی کی رکم ادا کر دوں گا۔"

"اس کے پرنے کی نیکوں اتنی جلدی کیوں ہے؟" سردار نے لڑکی کی طرف ہاتھ سے

اشارہ کرتے ہوئے ناگواری سے کہا۔" پہلے ربیع کی بوائی کر۔ فصل کی واڈی کے بعد ڈالی دینا، تب ہی اس کا پرنا کرنا۔"

"سئیں! تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تیرا کہا سر آنکھوں تے، سر ماتھے تے۔" وہ گڑگڑانے لگا۔" پر میں ربیع کی بوائی کیسے کروں گا۔ میرے تو ڈنگر مویشی بھی چھل کا تیز پانی اپنے ساتھ لے گیا۔" اس نے مڑ کر لڑکی کی طرف دیکھا۔" سئیں اس کا پرنا کردوں گا تو اس کا گھوٹ خاوند بوائی کر سکتا ہے۔ اس کے کول ایک جوڑی ہل بھی ہے۔ وہ میرا شریکا ہے اور یہ اس کی منگ ہے۔" اس نے لگا ہیں نیچی کر لیں۔" میں نے اس کا منگڑاں کر دیا پر ڈالی نہ دے سکا۔ سئیں! میکوں معافی دے دے۔"

سردار مراد خاں نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔

فریدا قدرے تامّل کے بعد عاجزی سے گویا ہوا۔" سئیں اس کا پرنا ہو جائے تو میں لائل پور چلا جاؤں گا۔ وہاں کسی کارخانے میں لگ جاؤں گا۔ میرا ایک سکا بلیر وہاں مزدوری کرتا ہے۔ اس نے مجھے لائل پور آنے کو کہا ہے۔"

"فریدے! تو اتنی غریبی میں اس کا پرنا کیسے کرے گا؟ اس کے لیے کچھ نہ کچھ رقم تو چاہیے ہوگی۔" مراد خاں شاہانی نے بے نیازی سے کہا۔

"خرچ ہی کیا کرنا ہے سئیں۔ میں نے تو جی فرض ادا کرنا ہے۔" فریدا نے وضاحت کی۔ "دو سو روپے وستی کے سنار سیٹھ نے ادھار دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اتنی رقم سے کام چل جائے گا۔" وہ ہاتھ جوڑ کر ایک بار پھر گڑگڑانے لگا۔" سئیں سردارا! معافی دے دے۔ میں بہت غریب مسکین ہوں۔" اس نے مڑ کر لڑکی کی جانب دیکھا۔" اس کا پرنا ہوگیا تو ربیع کی بوائی بھی ہو جائے گی۔ میں بھی محنت مزدوری سے کچھ کمائی کروں گا۔ یہ ابھی کنواری ہے، بکرّ ہے۔ میں اسے گھر پر اکیلا چھوڑ کر کیسے لائل پور جا سکتا ہوں۔ اب تو اماں بھی نہیں رہی۔ میری کھیتی باڑی سب تباہ ہو جائے گی۔" اس نے تڑپ کر دہائی دی۔" میکوں بچا لے سئیں! تو سدا جیوے، رب راضی ہووے۔" وہ فریاد کرتا رہا۔

سردار مراد خاں شاہانی خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ اس کا کاردار کریم بخش راد ھانی بھی خاموش تھا۔ مراد خاں نے نگاہیں گھما کر لڑکی کی سمت دیکھا۔ وہ دوپٹے کے آنچل سے اپنا چہرہ چھپائے بت بنی کھڑی تھی۔ مراد خاں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں تیز چمک پیدا ہوئی۔ اس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر پشت پر کھڑے ہوئے ملازم کو مخاطب کیا۔

"جوڑے!" اس نے لڑکی کی جانب اشارہ کیا۔ "اس کے منہ پر سے مانچھلی بلکل تو ہٹا۔"

اللہ بخش جوڑا حکم ملتے ہی لڑکی کے قریب پہنچا۔ لڑکی بے چین ہو کر کسمسائی۔ جوڑا نے اس کی بے چینی اور گھبراہٹ پر مطلق توجہ نہیں دی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور آنچل ہٹا دیا مگر لڑکی کا سر اور سینہ ہنوز دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ لڑکی نے اسے اور ڈھانپ لیا۔

سردار کو لڑکی کی یہ ادا ناگوار گزری۔ اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ اس نے جوڑا کو ڈانٹا۔

"جوڑے! بوچھن بالکل ہٹا دے۔"

اللہ بخش جوڑا نے حکم کی تعمیل میں مستعدی دکھائی۔ پلو پکڑ کر اس قدر زور سے جھٹکا دیا کہ دوپٹہ لڑکی کے سر سے اتر گیا۔ اس نے دوپٹہ ایک طرف پھینک دیا۔ لڑکی شرم سے سمٹ کر دوہری ہو گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ چھپا لیا۔ گردن اور زیادہ جھکا لی۔ اس کی عمر سولہ برس کے لگ بھگ تھی۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا۔ چہرہ بیضوی تھا۔ ناک ستواں، ہونٹ گلابی اور بھرے بھرے تھے۔ دہانہ کسی قدر چوڑا، بدن چھریرا اور سڈول تھا۔ میلے کچیلے بوسیدہ لباس کے باوجود دربار ہال کی تیز روشنی میں اس کا نوخیز سراپا دمک رہا تھا۔ وہ خاصی کشش انگیز نظر آ رہی تھی۔ اس کا بڑا بھائی فرید اسہما ہوا چپ چاپ کھڑا تھا۔

مراد خاں کو لڑکی کا شرمانا لجانا نہایت شاق گزرا۔ اس نے غصے سے ڈپٹ کر کہا۔ "اُٹھ اوپر اٹھا۔" مگر لڑکی نے نظریں اونچی نہ کیں۔ گردن جھکائے دم بخود کھڑی رہی۔ سردار مراد خاں شاہانی کے چہرے پر جھنجلاہٹ طاری ہو گئی۔ وہ زور سے دھاڑا۔ "سر اونچا کر۔ ٹھیک سے کھڑی ہو۔" اس دفعہ لڑکی نے جھجکتے ہوئے گردن اٹھائی۔ مراد خاں کی جانب بے بسی سے دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

مراد خاں نے دیکھا۔ لڑکی کی آنکھیں بھی خوبصورت اور دل کش تھیں۔ وہ زیرِ لب مسکرایا۔ چہرے پر چھائی ہوئی خشونت اور برہمی زائل ہو گئی۔ خوش ہو کر بولا۔ "رنگ روپ سے تو یہ انگوری لگتی ہے۔" اس نے فریدا کی جانب رخ کیا۔ "فریدے! اس کا ناں کیہ ہے؟"

"سیئیں! اس کا ناں حمیدہ ہے۔" فریدا نے سردار کو بتایا۔

رحیم داد نے چونک کر لڑکی کو دیکھا۔ وہ سردار مراد خاں شاہانی کی نہیں، فرید خاں شاہانی کی بہن تھی جو فرید خاں شاہانی نہیں صرف فریدا رہ گیا تھا۔ مراد خاں کا چہرہ بھی متغیر ہو گیا مگر فریدا نے بھی شاید اپنی غلطی محسوس کی۔ وہ ہکلانے لگا۔

"سس سس سیئیں! یہ میدہ ہے میدہ۔ اسے سب میدہ ہی کہتے ہیں۔"

سردار مراد خاں کے چہرے پر چھایا ہوا غبار چھٹ گیا۔ وہ زیرِ لب مسکراتا رہا۔ اس نے اللہ بخش جوڑا کو مخاطب کیا۔ "جوڑے! میدہ کو اس کا بوچھن دے دے۔"

جوڑا نے فرش پر پڑا ہوا دوپٹہ اٹھایا اور لڑکی کے سر پر ڈال دیا لیکن دوپٹہ پھسل کر نیچے گر گیا۔ میدہ خاموش کھڑی رہی۔ اس نے دوپٹے کو ہاتھ نہ لگایا۔ اس کے چہرے پر چھائی حیا پر رفتہ رفتہ جھنجلاہٹ حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ ہال میں گہری خاموشی تھی۔ چند لمحے بعد سردار مراد خاں کی گرج دار آواز خاموشی میں ابھری۔

"جوڑے! میدہ کو اندر پہنچا دے۔"

رحیم داد نے دیکھا، فریدا کی بہن میدہ لمحے بھر تک ہونٹ بھینچے خاموش کھڑی رہی پھر اس نے جھک کر اپنا دوپٹہ اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں ستارے جھلملانے لگے۔ پلکوں پر آنسوؤں کے قطرے ابھرے اور ٹپ ٹپ رخساروں پر ٹپکنے لگے۔ اس نے میلے کچیلے دوپٹے کے آنچل سے ٹکٹکی مار کر ایک بار پھر اپنا چہرہ چھپالیا۔ جوڑا نے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور وہ اس کے پیچھے پیچھے اس دروازے کی سمت بڑھی جو مراد خاں شاہانی کی خواب گاہ میں کھلتا تھا۔

دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ٹھٹکی، مڑ کر فریدا کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں مگر فریدا نے نظریں موڑ کر سر نیچا کر لیا۔ میدہ آگے بڑھی اور سردار مراد خاں کی خواب گاہ میں داخل ہو گئی۔

مراد خاں نے پلٹ کر کریم بخش رادھانی کی جانب دیکھا۔ نرم لہجے میں گویا ہوا۔ "فریدا نے منگنا کرن سے پہلے ڈالی نہ دینے کی معافی چاہی تھی، اسے معافی دے دی گئی۔ پر میدہ اب ادھر ہی رہے گی۔ یہ فیصلہ بعد میں ہوگا کہ میدہ کو کب فریدا کے حوالے کیا جائے۔"

"جیسی سئیں کی مرضی۔" رادھانی نے مستعدی سے جواب دیا اور جھک کر رجسٹر میں سردار کے حکم کا اندراج کر لیا۔

سردار مراد خاں نے فریدا کو مخاطب کیا۔ "فریدے!" وہ کھل کر مسکرایا۔ "نواب نوراضی باضی ہے۔ اپنے حالات ٹھیک کرلے فیر جب چاہے میدہ کا پرنا کرنا، مکلاوا کرنا، اسے اپنے گھر سے بدا کر کے سسرال ساہورے بھیجنا۔ ڈالی کی رکم فصل کی واڈھی پر ادا کر دینا۔" سردار نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "فریدے! جا عیش کر، موجاں اڑا۔ میری طرف سے تجھے میدہ کے پرنے کی اجازت ہے۔"

فرید خاں شاہانی عرف فریدا چند لمحے بت بنا جہاں تھا وہیں کھڑا رہا پھر اس کے جسم میں حرکت ہوئی۔ وہ آگے بڑھا۔ سردار کے قدموں پر پڑی ہوئی اپنی پگڑی اٹھائی، چار پانچ پیچ دے کر اسے سر پر باندھا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر دعائیں دیں۔ "سئیں سردارا! تو سدا جیوے، سکھی صحت ہووے، رب راضی ہووے۔" اس نے نظریں گھما کر اس دروازے کی جانب دیکھا جس میں اس کی بہن اللہ بخش جوڑا کے ساتھ داخل ہوئی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند ہو چکا تھا اور جوڑا واپس آکر سردار مراد خاں شاہانی کی پشت پر مستعدی سے کھڑا ہو گیا تھا۔

فریدا ذرا دیر ٹھہر کر الٹے قدموں پیچھے ہٹا، مڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا دربار حال کے صدر دروازے پر پہنچا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے پشت پر پڑا پگڑی کا شملہ ایک ہاتھ بڑھا کر پکڑا۔ چہرے پر لے گیا اور اس سے رک رک کر آنکھوں کو ملنے لگا۔ رحیم داد نے محسوس کیا کہ وہ رو رہا تھا۔

سردار مراد خاں شاہانی اونچی کرسی پر لباس فاخرہ زیب تن کئے نہایت آن بان سے بیٹھا تھا اس کا چہرہ جاہ و جلال سے دمک رہا تھا۔ فریدا کا چہرہ سر جھکا کر زرد پڑ گیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے بڑھا، دروازہ عبور کیا اور باہر پھیلے ہوئے اندھیرے میں گم ہو گیا۔

۲۹

ہموں والی میں رحیم داد کے قیام کا نواں روز تھا کہ صبح صبح نادر خاں پہنچا۔ رحیم داد کمرے میں ناشتہ کر رہا تھا۔ نادر خاں کو اچانک اپنے روبرو پا کر وہ گھبرا گیا۔ اس نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔

"نادر! تو یہاں کیسے پہنچ گیا۔ کوئی پریشانی کی گل بات تو نہیں؟" اس کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔

"نہیں چوہدری! گھبرانے کی کوئی گل نہیں۔" نادر خاں نے مسکرا کر رحیم داد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "میں تو تیں نوں یہ بتانے آیا تھا کہ تیرے کلیم کا معاملہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ میں نے محکمۂ آبادکاری کے دفتر جا کر اپنے سامنے وہ درخواست ہی پھڑوا دی جو تیرے خلاف لگائی گئی تھی۔ اور جس پر تیرے کلیم کے بارے میں تحقیقات کرنے کے احکامات جاری ہوئے تھے۔ میں نے درخواست کے ساتھ متعلقہ کاغذات بھی ضائع کروا دیئے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔"

وہ اپنی کارگزاری پر مسرور نظر آ رہا تھا۔

"یہ تو نے بہت زوردار کام کیا۔" رحیم داد نے بھی مسرت کا اظہار کیا۔ "اس پر خرچ کتنا آیا؟"

"صرف چار سو روپے۔" نادر خاں نے فخر سے گردن اونچی کی۔ "وکیل اسی کام کے دو ہزار مانگتا تھا۔ چوہدری یہ وکیل تو ایسے ہی چکر چلا کر جیب کاٹتے ہیں۔ میرا تو ان سے بہت معاملہ رہا ہے۔"

نادر خاں ابھی تک رحیم داد کے سامنے کھڑا تھا اور نہایت مستعدی سے اپنی کارگزاری سنا رہا تھا۔ رحیم داد اس کی باتیں سن کر بہت متاثر ہوا۔ ہنس کر بولا۔" تو کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔ آرام سے بات کر۔"

وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوا۔" محکمہ آبادکاری میں جانے سے کئی عجیب باتوں کا پتہ چلا۔" اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔" ایک تو بالکل تعجب انگیز بات کا پتہ چلا۔"

"کون سی ایسی عجیب گل تھی جس پر تجھے اتنا تعجب ہوا؟"

"تیں نوں پتہ ہے۔ تیرے خلاف کس نے درخواست لگوائی تھی؟" نادر خاں نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔

"وکیل بتاتا تھا، گورداس پور ہی کا کوئی مہاجر ہے جس نے میرا کلیم ختم کرا کے اپنے نام کوٹلہ ہرکشن کی آراضی اور حویلی الاٹ کرانے کے لالچ میں درخواست لگائی تھی۔" رحیم داد نے نادر خاں کو مطلع کیا۔" یاد پڑتا ہے، وکیل نے اس کا نام محمد بشیر بتایا تھا۔"

"اس کا تو جی صرف نام ہی نام تھا۔" نادر خاں نے ہنس کر کہا۔" چوہدری! تجھے یہ سن کر بہت اچنبھا ہوگا کہ تیرے خلاف احسان شاہ نے درخواست لگوائی تھی۔"

"تیرا مطلب ہے اپنے شاہ جی نے؟" رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں کہا۔" نادرا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ شاہ جی ایسا نہیں کر سکتا۔" اُس نے نادر خاں کا چہرہ غور سے دیکھا۔" تیں نوں پکا یکین ہے؟"

"پہلے تو جی مجھے بھی یکین نہیں آیا۔" نادر نے اُسے باور کرایا۔" پر میں نے درخواست خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے، اس پر محمد شفیع گیلانی کا پتہ لکھا تھا، دستخط البتہ محمد بشیر کے تھے۔ تو نے پتہ ہے محمد شفیع گیلانی کون ہے؟"

"میں نے تو اس کا نام پہلی بار سنا ہے۔" رحیم داد نے استفسار کیا۔" کون ہے یہ محمد شفیع گیلانی؟"

"وہ شاہ جی کے پتر حسن شاہ کا سگا سالا ہے۔ لہور میں رہتا ہے۔" نادر خاں نے کہا۔ "اُس کی بسیں اور لاریاں چلتی ہیں۔ وڈا ٹرانسپورٹر ہے۔ شاہ جی کا پتر بھی اُس کے کاروبار میں ساجھے دار ہے۔"

"سمجھ نہیں آتی، شاہ جی نے ایسا کیوں کیا؟" رحیم داد بدستور تذبذب میں مبتلا تھا۔ اُس کے رویے سے صاف جھلکتا تھا کہ اُسے نادر کے بیان پر ابھی تک شبہ ہے۔ رحیم داد نے اس کا برملا اظہار بھی کیا۔ "نادر! تو سچ بول رہا ہے؟"

"بالکل سچ بول رہا ہوں جی! مجھے تو محکمہ آبادکاری والوں نے یہاں تک بتایا کہ اس معاملے میں شاہ جی آبادکاری کے افسروں سے کئی بار ملا بھی۔ اُسی کے زور دینے پر الکوائری کرانے کے آرڈر ہوئے تھے۔"

رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پر شاہ جی نے میرے خلاف یہ کاروائی کیوں کی؟ وہ تو مجھے اپنا یار بیلی کہتا ہے۔ تیں نوں بھی پتہ ہے، وہ مجھ سے کتنا پیار کرتا ہے۔"

"تو نے ٹھیک ہی کہا چوہدری! اُس نے ہمیشہ میرے سامنے تیری تعریف کی۔ محبت ہی کا اظہار کیا۔"

"ایسا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نے یہ کاروائی میرے خلاف کیوں کی۔ تُو نے اس بارے میں کچھ سوچا؟"

"مجھے تو ایسا لگتا ہے، شاہ جی نے تیرے خلاف یہ کاروائی اللہ وسایا کی دشمنی میں کی ہوگی۔" نادر نے اظہار خیال کیا۔ "اللہ وسایا کا تو نام سنتے ہی آج بھی شاہ جی کے منہ پر جھنجلاہٹ چھا جاتی ہے حالانکہ اب وہ زندہ بھی نہیں ہے۔ اُسے مرے ہوئے مدت ہو گئی پر شاہ جی کی نفرت کم نہیں ہوئی۔ وہ اس سے سخت نفرت کرتا ہے۔" نادر نے سوالیہ نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "اپنی سمجھ میں تو جی یہی وجہ آتی ہے۔ سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ تجھ سے تو اسے کوئی گلہ شکوہ نہیں۔ جب بھی تیرے بارے میں اس سے بات چھڑی، اُس نے ہر بار تجھے اچھے لفظوں سے یاد کیا۔"

"تیرا خیال ٹھیک لگتا ہے۔" رحیم داد نے نادر خاں سے اتفاق کیا۔ "یہی وجہ ہو سکتی ہے۔ اللہ وسایا سے شاہ جی بہت زیادہ خار کھاتا تھا۔" رحیم داد اب کسی قدر مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر بکھرا ہوا غبار صاف ہوتا جا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ احسان شاہ کے بارے میں اُس کے ذہن میں جو شبہات اور خدشات پیدا ہوئے تھے۔ اب وہ زائل ہو چکے ہیں۔ اُس نے سوچا احسان شاہ نے اللہ وسایا سے عداوت کے باعث ہی اس کا کلیم اور الاٹمنٹ منسوخ کرانے کی کوشش کی ہوگی۔ اُسے یاد آیا کہ درخواست اُس زمانے میں داخل کی گئی تھی جب اللہ وسایا زندہ تھا اور تمام زمین داری کی دیکھ بھال وہی کرتا تھا۔

رحیم داد اسی سوچ میں غرق تھا۔ نادر خاں نے اُسے اس قدر محویت سے سوچتے دیکھا تو خاموش نہ رہ سکا۔ اُس نے دریافت کیا۔ "چوہدری! تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

رحیم داد نے چونک کر نادر کو دیکھا اور بات کا رُخ موڑتے ہوئے دبی زبان سے پوچھا۔ "جمیلہ کا کیا حال چال ہے؟ تو نے پھٹی پر کیڑے مار دوائی چھڑکوا دی تھی اور جمیلہ کو اس کے بارے میں بتا بھی دیا تھا؟"

"وہ تو جی اب پرانی گل ہو گئی۔" نادر خاں نے مسکرا کر بتایا۔ "دوائی تو اُسی روز سپرے کرا دی گئی تھی اور شام ہی کو میں نے اس کے بارے میں زمین دارنی کو بتا بھی دیا تھا۔"

"اب تو پھٹی پر سونڈی نہیں رہی؟"

"نہیں جی، بالکل نہیں رہی۔ سپرے کے بعد ہی ختم ہو گئی۔" نادر خاں نے جواب دیا۔

"زمین دارنی نے پھٹی کے بوٹے خود جا کر دیکھے تھے۔"

"تو اُس سے ملنا ملاتا رہتا ہے؟"

"روز تو جی وہ ملتی نہیں۔ اُسے تو سکول ہی سے فرصت نہیں۔" نادر خاں نے بتایا۔ "پر مجھے جب بھی موقع ملا، اُسے خریف کی داڑھی اور ربیع کی بوائی کے بارے میں ایک ایک بات بتاتا رہا۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ زمین داری میں دلچسپی لے رہی ہے۔" رحیم داد نے کہا۔

"نہیں چوہدری! اُس پر تو آج کل تاجاں کے ویاہ کی فکر زیادہ سوار نظر آتی ہے۔"

رحیم داد نے جھکتے ہوئے پوچھا۔" میرے بارے میں بھی اُس نے کوئی گل بات کی؟"

" مجھ سے تو نہیں پر میری گھر والی سے اُس نے تیرے بارے میں بہت سی باتیں کیں۔" نادر خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔

" کیا کہتی تھی میرے بارے میں؟" رحیم داد نے بے قرار ہو کر دریافت کیا۔" تیری گھر والی نے تجھے بتایا تو ہوگا۔"

نادر خاں کی تیز نظروں نے رحیم داد کی بے قراری فوراً بھانپ لی۔ اس نے شکوے کے انداز میں کہا۔" اُس نے مجھے ساری ہی باتیں بتائیں پر چوہدری! تو نے تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔ میں تو تیرا ہی بندہ ہوں۔ مجھے زمیں داری سے کیا لینا۔"

رحیم داد پریشان ہو کر بولا۔" پہلے یہ بتا، جمیلہ نے میرے بارے میں تیری گھر والی کو کیا کیا بتایا؟"

" وہ تجھ سے بہت ناراض تھی۔" نادر خاں نے کہا۔" چوہدری! تُو نے اپنی گھر والی اور بچوں کے بارے میں جو جھوٹ بولا تھا اُس کا اس نے بہت بُرا منایا۔"

رحیم داد بلبلا کر رہ گیا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ نادر خاں جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ اگر جمیلہ اُس کی بیوی کو یہ بات نہ بتاتی تو اُسے ہرگز علم نہ ہوتا۔ اُس نے نادر کی جانب نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا، خاموش بیٹھا رہا۔ نادر بتاتا رہا۔" اُسے یہ بھی پتہ چل گیا کہ تو چھپ چھپ کر شاہ جی کے پاس جاتا ہے، اُس کی حویلی میں کئی کئی روز ٹھہرتا ہے۔ وہ شاہ جی سے سخت نفرت کرتی ہے۔ کہتی ہے اللہ وسایا کو احسان شاہ ہی نے قتل کرایا ہے۔"

رحیم داد نے دبی زبان سے پوچھا۔" اُس نے تیری گھر والی سے ایسی بات بھی کہی؟" وہ نادر خاں سے یہ بھی دریافت کرنا چاہتا تھا کہ اس کے بارے میں تو جمیلہ نے کوئی ایسی بات نہیں کہی کہ وہ بھی احسان شاہ کے ساتھ اللہ وسایا کے قتل میں شریک تھا۔ مگر یہ بات اس کی زبان پر آتے آتے رہ گئی۔ اُس نے فوراً خود کو سنبھالا، لہجے میں تیکھا پن پیدا کرنے کی کوشش

کی۔" اُسے شاہ جی کے بارے میں ایسی بات نہیں سوچنی چاہیے۔ شاہ جی ایسا نہیں کر سکتا۔ پتہ نہیں اُسے کیسے ایسا شبہ ہوا۔" احسان شاہ کی حمایت دراصل وہ خود اپنے دفاع میں کر رہا تھا۔

"مجھے جی جب اپنی گھر والی سے ان باتوں کا پتہ چلا تو میں بہت پریشان ہوا۔" نادر خاں نے اُس کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے کہا۔" سچی گل پوچھ تو میں نے شاہ جی کے بارے میں زمیں دارنی سے کوئی بات نہیں کی ورنہ وہ مجھ سے بھی ناراض ہو جاتی۔ ناراض نہ ہوتی تب بھی اُس کے دل میں نہ جانے کیسے کیسے شبہات پیدا ہو سکتے تھے۔" اُس نے رحیم داد کو مرعوب کرنے کا سیدھا سادا حربہ استعمال کیا۔" میں نے تو جی صرف تیرے بارے میں اُس سے گل بات کی۔ اُس کے دل میں تیری طرف سے جو ناراضی اور غصہ تھا اُسے دور کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔"

"تو نے اس کی ناراضی ختم کرا دی؟" رحیم داد نے بے اختیار پوچھا۔

"چوہدری! ایسے معاملے میں نے بہت نمٹائے ہیں۔" نادر خاں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔" زمیں دارنی تو زنانی ہی ہے نا۔ میں نے تو جگیرداروں اور وڈے وڈے زمینداروں کے نہ جانے کیسے کیسے الجھے ہوئے جھگڑے نمٹے کرائے ہیں۔" بات کہتے کہتے وہ ٹھٹکا۔ رحیم داد کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔" چوہدری! میں تجھ سے ایک گل پوچھوں، صاف صاف بتائے گا؟"

"پوچھ، کیا پوچھنا چاہتا ہے؟" رحیم داد نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"تو زمیں دارنی سے ویاہ کرنا چاہتا ہے؟" نادر نے رحیم داد کو اور زیادہ مرعوب کرنے کے لیے ہیر پھیر کے بجائے براہِ راست سوال کیا۔

رحیم داد انکار نہ کر سکا۔" میں نے ایسا سوچا تو تھا۔" رحیم داد نے دھیمے لہجے میں بتایا۔ نادر خاں کی توقع کے مطابق وہ خاصا مرعوب نظر آ رہا تھا۔

"تُو نہ بھی بتاتا تب بھی مجھے یہ بات پہلے ہی معلوم ہو گئی تھی۔" نادر خاں اب اس کی شخصیت پر پوری طرح چھا چکا تھا۔

"جمیلہ نے تیری گھر والی کو یہ گل بتائی ہو گی؟" رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں جی!" نادر خاں بولا "ساتھ ہی زمیں دارنی نے یہ بھی بتایا کہ اُس نے صاف انکار کردیا۔" نادر نے اپنا سکّہ اچھی طرح جمانے کے لیے سوال کیا "یہی گل ہے نا؟"

رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا "نادر! تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" اُس کے چہرے پر افسردگی پھیلنے لگی۔

نادر خاں نے اُس کی افسردگی کا فوراً اندازہ کرلیا اور اس کی ہم دردی حاصل کرنے کی غرض سے بولا "چوہدری! پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تو دیکھنا، سب ٹھیک ٹھاک ہوجائے گا۔ تو جو چاہے گا۔ وہی ہوگا۔"

رحیم داد نے مڑ کر کھونٹی پر لٹکی ہوئی اپنی پگڑی دیکھی اور وہ گرہ تلاش کی جو اس نے بھکّر میں تکھے پیر کے مزار پر منّت ماننے کے بعد پگڑی کے شملے میں لگائی تھی۔ گرہ ابھی تک موجود تھی۔ رحیم داد اپنی بے چینی چھپانے کی کوشش کے باوجود چھپا نہ سکا، پوچھنے لگا "تو جو کچھ کہہ رہا ہے، وہ کیسے ہوگا؟"

نادر خاں اس کی دل جوئی کرتے ہوئے شگفتہ لہجے میں بولا "چوہدری! فکر نہ کر۔ جب تُو نے اپنا سمجھ کر مجھے اپنے دل کی بات بتا ہی دی تو یہ بھی سن لے۔ زمیں دارنی لہور شہور نہیں جائے گی۔ حویلی ہی میں رہے گی اور تیری بن کر رہے گی۔" اس نے مسکرا کر رحیم داد کا چہرہ دیکھا اور اس کا ردِ عمل چہرے کے تاثرات سے معلوم کرنے کی کوشش کی۔

رحیم داد خود کو سنبھال نہ سکا۔ جذبات کی رو میں بہہ گیا، تڑپ کر بولا "یقین نہیں آتا نادر؟"

"آجائے گا، آجائے گا" نادر نے بڑے اعتماد سے کہا "پہلے آرام سے میری گل سن لے۔"

"سنا، ضرور سنا" رحیم داد کی بے قراری بڑھتی گئی۔ "میں یہی تو سننا چاہتا ہوں۔ یہ بتا، ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ مجھے صاف صاف بتا۔"

"سب کچھ بتا دوں گا، آرام سے سن" نادر خاں بے تکلفی سے مسکرایا۔ اُسے رحیم داد

کو اپنے قابو میں کرنے کا نہایت مناسب موقع ملا تھا۔ اُس نے رحیم داد کو مطمئن کرنے کی غرض سے کہا۔" مجھے گھروالی کے ذریعے ان باتوں کا پتہ چلا تو میں نے اس کی ڈیوٹی لگائی۔ اسے اچھی طرح سمجھا بجھا کر تیار کیا کہ تیری طرف سے زمیں دارنی کے دل میں جو میل پیدا ہوگیا ہے اسے دور کرنے کی کوشش کرے۔" نادر خاں نے اپنی کارگزاری کی روداد بیٹھ بیٹھ کر سنانی شروع کی۔" میں نے اُسے کہا کہ زمیں دارنی کو سمجھائے کہ چوہدری سیدھا سادا نیک بندہ ہے۔ احسان شاہ کے بہکانے اور پھسلانے میں آگیا۔ میں نے گھروالی سے یہ بھی کہا کہ زمیں دارنی کے سامنے تیری تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ شاہ جی کو برا بھلا بھی کہتی رہے، اُس کے بارے میں کوڑی گلاں کرے۔"

" یہ تو نے اچھا نہیں کیا۔" رحیم داد کو اس کی بات پسند نہیں آئی۔" شاہ جی کو پتہ چل گیا تو بہت نراض ہوگا۔ میں اُس سے بگاڑ کرنا نہیں چاہتا۔"

" چوہدری! تو کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہا ہے۔ شاہ جی کو پتہ ہی کیسے چلے گا۔ زمیں دارنی تو اُسے بتانے سے رہی۔" نادر نے رحیم داد کو بزرگوں کے انداز میں سمجھانے کی کوشش کی۔" یہ تو تجھے بھی پتہ ہے کہ زمیں دارنی کو شاہ جی سے کتنی نفرت اور گھن ہے۔ جب کسی سے سخت نفرت اور گھن ہوتی ہے تو اس کی برائی سن کر خوشی ہوتی ہے۔ مزا آتا ہے۔ شاہ جی کو برا بھلا کہہ کر ہی میری گھروالی زمیں دارنی کی ہمدردی اور اعتماد حاصل کرسکتی ہے اور تیرے بارے میں اس کی بدگمانی دور کراسکتی ہے۔" نادر خاں کھل کر مسکرایا۔" نتیجہ وہی نکلا جو میں نے سوچا تھا۔"

" کیا نتیجہ نکلا؟" رحیم داد نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

" ہوا یہ کہ پہلے جب میری گھروالی تجھے اچھا کہتی اور تیری تعریف کرتی تو زمیں دارنی کے ماتھے پر بل پڑ جاتے۔ منہ بگاڑ کر اسے کہتی۔ جنتؔ! تو چوہدری کو نہیں جانتی۔ وہ بھلا بندہ نہیں ہے۔ یہ بات میری گھروالی نے مجھے کئی بار بتائی۔"

" پر تو کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔" رحیم داد نے بگڑ کر مداخلت کی۔

" آرام سے پہلے پوری گل سن لے۔" نادر خاں نے اُسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

" ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ تیری تعریف سن کر پہلے تو زمیں دارنی خوش نہیں ہوئی تھی پر

جب میری گھر والی نے میری ہدایت پر شاہ جی کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا تو وہ رفتہ رفتہ بدلنے لگی۔ تیرے بارے میں اچھے بول سن کر چپ ہو جاتی نہ اس کے ماتھے پر بل پڑتے نہ منہ بگاڑتی۔" اُس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔" پر اُس کے دل کا میل پوری طرح صاف نہیں ہوا تھا۔"

"کیا ابھی تک صاف نہیں ہوا؟" رحیم داد نے بے صبری سے پوچھا۔

"اب تو صاف ہو چکا ہے۔ دراصل اسے شبہ تھا کہ تو شاہ جی کی حویلی میں ٹھہرا ہے۔ اپنے شبے کا اظہار اُس نے مجھ سے بھی کیا تھا۔"

"کیا پوچھا تھا اُس نے؟"

"ایک روز باتوں باتوں میں اُس نے مجھ سے پوچھا۔ سنا ہے چوہدری آج کل احسان شاہ کے پاس ہوتا ہے۔ تجھے پتہ ہے؟ میں اس کی بات سن کر الجھن میں پڑ گیا۔"

"تو نے کیا بتایا؟" رحیم داد نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"میں کیا بتاتا جی۔" نادر خاں نے جواب دیا۔" وہی کہا جو یہاں آنے سے پہلے تو نے مجھے ہدایت کی تھی۔ میں نے زمیں دارنی سے کہا کہ چوہدری تو اپنے کلیم کے سلسلے میں ملتان گیا ہے۔ تو نے مجھ سے یہی تو کہا تھا نا؟" نادر نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔

"جمیلہ نے تیری بات مان لی تھی؟"

"نہیں،" نادر خاں نے انکار میں گردن ہلائی۔" میری گل سن کر وہ چپ ہو گئی بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اُس نے میری بات پر اعتبار نہیں کیا بلکہ برکت دودھی کے ذریعے کھوج لگایا کہ تو شاہ جی کے پنڈ پیراں والہ میں تو نہیں ہے؟"

"پر میں تو پیراں والہ میں تھا ہی نہیں۔ دوسرے ہی روز لہور چلا گیا تھا۔"

"اچھا ہی ہوا کہ تو وہاں نہیں تھا ورنہ بہت گڑبڑ ہوتی۔" نادر خاں نے کہا۔" وہ مجھے بھی جھوٹا فریبی سمجھتی۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔" میری گل سچی نکلی اور اُسے معلوم ہو گیا کہ تو شاہ جی کی حویلی میں نہیں۔ فیر تو میرے ساتھ اچھی طرح پیش آنے لگی اور میری گھر والی پر تو اتنی مہربان ہو گئی کہ شام کو گھنٹوں بیٹھ کر اُس کے ساتھ باتیں کرتی رہتی۔ گھر والی کی طبیعت

گڑبڑ ہوتی، وہ نہ جاتی تو خود اُسے دیکھنے آتی، دوائی کھلاتی۔ دیر تک اُس کے پاس بیٹھی تسلی دیتی رہتی۔"

رحیم داد نے نادر خاں کی باتوں سے متاثر ہو کر کہا۔" ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ بیمار کوئی بھی پڑے۔ جمیلہ دوائیوں کا بکسہ اُٹھائے فوراً پہنچ جاتی ہے، دوائی دیتی ہے، دیکھ بھال کرتی ہے۔ اس معاملے میں اس کا دل بہت کھلا ہوا ہے۔"

"بالکل ایسا ہی ہے۔ میرا تجربہ بھی یہی بتاتا ہے۔" اس نے رحیم داد کی تائید کی۔" سچ تو یہ ہے چوہدری! جتنی سوہنی ہے، من کی بھی اتنی ہی سوہنی ہے۔" اُس نے رحیم داد کا چہرہ دیکھا جو خوشی سے سرخ ہو رہا تھا۔" اب یہی دیکھ، جب ہفتہ بھر سے اوپر ہوگیا اور تو واپس نہیں پہنچا تو وہ پریشان ہوگئی۔"

"تیں نوں کیسے پتہ چلا کہ وہ پریشان ہوگئی۔"

"ہوا یہ کہ ایک روز وہ مجھ سے کہنے لگی۔ نادرا لگتا ہے چوہدری نراض ہو کر یہاں سے چلا گیا۔ اس کا ادھر کوئی بھی تو نہیں۔ کہاں جائے گا۔ کس کے پاس جائے گا۔ فیر یہ زمیں داری بھی تو اسی کی ہے۔ مجھے اس سے کیا لینا۔ یہ باتیں جب اس نے مجھ سے کہیں تو اس کے منہ پر پریشانی صاف نظر آرہی تھی۔"

"تو سچ کہہ رہا ہے نادر؟" رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔

"اب میں تجھے صاف صاف ہی بتا دوں۔"

"میں صاف صاف ہی سننا بھی چاہتا ہوں۔" اس کی بے قراری سارے بندھن توڑ کر سامنے آگئی۔

"چوہدری! سچ تو یہ ہے کہ میں اسی کے کہنے پر ادھر آیا ہوں۔"

"تو اس کے کہنے پر ادھر آیا ہے؟"

"ہاں جی، بالکل یہی گل ہے۔" نادر خاں نے رحیم داد کو باور کرایا۔" زمیں دارنی نے مجھے کہا کہ میں تجھے منا کر کوٹلہ ہرکشن واپس لے آؤں۔"

"اسے پتہ تھا کہ میں یہاں ہوں ؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "اُسے کیسے پتہ چلا؟"

"نہیں چوہدری! ایسی کوئی گل بات نہیں۔" نادر خاں نے اس کی غلط فہمی رفع کی۔ "اس کا خیال تھا کہ تو ملتان میں ہوگا اور محکمہ آبادکاری سے تیرا پتہ معلوم ہو جائے گا۔ میں نے کیا بھی ایسا ہی۔ سیدھا ملتان پہنچا۔ وہاں دو روز ٹھہر کر تیرے کلیم کا معاملہ طے کرایا اور کوٹلہ ہرکشن لوٹنے کی بجائے سیدھا شاہ جی کی حویلی پہنچا۔ وہاں شیدا سے پتہ چلا کہ تو مراد خاں شاہانی کے ساتھ بھکر گیا ہے۔ بھکر گیا تو معلوم ہوا تو اِدھر ہے۔ سو میں یہاں آگیا۔"

"اچھا ہی ہوا کہ تو یہاں آگیا۔" رحیم داد خوش ہو کر بولا۔ "تیرے آنے سے بہت سی باتوں کا پتہ چل گیا ورنہ میں تو پریشان تھا۔ سوچ رہا تھا کہ شاہ جی کے پاس جاؤں۔ اس سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد کوٹلہ ہرکشن لوٹنے کا فیصلہ کروں۔ مجھے جمیلہ کی ناراضی نے بہت تنگ کر رکھا تھا۔"

"پر اب تو وہ تجھ سے ذرا بھی ناراض نہیں۔ جی چاہے تو اور گھوم لے۔ پنڈ پہنچ کر خود معلوم کر لینا کہ زمیں داری تجھ سے کس طرح پیش آتی ہے۔ اب وہ بہت بدل چکی ہے۔ تیری طرف سے اس کا دل بالکل صاف ہو چکا ہے۔"

"یہ سب تو نے ہی کیا ہے۔" رحیم داد نے نادر خاں کی کارگزاری سے خوش ہو کر اپنے ردِعمل کا اظہار کیا۔ "سچ پوچھ، میں تو سمجھتا تھا کہ جمیلہ کی خفگی اب کبھی ختم نہ ہوگی۔ بات ہی اس طرح بگڑی تھی کہ میں چاہتا بھی تو اس کے دل کا میل صاف نہ ہوتا۔" وہ بے ساختہ ہنسنے لگا۔ "پر نادر! تُو نے تو کمال ہی کر دیا۔ شاہ جی سچ کہتا ہے، نادر تو بہت کام کا بندہ ہے۔"

نادر خاں کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی مگر اس نے انکسار سے کام لیا۔ "چوہدری! یہ تو کوئی ایسا پیچیدہ معاملہ نہیں تھا۔ تیری مہربانی چاہیے۔ آگے اس سے بھی زبردست کام کر کے دکھاؤں گا۔ ابھی تیری ملازمت کرتے مجھے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔"

"فکر نہ کر۔ اب تو ہمیشہ میرے پاس رہے گا۔ میں نوں تیرے ہی جیسے وفادار اور ہوشیار بندے کی ضرورت تھی۔" رحیم داد نے نادر خاں کا عندیہ معلوم کرنا چاہا۔ "اب یہ بتا، کیا

مجھے تیرے ساتھ ہی واپس چلنا چاہیے؟ ویسے مراد خاں مجھے ابھی جانے نہیں دے گا۔" اس نے اچانک بات کا رخ موڑ دیا۔" اور ہاں، یہ تو بتا، شاہ جی اپنے پنڈ واپس پہنچ گیا کہ نہیں؟"

"جب میں پیراں والہ میں تھا تب تک وہ نہیں لوٹا تھا" نادر خاں نے بتایا۔" شیدا کہتا تھا کہ شاہ جی پیراں والہ واپس آنے سے پہلے کراچی جائے گا۔ وہاں اسے کچھ ضروری کام ہے۔ مجھے تو اس کا لمبا ہی پروگرام لگتا ہے۔"

" ویسے اب شاہ جی سے ملنے اور مشورہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔" رحیم داد نے اپنا ارادہ بدل دیا۔" تو نے سب کچھ ٹھیک ٹھاک کرا دیا اب شاہ جی سے مل کر کیا لینا۔" اس نے سوالیہ نظروں سے نادر خاں کو دیکھا۔" سچ پوچھ تو مجھے اب شاہ جی کے پاس جانا بھی نہیں چاہیے۔ جمیلہ کو پتہ چل گیا تو فر نراض ہو جائے گی۔ تیری کیا رائے ہے؟"

"چوہدری! تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ تجھے اب شاہ جی سے ملنے جلنے میں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔" نادر خاں نے اس کی تائید کرنے کے ساتھ ساتھ مشورہ بھی دیا۔" اچھا تو یہی ہے کہ کچھ عرصے کے لیے تو شاہ جی سے دور ہی رہ بلکہ میں بھی اس کے پاس نہیں جاؤں گا۔ دراصل زمیں دارنی کو شاہ جی سے اتنی سخت نفرت ہے کہ میں تجھے کیا بتاؤں۔"

" میں نوں پتہ ہے کہ وہ شاہ جی سے کتنی زبردست نفرت کرتی ہے۔" رحیم داد نے نادر کی رائے سے اتفاق کیا۔" اچھا یہ سوچ میں نوں اب کیا کرنا ہے۔ تو کہہ تو آج ہی تیرے ساتھ چل سکتا ہوں۔ مراد خاں نے مجھے کید تو کر نہیں رکھا صرف اتنا خیال آتا ہے کہ اس نے بہت محبت سے روکا ہے۔ کل اس نے شکار کا پروگرام بنایا ہے اور میری ہی خاطر بنایا ہے۔ پچھلی بار وہ شکار پر گیا تو میں اچانک بیمار پڑ گیا تھا۔ اس دفعہ بھی نہ گیا تو اسے دکھ ہوگا۔"

"ایسی گل ہے تو چوہدری تو ٹھہر جا۔ فکر نہ کر، میں زمیں دارنی کو سمجھا دوں گا۔" نادر خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔" ویسے بھی تجھے ابھی واپس نہیں جانا چاہیے۔"

"کیوں نہیں چاہیے؟" رحیم داد بات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے بے تاب تھا۔

" تو ابھی نہیں جائے گا تو زمیں دارنی پر تیرا رعب پڑے گا۔ اسے بھی تو پتہ چلنا چاہیے

کہ تو بھی خفا ہو سکتا ہے۔"

"سوچ لے، کہیں معاملہ گڑبڑ نہ ہو جائے۔" رحیم داد نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"پرواہ نہ کر چوہدری!" نادر خاں نے اسے یقین دلایا۔ "میں تیرے بارے میں زمیں داری سے اس ڈھب سے بات کروں گا کہ معاملہ بگڑنے نہ پائے اور تیری آن بھی رہے۔"

"ٹھیک ہے، میں نے ابھی واپس نہیں جانا۔" رحیم داد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "پر میں فصل کی واڈھی سے پہلے پہنچ جاؤں گا۔"

"چوہدری! تو فصل کی واڈھی کی بالکل فکر نہ کر۔ میں نے پوری تیاری کر لی ہے۔ جاتے ہی شروع کرا دوں گا۔ ویسے تیری مرضی جب چاہے واپس آ جانا۔ زمیں داری کا کام تو چل ہی رہا ہے۔ اور ایسا ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے کہ تو دیکھے گا تو بہت خوش ہو گا۔"

"میں نوں پتہ ہے۔ تیری منیجری میں کام بالکل ٹھیک ٹھاک چل رہا ہو گا۔"

نادر خاں نے رحیم داد کو اس قدر مہربان پایا تو خوش ہوا۔ اپنی کارگزاری اور زیادہ جوش و خروش سے سنانے لگا۔ ربیع کی بوائی، خریف کی کٹائی اور کپاس کی چنائی کے بارے میں ایک ایک تفصیل بتانے لگا۔ دونوں دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ سورج چڑھ کر آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ گیا نادر خاں سے باتیں کرنے کے بعد رحیم داد اتنا مسرور اور مطمئن تھا کہ دوپہر کا کھانا اس نے نادر کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلایا۔

نادر خاں زیادہ دیر نہیں ٹھیرا۔ اس نے رحیم داد سے اجازت لی اور کوٹلہ ہرکشن جانے کے لیے ہموں والی سے بھکر کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆

رحیم داد بستر پر لیٹ گیا مگر سویا نہیں۔ گھنٹے سوا گھنٹے بعد وہ کمرے سے نکلا اور ڈیوڑھی سے حویلی کے پھاٹک کی جانب چلا۔ اس نے دیکھا، دالان کی سیڑھیوں پر دھوپ میں حمیدہ بیٹھی تھی جسے سب میدہ کہتے تھے۔ وہ اس وقت چھینٹ کا گھگرا اور چست آستینوں

والا سرخ رنگ کا لنڈا چولا پہنے تھی. چولے کے گلے پر سیاہ اور سبز دھاگے کی خوش نما کشیدہ کاری تھی. شانوں پر لہریا چندری پڑی تھی. اس کا لباس نیا اور خوش رنگ تھا.

اس کے گیلے بال دیکھ کر رحیم داد کو اندازہ ہو گیا کہ اس نے کچھ ہی دیر پہلے غسل کیا ہے.
اس کے چہرے پر نکھار تھا. دھوپ سے رخسار سرخ پڑ گئے تھے. وہ خوب رو اور دل کش نظر آ رہی تھی. سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی. اس کی پشت پر سلھڑی تھی. وہ لکڑی کی کنگھی سے میدہ کے گیلے بال آہستہ آہستہ سلجھا رہی تھی، سنوار رہی تھی.

سلھڑی کی جوانی ڈھل چکی تھی. رنگ سانولا تھا مگر نقش و نگار تیکھے اور سبک تھے.
آنکھیں بڑی بڑی اور خوب صورت تھیں. ان میں کاجل لگا تھا. سلھڑی کا بدن سڈول اور گدرایا ہوا تھا. وہ ایسی طرح دار عورت تھی جسے پوپٹ کہا جاتا ہے. پوپٹ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ہر وقت خوب بنی ٹھنی رہتی تھی. مزاج میں ابھی تک شوخی تھی. لگاوٹ اور عشوہ طرازی تھی. چلتی تو بدن کا ایک ایک عضو بولتا تھا، چھلکتا تھا. اسے اپنی دل کشی اور رعنائی کا پورا پورا احساس تھا. وہ خود کو ہر پہلو سے کشش انگیز بنا کر رکھتی بھی تھی، اپنے تین بچوں کے ساتھ حویلی کے عقبی حصّے میں رہتی تھی. وہ مراد خاں شاہانی کی منہ چڑھی خادمہ تھی. حویلی میں مزارعوں اور کمیّوں کی جو نوجوان لڑکیاں اور بیویاں، سردار مراد خاں شاہانی کا عشرت کدہ آباد کرنے کے لیے اٹھا کر لائی جاتیں، سلھڑی ان کی دیکھ بھال کرتی اور کڑی نگرانی کا فرض انجام دیتی. انہیں بنا سنوار کر سردار کی خواب گاہ میں پہنچانا بھی اسی کے ذمّے تھا.

رحیم داد نے اپنے قیام کے دوران سلھڑی کے شوہر کو کبھی حویلی میں نہیں دیکھا. نہ معلوم وہ کون تھا. رحیم داد کو اس کے بارے میں مطلق علم نہ تھا. اس نے حویلی کے کسی ملازم سے سلھڑی کے بارے میں اور نہ ہی اس کے شوہر کے متعلق پوچھ گچھ کرنے کی کوشش کی. البتہ وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ مراد خاں اس پر بہت زیادہ مہربان ہے اور مکمل اعتماد بھی کرتا ہے.

قدموں کی آہٹ سن کر میدہ نے نظریں اٹھائیں، رحیم داد کو دیکھا مگر جھٹ گردن جھکا لی وہ خاموش بیٹھی رہی. سلھڑی نے بھی مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا. ایک خاص ادا سے

مسکرائی اور اونچی آواز سے سلام کیا۔" سئیں چوہدری! سلام ولادون۔ سب خیر اے، تنکڑا اے، راضی اے، خوش اے!!"

رحیم داد نے ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔" شکر اے!"

میدہ نے ایک بار پھر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بجھی بجھی تھیں۔ ان میں ویرانی تھی۔ رحیم داد نے اس کی افسردگی محسوس کی مگر چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔ سرکانہ بانی کی۔ مراد خاں شاہانی سویرے سویرے جھوک مٹھو بندو چلا گیا تھا۔ کریم بخش راد ھانی بھی اس کے ہمراہ تھا۔ دونوں ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔

رحیم داد حویلی سے باہر نکلا۔ پھاٹک پر خانن بندوق سنبھالے بیٹھا تھا۔ وہ حویلی کا پرانا پہریدار تھا۔ خانن نے رحیم داد کو دیکھا تو جھٹ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے رحیم داد کو سلام کیا۔ رحیم داد نے گردن ہلا کر جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔

وہ ٹہلتا ہوا گاؤں کی جانب بڑھا۔ کچھ ہی دور گیا تھا کہ اس نے دیکھا، حویلی کے احاطے کی اونچی چار دیواری سے کچھ فاصلے پر نیم کے ایک گھنے درخت کے نیچے میدہ کا بڑا بھائی فریدا خاموش اور دبلا ہوا کھڑا تھا۔ اس کی حجامت اور بڑھ گئی تھی۔ سر کے بال خشک اور میلے چیکٹ ہو گئے تھے۔ پگڑی گلے میں پڑی تھی، چہرہ اجاڑ اور بے رونق تھا۔

رحیم داد آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھا۔ اسے فریدا سے ہمدردی تھی۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ حال احوال معلوم کرنا چاہتا تھا۔ فریدا نے اسے اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا تو فوراً ہاتھ اٹھا کر سلام کیا، دعائیں دیں۔" سئیں سدا جیویں، سئیں سکھی صحت ہو دیں۔"

رحیم داد نے نزدیک پہنچ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔" فریدے تو یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے؟"

"میدہ سے ملنے آیا تھا۔" اس کے لہجے میں نرمی اور حلاوت تھی۔

"اس سے مل لیا تو؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔" میدہ ادھر حویلی میں سلطڑی کے ساتھ دھوپ میں بیٹھی ہے۔ میں ادھر ہی سے آ رہا ہوں۔"

"سئیں! میں میدہ سے نہیں مل سکتا۔" اس نے حویلی کے پھاٹک کی سمت ہاتھ اٹھا

کر کہا۔" اُدھر راکھا بیٹھا ہے۔ اس نے نہیں ملنے دیا۔"

رحیم داد نے مڑ کر دیکھا، خانن بندوق سنبھالے پھاٹک کے باہر اللہ بخش جوڑا کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ فریدا نے بھی دونوں کو دیکھا اور رحیم داد کو بتانے لگا۔" میں نے راکھے سے منت کی، زاری کی پروہ نہ مانا۔" اس کا لہجہ رقت انگیز ہو گیا۔" پہلے بھی آیا تھا پر میدہ سے نہیں مل سکا سئیں! سردار کی اجازت نہیں۔ راکھا یہی بولتا تھا۔"

رحیم داد اس معاملہ میں اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ خانن ہرگز مراد خاں کی حکم عدولی نہیں کرے گا۔ رحیم داد کے کہنے پر بھی نہیں۔ وہ بہت سخت گیر تھا اور مراد خاں کے اعتماد کا آدمی تھا۔ ویسے بھی سردار مراد خاں شاہانی کے احکام کے سامنے سارے نوکر چاکر مجبور اور بے بس تھے، اس کے غیظ و غضب سے ڈرتے تھے۔ اسے اپنے کسی ملازم یا مزارع کی کوئی بات بری لگتی تو غصے میں اس قدر دیوانہ ہو جاتا کہ اپنے شکاری کتے بھنبھوڑنے اور نوچنے کھسوٹنے کے لیے ان پر چھوڑ دیتا۔ ہموں والی میں اپنے قیام کے دوران وہ کئی بار ایسے ہولناک مناظر دیکھ چکا تھا۔ یہ مظالم دیکھ کر وہ خود بھی سردار شاہانی سے خائف رہتا تھا۔ لہذا رحیم داد نے فریدا کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔

" فریدے! یہ بتا میدہ کب تک حویلی میں رہے گی؟"

" سردار کی مرضی ہے سئیں۔" فریدا افسردہ لہجے میں بولا۔" وہ جب چاہے گا تب ہی میدہ حویلی سے باہر نکلے گی۔ ویسے پرنا ٹیکس کی ڈالی نہ ملنے تک وہ اسے اپنے پاس رکھ ہی سکتا ہے۔ ریت اور رواج تو یہی ہے۔"

" پر سردار نے تو تجھے معافی دے دی تھی۔ میرے سامنے دی تھی۔"

" سئیں! تو سمجھا نہیں، معافی تو اس نے میدہ کا منگڑاں کرنے سے پہلے ڈالی نہ دینے کے جرم کی دی تھی۔" فریدا نے وضاحت کی۔

" اچھا یہ بتا، سردار چاہے تو ڈالی بالکل معاف کر سکتا ہے؟"

" کیوں نہیں معاف کر سکتا، بالکل کر سکتا ہے۔" فریدا نے مستعدی سے جواب دیا

"وہ سردار ہے، بادشاہ ہے، سب کچھ کر سکتا ہے۔"

"ایسا کر، تو سردار سے مل لے۔" رحیم داد نے فریدا کو مشورہ دیا۔" منت سماجت کرے گا تو وہ مان جائے گا۔ ڈالی معاف کر دے گا اور میدہ کو بھی واپس کر دے گا۔"

"ناں سئیں! میں ایسا نہیں کر سکتا۔" فریدا کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔" میں اس کا راجی رعیت ہوں، اس کا مزارع ہوں۔ میں سردار سے کچھ نہیں بول سکتا۔ وہ نراض ہو جائے گا۔ نراض ہو گیا تو ڈالی دینے پر بھی میدہ کو واپس نہیں کرے گا۔ کسی اور سردار کے پاس بھیج دے گا یا اپنے ہی پاس رکھے گا۔ اس سے ٹھکا ٹھک بچے جنوائے گا۔ اس کے بعد بھی زاری کرنے پر، منت کرنے پر، اگر واپس کرے گا تو جرمانہ لگا کر زیادہ ہی رکم مانگے گا۔"

"یہ تو نے بالکل نرالی گل سنائی۔" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔

"سئیں! لگتا ہے تو ادھر پہلی بار آیا ہے۔ تیکوں یہاں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ یہ بیٹ ہے۔" فریدا کا دبا ہوا غم و غصہ دفعتہً ابل پڑا۔ اس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔" یہاں اوپر رب دی خدائی ہے اور نیچے سرداروں کی۔" اس نے بے بسی سے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ "سئیں! میں غریب ہوں، حلیم ہوں، شامت دا ماریا ہوں۔"

رحیم داد اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا، چند لمحے سر جھکائے خاموش کھڑا سوچتا رہا پھر فریدا کا کندھا تھپک کر تسلی دی۔" فریدے! پریشان نہ ہو۔ میں سردار سے میدہ کے بارے میں بات کروں گا۔ شاید وہ میری بات مان لے اور ڈالی بالکل معاف کر دے۔ تب میدہ جلد ہی تیرے پاس پہنچ جائے گی۔ تو اس کا ویاہ کرنا۔ میرا مطلب ہے۔" وہ بات کہتے کہتے الجھا۔" کیا کہتے ہیں اسے، پرنا۔ ہاں، پرنا کر دینا۔"

فریدا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ گڑگڑا کر رحیم داد کو دعائیں دینے لگا۔" سئیں! تو حیاتی والا ہو نویں، رب راضی ہووے۔ میں صدقے تھیواں۔" وہ گلے میں پڑی ہوئی پگڑی ایک ہاتھ سے اٹھا کر آنسو پونچھنے لگا۔" سئیں! سردار تیری گالہہ ضرور مان لے گا۔ تو اس کا مہمان ہے۔ اس کا یار ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ بادشاہ ہے۔"

"فکر نہ کر۔" رحیم داد نے ایک بار پھر اس کا کندھا تھپکا۔ "اب تو ٹر جا۔"

فریدا تے جھک کر رحیم داد کے پیروں کو ہاتھ لگایا اور چپ چاپ چلا گیا۔ رحیم داد آگے نہ گیا۔ واپس حویلی میں آگیا۔ ڈیرے میں پہنچا اور کمرے کے سامنے کرسی کھسکا کر دھوپ میں بیٹھ گیا۔

سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے مراد خاں آگیا۔ شام کا اندھیرا پھیلا۔ سردی بڑھی۔ سردار شاہانی اور رحیم داد کمرے میں کرسیوں پر بیٹھے۔ شغل بادہ نوشی شروع ہوا۔ ہموں والی کے قیام کے دوران عام طور پر دیسی شراب چلتی۔ جسے مقامی کلال گڑ، آلو یا کھجور سے تیار کرتے تھے۔ اس شام بھی میز پر دیسی شراب کی بوتل تھی مگر کچھ زیادہ ہی تند اور تیز تھی۔ ذائقہ بھی مختلف تھا۔ یہ شراب جھوک مٹھو بندو میں اسے ایک نوانی زمیں دار نے تحفے کے طور پر پیش کی تھی۔

سردار شاہانی نے گلاس خالی کیا۔ اس میں دوبارہ شراب انڈیلتے ہوئے گویا ہوا۔ "عبداللہ خاں نوانی ٹھ[illegible] ہی کہتا تھا۔ زور دار چیز ہے۔ لک مارتی ہے۔"

رحیم [illegible] گھونٹ بھرا۔ "ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ بہت زور دار لگتی ہے۔"

"تجھے پتہ ہے یہ کیسے تیار کی جاتی ہے؟"

"میں نوں اس کے بارے میں کی پتہ۔" رحیم داد سادگی سے بولا۔

"تینوں کچھ بھی پتہ نہیں۔" سردار شاہانی نے ہنس کر کہا۔ "یہ لاہن سے بنتی ہے۔ اسے بنانے کے لیے، بیری، پیپل اور بوہڑ کے درختوں کی چھال مٹی کے کورے گھڑوں میں ڈال کر کچی زمین کھود کے دبا دی جاتی ہے۔ جتنے زیادہ دنوں بعد گھڑا باہر نکالا جاتا ہے، اتنا ہی اچھا خمیر اٹھتا ہے۔ اسی کو لاہن کہتے ہیں۔ جس سے بعد میں یہ کشید کی جاتی ہے۔" اس نے گلاس اٹھا کر چسکی لگائی۔ "میں نے تو دس بارھاں سال پرانے لاہن سے کشید کی ہوئی شراب پی ہے۔ بہت زور دار ہوتی ہے۔ یہ بھی پرانے لاہن کی لگتی ہے۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "تجھے کیسی لگی؟"

"زبردست ہے۔ ابھی سے چڑھنے لگی۔" رحیم داد نے بڑا گھونٹ بھرا اور گلاس میز

پر رکھ دیا۔

"پرلاہن کی تیز دارو کے ساتھ رن بھی تیز اور گرم ہونی چاہیے۔ اس کے بغیر اسے پینے کا مزا نہیں۔" شاہانی نے ہلکا قہقہہ لگایا۔

رحیم داد بھی ہنسنے لگا۔ شاہانی کی بات نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ "شاہانی! تو نے میدہ کو واپس نہیں بھیجا۔ کب تک رکھنے کا ارادہ ہے۔"

"چلی جائے گی، چلی جائے گی۔" مراد خاں نے بے نیازی سے کہا۔ "جلدی کیا ہے۔"

"اب تو اسے اپنے گھر جانے دے۔" رحیم داد نے نرم لہجے میں سفارش کی۔

"کیوں؟" مراد خاں شاہانی نے تیکھی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "تجھے اس سے کیا لینا؟"

رحیم داد نے فریدا سے اپنی ملاقات کا ذکر نہ کیا، چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولا۔

"میں نے آج دوپہر اسے دیکھا تھا۔ بیمار بیمار سی لگتی تھی۔ ویسے بھی وہ کمزور اور دبلی پتلی ہے۔"

"چوہدری! تو اسے نہیں جانتا۔" سردار نشہ کی ترنگ میں جھوم کر بولا۔ "وہ انگوری ہے انگوری۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "انگور کے پکے دانے کی طرح رس بھری۔ تو نے اس کا رنگ روپ دیکھا ہے۔ سچ بتا، تجھے وہ انگوری نہیں لگتی؟"

"مجھے تو وہ کسی طرف سے انگوری شنگوری نہیں لگتی۔" رحیم داد نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ لہجے میں اور نرمی پیدا کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "میں چاہتا ہوں تو اُسے واپس بھیج دے۔ اس کی سگائی پہلے ہی ہو چکی ہے۔ میدہ کا منگیدڑ اس کا انتظار کرتا ہوگا۔ اس کا بھرا، فریدا بھی اس کا ویاہ کرنے کو تیار ہے۔"

"تو میدہ کی اس طرح سفارش کیوں کر رہا ہے؟" سردار نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ "بات کیا ہے؟"

"کوئی خاص گل بات نہیں۔" رحیم داد نے فوراً بات بنائی۔ "میدہ کو دیکھا تو سوچا تجھ سے کہوں گا، اسے اپنے گھر جانے دے۔" اس نے لہجے میں عاجزی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"میں تو چاہتا ہوں تو اس کی ڈالی بھی معاف کر دے۔" رحیم داد نے اصرار کیا۔ "معاف کر

دے گا ناں؟"

"تو کہتا ہے تو اسے واپس بھیج دوں گا۔ ڈالی بھی معاف کر دوں گا۔" سردار مراد خاں خلاف توقع فوراً رضامند ہو گیا۔ شاید نشہ کچھ زیادہ چڑھ گیا تھا۔" پر گھر جانے سے پہلے وہ ایک رات تیرے پاس رہے گی اور آج ہی رات رہے گی۔"

"نہیں! تو آج رات بھی اسے اپنے ہی پاس رکھ۔" رحیم داد رضامند نہ ہوا۔

"میری فکر نہ کر چوہدری!" شاہانی لہرا کر بولا۔" میں نے اپنے لئے آج رات ایک پولانی اٹھوالی ہے۔ بہت گرم رن ہے۔ دن میں سوت سے کپڑا بنتے ہوئے اس کے ہاتھ فٹافٹ چلتے ہیں پر رات کی نہ پوچھ۔" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔" وہ پہلے بھی ایک بار میرے پاس رہ چکی ہے۔"

"ایسا ہے تو میدہ کو آج ہی رات جانے دے۔" رحیم داد نے زور دے کر کہا۔" ابھی تو رات زیادہ نہیں گزری۔"

"نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ آج رات نہیں جائے گی۔ تیرے پاس رہے گی۔ دیکھ انکار نہ کرنا۔" وہ نشے کی جھونک میں بڑبڑانے لگا۔" تو میرا مہمان ہے، میرا یار بیلی ہے۔ میدہ آج رات تیرے پاس نہ رہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے، ذرا سوچ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ نہیں ہو گا۔ ہرگز، ہرگز نہیں ہو گا۔"

رحیم داد نے سردار کی برہمی سے خائف ہو کر خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ سردار مراد خاں نے اسی دم سلطھڑی کو بلوایا۔ وہ فوراً آ گئی، جیسے شاہانی کے بلاوے کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ اس وقت وہ کچھ زیادہ ہی بن سنور کر آئی تھی۔ آنکھوں میں دنبالہ کا کاجل تھا، ہونٹوں پر سرخی تھی۔ بال مونیے کے پھولوں میں بسے ہوئے کرنے کے تیل سے جگمگا رہے تھے۔ سر پر بسنتی دوپٹہ تھا۔ وہ ریشم کی بسنتی منجھلی بھی باندھے ہوئے تھی۔ دلربا اور عشوہ طراز نظر آ رہی تھی۔ رحیم داد کو بھی وہ بہت اچھی لگی۔ اس کے سینے دھڑکن اور بے قراری بھی محسوس کی۔

سلطھڑی کو دیکھتے ہی مراد خاں کی آنکھوں میں چراغ روشن ہو گئے۔ لمحے بھر تک ٹکٹکی باندھے پیار بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے گلاس اٹھا کر بڑا سا گھونٹ بھرا اور جھوم کر گویا ہوا۔" جند جانی! آج تو بھری ہوئی بندوق لگ رہی ہے۔ اِدھر آ میرے پاس۔"

سلھڑی نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر ترچھی نظروں سے مراد خاں کو دیکھا۔ اس کے انداز میں لگاوٹ تھی۔ بڑی چاہت سے بولی "سئیں! میں صدقے نفیواں" وہ آگے بڑھی اور مراد خاں کے پہلو سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

شاہانی نے اسے مخاطب کیا "سلھڑی! انگوری کو، کیا نام ہے اس کا؟" نشے کی جھونک میں اسے میدہ کا نام یاد نہیں آیا۔

سلھڑی نے جھٹ بتایا "سئیں! تو میدہ کو تو نہیں پوچھ رہا؟"

"ہاں، ہاں! وہی، بالکل وہی۔ میدہ، میدہ۔ وہ انگوری ہے نا؟" شاہانی نے سلھڑی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا "میدہ کو چوہدری کے کمرے میں پہنچا دے۔ وہ آج رات چوہدری کے پاس رہے گی۔ صبح اُسے اپنے گھر بھیج دینا۔ رادھانی سے کہنا۔ اس کی ڈالی بھی میں نے معاف کر دی۔ سن لیا تو نے؟"

"جی سئیں!" سلھڑی نے سردار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور ٹھسّے سے بولی۔ "پولانی کو تیرے کوٹھے وچ پہنچا دوں؟"

"پولانی کو گولی مار۔ آج تو ہی میرے پاس رہے گی۔" سردار شاہانی نے سلھڑی کے لیے حکم صادر کیا "اب تو جا، میدہ کو چوہدری کے کمرے میں لے جا۔" اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ میرا انتظار کر۔ میں جلد ہی تیرے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

سلھڑی کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ آنکھیں مسکرانے لگیں۔ وہ گردن اٹھائے ہوئے ہولے ہولے قدم بڑھاتے چلی گئی۔ سردار شاہانی نگاہیں اٹھائے اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ بائیں ہاتھ کو مڑ کر اوجھل ہو گئی تو سردار نے رحیم داد کو مخاطب کیا "چوہدری! اپنی سلھڑی کا بھی جواب نہیں۔ سدا بہار ہے۔ برسوں سے میرے پاس ہے پر اب تک پرانی نہیں ہوئی۔ ہر بار کچھ زیادہ ہی نئی لگتی ہے۔ کیا خیال ہے تیرا؟"

رحیم داد صرف مسکرا کر رہ گیا۔ سردار شاہانی نے بھی مزید بات نہیں کی۔ دونوں شراب سے شغل کرتے رہے۔ مراد خاں زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ اٹھا اور ڈگمگاتے قدموں سے جھومتا جھامتا

اگے بڑھ گیا۔ رحیم داد بھی کھڑا ہوگیا اور شاہانی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

سلھڑی خواب گاہ کے دروازے پر سراد خاں کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی آگے بڑھی اور ہاتھ تھام کر مسکراتے ہوئے سہارا دیا۔ دونوں کھلے دروازے سے اندر چلے گئے۔ رحیم داد ڈیرے کی جانب چل دیا۔ کمرے کے قریب پہنچا۔ دروازہ کھول کر کمرے میں قدم رکھا تھا کہ ٹھٹک گیا۔ میدہ بستر پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ رحیم داد نے دروازہ بند کیا۔ آگے بڑھا اور اس کے قریب پہنچا۔ میدہ کسمسا کر سکڑنے لگی۔ اس نے نہ گردن اٹھائی نہ رحیم داد کی جانب دیکھا چپ بیٹھی رہی۔

رحیم داد نے اسے مخاطب کیا۔ "میدہ!" مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بہت سہمی ہوئی اور مضمحل نظر آرہی تھی۔ رحیم داد نے اس کی پریشانی محسوس کی۔ اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی غرض سے بولا۔ "فریدا تیرا بھائی ہے نا؟ وہ آج دوپہر حویلی سے باہر مجھے ملا تھا۔"

تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ میدہ نے فوراً نظریں اٹھائیں اور بے قرار ہو کر پوچھا۔ "فریدا یہاں آیا تھا؟"

"ہاں!" رحیم داد نے بتایا۔ "وہ تجھ سے ملنے آیا تھا۔"

"پر میں نے تو اُسے نہیں دیکھا۔ سئیں! وہ کب آیا تھا؟" اس کی آنکھوں سے بے قراری کے ساتھ ساتھ حیرت بھی جھلک رہی تھی۔

"میں نے کہا نا، وہ آج دوپہر کو آیا تھا۔ تو سلھڑی کے ساتھ دھوپ میں بیٹھی تھی۔ تیں نوں یاد ہے نا۔ میں تیرے اور سلھڑی کے سامنے سے گزرا تھا۔ باہر گیا تو وہ مجھے مل گیا۔" رحیم داد نے تفصیل بتائی۔ "پر راکھے نے فریدا کو اندر نہیں آنے دیا۔ وہ حویلی کے اندر نہ آسکا۔ باہر ہی رہا۔ تو اُسے کیسے دیکھتی۔ وہ تجھے ملے بنا چلا گیا۔"

"ہا سئیں! وہ میکوں کیسے مل سکتا ہے۔" میدہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سردار کی اجازت نہیں۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "فریدا تجھے کیا کہتا تھا؟ وہ تجھے ملا تھا نا؟"

"تیرے لیے وہ بہت پریشان ہے۔"

"پر اس کے پریشان ہونے سے کیا ہونا ہے؟" میدہ کے چہرے پر غم کی بدلی چھا گئی۔

"سئیں! وہ غریبی علیمی میں کیا کر سکتا ہے۔ پرنا ٹیکس کی ڈالی دے سکتا تو مجھے مل لیتا۔ اپنے ساتھ بھی لے جاتا۔"

"تیرے سوا یہاں اور بھی مٹیاریں ہوں گی؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"ہا سئیں!" میدہ رفتہ رفتہ رحیم داد سے مانوس ہوتی جا رہی تھی۔ "میری طرح یہاں تین اور بکر کیدہیں۔ اُن کا پرنا ماپیو نے سردار کی اجازت کے بنا چوری سے کر دیا تھا۔ ڈالی دینے کو رکم نہیں تھی۔ وہ میرے آنے سے پہلے حویلی میں تھیں۔ انہیں تو پنج چھی مہینے سے بھی ادپر ہو گئے۔ کنٹرک دے موسم توں اِدھر ہیں اب تک سئیں نہ اُن کی ڈالی سردار کو پہنچی اور نہ وہ جا سکیں۔"
اس کی آواز بھرا گئی۔ "میں بھی نہیں جا سکتی۔ فریدا ڈالی کی رکم کہاں سے لائے گا؟"

"تُو فکر نہ کر فریدا کو اب ڈالی نہیں دینی پڑے گی۔" رحیم داد نے اس کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔

"سئیں! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اُسے رحیم داد کی بات پر یقین نہ آیا۔

"ایسے ہی، جیسے میں کہہ رہا ہوں۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "تیرا پرنا ٹیکس سردار نے معاف کر دیا۔ تو کل سویرے اپنے گھر چلی جائے گی۔"

میدہ کی آنکھوں میں روشنی کے ستارے جگ مگائے مگر جلد ہی اُن کا چکا چوند ماند پڑ گئی۔ وہ دل گرفتہ ہو کر بولی۔ "سردار ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ مجھے جانے نہیں دے گا۔ کل رات ہی اُس نے مجھے کہا تھا۔"

"کل کی بات چھوڑ۔" رحیم داد ہنس کر بولا۔ "سردار نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔"

"سئیں! تُو سچ بول رہا ہے؟" میدہ کا چہرہ فرطِ مسرت سے پھول کے مانند کھل گیا۔

"سردار نے تجھے خود کہا تھا؟"

"ہاں، آج ہی تھوڑی دیر پہلے کہا تھا۔ میں اُس کا مہمان ہوں۔ میں نے تیرے بارے میں اُسے کہا تو وہ راضی ہو گیا۔" رحیم داد کھسک کر اُس سے اور قریب ہو گیا۔ "اُس نے سلھڑی کو بلا کر میرے سامنے ہی کہہ دیا کہ وہ کل تجھے فریدا کے پاس پہنچا دے۔"

"پر سلھڑی نے تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔" وہ ہنوز تذبذب میں تھی "سئیں! تُوا جازت دے تو میں سلھڑی کے پاس جا کر ابھی پوچھ لوں؟ ذرا دیر بعد لوٹ آؤں گی۔"

"سلھڑی تجھے نہیں ملے گی۔" رحیم داد نے بتایا۔ "وہ اس وقت سردار کے کمرے میں ہے۔ وہ تجھے صبح ملے گی اور تجھے تیرے گھر پہنچا دے گی۔"

"فریدا کو بھی اس گل کی خبر ہے؟"

"وہ ابھی تو نہیں جانتا۔ کل جب تو اس کے پاس جائے گی تو جان جائے گا۔" رحیم داد نے میدہ کو بتایا۔ "ویسے میں نے اُسے دلاسا دے دیا تھا۔"

"سئیں! تیرے ہی کہنے پر سردار نے ایسا کیا ہے؟" میدہ نے پوچھا "تیری باتوں سے ایسا ہی لگتا ہے۔"

رحیم داد نے خوش ہو کر اُسے اور مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ "ہاں، میں نے ہی اُسے کہا تھا۔ وہ میرا یار ہے، میری بات کیسے نہ مانتا۔"

"سئیں! تو سدا جیویں۔ رب راضی ہووے۔" اُس کا چہرہ مسرت سے شگفتہ ہو گیا، وارفتہ ہو کر بولی۔ "سئیں تو کتنا اچھا ہے۔"

"میں تو اچھا ہوں۔" رحیم داد نشے سے جھوم کر بولا۔ "اب تو بھی اچھی بن جا۔"

رحیم داد ہنسنے لگا۔ میدہ نے کچھ نہیں کہا۔ اس کا چہرہ شرم سے گلابی پڑ گیا، نظریں جھک گئیں، لانبی لانبی پلکوں کے سائے پھیل گئے۔

رحیم داد سویرے بیدار ہوا۔ میدہ نہ جانے کب کمرے سے جا چکی تھی۔ رحیم داد اٹھا، نہا دھو کر شاہانی کے پاس چلا گیا۔ وہ ناشتے پر اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں نے ناشتہ کیا۔ اسی اثنا میں کریم بخش راوھانی آ گیا۔ رحیم داد ناشتے سے فارغ ہو کر کمرے سے چلا گیا۔ اب صبح کی کہر کا دھندلکا چھٹ چکا تھا۔ ہر طرف چمکیلی بسنتی دھوپ پھیلی تھی۔

حویلی کے پچھواڑے سے سلھڑی نمودار ہوئی اس کے ہم راہ میدہ تھی۔ اللہ بخش جوڑا دونوں کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ پھاٹک کے قریب پہنچ کر سلھڑی کی آواز سنائی دی۔

" جوڑے!" اس نے میدہ کی طرف اشارہ کیا۔" اسے فریدا کے گھر پہنچادے۔ واپسی پر مجھے بتا دینا۔ اور دیکھ دیری نہ کرنا۔"

" جوڑا آگے بڑھا میدہ اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ پھاٹک سے گزرتے ہوئے وہ ٹھٹکی، مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوشی کا اجالا تھا۔ ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ رحیم داد بھی مسکرا دیا۔ میدہ پھاٹک سے باہر چلی گئی۔ رحیم داد اسے دور تک دیکھتا رہا۔

سلطڑی پھاٹک سے واپسی پر رحیم داد کے قریب سے گزری۔ رحیم داد نے اُسے ٹوکا۔

" میدہ اپنے گھر چلی گئی؟"

" جی سئیں! بہت راضی باضی تھی۔" سلطڑی نے ٹھٹک کر زیر لب تبسم کے ساتھ کہا۔" تجھ سے بہت خوش تھی۔ بار بار کہتی تھی، سئیں چوہدری بہت چنگا بندہ ہے۔" اس نے گردن کو خم دے کر ایک خاص ادا سے رحیم داد کو دیکھا۔" سئیں! تو نے اسے کیوں جانے دیا؟ کچھ دن تو اپنے پاس رکھتا۔ میدہ سوہنڑی ہے اور بھرپور جوان ہے۔"

" پر تو اس سے بھی زیادہ سوہنی اور چنگی ہے۔" رحیم داد نے مسکرا کر شوخی سے اُسے چھیڑا۔ " میرا تو جی کرتا تھا۔ رات تو میرے پاس ہوتی۔"

سلطڑی نے رحیم داد کی حوصلہ شکنی نہیں کی۔ نظریں جھکا کر آہستہ سے بولی۔" سئیں! تو سردار سے پوچھ لے۔" اس نے دوپٹہ کھینچ کر ہلکا سا گھونگٹ نکال لیا۔

رحیم داد اس کی اس ادا پر بے قرار ہو گیا۔ وہ کچھ بولنے ہی والا تھا کہ مراد خاں کمرے سے نکلا۔ اس کے پیچھے رادھانی تھا۔ دونوں رحیم داد ہی کی جانب آرہے تھے۔ سلطڑی نے سردار کو دیکھا تو فوراً آگے بڑھی اور چپ چاپ حویلی کے پچھواڑے چلی گئی۔

مراد خاں قریب آگیا۔ اس نے رحیم داد سے پوچھا۔" چوہدری! تو تیار ہے نا، شکار پر چلنا ہے۔" اس نے مڑ کر رادھانی کی جانب دیکھا۔" رادھانی جیپ باہر نکال۔ شکار پر چلنے کا بندوبست کر۔" رادھانی حکم ملتے ہی چلا گیا۔

مراد خاں شاہانی دھوپ میں رحیم داد کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس نے مسکرا کر رحیم داد

سے وہی بات کہی جو ذرا دیر پہلے سلطڑی کہہ چکی تھی۔" چوہدری تو نے میدہ کو کیوں جانے دیا؟
میں نے تو سلطڑی سے کہہ دیا تھا کہ چوہدری کی مرضی ہو تو میدہ کو روک لینا۔"

راد ھانی واپس آگیا۔ اس نے مراد خاں کو اطلاع دی کہ شکار پر چلنے کی تیاری مکمل ہو چکی ہے۔ مراد خاں اور رحیم داد آگے بڑھے، پھاٹک سے باہر نکلے اور سامنے کھڑی ہوئی جیپ میں جاکر بیٹھ گئے۔

☆

مراد خاں خود جیپ چلا رہا تھا۔ رحیم داد اس کے برابر بیٹھا تھا۔ پچھلی نشست پر کریم بخش راد ھانی اور دو ملازم بیٹھے تھے۔ جیپ میں کھانے پینے کی اشیاء کے علاوہ بندوقیں تھیں کارتوس اور شکار کا دوسرا ساز و سامان بھی موجود تھا۔ راستہ کچا تھا، جگہ جگہ گڑھے تھے۔ جیپ ہچکولے کھاتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ مراد خاں اسے بہت سنبھال کر چلا رہا تھا۔

جیپ چار میل سے زیادہ فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک بستی کے باہر جاکر ٹھہر گئی۔ یہ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ راد ھانی نے شکاری کتوں اور ان کی دیکھ بھال کرنے والے کوتیوں کو شکار کا ہانکا کرنے والوں کے ساتھ رات ہی کو بھیج دیا تھا۔ وہ سب راستے کے کنارے ایک سالہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ ایسی جھونپڑی تھی جس کی دیواروں پر پھوس اور سرکنڈوں کا چھپر تھا۔ چھپر کے نیچے شہتیر کے بجائے اڈّیاں جڑی تھیں۔ اڈّیاں مثلث کی شکل کی مضبوط لکڑیاں تھیں۔ سالہ میں کئی اڈّیاں تھیں۔ جن کے درمیان ٹیڑھی ترچھی کڑیاں اور لٹرے تھے۔ ان پر بڑا سا چھپّر تھا۔ گاؤں میں عام طور پر ایسے ہی سالے نظر آ رہے تھے۔

گاؤں سے چند فرلانگ پر دریائے سندھ بہتا تھا۔ دریا کے کنارے دور دور تک جھاڑیاں تھیں۔ جنگل اور اُدھڑے ہوئے گھنے درختوں کے گنجان جھنڈ بھی تھے۔ انہی جھنڈوں میں جنگلی سور رہتے تھے۔ وہ دن میں جھنڈوں کے اندر دور تک پھیلی ہوئی دلدل اور کیچڑ میں روپوش رہتے۔ رات کی تاریکی پھیلتے ہی ان کے غول کے غول نکلتے اور کھڑی فصلیں تباہ کرتے۔ اس حیثیت سے

سور کا شکار زمین داروں کے لیے مشغلے اور کھیل سے زیادہ ایک بڑی ضرورت بھی تھی۔ یہ فصلوں کو تباہی سے بچانے کی ضرورت تھی۔ سور کا شکار عام طور پر فصلوں کی تیاری کے دنوں میں کثرت سے ہوتا ہے۔ یہ ایسے ہی دن تھے۔ خریف کی فصل کہیں کٹ چکی تھی، کہیں کٹائی کے لیے تیار کھڑی تھی۔

مراد خاں کی ہدایت پر رادھانی نے شکاری کتوں اور ہانکا کرنے والوں کو جھنڈوں کی جانب پہلے ہی روانہ کر دیا تھا۔ آگے آگے کوتی تھے۔ وہ کتوں کی زنجیریں مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ اُن کے پیچھے ہانکا کرنے والے گردنوں میں ڈھول ڈالے، ہاتھوں میں ٹین کے پیپے، بلم اور برچھے سنبھالے چل رہے تھے۔ اُن میں سے کچھ ایسے نڈر اور بے باک تھے۔ جن کے پاس صرف لمبے شکاری چاقو یا خنجر تھے۔

اس شکار میں ایسے کتے بڑی تعداد میں تھے جو گل ٹیریئر اور بولی نسل کے کتوں کے باہمی ملاپ کی پیداوار تھے۔ نسلی طور پر یہ دوغلے کتے سور کے شکار میں بہت مؤثر اور کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ مراد خاں شاہانی نے سور کے شکار کے لیے ایسے کتے خاص طور پر تیار کرائے تھے۔ اُن کے دانت اور جبڑے اس قدر مضبوط تھے کہ ایک بار گردن منہ میں آ جانے کے بعد سور کے لیے اُن کی گرفت سے آزاد ہونا ممکن نہیں تھا۔ یہ کتے دوڑنے میں بھی تیز تھے، خوں خوار اور نڈر بھی تھے۔

مراد خاں اور رحیم داد جیپ کے اندر ہی بیٹھے رہے۔ رادھانی نے تھرماس سے چائے انڈیلی۔ دونوں کو ایک ایک پیالی پیش کی۔ دونوں آہستہ آہستہ چائے پینے لگے۔

جب کوتی اور ہانکا کرنے والے جنگلی درختوں سے ڈھکے ہوئے گنجان جھنڈوں میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئے تو کچھ ہی دیر بعد مراد خاں شاہانی نے دوبارہ جیپ اسٹارٹ کی۔ اب پچھلی نشست پر صرف رادھانی بیٹھا تھا۔ دونوں ملازم بھی ہانکا کرنے والوں کے ساتھ چلے گئے تھے۔ دونوں منجھے ہوئے شکاری تھے۔ وہ اپنے ساتھ اپنی بندوقیں اور کارتوس بھی لے گئے تھے۔ سردار مراد خاں اور رحیم داد کے زانوؤں پر بھی بھری ہوئی بندوقیں رکھی تھیں۔ دونوں جھنڈوں کی جانب دیکھ رہے تھے۔ شکاری کتوں کے بھونکنے کی آوازیں رک رک جھنڈوں میں گونج رہی تھیں

رادھانی پچھلی نشست پر بندوق سنبھالے بیٹھا تھا۔ سردار مراد خاں اُسے شکار پر ضرور ساتھ لے جاتا تھا اس لیے کہ اُس کا نشانہ بہت اچھا تھا۔ ویسے مراد خاں بھی بہت اچھا نشانے باز تھا۔ اس نے کم عمری ہی سے شکار کھیلنا شروع کر دیا تھا اور اب تو وہ ماہر شکاری ہو گیا تھا۔ البتہ رحیم داد نے سور کا شکار بہت کم کھیلا تھا۔ لیکن اُس کا نشانہ بھی بُرا نہیں تھا۔

جیپ ہچکولے کھاتی ہوئی ایک اوجھڑ پر آہستہ آہستہ دوڑ رہی تھی۔ یہ اوجھڑ خودرو جنگلی پودوں سے بھرا ہوا دشوار گزار اور دلدلی راستہ تھا۔ جیپ سنبھل سنبھل کر آگے اور آگے بڑھتی گئی۔ آخر ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں اس قدر بہتات سے گھنی جھاڑیاں تھیں، کہ اُن کے درمیان سے جیپ نہیں گزر سکتی تھی۔ شاہانی نے جیپ روک لی۔ بندوق سنبھالے ہوئے نیچے اترا۔ رحیم داد اور کریم بخش رادھانی بھی باہر آگئے۔ ہر طرف ہو کا سنّاٹا تھا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد سنّاٹے میں ایک طرف سے ڈھولوں اور پیپوں کی تیز آوازیں ابھریں۔

تینوں جھاڑیوں کے درمیان سے راستہ بناتے ڈھولوں اور پیپوں کی آوازوں کی سمت بڑھے۔ وہ شاخوں سے اُلجھتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ اب کتوں کے زور زور سے بھونکنے کی آوازیں ابھرنے لگی تھیں۔ مراد خاں شاہانی آگے آگے تھا۔ ایک مقام پر وہ ٹھہر گیا۔ ہاتھ اُٹھا کر اُس نے رحیم داد اور رادھانی کو بھی ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔

سامنے جھاڑی میں ایک سور دبکا کھڑا تھا۔ مراد خاں نے اپنی چھوٹی رائفل اٹھا کر نشانہ باندھا اور گولی چلا دی۔ گولی سور کی ٹانگ میں لگی۔ وہ زخمی ہو کر جھاڑیاں چیرتا تیزی سے ایک طرف بھاگا۔ مگر ذرا ہی دیر بعد وہ ایک گھنے درخت کے تنے کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ چوٹ کھا کر وہ زیادہ خونخوار ہو گیا تھا۔ وہ غرّاتا ہوا اپنے تیز اور نوکیلے دانت نکالے تینوں پر بگولے کی مانند اچانک جھپٹا۔

رادھانی نے فوراً گولی چلائی لیکن نشانہ خطا کر گیا۔ مراد خاں نے جھٹ رائفل اٹھائی مگر وہ اس کی انگلیوں سے پھسل کر نیچے گر گئی۔ سور منہ پھاڑے دانت نکالے بالکل سامنے تھا اور چند گز کے فاصلے پر پہنچ چکا تھا۔ مراد خاں آگے تھا۔ وہ نہتا بھی تھا اور بالکل اس کی زد پر تھا۔ رحیم داد

کے پاس ۱۲ بور کی بندوق تھی۔ اُس نے نہایت پھرتی سے بندوق اٹھائی، نشانہ لیا اور جھٹ گولی چلادی۔ نشانہ بالکل ٹھیک بیٹھا۔ گولی سور کا ماتھا چیرتی پھاڑتی اندر اتر گئی۔ سور فوراً وہیں ڈھیر ہو گیا لیکن پلک جھپکتے ہی سور کی مادہ نکلی۔ وہ بھی غراتی چیختی دانت نکالے تیزی سے جھپٹی۔ رحیم داد نے اس پر بھی گولی چلادی۔ اس دفعہ بھی نشانہ بالکل ٹھیک بیٹھا۔ وہ بھی گولی کھاتے ہی گر کر تڑپنے لگی۔

سور اور اس کی مادہ چند گز دور کیچڑ میں پڑے دم توڑ رہے تھے۔ تینوں چند لمحے انہیں سسکتے اور تڑپتے دیکھتے رہے پھر مراد خاں ہنستا ہوا آگے بڑھا اور نہایت گرم جوشی سے رحیم داد کو اپنے دونوں بازوؤں میں بھینچ لیا، اُس کی پیٹھ تھپک کر بولا۔

"چوہدری! تو نے تو آج کمال کر دیا۔ ایسا سچا نشانہ لگایا کہ دل خوش کر دیا۔ میں نے پتہ نہیں تھا تو اتنا اچھا شکاری ہے۔"

رحیم داد کچھ نہیں بولا صرف مسکرا کر رہ گیا۔ لیکن مراد خاں بہت مسرور تھا۔ راد ھانی نے بھی رحیم داد کے نشانے کی تعریف کی۔ اسی اثناء میں ہانکا کرنے والے اور دوسرے شکاری بھی گولیوں کی آوازیں سن کر پہنچ گئے مگر شاہانی وہاں نہیں ٹھیرا۔ اس نے جھک کر اپنی رائفل اٹھائی۔ رحیم داد اور راد ھانی کے ہمراہ اُس طرف بڑھا جس طرف سے کتوں کے زور زور سے بھونکنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

تینوں نے چونک کر دیکھا کچھ فاصلے پر سوروں کا ایک غول جھاڑیوں کے درمیان گزرتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ کتوں کے نرغے سے نکل کر بھاگے تھے۔ تینوں نے بھاگتے ہوئے سوروں پر تابڑ توڑ گولیاں چلائیں۔ دو سور فوراً گر کر تڑپنے لگے۔ غول کے بقیہ سور گھنی جھاڑیوں میں میں گھس کر آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ جھک جھک کر اِدھر اُدھر دیکھنے پر بھی نظر نہیں آئے۔

مراد خاں، رحیم داد اور راد ھانی آگے بڑھے، گھنی جھاڑیوں سے گزر کر کھلی جگہ پہنچے تو ایک خوف ناک منظر سامنے تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر ہانکا کرنے والا ایک شکاری کتا نا

خون میں لت پت پڑا تھا۔ تینوں جھپٹ کر اس کے قریب پہنچے۔ وہ تکلیف سے گردن اِدھر اُدھر ہلا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ابھی تک شکاری چاقو دبا ہوا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک سور بھی خون میں ڈوبا بے جان پڑا تھا۔ اس کا پیٹ پھٹا ہوا تھا، آنتیں باہر نکل آئی تھیں۔

زخمی کٹانے کا ایک پیر پنڈلی سے ران تک جنگلی سور نے اپنے تیز اور خوں خوار دانتوں سے چیر ڈالا تھا۔ زخم نہایت گہرا آیا تھا، ٹانگ کی چربی اور ہڈی تک نظر آ رہی تھی۔ خون بہت زیادہ بہہ چکا تھا۔ اُس کے جسم کے نیچے خون ہی خون تھا۔ رحیم داد اُسے دیکھ کر لرز گیا۔

مراد خاں نے زخمی کو فوراً پہچان لیا۔ وہ رادھانی سے مخاطب ہوا۔ "رادھانی! یہ تو سینا ہے۔" اُس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "بہت دلیر اور زبردست شکاری ہے۔ ایسا زبردست کہ سور تیزی سے دوڑ کر حملہ کرنے کے لیے جھپٹے تو یہ بھاگنے کے بجائے اُس سے ٹاکرہ لینے کے لیے دونوں ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو جاتا۔ سور عام طور پر ٹانگوں ہی میں گھس کر حملہ کرتا ہے۔ سینا کا یہ کمال ہے کہ جیسے ہی سور ٹانگوں کے بیچ میں گھستا، یہ نہایت پھرتی سے اس کا پچھلا حصّہ ٹانگوں سے دبا کر اُس پر سوار ہو جاتا اور تیزی سے چاقو اس کے پیٹ میں گھسیڑ کر اُسے چیر پھاڑ ڈالتا۔"

رحیم داد نے حیرت سے کہا۔ "بہت زور آور اور جی دار لگتا ہے۔"

"میں نے اپنی آنکھوں سے کئی بار اسے اسی دلیری سے سور کا شکار کرتے دیکھا ہے۔" مراد خاں نے بتایا۔ "بہت خطرناک انداز میں شکار کرتا ہے۔ میں نے کئی بار منع بھی کیا ہے مگر یہ نہیں مانا۔" اُس نے مردہ سور کی طرف اشارہ کیا۔ "لگتا ہے، اس کا شکار بھی سینا ہی نے کیا ہے۔ پر اس بار کچھ چوک ہو گئی۔ سور نے بپھر کر اپنے دانتوں سے پوری ٹانگ چیر ڈالی۔" اس کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی۔ اس نے رادھانی سے کہا۔ "رادھانی! خون بہت بہہ گیا۔ اس کی مرہم پٹی کے لیے کسی کو فوراً بلا ورنہ یہ مر جائے گا۔"

رادھانی نے حکم ملتے ہی اونچی آواز سے چیخ چیخ کر ہانکا کرنے والوں کو پکارا۔ ذرا دیر میں کئی مصلّی اور کٹانے وہاں پہنچ گئے۔ ایک نے جھٹ پگڑی اتاری اور خون بند کرنے کی غرض سے اُسے جلدی جلدی زخم پر لپیٹنے لگا۔ دوسرے بھی زخمی سینا کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے کئی اور پگڑیاں

لیس اور زخمی ٹانگ پر لپیٹ دیں۔ خون بند ہوگیا۔ سب نے زخمی کُتّا نے کو ہاتھوں پر اٹھایا اور ایک طرف بڑھنے لگے۔ سینا اب بے سدھ ہو چکا تھا۔ اُس کی گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ جھولتے ہوئے ہاتھ بے جان نظر آ رہے تھے۔ وہ بہت آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔

اس خوفناک حادثے کے باوجود شکار کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر جب دن ڈھلے جھُنڈوں کے گھنے درختوں کے نیچے اندھیرا پھیلنے لگا تو شکار ختم کر دیا گیا۔ مراد خاں جیپ کی جانب بڑھا۔ رحیم داد اور رادھانی اس کے ساتھ تھے۔ ہانکا کرنے والے مراد خاں کے مزارع اور کمّی ہی تھے وہ بیگار پر لگائے گئے تھے۔ کوتیوں اور اُن کے شکاری کتّوں کے ساتھ وہ بستی کی طرف چلے گئے۔ جیپ کے قریب پہنچ کر رادھانی نے مراد خاں اور رحیم داد کو تھرماس سے ایک بار پھر چائے پلائی۔ اس دفعہ چائے کے ساتھ پلیٹوں میں بھنا ہوا گوشت اور بسکٹ بھی تھے۔

تینوں جیپ میں سوار ہوئے۔ شاہانی نے جیپ اسٹارٹ کی۔ جیپ اوجھڑ سے نکل کر بستی میں پہنچی مگر شاہانی وہاں نہیں ٹھہرا۔ وہ اُس سالھہ کے پاس بھی نہیں رُکا جس میں ہانکا کرنے والوں اور کوتیوں کے علاوہ زخمی سینا بھی پڑا تھا۔ شاہانی نے نہ زخمی کا حال پوچھا اور نہ ہی اس کے بارے میں رحیم داد اور رادھانی سے کوئی بات کی۔ ویسے اس کے لیے یہ کوئی نیا یا انوکھا حادثہ نہیں تھا۔ سور کے شکار میں پہلے بھی ایسے کئی واقعات پیش آ چکے تھے۔ ان حادثات کے نتیجے میں دو ہانکا کرنے والے زخمی ہو کر ہلاک بھی ہو چکے تھے۔

☆

جیپ ہچکولے کھاتی کچے راستے پر دوڑتی رہی اور جب ہموں والی میں داخل ہوئی تو سورج مغرب کے اندھیرے غار میں اُتر چکا تھا۔ اور اس کی الوداعی کرنیں درختوں کی اونچی اونچی شاخوں پر دھندلی پڑتی جا رہی تھیں۔ کہر میں لپٹی ہوئی سرد شام آہستہ آہستہ فضا میں پگھلتی جا رہی تھی۔ شاہانی اور رحیم داد جیپ سے اتر کر حویلی کے اندر چلے گئے۔ رادھانی باہر ہی ٹھہر ا رہا۔

رحیم داد بہت تھک گیا تھا۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور کرسی پر نڈھال ہو کر نیم دراز ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ملازم نے غسل خانے میں گرم پانی کی بالٹی رکھ دی۔ رحیم داد نے گرم پانی سے غسل کیا۔ اُجلے کپڑے پہنے اور حویلی کی بیٹھک میں پہنچ گیا۔ مراد خاں شاہانی ابھی تک نہیں پہنچا تھا مگر رحیم داد کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ شاہانی نہا دھو کر اور صاف ستھرا لباس پہنے چند ہی منٹ بعد آ گیا۔ اس کے پہنچتے ہی بوتل اور گلاس بھی آ گئے۔ دو بڑی بڑی تھالوں میں تلے ہوئے مرغ بھی میز پر رکھ دیئے گئے۔ فوراً پینے پلانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

شاہانی نے دو گلاس چڑھانے کے بعد تیسری بار گلاس بھرا اور رحیم داد سے کہا "چوہدری! میں آج زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گا۔ بہت تھک گیا ہوں۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ بلند کیا۔ "پولانی میرا انتظار کر رہی ہے۔ اِدھر آتے ہوئے میں نے اُسے دیکھا تھا۔ ایسی بوٹا اور پوپٹ لگ رہی تھی کہ طبیعت ایک دم پھڑک اٹھی۔ جواب نہیں اُس کا۔"

"یہی گل تو کل رات سلھڑی کے بارے میں کہہ رہا تھا۔"

"وہ کچھ اور چیز ہے۔" شاہانی ہنس کر بولا۔ "سچ بتا، ہے کہ نہیں؟"

رحیم داد نے نشہ میں جھوم کر کہا۔ "دل کی بات پوچھ تو سلھڑی مجھے بھی پسند ہے۔"

"جب ہی آج صبح تو اُسے مٹھارنے کی کوشش کر رہا تھا۔" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔

"میں تاڑ گیا تھا کہ تیری طبیعت سلھڑی پر آ گئی ہے۔ وہ رن ہی ایسی پھڑک دار ہے۔"

"تیرے پاس تو پولانی رہے گی۔" دل کی بات رحیم داد کی زبان پر آ گئی۔ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "سلھڑی تو آج رات خالی ہے۔"

"کیا مطلب؟" شاہانی نے اُسے نظر بھر کر دیکھا۔ "صاف گل کر۔ تو چاہتا کیا ہے؟"۔

"تیری مرضی جاننا چاہتا ہوں۔" رحیم داد نے شاہانی سے نظریں نہیں ملائیں۔ تھال سے مرغ کی ٹانگ اٹھا کر گوشت دانتوں سے نوچنے لگا۔

"چوہدری! سلھڑی کی گالہہ نہ کر۔" شاہانی اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ "سلھڑی کے معاملے میں میرے کئی یار مجھ سے ناراض ہو گئے۔ ڈیرہ غازی خاں کے تمن دار سر بلند خاں دریشک

سے تو ایسا بگاڑ پیدا ہوا کہ اب تک اس سے بول چال بند ہے۔" اُس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔
" وہ میری سجن ہے ایسی جند جانی ہے کہ میں اُسے کسی کے پاس نہیں جانے دیتا۔ تیکوں پتہ نہیں سولہ سال سے اوپر ہو گئے، وہ میرے پاس ہے پر اس سے کبھی میرا دل نہیں بھرتا۔ سچ پوچھ تو میں اسی کے لیے ہموں والی آتا ہوں۔ وہ اس حویلی کی جان ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ شاہانی نے ایک اور بڑا گھونٹ بھرا۔ ہاتھ سے مونچھوں کے بھیگے ہوئے بال پونچھے، رحیم داد کی جانب مسکرا کر دیکھا۔" چوہدری! میں تیرے پاس آج کسی دوسری پھڑک دار اور پوپیٹ رن کو بھجوا دوں گا۔ حویلی میں کئی زوردار اور سوہنڑی رناں موجود ہیں۔ تیرا جی خوش ہو جائے گا۔" اُس نے نشے میں لہرا کر قہقہہ لگایا۔" فکر نہ کر۔ اپنی پسند تو مجھ پر چھوڑ دے۔"

" پہلے بھی میں نے کب تجھ سے اپنی پسند کی گل کی۔" رحیم داد نے کہا۔" سلھڑی کی بات تو ایسے ہی نکل آئی۔" اس کا لہجہ دھیما اور بجھا ہوا تھا۔" تو میری بالکل فکر نہ کر۔ کسی کو میرے پاس بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنی حویلی میں اکیلا ہی سوتا ہوں۔ مدت ہو گئی اس طرح سوتے ہوئے۔"

" لگتا ہے تو بھی ناراض ہو گیا۔" شاہانی نے رحیم داد کی افسردگی اور دبا دبا احتجاج محسوس کرتے ہوئے کہا۔" یہ سلھڑی بہت ظالم رن ہے۔ اس کی وجہ سے ہمیشہ یار دستوں سے بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔"

" پر اس معاملے میں مجھ سے تیرا کوئی بگاڑ پیدا نہیں ہو گا۔" رحیم داد نے اُسے یقین دلانے کی کوشش کی۔" تو میرا یار ہے اور سدا یار رہے گا۔ اوّل تو میں کسی سے یاری کرتا نہیں اور جب کرتا ہوں تو جی جان سے کرتا ہوں۔ ابھی تو میرا اور تیرا نیا نیا معاملہ ہے۔" اُس کے لہجے میں جوش و خروش پیدا ہو گیا۔" آگے تو خود دیکھ لے گا۔ میں خالی پیلی گلاں نہیں کرتا۔"

" میرے دل کی بات جاننا چاہتا ہے تو سن لے۔" مراد خاں شاہانی نے ایک ہاتھ سے اپنا سینہ تھپ تھپاتے ہوئے کسی قدر جوشیلے لہجے میں کہا۔" میرا رب جانتا ہے، میں تجھے کتنا چاہتا ہوں۔" اس نے گہری سانس بھری۔" چوہدری! میرا کوئی بھائی نہیں۔ سچ کہتا ہوں، تجھے اپنے چھوٹے بھائی سماں پیار کرتا ہوں۔ ویسے بھی تو بہت چنگا بندہ ہے۔" اس نے شراب کی چسکی لگائی۔" اور

آج تو تو نے کمال ہی کر دیا۔" مراد خاں نے حملہ آور سور کا حوالہ دیا۔" باہر والا مجھ پر کیسا دانت نکال کر جھپٹا تھا۔ تو نے دیکھا نہیں، میری رائفل ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی تھی اور میں بالکل اس کے سامنے تھا۔ تیرے گولی چلانے سے میں بال بال بچ گیا ورنہ میں بھی سینا کی طرح زخمی پڑا ہوتا۔"

"ایسی گل نہ کر۔" رحیم داد نے انکسار سے کام لیا۔" میں نے کیا کمال دکھایا۔ شکار میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔ اور تو تو پرانا شکاری ہے۔ ایسے واکعات تو نے شکار میں بہت دیکھے ہونگے۔"

مراد خاں شاہانی نے کچھ نہیں کہا۔ چپ بیٹھا دانتوں سے تلے ہوئے مرغ کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا رہا پھر اس نے اپنا گلاس اٹھایا اور غٹا غٹ چڑھا گیا۔ خالی گلاس میز پر رکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔" چوہدری! اب میں چلوں گا۔ تو بھی اپنا گلاس ختم کر۔"

رحیم داد نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور خالی کر دیا۔

" چوہدری! تو اپنے کمرے میں جا۔" مراد خاں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔" سلھڑی تیرے پاس پہنچ جائے گی۔"

" رہنے دے شاہانی۔" رحیم داد نے اٹھتے ہوئے کہا۔" سلھڑی کی گل تو پہلے ہی ختم ہو گئی۔"

" بکواس نہ کر۔" سردار شاہانی نے مسکرا کر رحیم داد کو پیار سے ڈانٹا۔" سلھڑی آج رات تیرے ہی پاس رہے گی۔" وہ نشے سے جھوم کر ڈگمگایا۔" یوں سمجھ یہ تیرے سچے نشانے کا انعام ہے۔ اب تو جا۔" شاہانی لڑکھڑاتے قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

رحیم داد بھی بیٹھک سے نکلا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ تھکا ہوا سا کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں بار بار دروازے کی جانب اٹھ جاتیں۔

چند منٹ بعد دروازہ کھلا۔ رحیم داد نے بے تاب ہو کر پہلو بدلا مگر وہ سلھڑی نہیں تھی، ملازم کھانا لے کر آیا تھا۔ اس نے کھانا میز پر رکھ دیا اور دبے قدموں واپس چلا گیا۔ رحیم داد نے کھانا نہیں کھایا۔ اشتہا ہی نہیں تھی اس نے اپنی پگ اتار کر کھونٹی پر لٹکائی۔ جوتے اتارے اور بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے رضائی اٹھا کر سینے پر ڈال لی۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی لیکن نہ کوئی آہٹ ہوئی نہ آواز۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ رحیم داد جاگ رہا تھا اور بستر پر خاموش لیٹا تھا مگر وہ زیادہ دیر تک چین سے نہ لیٹ سکا۔ اس نے کروٹ لی، بے قرار ہو کر اٹھا اور تکیے کے سہارے اونچا ہو کر بیٹھ گیا۔ وقت گزرتا رہا۔ پانچ منٹ گزرے، دس منٹ گزرے۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ اس کی زرد زرد روشنی در و دیوار پر پھیل گئی

رحیم داد نے کئی بار بے چینی سے پہلو بدلا پھر پلنگ سے اترا، سلیپر پہنے، لیمپ کی طرف بڑھا قریب گیا، ہاتھ بڑھایا، ٹھٹکا اور ہاتھ کھینچ لیا۔ لیمپ کی لو مدھم نہیں کی، واپس آیا اور بستر کے بجائے چپ چاپ ایک بار پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ رات اور سنسان ہو گئی۔

گھنٹہ بھر سے زیادہ وقت گزر گیا۔ دروازہ بدستور بھڑا ہوا تھا۔ رحیم داد نے گہری سانس بھری، اٹھا اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں مگر سویا نہیں۔ اسی عالم میں اس نے کمرے کے باہر چاپ سُنی۔ چاپ دھیرے دھیرے قریب آتی گئی۔ دروازہ چرچرایا۔ رحیم داد نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا، سلطری دہلیز پر کھڑی تھی۔ اس نے زیرِ لب مسکرا کر رحیم داد پر ایک نظر ڈالی، مڑی دروازہ بند کیا اور کنڈی چڑھا دی۔ وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی ہوئی رحیم داد کی جانب بڑھی اور اس کے رُو بہ رُو تیر کے مانند تن کر کھڑی ہوگئی۔ وہ سرخ دو شالہ اوڑھے ہوئے تھی۔ چولا ڈھیلا ڈھالا اور سفید تھا مگر تہمد کے بجائے وہ گھگھرا پہنے ہوئے تھی۔ جس پر سرخ اور سیاہ گل بوٹے تھے۔ آنکھوں میں دنبالہ کا جل تھا، ناک میں بڑا سا کوکا تھا، ہونٹ گہرے گلابی تھے۔ چہرے پر نکھار اور شگفتگی تھی۔ وہ خوب سج دھج کے ساتھ آئی تھی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ابھی ابھی سنگھار کیا ہے۔

رحیم داد نے اسے بے قرار نظروں سے دیکھا اور ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا، مسکرا کر بولا۔ ”کھڑی کیوں ہے؟ بیٹھ جا سلطری۔“

”تو نے مجھے بلا ہی لیا۔“ سلطری نے گردن ترچھی کی اور مڑ کر رحیم داد کو دیکھا ”سئیں چوہدری! تو بہت تکھا اور زور آور ہے۔“ اس نے ایک ہاتھ سے اپنے گھگھرے کا گھیر سنبھالا

لچکتی، بل کھاتی آگے بڑھی اور پاؤں لٹکا کر بستر پر بیٹھ گئی۔ چند لمحے خاموش رہی پھر مسکراتے ہوئے بڑے ٹھسے سے بولی: ''سردار مجھے کسی کے پاس جانے نہیں دیتا۔ تیری گالھ اس نے کیسے مان لی۔ یہ بھید اپنی سمجھ نہیں آیا۔''

رحیم داد اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے بولا: ''یہ بتا، تو نے اتنی دیر کیوں لگا دی؟'' اس نے سلھڑی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا: ''سردار نے روک لیا ہو گا؟''

''نا سئیں!'' وہ گردن ہلا کر بولی: ''وہ تو پولانی کے پاس ہے۔''

''پر وہ تجھے چاہتا بہت ہے۔'' رحیم داد نے اسے چھیڑا: ''تجھ میں ایسی کیا بات ہے جو وہ تجھے اتنا چاہتا ہے؟''

''پتہ نہیں سئیں!'' سلھڑی نے نظریں جھکا کر شرمانے کی کوشش کی: ''پر میں بھی اُسے اتنا ہی پیار کرتی ہوں۔ برسوں سے اس کے ساتھ ہوں۔'' اس نے گردن اونچی کی: ''اس حویلی میں مجھے بیس سال تو ہو گئے ہوں گے۔''

''بیس سال!'' رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا: ''جب تو یہاں آئی ہو گی۔ شاہانی تب چھوہرا رہا ہو گا۔ تو اس سے عمر میں زیادہ تو نہیں لگتی۔''

''نا سئیں! میں اس سے کچھ زیادہ ہی ہوں گی۔'' سلھڑی انکار نہ کر سکی: ''سردار کو بھی اس کا پتہ ہے۔''

رحیم داد کا تجسس اور بڑھا، اس نے کرید کر پوچھا: ''صاف بتا۔ تیری گل سمجھ نہیں آئی۔''

''تو سمجھ بھی نہیں سکتا۔'' وہ شوخی سے مسکرائی: ''تب وڈا سردار بجیب خاں زندہ تھا۔'' سلھڑی نے صاف گوئی سے کام لیا: ''میں پہلے اسی کے پاس ہوتی تھی۔ وہ بہت ڈاڈھا اور زور آور سردار تھا کھرا بلوچ۔ یہ وڈی اس کی ڈاڑھی تھی۔'' سلھڑی نے ہاتھ پھیلا کر بتایا: ''تیری ڈاڑھی اس کے آگے کچھ نہیں۔ وہ بہت رن رسیا تھا۔ جو سوہنڑی اور پوپٹ رن نظر آتی، اٹھوا کر حویلی میں ڈال لیتا۔ روز ہی نئی نویلی رن اٹھوا تا تھا۔''

''تجھے بھی اس نے اٹھوایا تھا؟'' رحیم داد نے دریافت کیا: ''میرا مطلب ہے، مراد خاں کے

پیُو سردار نجیب خاں نے تجھے اٹھوا کر اپنے پاس رکھا ہوا تھا؟"

"ناسئیں!" سلطڑی نے فوراً وضاحت کی۔" اس کا مرن ہو گیا۔ مجھے اس کے پیچھے جھوٹ نہیں بولنا۔ مجھے تو منصور خاں ڈھانڈے نے اٹھوایا تھا۔ وہ بھی بیٹ کا بہت وڈا سردار ہوتا تھا بس ان دنوں بہل میں ہوتی تھی۔ میرا پرنا ہو چکا تھا۔ میرا گھر والا تھا۔ اس کا ناں ہانو تھا۔ وہ جتوال تھا۔ اپنے اٹھ پر مال اسباب لاد کر دور دورے جاتا تھا۔ اس کے پاس دو اٹھ تھے۔ اچھی گزر بسر ہوتی تھی۔ اس سے میرا ایک پُتر بھی ہوا۔"

"پر تجھے تو ڈھانڈلہ سردار نے اٹھوالیا تھا۔" رحیم داد کے لہجے میں استعجاب تھا۔" تو بہی بتا رہی تھی نا؟ فیر تو مراد خاں کے پُیو کے پاس کیسے پہنچ گئی؟"

" وہ ایسا ہوا سئیں!" سلطڑی نے بتایا۔" سردار منصور نے جب مجھے اٹھوالیا تو میں اس کی حویلی میں لگ بھگ سال بھر رہی۔ ویسے وہ بھی مجھے بہت پیار کرتا تھا پر بہت ظالم اور خونی تھا۔ اس نے بہت خون کیے۔ ہانو کا بھی اسی نے خون کیا۔" سلطڑی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کے تابندہ چہرے پر دکھ کا ہلکا ہلکا غبار بکھر گیا۔" ہوا یہ کہ ہانو ایک اندھیاری رات کو اٹھ پر بیٹھ کر بہل سے ادھر آیا۔ اس نے اٹھ ڈھانڈے کی حویلی کی دیوار سے لگایا، کود کر اندر پہنچا۔ وہ مجھے لینے آیا تھا۔ بہت جی دار اور دلیر تھا، ذرا بھی نہ ڈرا۔ وہ مجھے بہت پیار کرتا تھا۔"

" سب ہی تجھے پیار کرتے ہیں۔" رحیم داد نشے میں لہرا کر بولا۔" تو ہے بھی تو کتنی سوہنی۔" وہ بہکا مگر فوراً سنبھل گیا۔ اس نے بات کا رُخ موڑتے ہوئے کہا۔" اچھا اب آگے کی سُنا۔"

" ہانو حویلی کے اندر پہنچا تو سردار منصور ڈھانڈے کو کسی طرح اُس کے آنے کا پتہ چل گیا۔"

سلطڑی نے رحیم داد کی مداخلت نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔" ہانو چھپتے چھپتے میں میرے پاس کھڑا تھا اور مجھے اپنے سنگ لے جانے کی گھات میں تھا۔ پر جیسے ہی ہم دونوں حویلی سے نکلے، دیکھا، سامنے ڈھانڈلہ کھڑا ہے۔ اس کے کئی کرندے بھی موجود تھے۔ انہوں نے جھپٹ کر ہانو کو دبوچ لیا۔ مجھے بھی پکڑ لیا۔ سردار نے مجھے تو ایک کوٹھری میں بند کر کے باہر سے تالا ڈال دیا اور ہانو کو اپنے سنگ لے گیا۔" اس نے گہری سانس بھری۔" وہ اتنا گصے میں تھا کہ

صبح بھی نہ ہونے دی۔ رات ہی کو ہاتو پر اپنے شکاری کتے چھوڑ دیے۔ کتوں نے چیر پھاڑ کے اسے ختم کر دیا۔ اس کی کٹی پھٹی لاش میرے پاس کوٹھری میں بھجوا دی۔"

"اس کی لاش دیکھ کر تینوں بہت دکھ ہوا ہوگا۔"

"سئیں! یہ بھی بتانے کی گل ہے۔" سلطری کا چہرہ اور افسردہ ہوگیا۔ "ہاتو کے ساتھ میرا پرنا ہوا تھا۔ وہ میرے پیو کے گھر سے میکوں ودا کر کے لایا تھا۔ میرے پتر کا پیو تھا۔ بہت جڑیا اور گھبرو جوان تھا۔"

"ایسی گال تھی تو سونے میں کسی رات تو چھری سے ڈھانڈے کا گلا کاٹ دیتی۔" رحیم داد نے سردار منصور خاں کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کیا۔

"تو کیسی گل کر رہا ہے سئیں!" وہ حیران و پریشان ہو کر بولی۔ "میں ایسا کیسے کر سکتی تھی۔ سردار منصور بہت جڑیا اور زور آور تھا۔" اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ "ظالم اور خونی اتنا زبردست تھا کہ ایک بار تو اپنے سکّے بھائی کا اس نے خون کر دیا تھا۔ ویسے اس کا بھائی بھی سردار تھا اور زور آور بھی تھا اس کا ناں محمود خاں ڈھانڈلہ تھا۔ وہ بھی بہت ٹھرکی اور رن رسیا تھا۔"

"وہ بھی تجھے پیار کرنے لگا تھا؟"

"ایسی ہی گالہہ تھی سئیں!" سلطری نے گردن ہلا کر اعتراف کیا۔ "وہ بھی مجھے پیار کرتا تھا۔ رات کے اندھیارے میں چھپ چھپ کر میرے پاس آتا۔ ایک رات وہ میری کوٹھری میں تھا۔ منصور کو پتہ چل گیا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ اُسے میرے ساتھ دیکھ کر غصے سے پاگل ہوگیا۔ بھری ہوئی رائفل اُس کے ہاتھ میں تھی اس نے ہم دونوں پر گولی چلا دی۔ میں تو صاف بچ گئی پر ایک گولی محمود خاں کے کندھے میں اتر گئی۔ منصور نے تو اپنے تئیں اُس کا خون کر ہی دیا تھا پر وہ مرا نہیں۔ گھاؤ زیادہ گہرا نہیں تھا۔"

"بہت ہنگامہ اور رولا پڑا ہوگا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"مجھے تو سئیں اتنا پتہ ہے کہ جھگڑا دونوں بھائیوں کا تھا پر میں شامت دی ماریا

ڈھانڈلوں کی نظروں میں بھوت بلا بن گئی۔" سلھڑی نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔" انہوں نے مجھے بالوں سے پکڑ کر زمین پر گھسیٹا، بہت مارا پیٹا۔ بدن پر ہر جگہ چوٹ آئی پر میں نے کچھ نہیں کہا۔ کوٹھڑی میں اکیلی پڑی درد سے بلکتی رہی، روتی رہی۔ اُدھر ڈھانڈلوں نے طے کیا کہ مجھے حویلی سے نکال دیا جائے۔"

"اس طرح تجھے اپنے گھر جانے کا موقع تو مل ہی گیا ہوگا؟"

"ایسا نہیں ہوا سائیں! سردار منصور مجھے چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔" سلھڑی بولی۔ "تب ڈھانڈلہ تمن نے جرگہ بلایا۔ جرگے میں خاندان والے ہی بیٹھے۔ کوئی ملک، مقدم یا معتبر نہیں بیٹھا۔ جرگے نے مجھے حویلی سے باہر نکالنے کا فیصلہ کیا پر منصور نے مجھے ماپیو کے پاس نہیں جانے دیا۔ وہ تب تک زندہ تھے اس نے مجھے دو ہزار میں سردار نجیب خاں کے ہاتھ بیچ دیا۔ اس طرح میں اس حویلی میں آ گئی۔"

"تو اس حویلی میں تو اس طرح آ گئی۔" رحیم داد مسکرا کر بولا۔" پر مراد خاں تیرے ساتھ کیسے لگ گیا؟"

"سائیں! اب تجھ سے کیا چھپانا۔ اس کے پیو سردار نجیب ہی نے لگایا تھا۔" سلھڑی نے تیکھے لہجے میں بتایا۔

"سردار نجیب نے لگایا تھا؟" رحیم داد نے حیرت سے چونک کر سوال کیا۔" یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"بس ایسے ہی جیسے کہہ رہی ہوں۔" سلھڑی نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔" میں سردار نجیب کے پاس لگ بھگ تین سال رہی۔ ان دنوں مراد خاں لہور میں پڑھتا تھا۔ رہتا بھی وہیں تھا۔ چھٹیوں میں صرف بھکر آتا تھا۔ ہموں والی کبھی نہیں آیا تھا۔ کم سے کم میں نے تو اسے ان دنوں نہیں دیکھا۔ فیر ایسا ہوا سائیں کہ مراد خاں کے پرنے کی بات چلی۔ تب وہ ستارہ اٹھارہ برس کا رہا ہوگا۔" اس نے رحیم داد کی جانب نظر بھر کر دیکھا۔" انہی دنوں وہ پہلی بار میرے سامنے ہموں والی آیا۔ سردار نجیب بھی اس کے ساتھ آیا تھا۔ حویلی میں مراد خاں کے رہنے کے لیے

علیحدہ کمرے میں بندوبست کیا گیا۔"

"یہی کمرہ ہوگا جس میں وہ آج کل ٹھہرا ہوا ہے؟"

"جی سئیں! وہ سدا اسی کمرے میں ٹھہرتا ہے۔" وہ رحیم داد کو صاف گوئی سے سب کچھ بتاتی رہی۔" مراد خاں کو سموں والی میں آئے ہوئے دوسرا یا تیسرا روز تھا کہ ایک شام سردار نجیب نے مجھے بلایا، کہنے لگا، سلھڑی! تینکوں پتہ ہی ہے کہ مراد کا پرنا ہونے والا ہے پر وہ بالکل بھولا بلا ہے۔ رن کے بارے میں اسے کچھ اتا پتا نہیں۔ تو آج رات اس کے ساتھ سوا اور اسے سب کچھ سمجھا دے، بتا دے۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے شرما گئی۔ دھیمے لہجے میں بولی۔" وڈے سردار کے حکم پر میں رات کو مراد خاں کے کمرے میں گئی اور اس کے ساتھ سوئی۔"

"اچھا تو یہ گل بات ہے۔" رحیم داد کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔" یہ کیوں نہیں کہتی کہ اس لائن پر تو نے ہی مراد خاں کو لگایا ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"نا سئیں! ایسی گل بالکل نہیں۔" سلھڑی نے فوراً انکار میں گردن ہلائی۔" وہ ایسا بھولا بلا نہیں تھا جیسا اس کا پیو سمجھتا تھا۔ وہ پہلے ہی سے سب کچھ جانتا تھا۔ لہور میں کنجریوں کے پاس جانا رہتا تھا۔" وہ کھل کھلا کر ہنسنے لگی۔" ہیرا منڈی کی کنجریوں نے اسے ایک دم فرسٹ بنا دیا تھا۔ یہ گالہہ اس نے مجھے خود بتائی تھی۔"

"یہ بتا اس رات کے بعد مراد خاں بعد میں بھی تیرے پاس آیا؟" رحیم داد نے دلچسپی سے دریافت کیا۔

"بالکل آتا رہا۔ پرنا ہو گیا تب بھی آتا رہا۔" سلھڑی نے رسان سے کہا۔" وڈے سردار سے چھپ چھپ کر میرے پاس آتا تھا۔"

"سردار نجیب خاں کو بالکل پتہ نہ چلا؟"

"کچھ ہی دنوں بعد اسے پتہ چل گیا تھا۔" سلھڑی نے انکشاف کیا۔" مجھ پر وہ بہت نراض ہوا پر مراد خاں سے کچھ نہیں بولا۔ وہ اس کا اکلوتا پتر تھا۔ بہت لاڈلا بھی تھا۔ پہلے تو اس نے گصے میں کئی بار میری مار کٹائی بھی کی۔ فیر ایک روز اپنے یار سردار سکندر خاں

کھوسہ کے پاس راجن پور بھیج دیا پر مجھے اس کے حوالے کر کے اسے دکھ بھی ہوا۔ وہ مجھے بہت چاہتا تھا۔ اس سے میری ایک لڑکی بھی پیدا ہوئی پر وہ کچھ ہی مہینوں بعد مر گئی۔ سردار نجیب خاں بھی زیادہ دن زندہ نہ رہا۔ میرے راجن پور جانے کے سال ہی بھر کے اندر اندر اس کا مرن ہو گیا۔"

"تو کھوسہ سردار کے پاس راجن پور میں ہوتی تھی۔ دوبارہ یہاں کیسے آ گئی؟" رحیم داد نے مسکرا کر اسے ایک بار پھر چھیڑا۔ "کھوسے کے گھر میں بھی تیری وجہ سے جھگڑا اکھڑا ہو گیا ہو گا۔"

"ایسا جھگڑا اکھڑا تو ہوا تھا۔ سردار سکندر خاں کا ایک چاچا بھی مجھ سے چپکے چپکے پیار جتانے لگا تھا۔ وہ تو زبردست ٹھرکیا تھا۔ ادھکڑ تھا پر ایسا رن رسیا کہ میں تجھے کیا بتاؤں۔ وہ مجھے اٹھوا کر اپنی حویلی میں لے جانا چاہتا تھا۔" سلھڑی مسکرا مسکرا کر بتاتی رہی۔ "پر چاچا بھتیجے کا جھگڑا زیادہ بڑھنے نہیں پایا۔ ہوا یہ کہ سردار نجیب کے مرن کے کچھ ہی مہینے بعد مراد خاں مجھے واپس لینے سردار سکندر خاں کھوسہ کے پاس پہنچا اور تین ہزار روپے دے کر مجھے راجن پور سے لے آیا۔ تب سے میں مراد خاں کے پاس ہوں۔ اس حویلی سے اب تک کہیں نہیں گئی۔"

سلھڑی کے چہرے پر باتیں کرتے ہوئے بار بار مختلف تاثرات ہوتے۔ کبھی اس کا چہرہ بجھ جاتا کبھی دمکنے لگتا۔ اسے ماضی کے ہنگامے بیان کرنے میں یکسوئی مل رہی تھی۔ لطف آرہا تھا۔ اپنے چاہنے والوں اور ان کی رقابتوں کے ذکر سے اسے خوشی حاصل ہو رہی تھی۔ رحیم داد پر اپنی اہمیت جتانے کا بہانہ مل گیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ صاف گوئی سے ایک ایک تفصیل بتاتی رہی۔

رحیم داد نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا۔ "ایک گال تو بتا۔ تیرا نام سلھڑی کیوں ہے؟ سلھڑی تو سیدھی سادھی گئو کو کہتے ہیں۔" رحیم داد نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "تو کسی طرف سے سیدھی سادھی نہیں لگتی۔"

"میں جب چھوٹی سی لڑکی تھی تو بہت بھولی بھالی تھی۔" وہ نظریں جھکا کر شرماتے ہوئے

بولی۔" اماں نے اسی لیے میراناں سلھڑی رکھ دیا۔ وہ مجھے یہی بتاتی تھی۔"

" تو کچھ ہی کہے پر تو سلھڑی تو ہرگز نہیں لگتی۔" رحیم داد بدستور ہنستا رہا۔" تو تو امبربیل ہے۔ ایک بار جس سے لگ جائے فیر وہ تیرے پیچ سے نہیں نکل سکتا۔ تجھ میں بات ہی ایسی ہے۔" اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے سلھڑی کو دیکھا۔" تو نے کبھی یہ بھی سوچا، تیرے اتنے چاہنے والے کیوں ہیں؟"

" میکوں کیہ پتہ؟" وہ بڑے ناز سے بولی۔

رحیم داد نے گہری سانس بھری اور سلھڑی کا چہرہ تکنے لگا۔ سلھڑی کا چہرہ ہلکی ہلکی مسکراہٹ سے نکھر کر اور شگفتہ ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں کہکشاں اتر آئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر انگڑائی لی۔ سرخ دوشالہ ڈھلک کر نیچے گر گیا۔ اس کے سینے پر لہریں اٹھنے لگیں رحیم داد کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہو گئی۔ وہ بے قرار ہو گیا۔

صبح تاروں کی چھاؤں میں سلھڑی اٹھ کر جانے لگی تو رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رسان سے بولا۔" سلھڑی! تو جا رہی ہے؟"

سلھڑی نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ مسکرا کر گویا ہوئی۔" جی سئیں!" وہ آگے بڑھی، دروازہ کھولا اور باہر چلی گئی۔

۴۵

شام کی کہر چادر اوڑھ کر روز بہ روز دھندل ہوتی جا رہی تھی۔ تیز اور چمکیلی دھوپ کی تمازت کم ہو گئی۔ راتیں طویل اور سرد ہو گئیں۔ رحیم داد ہموں والی میں ٹھہرا رہا۔ سردار مراد خاں شاہ نے اسے واپس کوٹلہ ہرکشن جانے نہ دیا۔

سلھڑی دوبارہ رحیم داد کے کمرے میں نہ آئی، تنہائی میں بھی مڈھ بھیڑ نہیں ہوئی۔ نہ بات چیت کی نوبت آئی۔ نظر بھی آتی تو اپنے مچلتے ابلتے جسم کو لہراتی ہوئی بے نیازی سے گزر جاتی۔ رحیم داد کی جانب مطلق توجہ نہ دیتی مگر وہ جتنا اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی رحیم داد اس کے لیے اتنا ہی بے قرار ہوتا جا رہا تھا۔ ان دنوں اس کے ذہن پر سلھڑی ساون کی گھٹا بن کر چھائی ہوئی تھی۔

رحیم داد نے مراد خاں کو ٹٹولا۔ باتوں باتوں میں سلھڑی کا ذکر کئی بار چھیڑا لیکن اس نے حوصلہ افزائی نہ کی، صاف ٹال گیا۔ ویسے وہ اپنی زمیں داری کے بکھیڑوں میں کچھ زیادہ ہی الجھا ہوا تھا۔ ہموں والی میں اس کے قیام میں اسی باعث اضافہ بھی ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ربیع کی فصل پر بہت توجہ دے رہا تھا۔ اس دفعہ وہ زیادہ بڑے رقبے پر گندم کی بوائی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے جھنگر اور چھچھ بھی صاف کرانے شروع کر دیئے تھے۔ یہ زمین وہ قابلِ کاشت بنانا چاہتا تھا، کھیتی باڑی کے ساتھ ساتھ اس پر آم کے باغات بھی لگانا چاہتا تھا۔

مراد خاں نے اپنی ان سرگرمیوں میں رحیم داد کو بھی شریک کر لیا تھا۔ وہ اسے اپنے ہمراہ

ناشتے کے بعد ہے جاتا۔ دن کھیتوں کے درمیان اِدھر اُدھر گھومنے، مزارعوں کو ڈانٹنے ڈپٹنے، فصل کی آب پاشی کے لیے آڑے، میگھے اور نکے درست کرانے اور ایسی ہی دوسری مصروفیات میں گزر جاتا۔ سورج غروب ہوتا تو مراد خاں اور رحیم داد طلوع ہوتے۔ نہا دھو کر تازہ ہوتے صاف ستھرے لباس پہنتے اور شغل مے نوشی کرتے۔

حویلی میں نئی نئی نوجوان عورتیں اور لڑکیاں اٹھا کر لائی جاتیں۔ کسی کو رکھ لیا جاتا، کسی کی قیمت وصول کر کے واپس کر دیا جاتا۔ کسی کو بلا معاوضہ چھوڑ دیا جاتا۔ کسی کو تحفے کے طور پر دوست زمیں داروں کو بخش دیا جاتا۔ اس معاملے میں فیصلے کا انحصار سردار مراد خاں کی مرضی اور موڈ پر تھا۔

عام طور پر ان مزارعوں کی نوجوان عورتیں اٹھوائی جاتیں جو جھنگر اور چھپر صاف کرنے کی بیگار سے کنی کتراتے، احتجاج کرتے اور دوسرے مزارعوں کو اکسانے کی کوشش کرتے۔ مراد خاں زیادہ خفا ہوتا تو عورتوں کے ساتھ مویشی بھی اٹھوا لیتا، مزارعوں کو بے دخل کر دیتا۔ اُن کے گھروں میں اپنے کارندوں کے ذریعے آگ لگوا دیتا، پولس سے ساز باز کر کے جھوٹے مقدمے بنواتا۔ جب سے سموں والی آیا تھا اُس کی وسیع زمیں داری کے ہر مزارع اور ہر فرد پر خوف طاری تھا۔

انھی دنوں بیسٹ کے ایک جاگیر دار فرط خاں ڈھانڈلہ کے بچے کے مونڈن کی تقریب ہوئی۔ پہلوٹی کا بیٹا تھا اور بڑی منت مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ لہٰذا دھوم دھام سے جشن منایا گیا۔ تقریب کا آغاز حسبِ دستور پیر کی درگاہ پر حاضری دینے اور منت کے مطابق منوتی چڑھانے سے ہوا۔ سرداروں اور بڑے زمیں دار ڈھانڈیوں کے گھرانوں کی عورتیں اور لڑکیاں تو سہ پہر کو ایسی جیپوں اور موٹروں میں بیٹھ کر درگاہ کی جانب روانہ ہوئیں، جن کے گرد چادریں بندھی تھیں تاکہ ملوک زادیوں کی کسی طور بے پردگی نہ ہو اور ان پر کسی نا محرم کی نظر نہ پڑے۔

لیکن مزارعوں کی عورتیں اپنے جاگیر دار کی خوشی میں شرکت کے لیے بچوں کے ساتھ سویرے سویرے اونٹوں کے کجاووں میں بیٹھ کر نکل کھڑی ہوئیں۔ وہ منوتی پیر کی زیارت ہی کی جانب جا رہی تھیں، خوب بن سنور کر نکلی تھیں۔ آنکھوں میں دُنبالہ کا جل لگایا تھا، مانگ بھر کر دھڑی

گوندھی تھی، ہونٹوں پر سرخی لگائی تھی، شوخ اور بھڑک دار لباس پہنے تھے۔ ریشمی گھگھروں پر سنہرے پلکے کی چوڑی چوڑی گوٹ لگی تھی۔ چولوں اور کرتیوں کے گریبانوں اور آستینوں پر موتیوں، شیشوں اور رنگین دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ سروں پر بیچ رنگی چنریاں تھیں۔ دوپٹے اور بوچھن تھے۔ ان پر ستارے ٹکے تھے۔ گلوں میں چاندی یا گلٹ کے کٹھمالے اور مالھان تھے۔ ناک میں فیروزہ جڑے تولے اور پوپے جھل ملا رہے تھے۔ ہاتھوں میں چوڑیاں تھیں اور بازوؤں پر چوڑے اور پہنوٹے تھے جن کے خوش رنگ دھاگوں کے پھندنے ہولے ہولے جھولتے تھے۔ کانوں میں بالیوں کے گچھے لٹکتے تھے۔

وہ قافلے کی صورت میں گاؤں سے نکلیں۔ ایک اونٹ پر نقاروں کی جوڑی سمیت میراثی سوار تھا۔ اس کا اونٹ سب سے آگے تھا جس کی مہار ایک جنوال سنبھالے ہوئے تھا۔ دوسرے تمام اونٹ اور اونٹنیاں پیچھے پیچھے تھیں۔ ان کے گھٹنوں پر پہنوٹے بندھے تھے جن کے گھنگھرو ٹخنوں میں پڑی جھانجروں کے ساتھ بجتے تھے، جھنکارتے تھے۔ گلوں میں گانیاں تھیں اور سروں پر بندھے ہوئے موروں کے پھندنوں کے ساتھ ساتھ موتیوں اور کوڑیوں کی جھالریں ادھر ادھر جھول رہی تھیں، لہرا رہی تھیں۔ عورتوں اور بچوں کے مانند اونٹ اور اونٹنیاں بھی خوب سجی ہوئی تھیں۔ چند اونٹوں پر جنوالوں اور ساربانوں کے ساتھ بین بجانے والے بھی بیٹھے تھے۔

قافلہ روانہ ہوا تو میراثی نے نقارے پر چوٹ لگائی۔ بین باجے والوں نے نقارے کی گت پر ایک مقبول دھن چھیڑی۔ میراثی کے اونٹ سے بھی آگے نوجوانوں کی ٹولی تھی۔ وہ ریشمی کرتے پہنے ہوئے تھے۔ سروں پر پگڑیاں بندھی تھیں۔ ان کے منجھلے بھی ریشمی اور رنگین تھے۔ قافلے کی روانگی سے پہلے انہوں نے بھنگ اور ساوی دبا کے پی تھی۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ نشے سے جھوم جھوم کر اپنے مضبوط اور کسے ہوئے جسموں کی نمائش کر رہے تھے اور بلوچوں کا ایک قدیم جھمر ناچ رہے تھے۔

رقص کرنے والے نوجوانوں کے درمیان ڈھولیا تھا۔ وہ گلے میں پڑے ہوئے ڈھول پر زور زور سے چوٹ لگا کر ناچنے والوں کو للکار رہا تھا جو اس کے چاروں طرف دائرے میں

ہاتھوں اور پیروں کی گردش کے ساتھ لہک لہک کر رقص کر رہے تھے۔

اونٹ ایک قطاریں کچے راستے پر ہچکولے کھاتے، گرد و غبار کے بادل اُڑاتے قافلہ کی صورت میں دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے۔ اُن کے گلوں میں لٹکتی گھنٹیاں اور گھنگھرو اور پیروں میں پڑی ہوئی جھانجریں نوجوانوں کے رقص کے ساتھ بج رہی تھیں۔ جھنکار رہی تھیں، عورتیں اور بچے خوشی سے قہقہے لگا رہے تھے، چہک رہے تھے، اونچی آوازوں سے بول رہے تھے۔ رقص کرتے کرتے ایک نوجوان نے کان پر ہاتھ رکھ کر لمبی اور اونچی تان لگائی۔ اور اپنے علاقے کا ایک عوامی جھمّر گیت چھیڑا۔

رکھاں میں امید ماہی دے ملّٹن دی

مکّہ دی دور ہے

دنجناں ضرور ہے

حسن حسین دے مانگے

دل پٹی تانگے

رکھاں میں امید ماہی دے ملّٹن دی۔

گیت کے بول جھمّر ناچنے والے نوجوانوں اور کجاووں میں بیٹھی ہوئی عورتوں اور کنواریوں نے اٹھائے۔ سب آواز سے آواز ملا کر گانے لگے۔ ڈھولیے نے ڈھول پر اور زور سے چوٹ لگائی۔ میراثی اور بین والوں نے جھمّر کی لے کے ساتھ ساتھ نقارے اور بین کے تال سُر کو ہم آہنگ کیا۔ گیت کے بول اونچے ہوتے گئے۔ آوازوں کے ساتھ ساتھ ساز بھی تیز ہوتے گئے۔ ساز و آواز کے مطابق رقص کی گردش کبھی تیز ہو جاتی کبھی دھیمی پڑ جاتی۔ اسی طرح منوتی کے لیے چلنے والا یہ قافلہ گاؤں سے نکل کر آگے بڑھا۔ دور، اور دور ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ گرد کے ابھرتے اور پھیلتے ہوئے بادلوں میں گم ہو گیا۔

دن گزرا۔ شام ہوئی۔ رات کو کھانے کی دعوت کے ساتھ ساتھ مہمانوں کے لیے پینے پلانے اور ناچ گانے کا بھی پروگرام تھا۔ تقریب کی دھوم دھام دوبالا کرنے کی غرض سے

ملتان اور لاہور سے طوائفوں کو بھی بلایا گیا تھا۔ رات بھر کا پروگرام تھا اور اس میں شرکت کے لیے سردار مراد خاں شاہانی خاص طور پر مدعو تھا۔ ہموں والی میں اس کے قیام میں اضافے کا سبب مونڈرن کی اس تقریب میں شریک ہونا بھی تھا۔

سورج ڈوبتے ہی مراد خاں شاہانی نے سردار فرط خاں ڈھانڈلہ کی حویلی جانے کی تیاری کی۔ اُس نے غسل کیا، بوسکی کی لمبی قمیص اور لٹھے کی خوب گھیر دار اجلی شلوار پہنی۔ قیمتی اونی شال اوڑھی، کپڑوں پر خوشبو لگائی۔ اسی سج دھج کے ساتھ کمرے سے نکلا تو زیادہ وجیہہ اور باوقار لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پھبن تھی۔ آنکھوں میں ستارے جگمگا رہے تھے۔ اُس کے ہمراہ سلھڑی بھی تھی۔ وہ بھی پورا سنگھار کیے ہوئے تھی۔ شاہانی آگے آگے تھا۔ سلھڑی اس سے ایک قدم پیچھے تھی۔

رحیم داد کمرے کے باہر دالان میں موجود تھا۔ مراد خاں شاہانی نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا۔ "چوہدری! تجھے ڈھانڈلے کی حویلی نہیں چلنا؟" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ "زبردست میل ہے۔ ڈھانڈلے نے شراب بھی اچھی منگوائی ہے اور کنجریاں بھی پوپٹ اور زوردار ہیں۔"

رحیم داد نے حیلہ سازی سے کام لیا۔ منہ بگاڑ کر مدھم لہجے میں بولا۔ "میرے سر میں بہت درد ہے۔ میں نوں نہیں جانا۔ تیں نوں یہی بتانے آیا تھا۔" وہ اونی دوہرا اوڑھے ہوئے تھا، بال پریشان تھے اور چہرہ بھی اجڑا اجڑا نظر آ رہا تھا۔

شاہانی نے اصرار کیا۔ "فٹا فٹ تیار ہو جا۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ "وہسکی کے دو پیگ لگاتے ہی سارا درد شرد جاتا رہے گا۔ ایک دم چنگا ہو جائے گا۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے نہ لے جا۔ طبیعت اور گڑبڑ ہو جائے گی۔" رحیم داد رضامند نہیں ہوا۔

"چلنا تو اچھا ہی تھا۔" شاہانی نے زور دے کر کہا۔ "بہت لطف آئے گا۔ طبیعت اگر نہ لگے تو جب تیرا جی چاہے۔ اُٹھ کر چلا آنا۔ پروگرام تو ویسے رات بھر کا ہے۔"

"سئیں چوہدری! چلا جا۔" سلھڑی نے بھی شاہانی کی تائید کی۔

رحیم داد نے اُسے نظر بھر کر دیکھا، اُس کا مسکراتا چہرہ نکھرا ہوا تھا، جسم پھڑک رہا تھا۔ آنکھیں جادو جگا رہی تھیں۔ رحیم داد تڑپ کر رہ گیا۔

مراد خاں شاہانی نے ایک بار پھر رحیم داد پر زور دیا "نخرا نہ کر" وہ مسکرایا۔ "تھوڑی ہی دیر کے لیے میل میں شریک ہو جا۔ ڈھانڈلے کا دل خوش ہو جائے گا۔ تجھے ساتھ لانے کے لیے اس نے مجھے بار بار کہا تھا۔" مگر رحیم داد کسی طور آمادہ نہ ہوا۔ اپنی طبیعت ناساز ہونے کا عذر تراشتا رہا۔

شاہانی چلا گیا۔ سلھڑی اس کے پیچھے پیچھے حویلی کے پھاٹک تک گئی۔ رحیم داد نظریں اٹھائے مراد خاں شاہانی کے بجائے سلھڑی کو دیکھتا رہا۔ اس نے گہری سانس بھری، اٹھا اور آہستہ آہستہ ڈیرے میں پہنچا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆

رحیم داد بستر پر چپ لیٹا تھا۔ نہ اس نے کھانا کھایا نہ سویا۔ پہر رات گزر گئی۔ حویلی سنسان ہو گئی۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ ہوائیں تیز ی آ گئی تھی۔ سرما کی اندھیری رات ساکت کھڑی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔

رحیم داد پلنگ سے نیچے اترا، اونی دوسہرا اوڑھی، سلیپر پہنے، لیمپ کی لو دھیمی کی، آہستہ سے دروازہ کھولا، کمرے سے نکل کر برآمدے میں آیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ وہ اندھیرے میں دم سادھے کھڑا تھا۔ ہر طرف ویرانی تھی۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔ حویلی کے تمام نوکر اپنی اپنی کوٹھڑیوں کے دروازے بند کیے گہری نیند سو رہے تھے۔ رحیم داد کی طرح حویلی کے ہر فرد کو معلوم تھا کہ مراد خاں شاہانی سویرے سے پہلے نہیں لوٹے گا۔ وہ ناچ گانے کا زبردست شوقین تھا۔ ایسی محفل چھوڑ کر وہ نہیں آسکتا تھا۔

رحیم داد احاطے میں پہنچا اور دبے دبے قدموں سے آگے بڑھا۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ مڑا اور حویلی کے عقبی حصے کی جانب بڑھنے لگا۔ خاموشی بہت گہری تھی اور کہر کی دھند

بھی اس قدر تھی کہ وہ سنبھل سنبھل کر چل رہا تھا۔ وہ سلھڑی کی کوٹھڑی پر پہنچا۔ دروازہ بند تھا مگر دروازے کی جھریوں سے اندر جلتے ہوئے چراغ کی روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ وہ دروازے کے نزدیک سانس روکے کھڑا رہا۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ سناٹا اور بڑھ گیا تھا۔ رحیم داد نے آہستہ سے دروازے پر ہاتھ رکھا، ہولے سے دھکا دیا، دروازے کا ایک پٹ کھل گیا۔ وہ آہستہ سے اندر داخل ہو گیا۔ سامنے پلنگ کی پٹی سے ٹیک لگائے سلھڑی فرش پر بیٹھی تھی۔ اُس کی پشت دروازے کی جانب تھی۔ رحیم داد نے مڑ کر نہایت احتیاط سے کوٹھڑی کا دروازہ بند کر دیا۔

آہٹ سن کر سلھڑی نے پلٹ کر دیکھا۔ رحیم داد کو اپنے سامنے پا کر وہ سخت حیرت زدہ ہوئی اور سٹ پٹا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی "سئیں چوہدری!" اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھورنے لگی۔ "تو یہاں کیسے آگیا؟"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ وہ بھی حیرت زدہ تھا۔ یہ وہ سلھڑی نہیں تھی جس کی چھب دیکھ کر وہ بے قرار ہو جاتا تھا، جس کے بدن کے پیچ و خم کے ڈولنے اور گردش کرنے سے اس کا دل ڈولنے لگتا تھا۔ وہ اسی سلھڑی کے لیے بے قرار ہو کر چوروں کی طرح چھپ کر رات کے سناٹے میں آیا تھا مگر اس کے سامنے جو سلھڑی کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ ویران اور اجاڑ تھا۔ آنکھوں کے ہردم جھل ملانے والے کنول بجھے بجھے تھے، بال خشک اور الجھے ہوئے تھے۔ وہ میلا کچیلا لباس پہنے ہوئے تھی اور اس کی آنکھوں کا کاجل پھیلا ہوا تھا، جوانی پگھلتی اور ڈھلتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

رحیم داد کو گم صم اور حیرت زدہ دیکھ کر سلھڑی نے ایک بار پھر گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا "سئیں چوہدری! تو یہاں کیوں آیا؟ کیسے آیا؟ تینکوں اس طرح میرے پاس نہیں آنا چاہیئے تھا۔" اس کا لہجہ قدرے تیکھا ہو گیا وہ بدستور پریشان اور سراسیمہ نظر آرہی تھی۔

رحیم داد ہکا بکا کھڑا رہا۔ سلھڑی بھی خاموش رہی مگر جلد ہی اس نے خود کو سنبھالا

کندھوں پر پڑا ہوا دوپٹہ سر کے پیچھے سے کھینچ کر اس طرح اوڑھا کہ اس کا چہرہ کسی قدر چھپ گیا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔

رحیم داد ٹکٹکی باندھے حیران و پریشان سلھڑی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے دوپٹے سے چہرہ چھپانے کی کوشش کی تو رحیم داد چونکا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ دائیں طرف کی دیوار کی کھونٹیوں پر شوخ اور بھڑک دار دوپٹے، چولے اور گھگھرے لٹک رہے تھے۔ ان کے ساتھ ریشمی منجھلیاں اور کرتیاں بھی جھول رہی تھیں۔ سامنے کی دیوار کے طاق میں سرخی، کاجل، کنگھی اور سنگھار کا دوسرا ساز و سامان رکھا تھا۔ طاق کے قریب ہی دیوار پر آئینہ آویزاں تھا۔

سلھڑی کی آواز خاموشی میں ابھری: "سئیں! تو یہاں کیوں آگیا؟ میری گالھ کا جواب کیوں نہیں دیتا؟" اس کے لہجے میں پریشانی اور گھبراہٹ کے ساتھ ساتھ عاجزی بھی تھی۔

رحیم داد اب خاموش نہ رہ سکا، آہستہ سے بولا: "تو میرے آنے پر اتنی پریشان کیوں ہو گئی؟"

"پریشانی کی بات ہی ہے۔" وہ بے زاری سے بولی: "سئیں تیکوں پتہ نہیں، سردار کو ملوم ہو گیا تو بہت گڑبڑ ہو گی۔ تو اچھی طرح جانتا ہے، اُس کا غصہ کتنا خراب ہے۔ غصے میں وہ پاگل بن جاتا ہے۔"

"یہ تو بتا تو میرے پاس بعد میں کیوں نہیں آئی؟" رحیم داد نے سلھڑی کی سراسیمگی نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"سئیں! میں سردار کی مرضی کے بنا تیرے پاس کیسے آسکتی ہوں۔" اُس نے صاف گوئی سے بتایا۔ "اُس رات اس نے مجھے تیرے پاس بھیج تو دیا پر بعد میں مجھ پر بہت ناراض ہوا۔ غصے سے بار بار گالاں نکالتا تھا۔"

"تب ہی تو مجھ سے دور دور اور کٹی کٹی رہتی ہے؟"

"ہا سئیں!" اس نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "سردار یہ دیکھ ہی نہیں سکتا کہ میں اس کے سوا کسی کے ساتھ میل جول پیدا کروں۔ یاری لگانے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

اُس نے خوف زدہ نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا"سئیں! مجھے ڈر لگ رہا ہے سردار بہت گُصے والا ہے، ظالم بھی ہے۔ اس کا مزاج بہت گرم ہے۔"

"اس کی پرواہ نہ کر۔" رحیم داد نے سلھڑی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔" وہ صبح سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔" اُس نے نظر بھر کر سلھڑی کو دیکھا" ویسے تو کہتی ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔"

"ہا سئیں! اب تو جا۔" وہ بے رخی سے بولی۔" مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ میں بہت مونجھی ماندی اور پریشان ہوں۔"

"سلھڑی! تو کچھ زیادہ ہی پریشان اور اداس لگ رہی۔ صاف صاف بتا، بات کیا ہے؟" رحیم داد نے سلھڑی کے چہرے پر چھائی ہوئی افسردگی شدّت سے محسوس کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"تیکوں کیہ پتہ، میرا پتّر کتنا بیمار ہے۔" سلھڑی نے پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔" دیکھ کیسا چپ کرکے پڑا ہے۔ اِسے بہت زور کی تپ چڑھی ہے۔" اس نے رحیم داد کی طرف افسردہ نظروں سے دیکھا۔" یہ میرا مندوں ہے۔ تینوں بچوں میں سب سے وڈا ہے۔"

رحیم داد نے توجہ سے دیکھا۔ پلنگ پر بوسیدہ اور میلی رضائی میں لپٹا لپٹایا مندوں بے سدھ پڑا تھا۔ اس کی عمر گیارہ سال کے لگ بھگ تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر رحیم داد کو دیکھا۔ اس کے چہرے کے نقوش سے مراد خاں شاہانی کی شباہت صاف جھلک رہی تھی۔ ناک اور آنکھیں تو ہو بہو مراد خاں سے ملتی تھیں۔

مندوں نے بے چینی سے پہلو بدلا اور گردن اِدھر اُدھر ہلانے لگا۔ آہستہ سے بولا" اماں!" وہ رک رک کر سانس بھر رہا تھا۔ حلق سے خُرخُر کی آواز نکل رہی تھی۔

سلھڑی جھپاک سے مندوں کے قریب پہنچی۔ جھک کر اس کی پیشانی چومی اور سرھانے بیٹھ کر ہولے ہولے سر دبانے لگی۔ اُس نے پیار بھری نظروں سے مندوں کو دیکھا اور تڑپ کر بولی۔" جیوے میرا لعل۔ میں صدقے ونجاں، تو حیاتی والا ہونویں۔"

رحیم داد بھی نزدیک چلا گیا۔ چراغ کی ہلکی زرد زرد روشنی میں مندوں کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ رحیم داد نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی پر رکھا۔ وہ آگ کے مانند دہک رہی تھی۔ اسے تیز بخار تھا۔ رحیم داد پریشان ہو گیا۔ تشویش کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ "اسے تو بہت تیز تپ ہے۔ تو نے اس کا دوا دارو بھی کیا؟"

"تیرے آنے سے تھوڑی ہی دیر پہلے دوائی کھلائی تھی۔" سلطری نے رحیم داد کو بتایا۔ "حکیم سے خود جا کر سویرے لائی تھی۔ مندوں تو پچھلے چار روز سے بیمار ہے پر تپ کم نہیں ہوتی۔ کھانسی بھی آتی ہے۔ کل رات تک اتنا بیمار نہ تھا۔ میں نے گرم دودھ پلایا تو پی لیا تھا۔ پر آج صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا پیا۔ ایسے ہی آنکھیں بند کیے پڑا ہے بار بار پانی مانگتا ہے۔"

"بخار بھی بہت تیز ہے۔" رحیم داد نے پوچھا۔ "تو نے حکیم سے پتہ کیا، اسے روگ کیا ہے؟"

"کہتا تھا، نمونیا ہو گیا ہے۔" سلطری نے بتایا۔ "اُسی کی دوائی دی ہے۔ ساتھ میں یہ بھی کہا ہے کہ تین تین گھنٹے بعد دوائی پلانا۔ سویرے آکر حال بتانا۔"

"تیرے پاس تو گھڑی بھی نہیں۔" رحیم داد نے کہا۔ "تُو تین تین گھنٹے بعد کیسے دوائی پلائے گی؟" اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی اتار دی اور سلطری کو دیتے ہوئے کہا۔ "لے اسے رکھ لے۔"

"نہیں، اسے تو اپنے ہی پاس رکھ۔" اس نے گھڑی لینے سے صاف انکار کر دیا۔ "سردار نے گھڑی میرے پاس دیکھ لی تو اسے پتہ چل جائے گا، تُو میرے پاس آیا تھا۔ بہت ناراض ہو گا۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔ "سئیں! بُرا نہ منانا۔ میں اسے دوائی ٹھیک وکھت ہی پر پلاتی رہوں گی۔"

رحیم داد نے گھڑی اس کے حوالے کرنے پر اصرار نہیں کیا۔ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے بولا۔ "پر دوائی پلانے کے لیے تئیں نوں رات بھر جاگنا پڑے گا۔"

"جاگ لوں گی۔" وہ مستعدی سے بولی۔ "سئیں! دعا کر۔ میرا لال چنگا ہو جائے۔ یہ میرا

آگے کا سہارا ہے۔" اس کا لہجہ دکھ بھرا ہوتا گیا۔" میں کب تک جوان رہوں گی، ایک دن تو بوڑھا ہونا ہی ہے۔ بوڑھی ہو گئی تو سردار مجھے حویلی میں کیوں رکھے گا۔ منجھ بوڑھی ہو جاتی ہے تو اسے کصائی کو دے دیتے ہیں۔" اس نے گہری سانس بھری۔ اس کے چہرے کی افسردگی اور بڑھ گئی۔

" ہاتو سے بھی تو تیرا ایک پتر تھا۔ اُس کا کیا بنا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

" وہ تو میرا پلوٹھا ہے۔" سلھڑی نے بتایا۔" پر وہ کس کام کا۔" اس کا لہجہ پھر غمگین ہو گیا۔ "ایک بار اس کے پاس بہل گئی تھی۔ وہ وہیں رہتا ہے۔ اس نے پرنا کر لیا ہے۔ ذال ہے، اس سے ایک نکی بھی ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔" اُس نے مجھے دیکھا تو نوہ کے سامنے ننگی ننگی گالاں اور مندا نکالیں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔" دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔" سلھڑی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔" سئیں! میرا لال چنگا ہو جائے۔ یہ میرا بازو ہے، بڑھاپے کا سہارا ہے۔ میرا اور کوئی بھی تو نہیں۔" وہ سسکیاں بھر کر بے بسی سے رونے لگی۔

رحیم داد مبہوت کھڑا تھا اور ہر دم ہنستی مسکراتی سلھڑی کو پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھ رہا تھا۔ اُس پر پہلی بار یہ راز آشکارہ ہوا کہ سلھڑی اندر سے کس قدر غم زدہ اور مظلوم ہے۔ اس نے سلھڑی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔" تو فکر نہ کر۔ تیرا منڈا ضرور چنگا ہو جائے گا۔ حوصلے سے کام لے۔" رحیم داد نے اس کی جانب دیکھا، دل گرفتہ ہو کر بولا۔" سلھڑی تو سچ مچ سلھڑی ہے۔ میں نوں پتہ ہی نہیں تھا تو اتنی دکھی ہے۔" اس نے آہستہ آہستہ اس کا بازو تھپکا۔" اس طرح نہ رو سلھڑی! تو کہہ تو میں خود جا کر حکیم کو بلا لاؤں۔ پھاٹک پر راکھا خان بیٹھا ہے اُس کے ساتھ حکیم کے گھر چلا جاؤں گا۔"

" نا سئیں! تو ایسا نہ کرنا۔" وہ نرم لہجے میں بولی۔" میں خود چلی جاتی پر حکیم نہیں آئے گا۔ میں تو اسے سویرے ہی لانا چاہتی تھی۔ پر اس نے صاف انکار کر دیا۔ دوائی دے کر بولا، یہ کھلاتی رہنا، چنگا ہو جائے گا۔ وہ تب نہ آیا تو اب اتنی رات کو کیسے آ جائے گا۔"

میں جاؤں گا تو ضرور آ جائے گا۔"

" پر تیرا اس کے پاس جانا ٹھیک نہیں۔" وہ پریشان ہو کر بولی۔" سردار تجھے تو کچھ

نہیں بوے گا پر میرے گلے پڑ جائے گا۔ سخت نراض ہوگا۔"

"تُو ایسا کر مندوں کے متّھے پر کپڑا گیلا کر کے رکھ۔" رحیم داد نے اُسے مشورہ دیا۔ "مجھے بھی ایک بار ایسی ہی زوروں کی تپ چڑھی تھی۔ گیلا کپڑا رکھنے سے کم ہوگئی تھی۔" اُس نے کوٹھری میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ "مجھے کوئی اُجلا کپڑا دے دے۔ میں بھگو کر فوراً اس کے متّھے پر رکھوں گا۔" اُس نے تیکھی نظروں سے سلھڑی کو دیکھا۔ "میرا منہ کیا تک رہی ہے۔ جا کپڑا لے کر آ۔"

وہ اٹھی اور ٹرنک کھول کر کپڑا تلاش کرنے لگی۔ رحیم داد نے انتظار نہ کیا۔ بڑھ کر کھونٹی پر لٹکا ہوا ایک اُجلا دوپٹہ اتارا اور کونے میں رکھے ہوئے گھڑے سے پانی نکال کر پلّو بھگونے لگا۔

سلھڑی نے اس کی جانب دیکھا تو گھبرا کر بولی "سئیں! تو نے یہ کیا کر دیا۔ یہ بوچھن تجھے اس طرح خراب نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

رحیم داد نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے دوپٹے کا گیلا پلو تہہ کر کے چار انگل کی ویسی ہی پٹی بنائی جیسی جمیلہ نے ایک بار تیز بخار کی حالت میں اس کے لیے بنائی تھی۔ اس نے گیلی پٹی مندوں کی پیشانی پر رکھی اور سلھڑی کو مخاطب کیا۔ "سلھڑی! فکر نہ کر۔ تھوڑی دیر میں اس کی تپ کم ہو جائے گی۔"

سلھڑی بھی اس کے پاس پہنچ گئی۔ وہ رحیم داد کے پاس پلنگ کے سرہانے بیٹھ گئی۔ رحیم داد نے اس سے کٹورے میں پانی منگوایا۔ پانی سرد تھا۔ رحیم داد بار بار دوپٹے کا پلّو پانی میں تر کرتا اور اسے مندوں کی پیشانی پر رکھتا۔ سلھڑی چپ بیٹھی رحیم داد کو دیکھتی رہی۔ اُس نے مندوں کی گردن کو ہاتھ لگایا۔ اس کے چہرے سے قدرے اطمینان جھلکنے لگا۔

"لگتا ہے تپ تو کم ہوگئی۔" سلھڑی نے رحیم داد سے کہا۔ "سئیں! تو بہت چنگا اور نیک بندہ ہے۔" وہ اسے دعائیں دینے لگی۔ "سئیں! تو سدا جیویں۔ رب راضی ہووے۔" اس کے لہجے میں عاجزی پیدا ہوگئی۔ "سئیں! بوچھن اب مجھے دے دے۔" اُس نے خوف زدہ نظروں سے

دروازے کی جانب مڑ کر دیکھا۔" اب تو جا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ تیرا اس طرح یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔"

رحیم داد نے اس کی پریشانی اور سراسیمگی محسوس کرتے ہوئے دوپٹہ سلمٰی کو دے دیا۔ خاموشی سے اٹھا، کوٹھری سے نکلا، باہر سے دروازہ بند کیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا مگر وہ اپنے کمرے میں نہیں گیا۔ دل ہی نہ چاہا۔ آنکھوں میں دور دور تک نیند نہیں تھی۔ ذہن بوجھل ہو رہا تھا۔ عجیب سا اضطراب تھا۔ اضطراب دور کرنے کی غرض سے اس نے اللہ بخش جوڑا کو آواز دے کر بلایا۔ اُس سے شراب اور گلاس لانے کو کہا اور بیٹھک میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جوڑا نے تھوڑی ہی دیر بعد بوتل، گلاس اور جگ میں پانی لا کر میز پر رکھ دیا۔ رحیم داد نے پیگ بنایا اور ایک بڑا گھونٹ بھرا۔

☆

حویلی کے پھاٹک پر جیپ ٹھہرنے کی آواز رات کے پُرہول سناٹے میں ابھری۔ ذرا ہی دیر بعد قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ رحیم داد نے چونک کر دروازے کے باہر دیکھا، اندھیرے میں ایک سایہ لہرایا اور مراد خاں شاہانی ڈگمگاتے قدموں سے کمرے میں داخل ہوا۔ رحیم داد کو دیکھ کر وہ زور سے ہنسا۔" چوہدری! پینی ہی تھی تو میرے ساتھ چلتا۔ اُدھر بہت عمدہ وہسکی تھی۔" وہ آگے بڑھا اور کرسی کھسکا کر رحیم داد کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔

"میں نے سوچا، پینے سے سر کا درد کچھ کم ہو جائے گا۔ ویسے میرا بالکل ارادہ نہیں تھا۔" رحیم داد نے صفائی پیش کی مگر فوراً بات پلٹتے ہوئے دریافت کیا۔" تُو نے تو سویرے آنے کو کہا تھا۔ ابھی سے اٹھ کر کیسے واپس آگیا؟ لگتا ہے، مجرا زوردار نہیں تھا۔"

"سئیں! ایسی گل نہیں۔" شاہانی نشے میں جھوم کر بولا۔" وہاں ایک کنجری بہت پھڑک دار تھی، خانہ خراب نے ایسی طبیعت گرمائی کہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔" اس نے قہقہہ بلند کیا۔" لا مجھے بھی ایک پیگ بنا کر دے۔ اکیلا ہی پیتا رہے گا؟"

رحیم داد نے مسکرا کر اپنا گلاس مراد خاں شاہانی کے سامنے رکھ دیا۔ دوسرا گلاس ہی نہ تھا۔ شاہانی نے رحیم داد کے گلاس سے ایک گھونٹ بھرا اور گلاس میز پر رکھتے ہوئے اللہ بخش جوڑا کو آواز دی۔

جوڑا گھبرایا ہوا آیا۔ شاہانی نے حکم دیا۔ "جوڑے! جا گلاس لے کر آ۔" جوڑا چلنے کے لیے مڑا تو شاہانی نے اُسے ٹوکا۔ "اور دیکھ، سلھڑی کو بھی یہاں بھیج دے۔"

رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ اُسے فوراً بیمار مندوں یاد آ گیا۔ اُس نے چاہا کہ شاہانی اس وقت سلھڑی کو نہ بلائے۔ اس وقت اپنے بیمار بیٹے کے پاس اس کا موجود ہونا ضروری تھا۔ رحیم داد نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "سلھڑی کو بلا کر کیا کرے گا۔ اُس نے کسی رن کو پہلے ہی تیرے کمرے میں پہنچا دیا ہوگا۔ سلھڑی تو اب سوئی ہوگی۔" رحیم داد مسکرایا۔ "بہت کام کرتی ہے۔ صبح سے رات گئے تک اِدھر سے اُدھر بھاگ دوڑ کرتی رہتی ہے۔ جب دیکھو کچھ نہ کچھ کرتی نظر آتی ہے۔ بہت ہی محنتی رن ہے۔"

"پر وہ ابھی سو نہیں سکتی اور سو بھی گئی ہو تو جاگ سکتی ہے۔" سردار مراد خاں شاہانی نے نہایت بے نیازی سے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "سئیں چوہدری! تو اسے نہیں جانتا۔ وہ میرے لیے ہر دم تیار رہتی ہے۔"

اللہ بخش جوڑا گلاس لے کر آ گیا۔ رحیم داد نے خالی گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے ایک بار پھر مراد خاں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "سلھڑی کو چھوڑ، پولانی ٹھیک رہے گی۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔ "میں نے کل ہی اسے دیکھا تھا۔ ابھی تو نہیں ہے۔ سوہنی ہے اور تکڑی جوان ہے۔"

"نہیں! آج سلھڑی ہی چلے گی۔" مراد خاں نشے میں لہرا کر بولا۔ وہ خوب چڑھا کر آیا تھا۔ بات کرتا تو زبان لڑکھڑاتی۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس نے بہکی بہکی نظروں سے جوڑا کو گھور کر دیکھا۔ "سور دے پتر، تو ابھی تک کھڑا ہے۔ سلھڑی کو لانے نہیں گیا۔"

"سئیں! سر اکھوں تے۔" جوڑا سراسیمہ ہو کر گڑگڑانے لگا۔ "ابھی جا کر اُسے بولتا ہوں۔ وہ ضرور آئے گی۔"

اللہ بخش جوڑا تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا گیا۔ مراد خاں اور رحیم داد شراب سے شغل کرنے لگے۔ اندھیرا گہرا ہوتا گیا۔ رات بھیگتی گئی۔ مراد خاں نے بے چینی سے دروازے کی جانب دیکھا "سلھڑی ابھی تک نہیں آئی۔ وہ کیوں نہیں آئی؟" اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ رحیم داد نے کچھ نہ کہا خاموشی سے گلاس ہونٹوں سے لگا کر آہستہ آہستہ چسکی لگانے لگا۔

وقت کچھ اور گزر گیا۔ مراد خاں شاہانی کے چہرے پر جھنجلاہٹ پھیلنے لگی۔ وہ غصے سے بڑبڑانے لگا "لگتا ہے، اس کا نکھرا بہت بڑھ گیا ہے۔ سمجھتی ہے، میں اسے بہت چاہتا ہوں۔" اس کی آنکھیں اُبلی پڑ رہی تھیں۔ عین اسی وقت کمرے کے باہر چاپ اُبھری۔ سلھڑی اندھیرے سے نکل کر اندر داخل ہوئی۔ دھیرے دھیرے آگے بڑھی۔ رحیم داد نے حیرت سے دیکھا، سلھڑی گوٹا کناری لگا گلابی دوپٹہ اوڑھے اور گلابی ہی منجھلی باندھے ہوئے تھی۔ بالوں میں چمک دمک تھی۔ ماتھے پر ٹیکا سجا تھا۔ آنکھوں میں کاجل تھا۔ چہرے پر ملاحت تھی، نکھار تھا۔ اس کا جسم ہولے ہولے لہرا رہا تھا، مچل رہا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی آئی اور ایک خاص ادا سے مراد خاں کے روبرو کھڑی ہو گئی۔

مراد خاں شاہانی نے تیوری پر بل ڈال کر کہا "بہت دیر لگا دی تو نے۔ لگتا ہے تیرا نکھرا کچھ زیادہ بڑھ گیا ہے۔"

"سئیں سردار! ایسا نہ سوچ۔" وہ عاجزی سے بولی "میں صدکے تھیواں، تو بلائے اور میں نہ آؤں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

شاہانی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سلھڑی کی جانب جھومتا ہوا بڑھا۔ بے قرار ہو کر گویا ہوا "میرے گلے سے تو لگ جا جند جانی۔" اس نے سلھڑی کو بازوؤں میں دبوچ لیا، مڑ کر رحیم داد کی طرف دیکھا "چوہدری! میں تو اب چلا۔ میں تو اسی کے لیے ڈھانڈلے کی میل سے اٹھ کر آیا تھا۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر گلاس اٹھایا۔ ہونٹوں سے لگایا اور ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

رحیم داد نے بھی گلاس ختم کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

مراد خاں مسکرا کر بولا "چوہدری! آج یہ گل چاندنی میرے پاس رہے گی۔ پولانی تیرے

پاس پہنچ جائے گی۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔" تجھے وہ پسند بھی ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا، حیرت سے سلھڑی کو دیکھتا رہا۔ اس نے اپنے بیمار بیٹے مندوں کے بارے میں مراد خاں شاہانی سے کچھ نہیں کہا جس کے لیے وہ کچھ ہی دیر پہلے اپنی کوٹھری میں رو رہی تھی۔ گریہ وزاری کر رہی تھی۔

مراد خاں جھومتا جھامتا کمرے سے چلا گیا۔ سلھڑی سہمی ہوئی تھی۔ وہ چہرے پر ابھرتی ہوئی افسردگی چھپانے کے لیے بار بار مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ رحیم داد بھی کمرے سے نکلا، کچھ دور تک مراد خاں اور سلھڑی کے پیچھے اندھیرے میں چلتا رہا۔ حویلی سنسان تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔

رحیم داد مڑا، ڈیرے کی جانب بڑھا۔ اپنے کمرے میں پہنچا اور چپ چاپ بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ وہ سلھڑی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی مجبوری اور بے بسی پر مضطرب تھا۔ اسے رہ رہ کر سلھڑی کا بیٹا یاد آ رہا تھا جسے حکیم نے نمونیا بتایا تھا۔ وہ بخار سے بھن رہا تھا اور اس کی ماں سردار مراد خاں شاہانی کے بپھرے ہوئے جذبات کے گرداب میں تھی۔

کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ رحیم داد نے چونک کر دیکھا۔ پولانی اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس کا قد نکلتا ہوا تھا۔ رنگ گورا اور زردی مائل تھا۔ جسم مضبوط اور چھریرا تھا۔ وہ گاؤں کے نوجوان جولاہے کی بیوی تھی۔ رحیم داد کی تیز نظروں نے تاڑ لیا کہ بناؤ سنگھار کے باوجود اس کے چہرے پر خوف کے سائے منڈلا رہے تھے۔ آنکھوں میں کچی نیند سے بیدار ہونے کا خمار تھا۔ اس نے دروازہ بند کیا۔ مسکرانے کی کوشش کی، آگے بڑھی اور بستر پر سمٹ کر ایک طرف بیٹھ گئی۔

☆

رحیم داد غسل کرنے کے بعد تولیا سے بدن پونچھ رہا تھا کہ حویلی کے پچھواڑے سے عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے گھبرا کر تولیا ایک طرف پھینکا۔ جلدی جلدی کپڑے پہنے، باہر نکلا۔ ابھی تک گہر کی ہلکی ہلکی دھند فضا میں بکھری ہوئی تھی۔ سورج طلوع

ہو چکا تھا مگر کہر میں لپٹی ہوئی دھوپ مٹیالی اور پھیکی پھیکی تھی۔

رحیم داد حویلی کے پچھواڑے بڑھا جدھر سے رونے کی آوازیں صبح کی گہری خاموشی میں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ وہ آگے گیا تو جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ رونا پیٹنا سلھڑی کی کوٹھڑی کے اندر ہو رہا ہے۔ رحیم داد کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بڑھ کر کوٹھڑی کے دروازے پر پہنچا، اندر داخل ہوا۔ سامنے چارپائی پر سلھڑی کا بیٹا مندوں بے جان پڑا تھا۔ اس کے مردہ جسم پر ایک میلی چادر پڑی تھی۔ سلھڑی اس کے سرہانے چارپائی کی پٹی سے سر ٹکائے بین کر رہی تھی۔ چارپائی کے اردگرد چند عورتیں بھی بیٹھی تھیں۔ وہ بھی رو رہی تھیں۔ رک رک کر سینے پر ہاتھ مارتیں اور دل گرفتہ ہوکر "ہائے ہا، ہائے ہا!" کی صدائیں بلند کرتیں۔ کوٹھڑی میں عود و لوبان کا دھواں لہرا رہا تھا۔ فضا دھندلی اور افسردہ تھی۔

سلھڑی نے گردن اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ اُس کی آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ چہرہ اجڑا اجڑا تھا۔ بال بکھر کر منہ پر آگئے تھے، بدن پر وہی لباس تھا جسے پہن کر وہ پچھلی رات سردار مراد خاں شاہانی کے پاس آئی تھی البتہ اس کا گلابی دوپٹہ ایک طرف پڑا تھا۔ سر برہنہ تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے، کھوئی کھوئی نظروں سے رحیم داد کو دیکھتی رہی۔ پھر سینے پر دوہتڑ مار کر بین کرنے لگی۔

"سئیں! میں لٹ گئی، میرا مندوں مرگیا۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ ڈائن موت اُسے رات ہی کو اپنے ساتھ لے گئی۔ میں سویرے لوٹی تو وہ مردا پڑا تھا۔ سئیں! میں شامت دی ماریا، آخری گھڑی اُس سے مل بھی نہ سکی۔ میں اُس کے لیے کچھ نہ کر سکی۔" اُس نے بے بسی سے گردن اِدھر اُدھر ہلائی۔" وہ یہاں اکیلا تھا۔ کوئی پانی پلانے والا بھی نہ تھا۔"

سلھڑی رک رک کر بین کر رہی تھی۔ قریب بیٹھی ہوئی عورتیں اُس کے ساتھ ساتھ بٹنی کرتیں۔ سینے پر بار بار ہاتھ مار کر "ہائے ہا!" کی صدا بلند کرتیں۔ سلھڑی بین کرتے کرتے بیقرار ہوکر چیختی "ہائے ربا! میں کیہ کراں۔ میں لٹ گئی۔ میرا سہارا ختم ہوگیا۔" اُس نے تڑپ کر اپنا سر چارپائی پر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

رحیم داد قریب گیا اور سلطڑی کا سر آہستہ آہستہ تھپک کر بولا: "صبر کر سلطڑی! صبر کر، رب کی یہی مرضی تھی۔" اس کا دل بھر آیا، آنکھیں چھلک پڑیں، آنسو پلکوں سے بہہ کر رخساروں پر ٹپکنے لگے۔ وہ کچھ دیر میت کے نزدیک خاموش کھڑا آنسو بہاتا رہا۔ پھر اس نے آنسو پونچھے مڑا اور کوٹھڑی سے نکل گیا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا مراد خاں شاہانی کے کمرے میں پہنچا۔ مراد خاں نہایت اطمینان سے ناشتہ کر رہا تھا۔ رحیم داد کرسی کھسکا کر قریب بیٹھتے ہوئے بولا: "شاہانی! تیری سلطڑی کا پتر مر گیا۔"

"مجھے پتہ ہے۔" وہ تلے ہوئے مرغ کا گوشت نوچتے ہوئے بولا: "پر چوہدری! تو سلطڑی کی کوٹھڑی میں کیوں گیا تھا؟" اس کا لہجہ تیکھا تھا اور چہرے پر جھنجلاہٹ تھی۔ "تجھے وہاں نہیں جانا چاہیے تھا۔ تجھے پتہ ہونا چاہیے ہم سردار کمیوں کے پاس اس طرح نہیں جاتے۔" مراد خاں کے رویّے میں اور تلخی پیدا ہو گئی۔ "تو میرا مہمان ہے تو نے اس طرح میری آن اور رتبہ نہیں بگاڑنا چاہیے تھا۔ یہ عزت اور دبدبہ کائم رکھنے کا معاملہ ہے۔ اس کے لیے خود کو بہت اونچا رکھنا پڑتا ہے۔ مزارعوں اور کمیوں کو جتّی کے نیچے دبا کر رکھنا پڑتا ہے۔"

رحیم داد حیران و پریشان بیٹھا رہا۔ سردار مراد خاں تیزی سے بولتا رہا: "وڈّے اور بزرگ کہہ گئے ہیں۔ سور اور گیدڑ کو گولی مار دو تاکہ وہ فصل خراب نہ کریں۔ مزارعوں اور کمیوں کی گردن سدا نیچی رکھنے کے لیے ان کی رن کو اپنا بستر سمجھو تاکہ وہ فصل پر حق نہ جتائیں۔" اس نے رحیم داد کو بھرپور نظروں سے دیکھا: "اسی لیے ہمیں ان کی نوجوان رناں اور بالڑیاں اٹھوانی پڑتی ہیں تاکہ ان کی آنکھ اونچی نہ ہو۔ ان سے الگ اور دور رہنا پڑتا ہے تاکہ وہ سر نہ چڑھیں۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" رحیم داد اس کے غصّے سے مرعوب ہو کر معذرت کے انداز میں بولا: "سچی بات یہ ہے تو سردار ہے، وڈا جگیردار ہے میں تیرے سامنے معمولی زمیں دار ہوں، مہاجر بھی ہوں۔ میں تو ان باتوں کا ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" مراد خاں بھی نرم پڑ گیا۔ اس نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا: "تجھے پتہ نہیں، مجھے بھی سلطڑی کے پتر کے مرن کا رنج ہوا۔ پر کیا کیا جائے۔ رب کی یہی مرضی

تھی۔" اُس نے تولیا اٹھا کر ہاتھ پونچھے۔ "میں نے آدھ گھنٹہ پہلے سلھڑی کو بلایا تھا، اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ دلاسا دیا تھا، حوصلہ بڑھایا تھا۔ سو روپے بھی دیے۔"

رحیم داد اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس نے نہ مداخلت کی نہ کسی فوری ردِّ عمل کا اظہار کیا۔ مراد خاں نے ہاتھ پونچھ کر رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری! تو بھی فٹافٹ ناشتہ کر لے بھکر واپس جانا ہے۔ تجھے بھی ساتھ ہی چلنا ہے۔"

"کیا آج بھکر جانا ضروری ہے؟" رحیم داد نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"بہت ضروری ہے۔" مراد خاں نے بتایا۔ "ملتان سے میرا یار مرشد علی گردیزی آیا ہے۔ وہ کل رات ہی بھکر پہنچا ہے اور میرا انتظار کر رہا ہے وہ مجھے اپنے ساتھ ملتان لے جائے گا۔ اُس کی بہن کا پرنا ہے۔ اُس میں مجھے شرکت کرنا بہت ضروری ہے۔"

"کیوں بہت ضروری ہے؟" رحیم داد نے بے خیالی میں پوچھ لیا۔

سردار مراد خاں شاہانی بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ "سئیں چوہدری! تجھے پتہ نہیں۔ مرشد کا پیو ملتان کے گدّی نشینوں میں سے ہے۔ اس کا ایک شریکا بھی وزیر لگا ہے، وہ بھی آئے گا۔ اس کے ساتھ دوسرے وزیر اور وڈّے سرکاری افسر بھی آئیں گے۔ ان سب سے وہاں ملنا جلنا ہو گا۔ وزیروں اور افسروں سے میل ملاپ رکھنا چاہیے۔ جگیرداری اور زمیں داری چلانے میں ان سے بہت کام نکلتا ہے۔" اس نے رحیم داد کا ہاتھ تھام کر ہولے سے دبایا۔ "تجھے بھی ملتان لے چلوں گا۔ سب سے تجھے ملواؤں گا۔ چوہدری! ایسا موکع روز روز نہیں ملتا۔"

"تیرے ساتھ میں ضرور ملتان چلوں گا۔" رحیم داد نے نرم لہجے میں اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "پر تو سوچ۔ سلھڑی کا پتر آج ہی مرا ہے وہ تیری بہت چہیتی اور پرانی رکھیلی ہے۔ تیرے اس طرح چلے جانے پر اسے بہت دکھ ہو گا۔ تیرے بارے میں وہ کیا سوچے گی؟"

"تو اس کی فکر نہ کر۔" مراد خاں شاہانی نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ "چند روز میں وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائے گی۔ پہلے کی طرح مسکراتی، لچکتی، بل کھاتی رات کو میرے پاس آئے گی۔ تو اسے نہیں جانتا۔ میکوں اچھی طرح پتہ ہے، وہ میری کسی گالھ کا ذرا برا نہیں مناتی۔ وہ

مجھ سے کبھی روٹھ نہیں سکتی۔" اس نے ہلکا قہقہہ بلند کیا۔" بس ذرا کمر پر ہاتھ پھیرا، گلے لگا کر پیار سے کہا، ہائے میری جند جانی! وہ ایک دم موم کی طرح پگھل جاتی ہے۔ خوشی سے ایسی مست ہو جاتی ہے جیسے پھول کھلتا ہے۔ میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ برسوں سے میرے پاس ہے۔ مجھ سے زیادہ اسے کون جان سکتا ہے۔"

"ویسے جیسی تیری مرضی۔ میں چاہتا تھا تو ایک روز یہاں ٹھہر جاتا تو اچھا تھا۔" رحیم داد نے اسے روکنے کے لیے دبی زبان سے اصرار کیا۔

"چوہدری! میرے یہاں ٹھہرنے سے کیا ہوگا۔" مراد خاں شاہانی رضامند نہ ہوا۔" رادھانی موجود ہی رہے گا۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے، گور کفن کا بندوبست کر دے۔ وہ سارا کام ٹھیک ٹھاک طور سے کرا دے گا۔ تجھے پتہ ہے وہ کتنا ہوشیار بندہ ہے۔" اس نے گردن اونچی کی اور ذرا پھیل کر بیٹھ گیا۔" چوہدری اطمینان رکھ۔ سلھڑی کے پتر کا کفن دفن پوری شان سے ہوگا۔ غریب غربا کو روٹی کھلائی جائے گی۔ مندر چھوڑ دے چاول ہوں گے، کل ہوگا، فاتحہ ہوگی۔ جمعراتیں ہوں گی۔ سب ہی کچھ ہوگا اور میری طرف سے ہوگا۔" اس نے مسکرا کر رحیم داد کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ "چوہدری! تجھے پتہ ہے، میں سلھڑی کو کتنا پیار کرتا ہوں۔ وہ میری چہیتی ذال ہے۔"

رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد ناشتہ آ گیا۔ رحیم داد نے بے دلی سے ناشتہ کیا اور جلد ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ خاصا افسردہ اور دل گرفتہ تھا لیکن شاہانی اطمینان سے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر افسردگی کا نام و نشان نہ تھا۔

پہر دن گزرا۔ سورج چڑھ کر آسمان کی بلندی پر پہنچا۔ مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالا اور اس کے ہم راہ حویلی کے پھاٹک پر پہنچا۔ دونوں جیپ میں سوار ہو گئے۔ حویلی کے پچھواڑے سلھڑی کی کوٹھڑی میں پٹنی ہو رہی تھی۔ رونے اور بین کرنے کی دل دوز آوازیں ابھر رہی تھیں۔

جیپ آگے بڑھی۔ رحیم داد اور سردار مراد خاں رونے اور بین کرنے کی دل دوز آوازیں دور تک سنتے رہے۔ دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ جیپ ہچکولے کھاتی، گرد کے بادل اڑاتی گاؤں کے

کچے راستے پر دوڑتی رہی۔ رونے پیٹنے کی آوازیں پیچھے رہ گئیں۔ جیپ پختہ سڑک پر آگئی اور تیز رفتار سے بھکر شہر کی جانب دوڑنے لگی۔

☆

مرشد علی گردیزی حویلی کے چوک ہی میں مل گیا۔ مراد خاں شاہانی کو دیکھتے ہی دوڑ کر گلے سے لپٹ گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے گلے سے لگے ہوئے خاصی دیر تک جوش و مسرت سے قہقہے لگاتے رہے، گلے شکوے کرتے رہے۔ پھر ہنستے مسکراتے بیٹھک کی جانب بڑھے رحیم داد بھی ان کے ساتھ تھا۔ مراد خاں نے مرشد علی کا تعارف کراتے ہوئے رحیم داد کو مخاطب کیا۔

"چوہدری! یہ گردیزی میرا بہت پرانا یار ہے۔ جب میں لہور میں پڑھتا تھا۔ یہ میرا کلاس فیلو ہوتا تھا۔ ہم اکٹھے ہوسٹل میں رہتے تھے۔"

"اور اکٹھے ہی چھپ چھپ کر کنجریوں کے پاس ہیرا منڈی بھی جاتے تھے۔" گردیزی نے زور کا قہقہہ لگایا۔ "پر اس نے پرنا پہلے کرلیا اور مجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔"

مراد خاں نے بھی زور کا قہقہہ بلند کیا۔ رحیم داد کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "مرشد! یہ چوہدری نور الٰہی ہے۔ منٹگمری کا وڈا زمیں دار ہے۔ احسان شاہ کی حویلی میں پہلی بار اس سے ملا تھا۔ تب سے ایسی یاری ہوگئی کہ اب تو یہ میرا جگری یار ہے۔"

مرشد علی نے مسکرا کر رحیم داد کو دیکھا، گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبا کر بولا۔ "چوہدری! تو مراد کا یار ہے تو آج سے میرا بھی یار بن گیا۔" اس نے بات کا رخ موڑ کے اچانک مراد خاں کو مخاطب کیا۔ "یار شاہانی! آج تک احسان شاہ سے تیری یاری کا راز سمجھ نہیں آیا۔" وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ "خدا جھوٹ نہ بلوائے، وہ عمر میں لگ بھگ تیرے پیو کے برابر ہوگا۔ تیری اس کے ساتھ کیسے یاری ہوسکتی ہے؟"

"تو اس راز کو نہیں جانتا۔" مراد خاں نے صاف گوئی سے بتایا۔ "وہ عمدہ اسکاچ وہسکی

پلاتا ہے اور سب سے خاص بات یہ ہے کہ اس کے کوٹ میں ایک سے ایک زوردار اور پوپٹ ارن ہے۔ خود تو عیش کرتا ہی ہے پر یاروں کو کرا کے زیادہ خوش ہوتا ہے۔"

"تو اس سے کہاں ٹکر گیا؟" مرشد علی شاہ گردیزی نے پوچھا۔ "پہلے تو تیری اس سے یاری نہیں تھی۔ سال سوا سال سے سن رہا ہوں تو اس کے پاس بہت جانے لگا ہے۔ کئی کئی روز اس کی حویلی میں ٹھیرتا ہے۔ یہ چکّر کیا ہے؟"

"بات دراصل یہ ہے سئیں!" مراد خاں نے مسکرا کر بتایا۔ "شاہ جی کا ایک جنوائی سی ایس پی افسر ہے۔ وہ ضلع میانوالی میں ڈپٹی کمشنر لگا ہے اور میرا ایک کام اس سے اٹکا ہے۔ اس چکّر میں شاہ جی سے ملنا پڑا۔ نواب زادہ نیاز محمّد خاں کو تو جانتا ہی ہے۔ وہی اپنا کالا باغ والا۔ اسی نے شاہ جی سے مجھے ملایا تھا۔" اس نے ہنس کر مرشد علی گردیزی کے زانو پر ہاتھ مارا۔ "پر یہ باتیں میں تجھے پہلے بھی بتا چکا ہوں۔"

"کیا بتا چکا ہے۔" مرشد علی شاہ نے شکوہ کیا۔ "تجھ سے پچھلے دنوں میرا ملنا جلنا ہی کتنا رہا۔ دو تین بار ملا بھی تو کبھی ٹھیک سے بات نہیں ہوئی۔ تو نے ہر بار ملتان آنے اور میرے ساتھ کچھ دن گزارنے کا وعدہ بھی کیا پر کبھی آیا نہیں۔"

"اب تو تیرے ساتھ ملتان چل ہی رہا ہوں۔ روز ہی مل بیٹھیں گے، جی کھول کر باتیں ہوں گی۔ پرانی یادیں تازہ ہوں گی۔"

نوکروں نے بیٹھک ہی میں کھانا لا کر میز پر چن دیا۔ تینوں نے کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر مراد خاں اور مرشد علی شہر چلے گئے۔ رحیم داد زینہ طے کر کے اوپر کی منزل کے اس کمرے میں چلا گیا جس میں اس کے قیام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ مرشد علی گردیزی کا کمرہ برابر ہی تھا۔

شام کو پینے پلانے کا دور چلا۔ مرشد علی گردیزی اور رحیم داد کے درمیان جو حجاب اور تکلّف تھا وہ چند ہی پیگ لگانے کے بعد دور ہو گیا۔ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ مراد خاں زیادہ دیر ان کے ساتھ نہ بیٹھ سکا۔ ساڑھے آٹھ بجے اُٹھ کر

کھڑا ہوگیا۔

رحیم داد نے ٹوکا۔ "کہاں چلا شاہانی؟"

"چوہدری! میں نے اب اندر جانا ہے۔" مراد خاں شاہانی نے سنجیدگی سے کہا۔ "گردیزی تو تیرے ساتھ بیٹھا ہی ہے۔"

"کچھ دیر اور ٹھیر جاتا تو اچھا تھا۔" رحیم داد نے اصرار کیا۔ "چلا جانا، ابھی تو بہت رات پڑی ہے۔"

"نہیں! اب میں نہیں ٹھیر سکتا۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "اپنی ذال انتظار کر رہی ہے۔ ۲۵ روز بعد لوٹا ہوں۔ کچھ اس کا بھی تو حق ہے۔"

"جا یار جا۔" مرشد علی نے ہنس کر بے تکلفی سے کہا۔ "چوہدری! اسے جانے دے۔ اس نے اب نہیں رُکنا۔"

مراد خاں شاہانی چلا گیا۔

ذرا دیر خاموشی رہی۔ مرشد علی نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا اور مسکرا کر بولا۔ "چوہدری! تجھے پتہ نہیں، شاہانی اپنی گھروالی سے بہت ڈرتا ہے۔"

"میں تو سمجھتا ہوں جی، وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔" رحیم داد نے زور دے کر کہا۔ "اور کسی زنانی سے تو وہ ڈر ہی نہیں سکتا۔ گھروالی تو صرف بچوں کی ماں ہوتی ہے۔ اس سے کیا ڈرنا شرنا۔"

"پر شاہانی کی گھروالی کی بات ہی دوسری ہے۔" مرشد علی گردیزی نے نشے میں لہرا کر رحیم داد کو گہری نظروں سے دیکھا۔ "وہ وڈی جگیر دارنی بھی ہے۔ اسے نر کے میں بہت وڈی جگیر ملی ہے۔" وہ کچھ زیادہ ہی چڑھا گیا تھا۔ قہقہہ لگا کر بولا۔ "ایسی گھروالی سے تو ڈرنا ہی پڑتا ہے۔"

"یہ تو میں نوں پتہ نہیں تھا۔" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔

"تجھے تو یہ بھی پتہ نہ ہوگا کہ شاہانی اس کا دوسرا کھصم ہے۔ دھیج میں ایک اگوایا بھی ساتھ لائی ہے۔" مرشد علی پر نشہ تیزی سے چڑھا تھا۔ بار بار زور کا ریلا آتا۔ اس کی جھوک میں وہ رحیم داد سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہوگیا۔ شاہانی کی نجی زندگی کے بارے میں کھل کر بات

کرنے لگا۔" اس کا پہلا کھصم بہت وڈا جگیر دار ہوتا تھا۔ وہ گھوڑی سے گر کر مر گیا۔ اس کے مرن کے بعد ساری جائیداد اور زمین داری گھر والی اور اس کے اکلوتے پتّر کو ملی۔"

"اس کی زمین داری بھی بیٹ میں ہے؟" رحیم داد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔

"نہیں!" مرشد علی گردیزی نے جواب دیا۔" نواں کوٹ میں اس کے مربعے ہیں، باغات ہیں ان کی دیکھ بھال شاہانی کا سالا کرتا ہے۔ پر اب تو اس جائیداد اور اراضی کا مالک بھی مراد ہی ہے۔" اس نے نشے میں جھوم کر قہقہہ لگایا۔" اسی جگیر کے چکر میں تو مراد کے پیو نے اس سے پرنا کر دیا حالانکہ عمر میں بھی وہ وڈی تھی اور ایک پتّر کی ماں بھی تھی۔ یہ جائیداد اور جگیر بھی بہت ظالم ہوتی ہے۔"

"یہ باتیں تو شاہانی نے مجھے کبھی بتائی ہی نہیں۔" رحیم داد بدستور حیرت زدہ تھا۔

"ایسی باتیں کہیں بتانے والی ہوتی ہیں سئیں چوہدری! تو نے بھی حد کر دی۔" وہ رحیم داد کی سادہ لوحی پر ٹھٹھا مار کر ہنسا۔" مجھے تو اس لیے معلوم ہیں کہ مراد کے پرنے میں شریک ہوا تھا۔ ویسے میں اس کی ذال کے پہلے کھصم کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔" مرشد علی نے گردن بڑھا کر سرگوشی کی۔" تجھے راز کی ایک گالہہ بتاؤں، شاہانی سے اب تک اس کی کوئی نرینہ اولاد نہیں۔ ایک نکی ہوئی تھی۔ بچپن ہی میں مر گئی۔ اب تو پہلے ہی کھصم کا پتّر رہ گیا ہے۔ اس کا نام محمد سلمان خاں ہے۔ اچھا گھبرو جوان ہے۔ بالکل اپنے پیو پر گیا ہے۔ وہ جرّیا اور تکڑا جوان ہوتا تھا۔"

رحیم داد نے ہنس کر تبصرہ کیا۔" تب ہی تو شاہانی نت نئی زنانیوں کے چکر میں رہتا ہے۔"

"چوہدری! ویسے یہ انوکھی گالہہ نہیں۔" وہ نشے میں بولا۔" سارے ہی وڈے زمیں دار اور جگیر دار اسی چکّر میں رہتے ہیں۔ گھر والیاں بھی سب کچھ جانتی ہیں پر انہیں پتہ ہوتا ہے کہ جگیر اور جائیداد کی اصلی مالکن وہی ہوتی ہیں۔ انہی کی اولادیں جائیداد کی وارث بنتی ہیں۔ یہ حق ان سے کوئی نہیں چھین سکتا۔" وہ بہکنے کے عالم میں بڑ بڑانے لگا۔" یار چوہدری! اپنے بادشاہ اور شہنشاہ بھی تو حرم رکھتے تھے۔ ان میں چھانٹ چھانٹ کر ایک سے ایک خوبصورت

اور پوپٹ کنیزیں رکھتے تھے،" اس نے قہقہہ لگایا" عیش کرتے تھے جی۔ جب چاہتے تھے اور جسے چاہتے تھے اس کے ساتھ سوتے تھے۔ انہیں کوئی روکنے والا یا منع کرنے والا تو ہوتا نہیں تھا۔ پر ملکہ، ملکہ ہی ہوتی تھی۔ تخت و تاج اسی کے پتر سنبھالتے تھے۔ اسی سے ان کی نسل چلتی تھی۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

" ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ بالکل ٹھیک کہہ رہا۔" رحیم داد بھی نشے کے ایک زوردار ریلے میں بہہ گیا۔" اس معاملہ میں اپنا مراد خاں بھی کسی بادشاہ سے کم نہیں۔ اسے تو روز نئی رن چاہیئے۔"

" پر شاہانی کچھ زیادہ ہی رَنّاں کے چکر میں رہتا ہے۔" گردیزی بولا۔" میں نے اور دل سے بھی سنا ہے، مراد اب بہت رن رسیا ہو گیا ہے۔"

رات گزرتی رہی۔ مے نوشی کا دور چلتا رہا۔ بات سے بات نکلتی رہی۔ شاہانی سے ہٹ کر بات سیاست پر آگئی۔ رحیم داد کو سیاست کے بارے میں کوئی شدبد نہیں تھی۔ مگر مرشد علی شاہ سیاسی جوڑ توڑ سے خاصا باخبر تھا۔ وہ ملک کے سیاسی حالات کے بارے میں ایسی باتیں سناتا رہا۔ جو رحیم داد کے لیے نئی تھیں اور حیرت انگیز بھی۔

دونوں نے جم کر پی۔ کھانا کھایا اور اپنے اپنے کمروں میں جا کر بستر پر لیٹ گئے۔

دوسرے روز دوپہر کو ملتان جانے کا پروگرام تھا مگر صبح کی ٹرین سے اچانک مراد خاں کی بیوی کا چھلگ یا لاڈلا محمد سلمان خاں آگیا۔ وہ اُنیس بیس سال کا خوش شکل اور صحت مند نوجوان تھا۔ گورڈن کالج راولپنڈی میں پڑھتا تھا اور ہوسٹل میں رہتا تھا۔ دو ہفتے کی چھٹی پر بھکر آیا تھا۔ اس کے پہنچنے کے بعد مراد خاں کا پروگرام درہم برہم ہو گیا۔ وہ ملتان نہیں جا سکا۔ اس نے مرشد علی کو بھی روک لیا۔ مراد خاں کا بیشتر وقت سلمان کے ساتھ گزرتا۔ وہ اسے بہت چاہتا تھا۔ اس کی بڑی ناز برداری کرتا۔ اس کے آرام و آسائش کا ہر طرح خیال رکھتا۔

مرشد علی اور رحیم داد ایک دوسرے کے زیادہ قریب آگئے۔ دونوں شام کو دیر تک بیٹھتے بادہ نوشی کرتے اور ہنس ہنس کر بے تکلفی سے باتیں کرتے۔ شاہانی ان کی صحبت میں کم ہی وقت گزارتا۔ پہر رات گزرتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو جاتا۔ چار روز گزر گئے۔ مرشد علی کے لیے بہن کی شادی

کے باعث زیادہ قیام کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے بار بار اپنی مجبوری کا مراد خاں سے اظہار کیا۔ اس کے زور دینے پر پانچویں روز مراد خاں اور رحیم داد شام کی ٹرین سے مرشد علی گردیزی کے ہم راہ ملتان روانہ ہو گئے۔

☆

ملتان میں دو روز ٹھیرنے کے بعد مرشد علی سویرے سویرے مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کو قاسم بیلہ لے گیا۔ وہاں اس کی زمینیں تھیں۔ آم اور مالٹے کے باغات تھے۔ چند میل کے فاصلے پر دریائے چناب بہتا تھا۔ اس کے کنارے گھنے جنگل تھے۔ جن میں مرشد علی کی اپنی شکارگاہ بھی تھی۔ قاسم بیلہ میں اس کی ایک حویلی بھی تھی۔ اسی میں تینوں کے قیام کا بندوبست کیا گیا۔

رات گزری۔ صبح ہوئی۔ مراد خاں اور مرشد علی شکار کھیلنے نکل گئے۔ رحیم داد نہیں گیا۔ اسے شکار سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ طبیعت بھی کچھ مضمحل تھی۔ پچھلی رات بہت زیادہ شراب پی گیا تھا۔ اس کا خمار ابھی تک باقی تھا۔ سر میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ اس نے گرم پانی سے غسل کیا۔ لسی کے کئی گلاس چڑھائے لیکن خمار اور ہینگ اوور میں کمی نہ آئی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر رحیم داد باغ میں چلا گیا۔ باغ حویلی کی چاردیواری کے اندر ہی تھا۔ خاصا وسیع بھی تھا۔ اس میں پھلوں کے درخت تھے۔ رات کی رانی اور چنبیلی کے بیلوں سے مہکتے ہوئے فرحت افزا کنج تھے۔ گلاب کے پودے کثرت سے تھے اور قسم قسم کے تھے۔ ان کی چمن بندی سلیقے اور نفاست سے کی گئی تھی۔ سرمائی ہلکی ہلکی دھوپ میں گلاب کے شگفتہ پھول مہک رہے تھے۔ ان کی پنکھڑیوں پر شبنم کے قطرے جھل ملا رہے تھے۔

رحیم داد کو باغ بہت پسند آیا۔ وہ سبزہ زار میں پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا اور دھوپ سے لطف اندوز ہونے لگا مگر وہ زیادہ دیر باغ میں نہ بیٹھ سکا۔ طبیعت بے مزہ ہو رہی تھی۔ سر چکرا رہا تھا اور آنکھیں سلگ رہی تھیں۔ وہ کمرے میں گیا اور بستر پر سو گیا۔

دوپہر کو وہ سو کر اٹھا۔ ایک بار پھر خوب گرم پانی سے غسل کیا۔ اب اسے کچھ قرار آیا۔ وہ

فرحت اور تازگی محسوس کرنے لگا۔ اس نے کھانا کھایا اور مرشد علی کے مینیجر خادم علی جویا کے ہم راہ کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ خریف کی فصل کی کٹائی ہو چکی تھی۔ کھیتوں میں جگہ جگہ مکئی اور لماد کے کٹے ہوئے پودوں کے مہارے اور ڈھیر لگے تھے۔

دونوں پگڈنڈیوں اور پہیوں سے گزرتے ہوئے کپاس کے کھیتوں میں چلے گئے۔ کپاس کی فصل بہت اچھی تھی۔ اور اس کی کاشت بہت بڑے رقبے پر کی گئی تھی۔ سورج بیچ آسمان سے گزر کر تھوڑا سا مغرب کی طرف ڈھلک گیا تھا۔ دھوپ میں تمازت آگئی تھی۔ کپاس کے پودوں میں روئی کے سفید سفید گالے ڈوڈوں سے پھوٹ کر باہر جھانک رہے تھے۔ یہ پھٹی تھی۔ سرائکی میں اسے ونواڑ بھی کہا جاتا ہے۔ اجلی اجلی ونواڑ کھیتوں میں حدِ نظر تک پھیلی ہوئی تھی۔ سورج کی چمکیلی اور ترچھی کرنوں میں جھلکتی نظر آرہی تھی۔ کپاس کے پودے دیکھ کر صاف پتہ چلتا تھا کہ ونواڑ کی چنائی بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔

اس وقت بھی نوجوان جوگی عورتیں اور لڑکیاں ٹولیاں بنائے کھیتوں میں جگہ جگہ بکھری ہوئی تھیں۔ وہ ونواڑ کی چنائی کر رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے دوپٹے پیشانی سے سر تک لپیٹ کر پیچھے کر لیے تھے اور ان کے دو پلو کمر کے گرد باندھ رکھے تھے۔ وہ انگلیوں سے ونواڑ چنتیں اور دائیں بائیں کمر کے پیچھے ڈالتی جاتیں۔ اُن کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے، چہروں پر پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے۔ وہ قہقہے لگا رہی تھیں اور ونواڑ کی چنائی کے گیت گا رہی تھیں۔ رحیم داد جب خادم علی جویا کے ہم راہ جوگیوں کے قریب سے گزرا تو انہوں نے نظریں اٹھا کر دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ ونواڑ چن چن کر دائیں بائیں تیزی سے اڑس رہی تھیں اور ہنس ہنس کر گا رہی تھیں۔

ملک تاں تیڈا یار ہے، تو کیوں میر بینڈیں بولیاں

موسم آئی ونواڑ دی چڑ ویاں لمکیاں بھولیاں

خادم علی جویا گیت کے بول سن کر مسکرایا۔ اُس نے رحیم داد سے پوچھا "سیکں چوہدری! تو ملتانی سمجھتا ہے؟"

رحیم داد بولا "زیادہ نہیں جانتا جی!"

جویا نے ہنستے ہوئے کہا "یہ جوگیاں تجھے دیکھ کر آپس میں چھیڑ چھاڑ کر رہی ہیں، ایک دوسرے سے کہہ رہی ہیں، زمیں دار تیرا یار ہے۔ تو مجھے کیوں طعنے دیتی ہے۔ کپاس چن نے کا موسم آگیا ہے۔ بھولی بھالی مٹیاریں کپاس چن رہی ہیں۔ ان بولوں کا یہی مطلب ہے۔" وہ بے تکلفی سے ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگا۔

رحیم داد مسکرایا، اس نے جوگیوں کی جانب دیکھا۔ وہ گا رہی تھیں، ہنس رہی تھیں اور دنواڑ چن نے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دونوں کپاس کے کھیتوں کے درمیان گزرتی ہوئی ایک پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ کچھ دور جانے کے بعد رحیم داد کپاس کی چنائی کرنے والی ایک جوگی کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت نمودار ہوئی۔ رحیم داد نے اسے پہچان نے کی کوشش کی۔ وہ شاداں تھی۔ ہاں وہی تھی۔ وہی کسا ہوا سڈول جسم، وہی ملگجے چھگے سے جھانکتا ہوا بھرا بھرا سینہ، وہی بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ وہ ذرا بھی نہیں بدلی تھیں۔

شاداں کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ چہرہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ اور دھوپ میں اُجلے تانبے کی طرح دمک رہا تھا۔ اس کے بالوں میں پھٹی کے ریشے الجھے ہوئے تھے۔ لمبی لمبی پلکوں پر خاک کے ذرّوں کی تہہ نظر آرہی تھی۔ وہ انگلیوں سے پھٹی چنتی، جوگیوں کے غول سے نکل کر کبھی اس پودے پر جاتی کبھی اس پر۔ اس کے چہرے پر نہ شوخی تھی نہ اس کے انداز میں چلبلا پن تھا۔ وہ نظریں جھکائے محویت سے جوگیوں کے ساتھ آواز میں آواز ملا کر گا رہی تھی۔

روزی دے کھاطر وطن بیٹو سے
ملک بگانے ان دلیو سے
غربت دی مانگ
دلبر دی تانگ
نیراں دی وانگ

دیس بدیس وچ پیٹ دی کھاطر در در عزتاں رولیاں

خادم علی جویا نے شاداں کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے رحیم داد کو بتایا "سئیں! اس کا ناں شاداں ہے۔ یہ گا نہیں رہی۔ گیت کے بولوں میں اپنے دل کا حال بیان کر رہی ہے۔ یہ کہہ رہی ہے۔

میں نے روزی کے لیے وطن چھوڑا

اب پرائے دیس میں ماری ماری پھرتی ہوں

غربت کی برچھی ہے

دل برکا انتظار ہے

دونوں ہی تیر کی طرح چھیدتے ہیں

پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے دیس بدیس ٹھوکریں کھا رہی ہوں۔ عزت اور لاج خاک میں ملا دی ہے۔

رحیم داد نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ خادم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا "سئیں! یہ بھی تیرے ہی ضلع کی رہنے والی ہے۔ پچھلے کئی مہینوں سے ادھر آگئی ہے۔ بہت محنتی اور جفاکش جوگی ہے۔ پر اتنی ہی کڑوی اور سرکش بھی ہے۔" وہ ایک آنکھ دبا کر شوخی سے مسکرایا "سونہڑی اور پوپٹ رن ہے پر جنگلی گھوڑی کی طرح بدکنی ہے۔" رحیم داد نے خادم علی جویا کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ چپ چاپ چلتا رہا۔

شاداں نے ناگاہ نظریں اٹھا کر رحیم داد کی طرف دیکھا اور ایک ٹک دیکھتی رہی۔ وہ بالکل رحیم داد کے سامنے تھی۔ دونوں کے درمیان صرف کپاس کے چند پودے حائل تھے۔ رحیم داد نے جھٹ نظریں گھمائیں اور گردن اٹھائے جویا کے ہم راہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔ شاداں کو دیکھ کر اسے لالی یاد آگیا اور وہ دن یاد آگئے۔ جب وہ جیل میں اس کے ساتھ تھا پھر اس کے ساتھ ہی جیل کی دیوار پھاند کر فرار ہوا تھا۔ گرفتاری کے ڈر سے ویرانوں اور جنگلوں میں چھپتا پھرتا تھا۔ ان یادوں کی یلغار نے اس کے ذہن میں کھلبلی مچادی۔ وہ زیادہ دور نہیں گیا۔ حویلی

میں واپس آگیا۔

شام کا دھندلکا پھیلنے لگا مگر مرشد علی شاہ اور مراد خاں نہیں آئے۔ ڈیرے کے ایک دالان میں جوگیاں پھٹی کی گٹھڑیاں سنبھالے بیٹھی تھیں۔ رحیم داد بھی ایک کرسی پر الگ تھلگ بیٹھا تھا۔ تین چار کارندے فرش پر بیٹھے تھے۔ وہ خادم علی جویا کی ہدایت کے مطابق جوگیوں کو اُن کا چگائی کے حصے کی پھٹی دے رہے تھے۔

چنائی شروع ہوئے کچھ عرصہ گزر چکا تھا مگر ہر جوگی نے اچھی مقدار میں پھٹی چنی تھی۔ قاعدے کے مطابق چنائی کے ابتدائی دنوں میں ہر جوگی کو اس کی چنی ہوئی پھٹی یا ونواڑ کا سولھواں حصہ دیا جاتا ہے۔ بعد میں گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ کپاس کے کھیتوں میں جوں جوں ونواڑ کم ہوتی جاتی ہے۔ چگائی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جوگیوں کو چنی ہوئی ونواڑ میں سے اٹھواں، یہاں تک کہ چھٹا حصہ ملنے لگتا ہے۔

ہر جوگی باری باری آتی، اپنی گٹھڑی کھول کر ونواڑ سامنے ڈالتی، کارندے بارہ حصے کرتے اور ایک حصہ جوگی کو چگائی کے طور پر دے دیتے۔ چنائی کے اس مرحلے پر چگائی کی تقسیم اسی طرح مقرر کی گئی تھی۔ حصہ کرتے وقت جوگیاں عام طور پر جھگڑتیں، کارندوں کے خلاف احتجاج کرتیں، جو ڈھیری سب سے بڑی سمجھتیں، اُسے حاصل کرنے کی کوشش کرتیں، مگر یہ فیصلہ خادم علی جویا کرتا کہ کس جوگی کو چگائی میں کون سی ڈھیری دی جائے۔ وہ چاہتا تو کسی کو چگائی میں زیادہ ونواڑ دے دیتا۔ کسی کو کم دیتا۔

دالان میں جوگیاں چائیں چائیں کر رہی تھیں۔ اونچی آواز سے بول رہی تھیں۔ لڑتے جھگڑتے کے ساتھ قہقہے بھی لگا رہی تھیں۔ جویا انہیں بار بار ڈانٹتا۔ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش بھی ہو جاتیں لیکن پھر شور مچانا شروع کر دیتیں۔ جوگیوں میں شاداں بھی تھی۔ ابھی اُس کی باری نہیں آئی تھی۔ وہ ایک کونے میں دیوار سے پیٹھ ٹکائے چپ بیٹھی تھی۔ قریب ہی اُس کی ونواڑ سے بھری ہوئی گٹھڑی رکھی تھی۔ وہ نڈھال اور تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

رحیم داد اکتا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مہمان سرا کی طرف بڑھا جو ڈیرے ہی کے ایک حصے میں تھی۔

ڈیرے میں بھی مہمان ٹھہرتے تھے مگر مہمان سرا میں سرکاری افسر اور بڑے زمیں دار ٹھہرائے جاتے تھے۔ اُس کے کمرے کشادہ تھے۔ بستر اور فرنیچر بھی عمدہ تھا۔ رحیم داد اپنے کمرے میں گیا اور تھکا ہوا سا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مرشد علی اور مراد خاں ابھی تک شکار سے نہیں لوٹے تھے۔

کمرے کے باہر کہر کا دھندلکا پھیلا تھا۔ رات دبے قدموں درو دیوار سے اتر رہی تھی۔ ڈیرے کے جس حصے میں جوگیوں کو جگائی ادا کی جا رہی تھی، وہاں سے ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور ابھر رہا تھا۔ رحیم داد کو کمرے میں آئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ شاداں دفعتہً اندھیرے سے نکل کر کمرے میں داخل ہوئی اور دہلیز کے پاس پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ وہ احاطے میں لگے ہوئے ہینڈ پمپ پر منہ دھو کر آئی تھی۔ اس کے چہرے پر پانی کے قطرے جھل ملا رہے تھے۔ کانوں پر پڑی ہوئی لٹیں بھیگی ہوئی تھیں۔

شاداں نے بیٹھتے ہی دوپٹے کے پلّو سے منہ پونچھا، مسکرا کر رحیم داد کو دیکھا اور کہنے لگی "لگتا ہے، میں نے تجھے پہلے بھی دیکھا ہے۔"

رحیم داد نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ اس کا چہرہ اب ترو تازہ اور نکھرا نکھرا دکھائی دے رہا تھا۔ آنکھوں میں ستارے جگ مگا رہے تھے۔ ناک سبک اور ستواں تھی، ہونٹ بھرے بھرے تھے۔ اس کی گول گول سڈول پنڈلیاں سبز لاچے سے جھانک رہی تھیں۔ شاداں اسے دل کش اور طرح دار لگی۔ وہ اس کی نظروں میں اسی روز سما گئی تھی جب اس نے پہلی بار اسے جہانگیرہ میں دیکھا تھا۔

شاداں نے اپنا سر دوپٹے سے ڈھکتے ہوئے تیکھے لہجے میں کہا "تو مجھے اس طرح گھور کیوں رہا ہے؟"

"میں تو پہچان نے کی کوشش کر رہا ہوں۔" رحیم داد نے مسکرا کر بات بنائی "یاد تو میں نوں بھی آتا ہے کہ تیں نوں پہلے کہیں دیکھا ہے۔" وہ سوچنے کے انداز میں گردن جھکا کر چند لمحے خاموش بیٹھا رہا پھر اس نے نگاہیں اٹھا کر شاداں کی جانب دیکھا "یاد آیا، تو مجھے منٹگمری سٹیشن پر ملی تھی، کسی کیدی سے ملنے جا رہی تھی۔" اس نے قدرے توقف سے کہا۔

"میں نے غلط تو نہیں سوچا؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ میں لالی سے ملنے جا رہی تھی۔" شاداں بولی۔ "توں میں توں منٹگمری اسٹیشن پر ملا تھا پر یہ تو بہت پرانی گل ہے۔ میں تو بھول بھی گئی تھی۔"

"تیں نوں ایک بار دیکھ کر کوئی بھول سکتا ہے۔" رحیم داد نے اسے چھیڑا۔

شاداں کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ وہ شرمانے کے انداز میں فرش پر انگلی سے آڑی ترچھی لکیریں بناتے ہوئے بولی "لالی بھی جب بہت خوش ہوتا ہے تو یہی کہتا ہے۔"

"یہ لالی کون ہے؟" رحیم داد نے ان جان بننے کی کوشش کی۔

"وہی ہے جسے اس روز ملنے جا رہی تھی۔" شاداں نے بتایا "ادھر ڈسٹرکٹ جیل میں کید کاٹ رہا ہے۔"

"لالی تیرا کیا لگتا ہے؟"

"کچھ لگتا ہی ہے۔" وہ نظریں جھکا کر بولی۔ "اسی کے لیے میں کادر آباد چھوڑ کر یہاں آگئی۔"

اس نے رفتہ رفتہ نظریں بلند کیں، رحیم داد کی جانب دیکھا "اس سے پہلے میں جہانگیرہ میں ہوتی تھی۔ کادر آباد سے ملتان آنے میں جی بہت چکر ہوتا تھا۔ گھر میں بھی کوئی نہ تھا۔ میں بالکل اکیلی تھی۔ ماما ساتھ میں ہوتا تھا۔ وہ دودھی ہے، لہور چلا گیا۔"

"لالی کو جیل کیوں ہوگئی؟" رحیم داد نے بے نیازی سے پوچھا۔

"وہ جی ایسا ہے کہ پہلے تو اسے چوری چکاری میں سزا ہوئی، فیر جیل سے نکل بھاگا۔ اس کے ساتھ ایک کیدی اور بھی فرار ہوا تھا۔ اس کا ناں رحیم داد تھا۔" وہ بات کہتے کہتے بے تکلفی سے ہنسنے لگی۔ "سچ مچ تجھ سے کچھ ملتا جلتا تھا۔"

رحیم داد بہت سٹ پٹایا، اس کا چہرہ فق ہوگیا مگر شاداں نے صفائی پیش کی۔ "وہ تو جی کب کا مر گیا۔ کسی نے اسے کتل کر دیا تھا۔ سنا ہے پرانی دشمنی تھی۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "ادھر لالی کی پولس کے ساتھ گولی چلی۔ زخمی ہوا، پکڑا گیا۔"

"تب تو اسے لمبی سزا ہوئی ہوگی۔"

"زیادہ لمبی نہیں ہوئی۔" شاداں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "منٹگمری کا مجسٹریٹ لالی کو جانتا تھا۔ اس نے بہت کم سزا دی۔ ویسے میں نے اس کے مقدمے میں وکیل بھی تکڑا اکھڑا کیا تھا۔ ہر پیشی پر خود عدالت میں جاتی تھی۔"

"ایک گل پوچھوں شاداں!" رحیم داد نے زور دے کر کہا۔ "سچ سچ بتانا۔"

وہ بولی۔ "پوچھ۔ کیا پوچھنا چاہتا ہے؟"

"یہ بتا۔" رحیم داد نے کہا۔ "لالی چور اچکا ہے، نمبری بدمعاش ہے، جیل بھی کاٹ رہا ہے تب بھی تو اس سے اتنا پیار کرتی ہے کہ اس کے لیے گھر بار چھوڑ کر یہاں آ گئی۔"

"پہلے تو جی وہ بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔" شاداں نے صاف گوئی سے بتایا۔ "فیر جانے کیوں اس سے اتنا پیار ہو گیا۔" اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "پر اب تو اس نے مجھ سے پکا وعدہ کر لیا ہے کہ بالکل چوری چکاری نہیں کرے گا۔ لگتا بھی ہے کہ اب وہ ایسا نہیں کرے گا۔"

"تہیں نوں کیسے اندازہ ہوا کہ وہ چوری چکاری کی پرانی عادت چھوڑ دے گا؟ یہ بات سمجھ نہیں آئی۔"

"تیری سمجھ میں آ بھی نہیں سکتی پر میں اسے سمجھتی ہوں۔" شاداں نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "اب یہی دیکھ۔ پچھلے دنوں چناب میں زبردست سیلاب آیا۔ بھکری سے آگے لوپ بند ٹوٹ گیا۔ بہت تباہی ہوئی۔ کئی پنڈ بالکل پانی میں ڈوب گئے۔ جیل سے کیدی بند کی مرمت کرنے بھیجے گئے۔" اس نے رحیم داد کی جانب مسکرا کر دیکھا۔ "میں نے کیدیوں کو بند پر کام کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ دن رات زبردست کام ہوتا تھا۔ کئی کیدی رات کے اندھیرے میں نکل بھاگے۔"

"لالی بھی بھاگنے والوں کے ساتھ نکل گیا ہو گا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"نہیں۔" شاداں نے انکار میں گردن ہلائی۔ "بھاگنے والے کیدیوں نے لالی سے اپنے ساتھ چلنے کو بہت کہا پر وہ اس چکر میں نہ پڑا۔ بند پر محنت سے کام کرتا رہا۔" اس نے فخر

سے گردن اونچی کی۔" جیل کا وڈا افسر اتنا خوش ہوا کہ اس نے لالی کی سزا میں کمی کر دی اور اب تو اسے پیٹی بھی مل گئی ہے۔ میں ہر ملاکات کے دن اُسے ملنے سویرے سویرے جیل کے پھاٹک پر پہنچ جاتی ہوں۔"

"لگتا ہے تجھے لالی سے بہت زیادہ پیار ہے۔"

"وہ بھی تو جی مجھے اتنا ہی پیار کرتا ہے۔" شاداں نے نظریں جھکا کر بتایا۔" مجھے دیکھتے ہی خوشی سے اس کا چہرہ کھل اٹھتا ہے۔ تجھ سے بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔"

"کب تک تیرا لالی چھوٹ جائے گا؟" رحیم داد نے دھڑکتے دل سے دریافت کیا۔ اس کے چہرے پر خوف اور پریشانی کے سائے پھیلنے لگے۔

"سال بھر سے کچھ اوپر رہتا ہے۔" شاداں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔" وہ بھی گزر ہی جائے گا جی۔ سزا میں کمی بھی ہو سکتی ہے۔ لالی یہی بتاتا ہے۔"

رحیم داد اس اطلاع سے زیادہ پریشان نہیں ہوا۔ لالی کے فوری طور پر رہا ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا مگر وہ لالی سے خائف ضرور تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ لالی اس کے ساتھ جیل میں اور جیل سے فرار ہونے کے بعد بھی اتنی زیادہ مدت تک رہا ہے کہ اس کی تیز نظریں اسے پہچان سکتی ہیں۔ لالی اس حیثیت سے اب اس کے لیے سنگین خطرہ بن گیا تھا۔ رحیم داد لالی کے بارے میں سوچنے لگا۔

"تو کس سوچ میں پڑ گیا؟" شاداں نے اسے ٹوکا۔

رحیم داد نے دریافت کیا۔" یہ بتا تو میرے پاس کیسے آئی؟ تو نے بھٹی چننے کی چکائی لے لی؟"

"اسی کے لیے تو تیرے پاس آئی ہوں۔"

"میرے پاس کیوں آئی ہے؟" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔" میں نوں تیری چکائی سے کیا لینا۔"

"تو خادم علی جویا کو تو جانتا ہی ہے۔ میں نوں اسی کے بارے میں تجھ سے گل کرنی ہے۔"

"کیا گل کرنی ہے؟"

"جویا میرے حصے کی پوری چگائی نہیں دیتا۔" شاداں نے شکوہ کیا۔ "وہ جس جوگی سے راضی باضی ہوتا ہے۔ اسے زیادہ پھٹی حصے میں دیتا ہے۔ کئیوں کو تو دو دو ڈھیریاں تک دے دیتا ہے۔"

"پر تجھ سے جویا کیوں ناراض ہے؟"

"گل ایہہ ہے جی!" وہ منہ بگاڑ کر بولی۔ "وہ رات کو اپنے ڈیرے پر جوگیوں کو بلاتا ہے، جو چلی جاتیں ہیں ان سے خوش رہتا ہے۔ جو نہیں جاتی انہیں پریشان کرتا ہے، طرح طرح سے تنگ کرتا ہے، ڈانٹتا ڈپٹتا ہے، چگائی بھی کم دیتا ہے۔"

"تو بھی کسی رات اس کے ڈیرے پر چلی جا۔" رحیم داد نے ہنس کر شاداں کو چھیڑا۔ "تب خادم علی جویا تجھ سے بھی خوش رہے گا۔ زیادہ ہی چگائی دے گا۔" اس نے شاداں کا ردِعمل معلوم کرنے کے لیے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ "ویسے خادم علی چاہے تو تجھے اٹھوا بھی سکتا ہے۔"

"مجھے اٹھوا لینا کوئی مخول ہے۔" شاداں نے تند و تیز لہجے میں گھور کر رحیم داد کو دیکھا۔ اسے رحیم داد کی بات سخت ناگوار گزری تھی۔ "تو کیسی گل کر رہا ہے۔" وہ تیوری پر بل ڈال کر بولی۔ "میں کوئی کنجری ہوں، چھنال ہوں۔ کیوں جاؤں اس کے ڈیرے پر۔" اس کی جھنجلاہٹ سوا ہو گئی۔ "مجھے اٹھوا کر ڈیرے پر بلوایا تو اس کی گردن مروڑ دوں گی۔" اس نے اپنا مضبوط اور ٹھوس ہاتھ رحیم داد کے سامنے کر دیا۔ "اس میں بہت زور ہے۔ میں ہوں تو زنانی پر بہت زور آور بھی ہوں۔ تو مجھے ٹھیک سے نہیں جانتا۔"

"اتنا ناراض کیوں ہوتی ہے؟" رحیم داد نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ لہجے میں سنجیدگی پیدا کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "یہ بتا تو یہاں بھی اکیلی رہتی ہے؟"

"میری ایک میری ادھر ویاہی ہے۔ اسی کے ساتھ رہتی ہوں۔" شاداں نے بتایا۔ "پر میں نوں اس سے کچھ نہیں لینا۔ میرے پاس دو مجھ ہیں، اصلی نیلی بار کی ہیں۔"

رحیم داد نے مداخلت کی۔ "ویسے تو میں گورداس پور کا مہاجر ہوں پر اب میری زمین داری نیلی بار ہی میں ہے۔ تیں نوں پتہ ہے ستلج کو پاک پتن میں نیلی کہتے ہیں اور اس لیے کہتے ہیں

کہ وہاں اس کا پانی نیلا نیلا دکھائی پڑتا ہے۔ پر دیپال پور میں اسے ستلج ہی کہا جاتا ہے۔ میرا پنڈ ہے تو تحصیل دیپال پور میں اور دیپال پور بیاس بار میں ہے۔ میرا پنڈ دیپال پور سے دور اور اس علاقے سے بالکل ملتا ہے جو پاک پتن تحصیل کہلاتا ہے۔ پاک پتن تحصیل نیلی بار ہی میں ہے۔"

"اچھا، تیرا پنڈ نیلی بار میں ہے۔" شاداں نے کسی قدر حیرت سے کہا مگر رحیم داد کی بات کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ اپنی بھینسوں کی تعریف توصیف کرتی رہی۔ "تیں نوں پتہ ہے، میری دونوں بھینسیں کتنا دودھ دیتی ہیں؟" اس نے فخر سے گردن اونچی کی۔ "من بھر تو روزانہ دودھی لے جاتا ہے، جو بچتا ہے اس کا مکھن نکال لیتی ہوں۔ چنگی آمدنی ہو جاتی ہے۔"

"لگتا ہے تو مکھن بہت کھاتی ہے۔" رحیم داد نے اسے ایک بار پھر چھیڑا۔ "جبھی تو ایسی سوہنی مٹیار دکھائی دیتی ہے۔"

"لے، میں مٹیار لگتی ہوں؟ تو کیسی گل بات کرتا ہے۔" اس نے رحیم داد کی چھیڑ چھاڑ پر ناراضگی کا اظہار نہ کیا۔ شرما کر بولی۔ "اب تو کچھ بھی نہیں رہی، جل کر راکھ ہو گئی۔ تُو نے مجھے پہلے نہیں دیکھا۔"

"اب بھی تو کیا کم ہے، تب ہی تو خادم علی جویا کا تجھ پر دل آ گیا۔"

"نہیں جی، وہ بندہ ہی بُرا ہے۔ تو اسے نہیں جانتا۔" شاداں نے ایک بار پھر جویا کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کیا۔

رحیم داد نے اس کی شکایت نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "تیرے پاس جب نیلی بار کی دو مجھیں ہیں اور ان کے دودھ سے آمدنی بھی اچھی ہو جاتی ہے۔ فیر تو بھٹی کی چنائی کیوں کرتی ہے؟" اس نے قدرے تامل کے بعد وضاحت کی۔ "میرا مطلب ہے تو چوگی کیسے بن گئی؟"

"کیا کیا جائے جی! اگے کے لیے بھی تو سوچنا چاہیے۔" شاداں نے بتایا۔ "لالی جیل سے نکلے گا تو کیا کرے گا اب اس نے چوری چکاری تو کرنی نہیں۔ کوئی نہ کوئی دھندا کرنا ہی پڑے گا۔ اس کے لیے روپے کی ضرورت ہو گی۔ روپے کے بنا تیں نوں پتہ ہے، کچھ نہیں ہو سکتا۔"

شاداں نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ خادم علی جویا کمرے میں داخل ہوا، شاداں کو دیکھ کر تیکھے لہجے میں بولا "تو اُدھر بیٹھی ہے۔ تیری چگائی کون لے گا؟"

"میں لوں گی اور کون لے گا" وہ خادم علی جویا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے باکی سے بولی "چنائی میں نے کی ہے اور سب سے زیادہ ہی کی ہے"

"تو روز ایسی ہی بڑھکیں مارتی ہے" جویا نے ڈپٹ کر تیکھے لہجے میں کہا "بکواس نہ کر۔ چل اپنی ونواڑ کی ڈھیریاں بنوا اور اپنی چگائی کی ڈھیری اٹھا کر لے جا۔ دیری کی تو کوئی چگائی شگائی نہیں ملے گی"

رحیم داد خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے مداخلت کی "خاما خا ناراض کیوں ہوتا ہے۔ تو نے ہی تو مجھے بتایا تھا یہ بہت محنتی اور ماہری جوگی ہے۔ سب سے زیادہ ونواڑ چنتی ہے۔ تو نے مجھے یہی کہا تھا نا؟" رحیم داد کا لہجہ تیکھا تھا۔

"محنتی تو جی یہ ہے۔ پر جھگڑا ٹنٹا بہت کرتی ہے" خادم علی جویا نے جھٹ پینترا بدلا، دبی زبان سے شکوہ کیا "چوہدری میں تجھے کیسے بتاؤں یہ کتنا جھگڑا کرتی ہے"

"لے، میں تجھ سے کیا جھگڑا کرتی ہوں۔ جتنی محنت کرتی ہوں، اتنی ہی چگائی مانگتی ہوں۔ تو ایرپھیر کرنے کی کوشش کرتا ہے"

خادم علی کے چہرے پر جھنجلاہٹ نمودار ہوئی۔ رحیم داد نے اس کی خفگی بھانپ لی! اس نے مسکرا کر نرمی سے کہا "جویا! اسے ٹھیک ٹھیک چگائی دے دے"

جویا فوراً نرم پڑ گیا، گردن جھکا کر ادب سے بولا "سئیں چوہدری! تو حکم کر، ایک چھوڑ میں اسے چگائی میں ونواڑ کی دو ڈھیریاں دے دوں گا"

"میں نوں تیری دو ڈھیریاں نہیں لینیں" شاداں نے تیکھی نظروں سے جویا کو دیکھا "محنت کی ہے، اس کی چگائی لوں گی۔ کھیرات نہیں لینی"

"چپ کر شاداں۔ خاما خاکی کڑ کڑ نہ کر" رحیم داد نے اُسے پیار سے ڈانٹا اور خادم علی جویا کو مخاطب کیا "خادم! اسے دو ہی ڈھیریاں دے دے۔ تیں نوں پتہ ہی ہے۔ یہ اپنے ضلع

کی ہے اور پریشان بھی ہے۔ برائی اس میں یہ ہے کہ بول کڑوا بولتی ہے۔"

"سئیں! تیرا حکم، سر اکھیں تے، سر متھے تے!" خادم علی جویا نے خوشامد کے انداز میں کہا "میں اسے دُہری ہی چگائی دوں گا۔"

"اگے بھی اس کا خیال رکھنا۔ اسے تنگ نہ کر۔" رحیم داد نے شاداں کی سفارش کی۔

"سئیں چوہدری! تو بالکل فکر نہ کر۔" جویا نے رحیم داد کو یقین دلانے کی کوشش کی۔

"جیسا تو نے کہا ہے، ویسا ہی ہو گا۔"

رحیم داد نے شاداں سے کہا "جا اپنی چگائی لے۔ خادم علی بہت نیک بندہ ہے۔ اگے تجھ سے نراض نہیں ہو گا۔"

شاداں خاموشی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر رحیم داد کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر شگفتگی تھی، آنکھوں میں کنول کھل رہے تھے۔ اس نے رحیم داد سے پوچھا "چوہدری! تیں نوں ادھر کب تک ٹھہرنا ہے؟"

رحیم داد کے بولنے سے پہلے ہی خادم علی جویا نے شاداں سے سوقیانہ مذاق کیا "تو نے رات کو ادھر آنا ہے؟"

شاداں ایک دم شعلے کی طرح بھڑک اٹھی "چپ کر۔ تُو نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ میں کنجری ہوں، پاپی ہوں، کیا ہوں بتا؟"

رحیم داد نے فوراً مداخلت کی، خادم علی سے کہا "خادم! تُو اس طرح اس سے چھیڑ چھاڑ نہ کیا کر۔ یہ بہت کڑوی زنانی ہے۔ خاما خا جھگڑا اٹھانا کر۔"

جویا جھینپ کر بولا "سئیں! یہ تو مخول بھی نہیں سمجھتی۔ تیکوں پتہ ہے، میں نے کسی بُرے ارادے سے گالہ نہیں کی تھی۔"

شاداں نے تیکھے لہجے میں کہا "میں تیری گل بات کا مطلب اچھی طرح جانتی ہوں۔"

"بے کار کی گلاں نہ کر۔" رحیم داد نے شاداں کو ایک بار پھر ڈانٹا "میں نے جویا کو سمجھا دیا ہے۔ اب وہ تجھے تنگ نہیں کرے گا۔ اب جا اور اپنی چگائی کی پھٹی لے۔ تیری میری گھر

ہیں انتظار کرتی ہوگی۔" وہ کھل کر مسکرایا۔" اتنا ناراض نہ ہوا کر۔"
شاداں خاموشی سے خادم علی جویا کے ہم راہ چلی گئی۔

☆

مرشد علی اور مراد خاں رات گئے واپس آئے تو رحیم داد سو چکا تھا۔ دونوں نے اس کی نیند خراب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ علاحدہ کمرے میں بیٹھے۔ آدھی رات تک باتیں کرتے رہے۔ قہقہے لگاتے رہے۔

رحیم داد قاسم بیلہ میں مراد خاں اور مرشد علی گردیزی کے ساتھ ٹھہرا رہا۔ شاداں اسے کئی بار نظر آئی۔ مڈبھیڑ بھی ہوئی مگر بات چیت کرنے کی نوبت نہ آئی۔ رحیم داد نے مراد خاں شاہانی سے شاداں کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا۔ خادم علی جویا نے شاہانی کے سامنے شاداں کی بات بھی چھیڑی مگر رحیم داد صاف نظر انداز کر گیا۔

قاسم بیلہ میں چار روز قیام کے بعد تینوں ملتان روانہ ہو گئے۔ شام کو پہنچے مگر ملتان پہنچتے ہی مراد خاں کو بھکر سے تار ملا۔ لکھا تھا۔ محمد سلمان خاں کار کے حادثے میں زخمی ہو گیا ہے۔ تار دیکھتے ہی مراد خاں سخت پریشان ہو گیا۔ وہ رات گئے تک سلمان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے بھکر ٹیلی فون کرتا رہا مگر لائن میں ایسی گڑبڑ تھی کہ بار بار کوشش کے باوجود بات نہ ہو سکی۔

مراد خاں شاہانی کو جب سے سلمان کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی تھی، اسے کسی پہلو قرار نہ تھا۔ ادھر مرشد علی گردیزی کی بہن کی شادی کی تیاریاں مکمل تھیں۔ رات کو صادق آباد سے برات آ رہی تھی اور دوسرے روز شام کو پہنچنے والی تھی۔ مرشد علی کا اصرار تھا کہ مراد خاں دو روز ٹھہر کر بھکر چلا جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ شادی کی تقریب میں مراد خاں شاہانی ضرور شریک ہو۔ شادی کا نہایت دھوم دھام سے اہتمام کیا گیا تھا اور اس میں شریک کرنے کے لیے مرشد علی شاہ خود بھکر جا کر مراد خاں شاہانی کو اپنے ہمراہ لایا تھا۔

رحیم داد نے تنہائی میں مراد خاں پر زور دیا "شاہانی! ویاہ کے لیے ٹھیر جاتا تو اچھا تھا۔ ایک روز کی تو بات ہی ہے۔ رات کو نکاح میں شریک ہو کر چلا جانا۔ مرشد علی خوش ہو جائے گا۔" مگر مراد خاں رضامند نہ ہوا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

"چوہدری! مجھے نہ روک۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔" اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ "نیکوں پتہ ہے، سلمان میرا اکلوتا پتر ہے۔"

رحیم داد نے چونک کر مراد خاں کو دیکھا۔ اسے مرشد علی کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ سلمان اس کا نہیں، اس کی بیوی کے پہلے شوہر کا بیٹا ہے۔ رحیم داد کو سلھڑی کا مندوں یاد آگیا۔ وہ مراد خاں کا سگا بیٹا تھا مگر اس کے مرنے پر نہ وہ پریشان ہوا، نہ آنسو بہائے، نہ کسی قسم کا سیاپا کیا۔ یہاں تک کہ آخری بار اس کا دیدار بھی نہ کیا۔ اس کے جنازے میں بھی شریک نہ ہوا۔ رحیم داد کے اصرار کے باوجود شریک نہ ہوا۔ اس نے ہموں والی میں ٹھیرنا تک گوارا نہ کیا۔

رحیم داد کو مراد خاں شاہانی کے اس رویہ پر سخت حیرت تھی مگر مراد خاں اس کی حیرت سے بالکل بے نیاز تھا۔ وہ اس قدر پریشانی اور گھبراہٹ میں مبتلا تھا کہ کھانا بھی نہ کھا سکا۔ رات بھر بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ بار بار اٹھتا اور بے قراری کے عالم میں ٹہلنے لگتا۔ رحیم داد کی آنکھ کئی بار کھلی۔ اس نے مراد خاں کو پریشانی کے عالم میں دیکھا مگر بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔ خاموش لیٹا رہا۔

صبح بہت تڑکے کہر کی گہری دھند کے باوجود مراد خاں شاہانی نے گیرج سے مرشد علی کی کار نکلوائی اور شیر شاہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ شیر شاہ کا فاصلہ دس میل سے بھی کم تھا اور وہاں سے بھکر جانے والی ٹرین گیارہ بجے جاتی تھی۔ مراد خاں نے ناشتہ بھی نہ کیا۔ وہ جلد سے جلد شیر شاہ پہنچ کر بھکر جانے والی ٹرین میں سوار ہو جانا چاہتا تھا۔

رحیم داد بھی کار میں مراد خاں کے ہمراہ تھا۔ وہ تمام راستے اسے تسلی دیتا رہا مگر شاہانی کی بے چینی کم نہ ہوئی۔ وہ بے قرار ہو کر رحیم داد سے بار بار کہتا "چوہدری! اگر میرے سلمان کو خدا نخواستہ کچھ ہو گیا تو میں یہ غم برداشت نہ کر سکوں گا۔ میرا تو دماغ کام نہیں کرتا۔"

لیکن رحیم داد کو علم تھا کہ اسے سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ اگر سلمان مر گیا تو تونسہ کوٹ کی جاگیر، جو اس کے قبضے میں تھی، خطرے میں پڑ جائے گی۔ سلمان کے حقیقی بھیا اور بچا زاد بھائی فوراً تنازعہ کھڑا کردیں گے۔ جائیداد اور جاگیر حاصل کرنے کے لیے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیں گے۔

کار ملتان اسٹیشن پہنچی تو رحیم داد اتر گیا۔ وہ بھکر نہیں گیا۔ مراد خاں شاہانی نے بھی اصرار نہ کیا۔ ساڑھے آٹھ بجے صبح لاہور جانے والی ریل گاڑی پہنچی۔ وہ اس میں سوار ہو کر چلا گیا۔ وہ کوٹلہ ہرکشن واپس جا رہا تھا۔

سردار مراد خاں شاہانی تنہا رہ گیا۔ وہ سخت بے چینی کے عالم میں پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ اس کے چہرے پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ بہت پریشان اور دل گرفتہ نظر آرہا تھا۔

اکم

ہوا سرد تھی، ہر طرف کہر کا نیلگوں دھند لکا چھایا تھا۔ کوٹلہ ہرکشن پر سرِ شام ہی سناٹا طاری ہو گیا تھا۔
رحیم داد گھنٹہ، سوا گھنٹہ پہلے واپس پہنچا تھا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ لباس تبدیل کیا اور اب اپنے کمرے میں سفر کی تکان دور کرنے کی غرض سے بستر پر ٹانگیں پسارے خاموش لیٹا تھا۔ حویلی پر خاموشی چھائی تھی۔ نادر خاں اور جمیلہ سے اس کی اب تک ملاقات نہ ہو سکی تھی۔

حویلی کا صحن بہت کشادہ تھا۔ اس کے آخری سرے پر درختوں کا جھنڈ تھا۔ درختوں کے آس پاس نوکر چاکروں کی کوٹھریاں تھیں۔ باورچی خانہ کوٹھریوں کے عین مقابل تھا۔ اس کی چھت چار ستونوں پر قائم تھی۔ کوئی دروازہ یا کھڑکی نہ تھی۔ ہر طرف سے بالکل کھلا ہوا تھا۔ باورچی خانے میں تنور روشن تھا۔

تنور کے اندر سے نکلتی ہوئی آنچ کے ابھرتے لپکتے شعلے کہر کی دھند میں دور سے سرخ دھبوں کی مانند نظر آ رہے تھے۔ یہ روشن دھبے کبھی نمایاں ہو جاتے، کبھی اندھیرے میں گھل مل کر غائب ہو جاتے۔ باورچی خانے سے ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور رک رک کر ابھر رہا تھا اور ہر طرف پھیلے ہوئے سکوت میں ارتعاش اور ہلچل پیدا کر رہا تھا۔

ایک نوکر اندھیرے سے نکل کر کمرے میں داخل ہوا۔ رحیم داد نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ نادر تھا۔ رحیم داد کے لیے کھانا لے کر آیا تھا۔ اس نے میز پر کھانا لگا دیا۔ رحیم داد بھوکا بھی تھا۔ وہ بستر سے نیچے اترا اور میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

نامدار ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے اسے مخاطب کیا۔ "نامدار! یہ تو بتا، زیلدارنی اوپر اپنے کمرے ہی میں ہے ناں؟"

"نہیں جی، زیلدارنی تو پھاتاں کے گھر گئی ہے۔" نامدار نے بتایا۔

"پھاتاں کے گھر گئی ہے؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "پھاتاں بیمار ہے کیا؟"

"بیمار شیمار تو نہیں جی۔" نامدار نے جواب دیا۔ "وہ ایسا ہے جی، پرسوں تاجاں کے سسرال سے بچولیا آیا تھا۔ سگائی کی انگوٹھی اور دوسرا سامان لوٹا گیا۔ بہت برا ہوا۔"

رحیم داد کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔ "پر تاجاں کی سگائی ہوئی کب؟"

"پچھلے ہی دنوں تو یہیں حویلی میں اس کی سگائی ہوئی تھی۔ ان دنوں تو ادھر نہیں تھا۔" نامدار نے کہا۔ "بہت رونق لگی تھی۔ ڈھول بجی تھی۔ گانا ہوا۔ زیلدارنی نے اپنے ہاتھ سے تاجاں کو انگوٹھی پہنائی تھی۔ پر اب تو سگائی ٹوٹ ہی گئی۔"

"کیوں توڑ دی انہوں نے کڑمائی، میرا مطلب ہے سگائی؟" وہ مسکرایا۔ "ویسے بات ایک ہی ہے۔ کڑمائی کہو یا سگائی۔ پر ایک بار سگائی ہونے کے بعد ٹوٹ کیسے گئی؟ یہ تو اچھا نہیں ہوا۔ کوئی نہ کوئی تو اس کی وجہ ہوگی۔ ایسے ہی تو نہیں ٹوٹی ہوگی۔"

"کسی نے جی بھانجی مار دی۔" نامدار نے کہا۔ "میں تو کہتا ہوں جی، یہ شیبرا کا کام ہے۔ اس کے سوا اور کوئی ایسا کر ہی نہیں سکتا۔"

"یہ شیبرا کون ہے، اور اس نے کیوں بھانجی ماری؟" رحیم داد نے کرید کر دریافت کیا۔

"وہ تاجاں سے ویاہ کرنا چاہتا ہے۔" نامدار کا لہجہ تیکھا اور قدرے تلخ تھا۔ "کرتا دھرتا کچھ نہیں، بھومان شاہ کے زمیں دار محمد حنیف وٹو کے لئے مویشی اور چوکر چوری کرتا ہے۔ محمد حنیف وٹو بہت وڈا رسہ گیر ہے جی۔" اس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "چوہدری! تو ہی سوچ پھاتاں کیسے اپنی دھی شیبرے کو ویاہ دیتی۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ شیبرے کے ساتھ اس کے گھر والے بھی نراض ہو گئے۔ بس اسی کا بدلہ لینے کے لئے ایسا چکر چلایا گیا کہ سگائی ٹوٹ گئی۔"

"پر تاجاں کے سسرال والوں نے شیبرے کی بات کیسے مان لی۔ انہوں نے کیوں سگائی

توڑ دی؟" رحیم داد نے روٹی کا لقمہ توڑتے ہوئے استفسار کیا۔ "تاجاں کا ساہا تو میرے سامنے ہی ہوا تھا۔ تب تو سسرال والے بہت خوش تھے۔ انہوں نے سگائی پر بھی خوشی منائی ہوگی؟"

"ہاں جی، بہت خوش تھے۔" نامدار بولا۔

"یہ بتا، نامدار، کیا شبیر اکسی طرح تاجاں کے سسرال والوں کا شریکا لگتا ہے؟"

"نہیں جی، ایسی کوئی گل بات نہیں۔" نامدار نے کہا۔ "اس نے کسی مُلّا سیانے کے ذریعے تاجاں کے سسرال والوں کو بہکا دیا۔ وہ اس کے بہکانے میں آ بھی گئے۔ کہتے ہیں جنج اس حویلی میں نہیں اُترے گی۔ نہ یہاں ویاہ ہوگا۔ نہ زمیں دارنی ویاہ میں بیٹھے گی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ زمیں دارنی سے انہیں کیا بیر ہے۔" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ "اس نے ان کا کیا بگاڑا ہے؟"

"گل ایہہ ہے جی، وہ کہتے ہیں زمیں دارنی رنڈ بیوہ ہے۔ اس کے بیٹھنے میں ویاہ میں بدشگونی اور نحوست ہوگی۔" نامدار نے ناگواری سے منہ بگاڑا۔ "زمیں دارنی نے پر تو اس نے تاجاں کے سسرال والوں کی بات مان لی پر تاجاں کی ماں پٹھاناں نہ مانی۔ وہ اڑ گئی۔ صاف صاف کہہ دیا کہ ویاہ ہوگا تو حویلی ہی سے ہوگا اور بھین جی اس میں ضرور بیٹھے گی۔ اس کے بناں تو ویاہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"گل تو اس نے ٹھیک ہی کہی۔ پٹھاناں ہے حوصلے والی۔"

"سنا ہے جی، وہ تو ان سے لڑ پڑی۔ بولی، رنڈ بیوہ تو میں بھی ہوں۔ میرا گھر والا تو مدت ہوئی گزر گیا۔ فیر میں کیسے ویاہ میں بیٹھ سکتی ہوں۔ میرے گھر تاجاں کی جنج کیسے چڑھ سکتی ہے؟" نامدار تفصیل سے ایک ایک بات بتا تا رہا۔ "کہتی تو جی وہ بالکل ٹھیک ہی ہے۔ اگر حویلی سے تاجاں کا ویاہ نہیں ہو سکتا تو پٹھاناں کے گھر سے کیسے ہو سکتا ہے۔ گل تو ایک ہی سی ہوئی ناں؟"

"جب سگائی ٹوٹ ہی گئی تو اب زمیں دارنی پٹھاناں کے گھر کیوں گئی ہے؟" رحیم داد نے

حیرت کا اظہار کیا۔

"زیبں دارنی سگائی توڑنا نہیں چاہتی۔" نامدار نے رحیم داد کو مطلع کیا۔" اس نے تاجاں کی ہونے والی سسرال کے وڈّوں کو پھاتاں کے گھر بلوایا ہے۔ تاجاں کا سسر اس کا ماما بھی تو ہوتا ہے۔ پھاتاں کا سگا بھرا ہے۔ لگتا ہے آج زمیں دارنی انہیں سے گل بات کرنے گئی ہے۔"

"کب تک واپس آئے گی؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"پتہ نہیں جی۔ دیر سے ہی سے لوٹے گی۔ لمبی گل ہو گی۔ ایک بار سگائی ٹوٹ جائے تو مشکل سے رشتہ جڑتا ہے۔ میں نے تو یہی دیکھا ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ نامدار نے بھی بات آگے بڑھانے کی کوشش نہ کی۔ رحیم داد کھانے سے فارغ ہوا تو نامدار نے جھوٹے برتن اٹھائے۔ دروازے کی جانب بڑھا۔ رحیم داد نے ٹوکا۔

"حمدا کہاں ہے نامدار؟ وہ تو مجھے نظر ہی نہیں آیا۔"

"اس کا کیا ہے جی۔ کسی چکر میں گیا ہو گا۔ شام ہوتے ہی غائب ہو جاتا ہے۔ شندو کے گھر کے آس پاس منڈلاتا ہو گا۔" نامدار نے مسکرا کر کہا۔" اور آج تو اس کی گھر والی تاراں بھی زمیں دارنی کے ساتھ گئی ہے پر حمدا اس کی کب پرواہ کرتا ہے۔" اس نے رحیم داد کو غور سے دیکھا۔" ویسے تجھ سے کیا چھپانا۔ تاراں بھی کم نہیں۔ حمدا نہیں ہوتا تو وہ بھی اصطبل کے راکھے کے پاس چلی جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو ساری رات اسی کے ساتھ رہتی ہے۔"

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کر کے بولا۔" اور ہاں تو نے یہ تو بتایا ہی نہیں، نادر خاں کدھر ہے؟ وہ بھی نظر نہیں آیا۔"

"وہ تو جی دوپہر کو تانگے میں بیٹھ کر کہیں گیا ہے۔"

"کچھ پتہ ہے۔ کہاں گیا ہے؟" رحیم داد نے نادر خاں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔

"یہ تو جی۔ میں نوں پتہ نہیں۔ میں نے تو اسے صرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ زمین دارنی ہی نے کسی کام سے بھیجا ہو گا۔" نامدار نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

رحیم داد نے مزید بات چیت نہ کی۔ نامدار باہر چلا گیا۔

☆

رات سنسان ہوتی گئی۔ دھند اور گاڑھی اور بوجھل ہوتی گئی۔ رحیم داد خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ نادر خاں اس طرح اچانک کہاں چلا گیا۔ اسے احسان شاہ کا خیال آیا۔ اگرچہ انتہا یہ بھی یاد آیا کہ نادر نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ احسان شاہ کے پاس نہیں جائے گا بلکہ اس نے رحیم داد کو بھی مشورہ دیا تھا کہ احسان شاہ سے ملنے جلنے میں احتیاط سے کام لے۔ پھر وہ کہاں گیا۔ کس کے پاس گیا۔ کس لیے گیا؟ رحیم داد تنہا بیٹھا نادر کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتا رہا۔ اسے جمیلہ کی واپسی کا بھی بے چینی سے انتظار تھا۔ وہ جلد سے جلد اس کا ردِ عمل معلوم کرنا چاہتا تھا۔

پھر رات گزر گئی۔ جمیلہ ہنوز لوٹی نہ تھی۔ رحیم داد کو نیند بھی نہیں آرہی تھی۔ کچھ عرصے سے رات گئے تک جاگنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے قرار تھا کہ اس کی غیر حاضری میں کیا کیا ہوتا رہا؟ کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں؟ اسے الجھن ہو رہی تھی۔ آخر اکتا کر وہ کھڑا ہو گیا۔

اس نے اونی دھسا اوڑھا۔ سر اور کانوں کو اچھی طرح دھسے سے ڈھک کر وہ کمرے سے باہر نکلا۔ سردی چمک گئی تھی۔ حویلی خاموشی میں ڈوبی اونگھ رہی تھی۔ سارے ہی نوکر چاکر اپنی اپنی کوٹھریوں میں چلے گئے تھے۔ حویلی کے پھاٹک پر پہریدار کے رک رک کر کھانسنے اور کھنکارنے کی آواز رات کے سناٹے میں ابھر رہی تھی۔

رحیم داد آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس دروازے کی جانب بڑھا جو مہمان خانے میں کھلتا تھا اس نے دروازے کو دھیرے سے کھولا اور مہمان خانے کے صحن میں پہنچ گیا۔ خیال تھا کہ احمد اب تک واپس آگیا ہوگا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ مہمان خانہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ مہمان خانے کے باہر کہیں قریب ہی گیدڑ بول رہے تھے۔

اس نے مہمان خانے کو خالی پایا تو رک گیا۔ چند لمحے خاموش کھڑا رہا، سوچتا رہا۔ مہمان خانے

سے ملحق دو بڑی بڑی اور کشادہ کوٹھریاں تھیں۔ ان میں کبھی مہمان خانے کے نوکر چاکر رہتے تھے۔ مگر بعد میں انہیں کاٹ کباڑ رکھنے کے لیے استعمال کیا جانے لگا تھا۔ نادر خاں نے اپنی رہائش کے لیے انہیں خالی کرایا۔ کوٹھریوں میں کھڑکیاں نکال کر انہیں کمروں میں تبدیل کر دیا تھا۔ کمروں کے آگے برآمدہ تھا۔ سامنے کھلا صحن تھا۔ صحن کے تین طرف قدِ آدم چار دیواری تھی۔ اس گھر میں نادر خاں بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ رحیم داد اس طرف بڑھنے لگا۔

مہمان خانے کا ایک بیرونی دروازہ نادر خاں کے گھر کے عین سامنے کھلتا تھا۔ اسے نادر خاں نے اپنی سہولت کے لیے کچھ ہی عرصہ قبل لگوایا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور مہمان خانے سے باہر چلا گیا۔ قریب ہی نادر خاں کے گھر کا ایک دروازہ تھا لیکن عام آمدورفت کا دروازہ صحن میں تھا۔ رحیم داد اس طرف نہ گیا۔ کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ کچھ دیر چپ چاپ کھڑا رہا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔

دروازہ دھیرے سے کھلا۔ رحیم داد نے دیکھا لالٹین کی مدھم روشنی میں نادر خاں کی بیوی جنّت سامنے کھڑی تھی۔ کچی نیند سے بیدار ہوئی تھی۔ سردی سے کپکپا بھی رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے آنکھیں ملیں۔ غور سے رحیم داد کو دیکھا۔

جنّت نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا "چوہدری! تو اتنی رات کو کیسے آیا؟ تو واپس کب پہنچا؟" اس کے چہرے پر گھبراہٹ بکھر گئی۔

"تو گھبرا کیوں گئی؟" رحیم داد نے مسکرا کر اسے اطمینان دلایا "میں آج ہی شام واپس آیا ہوں۔"

"باہر اتنی سردی میں کیوں کھڑا ہے؟" اس نے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیے۔ "اندر آجا۔"

رحیم داد چپ چاپ اندر چلا گیا۔ جنّت نے دروازہ بند کیا مگر کنڈی نہ لگائی۔ جھٹ ایک مونڈھا اٹھا کر لائی اور رحیم داد کے سامنے رکھتے ہوئے بولی "بیٹھ جا چوہدری۔" وہ سردی سے بدستور کپکپا رہی تھی۔ "آج سردی کچھ زیادہ ہی ہے۔"

"ہاں، سردی آج زیادہ ہی ہے۔" رحیم داد نے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
جنت نے لالٹین کی مدھم لو اونچی کی۔ کمرہ روشن ہو گیا وہ نقرئی ہوتی آواز میں بولی "آج سردی زیادہ تھی اس لیے میں تو چراغ جلنے کے بعد گھر سے باہر ہی نہیں گئی۔" اس نے اپنا سر دوپٹے سے ڈھک لیا۔

"کوئی دوہر یا کمبل اوڑھ لے۔" رحیم داد نے کہا "سردی سے تیرے ہونٹ نیلے پڑتے جا رہے ہیں۔"

جنت نے کھونٹی پر لٹکی ہوئی موٹی کھیس اتاری۔ اسے اوڑھا اور رحیم داد کے سامنے پلنگ پر پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔ وہ گٹھے ہوئے بدن کی گوری چٹی عورت تھی۔ چہرہ گول اور بھرا بھرا تھا۔ ناک میں بڑا سا فیروزہ تھا۔ آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ کئی بچوں کی ماں تھی۔ تین تو نادر خاں ہی سے تھے۔ ایک شوہر چھوڑ چکی تھی۔ مگر اس کی کاٹھی بہت اچھی تھی۔ نہ اس کا جسم بے ڈھنگے پن سے پھیل کر بگڑا تھا۔ نہ چہرے کے نقش و نگار دھندلے پڑے تھے وہ نادر خاں کے مقابلے میں زیادہ جوان اور تندرست نظر آتی تھی ویسے بھی وہ نادر خاں سے پندرہ سولہ برس کم عمر تھی۔

وہ پھول دار قمیص پہنے ہوئے تھی۔ شلوار سفید لٹھے کی تھی۔ دوپٹہ ہلکے نیلے رنگ کا تھا۔ اس کے لباس پر شکنیں اور سلوٹیں پڑی تھیں مگر میلا نہیں تھا۔ وہ نظریں جھکائے رحیم داد کے روبرو خاموش بیٹھی تھی۔

"نادر کہاں ہے؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"وہ تو جی دیپال پور گیا ہے۔" جنت نے بتایا۔ "زمیں دارنی نے کسی ضروری کام سے بھیجا ہے۔"

"نادر، دیپال پور گیا ہے!" رحیم داد حیرت سے چونک کر بولا۔ "تمہیں نوں پتہ ہے کس کام سے گیا ہے؟"

"یہ تو جی اس نے مجھے بتایا نہیں۔ بس چلتے چلتے اتنا کہہ گیا تھا کہ کل شام لوٹے گا۔ دیری بھی ہو سکتی ہے۔" جنت نے کہا "میں نے تو پوچھا بھی۔ تب بھی اس نے آگے کچھ نہ بتایا۔"

"کام کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"میں نے بتایا ناں کہ اس نے زیادہ گل بات ہی نہیں کی۔ جلدی میں لگتا تھا۔ میرے بار بار پوچھنے پر صرف اتنا کہا کہ زمیں دار نی کے ایک ضروری کام سے دیپال پور جا رہا ہوں۔"

"جمیلہ کا کیا حال چال ہے؟" رحیم داد نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔" جنت مسکرا کر بولی "تو اس سے نہیں ملا؟"

"نہیں!" رحیم داد نے جنت کو آگاہ کیا "وہ پٹھاناں کے گھر گئی ہے۔ ابھی تک لوٹی نہیں۔ نامدار بتاتا تھا دیر سے لوٹے گی۔"

"سمجھ گئی۔" جنت نے آہستہ آہستہ سر ہلایا۔ "وہ پٹھاناں کے گھر تاجاں کے سسرال والوں سے بات چیت کرنے گئی ہے۔ وہ ایسا ہے جی۔ تاجاں کے رشتے میں کچھ گڑبڑ پیدا ہو گئی ہے؟"

"میں نے تو سنا ہے" پچھلے دنوں تاجاں کی سگائی ہوئی تھی۔ وہ ٹوٹ گئی۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟"

"ہاں ایسا ہی ہوا ہے۔"

"جمیلہ سے میرے بارے میں بھی تیری بات چیت ہوئی؟" رحیم داد نے جنت کو ٹٹولا۔

"کئی بار ہوئی۔ اور دیر تک ہوتی رہی۔" وہ مسکرا کر بولی "نادر نے تجھے بتایا ہی ہو گا۔"

"کچھ بتایا تو تھا، پر نادر سے ملے ہوئے بہت دن ہو گئے۔" رحیم داد نے کھل کر بات کی۔ "یہ بتا۔ اب وہ میرے بارے میں کیا کہتی ہے۔ ناراض تو نہیں ہے؟"

"پہلے تو تجھ سے سخت نراض تھی۔" جنت کھل کر مسکرائی۔ "پر میں نے اس کی ساری نراضگی ختم کرا دی۔ اب اس کے دل میں تیری طرف سے بالکل میل نہیں۔ اس کی باتوں سے تو ایسا ہی لگتا ہے۔"

"تجھے یہ تو پتہ ہی ہوگا، وہ پنڈ چھوڑ کر لاہور جانا چاہتی تھی۔" رحیم داد نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ "اب اس کا کیا ارادہ ہے۔ اس بارے میں بھی تیری اس سے بات ہوئی؟"

"اس بارے میں پہلے بہت بات کرتی تھی۔ پر اب بالکل نہیں کرتی۔" جنت نے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ وہ شوخی سے مسکرائی۔ اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "چوہدری! برا نہ منانا۔ تو اسے سمجھ نہ سکا۔ زیب دارنی جتنی سوہنی ہے، اتنا ہی سوہنا اس کا دل بھی ہے۔ وہ کسی سے بھی زیادہ دنوں تک نراض نہیں رہ سکتی۔ اسے منانا تو بہت آسان ہے۔" اس نے پہلو بدلا۔ "ویسے بھی جی وہ کسی کو پریشان نہیں دیکھ سکتی۔ بلکہ خود پریشان ہو جاتی ہے۔" اس نے آنکھوں کو گردش دے کر ہونٹوں پر تبسّم پیدا کیا۔ "تیرے بارے میں اس نے مجھے ساری ہی باتیں بتا دیں۔"

"میرے بارے میں کوئی خاص گل بات ہوئی؟" رحیم داد نے بے قرار ہو کر دریافت کیا۔ "میرا مطلب ہے۔"

"میں تیرا مطلب سمجھ گئی۔" جنت اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "نادر مجھے بتا چکا ہے کہ تو کیا چاہتا ہے۔" جنت سنجیدہ ہو گئی۔ "پر تو جو کچھ چاہتا ہے، ابھی اس سلسلے میں زیب دارنی سے بات کرنی ٹھیک نہیں۔ آج کل تو وہ تاجاں کے ویاہ میں بری طرح الجھی ہوئی ہے۔ اسے کسی اور طرف دھیان دینے کا ہوش ہی نہیں۔ ہر گھڑی اسی کے بارے میں باتیں کرتی رہتی ہے۔" اس کا لہجہ نرم اور شگفتہ ہو گیا۔ "چوہدری! ایسی لگن اور چاہ سے ویاہ کی تیاریاں کر رہی ہے جیسے تاجاں اس کی اپنی دھی ہو۔" اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ "وہ بہت دھوم دھڑکے سے ویاہ کرنا چاہتی ہے پر اب تو تاجاں کی سگائی ٹوٹ

گئی۔ بہت بُرا ہوا۔ زمیں دارنی کو اس کا بہت دکھ ہے۔ جب سے یہ ہوا ہے بہت گھبرائی ہوئی اور پریشان رہتی ہے۔"

رحیم داد نے بات کا رخ بدلتے ہوئے دریافت کیا۔" جنّت! تیری تینوں چھوریاں کدھر ہیں؟"

" برابر کے کمرے میں سو رہی ہیں۔" اس نے مڑ کر اس طرف دیکھا۔" میں بھی وہیں سوتی ہوں۔"

رحیم داد نے جنت کے جسم کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ اس نے کسمسا کر پہلو بدلا اور ایک ٹانگ پر دوسری رکھ کر ذرا ترچھی ہو کر بیٹھ گئی۔

رحیم داد کو اس کا یہ انداز اچھا لگا۔ مسکرا کر بولا۔" جنّت تو لاچا کیوں نہیں باندھتی؟"

" نہیں جی میرے میکے میں زنانیاں دھوتی اور لاچا نہیں باندھتیں۔" اس نے گردن اونچی کرتے ہوئے ٹھسّے سے کہا۔" میرا پیو زمیں دار ہے اس کی ۳۰ کلّا سے اوپر زمین ہے۔ ویسے بھی جی ہم آبادکار ہیں۔ اِدھر کے جانگلی شانگلی نہیں ہیں۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے ٹھٹکی۔ زیرِلب مسکرائی۔" پر چوہدری تیرے دھیان میں یہ بات کیسے آئی کہ مجھے لاچا باندھنا چاہیے۔ شلوار مجھے بری لگتی ہے۔"

رحیم داد نے ہیجان انگیز نظروں سے جنت کو دیکھا۔ وہ احسان شاہ اور سردار مراد خاں شاہانی کی صحبت میں خاصا اوباش اور بدنظر ہوگیا تھا۔ جنّت اس وقت اسے اچھی لگی۔ لالٹین کی زرد زرد روشنی میں اس کا گورا چٹّا چہرہ دمک رہا تھا۔ جنّت اس کی چبھتی ہوئی نظروں کی تاب نہ لا سکی۔ اس نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔ اس کے رخساروں پر ہلکی ہلکی سُرخی پھیل گئی۔

" جنّت! تو لاچا باندھے تو زیادہ سوہنی لگے گی۔" رحیم داد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

" کہاں سوہنی ہوں جی۔" وہ بڑے ناز سے بولی۔" سوہنی تو سچ پوچھ اپنی زمیں دارنی ہے۔ اسے تو جو بھی دیکھتا ہے، دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ اس کا رنگ روپ ہی

ایسا ہے۔"

جمیلہ کا ذکر سن کر رحیم داد کے سارے اُبلتے اور مچلتے ہوئے ولولے جھاگ کی مانند بیٹھ گئے۔ وہ کچھ نہ بولا۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جنّت نے ٹوکا "کہاں چلا چوہدری؟"

"نیند لگ رہی ہے۔ جاکر سوؤں گا۔"

"چلا جانا۔ ایک گلاس گرم دودھ تو پی لے۔" وہ مسکرا کر بولی۔ اس کے انداز میں لگاوٹ تھی۔ "تو پہلی بار میرے گھر آیا ہے۔ میں تجھے ایسے ہرگز نہیں جانے دوں گی۔ میں ابھی دودھ لائی۔ گرم ہی ہوگا۔ میں رات کو بھڑولی پر دودھ رکھ دیتی ہوں صبح تک گرم رہتا ہے۔"

رحیم داد بیٹھ گیا۔ جنّت کمرے سے نکل کر صحن میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ہاتھوں میں بھڑولی اُٹھائے ہوئے آئی۔ یہ پیالے کی شکل کی کھلے منہ اور چوڑے پیندے کی انگیٹھی تھی۔ اس کے بالائی کناروں میں چاروں طرف چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ اسے چکنی مٹی میں توڑی شامل کر کے اس طرح بنایا گیا تھا کہ پہلے مٹی کو اچھی طرح گوندھا گیا۔ پھر اسے ہاتھوں کی مدد سے تیار کر کے دھوپ میں سکھایا گیا تھا۔ اس میں اوپلے سلگا کر رکھ دیئے گئے جن کی ہلکی ہلکی آنچ رات بھر دہکتی رہتی ہے۔

بھڑولی کے اوپر پیتل کی گڑوی میں دودھ بھرا تھا۔ جنّت نے بھڑولی کمرے میں لا کر رکھ دی۔ وہ دوبارہ باہر گئی اور کانسی کا لمبا گلاس لے کر آئی۔ گلاس میں اس نے گڑوی سے گرم گرم دودھ انڈیلا۔ شکر ملائی اور گلاس رحیم داد کی طرف بڑھا کر بولی۔

"چوہدری! لے اسے پی لے۔ زیادہ گرم نہیں ہے۔"

رحیم داد نے گلاس ہاتھ میں لیا۔ ہونٹوں سے لگایا اور گھونٹ گھونٹ گرم دودھ پینے لگا۔ جنّت نے بھڑولی اپنے سامنے رکھ لی اور اس میں سلگتے ہوئے اپلوں کی آنچ پر دونوں ہاتھ پھیلا کر سینکنے لگی۔ رحیم داد نے دودھ پی کر گلاس جنّت کو دے دیا۔ اس

نے گلاس ایک طرف رکھ دیا۔ اور بھڑولی پر جھک کر ایک بار پھر دونوں ہاتھ سینکنے لگی۔

رحیم داد نے دیکھا۔ بھڑولی کی سُرخ سُرخ آنچ سے جنت کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس پر جوبن آگئی تھی۔ رحیم داد اسے غور سے دیکھتا رہا۔ وہ مسکرایا۔ اس نے جنّت کو ٹٹولنے کے لیے چھیڑا۔ "جنّت! صرف دودھ ہی پلائے گی؟"

"اور تجھے کیا چاہیئے؟" وہ بدستور بھڑولی پر جھکی ہوئی بیٹھی رہی۔

"یہ تو تجھے بھی پتہ ہے۔" رحیم داد دھیرے دھیرے کھلنے لگا۔

"مجھے کیا پتہ جی۔" اس نے رحیم داد کی جانب پھر بھی نہ دیکھا۔

"تو سوہنی تو ہے پر اتنی بھولی نہیں کہ تجھے کچھ پتہ نہیں۔" وہ ہولے ہولے ہنسنے لگا۔

جنت نے زبان سے تو کچھ نہ کہا۔ نظریں اٹھا کر دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ وہ مسکرائی اور پھر گردن جھکالی۔ اس کے رخسار بھڑولی کی آنچ سے لال بھبھوکا ہو رہے تھے۔ لبوں پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں چراغ جھلملا رہے تھے۔ رحیم داد ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔

جنّت نے گردن اونچی کی۔ رحیم داد کی جانب دیکھا۔ آہستہ سے بولی "چوھدری! تجھے سردی نہیں لگ رہی؟"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ اُٹھ کر جنت کے پاس جانے کے لیے کسمسایا۔ اسی وقت دروازہ چرچرایا۔ رحیم داد نے پلٹ کر دیکھا۔ جمیلہ دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ اندر آگئی۔ اس کے پیچھے تاراں بھی تھی۔

"چوہدری! تو ادھر بیٹھا ہے۔" جمیلہ نے کہا۔ "میں تیرا کھوج لگاتی پھر رہی ہوں۔" وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔ "مجھے تو پٹھاناں کے گھر سے واپسی پر پتہ چلا کہ تُو آگیا ہے۔ کب آیا تو؟"

"میں تو شام ہونے سے پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ کمرے میں بیٹھا تیرا انتظار کرتا رہا۔

جب تو دیر تک نہ آئی تو نادر سے ملنے اِدھر آگیا۔ یہاں جنّت سے پتہ چلا، وہ دیپال پور گیا ہے۔" رحیم داد بولتے بولتے ٹھٹکا۔" زیبں دارنی! تو اس طرح کھڑی کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔"

" اِدھر آ جا زیبں دارنی۔" جنّت نے بھی رحیم داد کی تائید کی۔ اور کھڑے ہو کر پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔" یہیں بیٹھ جا۔" اس نے اٹھ کر جھٹ پٹ جھپاک بستر کی شکنیں درست کرنا شروع کر دیں۔

جمیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔" جنّت! میں نے یہاں بیٹھنا نہیں ہے۔" اس نے رحیم داد کی جانب مڑ کر دیکھا۔" چوہدریا! میرے ساتھ چل۔ تجھ سے کچھ ضروری گل بات کرنی ہے۔ میں تو تیرا کئی روز سے سخت انتظار کر رہی تھی۔"

رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جمیلہ دروازے کی جانب بڑھی۔ رحیم داد بھی اس کے ساتھ ساتھ بڑھا۔ تاراں دونوں کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ تینوں باہر نکلے اور مہمان خانے میں داخل ہو گئے۔ تاراں نے مہمان خانے کا دروازہ بند کر دیا۔

☆

رحیم داد اپنے کمرے میں گیا۔ جمیلہ بھی اس کے ہمراہ تھی۔ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ جمیلہ سنہری کنارے کی سفید شال اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کا لباس بھی سفید ہی تھا۔ اس سادگی میں بھی اس کا دلکش چہرہ کندن کی مانند دمک رہا تھا۔ رخساروں پر گلاب کھل رہے تھے۔ غزالی آنکھوں میں ستارے جگمگا رہے تھے۔

دونوں کے پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد نامدار نے انگیٹھی لا کر کمرے میں رکھ دی۔ انگیٹھی میں انگارے دہک رہے تھے۔ انگیٹھی رحیم داد اور جمیلہ کے درمیان رکھی تھی۔ دونوں جھک کر ہاتھ تاپنے لگے۔ انگاروں کی آنچ سے جمیلہ کا گلابی چہرہ اور سرخ ہو گیا، خوبصورت اور تابندہ ہو گیا۔

رحیم داد انگیٹھی پر ہاتھ پھیلا کر جسم میں حرارت اور گرمی پہنچاتا رہا۔ وہ گُم صُم

بیٹھا تھا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے اور خدشے منڈلا رہے تھے۔ ہرچند کہ وہ جنّت کی زبانی سن چکا تھا کہ جمیلہ اب اس سے خفا نہیں تھی مگر اس کے دل میں چونکہ چور تھا۔ لہذا سہما ہوا تھا۔ بار بار یہ خیال اسے پریشان کرتا کہ جمیلہ اتنی رات گئے کون سی اہم بات کرنا چاہتی ہے جس کے لیے اس نے نہ صرف پھاتاں کے گھر سے لوٹتے ہی اس کی تلاش شروع کر دی تھی بلکہ کئی روز سے اس کا بے چینی سے انتظار بھی کر رہی تھی۔

اس نے نظریں اٹھا کر جمیلہ کے دل آویز اور دہکتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ لمحہ بھر تک بے قراری سے دیکھتا رہا، پھر اس نے ہولے سے گہری سانس بھری اور نظریں جھکا لیں۔

جمیلہ نے رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر خاموشی کو توڑا " چوہدری! تُو اتنے دن کہاں رہا؟" وہ زیرِ لب مسکرائی " خریف کی واڈھی پر تیرا بہت انتظار رہا۔ تجھے واڈھی پر تو یہاں ہونا ہی چاہیئے تھا۔"

" خریف کی واڈھی ہوگئی۔ بہت اچھا ہوا۔"

" واڈھی تو کرانا ہی تھی۔ جب تو نہیں آیا تو شروع کرانی پڑی۔ بلکہ دیر سے شروع ہوئی۔ ایسا تیرا لمبا انتظار کرنے کے کارن کرنا پڑا۔" جمیلہ نے اسے بتایا " میں پوچھتی ہوں تو واڈھی پر پہنچا کیوں نہیں؟"

" میں ہوتا بھی تو کیا کرتا۔" رحیم داد نے مسکرا کر جواب دیا " تُو موجود ہی تھی۔"

" کمال کرتا ہے تُو۔ یہ بھی کوئی گل بات ہوئی۔" اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اس کا لہجہ تیکھا تھا مگر اس کی آنکھوں میں خفگی یا کدورت کا غبار مطلق نہ تھا" میرا کیا ہے۔ واڈھی پر تو تیرا موجود ہونا ضروری تھا۔ میں نے کون سی زمیں داری چلانی ہے۔"

جمیلہ کا لہجہ نرم پڑ گیا" اچھا یہ بتا تو اب تک رہا کہاں؟"

" میں کلیم کے چکر میں پہلے منٹگمری گیا۔ فیر ملتان جانا پڑا۔"

" وہ تو میں نوں پتہ ہے۔ نادر مجھے بتا بھی چکا ہے اور یہ بھی بتا چکا ہے کہ تیرے

کلیم کے بارے میں جو گڑبڑ پیدا ہو گئی تھی، وہ بھی بالکل دور ہو گئی ہے۔ یہ بہت اچھا ہوا۔ مجھے تیرے کلیم کے کارن بہت چنتا تھی۔" جمیلہ نے اظہارِ مسرت کرتے ہوئے کہا۔" پر اس کے بعد تو رہا کہاں۔ واپس کیوں نہ آیا؟"

"کیا کرتا واپس آکر۔" رحیم داد نے چہرے پر افسردگی کے تاثرات پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس زمین اور حویلی کے الاٹمنٹ سے کیا لینا۔ تو نے ہی دلائی تھی اور تیری ہی زمین اور حویلی تھی بھی۔" اس نے نظریں اٹھا کر جمیلہ کے شگفتہ اور دہکتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔" میں تو برسوں محکمہ آبادکاری کے دفتروں کے چکر کاٹ کاٹ کر اور گرداوروں اور پٹواریوں کی خوشامد کرتے کرتے مایوس ہو کر اپنے کلیم کو بھول ہی چکا تھا۔"

"پر یہ گلاں تو اب پرانی ہو چکی ہیں۔" جمیلہ نے اسے ٹوکا۔

"میں تو یہ سوچ کر یہاں سے گیا تھا کہ اب میں نے واپس نہیں آنا۔" اس نے لہجے میں رقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔" پہلے ملتان میں کوشش کی۔ وہاں کام نہ بنا تو بھکر چلا گیا۔ سنا تھا وہاں الاٹمنٹ مل رہے ہیں۔ پر ساری اچھی اور زرخیز زمینیں وڈے زمیں داروں نے اپنے مزارع لگا کر دبا لیں یا فیر بوگس اور جعلی کلیموں کے ذریعے اپنے کبضے میں کر لیں۔ محکمہ آبادکاری والوں نے وہاں بھی زبردست دھاندلی مچا رکھی ہے۔ چھانٹ چھانٹ کر اچھی زمینیں اپنے ناتے داروں، شریکوں اور جاننے والوں کے نام الاٹ کرا دیں۔" رحیم داد کے لبوں پر زہر خند نمودار ہوا۔" اب تو وہاں بنجر اور کلر زمین رہ گئی ہے۔ اس کے لیے بھی درخواستوں کے ڈھیر لگے ہیں۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔" زبردست اندھیر گردی ہے جی۔ دبا کے رشوت لی جا رہی ہے اس کے بنا تو کوئی بات سننے کو بھی تیار نہیں۔"

"اس دھاندلی میں تو چھوٹے بڑے سرکاری افسروں اور اہل کاروں سے لے کر صوبائی اور مرکزی وزیر تک سب ہی شامل ہیں۔ رشوت کے ساتھ ساتھ سفارش بھی چل رہی ہے۔" جمیلہ نے رحیم داد سے اتفاق رائے کیا۔" پر چوہدری، تو الاٹمنٹ کے چکر میں پڑا ہی کیوں؟ یہاں کی آراضی کچھ کم ہے۔ تو کیوں الاٹمنٹوں کی لوٹ مار میں شامل ہو گیا؟ تیرے لیے

تو بھی زمین بہت ہے۔"

"سوچا تھا، تھوڑی سی زمین کہیں اور مل جائے تو زمیں داری شروع کر دوں گا۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ اس زمین اور جائیداد کو تو کبھی میں نے اپنا سمجھا ہی نہیں۔ یہ تو بھی اچھی طرح جانتی ہے۔" رحیم داد نے آواز میں اور زیادہ رقت پیدا کی۔ "جب تو مجھ سے ناراض ہو گئی تو میں نے یہاں رہ کر کیا کرنا۔" اس نے بجھی بجھی نظروں سے جمیلہ کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "زمیں دارنی! مجھے لہور شہور جانے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ سنا ہے سندھ میں آسانی سے الاٹمنٹ مل جاتا ہے۔ ادھر بہت متروکہ زمین اور جائیداد ہے۔ اب وہیں چلا جاؤں گا۔"

"ایسا ہی ارادہ تھا تو ادھر واپس ہی کیوں آیا؟" جمیلہ کے لہجے میں طنز کا پہلو نمایاں تھا۔ رحیم داد نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ لہجہ میں اور زیادہ غم گھول کر بولا۔ "میں تو اس لیے آیا تھا کہ تیرے دل میں میری طرف سے میل نہ رہے۔ جو کچھ ہو گیا اسے بھول جا۔ ہاں، تیرا اور اللہ دسایا کا مجھ پر جو احسان ہے وہ میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ تُو نے اور اس نے مجھے ایسے وکت سہارا دیا، جب میرا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ کوئی اپنا نہ تھا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اب تیری زمین اور حویلی تیرے پاس رہے گی۔ وکیل کو بلا لے۔ میں زمین اور حویلی کا بیع نامہ تیرے نام کر دوں۔ میرا کیا ہے۔ جب ایک بار گھر سے بے گھر ہو گیا، اُجڑ کر تباہ ہو گیا۔ تو کہیں بھی پڑاؤ ڈال لوں گا۔ جیسے تیسے زندگی گزر ہی جائے گی۔"

جمیلہ اس کے دُکھ بھرے لہجے اور غم زدہ باتوں سے بہت متاثر ہوئی۔ پیار سے ڈانٹ کر بولی۔ "فضول باتیں نہ کر۔" جمیلہ مسکرائی۔ "چوہدری! تو نے مجھے سمجھا ہی نہیں۔ میں تو کسی سے بھی ناراض نہیں رہ سکتی۔ اور تو تو میری ہی طرح فسادات کی بھڑکتی آگ کا جھلسا ہوا ہے۔ خون کا دریا تیر کر نکلا ہے۔ میں تیرا دکھ جانتی ہوں۔" اس نے گہری سانس بھری۔ اس کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ اس میں تڑپ تھی۔ درد کی چبھن تھی۔ "میں نے آگ اور خون کا خوف ناک کھیل دیکھا ہے۔ اس دکھ اور اپرادھ کو جھیلا ہے، بھگتا ہے۔ یہ ایک بھیانک

کلپنا ہے۔ رات کو کبھی اس کی یاد آجاتی ہے تو آج بھی ساری ساری رات نیند نہیں آتی۔ اس کے خوبصورت اور تابناک چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔" چوہدری! ایسی باتیں کر کے میرے گھاؤ نہ چھیڑ۔ تینوں نوں پتہ نہیں، میں کتنی ابھاگن اور دکھی ہوں۔"

"تو پنڈ چھوڑ کر لہور تو نہیں جا رہی ہے؟" رحیم داد نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"پہلے مجھے یہ بتا، تو نے اس بارے میں کیا سوچا؟"

"میں تو آج کل تاجاں کے ویاہ کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔"

"سنا ہے تاجاں کی تو نے سگائی بھی کر دی۔" رحیم داد نے پوچھا۔

میری تو آشا تھی کہ تو اس کی سگائی پر یہاں ہوتا۔ پر تیرا تو کچھ پتہ ہی نہ تھا کہ کہاں ہے اور کب لوٹے گا۔ لوٹے گا بھی یا نہیں۔" جمیلہ کا لہجہ اچانک غم ناک ہو گیا۔" پر اب تو تاجاں کے سسرال والوں نے سگائی توڑ دی۔"

"سنا تو میں نے بھی یہی ہے۔" رحیم داد نے بتایا۔" نامدار کہتا تھا تو آج اسی معاملہ میں پٹھاناں کے گھر گئی تھی۔ کیا بنا بات چیت کا؟"

"سگائی کے ساتھ رشتہ تو سمجھو ٹوٹ ہی چکا ہے۔" جمیلہ نے رحیم داد سے کہا۔" پر تاجاں کا ہونے والا سسر نیک بندہ ہے۔ ویسے تاجاں کا سگا ماما بھی ہوتا ہے۔ اس نے سب کو سمجھا بجھا کر راضی تو کر لیا ہے۔ بہت بک بک، جھک جھک کے بعد فیصلہ ہوا۔"

"کیا فیصلہ ہوا؟" رحیم داد نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

"ویاہ نہ حویلی سے ہوگا، نہ پٹھاناں کے گھر سے۔" جمیلہ بولی۔" نادر خاں، جس گھر میں رہتا ہے، وہاں سے نو ویاہ ہوگا، جنج سکول میں اترے گی۔"

"یہ تو ٹھیک ہی فیصلہ ہوا۔ ویسے حویلی سے ویاہ ہوتا تو اچھا تھا۔" رحیم داد نے کہا۔" تو ویاہ میں بیٹھے گی نا؟ میں نے سنا تھا تاجاں کے سسرال والوں کو تیرے ویاہ میں بیٹھنے پر بھی اعتراض تھا۔ یہ تو انہوں نے بہت خراب شرط لگائی تھی۔ ویاہ کے لیے سب کچھ تو کرے اور تجھے ہی ویاہ میں نہ بیٹھنے دیا جائے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"اب یہ طے ہوا ہے کہ میں ویاہ میں بیٹھوں گی۔ ویسے میں تو خود بیٹھنا نہیں چاہتی تھی"۔ اس کی آواز میں دباد با کرب تھا۔

"تو کیوں نہیں ویاہ میں بیٹھنا چاہتی تھی؟"

"رنڈوودھوا جو ہوئی"۔ جمیلہ کا لہجہ اور افسردہ ہو گیا"۔ رنڈ کا تو ویاہی جانے والی کڑی پر سایہ بھی نہیں پڑنا چاہیئے۔ اسے بُرا شگون سمجھا جاتا ہے۔ کیا کیا جائے۔ ریتاں رسماں ہی ایسی ہیں"۔

رحیم داد نے جمیلہ کو غم زدہ اور دل گرفتہ پایا تو گفتگو کا رُخ بدل دیا۔ پوچھا"۔ زمیں دارنی! تُو نے نادر کو دیپال پور کس لیے بھیجا ہے۔ کوئی خاص کام ہے؟"

"خاص ہی کام ہے"۔ جمیلہ نے بتایا"۔ تجھ سے اسی کے بارے میں مشورہ کرنا چاہتی تھی۔ بلکہ اس معاملہ میں تو مجھے تیرا سخت انتظار تھا۔ نہ آتا تو میں نادر خاں کو دوبارہ تیرے پاس بھیجتی"۔

"گل کی ایہہ۔ خیر اے ناں؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"خیر ہی ہے"۔ جمیلہ بولی"۔ تُو احسان شاہ کو تو جانتا ہے"۔

رحیم داد گھبرا گیا۔ لہجے میں عاجزی پیدا کرتے ہوئے بولا"۔ تجھے سب کچھ پتہ ہے۔ فیر ایسی گل بات کیوں پوچھتی ہے؟" اس نے لہجے میں تلخی پیدا کرنے کی کوشش کی"۔ پر اب میرے سامنے اس کا نام نہ لے۔ اسی کی وجہ سے تجھ سے ساری ناراضگی ہوئی"۔ اس نے چہرے پر غصے اور ناگواری کے تاثرات پیدا کیے۔ تیوری پر بل پڑ گئے"۔ تجھے پتہ نہیں وہ کتنا کمینہ ہے۔ اسی نے میرا کلیم منسوخ کرانے کے لیے درخواست لگوائی تھی تفتیش کروانے کا حکم نکلوایا تھا"۔

"میں نوں سب پتہ ہے" جمیلہ نے کہا"۔ نادر مجھے اس بارے میں پہلے ہی سب کچھ بتا چکا ہے۔ احسان شاہ کتنا کمینہ اور گندہ ہے۔ یہ مجھے اچھی طرح خبر ہے"۔

"جب ایسی بات ہے تو اس کا ذکر تو نے میرے سامنے کیوں چھیڑا؟" رحیم داد

نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا ” مجھے تنگ کرنا چاہتی ہے، ذلیل کرنا چاہتی ہے؟“
” ایسی گل نہیں “ جمیلہ مسکرا کر نرم لہجے میں بولی ” ناراض نہ ہو “ اس نے رحیم داد کے چہرے کی جانب نظریں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں پچھلی رات کے چاند کی چاندنی اُتر آئی تھی ” مجھے احسان شاہ سے ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔“
” احسان شاہ سے ضروری کام پڑ گیا ہے۔ اور تجھے؟“ رحیم داد حیران و پریشان ہو کر گویا ہوا۔
” ہاں، ایسی ہی گل ہے“ وہ اطمینان سے بولی ” اور تجھے اس کام کے سلسلہ میں احسان شاہ کے پاس جانا ہو گا۔“
” زمیں دارنی تو کیسی گل کر رہی ہے“ رحیم داد نے چہرے پر جھنجلاہٹ پیدا کرتے ہوئے ناگواری سے کہا ” میں نے اس کے پاس نہیں جانا۔ مجھے تو اب اس کے نام سے بھی گھن آتی ہے۔“
” میری گل تو سن “ جمیلہ نرمی سے بولی۔
” سنا، کیا سنانا چاہتی ہے “ رحیم داد کا چہرہ بدستور تنا ہوا تھا۔
” بات یہ ہے “ جمیلہ نے سنبھل سنبھل کر اپنا مقصد بیان کیا ” یہ تو تجھے پتہ ہی ہو گا کہ احسان شاہ اپنے مزارعوں اور کمیوں کی نوجوان گھر والیوں اور کڑیوں کو اٹھوا کر کید کر لیتا ہے۔ سنا ہے ان کو رکھنے کے لیے اس نے بہت وڈا کوٹ بنوا رکھا ہے۔ سمجھو ایک طرح کی جیل ہے وہ۔ اس کی کڑی نگرانی کی جاتی ہے۔“
” سنا تو میں نے بھی ہے۔ پر کبھی دیکھا نہیں “ رحیم داد نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔
” ان ہی کیدی زنانیوں میں سے ایک نے کسی نہ کسی طرح کوٹ کی جیل سے بھاگنے کی کوشش کی اور اس کی کوشش سپھل بھی ہو گئی۔“
” جب جیل ہو گی تو زنانیاں اس سے نکل کر بھاگنے کی کوشش بھی کرتی ہوں گی اور کوئی کوئی تو کامیاب بھی ہو جاتی ہو گی “ رحیم داد نے اپنے فوری ردعمل کا اظہار کیا۔

"پر تو نے ان سے کیا لینا؟"

"ہوا یہ کہ ایک ایسی ہی زنانی چند روز ہوئے یہاں پہنچ گئی۔" جمیلہ نے رحیم داد کو اپنی بات وضاحت سے سمجھانے کی کوشش کی۔ "ایسی کڑاکے کی سردی میں وہ رات بھر جھاڑیوں میں چھپی رہی۔ میں سویرے سکول پہنچی تو وہ جھاڑیوں سے نکل کر میرے پیروں پر گر پڑی۔ سردی سے اس کا بدن مانو برف ہو رہا تھا۔"

رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ اسے خدشہ لاحق ہوا کہ کوئی ایسی عورت نہ ہو جو احسان شاہ کی حویلی میں اس کے ساتھ رات بسر کر چکی ہو۔ وہ اسے فوراً پہچان لیتی۔ اور اس کے لیے خطرہ بن جاتی۔ جمیلہ ایک بار پھر اس سے ناراض ہو جاتی اور اب اسے منانا بھی مشکل ہوتا۔

وہ سخت الجھن میں پڑ گیا۔ جھجکتے ہوئے کہا "اب وہ کہاں ہے؟"

"میرے کمرے میں ہے" جمیلہ نے بتایا۔ رحیم داد کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ اور اس قدر بڑھ گئی کہ وہ اس کے بارے میں پوچھ گچھ بھی نہ کر سکا۔ دم بخود بیٹھا رہا۔ جمیلہ بولتی رہی "میری طرح وہ بھی مغویہ ہے۔ پہلے ہندو ہوتی تھی۔ اب مسلمان ہو چکی ہے۔ اس کا نام زینت بی بی ہے۔ میری ہی طرح ابھاگن ہے" جمیلہ کا چہرہ ذہنی کرب سے مرجھا گیا۔

مگر رحیم داد نے اطمینان کی سانس لی۔ اسے فوراً یاد آگیا کہ پچھلی بار جب وہ احسان شاہ کی حویلی میں تھا تو مراد خاں شاہانی نے مزے لے کر زینت کا ذکر کیا تھا۔ وہ کوٹ میں ان دنوں نئی نئی اٹھا کر لائی گئی تھی۔ رحیم داد نے اس کے بارے میں مراد خاں سے بہت کچھ سنا تھا مگر زینت سے اس کا آمنا سامنا نہ ہوا تھا۔ نہ اس نے رحیم داد کو دیکھا تھا اور نہ ہی رحیم داد نے اسے دیکھا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی اور انجان تھے۔

رحیم داد نے زینت کے بارے میں کسی تبصرے سے گریز کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری "اس پر بھی بہت اپرادھ ہوا۔ جس کے ہاتھوں میں پڑ گئی اس نے نوچا کھسوٹا۔ ذرا بھی ترس نہ کھایا۔ آخر اسے ایک نیک بندہ مل گیا۔ وہ سکول

ماسٹر تھا۔ اس نے زینت سے باقاعدہ دیاہ کرلیا۔ اب وہ اسی کے پاس جانا چاہتی ہے۔"

"وہ کہاں ہوتا ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"وہ آج کل دیپال پور کے پرائمری سکول میں ماسٹر لگا ہے۔ اس کا نام جلیل ہے۔"

"تو نے اسی کو بلانے کے لیے نادر کو دیپال پور بھیجا ہے؟"

"ہاں جی، میں نے نادر خاں کو اسی لیے دیپال پور بھیجا ہے۔" جمیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔" وہ آکر زینت کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔"

"جب ایسی گل بات ہے تو احسان شاہ کے پاس میرے جانے کی کیا ضرورت ہے؟" اس نے استفہامیہ نظروں سے جمیلہ کی جانب دیکھا۔" میں تو کہتا ہوں زمیں دارنی، احسان شاہ کو تو اس کا بالکل پتہ نہیں چلنا چاہیے۔ بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ تیں نوں پتہ نہیں وہ کتنا خطرناک اور کمینہ ہے۔" اس کے چہرے سے خوف اور پریشانی صاف عیاں تھی۔

"میں نوں پتہ ہے، وہ کتنا خطرناک ہے۔" جمیلہ نے رحیم داد سے اتفاق رائے کیا۔

"اس کا اثر ورسوخ بھی بہت ہے۔ وڈے وڈے سرکاری افسروں بلکہ اسمبلی کے ممبروں اور وزیروں تک سے اس کی یاری ہے۔ اس کی پہنچ تو بہت اوپر تک ہے۔" اس کا لہجہ تلخ ہوگیا۔ چہرے کی شگفتگی اور رعنائی دھندلی پڑگئی۔" سچ پوچھ تو حکومت ہی ایسے بندوں کی ہے۔ اس کے دو پُتر تو وڈے سرکاری افسر لگے ہیں۔ جنوائی اور بھتیجے بھی اونچے عہدوں پر لگے ہیں۔"

"تو بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔" رحیم داد نے کہا۔" پر اپنی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ تو مجھے اس کے پاس کیوں بھیجنا چاہتی ہے۔"

"یہی تو میں نے تجھے بتانا ہے۔" جمیلہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔" زینت کے دو بچے ہیں۔ وہ دونوں احسان شاہ کے مزارع سلامو کے پاس ہیں۔ سلامو ہی اُسے اغوا کرکے پیراں والہ لایا تھا۔ اور اس کے گھر سے احسان شاہ نے اپنے غنڈوں اور کرندوں کے ذریعہ زینت کو اٹھوالیا۔"

" زینت کو اپنے بچے تو یاد آتے ہی ہوں گے۔"

" کیوں نہیں یاد آتے۔ زینت کے سینے میں بھی ماں کا ہردے دھڑکتا ہے۔"
جمیلہ نے تڑپ کر کہا" ان کے لیے وہ بلک بلک کر روتی ہے۔ اُسے روتا دیکھتی ہوں
تو میری آنکھوں میں بھی آنسو آ جاتے ہیں۔ میں بھی تو ماں ہوں۔" اس کے چہرے پر دُکھ
برسات کے بادلوں کی مانند منڈلانے لگا۔" چوہدری! تجھے ماں کی ممتا کا پتہ نہیں۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ چپ بیٹھا رہا۔

" تو احسان شاہ کے پاس چلا جا۔" اس دفعہ جمیلہ کے لہجے میں التجا کا پہلو نمایاں
تھا۔" اس کی منت سماجت کر لینا۔ میری خاطر کر لینا۔" اس کے رویہ میں عاجزی اور بڑھ
گئی۔" چوہدری! تو زینت کے بچے دلوا دے۔ تیری بہت مہربانی ہوگی۔ مجھے وشواس ہے
احسان شاہ تیری گل ضرور مان لے گا۔"

" بالکل نہیں مانے گا۔ تو نے بالکل غلط اندازہ لگا رکھا ہے۔" رحیم داد نے جھٹ
صفائی پیش کی۔" میری اس کے ساتھ ایسی یاری نہیں کہ وہ میری ہر گل بات مان لے۔
مجھے تو ڈر ہے کہیں وہ تیرا دشمن نہ ہو جائے۔"

" ہو جائے، کون سا فرق پڑتا ہے۔ پہلے ہی وہ کون سا مجھ پر مہربان رہا ہے۔"
جمیلہ کے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوا۔" وہ تو مجھے اپنی رکھیل بنانے کے لیے خریدنا
چاہتا تھا۔ دو ہزار بولی لگائی تھی۔ پر اللہ وسایا نے صاف انکار کر دیا۔" جمیلہ نے اپنی
بات کا رخ بدل دیا۔ ایک بار پھر حرف مطلب پر آ گئی۔" چوہدری! تو زینت کے بچوں
کے لیے احسان شاہ سے بات کر کے تو دیکھ۔

" تو بھی کمال کرتی ہے زینیں دارنی۔" رحیم داد کسی قدر جھنجلائے ہوئے لہجے میں
بولا۔" اس سے بات کرنے کا تو یہ مطلب ہوگا کہ اسے پتہ چل جائے گا کہ زینت یہاں ہے۔"
اس نے جمیلہ کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔" تو نے یہ نہیں سوچا، اگر احسان شاہ نے میری
بات نہ مانی تو کیا ہوگا۔ میں تو کہتا ہوں اسے پتہ چل گیا تو زینت اپنے گھر والے کے

پاس بھی نہ جا سکے گی۔ احسان شاہ اسے رستے ہی سے اٹھوا لے گا۔ وہ ایسا ہی خطرناک بندہ ہے۔"

جمیلہ تذبذب میں پڑ گئی۔ رحیم داد نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا، ان کی اہمیت کو اس نے بھی محسوس کیا۔

☆

رات کالی کاجل ہو گئی تھی۔ سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ حویلی پر سناٹا چھایا تھا۔ اسی اثنا میں رات کے گہرے سناٹے میں کمرے کے باہر قدموں کی مدھم آہٹ ابھری۔ چاپ ہولے ہولے قریب آتی گئی۔ دروازے کا ایک پٹ ذرا سا کھلا تھا۔ دونوں نے گردن موڑ کر اس طرف دیکھا۔

زینت دروازے پر کھڑی تھی۔ مگر وہ اندر نہ آئی۔ جمیلہ نے نرمی سے کہا۔" اندر آجا۔ باہر سردی میں کیوں کھڑی ہے؟"

وہ سہمی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور دہلیز کے پاس فرش پر خاموشی سے بیٹھ گئی۔ رحیم داد نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ اس کا رنگ ہلکا گلابی تھا۔ بال سنہری مائل تھے۔ آنکھیں بھوری تھیں مگر بڑی بڑی اور کشش انگیز تھیں۔ ناک نقشہ سیک اور کھڑا کھڑا تھا۔ جسم نرم اور گداز تھا۔ عمر ۲۴ سال سے زیادہ نہ تھی۔ مگر وہ اتنی ہی عمر میں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر بن چکی تھی۔ آنکھیں ویران اور دھواں دھواں تھیں۔ چہرہ مرجھائے ہوئے پھول کی طرح شگفتگی سے عاری تھا۔ جلد کھردری پڑ گئی تھی۔ وہ گہری نیلی دھوتی باندھے ہوئے تھی اور ملگجی کھیس اوڑھے سکڑی سکڑائی حسرت کا مرقع اور عبرت کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔

جمیلہ نے پوچھا۔" زینت تو کیسے آگئی؟"

"بھین جی، نیند نہیں آرہی تھی۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔" مجھے پتہ چلا،

تُو یہاں ہے۔ من گھبرایا تو اِدھر آ گئی۔ تُو نے بُرا تو نہیں منایا؟"

"ایسی گل نہ سوچ۔" جمیلہ نے اسے پیار سے ڈانٹا۔" وہاں کیوں بیٹھی ہے۔ اِدھر میرے پاس کرسی پر آ کر بیٹھ جا۔"

اس نے گردن ہلا کر آہستہ سے کہا۔" نہیں بھین جی، میں یہیں ٹھیک ہوں۔" وہ اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔

جمیلہ نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔" چوہدری! اس نے دسویں تک پڑھا ہے۔ پیتا ڈاکٹر تھا۔ پنڈ تُوں کا کھاتا پیتا گھرانہ تھا۔" اس نے گہری سانس بھری۔" سمے بدلا تو سب کچھ بدل گیا۔ اب یہ اپنی ہی نظروں میں اتنی گر گئی ہے کہ خود کو کمی سمجھتی ہے۔ میرے ساتھ کرسی پر بیٹھتے ہوئے ڈرتی ہے۔"

رحیم داد نے جمیلہ کی بات نظر انداز کرتے ہوئے زینت سے پوچھا۔" تو احسان شاہ کے کوٹ سے کیسے نکل آئی۔ سنا ہے اُدھر بہت کڑی نگرانی ہوتی ہے۔ ہر وقت مسلح راکھے پہرہ دیتے ہیں۔ میں نے غلط تو نہیں سنا؟" رحیم داد نے انجان بننے کی کوشش کی۔

"تُو نے ٹھیک ہی سنا۔" اس نے رحیم داد کی تائید کی۔" وہ ایسا ہوا جی کہ میں اس رات کوٹ میں نہیں تھی۔ مجھے شاہ جی کے نوکر، شیدا نے ان کمروں میں سے ایک میں پہنچا دیا تھا جن میں مہمان ٹھہرتے ہیں۔ وہ جی بہت گندی اور خراب جگہ ہے۔" اس کا لہجہ مدھم اور افسردہ پڑ گیا۔"پہلے بھی ان کمروں میں کئی بار جا چکی تھی۔ اس رات محکمہ آبادکاری کا کوئی وڈا افسر ٹھہرا تھا۔ اس نے دانتوں سے ایسے زور زور سے کاٹا کہ مجھے رونا آ گیا۔ پر وہ ہنستا رہا۔ مخول کرتا رہا۔ نشے سے بالکل پاگل ہو رہا تھا۔"

رحیم داد نے مسکرا کر جمیلہ کی جانب دیکھا۔" سن لے، زمیں دارنی۔ اس طرح ہو رہی ہے آبادکاری۔" جمیلہ کچھ نہ بولی۔ نگاہیں نیچی کیے خاموش بیٹھی رہی۔ رحیم داد نے نگاہیں گھمائیں۔ زینت کو دیکھا، پوچھا۔" یہ تو بتا زینت، تو وہاں سے نکلی کیسے۔ راکھوں نے تجھے نہیں روکا؟" اس کی آنکھوں میں حیرت اور استعجاب تھا۔

"بات سچی یہ ہے جی" زینت نے رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر بتایا "نشے میں تو وہ تھا ہی۔ ایسا بے خبر ہو کر سویا کہ اسے بالکل سُدھ بُدھ نہ رہی۔ مجھے نیند نہیں آئی۔ اس نے ایسے کٹھور پن سے بدن میں جگہ، جگہ کاٹا تھا کہ بار بار ٹیس اٹھتی تھی" اس نے سردی سے بچنے کے لیے کھیس ٹانگوں تک پھیلا دی۔

"فیر کیا ہوا؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"جب وہ بے سُدھ ہو کر سو گیا تو میں اٹھی۔ چپکے سے دروازہ کھولا" زینت آہستہ آہستہ بتاتی رہی "کمرے کے باہر برآمدہ تھا۔ اس میں راکھا بیٹھا تھا۔ اس کے پاس بندوک تھی۔ پر وہ بھی دیوار سے پیٹھ ٹکائے اس سمے اونگھ گیا تھا۔ میں چوری چوری چلتے ہوئے برآمدے کی سیڑھیوں سے نیچے اتری۔ سامنے گھنے پیڑ تھے۔ اندھیرا بھی بہت تھا۔ میں درختوں تلے پہنچ گئی۔ اگے بڑھی اور ایک پیڑ پر چڑھ گئی"

"تو پیڑ پر بھی چڑھ لیتی ہے؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں جی" وہ بولی "مجھے بچپن سے پیڑوں پر چڑھنے کی اچھی پریکٹس ہے" اس نے جھجکتے ہوئے رحیم داد کی جانب دیکھا "پیڑ دیوار کے ساتھ ہی تھا۔ میں ایک ڈالی سے لٹک کر جھولتی رہی اور ایک بار جی کڑا کر کے باہر کود گئی"

"پر حویلی کی دیوار تو بہت اونچی ہے" رحیم داد نے پوچھا "تجھے چوٹ نہیں آئی"

"آئی تھی۔ پر زیادہ نہیں آئی" زینت نے بتایا "اس سمے تو بالکل پتہ نہ چلا۔ میں پیراں والہ سے بھاگتی ہوئی رات کے اندھیرے میں نکلی اور نہر کے ساتھ ساتھ چلتی اِدھر آ گئی۔ پر بعد میں ایک ٹانگ درد کرنے لگی۔ اب بھی کرتی ہے" اس نے نظریں اٹھا کر جمیلہ کو دیکھا "بھین جی کو میں نے بتایا۔ اس نے تاراں سے مالش کرائی۔ اس سے درد کم ہو گیا"

جمیلہ زیادہ دیر خاموش نہ رہی۔ اس نے دل گرفتہ ہو کر کہا "زینت! تیرا اصلی درد تو تیرے بالک ہیں جن کو تو ہر سمے یاد کرتی رہتی ہے۔ روتی رہتی ہے۔ آنسو

بہاتی ہے۔" جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔" یہی گل ہے نا؟"

"میرا اصلی درد تو بہین جی یہی ہے۔ ان کے لیے تو میں شاہ جی کی حویلی میں بھی روتی رہتی تھی۔" زینت نے دکھ بھرے لہجے میں جمیلہ کی بات کی تائید کی۔" کوٹ کی کیدی زنانیوں کی انچارج رہتی ہے۔ مجھے روتا ہوا دیکھ کر وہ ڈانٹتی ڈپٹتی تھی۔ بالوں سے پکڑ کر مارتی تھی۔ وہ جی بہت کٹھور ہے۔" زینت نے ہولے سے سانس بھری۔ "اس کے ڈر سے میں چھپ چھپ کر روتی تھی۔" اس کی آواز گلوگیر ہوگئی۔ اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ وہ کھیس کے پلّو سے آنسو پونچھنے لگی۔

جمیلہ نے رحیم داد سے کہا۔" چوہدری! یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ زینت اس سمے یہاں آگئی۔ تو نے بھی اس کا دکھ جان لیا۔ یہ اپنے بچوں کے لیے بہت دکھی ہے۔ اسے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ روٹی بھی ٹھیک سے نہیں کھاتی۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔" یہ بتا اس کے بچوں کو لانے کے لیے کیا رستہ نکالا جائے۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

"میں تو کہتا ہوں جی، پہلے اس کے گھر والے کا انتظار کر لیا جائے۔ وہ کل شام تک نادر خاں کے ساتھ پہنچ ہی جائے گا۔ جنّت نے مجھے یہی بتایا ہے۔" رحیم داد نے اپنے خدشات کا دبی زبان سے اظہار کیا۔" پہلے اس کے گھر والے سے گل بات کرنی ضروری ہے۔ مان لے وہ اسے لے جانے پر تیار نہ ہوا، تب کیا ہوگا؟ مجھے یا تجھے اس کے دل کا کیا پتہ؟"

"چوہدری! تو کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔ ایسا سمے لگا ہے، کسی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کبھی کبھی تو میں بھی اس طرح وچار کرتی ہوں۔" جمیلہ نے بھی رحیم داد کی رائے سے اتفاق کیا۔" سال بھر سے اوپر ہوگیا۔ پتہ نہیں گھر والے کے من میں اس کے بارے میں کیا ہو۔ اس نے کیا سوچ رکھا ہو؟"

"بہین جی! ایسا نہ کہہ۔" زینت تڑپ کر بولی۔" وہ مجھے بہت پیار کرتا ہے۔ بہت نیک اور بھلا بندہ ہے۔ وہ مجھے اتنا پیار نہ کرتا تو میں اپنے کنبے والوں کو چھوڑ کر فیروز پور سے ادھر واپس ہی کیوں آتی۔ تجھے تو ساری باتوں کا پتہ ہی ہے۔ سب کچھ بتا چکی ہوں

تجھ سے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" رحیم داد نے اس کی دل شکنی نہ کی۔" پر پہلے اس سے مل کر بات کر لینی ضروری ہے۔" اس نے جمیلہ کو مخاطب کیا۔" زیں دارنی! میں تو ایسا ہی سوچتا ہوں۔ تو کیا کہتی ہے؟"

"وہی جو تیرا وچار ہے۔" جمیلہ نے اس کی تائید کی۔" زینت کے گھر والے کا پہلے انتظار کر لینا چاہیے۔ اس سے بات چیت کرنے پر صاف پتہ چل جائے گا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔" اس نے زینت کی جانب مڑ کر دیکھا۔" مان لے وہ تجھے اپنے ساتھ لے جانے پر تیار نہ ہوا۔" اپنے اس شک و شبہ کے اظہار کے ساتھ ہی اس نے زینت کو یقین بھی دلایا۔" چنتا نہ کر زینت۔ میں تجھے اور تیرے بچوں کو اپنے پاس رکھوں گی۔ ویسے تیرا گھر والا جلیل چاہے تو اسے بھی یہاں ٹھہرا لوں گی۔"

"بھین جی! وہ یہاں کیسے رہ سکتا ہے؟" زینت نے کہا۔" دیپال پور میں تو وہ نوکری کرتا ہے۔ سکول میں پڑھاتا ہے۔"

"یہاں بھی سکول میں پڑھائے گا۔" جمیلہ نے مسکرا کر زینت کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔" تو نے تو میرا اسکول دیکھا ہے۔ وہیں تو مجھے پہلی بار ملی تھی۔ بھول گئی؟"

زینت نے جھجکتے ہوئے کہا۔" پر جلیل تو سرکاری سکول کا ماسٹر ہے۔ وہ کیسے سرکاری نوکری چھوڑ دے گا؟"

"یہ بھی سرکاری سکول بن جائے گا۔" جمیلہ نے اسے یقین دلایا۔" میں تو یہی چاہوں گی جلیل ادھر ہی ٹھہر جائے اور یہ سکول چلائے۔ مجھے تو ویسے بھی تجربہ کار سکول ماسٹروں کی ضرورت ہے۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوئی۔" چوہدری! میں تجھے یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ اپنے سکول کے بارے میں بات چیت کرنے شہر گئی تھی۔ محکمہ تعلیم والوں نے تو ٹال مٹول سے کام لیا۔ میں ڈپٹی کمشنر سے ملی۔ بہت اچھی طرح پیش آیا۔ اچھا بندہ لگتا ہے۔ اس نے مدد کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ مجھے وشواس دلایا

کہ میرے سکول کو سرکاری پرائمری سکول بنا دیا جائے گا۔"

"کب تک ایسا ہو جائے گا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"یہ تو بتانا مشکل ہے۔" جمیلہ نے جواب دیا۔ "ڈپٹی کمشنر نے کہا ہے، اگر فوری طور پر ایسا نہ ہوا تو سکول کو منظور شدہ تو ضرور بنا دیا جائے گا۔ سرکار کی طرف سے مالی مدد بھی ملے گی۔ اس کی ویسے مجھے چنتا نہیں۔ پر ریکگنائزڈ یا منظور شدہ ہو جانے کے بعد سکول کی اہمیت بڑھ جائے گی۔ ابھی تو وہ کچھ بھی نہیں۔"

"یہ تو بہت اچھا ہو گا۔" رحیم داد نے جمیلہ کی خوشنودی کے لیے کہا۔ ویسے اسے سکول سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ احسان شاہ سے سکول کے بارے میں تفصیلی بات چیت کرنے کے بعد وہ اس کے قیام کے حق میں نہ رہا تھا۔

مگر جمیلہ اس کے احساسات سے بے نیاز بڑے جوش و خروش سے بتاتی رہی۔ "ڈپٹی کمشنر نے تو مجھے یہاں تک وشواش دلایا کہ وہ ڈسٹرکٹ بورڈ والوں سے بات چیت کرے گا اور انسپکٹر آف سکولز کو جلد ہی معائنے کے لیے بھجوانے کی کوشش کرے گا۔ خود بھی ادھر آنے کو کہتا تھا۔"

"بھین جی، تیرا سکول سرکاری بن گیا، تب تو جلیل ضرور یہاں آ جائے گا۔" زینت خوش ہو کر بولی۔ "میں بھی اسے کہوں گی۔ وہ میری بات مان لے گا۔ پر اسے ادھر اپنا تبادلہ کرانا پڑے گا۔"

"پر ابھی اُسے آنے تو دے۔ تُو نے تو ابھی سے اونچی اونچی گلاں سوچنی شروع کر دیں۔" رحیم داد نے ہنس کر زینت سے کہا۔ "پہلے تو اس سے مل کر یہ کھوج لگانا ہو گا کہ اس کا ارادہ کیا ہے۔ بنا اس سے ملے اور بات کیے تو کچھ بھی نہیں طے کیا جا سکتا۔"

"چوہدری! تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پہلے جلیل کا انتظار کرنا ہو گا۔" جمیلہ نے رحیم داد کی رائے سے پورا پورا اتفاق کیا۔ "اسے کل شام تک نادر کے ساتھ یہاں پہنچ جانا چاہیئے۔" اس نے کلائی پہ بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ "ساڑھے بارہ بج گئے۔ آدھی

رات ہوگئی، باتوں میں سمے کا پتہ ہی نہ چلا۔ بہت دیر ہو گئی۔ اب چلنا چاہیئے۔" وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"پر تو نے طے کیا کیا؟" رحیم داد نے جمیلہ کو ٹوکا۔

"طے کیا کرنا ہے۔" جمیلہ نے جواب دیا۔ "پہلے جلیل سے مل کر بات کرنی ضروری ہے۔ ہونا بھی یہی چاہیے۔ اس کے آنے کے بعد ہی اگے کے لیے سوچ وچار کیا جائے گا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ جمیلہ آگے بڑھی۔ زینت بھی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ دونوں کمرے سے چلی گئیں۔

☆

زینت کے شوہر جلیل کا صبح ہوتے ہی انتظار شروع ہوگیا۔ دن ڈھلنے لگا۔ سورج غروب ہوگیا۔ شام ہوگئی۔ مگر جلیل نہ آیا۔ نادر خاں بھی نہ لوٹا۔ پھر رات ہوگئی۔ حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ رحیم داد جاگ رہا تھا۔ اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ ویسے بھی کچھ عرصے سے اسے دیر سے سونے کی عادت پڑگئی تھی۔

رات گئے بالائی منزل پر جانے والے زینے پر قدموں کی آہٹ ابھری۔ رحیم داد پوری طرح بیدار تھا۔ چاپ رفتہ رفتہ قریب آتی گئی اور کمرے کے پاس پہنچ کر ختم ہوگئی۔ رحیم داد نے بے چین نظروں سے بند دروازے کی جانب دیکھا۔

دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ رحیم داد نے اٹھ کر لیمپ کی لو اُونچی کی۔ آگے بڑھا۔ دروازہ کھولا۔ سامنے جمیلہ کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دواؤں کا بکسہ لٹک رہا تھا۔ اس کے قریب حویلی کی نوکرانی نا جو کھڑی تھی۔ وہ ایک ہاتھ میں جلتی ہوئی لالٹین سنبھالے ہوئے تھی۔

جمیلہ نے رحیم داد کو دیکھتے ہی دریافت کیا۔ "چوہدری! تو ابھی سویا نہیں؟"

"نہیں جی، میں جاگ رہا تھا۔ دن میں دیر تک سوتا رہا۔ اب نیند نہیں آرہی

تھی،" رحیم داد نے وضاحت کی، پوچھا۔" پر زیبں دارنی تو اتنی رات کو کہاں جا رہی ہے؟"
"پنڈ کے موچی کی طبیعت بہت گڑ بڑ ہے۔" جمیلہ نے قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔" شام سے اسے الٹیاں ہو رہی ہیں۔ حکیم سے دوائی بھی لایا تھا پر طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی۔ تھوڑی دیر پہلے حمدا کے ساتھ اس کا پتر آیا تھا بہت پریشان لگتا تھا۔ اسے تو میں نے جھٹ واپس بھیج دیا۔ اب موچی کے گھر جا رہی ہوں۔"
"پر اب تو بہت رات ہو گئی۔" رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا۔
جمیلہ کچھ نہ بولی۔ دواؤں کا بکسہ فرش پر رکھا۔ شال دوبارہ اس طرح سنبھال کر اوڑھی کہ کان اور چہرے کا بیشتر حصہ ڈھک گیا۔
"زیبں دارنی! سردی بہت ہے۔ تو نے خالی شال اوڑھ رکھی ہے۔"
"نہیں، میں نے موٹا اونی سویٹر بھی پہن رکھا ہے۔ تو چنتا نہ کر۔" جمیلہ نے زیر لب مسکرا کر کہا۔" ویسے مجھ سے کمبل یا دھسا اوڑھ کر چلا نہیں جاتا۔ نہ جانے کیسا لگتا ہے۔" بات کہتے کہتے اس کے چہرے سے گھبراہٹ جھلکنے لگی۔" چوہدری! میں تیرے پاس اس کارن آئی تھی کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ احسان شاہ کا ایک کرندہ شام کو ادھر آیا تھا۔ تجھ سے تو نہیں ملا؟"
"مجھے تو نہیں ملا۔ پر وہ آیا کیوں؟" رحیم داد بھی گھبرا گیا۔" زینت تو تیرے ہی ساتھ ہے نا؟"
"وہ تو میرے ہی کمرے میں ہے۔ اسے نینا اور گڈو کے پاس چھوڑ کر آئی ہوں۔ جاگ رہی ہے۔"
"جلیل کا انتظار کر رہی ہو گی۔ پر نہ وہ آیا اور نہ ہی نادر لوٹا۔"
"پتہ نہیں کیوں نہیں آیا۔" جمیلہ نے کہا۔" لگتا ہے نادر اسے لے کر ہی آئے گا۔ کل تک دونوں کو آجانا چاہیے۔"
"زیبں دارنی! اندر آجا۔ باہر کیوں کھڑی ہے؟"

"میں نے بھٹورنا نہیں ہے۔ تجھے احسان شاہ کے کرندے کے بارے میں بتانے آئی تھی۔ مجھے اب موچی کے گھر جانا ہے۔"

"بیٹھ جا، میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔ تیرا اتنی رات گزرے اس طرح جانا ٹھیک نہیں۔"

جمیلہ نے منع بھی کیا، مگر وہ باز نہ آیا۔ اس نے جلدی جلدی جوتے پہنے، سر پر پگڑی رکھی، اونی دُھسّا اوڑھا، باہر نکلا، دروازہ بند کیا اور جمیلہ کے انکار کے باوجود اصرار کر کے دواؤں کا بکسہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

رحیم داد بکسہ سنبھالے جمیلہ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ناجو لالٹین لیے آگے آگے تھی۔ تینوں حویلی سے باہر نکلے۔ پھاٹک پر پہریدار موجود تھا۔ رحیم داد نے اسے چوکنا اور محتاط رہنے کی ہدایت کی۔ حویلی کے باہر کہر کا نیلگوں دھندلکا پھیلا تھا۔ اس کی تہہ اس قدر گاڑھی اور دبیز تھی کہ لالٹین کی روشنی ہلکا سا دھبا نظر آتی تھی۔

گاؤں کہر میں لپٹا سو رہا تھا۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔ یہ جاڑے کی ایک سرد اور خون منجمد کر دینے والی رات تھی۔ رحیم داد کا بدن موٹے دُھسّے میں بھی کپکپا رہا تھا۔ ناجو بھی سکڑی سکڑائی نظر آتی تھی۔ مگر جمیلہ گردن اٹھائے نہایت سکون سے چل رہی تھی۔ تینوں نے رڑ عبور کیا اور گاؤں کی جانب بڑھے۔

ابھی تینوں گاؤں کے مکانات سے دور ہی تھے کہ رات کے پُرہول سناٹے میں عقب سے تیز ٹاپیں سنائی دیں۔ کوئی گھوڑا سرپٹ دوڑاتا اسی طرف آ رہا تھا۔ جمیلہ، رحیم داد اور ناجو نے ٹاپیں سنیں تو ٹھٹک کر رہ گئے۔ ان کی آنکھوں میں خوف تھا۔ چہروں پر پریشانی تھی۔ وہ اس سمت دھڑکتے دل سے دیکھنے لگے جدھر سے آہٹ اُبھر رہی تھی اور دم بدم قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے گھڑ سوار ان کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے گھوڑا ٹھہرایا۔ نیچے اترا اور رکابیں سنبھالے ہوئے ان کی طرف بڑھا۔ تینوں دم بخود تھے۔ کہر کا دھندلکا

اتنا دبیز تھا کہ آنے والا سائے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ رحیم داد گو مگو کے عالم میں حیران و پریشان کھڑا رہا۔ مگر جمیلہ نے جرأت سے کام لیا۔ آگے بڑھی۔ ناجو کے ہاتھ سے لالٹین لی۔ اسے اٹھا کر اونچا کیا۔ اور آنے والے کو آنکھیں پھاڑ کر غور سے دیکھا۔ وہ اب ٹھہر گیا تھا اور دھندلکے میں لپٹا ہوا چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ وہ اندھیرے میں اونی دوہر سے اس طرح چہرہ چھپائے ہوئے تھا کہ صرف تیز چمکتی ہوئی آنکھیں لالٹین کی دھندلی روشنی میں نظر آ رہی تھیں۔

جمیلہ نے جھجکتے ہوئے پوچھا "کون ہے تو؟" اس کی آواز میں ہلکی ہلکی کپکپاہٹ تھی۔ وہ جہاں تھی وہیں کھڑی رہی۔

وہ کچھ نہ بولا۔ اس نے خاموشی سے قدم اٹھایا اور آگے بڑھنے لگا۔ اب رحیم داد کو بھی اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا۔ اس نے ڈپٹ کر کہا "بولتا کیوں نہیں۔ صاف صاف بتا تو کون ہے۔ کیا چاہتا ہے؟"

وہ تینوں کے مقابل پہنچ کر پھر رک گیا، مگر کچھ بولا نہیں۔ چہرے پر سے دوہر ہٹائی اور جمیلہ کو مخاطب کیا "بھین جی، گھبرا نہیں۔ میں جیرا ہوں۔"

جمیلہ نے لالٹین اٹھا کر اس کے چہرے کے سامنے کر دی۔ وہ جیرا ہی تھا۔ اس کے مزارع دین محمد کا بڑا بیٹا۔ جمیلہ نے لالٹین نیچے کر لی۔ اطمینان کی سانس لی، مسکرا کر بولی "جیرے! تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔"

جیرا نے کچھ نہ کہا۔ گم صم کھڑا رہا۔ جمیلہ نے زور دے کر پوچھا "جیرے! تو اس سمے کہاں سے آ رہا ہے؟"

"میں اپنی گھر والی لاڈو کو لینے سلیمان پور گیا تھا۔"

"تو اسے اپنے ساتھ نہیں لایا؟" جمیلہ نے دریافت کیا؟ کہاں ہے وہ؟"

"بھین جی، تینوں پتہ ہی ہے۔ وہ دونوں بچے چھوڑ کر اسلم کے ساتھ چلی گئی۔" جیرا نے دبی زبان سے کہا۔

" بیں نوں پتہ ہے، بالکل پتہ ہے۔ تیرا پیو میرے پاس آیا تھا۔ اس سے دیر تک گل بات ہوئی تھی۔ وہ اسے لینے سلیمان پورہ بھی گیا تھا۔ اَگے کا مجھے پتہ نہیں۔ نہ دین محمدّ نے کچھ بتایا اور نہ تیری ماں تے۔ دونوں میں سے کوئی بھی میرے پاس نہ آیا۔"

" آکر کرتے بھی کیا۔" بھیرا تیکھے لہجے میں بولا۔" اس نے واپس آنے سے صاف انکار کر دیا۔"

" پر تیرے پیو دین محمدّ کو بتانا تو چاہیے تھا۔" جمیلہ نے نرم لہجے میں کہا۔" وہ میرے پاس آتا تو اَگے کی سوچی جاتی۔ لاڈو کو واپس لانے کے لیے کوئی اپائے کیا جاتا۔ وہ تیری گھر والی ہے۔ تیرا اس پر ادھیکار ہے۔ اسے تیرے پاس آنا چاہیئے۔ بچے بھی اس کے بناں بہت پریشان ہوں گے۔"

" بہت تنگ کرتے ہیں جی۔ چھوٹے چھوٹے نکّے ہی تو ہیں۔ بہت ضد کرتے ہیں جی۔ ہر دم روتے رہتے ہیں بھین جی! تجھ سے اب کیا بتاؤں۔"

" بیں نوں پتہ ہے۔ ضرور تنگ کرتے ہوں گے۔" جمیلہ نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔" پر لاڈو کیسی ماں ہے۔ اسے اپنے بچے بھی یاد نہیں آتے۔ اس کی ممتا بھی نہیں جاگی۔"

" اسے تو جی کسی کی یاد نہیں آتی۔ تین مہینے سے اوپر ہو گئے۔ سب نے مشورہ دیا۔ تھانے میں پرچہ چاک کرا دو۔ پر میرے پیو نے منع کر دیا۔ خود اسلم کے گھر گیا۔ لاڈو سے مِلا۔ سمجھاتے بجھانے کی کوشش کی پر وہ آنے پر راضی نہیں ہوئی۔ دوبارہ چاچا کو لے کر گیا۔ اس نے ملنے اور گل بات کرنے سے بھی انکار کر دیا۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔" آج دوپہر مجھے پتہ چلا کہ وہ کل سویرے کی گڈّی سے اسلم کے ساتھ کراچی جا رہی ہے۔ اپنے پنڈ سے بھاگنے کی تیاری اسلم چپکے چپکے کر رہا تھا پر مجھے کسی نہ کسی طرح ملوم ہو گیا۔" اس نے قدرے تامل کیا پھر جمیلہ کو بتایا۔" بیں آج طے کر کے سلیمان پورہ گیا تھا کہ لاڈو کو اپنے ساتھ لے کر ہی آؤں گا۔" بولتے بولتے اچانک اس کا لہجہ تند اور تیکھا ہو گیا۔" پر اب وہ کبھی نہیں آئے گی۔"

"کیوں نہیں آئے گی؟" جمیلہ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "تُو نے ایسا کیسے سوچا؟"
جیرا کا چہرہ کرخت ہو گیا، آنکھوں سے جیسے چنگاریاں نکلنے لگیں، منہ بگاڑ کر بولا۔
"میں اسلم کے گھر اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ گیا۔ یار دوستوں کو پہرے پر لگایا۔ گھوڑی بڑھا کر آنگن کی دیوار کے ساتھ کھڑی کی۔ دیوار پر پہنچا اور دھیرے سے کود کر اندر چلا گیا۔" اس کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ "لاڈو اپنے یار اسلم کے ساتھ لیٹی تھی۔ دونوں کو دیکھتے ہی میں پاگل ہو گیا۔" جیرا نے دوہر کے اندر سے ہاتھ نکالا۔ اس میں خون سے لتھڑی ہوئی چھری دبی تھی۔

لال لال خون دیکھ کر جمیلہ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ رحیم داد بھی دہشت زدہ ہو گیا۔ ناجو نے چیخنے کے لیے منہ پھاڑا مگر آواز نہ نکلی۔ جیرا خون آلود چھری ہاتھ میں دبائے تینوں کے عین سامنے، گز، سوا گز کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ وہ اس وقت بہت خونخوار نظر آ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر چھری سامنے کر دی۔ "میں نے جی، اس سے دونوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ اس وقت تک وار کرتا رہا جب تک وہ بالکل ختم نہ ہو گئے۔" جیرا نے گہری سانس بھری اور جمیلہ کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگا۔

"جیرے! تُو نے یہ بہت بُرا کیا۔" جمیلہ اب سنبھل چکی تھی۔ اس نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ ایسا کر کے تجھے کیا ملا؟"

"جو ہونا تھا جی، وہ ہو گیا۔" اس کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔

"یہ کب کی گل ہے؟" جمیلہ نے پوچھا۔

"سیدھا سلیمان پورے سے آ رہا ہوں۔" جیرا نے مطلع کیا۔ "میں اپنے گھر جا رہا تھا۔ اب نہیں جاؤں گا۔ بھین جی، تو میرے پیو کو بتا دینا کہ تیرے پتر نے اپنی بے عزتی کا حساب چکا دیا۔ اب وہ پنڈ میں گردن اونچی کر کے چلے گا۔"

جمیلہ کا چہرہ بدستور پریشان تھا۔ "تُو کچھ ہی کہہ، جیرے تو نے یہ اچھا نہیں کیا۔"

جیرانے کچھ نہ کہا۔ آگے بڑھا، جُھکا، جمیلہ کے پیروں کو چھو کر عاجزی سے بولا "بہن مجھے معاف کر دینا" وہ چند لمحے گردن جھکائے جمیلہ کے سامنے کھڑا رہا۔ پھر اس نے دوہر سے اپنے چہرے کو ڈھاٹا باندھ کر چھپایا۔ گھوڑے کی طرف بڑھا اور اچھل کر اس پر سوار ہو گیا۔

جمیلہ نے گھبرا کر ٹوکا "جیرے اب تو کہاں جا رہا ہے؟"

"سوئے کے کنارے میرا یار ملکان انتظار کر رہا ہے۔ میں اس کے پاس جا رہا ہوں" جیرانے بتایا "وہ بھی میرے ساتھ سلیمان پور سے گیا تھا"

"پر تو اس کے ساتھ کہاں جائے گا؟"

"ملکان کو اس کے گھر بھیج دوں گا" جیرانے جمیلہ کی جانب دیکھے بغیر کہا "میں تھانے چلا جاؤں گا"

جمیلہ نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ چیخ کر بولی "جیرے ٹھہر جا۔ میری گل تو سن"

مگر جیرانے کچھ نہ سنا۔ اس نے گھوڑے کو موڑا، ایڑ لگائی اور جس طرف سے آیا تھا اسی طرف گھوڑے کو تیزی سے دوڑاتا ہوا آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ رحیم داد، جمیلہ اور ناجو سکتے کے سے عالم میں کھڑے رہے اور رات کے سنّاٹے میں دور ہوتی ٹاپیں سنتے رہے۔ آخر وہ بھی گہری خاموشی میں تحلیل ہو کر ختم ہو گئیں۔

جمیلہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا "کیسا گبھرو جوان ہے۔ غصّے میں پاگل ہو کر ہتیا کر بیٹھا"

"اور کیا کرتا" رحیم داد نے گردن اونچی کرتے ہوئے کہا "اس کی جگہ اگر میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔ عزت اور آن بھی تو کچھ ہوتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں، جیرا حوصلے والا اور جی دار جوان ہے"

"چوہدری، چھوڑ اس جی داری شی داری کو۔ اس میں کیا دھرا ہے" جمیلہ نے

جل کر تیکھے لہجے میں کہا۔" کوئی جگیردار اور وڈا زمیں دار کسی بھی زنانی کو اٹھوالے۔ اسے رکھیلی بنا کر رکھے۔ بچے جنوائے۔ تب نہ عزت یاد آتی ہے نہ آن اور آبرو۔ ساری جی داری دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ اس کے تو پیر پکڑتے ہیں، منتیں کرتے ہیں، گڑگڑاتے ہیں کہ میرا بازو واپس دے دے۔" اس کا لہجہ اور تلخ ہوگیا۔ چہرے پر جھنجلاہٹ بکھر گئی۔" دھتکارے جاتے ہیں، گالاں سنتے ہیں۔ بار بار جا کر ہاتھ جوڑتے ہیں، پیروں پر پگڑی ڈال دیتے ہیں اور عام طور پر رکم ادا کر کے واپس لاتے ہیں۔" اس نے منہ بگاڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔" ایک طرف تو عزت اور آن کا یہ حال ہے اور دوسری طرف اپنی ہی طرح کا مزارع یا کمّی بھگا لے جائے تو جھٹ عزت اور آبرو جاگ اٹھتی ہے۔ تب جی داری بھی دکھاتے ہیں۔ کتل کرتے ہیں اور پھانسی کے پھندے پر لٹک جاتے ہیں۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ وہ جمیلہ کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر مرعوب ہوگیا تھا جمیلہ نے لالٹین ناجو کو دے دی۔ آگے بڑھی۔ رحیم داد اور ناجو نے بھی قدم بڑھائے۔ تینوں گاؤں میں پہنچے اور گلیوں سے گزرتے ہوئے موچی کے دروازے پر جا کر ٹھہر گئے۔

جمیلہ نے رحیم داد سے کہا۔" چوہدری! اب تو جا۔ میں یہاں سے جیرا کے پیو دین محمد کے گھر جاؤں گی۔ اسے ساری گل بات بتاؤں گی۔"

" میں بھی تیرے ساتھ دین محمد کے گھر چلا جاؤں گا۔ تو اکیلی کیسے اتنی رات کو واپس آئے گی۔"

" مجھے دیر لگ جائے گی۔ تو واپس حویلی جا۔" جمیلہ نے نرمی سے کہا۔" میری چنتا نہ کر۔ میں موچی کے ٹبّر کے ساتھ آجاؤں گی، ویسے چوہدری، یہ میرا اپنا پنڈ ہے۔ مجھے یہاں ڈر نہیں لگتا۔ میرے لیے اِدھر دن رات سب برابر ہے۔"

رحیم داد نے مزید اصرار نہ کیا۔ خاموشی سے پلٹا اور اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ حویلی پر پہنچا۔ پہریدار جاگ رہا تھا۔ اس نے پھاٹک کھولا۔ رحیم داد اندر داخل ہوا اور اپنے کمرے میں جا کر بستر پر ٹانگیں پسار کر لیٹ گیا۔ وہ

نڈھال اور تھکا ہوا تھا۔ اس کے ذہن پر جیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ جب تک جاگتا رہا اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔

☆

نادر خاں دوسرے روز بھی واپس نہ آیا۔ تیسرا روز گزرا، چوتھا گزرا۔ کئی روز گزر گئے۔ مگر وہ نہ آیا۔ جلیل کی بھی کوئی خیر خبر نہ ملی۔ جمیلہ پریشان تھی۔ زینت اس سے بھی زیادہ پریشان تھی۔ وہ ہر وقت روتی رہتی۔ جمیلہ اسے تسلّی دیتے دیتے خود بھی رونے لگتی۔ جنت موجود ہوتی تو تینوں مل کر روتیں۔

رحیم داد بھی پریشان تھا مگر زینت اور جمیلہ کی پریشانی نے اور پریشان کر دیا تھا۔ جمعہ کو دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے نامدار کے ہمراہ دیپال پور جانے کا منصوبہ بنایا۔ تانگہ آچکا تھا۔ رحیم داد حویلی سے نکل کر اس میں سوار ہونے جا رہا تھا کہ منصب داد بھاگتا ہوا آیا۔ وہ بھی حویلی کا ملازم تھا۔ اس نے نادر خاں کے واپس آنے کی اطلاع دی۔ رحیم داد واپس اپنے کمرے میں آگیا۔

نادر خاں کے ہمراہ جلیل بھی تھا۔ دونوں رحیم داد کے کمرے میں پہنچے۔ رحیم داد ان کا بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ اس نے جلیل کو دیکھا۔ وہ چھریرے بدن کا جوان تھا۔ عمر تیس سال سے نکلتی ہوئی تھی۔ رنگ گندمی تھا۔ صورت شکل بھی گوارہ تھی۔ قد اونچا تھا۔ مگر بیمار اور پریشان حال نظر آتا تھا کم گو بھی تھا۔

جمیلہ اس وقت اسکول میں تھی اور زینت کو بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

"نادر! تو نے اتنی دیر کہاں لگا دی؟" رحیم داد نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا "ادھر تیری گھر والی نے رو رو کے بُرا حال کر ہی لیا تھا۔ جمیلہ اور زینت بھی اس کے ساتھ رونے پیٹنے میں شریک ہو جاتیں۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "نادر، تو نے بہت پریشان کیا۔ میں تیری تلاش میں نکلنے ہی والا تھا۔ دیپال پور جا رہا تھا۔ تو نے

حویلی کے پھاٹک پر تانگہ بھی کھڑا دیکھا ہوگا۔"

"مجھے پتہ تھا، اِدھر سب پریشان ہوں گے۔" نادر خاں نے دبی زبان سے کہا۔

"جب تئیں نوں پتہ تھا کہ سب پریشان ہوں گے، تب بھی تُو نے اتنی دیر کر دی۔ کیا کرتا رہا؟" رحیم داد نے اسے گھور کر دیکھا۔ "تُو نے ٹھیک نہیں کیا۔ ایک روز کے لیے کہہ کر گیا اور ہفتہ بھر بعد لوٹا۔"

"کیا کرتا جی۔ یہ لہور گیا تھا۔" نادر خاں نے جلیل کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "مجھے اس کا انتظار کرنا پڑا۔ سوچا، اب آیا ہوں تو اسے مل تو لوں۔ دیپال پور میں میرا ایک پرانا یار ہے۔ عبدالصمد۔ اسی کے ساتھ ٹھہرا تھا۔"

رحیم داد نے جلیل کو نظر بھر کر دیکھا۔ پھر مڑ کر نادر کی طرف متوجہ ہوا۔ "یہ کب لہور سے واپس آیا؟"

"کل رات ہی آیا تھا جی۔" نادر خاں نے بتایا۔ "میں نے اسے کہا تو یہ چلنے کو تیار بھی ہو گیا۔ ہم دونوں سویرے ہی سویرے روانہ ہو گئے تھے۔" نادر خاں نے لمحہ بھر کے لیے تامّل کیا، پھر دریافت کیا۔ "چوہدری! تو کب واپس آیا؟"

"جس روز تو دیپال پور گیا، بس اسی شام لوٹا تھا۔"

نادر خاں بہت تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی بیوی جنت کو اس کی واپسی کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ دو بار ناراں کو اور اپنی بچی کو بھیج چکی تھی۔ ہر بار نادر سے گھر پہنچنے کا تقاضہ کیا جاتا۔ آخر رحیم داد نے زچ ہو کر نادر خاں سے کہا۔

"نادر تو جا۔ تیری گھر والی تیرے لیے بہت بے چین ہے۔"

نادر خاموشی سے اٹھا اور کمرے سے چلا گیا۔ جلیل کرسی پر گم صم بیٹھا رہا۔ اس کی نگاہیں بار بار دروازے کی جانب اٹھ جاتیں۔ رحیم داد اس کی بے قراری کا سبب فوراً بھانپ گیا۔ مسکرا کر بولا۔ "جلیل! لگتا ہے تو زینت کے لیے بہت بے چین ہے۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "یہ بتا۔ تو اسے اپنے ساتھ لے جائے گا؟"

"آیا تو جی بالکل اسی ارادے سے ہوں"۔ جلیل نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔"پر زینت ہے کہاں؟"

"وہ بھی آجائے گی"۔ رحیم داد زیرِ لب مسکراتا رہا۔ اسے جلیل کی بے قراری میں لذت محسوس ہو رہی تھی۔"اب تو اتنا بے تاب ہو رہا ہے، پہلے اس کی یاد نہ آئی"۔

"میں تو جی یہ سمجھے ہوئے تھا کہ وہ ابھی تک اپنے خاندان والوں کے پاس فیروز پور میں ہوگی۔ اس کی واپسی کی امید تو بالکل ختم ہو چکی تھی۔ ایک بار سرحد پار جانے کے بعد کون مغویہ واپس آسکتی ہے۔ یہ تو بالکل انہونی بات ہے"۔ جلیل نے وضاحت کی۔"نادر خاں نے مجھے زینت کے بارے میں بتایا تو پہلے مجھے اس بات پر اعتبار ہی نہ آیا"۔

"تجھے یہ بھی پتہ ہے کہ سرحد پار سے واپسی کے بعد وہ سال بھر تک کسی اور کے پاس تھی؟ بلکہ اس کے بچے بھی ابھی تک اس کے پاس ہیں"۔ رحیم داد نے اس کا عندیہ معلوم کرنے کے لیے صاف گوئی سے کام لیا۔"تجھے یہ بھی ملوم ہونا چاہیے کہ پیراں والہ کے زمیں دار سید احسان علی شاہ نے زینت کو اٹھوا کر اپنی حویلی کے کوٹ میں رکھیل بنا کر رکھ چھوڑا تھا۔ وہ وہاں سے کسی نہ کسی طرح بھاگ کر ادھر پہنچی ہے"۔

"نادر خاں، کل رات زینت کے بارے میں مجھے سب کچھ بتا چکا ہے"۔ جلیل نے پرسکون لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر نہ جھنجلاہٹ تھی اور نہ ہی کسی قسم کی کدورت نظر آتی تھی۔"نادر نے کوئی بھی گل بات مجھ سے بالکل نہیں چھپائی۔ سب کچھ صاف صاف بتا دیا"۔

"اچھا ہی کیا اس نے"۔ رحیم داد نے مطمئن ہو کر کہا۔"لگتا ہے تو نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر زینت کو لے جانے کا فیصلہ کیا ہے"۔

"بات یہ ہے جی، مجھے زینت سے تب شکایت ہوتی جب اس کا اپنا کوئی کصور ہوتا"۔ جلیل بڑے اعتماد سے گویا ہوا۔"وہ تو حالات کا شکار ہوئی۔ گیند کی طرح ایک ہاتھ سے دوسرے میں جاتی رہی"۔ اس کے لہجے میں دبا دبا کرب تھا۔"زینت پر جو کچھ بیتی

اسے میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔"

"تو مہاجر تو نہیں ہے؟" رحیم داد نے اس کی بات سن کر معاً سوال کیا۔

" ویسے تو جی میں شیخوپورہ کا رہنے والا ہوں پر جب فسادات کی آگ بھڑکی تو میں ملازمت کے سلسلہ میں کرنال میں تھا۔ گھر والے بھی ساتھ تھے۔" جلیل نے سنبھل سنبھل کر بتایا۔" ماں تھی، چھوٹا بھائی تھا، دو جوان بہنیں تھیں۔ میرا پیو پہلے ہی مر چکا تھا۔" اس نے گہری سانس بھری۔" ستمبر ۱۹۴۷ء کا مہینہ تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے۔ سکھوں اور ہندوؤں کے حملوں سے تنگ آکر میں گھر والوں کے ساتھ بچ بچا کر حصار پہنچ گیا۔ وہاں بھی حالات خراب تھے اور روز بروز بگڑتے ہی جا رہے تھے۔ حملے ہوتے، آگ لگائی جاتی۔ خون خرابہ ہوتا۔ آخر کسی نہ کسی طرح میں ریلیف کیمپ پہنچ گیا۔ گھر سے نکلتے ہی بلوائیوں نے اس میں آگ لگا دی۔ میں نے دور سے اپنے گھر کو شعلوں میں جلتے ہوئے دیکھا۔ کیا بتاؤں وہ کتنی بھیانک رات تھی۔"

" کیمپ میں پہنچ کر تو سب بچ گئے ہوں گے۔" رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

" میں صرف اکیلا کیمپ میں پہنچ سکا تھا۔" جلیل کا چہرہ مرجھا گیا۔ آواز میں رقّت پیدا ہوگئی۔" راستے میں بلوائیوں نے حملہ کر دیا۔ ماں اور چھوٹا بھائی میرے سامنے مارے گئے۔ ان کی لاشوں کے درمیان میں خون میں ڈوبا ہوا پڑا تھا۔ بلوائی دونوں بہنوں کو اٹھا کر لے جانے لگے تو وہ مجھے مدد کے لیے پکارنے لگیں۔ میں اُن کی آہ و زاری سنتا رہا۔ انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پر مجھ میں تو اٹھنے کی بھی ہمت نہ تھی۔ زخموں سے چور چور ہو رہا تھا۔" اس کا لہجہ اور رقّت آمیز ہوگیا۔" مر جاتا تو اچھا ہی تھا۔ پر اللہ کو یہ منظور نہ تھا۔" وہ لمحہ بھر تک گردن جھکائے خاموش بیٹھا رہا، پھر اس نے بتایا۔" بعد میں دوسرے زخمیوں کے ساتھ نہ جانے کس طرح کیمپ میں پہنچا۔ وہیں مرہم پٹی ہوئی۔ میں نومبر تک ریلیف کیمپ میں رہا۔"

" اس کا مطلب یہ ہوا کہ کیمپ محفوظ رہا۔"

" روز ہی اس پر حملے کی خبریں ملتی تھیں، پر حملہ نہ ہو سکا۔" جلیل نے رحیم داد کو مطلع کیا۔" ویسے کئی دوسرے مسلمان افسروں کے علاوہ حصار کا ڈپٹی کمشنر بھی مسلمان تھا۔"

" اسی نے مسلمانوں کو حملہ کرنے والوں سے بچائے رکھا ہوگا۔" رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

" توبہ کرو جی۔" جلیل کے چہرے پر جھنجلاہٹ بکھر گئی۔" مسلمان وفد بنا کر اس کے پاس گئے۔ میں بھی اس میں شامل تھا۔ ڈپٹی کمشنر کو سکھوں اور ہندوؤں کے ظلم وستم بتائے۔ پولس کے بارے میں آگاہ کیا کہ ہندو اور سکھ پولس والے کس طرح کھلم کھلا ہندوؤں اور سکھوں کی حمایت کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو اندھا دھند گولیاں چلا کر ہلاک کر رہے ہیں۔ اس کے دفتر میں کانگریس اور جن سنگھ کے کئی نیتا بھی بیٹھے تھے۔ ان کے سروں پر یہ لمبی لمبی بودیاں تھیں۔ ماتھے پر تلک تھے۔ وہ بھی اس سے ملنے آئے تھے۔" جلیل کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔" انہیں خوش کرنے کے لیے ڈپٹی کمشنر نے مسلمانوں کے وفد کو غصے سے گھور کر دیکھا۔ منہ بگاڑ کر بولا۔ تم نے پاکستان مانگا تھا۔ اس کی خاطر مسلم لیگ کو الیکشن میں ووٹ دے کر کامیاب بنایا تھا۔ اب پاکستان بن گیا۔ جاؤ اپنے پاکستان۔ یہاں کیوں پڑے ہو۔ اس نے تو مدد کیا کرنی تھی۔ اُلٹی مسلمانوں کو دھمکیاں دیں۔ سخت ناراض ہوا۔"

" وہ کیسا بندہ تھا۔" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر اپنے فوری ردِ عمل کا اظہار کیا۔ " اُسے اپنے مسلمان بھائیوں کا ذرا بھی خیال نہ آیا۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔" ہندوؤں کے سامنے نمبر بڑھانے کے لیے اس نے ایسا کیا ہوگا۔"

" ایسا ہی ہوگا جی۔" جلیل نے رحیم داد سے اختلاف رائے نہ کیا۔ اس کے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوا۔" لیکن ہندوؤں اور سکھوں کی چاپلوسی اور خوشامد کے بعد بھی وہ وہاں ٹک نہ سکا۔ وہ آئی سی ایس تھا اور جلندھر کا رہنے والا تھا۔"

" کہاں گیا وہ؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"حصار سے وہ دہلی گیا۔ وہاں سے وہ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر بال بچوں اور مال اسباب کے ساتھ آرام سے پاکستان پہنچ گیا۔ وہاں ڈپٹی کمشنر تھا یہاں پہنچ کر زیادہ وڈا افسر لگ گیا۔"

"کبھی تجھے ملا بھی؟"

"نہیں۔" جلیل نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔" پر سنا ہے پہلے سشن جج ہوتا تھا اب ترقی کر کے ہائی کورٹ کا جج بن گیا ہے۔"

"حد ہو گئی جی۔" رحیم داد نے اس کی باتوں سے متاثر ہو کر کہا۔" پر جلیل، تو نے بہت دکھ سہے۔ تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔"

"سب کچھ ختم ہو گیا۔ گھر بار۔ ماں، بھائی بھینیں سب بچھڑ گئے۔ کوئی بھی تو نہ رہا۔"

"تیری بھینوں کا کیا بنا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔" ان کا پتہ چلانے کی تو نے کوشش نہیں کی؟"

"چوہدری! یہ نہ پوچھ۔" جلیل بے زاری سے بولا۔" تجھے کیا کیا بتاؤں۔"

"جلیل! میں بھی تیری ہی طرح مہاجر ہوں۔" رحیم داد نے جلیل کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے متوفی چوہدری نور الٰہی کی المناک داستان اپنی آپ بیتی بنا کر سنائی۔" فسادات اور بلوے ہوئے تو میں ضلع گورداس پور کے موضع نصیر پور میں ہوتا تھا۔ پٹیالہ کی ریاستی فوج نے سکھوں اور ہندوؤں کے ساتھ نصیر پور پر حملہ کیا تو رات کے اندھیرے میں کسی نہ کسی طرح سارے ہی مسلمان نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ کافلہ بنا کر نر یموں کے پتن پر پہنچے۔ وہاں بھی حملہ ہوا۔ میرا پتر میری آنکھوں کے سامنے مارا گیا۔ جوان دھی کو حملہ آور اٹھا کر لے گئے۔ میں نے بیڑی میں بیٹھ کر راوی پار کیا اور پاکستان کی سرحد میں داخل ہو گیا۔ گھر والی اور بچے پیچھے رہ گئے۔ وہ بعد میں پہنچے۔ بس سنا ہی سنا ہے۔ انہیں بہت تلاش کیا پر اب تک نہ ملے۔" اس نے جلیل کے افسردہ چہرے کو دیکھا۔" تو کیسے ادھر پہنچا۔"

"میں جی ٹرین سے آیا تھا" جلیل نے بتایا "کیمپ سے دوسرے مہاجرین کے کافلے کے ساتھ نکلا اور ٹرین میں سوار ہو گیا۔ راستے بھر بلوائیوں کے حملے کا خطرہ منڈلاتا رہا پر پورا کافلہ خیریت سے لاہور پہنچ گیا۔"

"تو نے بعد میں اپنی بہنوں کا کھوج نکالنے کی کوشش نہیں کی؟"

"کی تھی۔ دو بار فوجیوں اور رضا کاروں کے ساتھ سرحد پار گیا۔ مردولہ سارا بھائی سے ملا۔ اسی کے والنٹیروں کی کوشش سے دونوں کا کھوج بھی لگا لیا تھا۔"

"اپنے ساتھ نہیں لایا انہیں؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"کیسے لاتا انہیں۔" جلیل نے دل گرفتہ ہو کر لمبی سانس بھری۔ "بڑی حصار ہی میں تھی۔ سٹیشن کے ساتھ موتی پورہ کی بستی ہے۔ وہاں ایک سکھ کانسٹیبل کے گھر میں ہے۔ اس کا نام منگل سنگھ ہے۔ وہ اس کا تیسرا گھر والا ہے۔ اس نے ملنے ہی نہ دیا۔ ہر بار جب میں مغویہ زنانیوں کی بازیابی کرنے والی پارٹی کے ساتھ اس کے گھر پر جاتا تو وہ اُسے پڑوس کے کسی مکان میں چھپا دیتا۔ ایک رات جب منگل سنگھ ڈیوٹی پر تھانے میں تعینات تھا میں اکیلا چھپتا چھپاتا اس کے گھر پر پہنچا۔ وہ مل گئی۔ گھر میں اکیلی ہی تھی۔ پر وہ میرے ساتھ چلنے پر راضی نہ ہوئی۔ منگل سنگھ سے اس کے ایک بچہ بھی ہو چکا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بچے کو دکھا کر بولی۔ اسے لے کر میں کس منہ سے وہاں جاؤں گی۔ میرے ساتھ جو ہونا تھا ہو گیا۔ تجھے خوا مخواہ بدنامی مول لینی ہوگی۔ میں نے اسے سمجھایا تو فکر نہ کر میں تیری خاطر سب کچھ برداشت کر لوں گا پر وہ نہ مانی۔ سمجھانے بجھانے کے ساتھ ساتھ منّت سماجت بھی کی۔ وہ سر جھکائے کچھ دیر چپ کر کے بیٹھی رہی پھر اپنے بچے کو بغل میں دبا کر ایسی تیزی سے باہر چلی گئی کہ میں دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں رک رک کر ایک ایک تفصیل بتاتا رہا۔ "بعد میں کئی بار کوشش کی پر وہ مجھے ملی ہی نہیں۔"

"چھوٹی کا کیا بنا؟"

"اب تجھے کیا بتاؤں چوہدری، اس کا کیا بنا۔ بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔" جلیل نے نظریں نیچی کر کے دبی زبان سے بتایا۔ "وہ کنجری بن گئی ہے۔ چکلے میں بیٹھتی ہے۔ ان دنوں تو جلندھر میں ہوتی تھی۔ جانے اب کہاں ہے۔ میں اسے ملنے ہی نہ گیا۔ کیا کرتا اسے مل کر۔" اس کی آواز میں درد کی کسک تھی۔ "ماں اور بھائی کی طرح دونوں بھینیں بھی مر جاتیں تو اچھا تھا۔ میں نے ہی ان کو مار دیا ہوتا تو ٹھیک تھا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ویسے بھی میرے لیے دونوں مر چکی ہیں۔ کبھی یاد بھی نہیں کرتا۔"

"بہت ظلم ہوا جی۔" رحیم داد بھی افسردہ ہو گیا۔ "تو نے ظلم دیکھا ہے اور اسے جھیلا بھی ہے۔ تب ہی تو نے زینت کو معاف کر دیا اور اسے لینے چلا بھی آیا۔"

"معاف تو جی میں نے اسے تب ہی کر دیا تھا جب وہ منا کمہار کے گھر سے بھاگ کر میرے پاس آ گئی تھی۔ میں اس زمانے میں چیچہ وطنی کے نزدیک سکھاں والا کے پرائمری سکول میں ماسٹر لگا تھا۔ منا میرے گھر کے پاس ہی رہتا تھا۔ ہر رات شراب پی کر نشے میں دھت ہو جاتا اور گندی گندی گالاں نکال کر زینت کو بہت بے رحمی سے مارتا پیٹتا۔ میں نے اور پاس پڑوس کے دوسرے رہنے والوں نے منع بھی کیا۔ سمجھایا بجھایا پر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا۔" جلیل آہستہ آہستہ بولتا رہا اور رحیم داد توجہ سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ "فیر ایسا ہوا جی ایک رات زینت منا کی مار کھاتے کھاتے ایسی بدحواس ہو گئی کہ پناہ لینے کے لیے بھاگ کر میرے گھر آ گئی۔ میں نے اسے واپس منا کے گھر بھیجنا چاہا تو میرے پیر پکڑ کر رونے لگی۔ مجھے بھی اس پر ترس آ گیا۔ اس رات کے بعد وہ دوبارہ منا کمہار کے گھر نہیں گئی۔"

"منا نے جھگڑا ٹنٹا تو نہیں کیا؟" رحیم داد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"وہ صبح میرے پاس آیا۔ ساتھ میں اس کے شریکے اور برادری والے بھی تھے۔" جلیل نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "لیکن زینت نے سب کے سامنے منا کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ رو رو کے منا کا ظلم و ستم بیان کیا۔ اس روز تو وہ چلے گئے پر دوسرے روز فیر آئے۔ کئی روز تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ زینت کسی طرح منا کے گھر جانے کے لیے تیار نہ تھی۔"

"کمہار نے تیرے خلاف تھانے میں اغوا کا پرچہ چاک نہیں کرایا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔ "زینت اس کی گھر والی تھی۔ تو اس کی مرضی کے خلاف زینت کو کیسے اپنے پاس رکھ سکتا تھا۔"

"وہ پولس کے پاس کیسے جاتا۔ ان دنوں مغویہ زنانیوں کی بازیابی کرنے والی سرکاری جماعتیں ہر طرف گھوم رہی تھیں۔ ہر طرح ان کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہی تھیں۔" جلیل نے وضاحت کی۔ "انہیں جیسے ہی کسی مغویہ کا پتہ چلتا فوراً چھاپہ مار کر اسے برآمد کیا جاتا اور سرکاری تحویل میں لے لیا جاتا۔ یہ بات منّا بھی جانتا تھا اور میں نے اسے خبردار بھی کر دیا تھا۔ اسی لیے اس نے زیادہ شور شرابا نہیں کیا۔ وہ بات چیت کے ذریعہ زینت کو واپس لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن جب وہ کسی طرح اس کے ساتھ جانے پر آمادہ نہ ہوئی تو ایک شام وہ اکیلا میرے پاس آیا۔" جلیل نے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔ "اس نے زینت کے عوض مجھ سے پانچ سو روپے مانگے۔ میرے پاس اتنے روپے نہیں تھے۔ میں نے تین سو ادھار لے کر کسی نہ کسی طرح اکٹھے کئے اور منّا سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں اس سے زیادہ کا بندوبست نہیں کر سکتا۔ وہ اسی پر راضی ہو گیا۔ اس نے روپے لے کر زینت کو طلاق دے دی۔ ایک بچّہ تھا وہ بھی دے دیا۔"

"بعد میں تو اس نے تجھے تنگ نہیں کیا؟"

"وہ بہت کمینہ اور گندہ بندہ تھا۔" جلیل نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "زینت کبھی گھر سے باہر نکلتی تو راستے میں اسے چھیڑتا۔ اُٹھا لینے کی دھمکی دیتا۔ میں نے جب یہ صورت دیکھی تو کوشش کر کے سکھاں والا سے اپنا تبادلہ رکن پور کرا لیا۔ وہیں عدّت کی مدّت پوری ہونے کے بعد میں نے زینت سے نکاح کر لیا۔ ہم دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ ایک پتّر بھی ہوا۔" اپنی بات کہتے کہتے دفعتاً اس کا چہرہ مرجھا کر راکھ ہو گیا۔ "زینت حاملہ تھی کہ انہی دنوں کسی نے مخبری کر دی۔ بازیابی کرنے والی سرکاری جماعت نے رات کو میرے گھر پہ چھاپا مارا۔ زینت کو بچوں کے ساتھ اپنی نگرانی میں سرحد پار پہنچا دیا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ اپنے چاچا کے پاس فیروز پور

گئی تھی۔ فیر مجھے اس کی کوئی خبر نہیں ملی پر میں کبھی اسے بھول نہ سکا۔

" ویسے میں تجھے یہ بتا دوں کہ وہ بھی تجھے بالکل نہیں بھولی"۔ رحیم داد نے ہنس کر جلیل کو بتایا۔" تجھ سے اتنا پیار کرتی ہے کہ تیرے ہی لیے چھپتی چھپاتی کسی نہ کسی طرح فیروز پور سے بھاگ کر پاکستان پہنچ گئی"۔

" سچی بات یہ ہے چوہدری اُدھر اس کا کوئی سگا ہے بھی نہیں۔ سارا ہی ٹبّر بلوائیوں کے ہاتھوں فسادات میں مارا گیا۔ ماں پیو، بھائی بھین، کوئی نہیں بچا"۔

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ جلیل بھی چپ رہا۔ وہ مڑ مڑ کر بے چینی سے دروازے کی سمت دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد باہر دالان میں آہٹ ابھری۔ رحیم داد نے دروازے کی جانب دیکھا۔ جمیلہ کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے زینت بھی تھی۔ جلیل اسے دیکھتے ہی بے قرار ہو کر کھڑا ہو گیا۔ زینت آنکھیں پھاڑے خوشی اور حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ آگے بڑھی اور جلیل کے بازو پر سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

جلیل اس کا سر ایک ہاتھ سے ہولے ہولے تھپکتے ہوئے تسلّی دینے لگا" اس طرح نہ رو زینت"۔ یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھی چھلک پڑیں، پلکیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ جمیلہ اور رحیم داد گم صم تھے اور دونوں کو تک رہے تھے۔ لیکن جمیلہ زیادہ دیر خاموش نہ رہی۔ رحیم داد کو مخاطب کرتے ہوئے بولی" لے چوہدری! دیکھ لے۔ زینت ٹھیک ہی کہتی تھی ناں"۔ وہ زیرِ لب مسکراتی ہوئی زینت کے پاس گئی۔ اس کا بازو تھاما، اپنے قریب کیا اور سینے سے لگا کر دل جوئی کرنے لگی" رونا دھونا چھوڑ۔ اوپر کمرے میں جا۔ منہ ہاتھ دھو۔ کپڑے لتّے تبدیل کر۔ جلیل یہیں رہے گا۔ مہمان خانے میں ٹھہرے گا۔ تو بھی اس کے ساتھ ہی رہنا۔ جی بھر کے باتیں کرنا"۔

زینت کچھ نہ بولی۔ مڑی اور آنسو پونچھتی ہوئی باہر چلی گئی۔

۴۳

دن ڈھل رہا تھا۔ دھوپ پھیکی پڑ گئی تھی۔

رحیم داد اور جلیل کمرے میں خاموش بیٹھے تھے۔ قریب ہی جمیلہ ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ جلیل کے چہرے سے اطمینان اور سکون نمایاں تھا۔

جمیلہ نے نظریں اٹھا کر جلیل کو دیکھا۔ آہستہ سے پوچھا "جلیل! اب تیرا کیا ارادہ ہے؟"

"میں تو جی زینت کو لینے آیا ہوں۔" اس نے نہایت اعتماد سے اپنے ارادے کا اظہار کیا۔

"ضرور لے جا زینت کو۔ تجھے بلایا ہی اسی لیے ہے۔" جمیلہ نے مسکرا کر کہا۔ "پر بچوں کے بارے میں تو نے کیا سوچا؟ وہ تو احسان شاہ کے مزارع سلامو کے پاس ہیں۔"

جلیل نے بتایا "نادر خاں اس بارے میں مجھے پہلے ہی بتا چکا ہے۔ اور یہ بھی بتا چکا ہے کہ زینت بچوں کے لیے کتنی پریشان اور غم زدہ ہے۔"

جمیلہ نے مڑ کر رحیم داد کی جانب نظریں گھمائیں۔ "چوہدری! تو نے احسان شاہ کے پاس جانے کے بارے میں کیا سوچا؟ مجھے آشا ہے، تیرے کہنے پر وہ سلامو سے زینت کے بچے واپس دلا دے گا۔"

"مجھے اس کے پاس نہ بھیج۔" رحیم داد نے انکار کر دیا۔ "مجھے ڈر ہے، کوئی گڑبڑ نہ پڑ جائے۔" اس نے جلیل کو مخاطب کیا۔ "جلیل تو بتا، بچوں کو کیسے واپس لائے گا۔ تو

احسان شاہ کے پاس جاسکتا ہے؟"

جلیل کے بولنے سے پہلے ہی جمیلہ نے کہا۔" چوہدری! اسے احسان شاہ کے پاس نہ بھیج۔ اسے دیکھ کر تو وہ سخت ناراض ہوگا۔ غصے سے بھڑک اُٹھے گا۔ فر تو وہ ضرور گڑبڑ کرے گا۔ مجھے اچھی طرح پتہ ہے وہ کتنا خطرناک بندہ ہے۔"

" میں تو جی احسان شاہ کو بالکل ہی نہیں جانتا۔ نہ کبھی اس کے پنڈ گیا اور نہ ہی کبھی اس سے ملا۔" جلیل نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ چپ بیٹھا رہا۔ وہ احسان شاہ کے پاس جانے اور زینت اور اس کے بچوں کے بارے میں بات کرنے سے کترا رہا تھا۔ مراد خاں شاہانی کی زبانی رحیم داد پہلے ہی سن چکا تھا کہ زینت احسان شاہ کو بہت پسند تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ کوٹ سے زینت کے فرار ہونے پر وہ سخت برہم ہوگا۔ عین ممکن ہے کہ رحیم داد سے بھی خفا ہو جاتا کہ اس نے اپنی حویلی میں زینت کو پناہ کیوں دی۔ وہ احسان شاہ سے کسی طور بگاڑ پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

جمیلہ نے رحیم داد کو خاموش پایا تو اسے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔" چوہدری، ایسے تو کام نہیں چلے گا۔ زینت کے بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ وہ ان کے بنا کیسے شانت رہ سکتی ہے۔ انہیں یاد کر کے ہر سمے روتی رہتی ہے۔"

" اپنی سمجھ میں تو ایک گل آتی ہے۔" جلیل نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔" دیپال پور کا تھانے دار، زماں خاں، مجھ پر بہت مہربان ہے۔ میں اس کے بچوں کو پڑھاتا ہوں۔ وہ ہمیشہ مجھ سے محبت اور پیار سے پیش آتا ہے۔" اس نے جمیلہ کی جانب دیکھا۔" زیں دارنی! تیرا مشورہ ہو تو میں تھانے دار زماں خاں سے بچوں کی واپسی کے لیے بات کروں۔ اُمید تو یہی ہے کہ وہ میری ضرور مدد کرے گا۔"

" یہ ٹھیک رہے گا۔" رحیم داد نے اپنا پیچھا چھڑانے کی غرض سے جھٹ جلیل کی تائید کی۔" احسان شاہ سے اگر تھانے دار نے کہا تو وہ اس کی بات ٹالے گا نہیں۔

"میں نے تو اس کے بارے میں یہی اندازہ لگایا ہے کہ وہ تھانے دار اور دوسرے سرکاری افسروں کو ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔" اس نے جمیلہ کی طرف دیکھا۔" ویسے زمیں دارنی اگے تیری مرضی۔"

جمیلہ نے رحیم داد کو نظر انداز کرتے ہوئے جلیل کو مخاطب کیا۔"جلیل، اگر تجھے وشواس ہے کہ تھانے دار زماں خاں تیری ضرور مدد کرے گا تو بچوں کی واپسی کے لیے اس سے ضرور بات کر۔"

"میں کل ہی دیپال پور چلا جاؤں گا اور تھانے دار سے بچوں کی واپسی کے لیے بات کروں گا۔" جلیل نے اپنے ارادے سے جمیلہ کو آگاہ کیا۔" ویسے بھی میں نے کل ہی واپس جانا ہے۔ پرسوں انسپکٹر آف سکولز معائنے کے لیے آرہا ہے۔ ہیڈ ماسٹر نے تاکید سے کہا ہے کہ معائنے پر میں ضرور حاضر رہوں۔ بعد میں لمبی چھٹی لے کر آجاؤں گا۔"

رحیم داد نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔" تو کل صبح ضرور چلا جا۔ تھانے دار کی منت سماجت کر کے راضی کر لینا۔ اس نے تیرے بارے میں احسان شاہ سے کہا تو وہ انکار نہیں کرے گا۔ مجھے اتنا تو پتہ ہے احسان شاہ تھانے دار کی بات آسانی سے ٹال نہیں سکتا۔"

نادر خاں بھی آگیا۔ وہ نہا دھو کر اور اجلے کپڑے پہن کر آیا تھا۔ جمیلہ نے اسے دیکھتے ہی جلیل کی جانب اشارہ کیا۔"نادر! اسے مہمان خانے میں لے جا۔ یہ وہیں ٹھہرے گا۔" وہ جلیل کی طرف متوجہ ہوئی۔" اب تو جا۔ بہت تھکا ہوا لگ رہا ہے۔ زینت کچھ دیر بعد تیرے پاس پہنچ جائے گی۔"

جلیل خاموشی سے اٹھا اور نادر خاں کے ہمراہ مہمان خانے کی جانب چلا گیا۔

جمیلہ نے رحیم داد سے کہا۔" تھانے دار زماں خاں نے جلیل کی مدد کرنے کی ہامی بھر دی تو ضرور کام بن جائے گا۔"

"جلیل تو کہتا ہے کہ تھانے دار اس کی ضرور مدد کرے گا۔" رحیم داد بولا۔" ویسے

سچی بات یہ ہے زیبی دارنی کہ اب میں احسان شاہ کے پاس جانا اور اس سے ملنا نہیں
چاہتا۔ وہ گندہ اور خطرناک بندہ ہے۔"

"بہت خطرناک اور گندہ ہے۔" جمیلہ نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "میرا من تو یہی کہتا ہے
کہ اللہ وسایا کا قتل اسی نے کرایا۔ اس کے سوا اللہ وسایا کا کوئی دشمن تھا ہی نہیں۔"

"میں اسے اتنا ظالم نہیں سمجھتا تھا۔" رحیم داد نے اپنی صفائی پیش کی۔ "مجھے ذرا
بھی شبہ ہوتا کہ اللہ وسایا کے قتل میں احسان شاہ کا ہاتھ ہے تو کبھی اس سے نہ ملتا۔ ویسے
تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ زیبی دارنی، احسان شاہ نے کبھی میرے سامنے اللہ وسایا
کی برائی نہیں کی۔"

"چوہدری، تجھے پتہ نہیں احسان شاہ اس سے کتنا خار کھاتا تھا۔ اس کی جان کا
دشمن تھا۔" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اپنے کرندوں اور بدمعاشوں کے ذریعہ پہلے تو
پرانے مزارعوں کو بے دخل کر کے میرے پتا کی بہت سی آراضی پر کبضہ کر لیا۔ میرے اور
اللہ وسایا کے خلاف جھوٹے کیس بنوائے۔ وہ تو یہ حویلی اور ساری ہی آراضی ہتیا
لینا چاہتا تھا۔"

رحیم داد نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک کہہ رہی ہے تو۔ میں نوں
تو پہلے ان باتوں کا کچھ پتہ ہی نہ تھا۔"

"تو اس کے پاس پہنچ کیسے گیا؟" جمیلہ نے پوچھا۔

"مجھے تو ماکھا خوشامد کر کے اس کے پاس لے گیا تھا۔" رحیم داد نے اپنی صفائی
پیش کی۔ "میں نے اسے بہت ٹالا پر وہ میرے گلے پڑ گیا۔"

"وہ تجھے احسان شاہ کے پاس کیوں لے جانا چاہتا تھا؟"

"ماکھے کی گھر والی، سگراں، کو اٹھوا کر احسان شاہ نے اپنے کوٹ میں ڈال رکھا
تھا۔ پانچ سال سے وہ اس کی کید میں تھی۔" رحیم داد نے بتایا۔ "پتہ نہیں کس نے
ماکھا کو میرے پیچھے لگا دیا۔ وہ میرے پیر پکڑ کر منت کرنے لگا۔ چوہدری، میرا بازو ولا

دے۔ میں نے اس کے بارے میں اللہ وسایا سے بھی ذکر کیا تھا پر اس نے مجھے صاف صاف بتا دیا کہ احسان شاہ اس کی بات ماننے کی بجائے ماکھے کا اور دشمن ہو جائے گا۔ اس پر اور اس کی گھر والی دونوں پر بہت ظلم کرے گا۔ میں نے یہ بات ماکھا کو صاف صاف بتا دی تھی۔"

"تب تو اس نے تیرا پیچھا چھوڑ دیا ہو گا؟"

"نہیں جی، وہ فیر بھی لگا رہا۔" رحیم داد نے کہا۔ "میں اسے ڈانٹتا، پر وہ اتنا ڈھیٹ نکلا کہ چھپتا چھپاتا میرے پاس پہنچ ہی جاتا۔ میں ہر بار انکار ہی کرتا رہا۔ جب تو کیمبل پور، اللہ وسایا اور بچوں کے ساتھ شرفاں کے ویاہ میں شریک ہونے گئی تھی، انھی دنوں ایک شام میں گھوڑی پر بیٹھ کر نہر کی طرف نکل گیا۔ نہ جانے کدھر سے ماکھا آگیا۔ اس نے میرے پیروں پر پگڑی ڈال کر منت کی کہ میں احسان شاہ سے مل لوں اور اس کے بازو کو دلانے کی سفارش کروں۔ اسی وکھت احسان شاہ بھی اپنی گھوڑی پر آگیا۔ ماکھا تو اسے دیکھتے ہی درختوں کے پیچھے چھپ گیا۔ پر ماکھا کی خاطر مجھے احسان شاہ سے ملنا پڑا۔ وہ مجھے اپنی حویلی لے گیا۔" رحیم داد نے جمیلہ کی طرف دیکھا۔ "زینں دارنی، اس طرح میں احسان شاہ سے ملا۔"

"تیرے کہنے پر احسان شاہ نے ماکھے کی گھر والی واپس کر دی تھی؟"

"ہاں جی۔ اس نے میرے کہنے پر دوسرے ہی روز ماکھے کی گھر والی کو اس کے بچوں کے ساتھ واپس کر دیا تھا۔"

"تب تو مجھے وشواس ہے، تیرے کہنے پر وہ زینت کے بچوں کو بھی سلامو سے واپس دلا دے گا۔" جمیلہ نے زور دے کر کہا۔

"تو کہتی ہے تو احسان شاہ کے پاس چلا جاؤں گا۔ اس سے زینت کے بچوں کی واپسی کے لیے بات کروں گا۔ اگے اس کی مرضی۔" رحیم داد نے اس دفعہ جمیلہ کی بات مسترد نہ کی مگر ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا۔ "پہلے جلیل کو تھانے دار زماں خاں کے ذریعے کوشش

کر لینے دے اگر اس طرح کام نہ بنا تو میں احسان شاہ کے پاس چلا جاؤں گا۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔" زمیں دارنی تیری بات ٹالی بھی تو نہیں جاسکتی۔"

جمیلہ نے رحیم داد کی رائے سے اتفاق کیا۔" یہ ٹھیک رہے گا۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔" مجھے اب جانا ہے۔ زینت کو لے کر جلیل کے پاس جاؤں گی۔"

رحیم داد چپ رہا۔ جمیلہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے سے نکل کر دالان میں چلی گئی۔

✡

شام گہری ہو چکی تھی۔ دھندلکا ہر طرف پھیل چکا تھا۔ رحیم داد نے کھانا کھایا۔ دیر تک کرسی پر چپ بیٹھا رہا۔ نہ جمیلہ آئی اور نہ ہی نادر خاں۔ پہر رات گزری تو رحیم داد نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کیا۔ لیمپ کی لو دھیمی کی اور بستر پر لیٹ گیا۔

صبح دیپال پور جانے سے قبل جلیل اس کے کمرے میں پہنچا۔ کچھ دیر رحیم داد کے پاس بیٹھا رہا۔ جمیلہ بھی پہنچ گئی۔ زینت اس کے ہمراہ تھی۔ جلیل سب سے رخصت ہوا۔ تانگے میں سوار ہوا اور دیپال پور کی جانب روانہ ہو گیا۔

جلیل کو گئے ہوئے نو روز ہو گئے۔ دسویں روز وہ واپس آ گیا۔ بچوں کو اپنے ساتھ لایا۔ رحیم داد اس وقت کھیتوں پر گیا تھا۔ بوائی کے بعد وہ ربیع کی فصل کی دیکھ بھال سرگرمی اور لگن سے کر رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا جب اسے جلیل کے پہنچنے کی اطلاع ملی وہ بے چین ہو کر حویلی کی طرف واپس ہوا۔ مہمان خانے میں پہنچا۔ زینت اپنے بچوں کے ساتھ جمیلہ کے پاس بالائی منزل پر جا چکی تھی۔ جلیل مہمان خانے کے صحن میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ گرم جوشی سے بغل گیر ہوا۔ بیٹھنے کے لیے بڑی انکساری اور احترام سے کرسی پیش کی۔ رحیم داد مسکراتا ہوا بیٹھ گیا۔

اس نے پوچھا۔" سنا ہے تو بچوں کو لے آیا ہے؟"

" ہاں جی، لے ہی آیا۔" جلیل نے بتایا۔" زینت بچوں کو لے کر اوپر زمیں دارنی کے

پاس گئی ہے۔"

" پر تو نے بہت دیر لگا دی۔ کہاں رہا اب تک؟"

" وہ ایسا ہوا جی کہ میں یہاں سے جاتے ہی تھانے دار زماں خاں سے ملا۔" جلیل نے اپنی روداد سنائی۔" وہ حسبِ معمول مہربانی سے ملا۔ میں نے اسے زینت اور بچوں کے بارے میں بتایا۔ زینت کی واپسی کی اطلاع پر بہت خوش ہوا۔" اس نے نظریں جھکا لیں۔ لہجہ مدھم پڑ گیا۔" زینت کے بارے میں اسے پتہ تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ مجھے اس کے ساتھ اتنا پیار ہے کہ میں نے دیاہ کرنے کا ارادہ ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ تو چاہتا تھا کہ میں فوراً زینت کو دیپال پور اپنے گھر میں لے آؤں۔ پر میں نے زور دیا کہ بچوں کی واپسی کے بعد اسے لانا ٹھیک رہے گا۔"

رحیم داد طویل تفصیل سے جلد ہی اکتا گیا۔ پوچھا" یہ بتا بچے کیسے ملے؟"

" تھانے دار نے اپنے ایک پرچے کے ساتھ مجھے احسان شاہ کے پاس بھیجا۔ میں پیراں والہ گیا۔ احسان شاہ سے ملا۔ تھانے دار کا پرچہ دیا۔" جلیل نے بتایا۔" پہلے تو وہ زینت کا نام سنتے ہی ایک دم مجھ پر گرم ہو گیا۔ زینت کو گندی گندی گالاں نکالنے لگا۔ دھمکی دی کہ اسے دوبارہ اٹھوا لوں گا۔ پر جب اس نے زماں خاں کا پرچہ پورا پڑھ لیا تو ذرا نرم پڑ گیا۔ اس نے سلامو کو بلوایا۔ جس کے پاس بچے تھے۔ مگر وہ آیا نہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا کہ سلامو، مزارع ہو کر احسان شاہ کے بلانے پر نہ آئے۔" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

" سلامو اب احسان شاہ کا مزارع نہیں رہا۔" جلیل بولا۔" اسے احسان شاہ نے بے دخل کر دیا ہے۔ پر ابھی رہتا پیراں والہ ہی میں ہے۔ احسان شاہ کا کرندہ پیغام لے کر سلامو کے پاس پہنچا۔ اس نے آنے کا بہانہ کیا اور بچوں کو لے کر چک ۱۷۲ میں اپنے چچیرے کے پاس چلا گیا۔"

" تب تو بہت مشکل پڑی ہو گی؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"ہاں جی۔ بہت مشکل پڑی" جلیل نے کہا۔" احسان شاہ کا منیجر کوشش کرتا رہا۔ پر نہ سلامو آیا اور نہ ہی بچے بھیجے۔ میں ٹھہرا رہا۔ سوچا اب آیا ہوں تو بچوں کو لے کر ہی جاؤں گا۔ اسی میں دیر ہو گئی۔ پانچ روز پیراں والہ میں ٹھہرا رہا مگر کام نہ بنا۔ احسان شاہ لہور جا چکا تھا" اس نے بجھی بجھی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا" جب کام نہ بنا اور بچوں کے ملنے کی کوئی امید نظر نہ آئی تو میں واپس دیپال پور چلا گیا۔"

"تھانے دار سے ملا تھا؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"سیدھا اس کے پاس پہنچا۔ اسے سب حال بتایا۔"

جلیل نے اپنی بات پوری بھی نہ کی تھی کہ کمرے سے ایک شخص نمودار ہوا۔ اسے دیکھتے ہی رحیم داد کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ احسان شاہ کا کرندہ، دینا تھا جس کے ذریعے رحیم داد نے احسان شاہ سے ساز باز کر کے اللہ وسایا کو دارا کے ہاتھوں قتل کرایا تھا۔ دینا اس سے احسان شاہ کی حویلی میں مل بھی چکا تھا۔

دینا کمرے سے نکل کر دونوں کی جانب بڑھا۔ جلیل نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رحیم داد سے کہا" یہ دینا ہے چوہدری، سچی بات یہ ہے جی، اسی کی کوششوں سے بچے ملے ہیں یہی ان کو لے کر آیا بھی۔ تھانے دار نے بچوں کو سلامو کے کبضے سے نکالنے کے لیے اسی کو لگایا تھا۔"

دینا نے بھی فوراً رحیم داد کو پہچان لیا۔ مسکرا کر بولا" جلیل! میں چوہدری کو پہلے سے جانتا ہوں۔" رحیم داد اور پریشان ہو گیا۔ دینا براہِ راست رحیم داد سے مخاطب ہوا۔" چوہدری! تو ٹھیک ٹھاک تو رہا۔ بہت دنوں بعد میں نے آج تجھے دیکھا ہے۔"

رحیم داد نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی۔ پوچھا" شاہ جی کا کیا حال احوال ہے؟"

"ٹھیک ہی ہے جی" دینا نے بے نیازی سے کہا" ویسے جی میں نے اس کی نوکری بہت دن ہوئے چھوڑ دی۔"

"اب کہاں ہے۔ کیا کر رہا ہے؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"آج کل دیپال پور میں ہوں جی۔ مویشی چوری کے ایک کیس میں پھنس گیا تھا۔" دینا نے بتایا۔" اپنے تھانے دار زماں خاں نے بچالیا۔ تب سے جی ان ہی کے ساتھ لگا ہوں۔ مخبری شکبری کرتا ہوں۔ اکیلا ہوں اسی میں گزارہ ہو جاتا ہے۔ دو تین ڈکیتیوں اور چوریوں کا کھوج لگایا۔ سمگلروں کے ایک وڈے گروہ کو بھی پکڑوایا۔ اس پر انعام بھی ملا۔" وہ بے تکلفی سے کھل کر مسکرایا۔" بس جی ایسے ہی کام چل رہا ہے۔"

"پر تو نے زینت کے بچوں کو واپس دلا کر بہت زبردست کام کیا۔" رحیم داد نے اسے خوش کرنے کے لیے اچھے الفاظ سے یاد کیا۔" ویسے تو ہے بھی بہت حوصلے والا۔ بہت کام کا بندہ ہے۔ تو نہ ہوتا تو میں کہتا ہوں، جلیل کو بچے ہرگز سلامو سے واپس نہ ملتے۔" رحیم داد نے مڑ کر جلیل کو دیکھا۔" یہی گل ہے نا جی؟"

"ہاں جی، دینا نہ ہوتا تو بچے نہ آتے۔ پتہ نہیں کتنی دشواری پڑتی۔" جلیل نے رحیم داد کی تائید کی۔

"زینت نے تو بچوں کے لیے رو رو کر بُرا حال کر رکھا تھا۔ روٹی تک اس سے کھائی نہیں جاتی تھی۔" رحیم داد نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس دس کے تین نوٹ نکالے۔ دینا کی طرف بڑھائے، ہنس کر بولا۔" لے رکھ لے۔ یہ میری طرف سے تیرا انعام ہے۔ ویسے تو نے ایسا کام کیا ہے کہ زینت کو تو دوسری زندگی مل گئی۔" رحیم داد نے گردن اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔" دینے تو نے رات یہیں ٹھیرنا ہے؟"

"نہیں جی، میں نوں واپس دیپال پور جانا ہے۔"

رحیم داد چاہتا بھی یہی تھا کہ دینا جلد سے جلد چلا جائے۔ اس نے جلیل سے کہا "اسے اب جانے دے ورنہ یہ رات گئے دیپال پور پہنچے گا۔ سردی بھی زوروں پر ہے۔ رستے میں اسے بہت تنگ کرے گی۔"

جلیل تو خاموش رہا، مگر دینا چپ نہ رہا۔ اس نے رحیم داد کی رائے سے اتفاق کیا۔

"مجھے تو جی اب روانہ ہو جانا چاہیے۔ دیر ہو گئی تو بہت مشکل پڑے گی۔ میرے پاس تو صرف ایک کھیس ہے۔ کمبل یا دُھسا بھی نہیں لایا۔ اِدھر سردی بھی بڑھ گئی ہے۔"

دینا نے مزید بات چیت نہ کی۔ کمرے میں جا کر کھیس اوڑھی۔ لمبی ڈانگ ہاتھ میں دبائی۔ جلیل کے پاس آیا۔ بولا "ماسٹر جی! میں تو اب چلا۔ تجھ سے دیپال پور میں ملوں گا۔ تو بعد میں آئے گا۔ میں نے پتہ ہے۔ تھانے دار سے تیرے بارے میں بتا دوں گا۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ جلیل اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دینا کے ساتھ ساتھ مہمان خانے کے بیرونی دروازے کی جانب بڑھا۔ عین اس وقت جمیلہ مہمان خانے میں داخل ہوئی۔ جلیل نے اسے دیکھا تو ٹھہر گیا۔ دینا بھی رک گیا۔ جمیلہ قریب پہنچ گئی۔ جلیل نے اسے سلام کیا۔ جمیلہ نے ہاتھ اٹھا کر دینا کی طرف اشارہ کیا "دینا یہی ہے جو بچوں کو سلامو کی قید سے نکال کر لایا ہے؟"

جلیل کے بولنے سے پہلے ہی دینا بول پڑا "یہ تو جی ایسا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ ماسٹر جی اچھی طرح جانتے ہیں، میں نے کیسے کیسے مشکل کام کیے ہیں۔"

رحیم داد کی پریشانی جمیلہ کو دیکھتے ہی سوا ہو گئی۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جمیلہ کی طرف دیکھا "زمیں دارنی اب دینے کو جانے دے۔ کڑاکے کی سردی ہے اور اسے دور جانا ہے۔" وہ چاہتا تھا کہ دینا کو جمیلہ سے مزید گفتگو کرنے کا موقع نہ ملے اور وہ جلد سے جلد چلا جائے۔

جمیلہ نے رحیم داد کو نظر انداز کرتے ہوئے نرم لہجے میں دینا سے کہا "دینے تو بہت نیک بندہ ہے۔ زینت کے بچے واپس لا کر تو نے ایسا بھلا کام کیا ہے کہ نہ صرف زینت اور جلیل بلکہ میرے من سے بھی تیرے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔" اس نے یہ کہتے ہوئے سو سو کے دو نوٹ نکالے اور دینا کو دے دیے "یہ تیرا انعام ہے ویسے تیری اتنی وڈی نیکی کا یہ کچھ بھی انعام نہیں۔"

رحیم داد کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

دینا نے دو سو روپے لے کر دھوتی کے ڈب میں اڑس لیے۔ وہ روپے پاکر اتنا خوش ہوا کہ بول بھی نہ سکا۔ دانت نکال کر ہنسنے کی کوشش کرنے لگا۔ رحیم داد نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ دینا سے بولا "اب تو ٹر جا۔ دیر کرنا تیرے لیے ٹھیک نہیں۔ سردی آج بہت زیادہ ہے۔"

مگر جمیلہ نے دینا کو جانے نہ دیا، بولی "جلدی کیا ہے۔ رات کی روٹی کھا کر جائے گا۔"

رحیم داد نے تیکھے لہجے میں کہا "زمیں دارنی تو نے بھی حد کر دی۔ اسے روٹی کھلانے کے لیے سردی میں تنگ کرنا چاہتی ہے۔ رات کو یہ کیسے دیپال پور جا سکے گا؟"

"آج ہی اس کا جانا کوئی ضروری ہے؟" جمیلہ کا لہجہ بھی تیکھا تھا۔ "رات کو حویلی میں ٹھیر جائے گا۔ کل دن چڑھے چلا جائے گا۔"

رحیم داد دم بخود ہو کر رہ گیا۔ مگر دینا رکنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ کہنے لگا "زمیں دارنی! مجھے تو اب جانے ہی دے۔ چک بیدی سے دیپال پور کے لیے لاری پکڑ لوں گا۔ میں ادھر ٹھیر نہیں سکتا۔ تھانے دار سے مجھے جلد سے جلد ملنا ہے۔ پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ اب اور دیری نہ کرا۔" اس نے عاجزی کا مظاہرہ کیا "مجھے نہ روک۔ اب جانے ہی دے۔ تیری بہت بہت مہربانی۔"

جمیلہ نے مزید اصرار نہ کیا۔ دینا آگے بڑھا۔ جلیل اس کے ہمراہ چلا۔ دونوں مہمان خانے سے باہر چلے گئے۔

دینا کے جانے کے بعد رحیم داد نے اطمینان کی سانس لی۔ اس کی گھبراہٹ اور پریشانی رفع ہو گئی۔ جب تک دینا موجود رہا، خطرہ اس کے سر پہ منڈلاتا رہا۔ مگر جمیلہ اس کے احساسات سے بے نیاز قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔

جلیل واپس آگیا اور دونوں کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ دھوپ کی رنگت بدلنے لگی تھی۔ دن ڈھل رہا تھا۔

جمیلہ بچّوں کے واپس آنے پر بہت مسرور تھی۔ جلیل سے ہنس ہنس کر باتیں کررہی تھی۔ اسے اپنے اسکول کے بارے میں بتاتی رہی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ لمبی چھٹی لے کر کوٹلہ ہرکشن آجائے اور اسکول کا انتظام درست کرنے میں اس کی مدد کرے تاکہ وہ نہ صرف منظور شدہ اسکول بن جائے بلکہ بعد میں ڈسٹرکٹ بورڈ اسے اپنی تحویل میں لے کر باقاعدہ سرکاری پرائمری اسکول بنادے۔ جمیلہ یہ بھی چاہتی تھی کہ زینت اور جلیل اپنے بچوّں کے ساتھ اس کے پاس ہی رہیں۔ لیکن یہ صرف اس صورت میں ممکن تھا کہ اسکول سرکاری بن جائے اور جلیل دیپال پور سے تبادلہ کرانے کے بعد کوٹلہ ہرکشن آجائے۔

جلیل ہر طرح جمیلہ کی مدد کرنے کو تیار رہتا۔ وہ اس کی دردمندی اور ہنس مکھ طبیعت سے بہت متاثر تھا۔ اس کا احسان مند بھی تھا۔ اس کے وسیلے سے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیوی بچے مل گئے تھے۔ ویسے بھی زینت اور جلیل کے ساتھ جمیلہ کا رویّہ بڑا مشفقانہ تھا۔ جلیل دیر تک جمیلہ سے باتیں کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

جلیل اور زینت اپنے بچوں کے ساتھ مہمان خانے میں ٹھیرے رہے۔ جلیل روزانہ جمیلہ کے ہمراہ اسکول جاتا۔ تمام وقت وہیں رہتا اور جمیلہ کے ساتھ ہی واپس آتا۔ رحیم داد ہر صبح جلیل اور جمیلہ کو جاتے ہوئے دیکھتا۔ وہ اس کے کمرے کے سامنے سے گزرتے تھے۔

لیکن پورا ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ وہ زینت اور بچوں کے ساتھ دیپال پور چلا گیا۔ حالانکہ جلیل دو ہفتے کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ اس نے رحیم داد کو یہی بتایا تھا۔ رحیم داد کو اس کے اچانک چلے جانے پر حیرت ہوئی اور اس سے بھی زیادہ حیرت اور تکلیف ان کے اس رویّہ پر ہوئی کہ وہ اس سے مل کر بھی نہ گئے۔

سہ پہر کو جمیلہ اسکول سے واپس لوٹی تو رحیم داد نے روک کر اس سے اپنی بے چینی اور حیرت کا اظہار کیا "زیبی دارنی! میں نے سنا ہے جلیل اور زینت دیپال پور چلے گئے۔ جلیل تو لمبی چھٹی پر آیا تھا۔ میں تو ان سے مل بھی نہ سکا۔ جب وہ گئے تو میں کھیتوں کی طرف تھا۔ وہ اس طرح اچانک کیسے چلے گئے؟"

"وہ ایسا ہے چوہدری"۔ جمیلہ نے وضاحت کی۔" تاجاں کا دیاہ تو نادر خاں کے گھر ہی سے ہونا ہے نا۔ تاجاں اسی کے گھر میں مائیاں بیٹھے گی۔ نادر خاں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ تب تک مہمان خانے میں ٹھیرے گا۔ اور کہاں جائے گا۔"

"سکول کا کیا بنے گا؟" رحیم داد نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔" تو مائیاں میں لگ جائے گی۔"

"سکول بھی بند رہے گا۔ جنج بھی تو سکول ہی میں اُترے گی۔ اور وہیں ٹھیرے گی۔" جمیلہ نے کہا۔" یہی طے ہوا ہے۔ ایسی صورت میں جلیل یہاں کیسے ٹھیر سکتا تھا۔"

رحیم داد سے جمیلہ نے مزید بات چیت نہ کی۔ وہ اسکول سے تھکی ہوئی آئی تھی۔ جلد سے جلد اپنے کمرے میں پہنچ کر آرام کرنا چاہتی تھی۔

☆

رحیم داد دوپہر کا کھانا کھا کر کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ نادر خاں اس کے ہمراہ تھا۔ اسکول سامنے ہی تھا۔ رحیم داد کی نظر اسکول کی طرف گئی۔ اس نے ایک شخص کو اسکول سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ سردی سے بچنے کے لیے چادر اس طرح سر اور کانوں کے گرد لپیٹے ہوئے تھا کہ چہرہ دور سے نظر نہ آتا تھا۔ رحیم داد کو شبہ ہوا کہ وہ دینا تھا۔ فوراً اس کا ماتھا ٹھنکا۔ طرح طرح کے وسوسوں نے اس کے ذہن میں کھلبلی پیدا کی۔ وہ حیران و پریشان ہو کر سوچنے لگا کہ دینا خلافِ توقع جمیلہ سے ملنے اسکول میں کیوں آیا تھا۔

رحیم داد نے دیکھا دینا اسکول سے نکل کر درختوں کے نیچے چلا گیا۔ وہ نہر کی طرف جا رہا تھا۔ رحیم داد نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نادر سے کہا۔" نادر! مجھے یہ دینا لگتا ہے۔"

"وہی ہوگا جی۔ میں نے اسے ٹھیک سے دیکھا نہیں۔" نادر خاں بے نیازی سے بولا۔

اب دینا کی پشت نظر آ رہی تھی۔ رحیم داد کو تشویش لاحق ہوئی۔ اس نے نادر سے کہا۔" نادر خاں، تو جا کر پتہ کر یہ دینا ہی ہے نا؟ ہو سکے تو یہ بھی معلوم کرنا کہ وہ زیں دارنی کے پاس کیسے آیا تھا" رحیم داد نے کھیتوں کی طرف جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔" میں واپس اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ نادر تو وہیں آ جا۔ میں تیرا انتظار کروں گا۔"

رحیم داد حویلی کی جانب واپس ہوا۔ نادر قدم بڑھاتا ہوا اس طرف چلا جدھر دینا گیا تھا۔

رحیم داد کمرے میں پہنچا اور بے چینی سے نادر خاں کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ گھنٹہ، سوا گھنٹہ بعد نادر خاں لوٹا۔ وہ تھکا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تیز رفتار سے چل کر آیا ہے۔

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ جب نادر خاں کو ذرا قرار آیا تو رحیم داد نے پوچھا" وہ دینا ہی تھا نا؟" اس کے لہجے سے بے قراری صاف عیاں تھی۔

" ہاں جی، وہ دینا ہی تھا" نادر خاں نے بتایا" میں نے اسے بہت آگے جا کے پکڑا۔"

" تو نے اس سے بات چیت کی تھی؟"

" بالکل کی تھی" رحیم داد سے نادر خاں نے بتایا۔

" تو نے پوچھا کہ وہ ادھر کس لیے آیا تھا؟"

" کہتا تھا زیں دارنی نے اسے بلایا تھا" نادر خاں نے کہا" جلیل نے دیپال پور جا کر اسے زیں دارنی کے پاس بھیجا تھا۔"

" تو نے دینے سے پوچھا کہ زیں دارنی نے اُسے کس لیے بلایا تھا؟" رحیم داد نے کرید کر دریافت کیا۔

" کہتا تھا زیں دارنی نے ایک ضروری کام کے لیے اسے بلایا تھا"

" اس سے تو نے پوچھا نہیں کہ وہ ضروری کام کیا تھا؟"

"میں نے اس سے پوچھا بھی۔ گھما پھرا کر بات کی پر اس نے کچھ نہ بتایا۔" نادر خاں نے کہا۔ "میں نے تو اس کی باتوں سے یہ اندازہ لگایا کہ وہ خود ہی زیبں دارنی کے پاس آیا تھا۔ زیبں دارنی نے اسے بلایا نہیں تھا۔"

رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ "پر یہ سمجھ نہیں آئی کہ اگر وہ جمیلہ کے پاس آیا تھا تو کیوں آیا تھا؟"

"میں تو جی سمجھتا ہوں کہ وہ زیبں دارنی سے سلامو کے نام پر کچھ رکم اینٹھنے کے لیے آیا ہوگا۔ اور تو کوئی وجہ اپنی سمجھ میں نہیں آتی۔" نادر خاں نے رحیم داد کو بے چین اور پریشان پایا تو زور دے کر پوچھا۔ "پر اس کے زیبں دارنی کے پاس آنے سے تو کیوں پریشان ہے؟"

"پریشانی کی گل ہی ہے۔" رحیم داد نے کہا۔ "دینا بہت عرصہ تک احسان شاہ کے پاس ملازم رہ چکا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ میرے اور شاہ جی کے میل ملاپ کے بارے میں جمیلہ کو بتائے۔ اس نے مجھے احسان شاہ کی حویلی میں کتنی ہی بار دیکھا ہے۔"

"پر دینا کے بتانے سے بھی کیا ہوگا۔" نادر خاں نے دینا کی آمد کو خاص اہمیت نہ دی۔ "اب تو زیبں دارنی کو پتہ چل ہی چکا ہے کہ تو شاہ جی کے پاس جاتا رہا ہے اور تو نے زیبں دارنی کے سامنے اسے مان بھی لیا۔ اب دینا یا کسی اور کے زیبں دارنی سے ملنے سے کیا فرک پڑتا ہے؟"

رحیم داد اپنی پریشانی کی اصل وجہ نادر خاں کو بتانا نہ چاہتا تھا۔ اس نے اللہ وسایا کے قتل کے سلسلہ میں نادر خاں کو اعتماد میں نہ لیا تھا اور نہ ہی اس سلسلہ میں کبھی تفصیل سے بات ہی کی تھی۔ رحیم داد نے پردہ پوشی کے لیے بات بنائی، کہنے لگا۔ "نادر تیں نوں پتہ ہے ادھر شاہ جی کی حویلی میں پینا پلانا بھی ہوتا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ جمیلہ کو اس کا پتہ نہ چلے۔ وہ شراب بلکہ کسی بھی نشہ بازی کو برا سمجھتی ہے۔"

"چوہدری، میں تو سمجھتا ہوں دینا نے زیبں دارنی سے تیرے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کی ہوگی۔" نادر خاں نے رحیم داد کی تشویش رفع کرنے کی کوشش کی۔ "اسے تجھ سے کوئی گلہ شکوہ بھی نہیں۔ وہ خاما خا زیبں دارنی سے کیوں تیری برائی کرنے لگا۔ وہ تو اپنے

ہی کسی کام سے آیا ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے جلیل اور اس کے بال بچوں کے بارے میں بتانے آیا ہو۔ جلیل کو چھٹی نہ ملی ہوگی۔ اس نے دینا کو زمیں دارنی کے پاس بھیج دیا ہوگا۔"

نادر نے اپنے طور پر رحیم داد کو ہر طرح مطمئن کرنے اور اس کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کی۔ مگر رحیم داد کے ذہن میں وسوسے اور خدشات منڈلاتے رہے۔ نادر خاں اجازت لے کر کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ رحیم داد کمرے میں خاموش بیٹھا رہا۔

سہ پہر ہو گئی۔ جمیلہ اسکول سے واپس ہوئی۔ رحیم داد کے کمرے کے سامنے سے گزری تو مسکرا کر بولی۔"چوہدری، کمرے میں خالی پڑے پڑے تیرا من نہیں گھبراتا؟" مگر وہ رُکی نہیں۔ آگے بڑھ گئی۔ اس کے خوشگوار رویّہ سے رحیم داد کی پریشانی بڑی حد تک زائل ہو گئی۔ اس نے ذہنی سکون محسوس کیا۔

☆

اُس روز اتوار تھا۔ جمیلہ حویلی ہی میں تھی اور اوپر کی منزل پر اپنے کمرے میں تھی۔ وہ صبح سے نیچے نہیں آئی تھی۔ دوپہر کو محمد عثمان راٹھور وکیل آیا۔ وہ رحیم داد کے کمرے کے سامنے سے گزرا مگر اس سے نہ ملا۔ سیدھا جمیلہ کے پاس اوپر کی منزل پر گیا۔ وہ گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ تک جمیلہ کے ساتھ بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ کھانا بھی اس نے جمیلہ کے ساتھ ہی کھایا۔ یہ ساری اطلاعات اسے حویلی کے ملازم نامدار سے ملتی رہیں جو بار بار جمیلہ کے پاس آ جا رہا تھا۔

سہ پہر کو وکیل واپس چلا گیا۔ رحیم داد نے نہ اسے ٹوکا اور نہ ہی اس نے رحیم داد کی جانب کوئی توجہ دی۔ وہ سر جھکائے لمبے لمبے قدم اٹھاتا کمرے کے سامنے سے گزر گیا۔ رحیم داد خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ وکیل کو دیکھ کر وہ ایک بار پھر پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا۔
رات ہو گئی مگر جمیلہ نیچے نہ آئی۔

سویرے وکیل پھر آیا۔ رحیم داد نے اسے زینے پر چڑھتے اور سیڑھیاں طے کرکے

اوپر جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ اس وقت کرسی پر صحن میں بیٹھا تھا۔ ہر طرف گہری بسنتی دھوپ پھیلی تھی۔ رحیم داد کی پریشانی اور بڑھ گئی۔

نصف گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ جمیلہ اور وکیل دو نوکروں کے ہمراہ نیچے آئے۔ نہ جمیلہ نے اور نہ ہی وکیل نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ وہ حویلی کا پھاٹک عبور کر کے باہر گئے۔ تانگوں میں سوار ہوئے اور گاؤں سے باہر چلے گئے۔ رحیم داد کو تشویش لاحق ہوئی۔ وہ دینا کی اچانک آمد ہی سے گھبرا گیا تھا مگر جمیلہ سے بات چیت کرنے کے بعد مطمئن بھی ہو گیا تھا۔ وکیل کی آمد و رفت نے اسے ایک بار پھر طرح طرح کے وسوسوں میں مبتلا کر دیا تھا۔

رحیم داد نے اپنی پریشانی اور خدشات کا نادر خاں سے کوئی ذکر نہ کیا۔ وہ جمیلہ کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ شام کو جمیلہ نوکروں کے ساتھ واپس آئی۔ رحیم داد کے کمرے کے سامنے سے گزری۔

وہ کمرے سے نکل کر دالان میں آگیا۔ بڑھ کر جمیلہ کے قریب پہنچا۔ مسکرا کر دریافت کیا۔ "زیبیں دارنی تو سویرے سویرے ہی وکیل کے ساتھ کہاں گئی تھی۔ کوئی خاص گل بات تھی؟"

"نہیں کوئی خاص گل نہیں۔" جمیلہ نے بے نیازی سے بتایا۔ "میں نے وکیل سے لہور میں مکان کا بندوبست کرنے کے لیے کہا تھا۔ وہ اسی کے بارے میں بات کرنے آیا تھا۔"

"تو کیا تو لہور جا رہی ہے؟" رحیم داد نے پریشانی کا اظہار کیا۔

"ابھی تو نہیں جا رہی۔"

"زیبیں دارنی، تو لہور جانے کا خیال دل سے نکال دے۔" رحیم داد نے کہا۔ "تو نے تو ابھی اپنے سکول کو منظور شدہ بنوانا ہے۔ اس روز تو یہی کہتی تھی۔"

"ارادہ تو ایسا ہی ہے۔"

"جب تیرا یہ ارادہ ہے تو لہور کیوں جا رہی ہے؟" رحیم داد نے اس کے جواب کا انتظار بھی نہ کیا، مشورہ دیا۔ "نادر کو لگا دے۔ وہ تیرے سکول کو منظور شدہ بنوا دے گا۔

فکر نہ کر۔ وہ یہ کام ضرور کر دے گا۔ تو جانتی نہیں، وہ ایسے معاملوں میں بہت ہوشیار ہے۔"
جمیلہ خاموش رہی مگر رحیم داد خاموش نہ رہا۔ گلہ کرنے کے انداز میں بولا "تجھے لہور ہی جانا تھا تو مجھے یہاں کیوں بلوایا؟" اس نے جمیلہ کے چہرے کی جانب دیکھا جس پر خفگی کے اثرات ہویدا تھے۔" اس دفعہ پھٹی اور کماد کی فصل بہت اچھی گئی ہے۔ اس کی آمدنی سے تو شاندار سکول بنا۔ ڈسپنسری بنا۔ تجھے روکنے والا کون ہے۔ سب ہی کچھ تیرا ہے۔ میں نے کیا لینا" اس نے لہجے میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی "تو لہور جانے کا خیال بالکل دل سے نکال دے۔"

"پر میں لہور جا کب رہی ہوں" جمیلہ مسکرا کر بولی " وکیل تو یہ بتانے آیا تھا کہ لہور میں اس نے میرے لیے جس مکان کا بندوبست کیا تھا، اس کا معاہدہ ختم کر دیا ہے۔ کل وہ اس سلسلہ میں مجھ سے پوچھنے آیا تھا کہ آگے کے لیے میرا کیا ارادہ ہے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں نے لہور جانے کا وچار چھوڑ دیا ہے تو آج وہ معاہدہ ختم ہونے کی بات بتانے آیا تھا۔"

"تو اس کے ساتھ کہاں گئی تھی؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"وہ واپس جا رہا تھا۔ میں نے بھی شہر میں ناجاں کے ویاہ کے لیے خریداری کرنی تھی۔ سو میں اس کے ساتھ ہی چلی گئی۔" وہ بے تکلفی سے مسکرائی "تو کیا سمجھا؟"

رحیم داد کچھ نہ کہہ سکا۔ جمیلہ آگے بڑھتے ہوئے بولی "تجھ سے کل بات ہو گی۔ اس سمے تو میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔" وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی زینے کی جانب بڑھی۔

رحیم داد ایک بار پھر پریشانی میں مبتلا ہو گیا اور جمیلہ سے گفتگو کرنے کے بعد مطمئن بھی ہو گیا۔ اس کے ذہن میں جو وسوسے اور شبہات کل سہ پہر سے بار بار ابھر رہے تھے رفع ہو چکے تھے۔ رحیم داد اپنے کمرے میں گیا۔ رات کا کھانا کھایا اور سکون سے گہری نیند سو گیا۔

دن چڑھے نادر خاں اس کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک فہرست تھی جو اسے جمیلہ نے دی تھی۔ اس میں ناجاں کے جہیز اور شادی بیاہ کے ساز و سامان کی ضروری اشیاء درج تھیں۔ وہ فہرست کے مطابق خریداری کرنے لاہور جا رہا تھا۔ مگر لاہور

جاتے سے پہلے وہ رحیم داد کے ساتھ کپاس کی فروخت کے بارے میں بھی بات کرنا چاہتا تھا اس سلسلہ میں اس نے رحیم داد کو ضروری اطلاعات فراہم کیں۔

وہ اٹھا اور لاہور کے سفر کے لیے روانہ ہوگیا۔

شام ہوئی۔ اندھیرا بڑھا۔ رات ہوگئی مگر نہ جمیلہ آئی اور نہ ہی رحیم داد اس کے پاس گیا۔ دوسرے روز شام کا اندھیرا بڑھتے ہی اس نے جمیلہ سے ملنے کا ارادہ کیا۔ نادر خاں ابھی تک واپس نہیں آیا تھا اور اس کا فوری طور پر لوٹنے کا امکان بھی نہ تھا۔ اسے خریداری کے لیے وقت کی ضرورت تھی۔ لاہور میں اس کا بھتیجا موجود تھا۔ لہٰذا ٹھہرنے کا بھی مسئلہ نہ تھا۔

رحیم داد اس وقت جمیلہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے اسکول کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے ساتھ وہ کمرے سے نکل کر دالان میں آیا۔ حویلی میں ابھی تک کسی قدر چہل پہل نظر آتی تھی۔ وہ اوپر کی منزل پر جانے والے زینے کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا تو سیڑھیوں پر جنّت مل گئی۔ وہ اوپر سے اتر کر نیچے آرہی تھی۔

رحیم داد نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ "کہاں چلی جنّت؟"

"گھر جا رہی ہوں جی۔" وہ سر کو دوپٹے سے ڈھکتے ہوئے بولی۔ "چھوریاں گھر میں اکیلی ڈرتی ہیں۔"

"نادر خاں، کب تک واپس آرہا ہے؟"

"ٹھیک سے جی پتہ نہیں۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "آج تو آتا ہوا نہیں لگتا۔"

"پوری خریداری کر کے ہی لوٹے گا۔" رحیم داد نے جنّت کو نظر بھر کر دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ اس نے جنّت سے پوچھا۔ "تو رات کو جلدی تو نہیں سوتی؟"

"نہیں جی، میں تو دیر ہی سے سوتی ہوں۔"

"پر اس رات تو جلد ہی سو گئی تھی۔" رحیم داد نے اسے چھیڑا۔ "تو نے جو گرم گرم دودھ پلایا تھا۔ بہت مزا دیا تھا اس نے۔"

"تجھے پسند آیا؟" وہ خوش ہو کر بولی۔ "ابھی چل کر پی لے۔ اچھا گرم ہوگا۔"

"ابھی تو میں زینب دادی کے پاس جا رہا ہوں۔ اس کے ساتھ کچھ ضروری گل بات کرنی ہے۔ بعد میں . . . " رحیم داد اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ اسی وقت گھر کے دھندلکے میں سیڑھیوں پر آہٹ ابھری۔ کوئی اوپر سے نیچے آ رہا تھا۔ آہٹ سنتے ہی جنت مہمان خانے میں کھلنے والے دروازے کی جانب بڑھی اور دروازے سے گزر کر چلی گئی۔

رحیم داد اوپر جانے کے بجائے آہستہ آہستہ چلتا ہوا واپس اپنے کمرے میں پہنچا۔ اس نے جمیلہ کے پاس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ رات کے تاریک اور سنسان ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

✡

حویلی پر گہری خاموشی چھائی تھی۔ رحیم داد باہر نکلا۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند کیا۔ دالان میں آیا۔ چوکنا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سردی زیادہ تھی۔ نوکر چاکر اپنی اپنی کوٹھریوں کے اندر جا چکے تھے۔ صحن میں کوئی نہ تھا۔ نہ کوئی آہٹ تھی، نہ آواز۔

رحیم داد مہمان خانے میں پہنچا۔ احمد حسبِ معمول غائب تھا۔ مہمان خانہ خالی تھا۔ رحیم داد مہمان خانے سے گزر کر نادر خاں کے گھر پر پہنچا۔ اس نے دروازے پر ہولے ہولے دستک دینے کے لیے ہاتھ رکھا تو وہ کھل گیا۔ کمرے میں لالٹین جل رہی تھی۔ رحیم داد اندر داخل ہو گیا۔

اس نے دیکھا، سامنے پلنگ پر جنت لہریا چندری اوڑھے بیٹھی تھی۔ آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ ہونٹوں پر سرخی کی دھڑی تھی۔ سر کے بال تیل سے چمک رہے تھے۔ پلنگ کے نیچے انگیٹھی میں انگارے دہک رہے تھے۔ ان کی تیز روشنی میں جنت کے گورے چٹے چہرے پر تازگی اور نکھار نظر آ رہا تھا۔ اس کی سج دھج صاف چغلی کھا رہی تھی کہ وہ رحیم داد ہی کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ پلنگ سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت شلوار کے بجائے لاچا باندھے ہوئے تھی۔ لاچا نارنجی رنگ کا تھا۔ اس کا ریشم بھی نرم تھا۔

اور نچلا کنارہ سنہری کلابتّو کا تھا۔

رحیم داد نے مسکرا کر شوخی سے پوچھا "تو نے تو آج لاچا باندھ رکھا ہے؟"

"تو نے ہی تو مجھے لاچا باندھنے کو کہا تھا۔" وہ آنکھوں کو ترچھا کر کے بے باکی سے مسکرائی "میں نے نادر سے کہا مجھے لاچا لا دے۔ میں لاچا باندھوں گی۔ وہ پچھلے دنوں لاہور گیا تو یہ لاچا لیتا آیا۔"

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ غور سے لاچا دیکھتے ہوئے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

جنت اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ اٹھلا کر بولی "کیسا لگ رہا ہے لاچا؟"

رحیم داد نے ہنس کر کہا "لشکارے مار رہی ہے۔ اسے پہن کر تو سچ مچ بہت سوہنی لگ رہی ہے۔"

"اب کہاں رہی سوہنی۔ تو نے مجھے پہلے نہیں دیکھا۔" وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی "بھڑولی پر تیرے لیے گرم دودھ رکھا ہے۔ لے آؤں؟"

"دودھ بعد میں پی لوں گا۔ پہلے تو دروازے کی زنجیر چڑھا دے۔" رحیم داد اٹھا اور پلنگ پر جا کر بیٹھ گیا۔

جنت اپنے کولھوں کو ہولے ہولے خم دیتی دروازے کی جانب بڑھی۔ کنڈی لگائی اور نظریں نیچی کیے شرماتی، لجاتی رحیم داد کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔

رات اپنا سفر طے کرتی رہی۔ نصف گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں پریشان ہو گئے۔ جنت نے جھٹ رحیم داد کا ہاتھ پکڑا اور برابر والے کمرے میں لے گئی۔ اس نے الگنی پر چادر ڈال دی اور رحیم داد کو اس کے پیچھے چھپا دیا۔

جنت نے رنگین چنری اتار کر سوتی کھیس اوڑھی، جلدی جلدی لاچا اتار کر ایک طرف ڈالا۔ شلوار پہنی۔ باہر نادر کی آواز ابھری "جنت دروازہ کھول۔ میرے ساتھ زمیں دارنی بھی ہے۔"

رحیم داد نے یہ سنا تو سخت سراسیمہ ہوا۔ اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ سہما ہوا پردے

کی آڑ میں دبکا ہوا کھڑا رہا۔ جنّت لالٹین سنبھالے ہوئے باہر چلی گئی۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ رحیم داد اندھیرے میں لمبی لمبی سانس بھرنے لگا اور اپنی گھبراہٹ اور پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

جنت برابر والے کمرے میں پہنچی۔ آگے بڑھی۔ دروازہ کھولا۔ دیکھا، نادر سامنے کھڑا تھا۔ جمیلہ اس کے ہمراہ تھی۔ دونوں کے عقب میں تاراں تھی۔ نادر نے جنت کو مخاطب کیا۔" جنت اتنی گہری نیند نہ سویا کر۔ جا زمیں دارنی کے لیے فٹا فٹ گرم دودھ لے کر آ۔" اس نے مڑ کر جمیلہ کی طرف دیکھا۔ مونڈھا اٹھایا اور اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولا" زمیں دارنی اسی پر بیٹھ جا۔ اپنے پاس کرسی تو ہے نہیں۔"

جمیلہ سنجیدگی سے بولی۔" میں نے بیٹھنا نہیں ہے۔ میں تو یہ دیکھنے آئی ہوں کہ ویاہ کے لیے تیرا گھر ٹھیک رہے گا ناں؟" اس نے ملحقہ کمرے کی طرف اشارہ کیا۔" تا جاں اس میں ماسیاں بیٹھ سکتی ہے۔"

" بالکل بیٹھ سکتی ہے جی۔" جنت نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

جمیلہ نے نادر خاں سے کہا۔" نادر، لالٹین اٹھا، میں ساتھ والا کمرہ دیکھوں گی۔" جنّت نے اسے روکنے کی کوشش کی۔" کیا کرے گی اسے دیکھ کر زمیں دارنی۔ وہ کمرہ بھی اتنا ہی وڈا ہے۔"

" نہیں میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔" جمیلہ نے اصرار کیا۔

" دیکھنا ہی ہے تو دن میں آرام سے دیکھ لینا۔" اس نے ایک بار پھر جمیلہ کو کمرے میں جانے سے روکنے کی کوشش کی۔" کل میں اسے صاف کر دوں گی۔"

مگر جمیلہ نہ مانی۔ اس نے نادر خاں سے کہا۔" نادر لالٹین اٹھا۔ اب آئی ہوں تو اس کمرے کو بھی دیکھ کر ہی جاؤں گی۔ کل مجھے اور بھی بہت کام کرنے ہیں۔"

نادر خاں نے لالٹین اٹھالی۔ جنّت کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس پر خوف اور پریشانی کا غبار چھا گیا۔ مگر جمیلہ اس کی گھبراہٹ اور سراسیمگی سے بے نیاز، نادر خاں کے ساتھ ساتھ

برابر کے کمرے میں داخل ہوئی۔ جنت نہ گئی۔ جمیلہ نے لالٹین کی روشنی میں دیکھا کمرے میں دو چارپائیوں پر نادر خاں کی تینوں بیٹیاں بے خبر سو رہی تھیں۔ ایک گوشے میں جنت کا نارنجی لاچا بے ترتیبی سے بکھرا ہوا تھا۔ قریب ہی لہریا چنری پڑی تھی۔

جمیلہ نے کمرے میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ رحیم داد دم بخود کھڑا تھا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس نے سنا جمیلہ کہہ رہی تھی "مجھے تو یہ کمرہ برابر کے کمرے سے کچھ وڈا ہی لگتا ہے۔" وہ الگنی پر پڑی ہوئی چادر کے بالکل برابر پہنچ چکی تھی۔ اتنی قریب کہ رحیم داد اس کے خوبصورت جسم کی مہک سونگھ سکتا تھا مگر اس کا خوف سے برا حال تھا۔ اس نے سانس روک لی اور آنے والے خطرے کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کرنے لگا۔

اسے توقع تھی کہ الگنی پر پڑا ہوا پردہ ایک طرف کھسک جائے گا اور جمیلہ اس کے سامنے ہوگی۔ اس تصور ہی سے وہ کانپ اٹھا۔ اس نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں مگر پردہ بدستور لٹکتا رہا۔ کمرے میں گہری خاموشی چھائی تھی۔

جمیلہ کی آواز ابھری "نادر! مائیاں بیٹھنے کے لیے یہ کمرہ ٹھیک رہے گا۔ اس کا ایک دروازہ باہر بھی کھلتا ہے ناں؟"

"ہاں جی، بالکل کھلتا ہے۔" نادر خاں نے الگنی پر لٹکی ہوئی چادر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "زمیں دارنی اسی کے پیچھے دروازہ ہے۔ پر اس میں تالا پڑا ہے۔ کنجی جنت کے پاس ہوگی۔ اسے دیکھنا چاہتی ہے تو جنت سے چابی لے لے۔"

"نہیں، میں نے اسے نہیں دیکھنا۔"

رحیم داد کی پیشانی پر سخت سردی کے باوجود پسینے کے قطرے نمودار ہوئے۔ اس کی نظریں سامنے لٹکتی ہوئی چادر پر ٹکی تھیں اور کان قدموں کی آہٹ پر لگے تھے۔ جمیلہ نہ آگے بڑھی اور نہ ہی اس نے چادر ہٹائی۔ وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ نادر خاں بھی لالٹین اٹھائے اس کے ہمراہ چلا گیا۔

جمیلہ مونڈھے پر بیٹھی نہیں۔ پلنگ کے نیچے رحیم داد کے جوتے پڑے تھے۔ جمیلہ

کی ان پر نظر پڑی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھری، نادر خاں سے مخاطب ہوئی۔

"نادر! تو نے بھی چوہدری کی طرح کے بوٹ پہن نے شروع کر دیے؟"

نادر خاں نے جوتوں کو دیکھا تو اس کے چہرے پر گھبراہٹ طاری ہو گئی مگر اس نے جھٹ اپنی پریشانی پر قابو پا لیا۔ آہستہ سے بولا۔ "وہ ایسا ہے زیں دارنی۔ لہور سے پچھلے دنوں میرا بھتیجا آیا تھا۔ وہی میرے لیے یہ بوٹ لیتا آیا تھا۔"

جنت دودھ سے بھرا ہوا گلاس لے کر صحن سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے گلاس جمیلہ کی طرف بڑھایا۔ "زیں دارنی دودھ پی لے۔ گرم گرم ہے۔ کوسا ہے۔"

"میں رات کے سمے دودھ نہیں پیتی۔" جمیلہ نے صاف انکار کر دیا۔ لالٹین کی روشنی میں اس نے جنت کے چہرے کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ جنت کی نظریں جھک گئیں۔ "جنت! لگتا ہے۔ تو سونے سے پہلے رات کو سنگھار بھی کرتی ہے۔"

"نہیں بھین جی۔ ایسی کوئی گل نہیں۔" جنت گھبرا کر بولی۔ "سنگھار شنگھار کیا کرنا۔ بس ذرا منہ ہاتھ دھو لیا تھا۔ میں تو تیرے ہی پاس آنے والی تھی۔"

جمیلہ نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے نادر سے کہا۔ "نادر، کل تو یہ گھر خالی کر کے مہمان خانے میں چلا جانا۔ یہاں کی اچھی طرح صفائی بھی کرا دینا۔ ویاہ تو یہیں سے ہو گا ناں۔" وہ مڑی۔ "اب میں چلوں گی۔" جمیلہ دروازے کی جانب بڑھی۔

دہلیز کے پاس تاراں بیٹھی تھی۔ جمیلہ اس کے ہمراہ باہر نکلی اور مہمان خانے سے گزر کر حویلی میں چلی گئی۔

دونوں کے جانے کے بعد نادر نے دروازہ بند کیا۔ جنت سے کہا۔ "دودھ واپس لے جا۔" وہ چپ چاپ صحن میں چلی گئی۔ نادر خاں نے لالٹین اٹھائی۔ برابر کے کمرے میں گیا۔ الگنی پر پڑی ہوئی چادر کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچا۔ اس نے ایک ہاتھ بڑھا کر چادر ایک طرف کر دی۔ لالٹین کی زرد زرد روشنی میں رحیم داد اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور چہرہ پر خوف اور دہشت کے سائے پھیلے تھے۔ کمرے میں

خاموشی چھائی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے چپ چاپ کھڑے تھے۔

رحیم داد نے دھڑکتے دل سے نظریں اٹھائیں۔ نادر اس کے روبرو کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر رحیم داد کا بازو پکڑا۔ آہستہ سے کہا۔ ”چوہدری باہر آ جا۔ زمیں دارنی چلی گئی۔“

رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر نادر خاں کو دیکھا اور خاموشی سے آگے بڑھا۔ نادر خاں کے ہمراہ ملحقہ کمرے میں گیا۔ جنّت ابھی تک کمرے میں واپس نہیں آئی تھی۔ نادر خاں نے پلنگ کے نیچے پڑے ہوئے جوتوں کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔

”چوہدری تو نے اپنے جوتے بھی یہیں چھوڑ دیے تھے۔ زمیں دارنی نے انہیں دیکھ لیا۔ پوچھا بھی۔ پر میں نے جھٹ بات بنا دی۔“

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ پلنگ پر جا کر بیٹھا اور سر جھکا کر اپنے جوتے پہننے لگا۔

”چوہدری! میں نے تجھ سے کچھ ضروری گل کرنی ہے۔“

رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ اس کے چہرے پر کچھ دیر کے لیے جو سکون نمودار ہوا تھا، غائب ہو گیا۔ اس نے کچھ نہ کہا۔ جلدی جلدی جوتے پہنے اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے نادر کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ ”تو نے ابھی گل کرنی ہے؟“

”تو چاہتا ہے تو سویرے کر لوں گا۔“ نادر خاں نے اصرار نہ کیا۔ ”پر گل ہے بہت ضروری۔“

رحیم داد اس قدر خفیف ہو رہا تھا کہ اس نے مڑ کر نادر خاں کی طرف نہ دیکھا۔ آگے بڑھا۔ دروازہ کھولا اور باہر چلا گیا۔ مہمان خانے میں احمد موجود تھا مگر بے خبر سو رہا تھا۔ رحیم داد مہمان خانے سے گزر کر حویلی میں پہنچا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ گیارہ کا عمل تھا۔ سردی بپھری ہوئی تھی۔ جسم تھر تھر آتا تھا۔ رحیم داد دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆

دوسرے روز رحیم داد دن چڑھے تک سوتا رہا۔ رات کو اسے دیر تک نیند

نہیں آئی۔ وہ شدید انتشار اور خلفشار میں مبتلا رہا۔

نادر خاں حسبِ وعدہ رحیم داد کے پاس نہ آیا۔ اُس نے نوکروں اور کمیّوں کی مدد سے اپنا مکان خالی کیا۔ گھر گرہستی کا سامان مہمان خانے کے ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ جنت اور اس کی تینوں بچیاں بھی مہمان خانے میں منتقل ہو گئیں۔ خالی مکان کو خوب اچھی طرح جھاڑ پونچھ کر صاف کیا گیا۔ جمیلہ نے خود جا کر اس کا معائنہ کیا۔ اپنی نگرانی میں سجا کر اسے شادی کا گھر بنایا۔ کمروں میں دریاں بچھی تھیں، ان پر جازم اور چاندنی کا فرش تھا۔ کمروں کے باہر دالان میں بھی دریاں اور چٹائیاں بچھائی گئی تھیں۔

سہ پہر تک سارے انتظامات مکمل ہو گئے۔ تاجاں کو گھر کے پچھلے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ وہ سرخ سالو باندھے ہوئے تھی۔ سر پر ہلدی میں رنگا ہوا زرد دوپٹہ تھا۔ کرتا بھی زرد ہی تھا۔ سورج ڈوبنے سے کچھ دیر پہلے تاجاں کی سسرال سے کچھ عورتیں اور نوجوان لڑکیاں آئیں۔ کمروں اور باہر دالان میں پیٹرومیکس روشن تھے۔ ان کی تیز روشنی دور تک پھیلی تھی۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ قہقہے تھے اور ملی جلی آوازوں کا شور تھا۔ خوشی تھی۔ ایک خوشگوار ہنگامہ تھا۔ ہر چہرہ چمکتا تھا، دمکتا تھا۔

سسرال سے آنے والی عورتیں اور لڑکیاں جب تاجاں کے پاس پہنچیں تو آوازوں اور قہقہوں کا شور اور بھی سوا ہو گیا۔ تاجاں کے چھوٹے ماموں نے، جو دولہا کا چچا بھی تھا، قریب جا کر اپنا ہاتھ بڑھایا، شفقت سے تاجاں کے سر پر پھیرا۔ بازو پکڑ کر اُسے اٹھایا اور سہارا دے کر تیل چڑھانے کی چوکی پر لے گیا۔ وہ سر جھکا کر اس پر شرماتی لجاتی سمٹتی سمٹاتی بیٹھ گئی۔

سات نوجوان عورتیں آگے بڑھیں اور تاجاں کے ارد گرد بیٹھ گئیں۔ ساتوں سہاگنیں تھیں۔ وہ تاجاں کے گندھے ہوئے بال آہستہ آہستہ کھولنے لگیں۔ لیکن بال کھولنے سے قبل ایک عورت نے تاجاں کی ہتھیلی پر ناریل اور گھی ملی ہوئی تھوڑی سی مہندی رکھ

دی۔ اس کا ہاتھ پکڑا اور دیوار کے پاس لے گئی۔ تاجاں نے اس کی ہدایت کے مطابق شرم سے جھجکتے ہوئے ہتھیلی کی مہندی دیوار پر مل دی۔

وہ عورت پیچھے ہٹی تو دوسری سہاگن نے بڑھ کر تاجاں کی ہتھیلی پر پھر مہندی رکھ دی اور تاجاں نے اس کے ہاتھ کی مدد سے اس دفعہ بھی مہندی دیوار پر مل دی۔ ساتوں سہاگنوں نے باری باری تاجاں کے ہاتھ سے دیوار پر مہندی لگوائی۔ لیکن ہر بار جب تاجاں دیوار پر مہندی لگاتی، تو ساتوں میں سے ایک سہاگن سرسوں کے تیل میں انگلی ڈبو کر اس کے سر میں لگاتی اور بالوں کی مینڈھی کھول دیتی۔

یہ تیل چڑھانے کی رسم تھی۔ اس رسم کے دوران میں تاجاں کی سہیلیاں اور دوسری نوجوان لڑکیاں اس کے چاروں طرف گھیرا ڈال کر کھڑی ہو گئیں۔ تاجاں اب سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ میراثنوں میں سے ایک نے ڈھولک پر تھاپ دی اور اونچی آواز سے یہ گیت چھیڑا۔

میری میڈھی نہ کھولو، میری میڈھی نہ کھولو، سہلڑیو!
میرے بابل توں پچھو سہلڑیو، جس میرا داج بنایا!
میرے چاچے توں پچھو، جس میرا کاج رچایا!
میرے ویر توں پچھو، جس مینو بوچھن دوایا!

گیت شروع ہوتے ہی دوسری میراثنیں بھی ڈھولک کی تھاپ پر گانے لگیں۔ تاجاں کے گرد حلقہ بنا کر کھڑی ہوئی لڑکیاں بھی ان کی آواز سے آواز ملا کر گانے لگیں۔ وہ گیت کے بول اٹھاتیں، خوشی سے کھلکھلا کر قہقہے بلند کرتیں۔ آپس میں چھیڑ چھاڑ کرتیں، مگر تاجاں حیا سے سمٹی سمٹائی چپ بیٹھی تھی۔ گیتوں کے بول سن رہی تھی جن میں اس کی آرزوؤں اور خواہشوں کا اظہار اس طرح کیا جا رہا تھا۔

پیاری سہیلو! میرے بال نہ کھولو، میرے بال پریشان نہ کرو
میرے بابل سے تو پوچھو سہیلو جس نے میرا جہیز بنایا!!

میرے چا چا سے تو پوچھو جس نے میرا بیاہ رچایا !!

میرے بھائی سے تو پوچھو سہیلو جس نے مجھے دوپٹہ اوڑھایا

مگر نہ اس کا باپ تھا، نہ چا چا تھا، نہ کوئی بھائی تھا۔ اس کی آنکھوں سے اپنی بے بسی پر ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اور جمیلہ جس نے اس کا جہیز تیار کیا، شادی کا اہتمام کیا۔ اس کے لیے لباس عروسی تیار کرایا، وہاں موجود نہ تھی۔ وہ سہاگن نہ تھی، ارانڈ بیوہ تھی اور کسی بیوہ کا سایہ مائیوں بیٹھنے والی لڑکی پر پڑنا نحوست اور بدشگونی سمجھا جاتا ہے۔

جمیلہ مہمان خانے میں کرسی پر بیٹھی تھی۔ گیت کے فضا میں بکھرتے ہوئے بولوں کو سن رہی تھی۔ مہمان خانے کے صحن میں بھی گیس بتی جل رہی تھی۔ اس کی ہر سو بکھری ہوئی روشنی میں بڑے بڑے چولہوں پر دیگچے چڑھے تھے۔ کڑاہیاں رکھی تھیں۔ دیگچوں میں گھنگھنیاں ابل رہی تھیں۔ کڑاہیوں میں گلگلے تلے جا رہے تھے۔ گلگلے تلے جانے کے بعد ٹوکروں میں ڈالے جا رہے تھے۔ قریب ہی پیتل کے بڑے بڑے تھالوں میں سوجی کی چوری اور ملیدہ تیار کیا جا رہا تھا۔ جمیلہ پکوان اپنی نگرانی میں تیار کرا رہی تھی۔

مائیوں کی رسم پر جمیلہ نے کوٹلہ ہرکشن کی تمام عورتوں اور لڑکیوں کو مدعو کیا تھا۔ ہر عورت تاجاں کے پاس جانے سے قبل مہمان خانے میں پہنچتی۔ اس کے ہاتھوں میں گندم سے بھری ہوئی تھالی ہوتی۔ وہ جمیلہ کے سامنے جاتی۔ اونچی آواز سے کہتی "سلام بھین جی" اور تھالی میں بھری ہوئی گندم دالان میں رکھے ہوئے مٹی کے بڑے بڑے کونڈوں میں انڈیل دیتی۔ پھر وہ دیگچوں کے پاس جاتی۔ ڈونگے کا دستہ پکڑ کر اندر سے گھنگھنیاں نکالتی، ٹوکروں سے گلگلے اٹھاتی، پیتل کے تھالوں سے چوری اور ملیدہ لیتی اور اپنی تھالی میں رکھتی جاتی، پھر ہنستی مسکراتی اس طرف چلی جاتی جہاں تیل چڑھانے کی رسم ادا کی جا رہی تھی۔

تیل چڑھانے کی رسم ختم ہوئی تو تاجاں کے ماموں نے ایک بار پھر اس کا بازو تھام کر اسے اٹھایا اور سہارا دے کر اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ اس نے تاجاں

کو پردے کے پیچھے بٹھا دیا۔ تاجاں اب باقاعدہ مائیوں بیٹھ چکی تھی۔

پھاتاں بھاگی بھاگی جمیلہ کے پاس آئی، گڑگڑا کر بولی۔ "بھین جی، تیری تاجاں مائیاں بیٹھ گئی ہے۔ اب تو بھی چل۔"

وہ تیل چڑھانے کی رسم کے موقع پر بھی جمیلہ کے پاس آئی تھی اور اس میں شرکت کرنے پر اصرار بھی کیا تھا مگر جمیلہ نے انکار کر دیا تھا۔ اس دفعہ بھی اس نے ٹالنے کی کوشش کی، بولی۔ "پھاتاں! تو جا، میں تھوڑی دیر بعد آ جاؤں گی۔ مجھے ادھر کئی ضروری کام نمٹانے ہیں۔ تو دیکھ رہی ہے ادھر کتنا کام ہو رہا ہے۔"

"وہ تو تیرے بناں بھی ہوتا رہے گا۔" پھاتاں نہ مانی، اپنی بات پر اڑ گئی۔ اس نے اپنا دوپٹہ اتار کر جمیلہ کے قدموں پر ڈال دیا۔ "بھین جی، میری لاج کی خاطر تجھے چلنا پڑے گا۔ تو نہ گئی تو میں بھی اب تاجاں کے پاس نہیں جاؤں گی۔"

رحیم داد، جو شام ہی سے مہمان خانے میں پہنچ کر جمیلہ کے قریب ہی بیٹھا تھا اور بہت دیر سے خاموش تھا، پھاتاں کے گڑگڑانے سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے جمیلہ کی جانب دیکھا اور نرم لہجے میں مخاطب کیا۔ "زمیں دارنی، اب تو چلی جا۔" اس کے لہجے میں بھی عاجزی تھی۔

جمیلہ نے کچھ نہ کہا۔ خاموش بیٹھی رہی۔ اس کا لباس اس وقت بھی حسبِ معمول سفید ہی تھا۔ البتہ وہ دوشالہ سبز رنگ کا اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کے کنارے سنہری تھے۔ آنکھوں میں دنبالہ کاجل تھا۔ چہرے پر سردی سے گلاب کھل رہے تھے۔ کانوں میں سونے کے مندرے پڑے تھے۔ پیٹرومیکس کی تیز روشنی میں وہ جگمگا رہی تھی، دل کش اور دل آرا نظر آ رہی تھی۔

جمیلہ راج ہنس کی مانند اپنی صراحی دار گردن اونچی اٹھائے گم صم بیٹھی سوچتی رہی۔ پھاتاں اس کے روبرو مجسم التجا بنی کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر بے چینی اور اضطراب کے سائے منڈلا رہے تھے۔ رحیم داد نے ایک بار پھر نرم لہجے میں جمیلہ سے

درخواست کی۔" زمیں دار نی، اب چلی بھی جا۔ تاجاں تو پھاتاں سے زیادہ تیری دھی ہے۔ تو اس کے مائیاں بیٹھتے پر نہیں جائے گی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ذرا سوچ تو یہ کیسا لگے گا؟"

جمیلہ نے اس دفعہ بھی کچھ نہ کہا۔ جھک کر پیروں پر پڑا ہوا دوپٹہ اٹھایا۔ پھاتاں کے سر پر ڈالا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ آگے بڑھی۔ پھاتاں اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ رحیم داد دونوں کو جاتے ہوئے بڑے اشتیاق سے دیکھتا رہا۔ جب وہ مہمان خانے کا دروازہ کھول کر باہر چلی گئیں تو رحیم داد نے گہری سانس بھری اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کمرے کے سامنے سے گزرا جس میں نادر خاں بیوی بچوں کے ساتھ عارضی طور پر مقیم تھا۔ جنّت اس وقت کمرے میں موجود نہ تھی۔ وہ اپنی تینوں بچیوں کے ہمراہ مائیوں کی تقریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔ نادر خاں بھی کمرے میں نہیں تھا۔ رحیم داد نے کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر ایک اُچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور آگے نکل گیا۔ وہ پھر واپس مہمان خانے میں آیا۔

☆

تاجاں کو مائیوں بیٹھے ہوئے چار روز گزر چکے تھے اور ابھی اسے مزید سات روز مائیوں بیٹھنا تھا۔ اس عرصے میں رحیم داد کو نادر خاں کم ہی نظر آیا۔ وہ ان دنوں جمیلہ کی اردلی میں تھا اور تاجاں کی شادی کی تیاری میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ مگر رحیم داد کو تاجاں کے بیاہ کی سرگرمیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ ہر وقت اکتایا ہوا سا رہتا۔ خود کو تنہا محسوس کرتا، بے چین اور مضطرب رہتا۔

انھی دنوں ایک سہ پہر کو رحیم داد نے وکیل عثمان راٹھور کو ایک بار پھر حویلی میں دیکھا۔ وہ سیدھا جمیلہ کے پاس اوپر چلا گیا۔ جب وہ جمیلہ سے طویل بات چیت کے بعد نیچے آیا تو گہرا دھندلکا پھیلنے لگا تھا۔ شام مشرقی افق سے زینہ زینہ نیچے اتر رہی تھی وکیل اپنے کسی زمیں دار موکّل کی کار میں آیا تھا۔ وہ اسی میں بیٹھ کر واپس چلا گیا۔

وکیل کی اچانک آمد رحیم داد کو بہت پراسرار معلوم ہوئی۔ وہ ایک بار پھر تشویش اور بے چینی میں مبتلا ہوگیا۔ اس کے ذہن میں دبے دبے وسوسوں اور شبہات نے از سرِ نو سر ابھارا۔ وہ پریشانی اور اضطراب کے عالم میں تنہا بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔

ملازم کھانا لایا تو رحیم داد ذہنی انتشار کے باعث رغبت سے نہ کھا سکا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ مہمان خانے میں چلا گیا مگر نہ وہاں نادر خاں تھا نہ جنت تھی۔ نادر خاں کے کمرے کا دروازہ اس وقت بھی کھلا تھا۔ چارپائیاں خالی تھیں۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ جمیلہ بھی اسے مہمان خانے میں کہیں نظر نہ آئی۔ صرف نوکر چاکر ادھر اُدھر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بہت مصروف اور سرگرم معلوم ہو رہے تھے۔

تاجاں جہاں مائیوں بیٹھی تھی، وہاں ڈھولک ٹھنک رہی تھی۔ لڑکیوں کے گانے کی ملی جلی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ اس وقت تاجاں کے بدن پر بٹنا ملا جا رہا تھا۔ گیت کے بولوں سے رحیم داد نے یہی اندازہ لگایا۔ لڑکیاں بٹنا مل رہی تھیں اور تالیوں کی تھاپ پر لہک لہک کر گا رہی تھیں۔ تاجاں سے یوں چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں۔

تیں نوں مائیں پاون آئیاں بی بی
کجھ بھیناں تے بھرجائیاں بی بی
کجھ چاچیاں، تے کجھ تائیاں بی بی
تے کجھ چاچے تائے دیاں جائیاں بی بی

رحیم داد ذرا دیر خاموشی سے گیت سنتا رہا، پھر اکتا گیا اور حویلی میں واپس چلا گیا اس کا ارادہ تھا کہ اوپر کی منزل پر جائے اور باتوں باتوں میں جمیلہ سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ وکیل اس کے پاس کیوں آیا تھا۔ کس مقصد سے آیا تھا؟

وہ کمرے سے نکل کر زینے پر پہنچا تو سیڑھیوں پر حویلی کی ملازمہ ناجو نظر آئی۔ وہ اوپر ہی سے آ رہی تھی۔ رحیم داد نے اسے ٹوکا "گل سن ناجو۔ یہ بتا زیبی دارنی اوپر

ہی ہے ناں؟"

"نہیں جی، وہ تو شام ہی سے تاجاں کے پاس ہے۔"

"کب تک واپس آئے گی؟"

"دیر ہی سے آئے گی جی۔" ناجو نے رحیم داد کو بتایا "روز ہی وہاں سے دیر کو لوٹتی ہے۔"

رحیم داد نے ناجو سے مزید بات چیت غیر ضروری سمجھی۔ واپس اپنے کمرے میں چلا گیا اور بستر پر لیٹ کر سو گیا۔ نہ جانے کتنی رات گزری تھی۔ اس کی آنکھ آہٹ سے کھل گئی۔ اس نے سنا دروازے پر آہستہ آہستہ دستک ہو رہی تھی۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ پلنگ سے نیچے اترا۔ آگے بڑھا، دروازہ کھولا۔ دیکھا، سامنے جنّت کھڑی تھی۔ وہ سردی سے تھر تھرا رہی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ جھٹ اندر داخل ہو گئی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ سارے نوکر چاکر تھک کر بستروں میں دبکے گہری نیند سو رہے تھے۔

رحیم داد نے دروازہ بند کرتے ہوئے جنّت سے پوچھا "تو اتنی رات گزرے کیسے آ گئی۔ نادر کہاں ہے؟"

"وہ تو جی لہور گیا ہے۔" جنّت نے جواب دیا "زمیں دارنی نے اسے شام ہی کو بھیجا ہے۔ اب تو وہ کل ہی واپس آئے گا۔"

جنّت رحیم داد کے بستر پر بیٹھ گئی۔ اس کا بدن سردی سے ہنوز کپکپا رہا تھا۔ اس نے لحاف اٹھا کر اپنے پیروں پر ڈال لیا۔ رحیم داد نے دریافت کیا "اس رات جب میں تیرے پاس گیا تھا، نادر خفا تو نہیں ہوا۔ کیا کہتا تھا وہ؟"

"اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ تیرے بارے میں اس سے کوئی گل بات ہی نہیں ہوئی۔"

"بعد میں بھی کوئی گل بات نہیں ہوئی؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"بس اتنا کہا تھا، تا جاں کے ویاہ کے بعد اپنے پیو کے پاس رحمت والی چلی جا"
جنّت نے بتایا۔" چوہدری! اس نے تجھ سے تو کچھ نہیں پوچھا؟"

"اس رات کے بعد سے وہ میرے پاس آیا ہی نہیں" رحیم داد نے جنّت کو مطلع کیا" ہاں، مجھ سے یہ کہتا تھا کہ کچھ ضروری گل کرنی ہے۔ پتہ نہیں کیا کہنا چاہتا تھا؟"

جنّت اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے بولی" میں تو تیرے پاس پہلے ہی آتی پر زمین دارنی نے مجھے تا جاں کے ساتھ لگا دیا ہے۔ رات کو میں اسی کے پاس ہوتی ہوں"

"آج کیسے اِدھر نکل آئی؟"

" وہ ایسا ہوا جی، نادر لہور گیا ہے۔ چھوہریوں کے پاس کوئی نہیں۔ اکیلے میں ڈرتی ہیں" جنّت نے بتایا" زمیں دارنی نے آج رات پٹھاناں کو تا جاں کے پاس لگا دیا ہے۔ میں مہمان خانے کے کمرے میں رہی۔ رات گزری تو تیرے پاس آگئی"

"زمیں دارنی نے تو تجھ سے اس رات کے بارے میں پوچھ تاچھ نہیں کی؟"

" وہ ایسا کیوں کرتی؟ اس نے کیا پتہ؟" جنّت نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

" نادر خاں نے اسی رات مجھے بتایا تھا کہ زمیں دارنی کو میرے جوتے منجی کے نیچے پڑے دیکھ کر شبہ ہو گیا تھا"

" مجھ سے تو اس نے کچھ پوچھا نہیں" جنّت نے بے نیازی سے کہا" پر تو اتنا گھبرا گیا تھا کہ جوتے پہن نے بھی بھول گیا۔ حد کر دی تو نے"

" لگتا ہے نادر مجھ سے کچھ ناراض ہے" رحیم داد نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "جب ہی تو میرے پاس اب تک نہیں آیا"

" مجھے تو ایسا لگتا نہیں" جنّت نے اطمینان سے کہا" ویسے آج کل تا جاں کے ویاہ کی تیاری میں نادر بری طرح الجھا ہوا ہے۔ زمیں دارنی نے ویاہ کا سارا ہی بوجھ اس پہ ڈال رکھا ہے"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ جنّت بھی خاموش رہی۔

علی الصّباح رحیم داد کی آنکھ کھلی تو جنّت اٹھ کر جا رہی تھی۔ رحیم داد نے اسے دیکھا مگر خاموش رہا۔ جنت کمرے سے باہر نکلی تو ہوا کا سرد جھونکا اندر آیا۔ باہر ہلکی ہلکی دودھیا کہر کی چادر ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ جنّت نے دہلیز عبور کرنے کے بعد آہستہ سے دروازہ بھیڑ دیا۔ ابھی بہت تڑکا تھا۔ ہر سو گہری خاموشی طاری تھی۔ سردی بھی شدید تھی۔ رحیم داد لحاف میں دبکا ہوا بستر پر لیٹا رہا۔

☆

پہر رات گزر چکی تھی۔ رحیم داد کھانا کھا رہا تھا کہ نادر خاں اچانک کمرے میں داخل ہوا۔ رحیم داد اسے دیکھ کر قدرے پریشان ہو گیا۔ اس نے نادر کی جانب دیکھے بغیر نرم لہجے میں دریافت کیا "نادر، تو اتنے روز کہاں رہا؟ میرے پاس آیا ہی نہیں۔"

"زمیں دارنی نے ویاہ کے کاموں میں ایسا الجھا دیا ہے کہ فرصت ہی نہیں ملتی۔" نادرخاں نے صفائی پیش کی۔ "لہور گیا تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے واپس آیا ہوں۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ خاموش بیٹھا کھانا کھاتا رہا۔ نادر خاں بھی خاموش رہا۔ کمرے میں سکوت چھایا تھا۔ ذرا دیر بعد نادر خاں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ سنبھلے ہوئے لہجے گویا ہوا "چوہدری، تجھ سے بہت ضروری گل کرنی تھی۔"

"اس رات کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہے؟" رحیم داد نے اس کی جانب دیکھے بغیر جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"اُسے چھوڑ۔ چوہدری، یہ اور ہی گل ہے اور بہت پریشانی کی گل ہے۔" نادر خاں نے اپنی بات کی اہمیت جتانے کی کوشش کی۔

رحیم داد نے اس دفعہ مڑ کر اس کی طرف حیرت زدہ نظروں سے دیکھا مگر چپ رہا۔

"میں تجھ سے اس بارے میں بہت پہلے بات کرنا چاہتا تھا۔" نادر خاں نے کہا۔ "پر موکع ہی نہ ملا۔"

"ایسی کیا پریشانی کی گل بات ہے؟" رحیم داد کے لہجے سے تشویش آشکارہ تھی۔
"تو سنے گا تو دنگ رہ جائے گا۔" نادر خاں نے کھل کر بات نہ کی۔
"تو فیر بتانا۔ اس طرح چبا چبا کر کیوں بات کر رہا ہے؟" رحیم داد نے بے چین ہو کر کہا۔

"شبہ تو جی مجھے پہلے ہی تھا پر اب تو تصدیق بھی ہو گئی۔" نادر خاں نے بتایا۔
"اسی لیے میں نے تجھ سے اب تک اس معاملے میں بات نہیں کی۔ سوچا پہلے تصدیق کر لوں تب تجھے آگاہ کروں کہ کیا ہو رہا ہے۔"

"کیا ہو رہا ہے؟" رحیم داد کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ اس نے بے قرار ہو کر پہلو بدلا۔ "صاف صاف گل کر۔ تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"
"لگتا ہے تجھے کچھ پتہ نہیں۔" نادر خاں نے گردن آگے بڑھا کر رازداری کے انداز میں آہستہ سے کہا۔ "نیں توں پتہ نہیں۔ زریں دارنی اپنی ساری آراضی بیچ رہی ہے۔"
رحیم داد ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے گھبرا کر کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ بھوک اڑ گئی۔ حیران و پریشان ہو کر بولا۔ "پر یہ کیسے ہو سکتا ہے نادر۔ تجھے کس نے بتایا کہ زریں دارنی اپنی آراضی بیچ رہی ہے؟"

"یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا۔" نادر خاں گویا ہوا۔ "پر تیری باتوں سے لگتا ہے کہ تجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ زریں دارنی نے وکیل عثمان راٹھور کی معرفت لاہور میں کرائے پر مکان بھی لے لیا ہے۔"
"مجھے شبہ تو ہوا تھا اور میں نے اپنے شبے کا جمیلہ سے اظہار بھی کیا تھا۔ پر اس نے صاف انکار کر دیا کہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔" رحیم داد نے قدرے توقف کیا پھر بولا۔
"لیکن وکیل کا روز روز آنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ تیری بات میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے۔"
"چوہدری! یہ چکر تو بہت دن سے چل رہا ہے۔"
"وکیل، کل بھی جمیلہ کے پاس آیا تھا اور شام تک اوپر بیٹھا جمیلہ سے باتیں کرتا

رہا۔" رحیم داد نے شکوہ کیا۔" میرے دروازے کے سامنے سے گزرتا ہے پر مجھ سے ایک بار بھی اس نے ملنے اور بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس طرح گزر جاتا ہے جیسے مجھ سے کبھی ملا نہ ہو، کوئی جان پہچان نہ ہو۔" اس نے لمحہ بھر کے لیے تامل کیا پھر گویا ہوا۔" مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ دینے نے بھی جمیلہ سے کچھ الٹی سیدھی گل بات کی ہے۔"

"دینا کیا الٹی سیدھی بات کر سکتا ہے؟" نادر خاں کے لہجے میں استعجاب تھا۔

"مجھے کچھ شبہ ہوا تھا۔" رحیم داد نے اپنے شبے کی نوعیت نہ بتائی۔ وہ اس معاملہ میں نادر خاں کو اعتماد میں لینا نہ چاہتا تھا۔ اس نے فوراً بات کا رخ بدل دیا۔" یہ بتا تجھے ان باتوں کا کیسے پتہ چلا؟"

"مجھے تو جی اس طرح پتہ چلا کہ پچھلی بار جب میں لہور گیا تھا تو وکیل کے دفتر بھی گیا۔ یہ تو تجھے پتہ ہی ہوگا کہ اس نے اب لہور میں پریکٹس شروع کر دی ہے۔"

"مجھے اس کا پتہ ہے۔ جمیلہ ہی نے بتایا تھا۔"

"وہ ایسا ہوا جی، میں نے وکیل کا بورڈ دیکھا تو اس کے دفتر میں چلا گیا۔ کام تو اس سے کچھ تھا نہیں۔ سوچا سلام دعا کر لوں۔ اس سے میل ملاپ رکھنا چاہیے۔ زمیں داری میں تو وکیل کی کبھی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔" نادر خاں سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔" وکیل تو دفتر میں موجود نہ تھا پر اس کا منشی مل گیا۔ اس نے مجھے چائے بھی پلائی۔ باتوں باتوں میں اس سے پتہ چلا کہ زمیں داری نے وکیل سے بیع نامہ تیار کرایا ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔" منشی سمجھا میں بیع نامے کے بارے میں معلوم کرنے آیا ہوں۔ اس نے یہ تو بتا دیا کہ بیع نامہ تیار ہو گیا ہے پر اس کے بارے میں اور کچھ نہ بتایا۔ میں نے بہت کوشش کی پر وہ کچھ بتلانے پر آمادہ نہ ہوا۔"

"ایسی بات تھی تو مجھے فوراً بتانا چاہیے تھا۔"

"میں نے سوچا جی، پہلے تصدیق ہو جائے تب ہی اس معاملہ میں تجھ سے بات کروں۔" نادر خاں نے وضاحت کی۔" مان لے۔ میرا شبہ غلط ہوتا اور تو اس بارے میں

زمیں دارنی سے بات کر لینا۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ میں بیچ میں مارا جاتا۔ زمیں دارنی مجھ سے ناراض ہو جاتی۔ وڈّے لوکاں کے جھگڑے میں ہمیشہ چھوٹا ہی مارا جاتا ہے۔ برا نہ منانا چوہدری، میں اسی وجہ سے تجھ سے بات کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا، تجھ سے بات کردوں تو پکّی ہو۔ اس میں کوئی اگر مگر نہ ہو۔"

"تو نے تصدیق کیسے کی؟"

"اس بار جب میں لہور گیا تو وکیل کے دفتر بھی گیا۔" نادر خاں نے رحیم داد کو بتایا۔" اتفاق سے اس بار بھی وکیل اپنے دفتر میں موجود نہ تھا۔ میں سیدھا منشی کے پاس پہنچا۔ اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ گھما پھرا کر بیع نامے کے بارے میں پوچھا۔ پردہ کھلا نہیں۔ شاید وکیل نے منع کر دیا ہو گا۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔" تب میں نے جی سدھی سدھی ترکیب نمبر ۱۱۳ استعمال کی۔ دس دس کے دو نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھے۔ فیر تو جی اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ بیع نامہ بھی دکھا دیا۔"

رحیم داد پریشان ہو کر بولا۔" اب تو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی۔"

"ہاں جی، اب تو سب کچھ کھل کر سامنے آگیا ہے۔" رحیم داد نے کہا۔" ۲۰ روپے میں نے زمیں دارنی کی رقم میں سے دیے ہیں۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کے ٹین کے ٹرنک کی جانب دیکھا۔ "چوہدری! تو وڈّا زمیں دار ہے۔ تینوں نوں یہ ٹرنک لے کر سفر نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ تجھے زیب نہیں دیتا۔ میں تیرے لیے چمڑے کا ایک سوٹ کیس بھی خرید کر لایا ہوں۔ بہت عمدہ ہے۔ ۵۰ روپے میں ملا ہے۔ اب سفر پر اسے ہی لے جانا۔ ٹین کا ٹرنک تیری شان کے خلاف لگتا ہے۔"

رحیم داد خاموشی سے اٹھا۔ ٹرنک کا تالا کھولا۔ سو روپے نکالے۔ اٹھ کر نادر خاں کے پاس گیا اور روپے اس کے ہاتھ پر رکھ کر بولا۔" لے، یہ روپے رکھ لے۔"

"سوٹ کیس میرے پاس ہے۔ بعد میں تجھے پہنچا دوں گا۔"

"آجائے گا۔ جب جی چاہے پہنچا دینا۔" رحیم داد نے بے نیازی سے کہا۔" تو مجھے ٹھیک ٹھیک بتا۔ وکیل کے منشی سے تیری کیا کیا گل بات ہوئی؟ تو نے تو مجھے الجھن میں

ڈال دیا ہے۔"

"پریشانی کی تو جی بات ہی ہے۔" نادر نے نوٹ کوٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا "منشی نے مجھے بتایا کہ ادھر زمین دارنی کی جو آراضی ہے، اس کا سودا پکا ہو چکا ہے۔ وکیل نے بیع نامہ اور دوسری ضروری دستاویزات بھی تیار کر لی ہیں۔ اس نے مجھے سارے ہی کاغذات دکھا دیے۔"

"یہ تو نے بہت بری خبر سنائی۔" رحیم داد نے کرسی کھسکا کر نادر کے قریب کر لی۔ "یہ بتا، اب کیا کیا جائے۔ اپنا تو مغز بالکل کام نہیں کرتا۔ سمجھ نہیں آتی کیا کروں۔"

"فکر نہ کر چوہدری، ابھی بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔" نادر نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "تیرا حکم ہونا چاہیے، سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ میں تیرا بندہ ہوں۔ سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔"

"مجھے، تجھ سے ایسی ہی امید ہے۔" رحیم داد دفعتاً جذباتی ہو گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں نادر خاں کا ہاتھ پکڑ کر گرم جوشی سے دبایا۔ "تیرا بہت وڈا دل ہے۔ نادر! میں نے سوچا بھی نہ تھا تو میرا اتنا وفادار ہے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "سچ کہتا ہوں، میں نے تجھے اب تک اتنا اچھا اور وفادار بندہ نہیں سمجھا تھا۔"

"چوہدری جب تو نے مجھے اپنا وفادار بندہ کہا ہے تو اب میرا بھی یہ فرض ہے کہ تجھے یہ بتا دوں کہ زمین دارنی سے نکاح کرنے کا خیال دل سے نکال دے۔ وہ کبھی تیری نہیں بن سکتی۔" نادر خاں نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "وہ لہور جاتی ہے تو جانے دے۔ پر اس کی آراضی نہیں جانی چاہیے۔"

"جب تک جمیلہ سے نکاح نہ ہو اور دونوں بچے میرے پاس نہ ہوں تب تک آراضی کیسے مل سکتی ہے۔" رحیم داد نے اپنی سمجھ کے مطابق مسئلہ کا قانونی پہلو پیش کیا۔ "تو ٹھیک کہتا ہے آراضی کسی طرح نہیں جانی چاہیے۔ نکاح کے بعد وہ میرے کبضے میں آ جائے گی۔ شاہ جی کا بھی یہی خیال ہے۔"

"شاہ جی بھی ٹھیک ہی کہتا ہے۔ ہونا تو یہی چاہیئے۔"

"میں تو کہتا ہوں نادر، ساری گل بات شاہ جی کو فوراً بتا دینی چاہئیے۔" رحیم داد نے نادر کا عندیہ معلوم کرنے کی غرض سے کہا۔ "تو کیا کہتا ہے؟ میرا تو خیال ہے وہ بالکل ٹھیک مشورہ دے سکتا ہے۔ ایسے معاملات کو وہ بہت اچھی طرح سمجھتا ہے۔ وہ بہت ہوشیار اور تجربہ کار بندہ ہے۔"

"تب تو شاہ جی سے جلد ہی ملنے اور بات کرنے کی ضرورت ہے۔" نادر خاں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ "اب تو فوری کاروائی کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔"

"نادر! ایسا کر۔ تو کل سویرے شاہ جی کے پاس چلا جا۔"

"چوہدری، مجھے اس وکت شاہ جی کے پاس نہ بھیج۔ زمیں دارنی کو فوراً میرے بارے میں شبہ ہو جائے گا۔ ابھی تک اسے پتہ نہیں کہ میرا شاہ جی سے میل ملاپ ہے۔ تجھے تو خود ہی شاہ جی کے پاس جانا ہوگا۔"

"جمیلہ کو شبہ تو میرے بارے میں بھی ہو سکتا ہے۔" رحیم داد نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"میں اسے کہہ دوں گا، چوہدری کا ویاہ کے شور شرابے سے دل گھبرا رہا تھا۔ وہ اپنے کسی یار دوست سے ملنے ملتان گیا ہے۔" نادر خاں نے مشورہ دیا۔ "ویسے اسے شبہ ہو بھی جائے تو کیا ہوگا۔ وہ تو اپنی کاروائی سمجھو پوری کر ہی چکی ہے۔ اب تو تئیں نوں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا اور چھیتی نال کرنا ہوگا۔ میں تو کہتا ہوں تو کل ہی صبح شاہ جی کے پاس چلا جا۔"

نادر خاں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "کہاں چلا نادر؟"

"چوہدری، مجھے اب جانے دے۔ زمیں دارنی میرا انتظار کرتی ہو گی۔"

نادر خاں چلا گیا۔ رحیم داد سخت ذہنی خلفشار میں مبتلا تھا۔ وہ بے چینی کے عالم

بیں آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس رات بھی وہ دیر تک جاگتا رہا۔

☆

جنوری کا مہینہ ختم ہو رہا تھا مگر سردی میں کمی نہ آئی تھی بلکہ کچھ بڑھ ہی گئی تھی۔ دن چڑھ چکا تھا۔

سرما کی ہلکی ہلکی دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ رحیم داد ناشتہ کرنے کے بعد صحن میں آگیا تھا اور کرسی پر دھوپ میں بیٹھا تھا۔ وہ پریشانی میں مبتلا تھا۔ اسے رہ رہ کر نادر کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ وہ احسان علی شاہ کے پاس جانے اور اس سے ملنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔

رحیم داد کو صحن میں پہنچے ہوئے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ جمیلہ زینے سے اُتری۔ اس نے رحیم داد کو دھوپ میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ ناجاں کے پاس جانے کے لیے نکلی تھی۔ مگر کچھ سوچ کر اس نے ناجاں کے پاس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ مڑی اور رحیم داد کی جانب بڑھی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔ نوکر نے فوراً اس کے لئے کرسی لا کر رکھ دی۔

جمیلہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "چوہدری، تو کچھ پریشان پریشان دکھائی دے رہا ہے۔ طبیعت تو تیری ٹھیک ہے نا؟"

جمیلہ کے رویے میں پہلی سی ہم دردی اور لگاؤ تھا۔ رحیم داد نے اسے محسوس کیا، نرم لہجے میں گویا ہوا۔ "زیبں دارنی، طبیعت ویسے ٹھیک ہی ٹھاک ہے۔ پر خالی بیٹھے بیٹھے دل بہت گھبراتا ہے۔ کوئی کام کاج تو کرنے کو ہے نہیں۔"

"وڈا زمیں دار بن نے میں یہی تو کٹھنائی ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "تو نے اوپر سے

منیجر بھی لگا رکھا ہے۔ تیرے لیے اب کرنے کو رہ کیا گیا ہے۔ اسی کارن تو جگیر دار اور وڈّے زمیں دار رسہ گیری کا دھندا کرتے ہیں۔ مزارعوں کی جوان گھر والیوں اور کڑیوں کو اٹھوا لیتے ہیں۔" وہ بے تکلفی سے کھلکھلا کر ہنسی۔" پنڈ میں من نہیں لگتا تو لہور یا کسی اور وڈّے شہر میں کوٹھیاں اور بنگلے بنواتے ہیں۔ منیجر اور منشی زمیں داری چلاتے ہیں اور وہ عیش کرتے ہیں۔ شراب اور دارو پیتے ہیں۔ نت نئے ویاہ رچاتے ہیں۔ ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر سیاست لڑاتے ہیں۔ من بہلانے کے لیے کوئی تو شغل ہونا چاہیے۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔" اور سیاست کے مشغلے میں تو فائدہ ہی فائدہ ہے۔ جگیر اور زمیں داری کم ہونے کی بجائے بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عیش کرنے کے لیے آمدنی بھی بڑھتی جاتی ہے۔"

رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔" تو بھی تو لہور جانا چاہتی ہے۔"

"میں نے کون سی سیاست لڑانی ہے۔" جمیلہ نے فوراً صفائی پیش کی۔" میں تو گڈو اور نینا کی پڑھائی کے لیے لہور جانا چاہتی تھی۔ سوچا تھا وہاں کسی سکول میں نوکری کر لوں گی۔ میری آشا ایم۔ اے کرنے کی ہے۔"

" زمیں دارنی، اتنا تو تو نے پڑھ لیا۔ اب اور پڑھ کر کیا کرے گی۔" رحیم داد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔" تو تو اپنے سکول کو سرکاری بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ چلی گئی تو اس کا کیا بنے گا؟"

"یہی سوچ کر تو میں نے لہور جانے کا ارادہ چھوڑ دیا۔ تجھے تو پہلے ہی بتا چکی ہوں۔" جمیلہ کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔" سکول کا معاملہ ٹھیک ہو جائے تو میں ڈسپنسری بنانے کا کام شروع کر دوں گی۔ تجھے تو پتہ ہی ہے کہ میں ڈسپنسری کیوں بنانا چاہتی ہوں۔"

" وہی ڈاکٹر دیر ندر والی گل ہے نا؟" رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔" لگتا ہے تو ابھی تک اسے بھولی نہیں۔"

" بہت سی یادیں ایسی ہوتی ہیں جو کبھی بھولنے والی نہیں ہوتیں۔" اس نے

ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کے چہرے پر دکھ کا سایہ پھیل گیا۔" اس کی تو بات ہی اور ہے۔ میں تو اللہ وسایا کو بھی نہیں بھول سکی۔ جب تک اس کے دونوں بچے موجود ہیں، میں اسے کیسے بھول سکتی ہوں۔"

"کیا کیا جائے زمیں دارنی، رب کی یہی مرضی تھی۔" رحیم داد نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔" اس کے نصیب میں یہی لکھا تھا۔"

"اللہ وسایا نے تو کسی کی ہتیا نہیں کی تھی پر اسے کتل کر دیا گیا۔" جمیلہ نے رقت انگیز لہجے میں کہا۔" جیرے نے اپنی گھر والی لاڈو کے ساتھ اس کے یار سلیم کا بھی خون کر دیا۔ اب پولس ریمانڈ پر حوالات میں پڑا ہے۔ منتیں کرتا ہے۔ پچھتاتا ہے۔"

"تجھے کیسے پتہ چلا جیرا پچھتاتا ہے۔" رحیم داد نے استفسار کیا۔" وہ تو خود ہی تھانے گیا تھا۔ تو نے روکا تو تیری بات بھی نہ سنی۔"

"اس سمے تو اس کے سر پر خون سوار تھا۔ وہ اپنے ہوش ہی میں کب تھا۔" جمیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔" پچھلے دنوں اس کا پیو دین محمد آیا تھا۔ روتا تھا، جیرا کا حال بتاتا تھا۔ جوان پتر ہے۔ اسے تو دکھی ہونا ہی چاہیے۔ اس کی تو جیون بھر کی کمائی تھی۔" اس نے اپنی شال اتار کر زانو پر رکھ لی۔ اس کا گلابی چہرہ دھوپ کی تمازت سے تمتما رہا تھا۔ پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلملا رہے تھے۔

"دین محمد اب کیا چاہتا ہے؟"

"جیرا کی ضمانت کرانا چاہتا ہے۔ وکیل کھڑا کر کے کیس لڑانا چاہتا ہے۔ اسی کارن میرے پاس آیا تھا۔" جمیلہ نے بتایا۔" اسی کے لیے میں نے اپنے وکیل راٹھور کو بلایا تھا۔"

رحیم داد اس کی بات سن کر مخمصے میں پڑ گیا۔ جمیلہ کی باتوں سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا لاہور جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اس نے وکیل کو بھی کسی بیع نامے کی تیاری کے لیے نہیں بلکہ جیرا کے مقدمے کی پیروی کی خاطر بلایا تھا۔ مگر نادر خاں کا بیان قطعی مختلف تھا۔ اس نے وکیل کے منشی سے جو کچھ سنا تھا اور جو دستاویزات اپنی آنکھوں سے دیکھی

تھیں، وہ ساری ہی تفصیلات نہ صرف بے حد پریشان کن تھیں بلکہ اس سلسلہ میں جلد سے جلد قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔ جمیلہ اور نادر خاں میں سے کون سچا تھا اور کون جھوٹا۔ کس کا بیان درست تھا، کس کا غلط۔ رحیم داد کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ اس معاملہ میں احسان شاہ ہی اس کی رہنمائی کر سکتا تھا۔ وہ پرانا گھاگ اور جہاں دیدہ تھا۔ وہ رحیم داد کی رہنمائی اور مدد کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا تھا۔

رحیم داد کو گم صم دیکھ کر جمیلہ نے پوچھا "چوہدری تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

"سوچ رہا تھا کچھ دنوں کے لیے ملتان چلا جاؤں" رحیم داد نے جواب دیا۔ "اُدھر میرا ایک پرانا ملنے والا ہے۔ اس کے ساتھ اچھا وکت گزر جاتا ہے۔"

"تجھ پر کسی نئی الاٹمنٹ کی دھن تو سوار نہیں ہو گئی؟" وہ ہنس کر بولی۔

"نہیں، زیمیں دارنی ایسی کوئی گل بات نہیں۔" اس نے جمیلہ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "یہاں دل گھبراتا ہے۔ اس کے پاس گیا تو شکار کھیلوں گا۔ تیں نوں پتہ نہیں، پہلے میں شکار کا بہت رسیا تھا۔ پچھلے دنوں جب ملتان اور بھکر میں تھا تو زیادہ دن شکار کھیلنے ہی میں گزرے۔"

"میری آشا ہے کہ ناجاں کی جنج چڑھے تو اس کے سسرال والوں کا تو سواگت کرے۔ تیرے سوا ادھر کون ایسا ہے۔" جمیلہ نے نرمی سے کہا۔ "مکلاوے کے سمے تو تیرا موجود ہونا بہت ضروری ہے۔ تو ناجاں کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرے گا، اسے بدا کرےگا۔ وہ تو اپنے پنڈ ہی کی نہیں اس گھر کی بیٹی ہے۔" اس کا لہجہ معاً غم ناک ہو گیا۔ "اس بے چاری کا تو نہ پیو ہے نہ بھرا۔ ایسے میں تیرا ادھر ہونا بہت ضروری ہے۔ اگے تیری مرضی۔" اس نے گلہ کیا۔ "جو من کرے ویسا کر۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"فکر نہ کر زیمیں دارنی، میں جنج پہنچنے سے پہلے ہی واپس آ جاؤں گا۔" رحیم داد نے جمیلہ کو باور کرانے کی کوشش کی۔ "ویسے جنج کے آنے میں تو ابھی ہفتہ سے زیادہ رہتا ہے۔ ابھی تو زنانیوں کی شورا شوری ہے۔ میں تو ادھر رہ کر ابھی کچھ نہیں کر سکتا۔" وہ کھل کر

مسکرایا۔" ویسے تو جو موجود ہے فیر فکر کا ہے کی۔"

" جانا چاہتا ہے تو چلا جا۔" جمیلہ نے اسے روکنے پر زیادہ اصرار نہ کیا۔" پر جنج آنے سے پہلے ضرور آجانا ورنہ مجھے دکھ ہوگا۔"

" کیسی گل بات کر رہی ہے زیں دارنی۔ تجھے دکھ پہنچانے کی تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔" اس نے کسی قدر جوش و خروش کا اظہار کیا۔" جیسا تو کہہ رہی ہے بالکل ویسا ہی کروں گا۔ تو بالکل فکر نہ کر۔"

رحیم داد نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ جنّت آگئی۔ وہ اس وقت خوب بن ٹھن کر آئی تھی۔ لباس بھی شوخ اور بھڑک دار تھا۔ زیور بھی سارے ہی پہنے ہوئے تھی۔ اس کا گورا گورا چہرہ دھوپ سے دمک رہا تھا۔

جنّت نے قریب پہنچ کر رحیم داد سے کہا۔" چوہدری! تو نے زیں دارنی کو اِدھر باتوں میں لگا رکھا ہے۔ اُدھر سب ہی اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ تا جاں تو بار بار پوچھ رہی ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ جمیلہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے شال اوڑھی اور جنّت کے ہمراہ چلی گئی۔

رحیم داد بھی زیادہ دیر صحن میں نہ ٹھیرا۔ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ نادر خاں کے لائے ہوئے سوٹ کیس میں اس نے کپڑے اور سفر کا ضروری سامان رکھا۔ تانگہ بلوایا۔ حویلی سے باہر نکلا۔ تانگے میں سوار ہوا اور احسان شاہ کے گاؤں پیراں والہ جانے کے لیے لاری اسٹینڈ کی جانب روانہ ہوگیا۔ مگر جب وہ کوٹلہ ہر کشن کی حدود سے باہر نکل رہا تھا تو اس نے دیکھا، دینا سامنے سے آرہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی رحیم داد گھبرا گیا۔ لیکن دینا اسے دیکھ نہ سکا۔

۴۴

آتش دان میں انگارے دہک رہے تھے۔ ان کی گہری سرخ روشنی کمرے میں پھیلی تھی۔ باہر سرد ہوا درختوں میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ رات ٹھنڈی اور سنسان تھی۔ رحیم داد اور احسان شاہ آتش دان کے قریب آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ بیچ میں میز تھی۔ میز پر گلاس تھے، وہسکی کی بوتل تھی اور پانی سے بھرا ہوا شیشے کا جگ تھا۔

احسان شاہ کے بشرے سے غور و فکر کے تاثرات عیاں تھے۔ اُس نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور وہسکی کا گھونٹ بھر کے رحیم داد سے مخاطب ہوا۔ "چوہدری! اس کا مطلب یہ ہوا کہ جمیلہ ساری تیاریاں کر چکی ہے۔ اُس نے اپنی زمین کا سودا کر لیا ہے۔ وکیل سے بیع نامہ بھی کرا لیا ہے۔ وہ لہور جا رہی ہے۔ اور وکیل کی معرفت اس نے وہاں مکان بھی کرائے پر لے لیا ہے۔ نادر خاں نے تجھے یہی بتایا ہے ناں؟" اُس نے رحیم داد کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ "تو نے جمیلہ سے بھی ٹوہ لگانے کی کوشش کی تھی۔ وہ کیا کہتی ہے؟"

"جمیلہ سے میری بات چیت ہوئی تھی۔" رحیم داد نے جواب دیا۔ "اُس کی باتوں سے تو کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بلکہ ایسا لگتا ہے کہ نہ تو وہ زمین بیچنے کا کوئی ارادہ رکھتی ہے اور نہ ہی لہور جا رہی ہے۔"

"تو نے کیسے یہ اندازہ لگایا؟" احسان شاہ نے حیرت سے پوچھا۔

"بات یہ ہے شاہ جی، وہ تو اپنے سکول کو سرکاری بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کام کے لیے وہ پچھلے دنوں منٹگمری میں ڈپٹی کمشنر سے بھی ملی تھی۔ کہتی تھی اُس نے مدد کرنے کا

وعدہ کیا ہے۔"

رحیم داد مزید بتانا چاہتا تھا مگر احسان شاہ نے اُسے آگے بولنے نہ دیا۔ "سکول تو سرکاری بننا سُننا نہیں۔" اُس کے لہجے میں جھنجلاہٹ اور تلخی تھی۔" اور نہ ہی تو بننے دینا۔ اس چکر میں ہرگز ہرگز نہ پڑنا۔ تو نے یہ بھی سوچا۔ مزارعوں اور کمیوں کے مُنڈے پڑھ لکھ گئے تو میرے اور تیرے پتر کیا کریں گے۔ میں اس بارے میں پہلے بھی تجھ سے کہہ چکا ہوں۔ لگتا ہے تو نے میری بات پر پوری توجہ ہی نہیں دی۔"

"ایسی گل بات نہیں۔ میں تو تجھے یہ بتا رہا تھا کہ جمیلہ آج کل کیا کر رہی ہے اور کس انداز سے سوچ رہی ہے۔" رحیم داد نے احسان شاہ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے اور جیسا تو کہہ رہا ہے، میں ویسا ہی کروں گا۔" اُس نے بات کا رُخ بدلا۔" شاہ جی سکول کا چکر تو آگے کی گل ہے۔ یہ بتا میں نے اب کیا کرنا چاہیے، اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ نادر کچھ بتاتا ہے جمیلہ کی باتوں سے کچھ اور ہی پتہ چلتا ہے۔ میں تو تیرے پاس آیا ہی اس لیے ہوں کہ تو ٹھیک ٹھیک بتا۔"

"نادر خاں تجھ سے غلط بات نہیں کہہ سکتا۔" احسان شاہ نے کہا۔" یہ تو میں نے پکا یقین ہے۔"

"میں یہ نہیں کہتا کہ نادر نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ پر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وکیل کے منشی ہی نے نادر سے غلط بات کہی ہو۔ یہ میں نے اس لیے سوچا کہ جمیلہ کو زمین بیچ کر لہور جانا ہوتا تو وہ اپنے سکول کو سرکاری بنانے کے چکر میں کیوں پڑتی۔ جب اسے کوٹلہ ہرکشن میں رہنا ہی نہیں تو سکول سرکاری بنے یا نہ بنے، رہے نہ رہے، اُسے اس سے کیا لینا۔" رحیم داد نے اپنے مُوقف کی تائید میں دلیل پیش کی۔ "پچھلے دنوں جمیلہ نے لہور جانا تھا۔ تب اس نے مجھے صاف صاف بتا دیا تھا اور میں اسے سنتے ہی گھبرا کر سیدھا تیرے پاس آیا تھا پر تو ان دنوں یہاں موجود نہ تھا۔ اپنا مراد خاں شاہانی اِدھر ہی مل گیا تھا، میں اس کے ساتھ بھکر چلا گیا۔ اس کے بعد سے اب تجھ سے مل رہا ہوں۔"

احسان شاہ مخمصے میں پڑ گیا۔ ذرا دیر تک نظریں جھکائے سوچتا رہا۔ پھر اس نے نظریں

اٹھا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چوہدری، یہ بتا جمیلہ کا تیرے ساتھ برتاؤ کیسا ہے؟"

"ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔" رحیم داد نے جواب دیا۔ "پہلے تو سخت ناراض تھی اور اتنی ناراض تھی کہ پنڈ چھوڑ کر اپنے بچوں کے ساتھ لہور جانے کو کہتی تھی۔" اُس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "تجھے تو پتہ ہی ہے کہ میں جمیلہ سے چھپ کر تیرے پاس آتا ہوں اور ہر بار کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے آتا ہوں، پر اُسے پتہ چل گیا اور جیسے ہی اُسے پتہ چلا، وہ یک دم بپھر گئی۔ مجھ سے بات چیت کرنی چھوڑ دی۔ پر جب میں بھکر چلا گیا تو اُس کا غصہ ختم ہو گیا، ویسے سچ پوچھ تو نادر اور اُس کی گھر والی جنّت نے جمیلہ کا غصہ ٹھنڈا کرنے میں بڑا کام کیا۔"

"نادر بہت ہوشیار بندہ ہے۔" احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے خوب سوچ سمجھ کر اُسے تیرے پاس لگایا ہے۔ آگے بھی تیرے بہت کام آئے گا۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ وہ بہت وفادار ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ نادر تجھ سے غلط گل نہیں کہہ سکتا۔" اُس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب بھرپور نظروں سے دیکھا۔ "چوہدری! تُو نے یہ بھی تو کہا تھا کہ زمین کی بیع کے کاغذات اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔"

"کہتا تو وہ یہی تھا۔" رحیم داد نے اعتراف کیا۔

"تب تو کچھ نہ کچھ بات ضرور ہے۔" احسان شاہ آہستہ آہستہ گردن ہلانے لگا۔ "تجھے جمیلہ کی باتوں پر اعتبار ہو تو ہو پر مجھے بالکل نہیں۔ وہ پڑھی لکھی ہے۔ بہت تیز اور چالاک ہے اپنے دل کی بات تجھے ہرگز نہیں بتائے گی۔"

رحیم داد نے احسان شاہ سے اختلاف نہیں کیا۔ "تُو نے ٹھیک ہی سوچا۔ اس کے بارے میں شبہ تو مجھے بھی ہے، تبھی تو تیرے پاس مشورہ کرنے آیا ہوں، اب تو بتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟"

"میں کل سویرے لہور جا رہا ہوں۔ میرا اینیجر، مہربان علی بھی ساتھ ہی ہو گا۔ وہ نادر سے بھی زیادہ ہوشیار بندہ ہے۔ میں اسے لگا دوں گا۔ وہ اپنے طور پر سب پتہ چلا لے گا۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ "تجھے زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں شام ہی کو لوٹ آؤں گا۔ تب تک تو صبر کر۔ جمیلہ نے اگے کے لیے جو بھی منصوبے بنا رکھے ہیں، سب کا سراغ

مل جائے گا۔"

"یہ بالکل ٹھیک رہے گا۔" رحیم داد مطمئن ہو کے بولا۔

احسان شاہ پھر خاموش ہو گیا اور گلاس اٹھا کر وہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔ اُسے چپ دیکھ کے رحیم داد اپنی بے چینی کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔" شاہ جی، کیا سوچ رہا ہے۔ کوئی خاص گل ہے؟"

"خاص گل تو نہیں۔ پر مجھے، تجھ سے سخت گلہ ہے۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔

"مجھ سے گلہ ہے؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔

"تو نے زینت کو اپنی حویلی میں کیوں چھپا کر رکھا؟" احسان شاہ نے تلخی سے کہا۔ "تیں نوں پتہ تھا وہ میرے کوٹ سے فرار ہو کر تیرے پنڈ پہنچی تھی۔ تو نے اسے میرے پاس پہنچانے کی بجائے پناہ دے کر اپنے پاس ٹھہرا لیا۔"

"وہ تو ان دنوں حویلی میں پہنچی جب میں پنڈ میں تھا ہی نہیں۔ مراد خاں شاہانی کے پاس بھکر میں تھا۔ تو شاہانی سے پوچھ لے۔ زینت کو تو جمیلہ نے پناہ دی تھی۔ مجھے تو واپسی پر اس کے بارے میں پتہ چلا۔" رحیم داد نے باور کرانے کی کوشش کی۔" شاہ جی میں تجھ سے غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ ویسے بھی میں نے زینت سے کیا لینا ہے۔"

احسان شاہ نے پوچھا۔" اب زینت کہاں ہے؟" اس کے روّیے سے صاف عیاں تھا کہ وہ رحیم داد کی صفائی سے مطمئن ہو گیا ہے۔

"وہ جلیل کے ساتھ دیپال پور چلی گئی۔" رحیم داد نے بتایا۔" یہ تو تجھے پتہ ہی ہو گا کہ جلیل اس کا گھر والا ہے۔ تیرے پاس تو وہ آیا بھی تھا۔"

"آیا تو تھا۔ تھانے دار زماں خاں کا خط لے کر آیا تھا۔" احسان شاہ نے کہا۔" زینت اپنے گھر والے کے ساتھ چلی گئی۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ تھی بھی ایک دم ٹھنڈی۔ پتھر کی طرح بے جان۔ ہر دم روتی ہی رہتی تھی۔"

"شاہ جی، میرا کہا مان، ایسی زنانی اپنے کوٹ میں نہ رکھا کر۔"

"ویسے تو عام طور پر ہر زنانی جب نئی نئی آتی ہے تو ایسے ہی ٹسوے بہاتی ہے۔ بعد میں سب راضی خوشی ہو جاتی ہیں۔" احسان شاہ نے قہقہہ لگایا۔ "پر اب تو میں نے کوٹ کا بہت سا کوڑا کرکٹ صاف کر دیا۔ جو بھی مزارع اپنی گھر والی لینے آیا۔ اُس سے سودا طے کیا۔ رقم وصول کی اور اس کا بازو اُسے واپس دے دیا۔"

"تو سچ کہہ رہا ہے شاہ جی؟" رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں حیرت سے کہا۔ "پر تو نے ایسا کیوں کیا؟"

"چوہدری، بات سچی یہ ہے۔ کئی کئی سال سے کوٹ میں پڑی تھیں۔ ان پر خرچ بھی بہت آتا تھا۔ ادھر مجھے روپے کی سخت ضرورت بھی پڑ گئی۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "زمین خریدنے کا ارادہ ہے؟"

"زمین تو اپنے پاس پہلے ہی بہت ہے۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "لہور میں ایک کوٹھی خریدی ہے۔ اگلے مہینے لندن سے میرا پتر رحمان شاہ آ رہا ہے۔" اُس کے چہرے پر خوشی سے سرخی بکھر گئی، آنکھیں جگ مگانے لگیں۔ "بیرسٹر بن گیا ہے۔ لہور ہی میں رہے گا۔"

"اُدھر کیوں رہے گا؟" رحیم داد کے انداز میں استعجاب تھا۔

"اُسے وہاں پریکٹس جو کرنی ہے۔ اب مجھے اپنے مکدموں کے لیے وکیلوں کے نخرے نہیں اٹھانے پڑیں گے۔" احسان شاہ مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔ "ویسے میں اُسے سیاست میں بھی لانا چاہتا ہوں۔ اس کا بھی ایسا ہی ارادہ ہے۔ چوہدری! سچ پوچھ تو سارے ہی سیاسی لیڈر عام طور پر وکیل یا بیرسٹر ہی ہوتے ہیں۔ انہیں کسی کی نوکری چاکری تو کرنی نہیں ہوتی، اپنی مرضی کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ وکالت اور بیرسٹری بھی بہت آزاد پیشہ ہے۔"

رحیم داد کو نہ سیاست سے دلچسپی تھی، نہ وکالت سے اور نہ ہی وکالت کے پیشے کی آزادی سے۔ اس نے کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا اور وہسکی سے شغل کرتا رہا۔ دونوں ہی خاموش تھے۔

کچھ دیر بعد احسان شاہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ "معاف کرنا چوہدری، میں آج تیرے ساتھ زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گا۔"

"کیوں شاہ جی؟" رحیم داد تجسس سے بولا۔ "بات کیا ہے، ابھی رات تو اتنی زیادہ نہیں ہوئی۔"

"گل ایہہ اے جی۔" احسان شاہ مسکرا کے بولا۔ "میں نے آج اندر حویلی میں اپنی چھوٹی گھر والی کے ساتھ روٹی کھانی ہے۔ وہ تین مہینے سے اوپر میکے میں رہ کر ملتان سے صبح ہی آئی ہے۔"

"چلا جانا۔ ابھی تو رات شروع ہوئی ہے۔"

"نہیں، اب مجھے جانے دے۔" وہ کھِل کھِلا کر ہنسا۔ "شام ہی کو اُس نے مجھے کہہ دیا تھا، انتظار کر رہی ہوگی۔ وڈے گھر کی ہے۔ نخرے بھی اس کے اتنے ہی وڈے اور اوچے ہیں۔"

"جیسی تیری مرضی۔" رحیم داد نے مزید اصرار نہ کیا۔ اس نے اپنا گلاس اٹھایا، ہونٹوں سے لگایا اور غٹا غٹ چڑھا گیا۔

✡

رحیم داد گرم کمرے میں تنہا بیٹھا قاب سے تلے ہوئے مرغ کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا رہا۔ کمرے میں خاموشی چھائی تھی اور باہر ہوا فراٹے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ پہر رات گزر گئی۔ رحیم داد ترنگ میں تھا اور اپنے کمرے میں جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ آہستہ سے دروازہ کھلا۔ رحیم داد نے مڑ کے دیکھا۔ رحمتے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہی تھی۔ وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی آتش دان کے قریب پہنچی اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ دھسا اوڑھے ہوئے تھی اس کے باوجود سردی سے کپکپا رہی تھی۔ اس نے اپنے بدن کو قدرے ترچھا کیا اور دونوں ہاتھ دہکتے ہوئے انگاروں پر پھیلا دیے۔

"آج سردی بہت زبردست ہے۔" خاموشی میں رحمتے کی آواز اُبھری۔

رحیم داد نے نظریں اُٹھا کے رحمتے کو دیکھا۔ اس کا سانولہ چہرہ انگاروں کی سرخ روشنی میں تانبے کے مانند دمک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کاجل تھا۔ تیل سے سر کے بال چمک رہے تھے۔ وہ سرخ کنارے کا سبز لاچا باندھے ہوئے تھی اور نیچی نظروں سے آتش دان میں دہکتے ہوئے لال لال انگارے دیکھ رہی تھی۔ رحیم داد مسکرا کر بولا۔ "رحمتے کی حال اے؟ آج بہت

گری گری لگ رہی ہے۔"

رحیم داد کی جانب نظریں اُٹھائے بغیر وہ بولی "آج میرا جی ٹھیک نہیں ہے۔"

"فیر کیوں چلی آئی؟" رحیم داد جھوم کر ہنسا۔ "رحمتے! لگتا ہے، اب تو بوڑھی ہو گئی ہے۔"

رحمتے نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "شاہ جی بھی یہی کہتا ہے۔"

رحیم داد نے رحمتے کو دیکھا۔ "مجھ سے بھی یہی کہہ رہا تھا۔"

"اب تو وہ ایسی ہی گلاں کرے گا۔" رحمتے تلملا گئی۔ "آٹھ سال پہلے جب میں اس حویلی میں آئی تھی تب ایسی نہیں تھی۔" اُس کا چہرہ راکھ بن گیا۔ "اُن دنوں تو شاہ جی بہت پیار جتاتا تھا۔ کہتا تھا میں تیرے بناں نہیں رہ سکتا۔ تجھ سے ویاہ کرلوں گا۔ زمیں دارنی بنا کر رکھوں گا۔"

"ایسا ارادہ تھا تو اُس نے تجھ سے ویاہ کیوں نہیں کیا؟ اُسے کون روک سکتا تھا۔"

"روک تو نہ جب اُسے کوئی سکتا تھا، نہ اب۔" رحمتے کے لہجے میں زیادہ تلخی پیدا ہو گئی۔ "چوہدری! اسچی بات تو یہ ہے۔ وہ مجھ سے کیسے ویاہ کرسکتا تھا۔ میں کسی وڈے زمیں دار یا جگیر دار کی تو دھی ہوں نہیں۔ شاہ جی وڈا زمیں دار ہے اور وڈے زمیں دار کا ویاہ وڈے زمیں دار ہی کی دھی سے ہو سکتا ہے۔" وہ نظریں جھکا کے سرخ سرخ شعلے تکنے لگی۔ "میرا پیو تو کمّی تھا۔ وہ کنوئیں سے ریت مٹی نکالنے والا ٹوبھا تھا۔ ٹوبھے کی کڑی وڈے زمیں دار کی گھر والی کیسے بن سکتی ہے۔ وہ تو صرف اس کا بستر ہی گرم کرنے کے کام آسکتی ہے۔"

رحیم داد کو پہلی بار اس حقیقت کا اندازہ ہوا کہ کوٹ کی قیدی عورتوں میں رحمتے جس قدر سفاک اور سخت گیر مشہور ہے، اندر سے ایسی ہے نہیں، یہ بھی غم زدہ اور زخم خوردہ ہے۔

رحیم داد نے رحمتے سے دریافت کیا۔ "شاہ جی نے تجھے بھی اٹھوایا ہوگا؟"

"نہیں جی! میں تو منٹگمری کے مہاجر کیمپ میں تھی۔" رحمتے نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "بالکل اکیلی اور بے سہارا۔"

"تیرا ادھر کوئی نہیں تھا؟" رحیم داد نے پوچھا۔ "تو مہاجر ہے ناں، پر تو پاکستان پہنچی کیسے؟"

"کیا کرے گا سن کر۔ اب تو یہ بہت پرانی گل ہو گئی۔" رحمتے آتش دان کے قریب فرش پر بیٹھ گئی۔" میں نوں اب تک یاد ہے۔ وہ جمعے کا دن تھا۔ شاہ جی رضا کاروں کے ساتھ کیمپ میں آیا۔ وہ مہاجرین میں لنگر بانٹنے کے لیے دیگیں بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔" رحمتے کے لبوں پر زہر خند نمودار ہوا۔" رضا کار لنگر بانٹتے تھے اور شاہ جی لٹے پُٹے بے سہارا اور بے گھر مہاجروں کے حوصلے بڑھاتا تھا۔ آنکھوں میں آنسو لا کر بہت ہمدردی جتاتا تھا۔ میں اب تک اُس کی وہ باتیں نہیں بھولی۔ کیسا نیک اور بھلا بندہ لگتا تھا۔"

"پر تو کیسے شاہ جی کے ہتھے چڑھ گئی؟"

"وہ ایسا ہوا جی۔" رحمتے نے بتایا۔" کیمپ سے واپسی پر شاہ جی اپنی حویلی میں کام کاج کے لیے تین پناہ گیر زنانیوں کو بھی ساتھ لے گیا۔ دو کو تو اس نے خراب کر کے اپنے مزارعوں کے ہاتھ بیچ دیا۔ مجھے اپنے پاس رکھ لیا۔ شاہ جی پیار جتاتا تو مست ہو کر کہتا تو ماجھے دی جٹی ہے۔" رحمتے نے شرم سے نظریں جھکا لیں۔" ویسے جی! میں ماجھے کی ہی ہوں۔ فسادات ہوئے اور میرے پنڈ پر رات کے اندھیرے میں حملہ ہوا تو میں گھر سے نکل کر فصلوں میں چھپ گئی۔ بعد میں ایک کافلے کے ساتھ کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ گئی۔" اُس نے گردن کو خم دے کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔" شاہ جی بتاتا تھا، تو بھی گورداس پور کا مہاجر ہے۔ اُس نے تیرے بارے میں ٹھیک ہی بتایا ناں؟"

"شاہ جی نے ٹھیک کہا۔ میں بھی مہاجر ہوں۔" رحیم داد نے آہستہ سے گردن ہلائی اور چند لمحے خاموش رہا۔ پھر اس نے اچانک بات کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا۔" تب تک تیرا ویاہ نہیں ہوا تھا؟"

"کیوں نہیں ہوا تھا۔ دو بچے بھی تھے۔" وہ نہایت اطمینان سے بولی۔" میرا گھر والا لوہار تھا۔ اس کا اچھا کام چلتا تھا۔"

"وہ بھی پاکستان آیا یا دوسرے مسلمانوں کی طرح ادھر ہی شہید کر دیا گیا؟"

"وہ بھی بچ بچا کر پاکستان آ گیا تھا۔" رحمتے نے گہری سانس بھری۔" مجھے ڈھونڈتا ہوا

شاہ جی کے پاس آیا تھا۔ بچے بھی اُس کے ساتھ ہی تھے، پر شاہ جی نے مجھے اُس سے نہیں ملنے دیا اور نہ جانے دیا۔ وہ مجھے لینے ہی کے لیے یہاں آیا تھا۔"

"پر تُو نے تو اس کے ساتھ جانے کی کوشش کی ہوگی۔" رحیم داد نے رحمتے کی آنکھوں میں جھانک کر ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔" وہ تیرا گھر والا تھا، تیرے بچوں کا پیو تھا اور انہیں اپنے ساتھ بھی لایا تھا۔"

"چوہدری! اب تجھ سے جھوٹ کیا بولنا۔" رحمتے کے لہجے میں رقّت پیدا ہو گئی، آنکھوں کے چراغ دھندلے پڑ گئے۔" میں خود اس کے ساتھ جانے پر تیار نہیں ہوئی۔ اُن دنوں شاہ جی مجھے اتنا پیار کرتا تھا جیسے میرے لیے دیوانہ ہو گیا ہو۔ اُس کے پیار نے مجھے اندھا کر دیا تھا، نہ بچے یاد آئے، نہ گھر والا، نہ ماما جاگی، نہ آگے کی سوجھی۔ لگتا ہے جیسے شاہ جی نے مجھ پر جادو کر دیا تھا۔" اس نے گہری سانس بھری۔" بہت بُرا کیا۔ میں نے بہت برا کیا۔"

"ایسا نہ سوچ۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔" رحیم داد نے ہمدردی سے کہا۔" تجھے شاہ جی سے نراض نہیں ہونا چاہیئے۔ مجھے تو لگتا ہے شاہ جی اب بھی تجھ سے پیار کرتا ہے۔ تجھے کوٹھے کا انچارج لگا رکھا ہے۔ یہ معمولی گل ہے؟"

"چوہدری! تیں توں کچھ پتہ نہیں۔" رحمتے کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔" نراض ہوتا ہے تو غصے میں مکّوں اور لاتوں سے مارتا ہے۔ زمین پر گرا دیتا ہے، بالوں سے پکڑ کر کھینچتا ہے۔" اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر کولھے پر رکھا۔" یہ میری کمر میں ایسے ہی درد نہیں ہوتا۔ شاہ جی نے ایک بار غصّے میں زور زور کی ٹھوکریں ماری تھیں۔ اس کے بوٹ سے میری پسلیاں دب گئیں تھیں۔ ہفتے بھر تک بستر پر پڑی رہی، اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔"

"شاہ جی تجھ سے اتنا نراض کیوں ہو گیا تھا۔" رحیم داد نے کریدا۔" کوئی نہ کوئی تو اتنے زبردست غصّے کی وجہ ہوگی؟"

"وہ جی ہوا یہ کہ کوٹھے سے ایک زنانی بھاگ گئی۔" رحمتے نے بتایا۔" اُن دنوں کوٹھے کے دروازے پر ایک ہی راکھا ہوتا تھا۔ رات کو اُسے اونگھ آ گئی۔ میں بھی سو گئی تھی۔ وہ چپکے سے

نہ جانے کب نکل گئی۔"

"پر تیرا اس میں کیا کصور ہوا؟" رحیم داد نے کہا۔ "تو رات بھر تو جاگنے سے رہی۔ تجھے تو سونا ہی تھا۔ اس میں کون سی غلط بات ہوئی؟"

رحمتے بولی۔ "شاہ جی تو یہ نہیں سمجھتا۔ سویرے اُسے پتہ چلا تو ایسا گرم ہوا کہ بالکل پاگل ہو گیا۔ راکھے کو تو اس نے الٹا لٹکا کر کرندوں سے پٹوایا۔" اس کا چہرہ مرجھا گیا۔ "مجھے اس نے کمرے میں بند کیا اور ٹھوکروں سے مار لگائی۔ غصے سے اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔"

"پچھلے دنوں زینت بھی تو یہاں سے بھاگ گئی تھی۔ تب بھی شاہ جی نے تجھے اس طرح مار لگائی ہو گی۔" رحیم داد نے کہا۔

"وہ کوٹ سے نہیں، مہمانوں کے کمرے سے بھاگی تھی۔" رحمتے نے وضاحت کی۔ "شاہ جی نے اس کے بھاگنے پر شیدے کو ایسی دبا کے مار لگائی کہ اب تک منجی سے نہیں اٹھا، ایک ہاتھ ٹوٹ گیا، اُس پر پٹی بندھی ہے۔ ہر دم پڑا ہائے ہائے کرتا ہے۔" اُس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "تبھی تو شاہ جی نے ادھر میری ڈیوٹی لگائی ہے۔ مجھے تو کوٹ کے اندر زنانیوں کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنی ہوتی ہے۔"

"جبھی شیدا نظر نہیں آیا۔ ایک دوسرا ہی بندہ اس کی جگہ پر کام کرتا رہا۔" رحیم داد نے قدرے تامّل کے بعد رحمتے سے پوچھا۔ "تجھ سے تو شاہ جی نے کچھ نہیں کہا؟" مگر سوال کا جواب ملنے سے پہلے ہی اس نے خود ہی صفائی پیش کی۔ "ویسے تیری تو غلطی بھی نہیں تھی۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے جی۔" رحمتے کے چہرے پر خوف کی پرچھائیں منڈلانے لگیں۔ "وہ مجھ سے بھی سخت ناراض ہوا۔ مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ غصے سے آنکھیں نکال کر ایسے زور سے ٹھڈ مارا کہ میں گر پڑی۔ پر اس کے بعد وہ کچھ نہ بولا۔"

"پر شیدے کی تو اس نے زبردست پٹائی کی۔" رحیم داد نے کہا۔ "تجھے تو صرف ایک ٹھڈ مار کر چھوڑ دیا۔"

"بعد میں اس نے جو چوٹ لگائی، وہ ٹھڈے سے بھی زیادہ سخت تھی۔"

"کیا کیا اُس نے؟" رحیم داد کے لہجے میں تجسّس تھا۔

"نیں نوں پتہ ہے، اُس نے کیا کہا مجھ سے۔" رحمتے آتش دان میں دہکتے ہوئے انگارے تکنے لگی۔ "پہلے تو وہ ننگی ننگی گالاں نکالتا رہا۔ فیر غصّے سے چیخا، تو اب بڈھی ہو گئی ہے، بالکل بڈھی کھوسٹ۔ میں نے ایسی رن کی ضرورت نہیں۔ تو یہاں سے چلی جا۔ میں تیرا اور تیرے بچوں کا خرچا اب نہیں اٹھا سکتا، سن لیا تو نے چوہدری۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ قریب رکھا ہوا پوکر اٹھایا اور لکڑی کا دستہ پکڑ کر لوہے کے آنکڑے سے راکھ کی تہہ کے نیچے دبے ہوئے انگارے کریدنے لگی۔ آتش دان میں آنچ تیز ہو گئی۔ کوئلے دہکنے لگے۔ کمرے میں بکھری ہوئی سرخی گہری ہو گئی۔ "تو ہی انصاف سے بتا۔ بچے میں اپنے ساتھ تو نہیں لائی تھی۔"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ مگر رحمتے زیادہ دیر چپ نہیں رہ سکی۔ "چوہدری، تو کیا سوچنے لگا؟"

"میں سوچ رہا تھا، شاہ جی نے اگر تجھے نکال دیا تو تو کہاں جائے گی؟"

"یہی تو میں سوچتی رہتی ہوں۔" اس کی آواز میں کسک تھی۔

"یہ بتا رحمتے! تیرا گھر والا اب کہاں ہے؟"

"میں نوں تو جی اُس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ جانے زندہ ہے کہ مر گیا۔" رحمتے نے بتایا۔ "نیں نوں ملوم ہے میں تو حویلی سے باہر جاتی ہی نہیں۔ شاہ جی کی بالکل اجازت نہیں۔"

"شاہ جی تجھے تنخواہ شنخواہ بھی دیتا ہے؟"

"توبہ کرو جی! وہ کیا تنخواہ دے گا۔ کبھی ایک پیسہ بھی نہیں دیتا۔" وہ لمحے بھر خاموش رہی۔ "پر اتنا ضرور ہے، مہمانوں سے کبھی کبھار کچھ مل جاتا ہے۔ سردار مراد خاں شاہانی وڈے دل والا ہے۔" اُس کے بجھے ہوئے چہرے پر اجالے کی رمق ابھری۔ "ایک بار تو اس نے مجھے اکٹھے تیہہ روپیئے دیے۔"

رحیم داد نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس دس کے تین نوٹ نکالے اور رحمتے کی طرف بڑھاتے ہوئے مسکرایا۔ "لے یہ بھی تیہہ روپیے ہیں۔ اب تو راضی خوشی ہے۔" اُس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔

"انہیں رکھ لے اور اب جا کے آرام کر۔"

رحمتے نے نوٹ لے کر لاچے کے ڈبے میں نہایت احتیاط سے رکھے۔ اُس کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ "تو ابھی جاگ رہا ہے ناں؟" وہ رازدارانہ لہجے میں بولی۔

رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا "کیوں کیا بات ہے؟"

رحمتے کچھ نہیں بولی۔ مڑی اور خاموشی سے باہر چلی گئی۔

✡

رحیم داد خاموش بیٹھا وہسکی کی چسکی لگاتار ہا۔ آتش دان میں انگارے دہک رہے تھے۔ ان کی سرخ سرخ روشنی درو دیوار پر بکھری ہوئی تھی۔ کمرہ خوب گرم تھا اور رحیم داد نشے سے جھوم رہا تھا۔

دروازہ آہستہ سے چرچراتا ہوا کھلا۔ رحیم داد نے چونک کر دیکھا۔ سامنے رحمتے کھڑی تھی۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "چوہدری! آ میرے ساتھ۔"

رحیم داد اٹھا مگر لڑکھڑا کر پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ "مجھے کہیں نہیں جانا۔" اس نے بے زاری سے کہا۔

"چوہدری، تو نے آج بہت پی رکھی ہے۔" رحمتے نے مسکرا کر کہا۔ "تجھے اب اپنے کمرے میں چل کر آرام کرنا چاہیے۔" وہ آگے بڑھی اور رحیم داد کے قریب پہنچ گئی۔ "چوہدری اب کھڑا ہو جا۔"

رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحمتے نے ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو تھام لیا۔ دونوں سنبھل سنبھل کر چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکلے اور برآمدے میں آگئے۔

ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ شدید سردی تھی۔ ہوا سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ دونوں سردی سے کپکپاتے ہوئے آگے بڑھے۔ ان کے قدموں کی آہٹ گہرے سناٹے میں رک رک کر ابھر رہی تھی۔ برآمدے کے آگے باغیچہ تھا۔ باغیچے کے بیرونی چار دیواری کے پاس سرس کے ایک گھنے درخت کے نیچے کوٹھری تھی۔ کوٹھری کا دروازہ کھلا تھا۔ دہلیز کے پاس پہرے دار چادر اوڑھے خاموش بیٹھا آگ تاپ رہا تھا۔ آہٹ سن کر وہ زور سے کھنکارا۔ نظریں اٹھا کر اس نے برآمدے

کی سمت دیکھا اور قریب رکھی ہوئی لالٹین اٹھائی "کون ہے؟"

رحمتے بڑھتی ہوئی برآمدے کے آخری سرے پر پہنچ گئی۔ ایک کمرے کے دروازے کے دروازے کے سامنے ٹھہر کے اس نے رحیم داد سے کہا "چوہدری، میں نے اب کوٹ میں جانا ہے" اس نے پہرے دار کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا "نواز موجود ہے۔ تیرے کمرے کے دروازے پر کوئی راکھا نہیں رہے گا۔ آج سردی بہت زیادہ ہے" اُس نے رحیم داد کو اطمینان دلایا "نواز رات بھر جاگتا رہے گا۔ کوئی ضرورت ہو تو اس سے کہہ دینا۔ میں اب سویرے تیرے پاس آؤں گی۔ نئیں نوں پتہ ہے۔ شیدا بیمار ہے، تیری دیکھ بھال میں نے ہی کرنی ہے" رحمتے نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کا ایک پٹ کھولا "اب توُ اندر جا" رحیم داد کمرے میں چلا گیا۔

رحمتے باہر رہ گئی۔ رحیم داد نے دروازہ بند کرلیا۔ کمرہ خاصا کشادہ تھا۔ اس کے دو حصّے تھے۔ آگے کے حصّے میں پرانی وضع کا بھدّا سا صوفہ سیٹ پڑا تھا، میز تھی کرسیاں تھیں پچھلے حصّے میں خواب گاہ تھی۔ دونوں حصّوں کے درمیان پردہ لٹکا ہوا تھا۔ رحیم داد نے پردہ ہٹایا اور خواب گاہ میں چلا گیا۔ ایک کونے میں اونچا اسٹول تھا، اُس پر لیمپ روشن تھا۔ کمرے کے ایک گوشے میں مسہری تھی۔ مسہری کے سرہانے کھڑکی تھی، وہ بند تھی۔ مسہری سے ذرا ہٹ کر پختہ چبوترا تھا۔ چبوترے کے اوپر دیوار میں مختصر روشن داں تھا۔ چبوترے پر رکھی ہوئی انگیٹھی میں انگارے دہک رہے تھے۔

رحیم داد نے لیمپ کی روشنی میں دیکھا، انگیٹھی کے پاس فرش پر ایک نوجوان عورت سر جھکائے بیٹھی ہے وہ کھیس اوڑھے تھی۔ انگاروں کی گہری سرخ روشنی میں اُس کا چہرہ گلابی نظر آرہا تھا۔ رحیم داد انگیٹھی کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ عورت سکڑی سمٹی چپ بیٹھی رہی۔ رحیم داد نے نرم لہجے میں پوچھا "تیرا نام کیا ہے؟"

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی "میرا ناں جی ہاجراں ہے" اُس نے رحیم داد کی جانب دیکھا نہیں۔ اس کی آنکھوں میں دُنبالہ کاجل اور بالوں میں تیل تھا۔ رحیم داد نے ہاتھ بڑھایا اور ہاجرہ کے سر سے جھٹ کھیس ہٹا دی۔ اُس کا پورا چہرہ سامنے آگیا۔ وہ بُری طرح

گھبرا گئی۔ اُس کا بدن اور سمٹ گیا۔ اس کے چہرے سے اضطراب عیاں تھا۔ رحیم داد مسکرا کر بولا "ذرا گردن تو اونچی کر۔" مگر اُس نے گردن نہ اٹھائی بلکہ کچھ اور سکڑ گئی۔

رحیم داد نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر کیا۔ ہاجراں کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ آنسوؤں کے دو قطرے ڈھلک کر اس کے رخساروں پر بکھر گئے۔

"ارے تو رو رہی ہے۔" رحیم داد جھینپے ہوئے انداز میں بولا "لگتا ہے نئی نئی یہاں آئی ہے۔"

وہ چپ بیٹھی رہی۔ رحیم داد کی کیفیت لمحہ بہ لمحہ بدل رہی تھی۔ نشے کا ایسا تیز ریلا آیا کہ اُس پر وحشت طاری ہو گئی۔ اس نے جھنجلا کر ہاجراں کی کھیس کھینچ کر ایک طرف پھینک دی۔ ہاجراں دوپٹہ نہیں اوڑھے ہوئے تھی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے آپ کو چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ وہ پھول دار جھگی پہنے ہوئے تھی۔ لاچا ہلکا نیلا تھا۔ پنڈلیوں میں چاندی کی پٹڑیاں پڑی تھیں۔

رحیم داد ڈگمگا کر کرسی سے گرتے گرتے بچا۔ اُس نے خود کو سنبھالا اور جیب سے دس دس کے دو نوٹ نکال کے ہاجراں کی طرف بڑھائے "لے ایہہ رکھ لے۔" وہ زیر لب مسکرایا "رکھ لے۔" ہاجراں نے نوٹوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا، عاجزی سے بولی۔

"میں کنجری نہیں ہوں۔"

"تو کوئی بھی ہو، اب تو یہاں آ ہی گئی۔"

"میں اپنی مرضی سے تو نہیں آئی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں تو اپنے گھر میں منجی پر لیٹی تھی۔ گھر والا فصلوں کو پانی لگانے کے لیے آڈ کا نکّہ کھولنے گیا تھا۔ پانی لگانے کی اُس کی باری رات ہی کو آتی ہے۔"

ہاجراں کی عاجزی سے رحیم داد متاثر نہ ہوا۔ اُس نے مسکرا کر بے نیازی سے پوچھا "تو گھر میں بالکل اکیلی تھی؟"

"ہاں جی اکیلی تھی، یہی سمجھ لو۔ دونوں بچے بہت چھوٹے ہیں۔"

"فیر کیا ہوا؟" رحیم داد نخوت سے بولا۔

"مجھے تین بندے ویہڑے کی دیوار پر نظر آئے۔" ہاجراں سہمے ہوئے انداز میں بولی۔ اُس وکھت میری آنکھ کھلی ہوئی تھی۔ اُن کے منہ پر منڈا سے بندھے تھے۔ وہ دیوار سے اُتر کر نیچے آ گئے۔ اُن میں سے ایک نے آگے بڑھ کر جھٹ میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔"

"فیر تو نے کیا کیا؟"

"وہ مجھے اُٹھا کر یہاں لے آئے۔" ہاجراں ٹھنڈی سانس بھر کے بولی۔ "میرا گھر والا جانے کیا سوچتا ہوگا، بچوں کا کیا حال ہوگا۔"

"گھر والے کو پتہ نہیں کہ تو یہاں ہے؟"

"لگتا ہے اُسے پتہ نہیں۔ اُسے پتہ ہوتا تو مجھے لینے ضرور آتا۔"

"ہاجراں! تیرے گھر والے کا کیا نام ہے؟"

"اُس کا نام عالم ہے۔ کیا تو اُسے جانتا ہے؟"

"نہیں! رحیم داد اُٹھ کر کھڑا ہوگیا اور چند لمحوں تک خمار آلود نظروں سے گھورتا رہا، پھر اُس نے جھک کر اچانک ہاجراں کا بازو پکڑا۔" باتیں بند کر۔ رات بہت ہوگئی ہے۔" ہاجراں نے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی مگر رحیم داد کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ رحیم داد گہری نیند سو رہا تھا۔ یکایک کمرے میں آہٹ ہوئی۔ رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ گہری خاموشی میں اُسے ایسی آواز سنائی دی جیسے بلی آہستہ آہستہ غرّا رہی ہو۔ رحیم داد نے دوبارہ سونا چاہا لیکن اُس کی نیند اُچاٹ ہو چکی تھی۔ اُس نے کروٹ بدلی تو محسوس ہوا کہ ہاجراں کمرے میں نہیں ہے۔ رحیم داد نے سوچا کہ سویرا ہوگیا ہے۔ مگر باہر گہرا سکوت تھا۔ وہ کچھ دیر لیٹا غور کرتا رہا مگر اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ لیمپ اسٹول کے بجائے فرش پر رکھا تھا اور اسٹول غائب تھا۔

رحیم داد نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ ایک بجنے والا تھا۔ اُس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا مگر ہاجراں کہیں نظر نہیں آئی۔ البتہ انگیٹھی کے پاس اُس کی کھیس پڑی تھی۔ رحیم داد گھبرا کر بستر سے نیچے اُترا، جوتے پہنے اور فوراً کمرے کے دوسرے حصّے کی جانب بڑھا۔ پردہ سرکا ہوا تھا۔ رحیم داد نے آگے بڑھ کر دیکھا، خوف اور دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

رحیم داد کی آنکھوں کے سامنے نہایت ہولناک منظر تھا۔ ہاجراں چھت سے لٹکی ہوئی تھی۔ اُس کے پیروں کے نیچے اسٹول پڑا تھا۔ ہاجراں کے نیلے لاچے کا ایک پلّو چھت کی کڑیوں میں ایک کنڈے سے بندھا تھا اور دوسرے پلّو کا پھندا بنا کر اُس نے اپنی گردن میں ڈال لیا تھا۔ ہاجراں کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ زبان ہونٹوں کے بائیں گوشے سے لٹک رہی تھی۔ اُس کا گلابی چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا اور گردن کھنچ کر لمبی ہو گئی تھی۔

رحیم داد بدحواس ہو کر کمرے سے باہر نکلا اور برآمدے میں پہنچ گیا۔ سرد ہوا کا تیز جھونکا اُس کے چہرے سے ٹکرایا مگر اُس نے سردی کی پروا نہیں کی، تیزی سے پہرے دار نواز کی کوٹھری کی جانب بڑھا۔ نواز سلگتی آگ کے سامنے بیٹھا تھا۔ رحیم داد قریب پہنچا، تو وہ پریشان ہو کر کھڑا ہو گیا" چوہدری! توں اتنی رات کو ادھر کیسے آگیا۔ بہت گھبرایا ہوا نظر آرہا ہے۔ گل کی اے۔"

"شیدا کدھر ہے؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"وہ تو جی بیمار پڑا ہے۔ کئی روز سے نہیں آیا۔"

رحیم داد کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا" میں نوں پتہ ہے، وہ بیمار ہے۔ میرا مطلب ہے، رحمتے کہاں ہے؟ تو جا کر اُسے فٹافٹ بلا لا۔"

"کوئی خاص گل ہے جی؟" نواز نے پریشان ہو کر دریافت کیا۔

"خاص ہی گل ہے۔ بعد میں بتاؤں گا۔ تو پہلے رحمتے کو یہاں بلا کر لا۔"

نواز نے مستعدی سے اپنی ملگجی چادر سر اور کانوں کے گرد لپیٹی، سردی سے کپکپا کر بولا۔

"چوہدری! تو نے چدر بھی نہیں اوڑھ رکھی۔" رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ گم صم کھڑا رہا۔

نواز آگے بڑھا اور درختوں کے اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ رحیم داد کوٹھری میں چلا گیا۔ دہلیز کے پاس اُپلے سلگ رہے تھے۔ رحیم داد نے دونوں ہاتھ جھٹ آگ پر پھیلا دیے۔ ہوا درختوں میں سرسراہٹ پیدا کر رہی تھی۔ ہر طرف ویرانی تھی۔ سنّاٹا تھا۔ رحیم داد خوف زدہ نظروں سے بار بار کمرے کی جانب دیکھتا۔ کمرے کے دروازے کا ایک پٹ کھُلا تھا۔

درختوں تلے آہٹ اُبھری۔ رحیم داد نے قریب رکھی ہوئی لالٹین کی دھندلی روشنی میں دیکھا۔ رحمتے اُونی دھسّا اوڑھے تیز تیز قدم اُٹھاتی حیران و پریشان کوٹھری کی طرف آ رہی تھی۔ نواز بھی اُس کے ساتھ تھا۔ دونوں کپکپا رہے تھے۔ رحمتے نے قریب پہنچ کر پوچھا۔ "چوہدری! تو نے مجھے بلایا ہے؟" اُس کی آنکھیں کچّی نیند سے جاگنے کے باعث سرخ ہو رہی تھیں۔ اُس نے رحیم داد کو غور سے دیکھا۔ "چوہدری، تو یہاں کیوں بیٹھا ہے۔ تجھے تو کمرے میں ہونا چاہیے تھا۔ ہاجراں کدھر ہے؟"

رحیم داد خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ کوٹھری سے نکلتے ہوئے اُس نے رحمتے سے کہا۔ "میرے ساتھ کمرے میں آ۔" وہ آگے بڑھا۔ رحمتے اُس کے پیچھے پیچھے چلی۔ نواز بھی اُن کے ساتھ تھا۔ تینوں نے باغیچہ طے کیا اور سیڑھیوں پر چڑھ کر برآمدے میں پہنچے۔

رحیم داد کمرے کے دروازے پر ٹھٹک گیا۔ رحمتے کو مخاطب کر کے اُس نے کہا۔ "اندر جا کر دیکھ۔"

رحمتے اور نواز کمرے میں چلے گئے۔ رحیم داد بھی سہما ہوا اُن کے پیچھے پیچھے بڑھا مگر دہلیز کے قریب رک گیا۔ سامنے چھت سے ہاجراں کی برہنہ لاش لٹکی ہوئی تھی۔ رحمتے کے چہرے سے وحشت برسنے لگی۔ "ہائے ربّا، یہ کیا ہوگیا؟" رحمتے نے سراسیمہ ہو کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چوہدری! یہ کیا ہوگیا؟"

"میں تو سو رہا تھا۔" رحیم داد نے بے چارگی اور بے بسی سے کہا۔ "کھٹ پٹ کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔" اُس نے فرش پر پڑے ہوئے اسٹول کی طرف اشارہ کیا۔ "لگتا

ہے یہ گرا تھا۔"

رحمتے پردہ سرکا کر خواب گاہ میں گئی۔ بستر سے چادر اُٹھا کر لائی، میز پر چڑھی۔ اُس نے جلدی جلدی ہاجراں کی برہنہ لاش کے گرد چادر لپیٹ دی۔ اُس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

رحمتے جلد ہی کمرے سے باہر چلی گئی۔ نواز بھی اس کے ساتھ نکل کر برآمدے میں آگیا۔ رحمتے نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ وہ کچھ دیر برآمدے میں سہمی ہوئی کھڑی رہی۔ رحیم داد اور نواز کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ رحمتے نے دھسّا ایک بار پھر اچھی طرح اپنے بدن پر لپیٹا اور رحیم داد سے بولی۔" چوہدری میں شاہ جی کو جا کر خبر کرتی ہوں۔" اُس کے لہجے میں تھرتھراہٹ تھی۔" پر وہ ایک دم گرم ہو جائے گا۔ ننگی ننگی گالاں نکالے گا۔"

"تیری اس میں کیا غلطی۔" رحیم داد نے اُسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔" کسی کی بھی غلطی نہیں ہے۔ یہ تو ہاجراں نے خود کیا ہے۔"

رحمتے نے خوف زدہ آواز میں کہا۔" پر شاہ جی کیسے جانے گا۔ نیند سے اُٹھنے پر اور سردی میں باہر آنے پر ویسے ہی اُسے غصہ چڑھا ہو گا۔ میری ایک نہیں سُنے گا۔ تُو بتا چوہدری، میں کیا کروں۔ اس معاملے میں میرا کیا دوش ہے؟"

رحیم داد نے اُس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔" پر ہاجراں نے ایسا کیوں کیا؟"

رحمتے نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ اُس کے اودے اودے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔" چوہدری، یہ گلاں چھوڑ۔ تُو نواز کے پاس جا کر بیٹھ۔ میں شاہ جی کے پاس جاتی ہوں۔ فوراً اُسے بتانا ہوگا۔ دیر نہیں ہونی چاہیے۔" وہ آگے بڑھی اور تیز قدموں سے چلنے لگی۔

رحیم داد اور نواز کوٹھری میں رہ گئے اور آگ تاپنے لگے۔ دونوں گم صم اور سہمے ہوئے تھے۔ نواز نے آہستہ سے کہا۔" چوہدری! تُو بہت ڈرا ہوا لگ رہا ہے۔ فکر نہ کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پہلے بھی ایک رن ایسے ہی خودکشی کر چکی ہے۔ پر اُس نے گردن میں پھندا نہیں ڈالا تھا۔"

"وہ کون تھی، اُس نے کیا کیا؟" رحیم داد نے ہاتھ ملتے ہوئے پوچھا۔

"اُس نے تو جی لیمپ سے تیل نکال کر اپنے کپڑوں پر چھڑکا، کمرے سے نکل کر باہر برآمدے میں آئی۔" نواز نے رحیم داد کو بتایا۔ "برسات کی اندھیری رات تھی۔ اُوپر بادل گھرے ہوئے تھے۔ اُس نے کپڑوں پر آگ لگالی۔ میں پہنچا تو وہ بہت جل چکی تھی۔ سمجھو سسک رہی تھی۔"

نواز تھا تو ادھیڑ مگر اس کا جسم ابھی تک مضبوط اور کسا ہوا تھا۔ نڈر اور حوصلہ مند بھی تھا۔

رحیم داد نے دہشت زدہ لہجے میں پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

"اُس کی لاش شاہ جی نے نہر کے کنارے کئی میل دور اُدھر جھنگر میں پھنکوا دی تھی۔ رات ہی کو جانوروں نے گوشت نوچ نوچ کر لاش اتنی بگاڑ دی کہ پہچان میں نہیں آتی تھی۔"

"کیا اس بار بھی وہ ایسا ہی کرے گا؟" رحیم داد نے جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔

"پتہ نہیں جی، اس دفعہ لاش کا کیا بنے۔" نواز نے آگ کریدتے ہوئے کہا۔ "ویسے باغیچے کے اس طرف درختوں کے نیچے پہلے بھی دو لاشیں دبائی گئی تھیں۔" اُس نے ہاتھ اُٹھا کر جھنڈ کی طرف اشارہ کیا۔ "ایک کو تو جی نشے میں شاہ جی کے یار نواب امتیاز خاں اعوان نے گلا دبا کر مار ڈالا تھا۔ وہ لہور میں ہوتا ہے۔ پہلے اس کا ادھر بہت آنا جانا تھا۔ پر اب اُس کا آنا جانا کم ہو گیا ہے۔ بہت دنوں سے تو آیا ہی نہیں۔ ویسے اس کے پتّر سے شاہ جی کی ایک دھی ویاہی ہوئی ہے۔"

رحیم داد سخت پریشان تھا۔ گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "نواز تُو یہاں کب سے لگا ہے؟"

"پندرہ سال سے اُوپر تو ہو گئے ہوں گے۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کے بولا۔ "ہاں جی اتنا ہی عرصہ ہوا ہو گا۔ پاکستان بننے سے بہت پہلے میں شاہ جی کے پاس لگ گیا تھا۔ ان دنوں تو جی تکڑا جوان ہوتا تھا۔ ساری جوانی یہاں ختم کر دی۔ میں نے کیا کیا نہیں دیکھا۔ رحمتے بھی میرے سامنے ہی آئی تھی۔"

"تُو نے رحمتے سے ویاہ کیوں نہ کر لیا؟ تیری ٹکّر کی ہے۔" رحیم داد نے ذہن کا بوجھ ہلکا

کرنے کی غرض سے اسے چھیڑا۔

"نہیں جی، اب بھی اُس کا نکھرا بہت ہے۔ ویسے جی، میری اپنی گھر والی ہے۔ حویلی کے اندر نوکرانی ہے۔ وہ رحمتے سے بہت خار کھاتی ہے۔ حویلی کی ساری ہی زنانیاں اور زمیں دارنیاں رحمتے سے خار کھاتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ رحمتے بھی بہت تیز ہے۔ تیں نوں پتہ نہیں، بہت کڑوی اور جھگڑالو ہے۔"

☆

برآمدے کے پختہ فرش پر رات کے پر ہول سناٹے میں آہٹ ابھری۔ رحیم داد نے دھندلی روشنی میں دیکھا۔ احسان شاہ اندھیرے سے نکل کر سامنے آگیا۔ وہ کمبل اوڑھے ہوئے تھا۔ اُس کے پیچھے رحمتے سر جھکائے چپ چاپ چل رہی تھی۔ رحیم داد اور نواز اُٹھ کر تیز قدموں سے احسان شاہ اور رحمتے کے قریب پہنچ گئے۔

احسان شاہ نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ مگر خاموش رہا۔ اُس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ وہ کمرے کے دروازے پر جا کر ٹھہر گیا۔ رحیم داد، رحمتے اور نواز جہاں تھے، وہیں رک گئے۔

احسان شاہ کے اشارے پر نواز نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ احسان شاہ اندر داخل ہوا۔ نواز اور رحمتے نے بھی اُس کے ساتھ کمرے کی دہلیز عبور کی۔ رحیم داد دروازے کے باہر ہی کھڑا رہا۔ احسان شاہ نے ہاجراں کی لاش دیکھی اور فوراً کمرے سے باہر آگیا۔ رحمتے بھی باہر آگئی، نواز بھی۔ رحمتے نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کر دیا۔

احسان شاہ نے نواز سے کہا: "تُو جا کر مہربان علی کو بلا لا۔"

نواز نے لالٹین رحمتے کے حوالے کی اور برآمدے کی سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔ احسان شاہ نے اُسے ٹوکا: "ٹھیر جا۔" نواز رُک گیا۔ احسان شاہ نے کہا: "مہربان کے آنے تک میں دیوان خانے کے پچھلے کمرے میں رہوں گا۔" اُس نے برآمدے میں کھلنے والے دروازے کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "تُو مہربان کو پہلے ادھر ہی لانا۔ جب وہ لاش دیکھ لے تب اُسے میرے پاس بھیج دینا۔"

نواز چلا گیا۔ احسان شاہ رحمتے سے بولا "رحمتے تو جا کر کمرے کے آتش دان میں کوئلے سلگا دے۔ میں چوہدری کے ساتھ وہیں آرہا ہوں۔"

رحمتے نے خاموشی سے لالٹین دیوار کے پاس رکھ دی۔ رحیم داد گم صم تھا۔ رات ڈھلنے لگی تھی، سردی بڑھ گئی تھی۔ ہوا میں تیزی اور کاٹ تھی۔ احسان شاہ نے کمرے کے دروازے کی باہر سے کنڈی چڑھا دی اور رحیم داد کو مخاطب کیا "چوہدری، میرے ساتھ آ۔" رحیم داد خاموشی سے اُس کے ہم راہ چلنے لگا۔

دونوں کے قدموں کی آہٹ فرش پر آہستہ آہستہ گونج رہی تھی۔ رحیم داد سردی سے تھرتھرا رہا تھا۔ دونوں نے برآمدہ عبور کیا، کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئے آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ رحمتے سر جھکائے پوکر سے کوئلے اور لکڑی کے ٹکڑے اُلٹ پلٹ کر آنچ تیز کر رہی تھی۔

احسان شاہ اور رحیم داد آتش دان کے قریب ہی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ رحمتے دونوں سے ذرا ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ احسان شاہ نے نظریں اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ اُس کے چہرے پر جھنجلاہٹ اُبھری اور تیوری پر بل پڑ گئے۔ وہ زور سے دہاڑا "کُتّی۔" شدید غصے سے اس کی گھنی مونچھیں ابابیل کے پروں کے مانند پھڑپھڑانے لگیں۔ آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔

رحمتے نگاہیں جھکائے دم بخود کھڑی تھی۔

احسان شاہ برسنے لگا "یہ سب کچھ تیری وجہ سے ہوا۔ تو نے اسی کنجری کو چوہدری کے پاس پہنچایا تھا۔ کوٹ میں کوئی اور رن نہیں تھی؟"

رحمتے نے دبی زبان سے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی "میں نے تو جی یہ سوچا..... "

احسان شاہ نے رحمتے کو پوری بات کہنے کا موقع نہ دیا۔ نفرت سے منہ بگاڑ کر بولا "بکواس نہ کر۔ تیرا تو مغز ہی کام نہیں کرتا۔" وہ غصے سے آہستہ آہستہ ہانپنے لگا "اب تو بڈھی ہو گئی۔ تجھ سے یہ کام نہیں چل سکتا۔ کچھ اور ہی سوچنا پڑے گا۔" وہ غیظ و غضب کے عالم میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ پھر ڈپٹ کر رحمتے سے بولا "تو اب یہاں کیوں کھڑی ہے؟ اُدھر جا جدھر لاش لٹک

رہی ہے۔ نواز کی کوٹھڑی میں بیٹھ کر مہربان علی کے پہنچنے کا انتظار کرے۔"

رحمتے نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا، گردن جھکائے چپ چاپ چلی گئی۔ رحیم داد ہنوز منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔ احسان شاہ نے مڑ کر دیکھا اور اُس کی دل جوئی کرتے ہوئے بولا۔"چوہدری! پریشان نہ ہو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"شاہ جی! مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ ایسا کرے گی۔" رحیم داد نے دبی زبان سے کہا۔

احسان شاہ نے بے نیازی سے کہا۔" لگتا ہے، تو بہت گہری نیند سو رہا تھا۔"

"وہ ایسا ہوا کہ تیرے جانے کے بعد بھی میں پیتا رہا۔" رحیم داد نے صفائی پیش کی۔" آج کچھ زیادہ ہی ہو گئی، تب ہی تو ایسا بے خبر ہو کر سویا۔ پتہ ہی نہ چلا، وہ کب کمرے سے گئی اور کب اُس نے یہ کارروائی کی۔ میری آنکھ تو سٹول کے گرنے سے کھلی جس پر چڑھ کے اُس نے اپنی گردن میں پھندا ڈالا تھا۔" رحیم داد نے احسان شاہ کے چہرے کی جانب دیکھا۔" شاہ جی، ویسے دیکھنے میں تو بہت سیدھی سادی لگتی تھی۔"

"تو ابھی بالکل اناڑی ہے۔" احسان شاہ نے اپنی مونچھ کو انگلیوں سے آہستہ آہستہ مروڑا۔ "ہر زنانی ایک سی نہیں ہوتی۔ کوئی ایک دم ڈھرے پر آجاتی ہے۔ کوئی بہت دھیرے دھیرے۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔" لگتا ہے یہ بھی ایسی ہی تھی۔ ابھی کچی تھی۔ رحمتے اُسے جلد ہی نکال لائی۔ مہینے دو مہینہ کوٹھے میں رہتی۔ دوسری زنانیوں سے ملتی جلتی انہیں دیکھتی تو خود ہی ایک دم لائن پر لگ جاتی۔ میں تجھے ایک واقعہ سناتا ہوں۔"

لیکن احسان شاہ وہ واقعہ نہ سنا سکا۔ مہربان علی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا دونوں کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے پہلی بار اُسے دیکھا تھا۔ وہ پستہ قد اور تنومند تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں مگر اُن میں تیز چمک تھی۔ ہلکی ہلکی مونچھوں میں سفید بال زیادہ تھے۔ رنگت سرخی مائل گندمی تھی۔ وہ ساٹھ کے پیٹے میں تھا مگر کاٹھی اچھی تھی۔ وہ اس وقت اونی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔

"لاش تو نے دیکھ لی ہے؟" احسان شاہ نے مہربان علی سے پوچھا۔

"دیکھ لی جی۔" اُس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اُسے اتار بھی لیا ہے۔ میں رانا اور علیا کو اپنے ساتھ ہی لے آیا تھا۔ ویسے راکھا نواز بھی موجود ہے۔"

"اب کیا ارادہ ہے؟" احسان شاہ نے مہربان علی کا عندیہ معلوم کرنا چاہا۔ "رات ہی کو سب کچھ کرنا ہے۔" احسان شاہ نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ "چوہدری ٹائم کیا ہو گیا؟"

رحیم داد نے گھڑی دیکھ کر بتایا۔ "اڑھائی بجنے والا ہے۔"

"ٹائم تو اب زیادہ نہیں رہا۔ جو کچھ کرنا ہے، جلدی کرنا ہوگا۔" مہربان علی نے رسان سے کہا۔ "میں نے تو جی یہ سوچا ہے کہ سر کاٹ کر کسی جھنگر میں دبا دیا جائے اور صرف دھڑ چار پانچ میل آگے نہر میں ڈال دیا جائے۔" وہ نہایت سکون سے سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ اُس کا چہرہ جذبات سے خالی تھا۔ "ایسا کرنے سے لاش کے بارے میں کھوج ہی نہ لگ پائے گا۔ ویسے آگے شاہ جی، جیسی تیری مرضی۔"

"کہتا تو ٹھیک ہی ہے تُو۔" احسان شاہ نے آہستہ آہستہ گردن ہلا کر کہا۔ "پر یہ بھی سوچ لے۔ پولس آخر پولس ہی ہوتی ہے۔ اپنے ہی موضع کی رن ہے۔ پولیس تفتیش کرتی ادھر بھی آ سکتی ہے۔ اُسے یہ پتہ تو چل ہی جائے گا کہ کس کی گھر والی ادھر غائب ہوئی ہے۔" اُس نے نظریں اٹھا کر غور سے مہربان علی کا چہرہ دیکھا۔ "اسے پچھلے ہی ہفتے تو اٹھوایا ہے۔ تازہ تازہ معاملہ ہے گڑبڑ نہ ہو جائے۔ ویسے ہونا ہوانا کیا ہے۔ خاما خا ہزار دو ہزار خرچ ہو جائیں گے۔ مہربان کچھ اور ہی سوچ۔"

"سوچنا کیا ہے جی۔" مہربان علی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "یہیں باغیچے میں گڑھا کھود کر دبا دیتے ہیں۔"

"یہی ٹھیک رہے گا۔ ٹائم بھی زیادہ نہیں۔ تُو بھی سارے چکروں سے بچ جائے گا۔" احسان شاہ نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"تو فیر جی میں رانا اور علیا کو گڑھا کھودنے پر لگائے دیتا ہوں۔ ابھی تو رات رہتی ہے۔ سناٹا بھی ہے۔ گڑھا کھودنے کی آہٹ بھی نہ اُبھرے گی۔"

"ٹھیک ہے ایسا ہی کر۔" احسان شاہ نے سر ہلا کر کہا۔ "اب دیر نہ کر۔ یہاں سے جا۔"
مہربان علی خاموشی سے مڑا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

آتش دان میں انگارے خوب دہک رہے تھے۔ کمرے میں بکھری ہوئی روشنی زیادہ گہری سرخ ہوتی جا رہی تھی۔ احسان شاہ کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ اُس نے مُنہ پھاڑ کر جماہی لی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد نے پوچھا۔ "کہاں چلا شاہ جی؟"

"چوہدری! میں نے اب جانا ہے۔" احسان شاہ بولا۔ "نیند لگ رہی ہے اور میں نے سویرے لہور بھی جانا ہے۔ تو آرام سے یہیں بیٹھا رہ۔ تیرا سامان دوسرے کمرے میں پہنچتے ہی تجھے لینے کوئی نہ کوئی آ ہی جائے گا۔" وہ مسکرایا۔ "چوہدری فکر نہ کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ دروازے کی جانب بڑھا اور باہر چلا گیا۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔ کمرہ اب خوب گرم ہو چکا تھا۔ اُس کا جی چاہا کہ وہیں سو جائے لیکن کچھ ہی دیر بعد رحمتے کمرے میں داخل ہوئی اور کہنے لگی۔ "چوہدری، میں نے تیرا سامان دوسرے کمرے میں پہنچا دیا ہے۔ چل میں تجھے بھی وہیں پہنچا دوں۔"

کمرے سے باہر نکل کر رحیم داد سردی کی اچانک یلغار سے کپکپانے لگا۔ چند قدموں کے فاصلے پر اُس نے دیکھا، برآمدے کی نکڑ پر نواز لالٹین لیے کھڑا تھا۔ اُس کی زرد زرد روشنی میں رانا اور علیا ہاتھوں پر ہاجراں کی لاش اُٹھائے کمرے سے باہر نکل رہے تھے۔ مہربان علی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ دور سے تینوں سایوں کی مانند دھندلے نظر آ رہے تھے۔ انھوں نے برآمدہ طے کیا۔ باغیچے میں پہنچے اور درختوں کے جھُنڈ کی جانب بڑھنے لگے۔

رحیم داد انہیں دیکھتے ہی ٹھٹک کر رہ گیا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے اُن کی سمت دیکھ رہا تھا۔ نواز لالٹین سنبھالے آگے آگے چل رہا تھا۔ رحمتے بھی ٹھہر گئی۔ اُس کی نظریں بھی اُدھر ہی اٹھی تھیں۔ رانا اور علیا لاش سنبھالے درختوں کی آڑ میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ مہربان علی اور نواز بھی اب نظر نہ آتے تھے۔ درختوں کے نیچے لالٹین کی روشنی، دھندلا زرد دھبا بن کر چمک رہی تھی۔

رحمتے زیادہ دور نہ گئی۔ قریب کے ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر رُک گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول دیا۔ رحیم داد اندر چلا گیا۔ رحمتے بھی اندر داخل ہو گئی۔ اُس نے دروازہ بند کر دیا۔ رحیم داد کو رہ رہ کر ہاجراں کا خیال آ رہا تھا۔ اُس کی پھٹی پھٹی آنکھیں، خوف ناک سیاہ چہرہ، ہونٹوں سے باہر نکلی ہوئی زبان اور کھنچی ہوئی لمبی گردن۔ وہ سخت بے چین اور پریشان تھا۔ بے زاری سے بولا "رحمتے تو جا۔ میں سو جاؤں گا، فکر نہ کر۔"

"سوچ لے۔ تو اکیلا گھبرائے گا تو نہیں۔ ہاجراں کا خیال تجھے زیادہ ہی تنگ کرے گا۔" اُس کے لہجے میں ہمدردی تھی، چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی "گھبرا نہیں، تو بول تو ادھر ہی رہ جاتی ہوں۔ تو اپنے بستر پر سو۔ میں دھسّا اوڑھ کر دری پر پڑ جاؤں گی۔" اُس نے ہاتھ اُٹھا کر انگیٹھی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ تو جل ہی رہی ہے۔ کمرہ گرم ہے، مجھے سردی نہیں لگے گی۔"

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ جوتے اتار کر بستر پر لیٹ گیا۔ رحمتے بھی انگیٹھی کے نزدیک ہی اپنا دُھسّا اوڑھ کر فرش پر بچھی ہوئی دری پر لیٹ گئی۔ دونوں خاموش تھے۔ باہر تیز ہوا درختوں میں سسکیاں بھر رہی تھی۔ ہوا کے شور کے درمیان رُک رُک کر کدال سے زمین کھودنے کی آواز رات کے سناٹے میں اُبھر رہی تھی۔ کئی منٹ تک یہ آواز اُبھرتی رہی۔ پھر بیلچے سے مٹی اٹھانے اور ڈالنے کی آواز سنائی دی۔ آخر یہ آواز بھی بند ہو گئی۔

پچھلا پہر تھا۔ سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ رات کی گہری خاموشی میں باہر برآمدے میں قدموں کی آہٹ اُبھری۔ یہ ایک سے زیادہ افراد کی چاپ تھی۔ چاپ رفتہ رفتہ دُور ہوتی گئی۔ سناٹے میں ڈوب کر ختم ہو گئی۔

☆

نہ معلوم رات کتنی گزر چکی تھی۔ رحیم داد کی آنکھوں میں دور دور تک نیند نہ تھی۔ وہ کچھ دیر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا، پھر اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اُس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ انگیٹھی میں انگارے راکھ کی تہہ کے نیچے دھندلے پڑ چکے تھے۔ انگیٹھی کے نزدیک رحمتے کروٹ کے بل

سو رہی تھی۔ رحیم داد کا اندازہ یہی تھا۔ وہ ٹانگیں پسارے تکیے کے سہارے کمر ٹکائے چپ چاپ بیٹھا رہا۔

اس نے سامنے دری پر لیٹی ہوئی رحمتے کو گردن موڑ کر ایک بار پھر دیکھا۔ بستر سے نیچے اُترا اور دبے دبے قدموں سے چلتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ رحمتے کی پشت اس کی جانب تھی۔ رحیم داد نے اسے دسان سے پکارا۔ "رحمتے!" مگر اس نے نہ کروٹ بدلی نہ کچھ بولی۔ خاموش لیٹی رہی۔ رحیم داد نے جھک کر اسے آہستہ سے جھنجوڑا۔ وہ اس وقت گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔

اس بار رحمتے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ لیکن سر جھکائے فرش کو تکتی رہی۔

"انگیٹھی بجھ گئی ہے۔" رحیم داد نے اظہار ہمدردی کیا۔ "تجھے سردی تو نہیں لگ رہی؟"

رحمتے نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ بیٹھی رہی۔

رحیم داد نے اس دفعہ بھی نرمی سے کہا۔ "لگتا ہے تجھے نیند نہیں آ رہی۔"

وہ پھر بھی نہ بولی۔ خاموشی سے گردن کو خم دے کر اپنا چہرہ رحیم داد کے سامنے کر دیا۔ لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں رحیم داد نے دیکھا، رحمتے کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ رخساروں پر ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

"رحمتے! تو رو رہی ہے۔" رحیم داد اس کے قریب ہی فرش پر بیٹھ گیا۔

"ہاں چوہدری، مجھے نیند نہیں آ رہی۔" رحمتے دل گرفتہ ہو کر بولی۔ "سمجھ نہیں آتی یہ کیا ہو گیا۔"

"جو ہونا تھا ہو گیا۔" رحیم داد نے اس کی دل جوئی کرنے کی کوشش کی۔ "اتنا نہ سوچ۔ کچھ دیر آرام کر لے۔"

"کیا کروں، نیند ہی نہیں آ رہی۔" اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "غلطی تیری نہیں۔ سارا قصور میرا ہی ہے۔ شاہ جی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں باجراں کو تیرے کمرے میں نہ لاتی تو وہ اس طرح گلے میں پھندا ڈال کر نہ مرتی۔ اس کی لاش اس طرح چوری چوری رات کے اندھیرے میں درختوں تلے گڑھا کھود کر نہ دبائی جاتی۔" رحمتے بات کہتے کہتے سسکیاں بھرنے لگی۔ رحیم داد بھی

افسردہ ہوگیا۔ اس کے چہرے پر غم کے سائے منڈلانے لگے۔ کمرے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چند لمحوں بعد خاموشی میں رحمتے کی بوجھل آواز ابھری۔ "چوہدری! میں نے بہت بُرا کیا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ہاجراں کے دو ننھے ننھے بچے ہیں۔ گھر والا بھی ہے۔ انہیں کچھ پتہ نہیں کہ ہاجراں کا کیا بنا۔ وہ تو اس کا انتظار کرتے ہوں گے۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ رحمتے نے آنسو پونچھے اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں بت بنے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ رک رک کر سانس بھرتے رہے۔ کمرے میں گہرا سکوت تھا اور باہر درختوں میں سرما کی بپھری ہوئی ہوا فراٹے بھر رہی تھی۔

رحیم داد نے نظر بھر کر رحمتے کو دیکھا۔ اس کا بدن قدرے پھیل گیا تھا مگر ابھی تک گداز اور کسا ہوا تھا۔ رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ بے قرار ہو کر ایک ہاتھ بڑھایا۔ رحمتے کی کمر کو آہستہ سے تھپکا۔ نرم لہجے میں بولا۔ "تو نے کوئی غلطی شلطی نہیں کی۔ اب ہاجراں کو بھول جا۔" اس نے رحمتے کو ہولے سے اپنے قریب لانے کی کوشش کی۔ "چل، ذرا دیر منجی پر آرام کر لے۔"

رحمتے کسمسائی۔ اس نے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے علیحدہ کر دیا۔ عاجزی سے بولی۔ "نہیں چوہدری، میں نے اب آرام نہیں کرنا۔" وہ ہٹ کر ذرا دور چلی گئی اور آہستہ آہستہ دروازے کی جانب بڑھی۔

"کہاں جا رہی ہے؟" رحیم داد نے اسے ٹوکا۔

"مجھے اپنے بچوں کے پاس جانا ہے، وہ اکیلے ہیں۔" رحمتے ٹھہرنے پر رضامند نہیں ہوئی۔

"ایسا ہی تھا تو ادھر آئی کیوں تھی؟" رحیم داد نے ناگواری سے اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا۔

"ناراض نہ ہو۔" رحمتے نے عاجزی سے کہا۔ "تو بہت ڈرا ہوا تھا، اکیلا بھی تھا۔ اب تو نہ ڈرا ہوا ہے، نہ اکیلا ہے۔" اُس نے قدرے توقّف کیا۔ لہجے میں اور زیادہ نرمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "چوہدری، مجھے اب جانے دے۔ راکھا اپنی کوٹھڑی میں موجود ہے جاگ بھی رہا ہے۔ کوئی کام ہو تو اُسے بتا دینا۔"

اُسی وقت باہر پہرے دار نواز زور سے کھنکارا۔

رحمتے نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور باہر چلی گئی۔ رحیم داد کو دوبارہ اُسے روکنے کی ہمّت نہیں ہوئی۔ برآمدے میں رحمتے کے قدموں کی آہٹ چند لمحوں تک سنائی دیتی رہی۔

صبح رحیم داد نے احسان شاہ کے ساتھ ناشتہ کیا۔ احسان شاہ نہا دھو کر آیا تھا۔ وہ تروتازہ اور ہشاش بشاش نظر آرہا تھا۔ اُس نے ہاجراں کی خودکشی اور اُس کی لاش ٹھکانے لگانے کے سلسلے میں کسی قسم کا تذکرہ نہ کیا۔ رحیم داد نے بھی ایسی کوئی بات نہ چھیڑی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر احسان شاہ حویلی سے باہر نکلا۔ رحیم داد بھی اس کے ہم راہ تھا۔ حویلی کے پھاٹک کے عین سامنے احسان شاہ کی لمبی چوڑی امپالا صبح کی بسنتی دھوپ میں جھل ملا رہی تھی۔ احسان شاہ نے یہ کار پچھلے ہی دنوں خریدی تھی۔ وہ رحیم داد کو اسے دکھانے ہی کے لیے حویلی سے باہر لایا تھا۔ رحیم داد چمکتی دمکتی امپالا دیکھ کر بہت مرعوب ہوا۔

احسان شاہ اپنے منیجر مہربان علی اور ایک خدمت گار کے ہم راہ کار میں سوار ہوا۔ کار کا انجن ہولے سے اسٹارٹ ہوا۔ کار آگے بڑھی۔ رحیم داد خاموش کھڑا لاہور کی سمت دوڑتی ہوئی امپالا کو دیکھتا رہا۔

☆

پہر دن گزر چکا تھا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی۔ رحیم داد کو چمکتی ہوئی اُجلی اُجلی دھوپ خوش گوار معلوم ہوئی۔ وہ حویلی میں واپس نہ گیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھیتوں کی جانب نکل گیا۔ ربیع کی بوائی ہو چکی تھی۔ گندم کے نازک پودے بیجوں سے پھوٹ کر ہاتھ بھر اُونچے ہو گئے تھے۔ سرسوں اور مٹر کے پودے بھی ہوا کے نرم جھونکوں سے گندم کے پودوں کے ساتھ جھوم رہے تھے۔ کھیتوں میں سبزے کی اونچی نیچی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ رحیم داد لوئی اوڑھے ہوئے تھا۔ اس کے نیچے گرم کوٹ بھی تھا۔ سرد ہوا سے محفوظ رہنے کے لیے گردن اور کانوں کے گرد اُونی مفلر لپیٹے ہوئے تھا۔ ہلکی ہلکی دھوپ کی حرارت اور گرمی سے لطف اندوز ہوتا وہ آگے بڑھتا گیا۔

کھیتوں کی ایک طرف جوہ تھا۔ جوہ میں نوعمر لڑکے کوکلا چھپاکی کھیل رہے تھے، شور مچا رہے تھے۔ ہر طرف پھیلی ہوئی دھوپ اور بھاگ دوڑ سے جسموں میں حرارت اور چستی پیدا کر رہے تھے۔ اُن کے آس پاس مویشی اور چوکھر گردنیں جھکائے، جگہ جگہ چرائی میں مصروف تھے۔ ان کے گلوں میں پڑی ہوئی پیتل کی گھنٹیاں رک رک کر بج رہی تھیں۔ جوہ کے اختتام پر مٹی سے لپے پتے مکانات دھوپ میں کچھ اور نکھر گئے تھے۔

رحیم داد پہیے پر چلتا ہوا ایک موڑ پر مڑا تو سامنے سے ماکھا آتا ہوا نظر آیا۔ رحیم داد نے اُسے دور ہی سے پہچان لیا۔ مگر ماکھا نے اُسے نہیں پہچانا تھا۔ وہ قریب پہنچا تو رحیم داد کو اپنے رُو برو دیکھ کر حیرت سے بولا "چوہدری! تو اِدھر ہے! میں نوں بالکل پتہ نہ تھا کہ تُو یہاں بھی ہو سکتا ہے۔ میں تو تیرے پنڈ آنے والا تھا۔" خوشی سے اس کا چہرہ کھل اُٹھا تھا۔

رحیم داد نے مسکرا کے پوچھا "تیری گھر والی رسیلی"۔ وہ ٹھٹکا اور بے تکلفی سے ہنسنے لگا "میرا مطلب ہے سگراں تو ٹھیک ٹھاک ہے، راضی خوشی ہے؟"

"بالکل راضی خوشی ہے جی۔" ماکھا خوش ہو کر بولا "تیرے بارے میں تو اکثر پوچھتی رہتی ہے۔ تُو میرے ساتھ گھر چل۔ تجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوگی۔"

رحیم داد اس کے ہم راہ چلنے پر رضامند نہ ہوا، سنجیدہ چہرہ بنا کر بولا "ماکھے مجھے حویلی واپس جانا ہے۔ وہاں کئی ضروری کام کرنے ہیں۔"

"حویلی تو تیں نوں واپس جانا ہی ہے۔" ماکھا گڑگڑا کر عاجزی سے بولا "میں معمولی مزارع ہوں۔ تُو میرے گھر چلا جائے گا تو میری عزت بڑھ جائے گی۔ مجھے اور سُگراں دونوں کو بہت خوشی ہوگی۔" اُس کے لہجے میں رقّت پیدا ہوگئی "چوہدری! تُو نے میرا اُجڑا ہوا گھر آباد کرا دیا۔ میرا بازو واپس دلا کے مجھے بربادی سے بچا لیا۔ تیرے لیے میرے دل سے کتنی دعا نکلتی ہے، میں تجھے بتا نہیں سکتا۔"

رحیم داد پھر بھی ماکھا کے گھر جانے کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ مگر اس کے بار بار انکار کے باوجود ماکھا نہ مانا۔ وہ منّت سماجت پر اُتر آیا۔ اصرار کر کے رحیم داد کو اپنے گھر لے ہی گیا۔ ماکھا اُس کے

ساتھ گھر کے صحن میں داخل ہوا۔ اُس نے جھپاک سے دھوپ میں چارپائی لاکر ڈالی، کھیس بچھائی۔ رحیم داد سے چارپائی پر بیٹھنے کو کہا۔ ماکھا خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ اُس نے اُونچی آواز سے پکارا۔

"سگراں اِدھر تو آ، دیکھ آج اپنے گھر کون آیا ہے۔"

صغراں، اوٹے کے عقب سے نکل کر سامنے آگئی۔ اُس کے دونوں ہاتھ گوبر سے لتھڑے ہوئے تھے۔ اُس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کے رحیم داد کو دیکھا۔ رفتہ رفتہ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی حیرت مسرّت میں بدل گئی۔ اُس نے رحیم داد کو سلام کیا اور معذرت کی۔ "چوہدری معاف کرنا میں ابھی تیرے پاس آتی ہوں۔" صغراں کچھ ہی دیر بعد دھوتی کے پلّو سے ہاتھ پونچھتی ہوئی واپس آگئی۔

ماکھا نے بیوی سے کہا۔ "سگراں تو چوہدری کو لسّی پلا۔ آرام سے گل بات کر۔ میں باہر جا رہا ہوں، فٹا فٹ لوٹ آؤں گا۔"

رحیم داد نے ماکھا کو روکنا چاہا مگر وہ تیزی سے بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ رحیم داد دھوپ میں چارپائی پر بیٹھا رہا۔ صغراں بھی جا چکی تھی۔ رحیم داد تنہا رہ گیا تھا۔ دھوپ میں حرارت بڑھتی جا رہی تھی۔ رحیم داد نے گردن اور کانوں کے گرد لپٹا ہوا مفلر اتار دیا۔ ٹوپی بھی اتار کر ایک طرف رکھ دی۔

صغراں لسّی سے بھرا ہوا گلاس لائی اور رحیم داد کے سامنے جھک کر پیش کیا۔ صغراں نے بُکّل مار کر چہرے کو سوتی دوہر سے ڈھک لیا اور رحیم داد کے سامنے فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ رحیم داد نے لسّی کا گھونٹ بھرتے ہوئے صغراں کو غور سے دیکھا۔ یہ وہ صغراں نہ تھی جس کے گلابی چہرے پر ہر لمحے بکھرتی ہوئی مسکراہٹ کے باعث احسان شاہ چاہت اور پیار سے رسیلی کہتا تھا۔ وہ ایک مرتبہ رحیم داد کے پاس بھی آئی تھی۔ مگر اب اس کا نرم و گداز بدن درخت کی خشک شاخ کی مانند مرجھا گیا تھا۔ جھلمل کرتی سیاہ آنکھوں کے چمکتے دمکتے ستارے بجھ گئے تھے۔ چہرہ زرد اور مٹیالا پڑ گیا تھا۔ وہ ملگجی دوہر اوڑھے تھی۔ اُس کی بوسیدہ نیلی جھگّی کمر

کے پاس سے اُدھڑی ہوئی تھی۔ وہ میلی سفید دھوتی باندھے ہوئے تھی۔ دھوتی پر جگہ جگہ دھبے تھے۔ وہ اُجڑی اُجڑی نظر آ رہی تھی۔

رحیم داد اُسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ اُس نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "سگراں، یہ تجھے کیا ہو گیا؟"

"میں نوں تو جی کچھ نہیں ہوا۔" وہ سادگی سے بولی۔

"تو پہلی سی سگراں ہی نہیں رہی۔" رحیم داد کے لہجے میں ہمدردی نمایاں تھی۔ "سچ کہہ رہا ہوں۔ تو بالکل ہی بدل گئی۔ جب تک شاہ جی کے کوٹ میں تھی سوہنی اور جوان ہوتی تھی۔ لگتا ہے تو یہاں راضی خوشی نہیں۔" رحیم داد نے تیکھی نگاہوں سے دیکھا۔ "تو نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ ماکھا نے تیرا ستیاناس مار دیا۔"

"چوہدری! ایسا نہ کہہ۔" وہ تڑپ کر بولی۔ "ماکھا تو مجھے بہت پیار کرتا ہے۔ سر میں ذرا درد بھی ہو جائے تو گھبرا جاتا ہے۔ بھاگا بھاگا حکیم کے پاس جاتا ہے۔ میرا سر دباتا ہے، اپنے ہاتھ سے دوائی کھلاتا ہے۔" وہ لہک لہک کر بتا رہی تھی۔ "میں جی اپنے گھر میں بہت خوش ہوں۔"

"مجھے تو خوش نہیں لگتی۔ حویلی میں تو تیری اور ہی بات تھی۔ بُرا نہ منانا۔ اب تو جیسے لال لال انگارے سے بجھ کر تو راکھ رہ گئی ہے۔"

"چوہدری، ایسی باتیں نہ کر۔ وہ بھی کوئی زندگی تھی۔" اس دفعہ صغراں کا لہجہ تند اور تیکھا تھا۔ "کنجریوں سے بھی خراب زندگی تھی وہ۔" اُس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "ویسے کھانے پینے کو تو اُدھر کوٹ میں بہت اچھا ملتا تھا۔ کام کاج بھی کرنا نہیں پڑتا تھا۔ پر ہر روز شام کو بناؤ سنگھار کرنا پڑتا۔ کب شاہ جی کا بلاوا آ جائے اور کب اس کا کوئی مہمان آ جائے۔ ایک سے بڑھ کے ایک شرابی کبابی مہمان ایک سے ایک گندا کتا۔ تو ہی بتا۔ یہ کیا زندگی ہوئی؟"

"پر دیکھنے میں تو وہاں تو بہت خوش نظر آتی تھی۔"

"تجھے کیا پتہ چوہدری۔ تو نیک بندہ ہے۔" صغراں نے کہا۔ "میں تیرے پاس پوری ایک رات رہی تو تو مجھ سے الگ رہا۔" اُس کے چہرے پر یاسیت چھا گئی۔ "پر شاہ جی! میں تجھ کو

کیا بتاؤں کیسا گندہ ہے وہ۔ شراب پی کے تو وہ آدمی ہی نہیں رہتا، اور اس کے یار، وہ بھی اتنے گندے اور خراب ہیں کہ ان کے بارے میں جب سوچتی ہوں تو اپنے سے بھی گھن آتی ہے۔ میں پانچ سال تک اس کنجر خانے میں رہی۔ اس میں زنانی جاکر زنانی نہیں رہتی کنجری بن جاتی ہے۔"

رحیم داد نے محسوس کیا کہ احسان شاہ کی حویلی کے ذکر نے صغراں کو اُداس کر دیا ہے۔ اُس کا روکھا اور مرجھایا ہوا چہرہ کھنڈر نظر آنے لگا۔ رحیم داد نے فوراً گفتگو کا رخ موڑ دیا، اِدھر اُدھر گردن گھما کر پوچھا "یہ ماکھا کہاں چلا گیا؟"

"آتا ہی ہوگا جی۔" وہ بولی۔"چوہدری، تو آرام سے بیٹھ۔ اب آیا ہے تو روٹی کھا کر ہی جانا۔"

"میں اتنی دیر یہاں نہیں ٹھیر سکتا۔" رحیم داد نے اپنی مجبوری ظاہر کرنے کی کوشش کی۔" حویلی میں میرا انتظار ہوتا ہوگا۔"

"پر شاہ جی تو اپنی موٹر میں بیٹھ کر لہور گیا ہے۔ ماکھا مجھے بتاتا تھا۔" صغراں نے کہا۔ "ویسے میرا کہا مان تو شاہ جی کی حویلی میں نہ ٹھیرا کر۔ گندی جگہ ہے۔ میں تو تجھے کہتی ہوں اُس کی یاری بھی چھوڑ دے۔ وہ بہت خطرناک بندہ ہے، تو اُسے نہیں جانتا۔"

"میں تو اُس کے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔ کسی کام کے بغیر میں اُس کے پاس نہیں آتا۔"

"یہ تو مجھے بھی لگتا ہے۔" صغراں آزردگی سے بولی۔" میں تجھے اچھی طرح جانتی ہوں، سمجھتی ہوں، تو بہت اچھا بندہ ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ صغراں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔" چوہدری! میں ابھی آتی ہوں۔" جواب کا انتظار کیے بغیر وہ گھر سے باہر چلی گئی۔

رحیم داد اکیلا صحن میں چارپائی پر بیٹھا رہا۔ پانچ منٹ گزرے۔ دس منٹ گزرے۔ پندرہ منٹ گزر گئے۔ رحیم داد اُکتا گیا۔ صغراں واپس نہ آئی، البتہ ماکھا آ گیا۔ اُس کے ہم راہ ایک اجنبی تھا۔ وضع قطع سے وہ بھی مزارع ہی لگتا تھا۔ وہ سانولی رنگت کا دراز قد مضبوط

اور چھریرا آدمی تھا۔ سر اور کانوں کو میلی کچیلی چادر کے کونے سے چھپائے ہوئے تھا۔ اُس نے رحیم داد کو اونچی آواز سے سلام کیا۔ ماکھا کے ساتھ وہ بھی رحیم داد کے سامنے صحن کے کچے فرش پر بیٹھ گیا۔

ماکھا بولا۔ "چوہدری، میں اسی کے بارے میں بات کرنے تیرے پاس آنے والا تھا۔" اُس نے مڑ کے قریب بیٹھے ہوئے دراز قد شخص کی جانب دیکھا۔ "اس کی گھر والی کو شاہ جی نے اٹھوالیا ہے۔ دس بارہ روز ہو گئے۔" ماکھا کے لہجے میں التجا تھی۔ "چوہدری، جیسے تو نے میری مدد کی، ایسے ہی اس کی بھی مدد کر دے۔ اس کا بازو واپس دلا دے۔ شاہ جی تیری گل ضرور مان لے گا۔" ماکھا نے اُس شخص کی جانب اشارہ کیا۔ "اس کا نام عالم ہے جی۔"

عالم کا نام سنتے ہی رحیم داد سخت پریشان ہو گیا۔ وہ ہاجراں کا شوہر تھا۔ رحیم داد کو فوراً کمرے کی چھت سے لٹکتی ہوئی برہنہ لاش کا خوف ناک چہرہ یاد آ گیا۔ اُس نے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالنے کی کوشش کی، کھنکار کر گلا صاف کیا، ماکھا کو بے چینی سے دیکھا، پوچھا "ماکھے! تجھے کیسے پتہ چلا کہ شاہ جی نے عالم کی گھر والی کو اٹھوا لیا؟"

ماکھا کے بجائے عالم بولا۔ "وہ ایسا ہے چوہدری کہ شاہ جی مجھے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔"

"شاہ جی، تجھے کیوں بے دخل کرنا چاہتا ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"بہت پرانا جھگڑا ہے جی۔" عالم نے بتایا۔ "میرا پنڈ پہلے لالہ کرشن دیال کی زمیں داری میں تھا۔" اُس نے رحیم داد کا چہرہ نظر بھر کے دیکھا۔ "لالہ کرشن دیال تیرے پنڈ کی زمیں داری جمیلہ کا پیو تھا۔ سنا ہے اب تو وہ مر گیا۔" عالم کے چہرے پر جھنجلاہٹ اُبھرنے لگی۔ "پر جی وہ اور اس کا منیجر بنسی لال مزارعوں پر بہت ظلم کرتا تھا۔ میں بھی اس کا مزارع تھا۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے عالم۔" رحیم داد نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "میرا پنڈ کوٹلہ ہرکشن بھی اس کی زمیں داری میں ہوتا تھا۔ میرے مزارع بھی لالہ کرشن دیال اور بنسی لال کے بارے میں یہی بتاتے ہیں۔"

"چوہدری! اصل بات یہ ہے۔" عالم نے بتایا۔ "اُدھار دے دے کر اُس نے بیاج کے

پھندے میں مزارعوں کو ایسا باندھ رکھا تھا کہ واڈھی کے بعد ساری کی ساری فصل اُس کے گوداموں میں چلی جاتی۔ اُدھار تب بھی ختم نہ ہوتا۔ اس کے منیم اور منشی اپنے وَہی کھاتے میں جو چاہتے لکھ لیتے اور مزارعوں سے انگوٹھا لگوا لیتے۔ تیں نوں پتہ ہے چوہدری، مزارعے پڑھے لکھے تو ہوتے نہیں۔" اُس کی آواز میں غم گھلا ہوا تھا۔ "منیم ادھار کی رکم جتنی چاہتا بڑھا کر لکھ دیتا۔ کسی بھی مزارع کو ادھار لے کر انگوٹھا لگاتے ہوئے کچھ بھی ملوم نہ ہوتا۔"

رحیم داد نے بے زاری سے کہا۔ "تجھے تو شاہ جی سے گلہ ہے۔ یہ لالہ کرشن کی بات کہاں لے بیٹھا۔"

"میں شاہ جی ہی کی گل بناتے لگا ہوں۔" عالم نے جھٹ وضاحت کی۔ "گل ایہہ اے جی کہ جب ۱۹۴۶ء میں الیکشن ہو رہا تھا تو شہر سے روز ہی مسلم لیگی لیڈر آتے۔ کہتے پاکستان بن گیا تو ہر مزارع اپنی زمین کا مالک بن جائے گا۔ مزارعوں اور کمیّوں کو بنیوں اور لالوں کے کرض ادھار کے چکر سے چھٹکارا مل جائے گا، زمین اس کی ہوگی جو اس پر ہل چلائے گا۔"

"شاہ جی بھی لیگی لیڈروں میں شامل تھا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"نہیں جی وہ تو سدا کا یونینسٹ ہے۔" عالم نے زہر خند سے کہا۔ "وہ تب بھی یونینسٹ پارٹی میں تھا۔ اس نے پاکستان کی سخت مخالفت کی۔ طرح طرح سے بہکایا، ڈرایا، دھمکایا۔ دباؤ بھی ڈالا۔ پر جب الیکشن ہوا تو جی سارے ہی مسلمانوں نے مسلم لیگ ہی کے بکسوں میں پرچی ڈالی اور میں نے تو جی، لیگ کو ووٹ دلوانے کے لیے بہت بھاگ دوڑ بھی کی۔ کسانوں کے جتھے بنا کر دور دور کے پنڈ جاتا تھا۔ ہر مسلمان بندے کو پاکستان کا حامی بناتا تھا۔" اس نے قدرے تامّل کے بعد بتایا۔ "میں تو جی شاہ جی اور پولیسیوں کی بار بار کی دھمکیوں سے بھی نہ ڈرا۔ اُن دنوں جی بہت جوش بھرا ہوا تھا۔" عالم کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "پاکستان آخر بن ہی گیا، پر پاکستان بنتے ہی تیں نوں پتہ ہے شاہ جی نے کیا کیا؟"

"کیا کیا اُس نے؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ جھٹ مسلم لیگی بن گیا۔ اُس نے اپنی حویلی پر لیگ کا ہرا جھنڈا لگایا اور پورے پیراں والہ میں مٹھائی بٹوائی۔ اُس نے کرشن دیال کے مزارعوں کو اُکسایا، کہا، اُس کی زمین

پر زبردستی کبضہ کرلو۔ وہ تو جی مزارعوں کو کرنا ہی تھا۔ یہ تو پہلے ہی طے تھا۔ لالہ کرشن دیال اور اُس کا منیجر بنسی لال سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بال بچوں کے ساتھ سرحد پار چلے گئے۔"

ماکھا نے عالم کو ٹوکا "گل چھوٹی کر، تو نے تو لمّی کہانی شروع کر دی۔"

"اچھا جی، چھوٹی ہی گل کروں گا۔" عالم سنبھل کے بولا "پھر ایسا ہوا جی کہ شاہ جی نے لالہ کرشن دیال کی چھوڑی ہوئی زمینوں پر خود کبضہ کرنے کا چکر چلایا۔ وہ محکمہ بحالیات کے افسروں سے ملا، اُن کو اپنے ساتھ لایا۔ افسروں نے مزارعوں سے کہا کہ اپنی اپنی زمین میں سے مہاجروں کو حصّہ دو۔ ان دنوں منٹگمری میں مہاجرین کا بہت وڈّا کیمپ لگا تھا۔ سرکاری افسروں کے ساتھ مہاجروں کے بھی جتھے کے جتھے آنے لگے۔" اُس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "ادھر مزارع اپنی زمین میں سے کوئی حصّہ دینے کو تیار نہ تھے۔ روز مہاجروں اور مزارعوں کے درمیان جھگڑے ہوتے۔ خون خرابہ تک ہوتا۔ پولیس آتی۔ جسے جی چاہتا پکڑ کر لے جاتی۔" عالم نے دھوپ کی تپش محسوس کرتے ہوئے چادر سر اور کانوں پر سے ہٹا دی۔ "وہی تھانے دار جو پاکستان کو گندی گندی گالاں نکالتا تھا اور یونینسٹوں اور ان کی حکومت کو خوش کرتا تھا، اب ہر گھڑی پاکستان، پاکستان کی رٹ لگاتا تھا۔ اور جن مزارعوں اور کسانوں نے پاکستان کے لیے اپنی پرچی ڈالی تھی اُن کو حوالات میں الٹا لٹکا کر زبردست مار لگاتا تھا۔"

رحیم داد نے دریافت کیا "اب وہ تھانے دار کہاں ہے؟"

"وہ تو جی بہت وڈّا پولس افسر بن گیا ہے۔ اُس کے کندھے پر زیادہ ہی پھول نظر آتے ہیں۔ آج کل لہور میں ہوتا ہے۔" عالم کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ "ادھر تو مہاجروں اور غیر مہاجروں میں دنگے فساد ہوتے تھے اور دونوں ہی کی پولس کے ہاتھوں ٹھکائی ہوتی تھی۔ دوسری طرف شاہ جی نے اپنے منیجر مہربان علی اور کرندوں کے ذریعے مزارعوں کو بہلایا پھسلایا کہ وہ اپنی اپنی زمین کا شاہ جی کے ساتھ بیع کر لیں ورنہ سرکار سارے ہی کابض مزارعوں کو بے دخل کر کے زمین مہاجروں میں بانٹ دے گی۔ پولیس نے پہلے ہی بہت تنگ کر رکھا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ پولس بھی شاہ جی کے اشارے پر مزارعوں اور کسانوں

کو تنگ کرتی تھی۔ کیمپ میں اپنے بندے بھیج کر وہ مہاجروں کو بھی جھگڑا کرنے پر اکساتا تھا۔ آخر ایک ایک کر کے سبھی نے شاہ جی کے ہاتھ بیع کر کے اسے تین ہزار کلّہ سے بھی اوپر زمین کا مالک بنا دیا۔" اُس نے ٹھنڈی سانس بھری۔" مزارع مزارع ہی رہ گئے۔ زمین کا مالک بننے کا سفنا، سفنا ہی رہ گیا۔" عالم نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔" اس طرح جی میں بھی شاہ جی کا مزارع بن گیا۔ جب لالہ کرشن دیال کی زمینیں شاہ جی کے پاس چلی گئیں تو مجھے بھی فیر اس کا مزارع تو بن نا ہی بن نا تھا۔"

ماکھا نے اُسے پھر ٹوکا۔" عالم تو گل چھوٹی نہیں کر سکتا۔ تیری ایسی ہی گلاں سے تو شاہ جی خار کھاتا ہے۔ تجھے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔"

"تو بھی ٹھیک ہی کہہ رہا ہے ماکھے۔" عالم نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔" پر چوہدری یہ تو بتا۔ ہندو بنیے اور وڈّے زمیں دار جب کسی مزارع کو بے دخل کرنا چاہتے تو اس کے خلاف عدالت میں نالش کرتے۔ ڈگری نکلواتے، کرکی لاتے۔ زمین کرک کراتے۔ مال مویشی اور گھر گرہستی کرک کرا کے اُٹھا لے جاتے۔" اُس کی آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی۔" پر شاہ جی کسی کو بے دخل کرنا چاہتا ہے تو اُس کی گھر والی اور جوان دھی تک کو اٹھوا لیتا ہے۔" عالم کی آواز بجھنے لگی۔" سکھ اور ہندو ادھر سے گئے تو مسلمان کسان اور مزارع بہت خوش تھے کہ بنیوں کے ظلم وستم اور بیاج کے چکّر سے چھٹکارا مل جائے گا۔ پر یہ پتہ نہ تھا کہ اس سے بھی زیادہ ظلم ہو گا۔ عزت اور آبرو بھی جاتی رہے گی۔"

"چوہدری، یہ تو ایسی ہی گلاں کرتا ہے۔" ماکھے نے مداخلت کی۔" تو شاہ جی سے اس کا باز و دلا دے۔ اس کی گھر والی کا نام ہاجراں ہے۔"

عالم بولا۔" شاہ جی مجھے بے دخل کرنا چاہتا ہے چوہدری، میں اس کے لیے تیار ہوں۔ وہ میرا باز و مجھے واپس دے دے۔ میں پنڈ چھوڑ کر چلا جاؤں۔" اُس کے لہجے میں درد کی کسک پیدا ہوئی۔" کیا کیا جائے جی، اپنے نصیب میں یہی لکھا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ماں کے لیے ہر دم روتے ہیں۔ اُنہیں روتا دیکھتا ہوں تو میری آنکھیں بھی بھیگ جاتی ہیں۔ کہتے

ہاں زمین کسان کی ماں ہوتی ہے۔ وہ اُس سے ویسا ہی پیار کرتا ہے۔ مجھے بھی اپنی زمین سے ایسا ہی پیار ہے۔ میں اسی پر پیدا ہوا۔ پلا بڑھا، جوان ہوا۔ پر مجھے اپنی گھر والی سے پیار ہے۔ وہ میرا بازو ہے۔ اس کے بنا یہ زمین کس کام کی۔ ہاجراں کے جانے کے بعد میں کچھ نہیں کر سکتا۔ کھیتوں کو دیکھوں یا گھر کو۔ دونوں ہی برباد ہو رہے ہیں۔ ویسے بھی جی شاہ جی مجھے رہنے نہیں دے گا۔" اس نے بے بسی سے رحیم داد کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔" چوہدری! مجھے بے دخلی منظور ہے۔ میں ہار گیا۔ شاہ جی جیت گیا۔"

رحیم داد گم بیٹھا تھا تاہم اُسے کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا۔ اُس نے نرم لہجے میں مشورہ دیا۔ "عالم تو ایسا کر شاہ جی سے مل لے، اچھّا ہے خود جا کے اُس سے منّت سماجت کر۔ شاہ جی سے نہ ملنا چاہے تو مہربان علی سے گل بات کر۔ جب تُو بے دخل ہونے کو تیار ہی ہے۔ تو شاہ جی تیری گھر والی کو ضرور واپس کر دے گا۔ اُس نے تجھے بے دخل کرنے ہی کے لیے تو تیری گھر والی کو اٹھوایا ہے۔ یہی گل ہے ناں؟"

ماکھا بولا۔" سچی بات تو یہی ہے جی۔" اُس نے مڑ کر عالم کی جانب دیکھا۔" عالم تُو ایسا کر مہربان علی سے ضرور مل لے۔ شاہ جی تو تجھے ملے گا نہیں۔" ماکھا کھسک کر رحیم داد کے قریب پہنچ گیا۔ اُس کے پیروں کو پکڑ کر ہولے ہولے دبانے لگا۔" چوہدری، یہ تو مہربان علی سے مل ہی لے گا پر تُو بھی شاہ جی سے اس کا بازو دلانے کے لیے کہنا۔ وہ تیری گل ضرور مان لے گا۔"

رحیم داد کے پاس احسان شاہ سے بات کرنے کا وعدہ کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ ان سے کیا کہتا کہ ہاجراں اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔ وہ پیوند خاک ہو چکی ہے۔ اُس نے عالم اور ماکھا کو تسلّی دی اور کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت صغراں بھاگی بھاگی آئی۔ وہ رحیم داد کے لیے مرغ تل رہی تھی۔ مسالوں کی تیز خوشبو گھر بھر میں پھیلی ہوئی تھی۔

صغراں کو جب یہ معلوم ہوا کہ رحیم داد جا رہا ہے تو وہ اسے روکنے کے لیے اصرار کرنے لگی۔ بار بار عاجزی سے کہا مگر رحیم داد نہ ٹھیرا۔

۴۳

سورج درختوں کی بلندیوں سے اوپر نکل گیا تھا۔ سائے سمٹتے جا رہے تھے۔ جاڑے کی چمکیلی اور شفاف دھوپ میں خوش گوار تمازت تھی۔ رحیم داد واپس احسان شاہ کی حویلی میں پہنچا۔ اُس نے حیران و پریشان ہو کر دیکھا، نادر خاں باغ میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ رحیم داد تیز قدموں سے آگے بڑھا۔ نادر اُسے دیکھتے ہی احتراماً کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔ "تو کیسے اِدھر آ گیا؟" اُس کے لہجے میں حیرت سے زیادہ تشویش غالب تھی۔

"ایک نئی بات کا پتہ چلا ہے، سوچا تجھے بتا دوں۔" نادر نے جواب دیا۔ "ویسے مجھے زمیں دارنی نے سامان کی خریداری کے لیے پاک پتن بھیجا ہے۔ پر میں نے تجھ سے ملنا ضروری سمجھا، بعد میں پاک پتن چلا جاؤں گا۔"

"تو ابھی تک کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔" رحیم داد نے نرمی سے کہا۔ "آرام سے بتا کون سی نئی گل کا پتہ چلا ہے؟"

"تیرے یہاں آنے کے بعد جلیل اور زینت شام کو اپنے بچوں کے ساتھ آ گئے۔" نادر کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔

"حویلی ہی میں ٹھہرے ہیں ناں؟"

"ہاں جی، زمیں دارنی نے انہیں حویلی ہی میں ٹھہرایا ہے۔ تیرے برابر والے خالی کمرے میں تا جاں کے ویاہ تک ٹھہرے رہیں گے۔"

"پھر یہ کون سی ایسی بات ہے جسے بتانے تو سویرے ہی سویرے آ گیا۔" رحیم داد نے قدرے بے زاری سے کہا۔ "جلیل اور زینت کو تو تاجاں کے ویاہ میں شریک ہونے کے لیے آنا ہی تھا۔"

"بات تو جی اصل میں وہ ہے جو کل رات جنت کی زینت سے ہوئی۔ میں تجھے وہی بتانے آیا ہوں۔" نادر خاں کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ "ہوا یہ کہ زینت نے باتوں باتوں میں جنت کو بتایا کہ وہ دینا تھا نا، وہی جو سلامو سے زینت کے بچے لے کر آیا تھا، بعد میں زمیں دارنی سے ملا۔ تیرے اور شاہ جی کے بارے میں اُسے بہت خطرناک باتیں بتائیں۔"

"وہ تو جمیلہ کے پاس کئی بار آ چکا ہے۔" رحیم داد تذبذب سے بولا۔ "ایک بار تو تیرے سامنے بھی آیا تھا۔ میں جب یہاں آ رہا تھا تب بھی وہ مجھے نظر آیا تھا۔ میرا خیال ہے وہ جمیلہ ہی کے پاس جا رہا تھا ورنہ وہ کوٹلہ ہرکشن کیوں آنے لگا۔ اِدھر تو اس کا کوئی میل جول کا بھی نہیں۔ جلیل اور زینت بھی تب تک نہیں پہنچے تھے۔" رحیم داد کے چہرے سے وحشت صاف عیاں تھی۔ "یہ بتا دینے نے کیا خطرناک باتیں میرے اور شاہ جی کے بارے میں جمیلہ کو بتائیں؟"

نادر خاں نے کرسی رحیم داد کے اور قریب کر لی، گردن اُٹھا کے چوکنّا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "زینت کہتی تھی دینے نے زمیں دارنی کو بتایا کہ تُو نے شاہ جی کے ساتھ مل کر اللہ وسایا کو کہاں اور کیسے کتل کرایا۔" وہ کہتے کہتے ٹھٹکا۔ "اُس نے تو یہاں تک کہا کہ اللہ وسایا کا کتل اُس کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔"

"بکواس کرتا ہے وہ۔" رحیم داد نے جھنجلا کر کہا۔

"تُو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" نادر خاں نے اُس کی تائید کی اور فوراً صفائی پیش کی۔ "میں نے تو جو سنا تجھے بتا دیا۔ یہ میرا فرض تھا پر میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ اُس نے زمیں دارنی سے تیرے اور شاہ جی کے بارے میں ایسی باتیں کیوں کہیں؟ تیرے ساتھ تو اس کا جھگڑا ٹنٹا بھی نہیں۔"

"جھگڑا ٹنٹا تو تب ہوتا جب میری اس کے ساتھ جان پہچان ہوتی۔ پتہ نہیں اُس نے جمیلہ سے میرے خلاف ایسی الٹی سیدھی باتیں کیوں کہیں۔" رحیم داد کی بوکھلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ گردن جھکائے چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر اس نے سوالیہ نظروں سے نادر خاں کو دیکھا۔ "نادر تُو نے یہ بھی پتہ

کیا کہ دینے نے یہ باتیں جمیلہ کو کب بتائیں۔ یاد پڑتا ہے پہلی بار جب وہ جلیل کے ساتھ آیا تھا تو میرے سامنے ہی دیپال پور واپس چلا گیا تھا۔ جمیلہ سے اس کی کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی اور نہ ہی اس نے دوبارہ آنے کو کہا تھا۔"

"پر وہ دوسرے روز آیا اور زمیں دارنی سے سکول میں دیر تک باتیں کرتا رہا، جلیل بھی موجود تھا۔" نادر خاں نے کہا۔" جلیل نے اُس کی باتیں سنیں تو اپنی گھروالی زینت کو بھی بتائیں۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ دینا خود ہی جمیلہ کے پاس آیا تھا۔" رحیم داد بولا۔" یہ تو میں نے بھی پتہ ہے کہ وہ جمیلہ کے پاس دوسرے روز آیا تھا۔ میں نے اُسے سکول سے نکلتے دیکھا تھا۔"

رحیم داد سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ وہ اللہ وسایا کے قتل کے سلسلے میں نادر خاں کو اعتماد میں لینا نہیں چاہتا تھا لہٰذا اُس کا رویّہ بہت محتاط تھا۔ مگر وہ اپنی بڑھتی ہوئی سراسیمگی زیادہ دیر نہ چھپا سکا۔ اُس نے کرید کر پوچھا۔" زینت نے جنّت کو اور کیا کیا بتایا؟"

"زینت کہتی تھی، زمیں دارنی لہور جانے کا پروگرام بنا رہی ہے، وہاں وہ اللہ وسایا کے کتل کی نئے سرے سے تفتیش کرانے کے لیے حکام سے ملے گی۔ وکیل محمّد عثمان راٹھور کو اُس نے اسی سلسلے میں صلاح مشورہ کرنے کی غرض سے بلایا تھا۔ اسے بلانے جلیل گیا تھا۔ وہ تو جی زمین دارنی کے بہت بھروسے کا بندہ ہے۔"

"وکیل تو جمیلہ کے پاس کئی بار آیا اور ایک بار بھی مجھ سے نہ ملا۔ میرا تو تب ہی ماتھا ٹھنکا تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ میں نے اس کی آمدورفت کے بارے میں جمیلہ سے پوچھا تو اُس نے مجھے کچھ اور ہی گل بتائی۔"

"کیا کہا اُس نے؟" نادر خاں نے پوچھا۔

"کہنے لگی، وکیل کو تو میں نے جیرے کے کیس کے بارے میں مشورہ کرنے کے لیے بلایا تھا۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ زمیں دارنی نے تجھے مغالطے میں رکھنے کی کوشش کی۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ زینت کی باتوں سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے جنّت سے جھوٹ نہیں بولا۔ اُس نے جو کچھ بتایا۔ بار بار تاکید کی کہ ان باتوں کا تجھے کسی طور پتہ نہ چلے۔"

"تیرا خیال ٹھیک ہی ہے۔ زینت کیوں جھوٹ بولنے لگی۔"

"جنت نے زینت سے یہ باتیں سنیں تو وہ بہت گھبرا گئی۔ سچ تو یہ ہے جی کہ میں خود بہت گھبرا گیا۔ رات بھر بے چین رہا اور سویرے اٹھتے ہی تیرے پاس چلا آیا تاکہ تجھے پتہ چل جائے کہ زمیں دارنی کے ارادے کتنے خطرناک ہیں۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا، خاموش بیٹھا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ بکھری ہوئی تھی۔ آنکھوں میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ اُس نے غصّے پر قابو پانے کی بہت کوشش کی مگر جب تند و تیز جذبات نے شدت سے یلغار کی تو وہ پھٹ پڑا۔ "پر اُس سور دے پُتّر دینے نے جمیلہ کو یہ باتیں بنانے کی ہمّت کیسے کی۔" رحیم داد نے گھور کر نادر کو دیکھا۔ "تفتیش دوبارہ شروع ہوئی تو وہ سب سے پہلے پھنسے گا۔"

نہ بتانے کی کوشش کے باوجود رحیم داد نے جذبات کی رَو میں نادر خاں کو بہت کچھ بتا دیا۔ نادر پُرانا گھاگ تھا۔ فوراً بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اُس نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے رحیم داد کو خطرے سے خبردار کیا۔ "وہ تو وعدہ معاف گواہ بن کر صاف بچ سکتا ہے۔ میرا تو خیال ہے یہ نکتہ اُسے کسی نے بتایا نہ ہوگا۔ اُسے خود پتہ ہوگا۔ وہ پولس کا مخبر ہے۔ گواہیاں بلیش کرنا اور سرکاری گواہ مہیا کرنا اس کا روز کا کام ہے۔" اُس نے قیاس آرائی کی۔ "میرا تو یہ بھی اندازہ ہے جی، زمین دارنی نے دینے کو رشوت کے طور پر کچھ رکم بھی دی ہے۔ آگے بھی دینے کا وعدہ کیا ہوگا۔"

"دو سو روپے تو اُسے جمیلہ نے زینت کے بچوں کو لانے کے انعام کے طور پر میرے سامنے ہی دیے تھے۔" رحیم داد نے سر ہلا کے کہا۔ "میرا تو خیال ہے اس سے اُس کا حوصلہ بڑھا۔ جمیلہ سے زیادہ رکم اینٹھنے کے چکر میں وہ خود ہی اس کے پاس آیا ہوگا۔" ایک بار پھر اُس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ چہرے پر خشونت برسنے لگی۔ "یہ ساری بکواس اُس نے اسی لیے کی ہے۔"

"ایسا ہی لگتا ہے جی۔" نادر نے رحیم داد کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اب وہ زیادہ دیر رُکنا نہ چاہتا تھا، بولا۔ "میں نے جی پاک پتن جانا ہے۔ شام تک واپس پنڈ بھی پہنچنا ہے۔ زمین دارنی انتظار کرے گی۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ "ایسی باتیں سننے کے بعد تجھے بتانا نہ صرف ضروری تھا

بلکہ یہ میرا فرض تھا۔"

"تو نے اچھا کیا کہ یہ باتیں مجھے بتا دیں۔" رحیم داد نے نرمی سے کہا۔" آگے بھی ایسی کوئی گل بات معلوم ہو تو فوراً مجھے بتانا۔ میرا تو خیال ہے کہ تو جنت کو لگا دے کہ وہ زینت کے ذریعے یہ معلوم کرتی رہے کہ جمیلہ آگے کیا کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔"

"وہ تو میں نے جنت سے پہلے سے ہی کہہ رکھا ہے۔" نادر نے بتایا۔" کوئی حرج نہ ہو تو اس بارے میں شاہ جی سے بھی مشورہ کر لیا جائے۔ ویسے دینے نے اس کے خلاف بھی بہت سنگین الزام لگایا ہے۔ حالاں کہ وہ برسوں اس کا ملازم رہ چکا ہے۔ شاہ جی تو اس کو ایسا فٹ کر دے گا کہ ساری بکواس بھول جائے گا۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں شاہ جی سے ضرور مشورہ کروں گا۔ ایسا کرنا بہت ضروری ہے۔" رحیم داد نے اس کی رائے سے اختلاف نہ کیا۔" اچھا اب تو جا۔ تجھے زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

نادر خاں چلا گیا۔ رحیم داد دھوپ میں کرسی پر بیٹھا رہا۔ نادر سے گفتگو کرنے کے بعد وہ سخت الجھن میں مبتلا تھا۔ وہ مسلسل دینا کے بارے میں سوچتا رہا جو سنگین خطرہ بن کر اس کے سر پر منڈلا رہا تھا۔

☆

شام کو احسان شاہ حسبِ وعدہ واپس آگیا۔ واپسی کے کوئی دو گھنٹے بعد اُس نے رحیم داد کو اپنے پاس بلایا۔ کمرہ خوب گرم تھا۔ آتش دان میں دہکتے ہوئے انگاروں کی سرخ سرخ روشنی نے فضا کو رنگین بنا دیا تھا۔

رحیم داد میز کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے میز پر رکھے ہوئے خشک میوے، مٹھائی اور پھلوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔" شاہ جی، آج یہ تبدیلی کیوں؟" اُس نے مسکرا کے پوچھا۔

"لاہور سے میرے ساتھ میاں عبدالسبحان بھی آیا ہے۔" احسان شاہ نے بتایا۔" چوہدری،

تو میاں سبحان کو نہیں جانتا۔ بہت وڈّا زمیں دار ہے۔ تیرے سامنے یہاں کبھی نہیں آیا۔ ویسے بھی بہت ہی کم آتا ہے۔"

"لگتا ہے بالکل ہی صوفی ہے؟"

احسان شاہ نے ہنس کر کہا۔ "پہلے تو بہت پیتا پلاتا تھا۔ پر پچھلے کئی سال سے بالکل چھوڑ رکھی ہے۔"

رحیم داد نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے دریافت کیا۔ "مہربان علی تو تیرے ساتھ ہی گیا تھا ناں، اُس نے جمیلہ کے بارے میں کیا پتہ لگایا؟"

"ابھی تو کچھ پتہ نہیں چل سکا۔" احسان شاہ نے جواب دیا۔ "میں نے مہربان کو لہور چھوڑ دیا ہے۔ وہ ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی لوٹے گا۔"

"کب تک واپس آ جائے گا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"اُسے کل شام تک واپس آ جانا چاہیے۔ ویسے ساری باتوں کا پتہ کر کے ہی آئے گا۔"

"آج صبح تیرے لہور جانے کے کچھ ہی دیر بعد نادر یہاں آیا تھا۔" رحیم داد نے گہری سانس لے کے کہا۔

"کیسے آیا تھا وہ۔ کوئی خاص گل بات تو نہیں؟"

"اُس نے تو بہت عجیب گل سنائی۔" رحیم داد نے اضطراب سے کہا۔ "میں تو اُسے سن کر گھبرا گیا۔ تب سے تیرا انتظار کر رہا تھا کہ تو آئے تو ساری گل بات تجھے بتاؤں۔"

"کیا کہتا تھا وہ؟" احسان شاہ نے رحیم داد کے چہرے پر بکھری ہوئی سراسیمگی محسوس کی۔ "تو کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آ رہا ہے۔"

"پریشان ہونے کی بات ہی ہے۔" رحیم داد نے کہا۔ "تیرے پاس ایک نوکر ہوتا تھا۔" رحیم داد کا لہجہ مدھم پڑ گیا۔ "دینا، وہی جسے تو نے دارا کے ساتھ اللہ وسایا کے کتل پر لگایا تھا۔"

"اُس کی تو میں نے کب کی چھٹی کر دی۔ ایک رات ساوی کے نشے میں دھت ہو کر اُس نے بہت رولا کیا۔ میں نے جوتے لگوا کر اُسی رات اُسے پنڈ سے نکال دیا تھا۔" احسان شاہ

نے کہا۔ "بہت زیادہ تنگ کرنے لگا تھا۔" اُس نے نظر بھر کر رحیم داد کا چہرہ دیکھا۔ "پر تجھے اس سے کیا لینا؟"

"تجھے یہ بھی پتہ ہے، اب وہ کہاں ہے؟"

"بالکل پتہ ہے۔" احسان شاہ نے نہایت اطمینان سے بتایا۔ "وہ پولس کا چڑی چور بن گیا ہے۔ تھانے دار زماں خاں نے اسے مخبر لگا رکھا ہے۔"

"پر تجھے یہ پتہ نہیں، دینے ہی نے زینت کے بچے سلامو سے واپس دلائے تھے۔ بچوں کو لے کر وہ زینت کے خصم جلیل کے ساتھ جمیلہ کے پاس پہنچا۔ زینت ان دنوں جمیلہ ہی کے پاس تھی۔" اُس نے قدرے تامّل کیا، احسان شاہ کی آنکھوں میں جھانک کر گویا ہوا۔ "تب سے وہ کئی بار جمیلہ کے پاس جا چکا ہے۔ نادر اسی کے بارے میں بتانے میرے پاس آیا تھا۔"

"کیا کہتا تھا نادر؟" احسان شاہ نے چونک کر پوچھا۔

"نادر کہتا تھا دینے نے اللہ وسایا کے کتل کے بارے میں جمیلہ کو سب کچھ بتا دیا۔"

"نادر کو کیسے اس بات کا پتہ چلا، جمیلہ نے اسے بتایا ہے؟" احسان شاہ کے چہرے پر غبار پھیل گیا۔

"بات کچھ اس طرح ہے۔" رحیم داد نے کہا۔ "زینت نے جنّت کو بتایا اور اُس نے ساری بات نادر کو بتا دی۔"

کمرے میں سکوت چھا گیا۔ دہکتے انگاروں کی روشنی میں رحیم داد اور احسان شاہ کے چہرے سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ رحیم داد زیادہ دیر خاموش نہ رہا۔ اُس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ اور صبح نادر خاں سے جو کچھ سنا تھا، احسان شاہ کو تفصیل سے بتا دیا۔

احسان شاہ کچھ دیر کے لیے فکر میں ڈوب گیا تھا مگر جلد ہی اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ وہ زیرِ لب مسکرایا۔ "چوہدری، تو فکر نہ کر۔ دینا کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دے۔"

مگر رحیم داد مطمئن نہ ہوا۔ اُس نے دبی زبان سے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "شاہ جی، یہ تو سوچ دینا اب تیرا نوکر نہیں رہا۔"

"پر وہ تھانے دار زماں خاں کے ساتھ تو لگا ہوا ہے ناں۔ زمان میرا گہرا یار ہے وہ دینے کو بالکل ٹھیک ٹھاک کر دے گا۔ تجھے پتہ نہیں، دینے کے خلاف ایک نہیں، جانے کتنے جرائم اور خطرناک وارداتوں کے کیس ہیں، کسی میں بھی اس کو جب چاہے اور جس طرح چاہے گردن سے پکڑ کر دبوچ سکتا ہے، وہ اس کی گرفت سے نہیں نکل سکتا۔"

"دینے کو تو زماں خاں سنبھال لے گا پر جمیلہ کا کیا بنے گا؟ اُسے تو سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ وکیل بھی اس کی مدد کر رہا ہے۔" رحیم داد نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

احسان شاہ نے اس دفعہ کچھ نہ کہا۔ وہ نظریں جھکائے سوچتا رہا۔ اسی اثناء میں کمرے کا دروازہ کھلا۔ میاں عبدالسبحان داخل ہوا۔ حویلی کا ایک ملازم اس کے ہمراہ تھا۔ وہ نظریں جھکا کر ایک طرف خاموش کھڑا ہو گیا۔

میاں سبحان ادھیڑ تھا، جسم بھاری بھر کم تھا اور رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخی تھی۔ وہ اوورکوٹ پہنے ہوئے تھا۔ احسان شاہ اُسے دیکھتے ہی تپاک سے بولا "بہت دیر کر دی میاں صاحب، میں تو کب سے انتظار کر رہا تھا۔" میاں سبحان نے اوورکوٹ اتار کر ملازم کو دیا۔ اس نے اوورکوٹ سنبھال کر احتیاط سے کھونٹی پر لٹکا دیا۔ چند لمحے ادب سے گردن نیچی کئے کھڑا رہا، پھر چپ چاپ کمرے سے باہر چلا گیا۔

میاں سبحان آتش دان کے قریب کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ احسان شاہ نے رحیم داد سے اس کا تعارف کرایا۔ میاں سبحان بہت بڑا زمیں دار تھا۔ رحیم یار خاں کے علاوہ لائل پور میں بھی اس کے مربعے تھے۔ ہزاروں ایکڑ اراضی پر پھیلی ہوئی کھیتی باڑی کے ساتھ ساتھ آم، امرود اور مالٹے کے باغات تھے۔ ذاتی شکارگاہ تھی لیکن زمیں داری سے زیادہ اسے سیاست سے گہری دلچسپی تھی۔ میاں سبحان نے کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد سیاست کا ذکر چھیڑ دیا۔ احسان علی شاہ سیاسی جوڑ توڑ کا ماہر تھا اور حکمران طبقے میں اس کا اثر و رسوخ بھی بہت تھا۔ میاں سبحان اس کے پاس ایک سیاسی غرض سے آیا تھا۔

لیکن رحیم داد کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ جلد ہی ان کی سیاسی گفتگو سے بے زار ہو

گیا۔ اس نے اکتا کر جماہی لی۔ احسان شاہ نے اُسے دیکھا، ہنس کر بولا "چوہدری! لگتا ہے تجھے نیند آرہی ہے تو روٹی کھا کر سو جا۔ میں نے میاں صاحب سے کچھ ضروری گل بات کرنی ہے۔ دیر تک یہ سلسلہ چلے گا۔ تجھ سے اب صبح آرام سے بات چیت ہوگی۔"

رحیم داد چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ خاموشی سے اُٹھ کے باہر چلا آیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اُس نے ملازم سے کھانا منگوایا اور کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گیا۔

☆

مہربان علی دوسرے روز بھی نہ آیا۔ تیسرے روز بھی رحیم داد اس کا انتظار کرتا رہا۔ رحیم داد کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ ہاجراں کی خودکشی کے واقعے کے بعد وہ اس قدر خوف زدہ ہوگیا تھا کہ احسان شاہ کے زور دینے پر بھی اُس نے کوٹھے سے کسی کو نہ بلوایا۔ وہ کمرے میں اکیلا ہی سوتا۔ چوتھے روز مہربان علی سہ پہر کو لاہور سے واپس آیا لیکن رحیم داد سے اُس کی ملاقات شام کو ہوئی۔

رحیم داد اس وقت احسان شاہ کے ساتھ گرم کمرے میں بیٹھا شغل بادہ نوشی کر رہا تھا۔ کمرے کے باہر سرما کی ٹھٹھرتی رات پھیل کر دھواں دھواں ہوگئی تھی۔ ہوا بپھری ہوئی تھی۔ اس کے تیز اور تند تھپیڑے دروازوں اور کھڑکیوں پر دستک دے رہے تھے۔ آتش دان کے دہکتے انگاروں کی سرخ آنچ سے رحیم داد اور احسان شاہ کے چہرے دمک رہے تھے۔ خمار آلود آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔

مہربان علی سردی سے کپکپا رہا تھا۔ اُس نے اُونچی آواز سے سلام کیا اور آہستہ آہستہ آتش دان کی جانب بڑھا۔ احسان شاہ نے پوچھا "مہربان، تو لہور سے کیا خیر خبر لایا؟ چوہدری تیرا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔"

"میں جی وکیل کے منشی سے ملا تھا اور اپنے طور پر بھی پوری چھان بین اور پوچھ تاچھ کی۔" مہربان علی نے سنبھل سنبھل کر بتایا۔ "نادر خاں کی اطلاع بالکل ٹھیک ہے جی۔ جمیلہ نے

بیڈن روڈ پر کرائے کے مکان کا بندوبست کرلیا ہے۔ وہ مکان میں نے دیکھا ہے۔ اُس کے مالک سے بھی ملا تھا۔"

رحیم داد نے پوچھا" اور زمین کی بیع کے بارے میں تو نے کیا پتہ لگایا؟"

"زمین کا سودا بھی جی، بالکل طے ہو چکا ہے۔ پولس کا ایک ریٹائرڈ انسپکٹر زمین خرید رہا ہے۔ اُس کا نام عبداللہ خاں ہے، امرتسر کا مہاجر ہے۔ ویسے اوکاڑے میں اُس کے آم اور مالٹے کے باغات بھی ہیں۔"

احسان شاہ نے کرید کر پوچھا" تو نے یہ بھی پتہ چلایا کہ زمین کی لکھا پڑھی کا کام کب تک پکا اور مکمل ہو جائے گا؟"

وکیل کا منشی کہتا تھا سارے کاغذات تیار ہیں" مہربان علی نے بتایا" جمیلہ اگلے مہینے کے شروع میں لہور پہنچ جائے گی۔ اُس کے پہنچنے کے بعد بیع کی رجسٹری کا کام بھی شروع ہو جائے گا۔"

" مہربان علی، اب تو جا آرام کر۔" احسان شاہ مزید بات چیت کرنا نہ چاہتا تھا۔

مہربان علی چلا گیا۔ رحیم داد اس کی باتیں سن کر سخت پریشان ہو گیا۔ احسان شاہ نے گلاس اٹھا کر ایک بڑا گھونٹ بھرا اور رحیم داد کو تسلی دینے لگا" چوہدری! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ بتا تیرے اندازے میں جمیلہ کب تک لہور چلی جائے گی؟"

" مہربان علی نے بتایا تو تھا کہ وہ اگلے مہینے کے شروع میں لہور پہنچ جائے گی۔"

" اس کو چھوڑ۔" احسان شاہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔" تو اپنی گل کر۔"

"تاجاں کے ویاہ تک وہ کوٹلہ ہرکشن میں ضرور ٹھہرے گی۔" رحیم داد نے بتایا" ویاہ سے نمٹنے کے بعد وہ لہور جائے گی۔ مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔"

" اس معاملہ میں نادر خاں سے بھی گل بات کرنی ہوگی۔ اُسے ہر بات کا تجھ سے زیادہ پتہ ہے۔ اُسے مشورے کے لیے کل ہی بلانا ہوگا۔"

" ہاں جی اُس سے بات کرنی بہت ضروری ہے۔" رحیم داد نے احسان شاہ کی رائے سے اتفاق کیا" وہ جنت کے ذریعے جمیلہ کے ارادوں کا پتہ چلا سکتا ہے۔"

"تیری باتوں سے لگتا ہے جنّت بھی نادر خاں کی طرح ہوشیار اور تیز ہے۔"

رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔"اس سے بھی کچھ زیادہ ہی تیز ہے۔"

"کیا بات ہے چوہدری، تیری طبیعت تو اس پر نہیں آگئی۔" احسان شاہ نشے میں جھوم کر ہنسنے لگا۔"میں نے تو جنّت کو ایک ہی بار دیکھا ہے۔ نادر کے ساتھ آئی تھی۔ رنگ روپ تو اس کا اچھا ہے۔ عمر بھی زیادہ نہیں۔"

مگر رحیم داد نے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی، چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولا۔"نہیں شاہ جی ایسی کوئی گل شل نہیں۔"

احسان شاہ نے کچھ نہ کہا، گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور خالی کر دیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں باہر نکلے۔ احسان شاہ مڑا اور حویلی کے زنان خانے کی جانب روانہ ہو گیا۔ رحیم داد اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دوسرے روز شام کا اندھیرا پھیلتے ہی نادر خاں آگیا۔ احسان شاہ اور رحیم داد آتش دان کے سامنے بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ احسان شاہ نے کسی تمہید کے بغیر پوچھا۔"نادر تیری اطلاع کی تو میں نے تصدیق کرالی ہے۔ یہ تو پتہ چل گیا کہ جمیلہ نے لہور میں رہنے کے لیے مکان کا بھی بندوبست کر لیا ہے۔ زمین بیچنے کا سودا طے ہو چکا ہے، اب رجسٹری ہونی رہ گئی ہے۔"

"تو بھی یہی خبر لایا تھا ناں؟" رحیم داد نے مداخلت کی۔

لیکن احسان شاہ نے اس کی بات کو اہمیت نہ دی اور نہ ہی نادر خاں کو بولنے کا موقع دیا۔ اس کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔" نادر! یہ بتا، تیرے اندازے میں جمیلہ کب تک کوٹلہ ہرکشن چھوڑ کے لہور چلی جائے گی؟"

" مجھے تو جی لگتا ہے کہ وہ تاجاں کے ویاہ کے فوراً ہی بعد لہور چلی جائے گی۔ میں نے اس بارے میں جنّت سے پوچھا تھا۔ وہ یہی بتاتی تھی۔ میرے خیال میں وہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔"

" تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تاجاں کے ویاہ تک تو وہ اپنے پنڈ میں ضرور ٹھہرے گی۔" احسان شاہ نے اپنے ردّعمل کا اظہار کیا۔

"ہاں جی' یہ تو طے ہے۔" نادر خاں نے وثوق سے کہا۔ "تاجاں کا ویاہ تو وہ ایسے چاؤ اور لگن سے کر رہی ہے جیسے اپنی سگی دھی کا ویاہ کر رہی ہو۔ اُس پر تو آج کل اُسی کی دھن سوار ہے۔ کسی اور گل بات کا اُسے ہوش ہی نہیں۔ جب دیکھو تاجاں کے ویاہ کے بارے میں باتیں کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔"

احسان شاہ سر جھکائے سوچتا رہا۔ اُس نے نادر خاں کی باتوں پر کسی ردِ عمل کا فوری طور پر اظہار نہ کیا۔ رحیم داد بھی خاموش رہا۔ ایک جلتا ہوا کوئلہ زور سے چٹخا۔ چنگاریاں اُڑیں اور آتش دان کے باہر تک بکھر گئیں۔ احسان شاہ نے مڑ کر آتش دان کے دہکتے ہوئے سرخ سرخ انگارے دیکھے پھر نادر سے پوچھا۔ "نادر یہ بتا تاجاں کی جنج کس روز آئے گی؟"

"آج منگل ہے جی۔" نادر خاں سر اٹھا کے سوچنے لگا۔ "جمعے کی شام کو جنج چڑھے گی۔ زمیں دارنی نے مجھے بھی بتایا ہے اور اسی حساب سے ویاہ کی تیاریاں بھی ہو رہی ہیں۔"

"مطلب یہ کہ اب صرف تین راتیں رہ گئی ہیں۔" احسان شاہ نے کہا۔ "جو کچھ کرنا ہے انھی تین راتوں میں کرنا ہو گا۔ آج کی رات تو سمجھو گزر گئی۔ دو راتیں رہ جاتی ہیں۔"

رحیم داد اس کی بات کا مفہوم مطلق نہ سمجھ سکا۔ نادر خاں کے بشرے سے بھی ایسی ہی کیفیت ہویدا تھی۔ وہ تو خاموش رہا مگر رحیم داد نے بے چین ہو کر کہا۔ "اب کیا ہو سکتا ہے؟"

"یہ تو مجھ پر چھوڑ دے کہ کیا ہو سکتا ہے اور کیا ہو گا۔"

"پر تاجاں کے ویاہ سے جمیلہ کے لہور جانے کا کیا ناتا؟" وہ ابھی تک احسان شاہ کی بات کا مقصد نہ سمجھ سکا تھا۔

"تو چپ کر کے دیکھتا جا۔" احسان شاہ بے پروائی سے بولا۔ قدرے تامّل کیا، پھر وہ نادر خاں کی جانب متوجہ ہوا۔ "تاجاں تو اب مائیاں بیٹھ چکی ہو گی۔"

"ہاں جی، مائیاں تو وہ کئی روز پہلے بیٹھ چکی ہے۔"

"رات کو اُس کے پاس کون رہتا ہے؟" احسان شاہ نے استفسار کیا۔

"ویسے تو جی کئی زنانیاں رہتی ہیں۔ تاجاں کی ماں پھاتاں بھی رہتی ہے۔ پر زمیں دارنی

نے جنّت کو خاص طور پر لگایا ہے کہ وہ رات کو تاجاں کے پاس رہے۔" نادر خاں نے احسان شاہ کو بتایا۔" وہ تو جی آج کل تاجاں کے ساتھ ہی سوتی ہے۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے۔" احسان شاہ کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔" اب تو کام آسان ہو جائے گا۔"

رحیم داد نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔" شاہ جی تو کرنا کیا چاہتا ہے؟"

"میں چاہتا ہوں جنج پہنچنے سے پہلے ہی تاجاں کو اٹھوا لیا جائے۔ اُسے لا کر یہاں حویلی میں رکھا جائے۔" احسان شاہ نے نگاہیں اُٹھا کر نادر خاں کو تیز نظروں سے دیکھا۔" تو نے بھی سن لیا نادر؟"

"بالکل سن لیا جی۔" نادر خاں نے مستعدی سے جواب دیا۔

احسان شاہ کے چہرے پر کرختگی پھیل گئی۔ وہ ایک ہاتھ اُٹھا کے انگلیوں سے بائیں طرف کی مونچھ مروڑنے لگا۔ اُس نے نادر خاں کو استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔" وہ جمعرات کی رات ہو گی نا؟" احسان شاہ سنبھل سنبھل کے بولنے لگا۔" اس رات فیکا دوسرے کرندوں کے ساتھ کوٹلہ ہرکشن پہنچ جائے گا۔ سب جیپ میں ہوں گے۔ جیپ درختوں تلے کھڑی کر دی جائے گی۔ فیکا اور اس کے ساتھی بندے آدھی رات سے پہلے ہی پہنچ جائیں گے۔ اور اس گھر کے پاس چھپ کر بیٹھ جائیں گے جہاں تاجاں مائیاں بیٹھی ہے۔ اب تو یہ بتا اس کام میں کوئی مشکل تو نہیں پڑے گی؟"

"نہیں جی، کوئی مشکل نہیں ہو گی۔" نادر خاں نے جواب دیا۔" تاجاں جس گھر میں مائیاں بیٹھی ہے، اُس کے نزدیک صرف مہمان خانہ ہے جس میں ان دنوں میں اپنی بچیوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ آس پاس اور کوئی مکان نشان نہیں۔ آگے رڑی ہے، اُس کے ساتھ جھنگر ہے جو گھر کے پچھواڑے تک پھیلا ہے۔ اُس سے ذرا ہٹ کر باغ ہے۔" نادر خاں نے پورا حدود اربع بتایا۔" یوں سمجھ لیں جی، اِدھر اُدھر ویرانہ ہی ویرانہ ہے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" احسان شاہ سر ہلا کے بولا۔ "جس کمرے میں ناجاں مائیاں بیٹھی ہے اس کا کوئی دروازہ آنگن میں یا گھر کے باہر بھی کھلتا ہے؟"

نادر خاں جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ احسان شاہ نے ہاتھ اُٹھا کر منع کر دیا۔ "مجھے نہ بتا۔ یہ ساری باتیں تو فیکا کے سامنے ہی بتانا۔ مجھ سے زیادہ اُس کے لیے ان کا جاننا ضروری ہے۔" اُس نے اونچی آواز سے کمرے کے دروازے پر بیٹھے ہوئے ملازم کو اندر بلایا۔ وہ آیا تو اُسے ہدایت کی کہ رفیق عرف فیکا کو کمرے میں بھیج دے۔ وہ خاموشی سے چلا گیا۔ ذرا ہی دیر بعد رفیق آگیا۔ چہرے مہرے سے وہ خاصا ہیبت ناک نظر آتا تھا۔ اس کا جسم لمبا اور مضبوط تھا۔ رنگ سیاہ تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور چمک دار تھیں۔ انداز میں اکھڑ پن تھا۔ آواز بھدّی اور کرخت تھی وہ احسان شاہ کے رُو بہ رُو نظریں جھکا کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔

احسان شاہ نے نادر خاں سے کہا۔ "ہاں، اب بتا۔"

"وہ ایسا ہے جی کہ ناجاں جس کمرے میں مائیاں بیٹھی ہے، اُس کے آدھے سے بھی کم حصے میں پردہ پڑا ہے۔" نادر نے بتایا۔ "ناجاں پردے کے پیچھے رہتی ہے۔ اس حصے میں دروازہ بھی ہے جو گھر کے پچھواڑے کھلتا ہے، پر اُس میں تالا پڑا رہتا ہے۔ اُسے تب کھولا جاتا ہے جب ناجاں ٹٹی پیشاب کے لیے سویرے سویرے ہی باہر نکلتی ہے۔ وہاں جی کِکّر کے درخت اور گھنی جھاڑیاں ہیں۔ اُس کے اگے تھوڑا سا کھلا میدان ہے۔ میدان کے ایک طرف باغ ہے۔ جہاں باغ ختم ہوتا ہے وہاں حویلی کا کڑہ ہے جس میں ڈھور ڈنگر رہتے ہیں۔ اس سے ملا ہوا اصطبل ہے۔ کڑے اور اصطبل کی نگرانی کے لیے رکھوالا موجود رہتا ہے۔"

احسان شاہ نے رفیق کو مخاطب کیا۔ "فیکے! تُو نے ساری گلاں سن لیں، پر تُو آج یا کل رات خود موقع پر جا کر سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ اچھی طرح سمجھ لے۔ تجھے پرسوں رات کارروائی کرنی ہے۔" اُس نے مڑ کر نادر خاں کی جانب دیکھا۔ "تُو جا کر جنت کی ڈیوٹی لگا دے کہ وہ اُس رات فیکا کے پہنچنے کے بعد ناجاں کو کسی بہانے باہر نے جائے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو چپکے سے دروازہ کا تالا کھول دے۔ ہاں، یہ تو بتا، تالے کی چابی کس کے پاس رہتی ہے؟"

"جنت ہی کے پاس رہتی ہے۔ پہلے میں اسی گھر میں رہتا تھا۔ اِسے تو میں نے ویاہ کے لیے خالی کیا ہے۔"

احسان شاہ نے رفیق کو مخاطب کیا۔" فیکے، ویسے تو تیرا کام زیادہ مشکل نہیں پر میں چاہتا ہوں، ذرا بھی گڑبڑ نہ ہو۔ ہر کام خاموشی سے ہو جائے۔"

رفیق سینہ تان کر بولا۔" شاہ جی، تیرا حکم چاہیے۔ سب کچھ ٹھیک ہی ہوگا۔ فکر کی کوئی گل نہیں۔"

"نوّاب بہت پکّا ہوگیا ہے۔" احسان شاہ نے ہنس کر کہا۔ پھر اُس نے مڑ کے نادر کو دیکھا۔ "جب تا جاں کو فیکا اٹھا کرلے جائے، تب تجھے کیا کرنا ہوگا، یہ گل بات تجھے مہربان علی سمجھا دے گا۔ اگے جو کچھ ہوگا اُسے سب کچھ پتہ ہے۔ اس بارے میں وہ مجھ سے پہلے ہی بات کر چکا ہے۔ جیسا وہ کہے تُو نے ویسا ہی کرنا ہوگا۔ سمجھ گیا نا؟"

"بالکل سمجھ گیا۔" نادر خاں نے احسان شاہ کو اطمینان دلایا۔" ہر کام ویسے ہی ہوگا جیسی مجھے ہدایت دی جائے گی۔"

احسان شاہ بولا۔" اچھا، اب تو فیکا کے ساتھ جا اور مہربان سے مل لے۔ وہ تیرا انتظار کر رہا ہوگا۔"

نادر خاں اور رفیق چلے گئے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ احسان شاہ بھی تھوڑی ہی دیر بعد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے پوچھا۔" تو ابھی سے جا رہا ہے؟ اگے کیا کرنا ہے۔ اس بارے میں تجھ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

"اب تو کل ہی بات ہوگی۔" احسان شاہ نے جواب دیا۔" تو اگے کی فکر نہ کر۔ اُسے مجھ پر چھوڑ دے۔ چپ کر کے دیکھتا جا۔"

"پر مجھے یہ تو سمجھ لینے دے کہ کیا کیا کرنا ہوگا۔" رحیم داد نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔" بہت سوچ سمجھ کر کام کرنا ہوگا۔ کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔"

"پریشان نہ ہو سب ٹھیک ہی ہوگا۔ میں کل تجھے ہر گل بات اچھی طرح سمجھا دوں گا۔ میں نے

اب جانا ہے۔ میاں سبحان ایک ایم۔پی۔اے اور ڈپٹی کمشنر کے ہم راہ لائل پور سے آ رہا ہے۔ تینوں پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ میں نے ان سے بہت اہم باتیں کرنی ہیں۔"

"ان سے اسی کمرے میں گل بات کرنی ہے؟" رحیم داد نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، ان سے بڑے کمرے میں بات چیت ہوگی۔" احسان شاہ بولا۔ "تیرا جی چاہے تو یہیں بیٹھ۔ پینے شینے کا ارادہ ہو تو اپنے لیے منگوا لے۔ میں نے آج نہیں پینی۔"

"میں نے بھی آج نہیں پینی۔ کمرے میں جا کر روٹی کھالوں گا۔"

رحیم داد کی بے قراری دیکھ کے احسان شاہ نے اُس کے کندھے پر تھپکی دی اور اس کے ساتھ ساتھ دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ "چوہدری، تو جا کر آرام سے اپنے کمرے میں روٹی کھا۔"

اپنے کمرے میں پہنچ کر رحیم داد چپ چاپ لیٹا رہا۔ احسان شاہ کے اطمینان دلانے کے باوجود وہ خائف تھا۔ اُس نے کھانا بھی نہ کھایا۔ دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

صبح ہوئی تو اس کا یہی عالم تھا۔ احسان شاہ سے بھی اس کی ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ میاں سبحان اور لائل پور کے ڈپٹی کمشنر کے ساتھ تمام دن اور رات گئے تک مصروف رہا۔ جمعرات کو رحیم داد کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ میاں سبحان اور ڈپٹی کمشنر سہ پہر کو لاہور چلے گئے مگر احسان شاہ سے رحیم داد کی ملاقات شام ہی کو ہوئی۔ وہ حسبِ معمول مطمئن اور چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ ملازم نے بوتل کے علاوہ گلاس بھی میز پر رکھ دیے تھے۔ لیکن رحیم داد کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ احسان شاہ کے اشارے پر ملازم بوتل، جگ اور گلاس واپس لے گیا۔

رحیم داد اس کے اس رویے کا سبب جاننا چاہتا تھا لیکن وہ چپ رہا۔ دونوں نے ساتھ کھانا کھایا۔ پھر رات گزری، تاریکی بڑھی، سناٹا گہرا ہوتا گیا۔ رحیم داد کی بے چینی میں برابر اضافہ ہوتا رہا مگر احسان شاہ سیاسی جوڑ توڑ کے بارے میں اپنے کارنامے سناتا رہا۔ رحیم داد بت بنا اُس کی باتیں سنتا رہا۔ اُسے احسان شاہ کی سیاسی سرگرمیوں سے ذرا لگاؤ نہ تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھا۔ اور جمیلہ کے بارے میں غور کر رہا تھا۔

رات آدھی ہو گئی۔ آتش دان میں انگارے دہکتے رہے۔ کمرے کا دروازہ چرچراتا ہوا کھُلا۔ رحمتے اندر داخل ہوئی۔ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دیکھا، رحمتے کے عقب میں تاجاں سکڑائی سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ وہ مانجھے کا زرد لباس پہنے ہوئے تھی، جو اب ملگجا ہو گیا تھا۔ وہ سردی سے کپکپا رہی تھی۔ اُس کا چہرہ دوپٹے کے آنچل سے چھپا تھا۔ تاجاں کے داخل ہوتے ہی کمرے میں اُبٹنے کی تیز بُو پھیل گئی۔

"یہ تاجاں آگئی ہے جی۔" رحمتے نے اس کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "فیکا اسے جیب میں ڈال کر لایا ہے۔"

احسان شاہ نے تاجاں کو دیکھا اور لمحے بھر تک ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر رحمتے کی جانب متوجہ ہوا۔ "رحمتے اسے ساتھ کے کمرے میں پہنچا کر باہر سے دروازہ بند کر دے۔ تُو نے کہیں اور نہیں جانا، دروازے ہی پر رہنا ہے۔"

رحمتے نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے مڑی اور تاجاں کے ساتھ باہر چلی گئی۔ دونوں کے جانے کے بعد رحیم داد نے بے قرار ہو کر پوچھا۔ "تاجاں تو آگئی پر اُس کے آنے سے کیا ہوگا؟ مجھے اس سے کیا لینا۔"

"تجھے اس سے کچھ نہیں لینا، پر جمیلہ کو تو اس کی سخت ضرورت ہے۔" احسان شاہ نے قہقہہ لگایا۔ "چپ کر کے دیکھتا جا۔" احسان شاہ نے قدرے تامّل کے بعد پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "تھوڑی دیر میں جمیلہ بھی یہاں آ جائے گی۔"

"کیا فیکا اُسے بھی اُٹھا کر لائے گا؟"

"نہیں وہ یہاں اپنی مرضی سے آئے گی۔" احسان شاہ نے زور دے کر کہا۔ "اُسے یہاں آنا پڑے گا۔"

رحیم داد کو احسان شاہ کی بات پر یقین نہ آیا لیکن وہ خاموش رہا۔ اُس کی آنکھوں میں استعجاب

جھلک رہا تھا۔ اُس کے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے کلبلا رہے تھے۔

مگر احسان شاہ کا کہا بالکل درست نکلا۔ تاجاں کو پہنچے ہوئے گھنٹہ، سوا گھنٹہ گزرا ہو گا کہ نادر خاں کمرے کے اندر آیا۔ اُس کے ہم راہ جمیلہ بھی تھی۔ رحیم داد ششدر رہ گیا۔ اس کی رگوں میں خون جمنے لگا۔ آتش دان میں دہکتے ہوئے انگاروں کی سرخ روشنی میں جمیلہ کا خوب صورت چہرہ تمتما رہا تھا۔ بالوں کی ایک لٹ بکھر کر ماتھے پر جھول رہی تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں جھنجلاہٹ اور غصے کی تیز چمک تھی۔ وہ سفید اونی دوشالہ اوڑھے ہوئے تھی۔

وہ احسان شاہ کے روبہ رو سر اُٹھا کے کھڑی ہو گئی۔ احسان شاہ نے اُس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی، مسکرایا اور بے تکلفی سے بولا۔ ''آخر تو آ ہی گئی۔'' اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور کھل اُٹھی۔ ''کھڑی کیوں ہے، بیٹھ جا۔ سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی آئی ہے۔ ذرا گرم ہو جا۔''

''میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی ہوں۔'' جمیلہ نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ بتا، تاجاں کہاں ہے؟''

''فکر نہ کر۔ وہ یہیں ہے اور بہت آرام سے ہے۔ اُسے کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ وہ تجھے خود بتا دے گی۔''

''میں اُس سے ملنا چاہتی اور ابھی ملنا چاہتی ہوں۔'' اُس کے لہجے میں بڑی سوزش تھی۔

رحیم داد نے نرم لہجے میں اُسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ ''تُو بالکل فکر نہ کر۔ تاجاں ٹھیک ٹھاک ہے۔''

جمیلہ نے سر کو خم دے کر رحیم داد کو قہر آلود نظروں سے دیکھا اور اُس سے کوئی بات نہ کی، احسان شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ''شاہ جی! مجھے ٹھیک ٹھیک بتا تُو نے تاجاں کو کہاں رکھا ہے؟ مجھے پہلے اُس سے ملنا ہے۔''

''ضرور مل لے۔ اپنا اطمینان کر لے۔'' احسان شاہ نے جمیلہ کے لہجے کی تلخی پر کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا، زیرِ لب مسکراتا رہا۔ ''اُس سے ملنے اور اطمینان کرنے کے بعد یہاں واپس آ جانا۔'' اُس نے آواز میں نرمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ''تُو اُسے واپس لینے ہی کے لیے یہاں آئی ہے ناں؟''

"میں اسے لینے ہی کے لیے آئی ہوں اور اُسے لے کر ہی جاؤں گی۔"

"ضرور لے جاؤ۔" احسان شاہ کا لہجہ بدستور نرم اور شگفتہ تھا۔" پر اُس سے مل تو لے۔" احسان شاہ نے رحمتے کو بلایا اور اُسے جمیلہ کو اپنے ہم راہ لے جانے کا حکم دیا۔

جمیلہ کے جانے کے بعد احسان شاہ نے نادر خاں سے دریافت کیا۔" نادر یہ تو بتا، تو جمیلہ کو یہاں لایا کیسے؟ چوہدری، یہ راز جاننے کے لیے بہت بے چین ہے۔ دیکھ تو کیسا حیران پریشان بیٹھا ہے۔" وہ کھِل کھلا کر ہنسنے لگا۔

"وہ ایسا ہوا جی کہ جنّت نے چپکے سے دروازہ کھول دیا تھا۔" نادر خاں نے بتایا۔" فیکا آرام سے اندر پہنچا۔ تاجاں بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے نزدیک پہنچ کر تاجاں کا جھٹ منّہ دبا دیا۔ فیکا نے اُسے اپنے بازوؤں میں اُٹھایا اور ایسی خاموشی سے باہر لے گیا کہ کمرے میں سوئی ہوئی زنانیوں میں سے کسی کو ذرا بھی پتہ نہ چلا۔"

"پر جنّت تو جاگ رہی تھی ناں؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"بالکل جاگ رہی تھی جی۔ بلکہ فیکا کے پہنچنے کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اُس سے کہہ جو رکھا تھا۔" نادر خاں نے رحیم داد سے کہا۔" جب فیکا اپنے ساتھیوں کے ساتھ تاجاں کو جیپ میں ڈال کر لے گیا۔ تب جنّت میرے پاس آئی۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ اُسی نے سب کچھ مجھے بتا دیا۔"

"جمیلہ اس وقت کہاں تھی؟" احسان شاہ نے دریافت کیا۔

"وہ جی اوپر اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔" نادر خاں نے کہا۔" جنّت کی زبانی جب مجھے یہ پتہ چل گیا کہ فیکا تاجاں کو اٹھا کر لے گیا ہے، تب مہربان علی کی ہدایت پر میں زمیں دارنی کے پاس گیا۔ جنّت میرے ساتھ تھی۔ اُس نے زمیں دارنی کو جگایا اور صاف صاف بتا دیا کہ تاجاں کو اغوا کر لیا گیا۔ یہ سنتے ہی وہ بدحواس ہو گئی، گھبرائی ہوئی نیچے اُتری اور اس کمرے میں گئی جہاں تاجاں ماسیاں بیٹھی تھی۔ تاجاں کو وہاں نہ پا کر وہ پریشان ہو گئی۔"

"اس نے کوئی شور شرابا تو نہیں کیا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"نہیں جی، وہ بالکل چپ کر کے رہ گئی۔ اُس نے کسی کو بھی تاجاں کے بارے میں کچھ نہ

بتایا۔" نادر خاں نے کہا۔" جنّت کو بھی منع کر دیا۔ وہ وہاں زیادہ دیر ٹھہری نہیں، فوراً مہمان خانے میں آگئی۔ میں اور جنّت اُس کے ساتھ ساتھ تھے۔ ساری زنانیاں بے خبر سوتی رہیں۔ انہیں کچھ بھی پتہ نہ چلا۔"

"مہمان خانے میں پہنچ کر تو اُس نے تجھ سے بھی پوچھ تاچھ کی ہوگی؟" احسان شاہ نے استفسار کیا۔

"پہلے تو جی وہ جنّت سے پوچھ تاچھ کرتی رہی پر اُس نے زیادہ گل بات نہ کی۔ اُسے جلد ہی واپس کمرے میں بھیج دیا۔ ساتھ ہی یہ ہدایت کی کہ وہ خاموشی سے اپنی جگہ پر جا کر لیٹ جائے اور پوری طرح یہ کوشش کرے کہ تاجاں کے بارے میں کسی کو کچھ پتہ نہ چلے۔" نادر خاں سنبھل سنبھل کر ایک ایک تفصیل بیان کرتا رہا۔" جنّت کے جانے کے بعد زمیں دارنی نے مجھ سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ تاجاں کو کون اُٹھا کر لے گیا۔"

رحیم داد زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا۔" تو نے کیا بتایا؟"

"میں نے اُسے صاف صاف کہہ دیا کہ شاہ جی کے بندے تاجاں کو اُٹھا کر جیپ میں لے گئے ہیں۔"

"جمیلہ نے تجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ تجھے اس بات کا کیسے پتہ چلا؟"

"اُس نے مجھ سے یہ گل پوچھی تھی۔" نادر خاں نے جواب دیا۔" میں نے اُسے بتایا کہ تاجاں کو اُٹھا کر لے جانے کے بعد شاہ جی کا ایک کارندہ میرے پاس مہمان خانے میں آیا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول تھا۔ اُس نے مجھے کہا کہ زمیں دارنی اگر تاجاں کو واپس لانا چاہتی ہے تو وہ شاہ جی کی حویلی پہنچ جائے۔ نہر کے کنارے جیپ کھڑی ہے، وہ اسے لے جائے گی۔"

"کیا تیرے پاس شاہ جی کا کوئی کارندہ سچ مچ آیا تھا؟" رحیم داد نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے پوچھا۔

رحیم داد کے اس احمقانہ سوال پر احسان شاہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ مگر نادر نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔" میرے پاس آنا شانا کس کو تھا جی۔ میں نے تو مہربان علی کی ہدایت پر

یہ بات زیبن دارنی سے کہی تھی۔" اُس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔" یہ سنتے ہی اُس کا تو بُرا حال ہو گیا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کے بولی۔ یہ کیا ہو گیا نادر، میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ کل تاجاں کی جنج آرہی ہے۔ جب تاجاں ہی نہ ہوئی تو کیسے ویاہ ہوگا۔ میں سب کو کیا جواب دوں گی، یہ کہتے کہتے جی وہ بلک بلک کر رونے لگی۔"

" وہ تو بالکل پاگل ہو گئی ہو گی۔" رحیم داد نے کہا۔

" پاگل تو جی اُسے ہونا ہی تھا۔" نادر خاں بولا۔" میں نے پہلے تو اُسے دلاسہ دیا۔ جب اُس نے رونا بند کیا تو مشورہ دیا کہ اب تو بے عزّتی سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ شاہ جی کے پاس چلا جائے اور تاجاں کو واپس لانے کے لیے منّت سماجت کی جائے۔ ساتھ ہی میں نے زور دیا کہ وکت بہت کم ہے جو کرنا ہے جلد سے جلد کرنا ہے۔ تاجاں کو سویرا ہونے سے پہلے ہی واپس آجانا چاہیے، ورنہ بات سارے پنڈ میں پھیل جائے گی۔ جنج آئی بھی تو واپس چلی جائے گی۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔" یہ سن کر وہ تجھ سے نراض تو نہیں ہوئی؟"

" پتہ نہیں جی، اُس نے میرے بارے میں کیا سوچا۔" نادر خاں کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ " میری باتیں سنتے ہی وہ ہاتھوں سے منہ چھپا کر ایک بار فیر رونے لگی۔ میں چپ کر کے بیٹھا رہا پر ذرا ہی دیر بعد وہ ایک دم اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور یہاں آنے کے لیے تیار ہو گئی۔ میرے ہم راہ وہ مہمان خانے سے باہر نکلی۔ جیپ بھی تب تک تاجاں کو اُدھر پہنچا کر واپس آگئی تھی۔ زیبن دارنی میرے ساتھ اس میں سوار ہو گئی۔"

احسان شاہ پوری روداد سن کر بولا۔" نادر تُو سچ مچ بہت کام کا بندہ ہے۔" وہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔" چوہدری! تُو نادر کو تگڑا انعام دینا۔ اُس نے زبردست کام کیا ہے۔"

" کام تو اس نے انعام ہی کا کیا ہے۔" رحیم داد نے بے ساختہ کہا۔" اسے ضرور انعام ملے گا۔ شاہ جی تیری بات خالی نہیں جائے گی۔ فکر نہ کر۔"

احسان شاہ نے نادر خاں کو جلد ہی رخصت کر دیا۔ بولا۔" نادر اب تُو مہربان علی کے پاس جا۔ وہ تیرا انتظار کر رہا ہوگا۔" یہ کہتے کہتے وہ ٹھٹکا۔" اور دیکھ باہر رہتے ہوگی۔ اس سے کہہ کہ جیسلہ تو

یہاں بھیج دے۔"

نادر خاموشی سے چلا گیا۔

"لے چوہدری، تیرا کام تو بن گیا۔" احسان شاہ نے ہنس کر رحیم داد سے کہا۔

رحیم داد سادگی سے بولا۔ "سچ پوچھ تو اپنی سمجھ میں اب تک نہ آیا کہ کیا کام بنا۔"

"گھبرا نہیں، جمیلہ کو آنے دے۔ تھوڑی دیر میں سب کام پورا ہو جائے گا اور تجھے بھی سب پتہ چل جائے گا۔"

رحیم داد گم صُم بیٹھا رہا۔ سانس کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ وہ بے چینی کے عالم میں بار بار پہلو بدلنے لگا۔ پھر پھر کر دروازے کی جانب دیکھتا۔ کمرے میں سکوت تھا۔ احسان شاہ بھی چپ تھا۔

☆

جمیلہ شکست خوردہ انداز میں کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کا چہرہ سوگ وار تھا۔ آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ نڈھال اور بہت تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اُس نے آگے بڑھ کر کرسی کھسکائی اور احسان شاہ کے رُو برُو بیٹھ گئی۔ رحیم داد کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ اُس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں چہرے پر دکھ کے سائے منڈلا رہے تھے۔

"تو تاجاں سے مل لی۔ وہ ٹھیک ٹھاک ہے ناں؟" احسان شاہ نے جمیلہ سے پوچھا۔

"ہاں، میں اُس سے مل لی۔" جمیلہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے دیکھتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔" اُس نے ٹھنڈی سانس بھری، نظریں اُٹھا کر احسان شاہ کی جانب دیکھا۔ "تیں نوں پتہ نہیں شاہ جی، وہ مجھے اپنی ماں کی طرح پیار کرتی ہے۔ چھوٹی سی تھی تو اُس کا پیُو مر گیا۔ بعد میں اُسے میں نے ہی پالا۔ پچھلے سات سال سے میرے ہی پاس ہے۔ مانو اب تو وہ میری ہی دھی ہے۔" اُس کے لہجے میں فریاد کا انداز تھا۔ "شاہ جی، تو نے اچھا نہیں کیا۔ تو اُسے کیوں برباد کرنا چاہتا ہے۔ اُس کا تو کیول ایک رانڈ ماں کے اور کوئی بھی نہیں۔"

"میں نے تو اس سے کچھ نہیں لینا۔" احسان شاہ نے بے نیازی سے کہا۔ "تو جیا ہے تو

وہ تیرے ساتھ واپس جا سکتی ہے۔ اُس کی زندگی برباد ہونے سے بھی بچ سکتی ہے۔ سب کچھ تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔"

"شاہ جی، فیر تُو کیا چاہتا ہے؟" جمیلہ کی آواز بھرّا گئی۔ "میں تاجاں کو برباد ہونے سے بچانے کے لیے تیری ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔" اُس نے کسی مزاحمت کے بغیر احسان شاہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ وہ اُس کے پاس آنے سے پہلے ہی شاید یہ فیصلہ کر چکی تھی۔ اُس نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔ "میں تاجاں کو اپنے ساتھ لے کر ہی جاؤں گی۔"

جمیلہ کی آواز گلوگیر ہوگئی۔ اُس نے سر جُھکا لیا۔ آنکھوں میں ستارے جھل ملائے اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اُس نے بے قرار ہو کر اپنا چہرہ چھپا لیا۔ کمرے کی گہری خاموشی میں اُس کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ آتش دان میں سُلگتے ہوئے انگاروں پر راکھ کی تہہ جم گئی تھی۔ احسان شاہ نے قریب رکھے ہوئے پوکر کا دستہ پکڑا اور لوہے کے آنکڑے سے انگارے کریدنے لگا۔

انگاروں کی آنچ تیز کرنے کے بعد اُس نے پوکر ایک طرف رکھ دیا، مڑ کے جمیلہ کو دیکھا، بے رُخی سے بولا۔ "اس طرح ٹسوے بہانے سے کام نہیں چلے گا۔" اُس کا لہجہ تُند ہوگیا۔ "تاجاں کو واپس لے جانے کے ارادے سے آئی ہے تو ٹھیک سے گل بات کر۔"

"کیا چاہتا ہے تُو؟" جمیلہ کی شکستہ آواز اُبھری۔

"میں یہ چاہتا ہوں کہ نہ تُو اپنی زمین بیع کرے گی اور نہ کوٹلہ ہرکشن چھوڑ کر لہور جائے گی۔" احسان شاہ کے لہجے میں گرج اور دھمک تھی۔ "تیرے سارے منصوبوں کا مجھے اور چوہدری کو پتہ چل چکا ہے۔" اُس نے گھور کر جمیلہ کو دیکھا۔ اس کا چہرہ درشت ہوگیا۔ ہونٹوں پر زہرخند نمودار ہوا۔ "اب بیٹھی ٹسوے بہا رہی ہے، جب تُو لہور جانے کے لیے اپنے وکیل راٹھور سے چپکے چپکے سکیمیں بنا رہی تھی، تب یہ نہ سوچا کہ تُو کیا کرنے جا رہی ہے۔ چوہدری کو مغالطے میں رکھ کر کس طرح دھوکا دے رہی ہے۔"

"میں کسی کے ساتھ دھوکا نہیں کر رہی۔" اُس نے سر اُٹھا کے تیکھی نظروں سے احسان شاہ کو دیکھا۔ "میں اگر اپنی زمین بیچنا چاہوں اور لہور جا کر رہنا چاہوں تو یہ دھوکا کس طرح ہوا۔ میں

اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ تو یا چوہدری اس بارے میں مجھ سے پوچھنے والا کون ہوتا ہے؟"

"زیادہ تیزی نہ دکھا۔" احسان شاہ نے ڈپٹ کر کہا۔ "یہ بتا اور صاف صاف بتا، تو تاجاں کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہے یا نہیں؟"

"تجھے پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ میں اسی کارن یہاں آئی ہوں۔" جمیلہ کی آواز پھر بجھ گئی۔ "میں اُسے اپنے ساتھ لے کر ہی جاؤں گی۔"

"ضرور اُسے لے جا، خوشی سے لے جا۔" احسان شاہ کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ "پر تاجاں کے ویاہ سے پہلے تیرا چوہدری کے ساتھ نکاح ہوگا۔"

جمیلہ کرسی پر پتھر کی طرح بیٹھی رہی۔ اس کے ذہن میں منڈلاتا ہوا جذبات کا سیلاب چہرے پر دھوپ چھاؤں بن کر لہرا رہا تھا۔ مگر احسان شاہ نے اُسے زیادہ دیر غور کرنے کا موقع نہ دیا، کہنے لگا۔ "تجھے جو کچھ طے کرنا ہے، جلدی کر۔ ٹائم کم ہے۔ سویرا ہوگیا تو تاجاں کو واپس لے جانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ بات پنڈ میں پھیل گئی تو آئی ہوئی جنج واپس چلی جائے گی۔ اچھی طرح یہ سوچ لے۔"

جمیلہ نے آنکھیں بند کرلیں، اُس کے ہونٹ لرز رہے تھے، احسان شاہ کی پھنکار پر اس نے ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "شاہ جی جیت تو ہمیشہ تیری ہی ہوتی ہے۔" اُس نے گہری سانس بھری۔

"میں تاجاں کو لے کر ہی جاؤں گی۔ تاجاں کو بلا لے۔ میں نے جلد سے جلد پنڈ پہنچنا ہے۔"

"تاجاں بھی آجائے گی۔" احسان شاہ کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔ "پر اُس کے یہاں آنے سے پہلے چوہدری کے ساتھ تیرا انتظام بھی تو ہوگا۔ نکاح ابھی ہوگا۔ بول کیا کہتی ہے۔"

"میں نے کیا کہنا ہے۔" اُس نے مڑ کر قہر آلود نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ رحیم داد نے گھبرا کے نگاہیں نیچی کرلیں۔ جمیلہ چند لمحے تک ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں بھرتی رہی۔ "میں نے تو تاجاں کو یہاں سے لے کر ہی جانا ہے۔ میں اُسے وچن دے کر آئی ہوں۔" اُس کے لہجے میں درد کی کسک تھی۔

احسان شاہ نے مزید بات نہ کی۔ فوراً مہربان علی اور نادر خاں کو بلایا۔ ان کے ہمراہ مسجد

کا ملّا بھی تھا جسے مہربان علی نے عشاء کی نماز کے بعد ہی بلوالیا تھا۔ وہ پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے نکاح نامہ تیار کر رکھا تھا۔ اسٹامپ پیپر پر جمیلہ کی زمین کی بیع کا رحیم داد کے ساتھ معاہدہ بھی لکھا ہوا اُس کے پاس موجود تھا۔

ملّا نے احسان شاہ کے حکم پر رحیم داد کا جمیلہ سے نکاح پڑھایا۔ نادر خاں نے جمیلہ کی جانب سے وکیل کے فرائض انجام دیے۔ احسان شاہ اور مہربان علی گواہ بنے۔ ایجاب و قبول ہوا۔ رحیم داد کے ساتھ جمیلہ نے بھی ہنکاری بھری۔ نکاح نامے پر دست خط بھی کر دیے۔ مسجد کے ملاّ، رحیم داد، احسان شاہ، مہربان علی اور نادر خاں نے بھی دست خط کر دیے۔

نکاح کے بعد مہربان علی نے زمین کی بیع کی دستاویز جمیلہ کے سامنے پیش کی۔ جمیلہ کی آنکھیں آتش دان کے انگاروں کی مانند دہک رہی تھیں۔ اُس نے نہ کوئی مین میخ نکالی نہ کسی برہمی کا اظہار کیا۔ چپ چاپ بیع نامہ پر بھی دست خط کر دیے۔

مہربان علی، نادر خاں اور ملاّ باہر چلے گئے۔ احسان شاہ نے رحمتے کو بلایا۔ وہ جمیلہ کو اپنے ہم راہ لے گئی۔

جمیلہ کو ایک علیحدہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہ اُس کا حجلۂ عروسی تھا۔ جمیلہ نے بجھی بجھی نظروں سے درو دیوار پر ایک نظر ڈالی، تڑپ کر نچلا ہونٹ دانتوں کے نیچے دبایا اور نڈھال ہو کے بستر پر گر پڑی۔

کراچی، ۲۰ نومبر ۱۹۸۹ء